

# ٹیپو سلطان



PDFBOOKSFREE.PK

خان آصف

## پیش لفظ

جنوبی ایشیا ہمیشہ سے بیرونی طاقتوں کی نظروں کا محور رہا ہے۔ اللہ رب العزت نے اس خطے کو جن وسائل سے مالا مال کیا ہے، ان پر ہمیشہ انگریزوں نے حریصانہ نظریں رکھیں اور اسی دولت کی کشش نے اُن کو آج تک اس خطے سے الگ نہیں ہونے دیا۔ انگریزوں نے مغل شہنشاہ جہانگیر کے جوتوں کو بوسے دیئے اور فرنگیوں کے لئے بحری تجارت کا حکم نامہ حاصل کر لیا۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے سود و سود کا کاروبار شروع کیا اور مسلمانوں کی صفوں میں غدار پیدا کئے۔ پھر چشم فلک نے وہ عبرت ناک منظر دیکھا کہ آخری مغل تاجدار، بہادر شاہ ظفر کو اپنے ہی ملک میں دفن ہونے کے لئے دو گز زمین بھی نہ مل سکی۔ برصغیر کے مسلمان اپنے کا ندھوں پر آٹھ سو سالہ اقتدار کی لاش اٹھائے پھر رہے تھے مگر ان کے لئے کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔ انگریزوں نے جس طرح برصغیر پاک و ہند میں اپنے قدم جمائے، اُن کے اثرات بد سے ہم آج تک محفوظ نہیں ہیں۔ آج بھی ہم اُن کے محکوم و معتوب نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی بد قسمتی یہی تھی کہ وہ اُن کے ارادوں کو نہ سمجھ سکے۔ انگریزوں نے جتنی بھی جنگیں لڑیں، وہ شجاعت و ہنرمندی اور سیاسی تدبیر سے نہیں بلکہ اپنی فطری عیاری و مکاری سے لڑیں۔ وہ بس ایک ہی ہنر جانتے تھے کہ وطن فروشوں کو کتنی قیمت میں خریدا جاسکتا ہے۔

انہوں نے تاریخ کے کسی موڑ پر بھی ہمت و بہادری کے جوہر نہیں دکھائے بلکہ انسان کی فطری کمزوریوں کو پر کھتے ہوئے اپنے آزمودہ نفسیاتی ہتھیاروں سے مسلمانوں کے دلوں اور حوصلوں پر کاری ضربیں لگائیں، ان کے ایمان کو زنگ آلود کیا۔ مزید غضب یہ کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑا کر کے پسندیدہ نتائج حاصل کئے آج بھی ان کا یہ خوفناک کھیل جاری ہے۔ ایک ارب سے زیادہ ہونے کے باوجود ہم ذلت و خواری کے غاروں میں رہ رہے ہیں۔ فرقوں میں بٹی ہوئی قوم نسلی تعصب کی بنا پر ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہی ہے۔ اہل ایمان کا خون پانی کی طرح سڑکوں پر بہہ رہا ہے۔ یعنی قاتل بھی ہم ہی ہیں اور مقتول بھی ہم ہی..... ایک وحشت ناک

عذاب ہے جو ہمارے سروں پر مسلط ہے۔

رہے ہیں۔ سہل پسندی اور بے وقافی یہ زہر ہمارے جسم میں اس طرح سرایت کر گیا کہ ہم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتے۔“

خدا بچا ، خودی بچتی ، زمین بچتی ، وطن بچا  
کہ بازار سیاست میں بزرگوں کا کتن بچا  
نہیں جب بیچنے کو کچھ ، کھڑے ہیں ہاتھ پھیلائے  
کہیں سے قرض مل جائے ، کہیں سے بھیک مل جائے  
قیامت سے بہت پہلے قیامت کا نظارہ ہے  
مسلمانوں کا اب غیروں کے ٹکڑوں پر گزارہ ہے

بہر کیف یہ داستان الم تو بہت طویل ہے۔ آئیے بات کرتے ہیں زیر نظر ناول ”ٹیپو سلطان“ کی۔ میرے والد محترم نے ”ٹیپو سلطان“ پر اخبار جہاں میں 1992ء میں لکھا اس زمانے میں یہ ناول بے حد مقبول ہوا۔ بعد میں پاکستان ٹیلی ویژن نے انہیں بھرپور موقع دیا اور انہوں نے ٹیپو سلطان پر سیریل لکھ کر اپنا فرض پورا کیا۔ ہندوستان میں اگرچہ ٹیپو سلطان پر ڈرامہ سیریل بنا کر ان کی شخصیت کو مخ کیا گیا، حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ خیر ان لوگوں سے کیا گلہ کہ وہ نام نہاد مسلمان تو خود بت پرستوں سے کم نہیں ہیں۔ ہندوؤں کے ٹکڑے چاٹ کر صرف ایسے ہی بدنام کام کر سکتے ہیں۔

والد گرامی کو حضرت ٹیپو سلطان سے بذات خود ایک عشق تھا اور اس میں کوئی دورانے نہیں کہ ٹیپو ایک جانا باز ولی اور صاحب کردار شخص تھا۔ حقیقتاً والد صاحب نے ٹیپو سلطان پر لکھ کر ایک قرض اُتارا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے تاریخی ناول نگاری کو بھی رنگ آلود اور بوسیدہ زنجیروں سے آزاد کر کے ایک انقلابی رنگ دیا۔ کیونکہ تاریخ، انقلاب ہی کا دوسرا نام ہے۔

میں بذات خود محمد علی قریشی صاحب کی شکر گزار ہوں کہ یہ ان کی ذاتی دلچسپی اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ٹیپو سلطان کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ عہد ساز شخصیت آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہے۔ وہ عزم و استقلال کا پیکر تھا۔ وہ نہ صرف ایک بہادر حکمران تھا بلکہ اعلیٰ کرداری میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ وہ بہترین منتظم تھا۔ اس کی انتظامی اصلاحات سے رعایا خوشحال تھی۔ وہ کیسا مشفق انسان تھا کہ اس کے دور حکومت میں ہندوؤں کو تمام مذہبی، سماجی اور سیاسی حقوق حاصل تھے۔ اُن کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ تھی۔ مساوات کا دور دورہ تھا۔ وہ ایک عظیم

ہر اک کا اپنا خطبہ ہے، ہر اک کا اپنا منبر ہے  
ہر اک کا اپنا قبلہ ہے، ہر اک کا ل رہبر ہے  
بظاہر ایک ارب ہم ہیں، عظیم الشان میلہ ہے  
مگر ہر اہل ایمان آج تنہا ہے، اکیلا ہے

آج بھی فرنگیوں کی وہی بساط سیاست ہے، وہی میرے ہیں، وہی چالیں ہیں۔ بس صرف نام اور چہرے بدل گئے ہیں۔ بت پرستوں سے کیا گلہ کریں اور دشمنان اسلام سے کیا شکایت کہ وہ تو اپنے مشن پر ہیں۔ مگر آپ ان منافقین کو کیا کہیں گے جو مسلمانوں کی مٹھوں میں شامل ہیں اور عجیب عجیب انداز سے اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ نہ جانے کتنے میر صادق اور میر جعفر آج بھی آستینوں میں چھپ کر ملت اسلامیہ کو ڈس رہے ہیں۔ خرید ستم ظریفی یہ کہ اہل ایمان کے نظریات پر حملے کئے جا رہے ہیں۔ مکروہ ذہنوں میں سوال اُٹھ رہے ہیں کہ ”اسلامی نظریہ حیات“ قابل عمل ہے بھی یا نہیں۔ اسلاف کو الزام تراشی کا ہدف بنایا جا رہا ہے مجاہدین اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، محمد بن قاسم اور ٹیپو سلطان کے کارناموں کو نفرت اور انتہا پسندی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اسلامی نصاب کو بوسیدہ کہا جا رہا ہے۔ ”دوقومی نظریہ“ روشن خیال مسلمانوں کو کشک رہا ہے۔ جدوجہد آزادی پر شکوک و شبہات کا اظہار ہو رہا ہے۔ بزرگوں کی بے مثال قربانیوں پر انگلیاں اُٹھ رہی ہیں۔ لفظ ”جہاد“ جس سے دشمنان اسلام ہمیشہ سے خوف زدہ تھے، ہیں اور رہیں گے، آج یہ لفظ شدت پسندی کے زمرے میں شمار کیا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انتہا پسندی کی تعبیر و تشریح کرتے وقت اسے اسلام اور مسلمانوں سے کیوں منسوب کیا جاتا ہے؟ جبکہ اہل زمین جانتے ہیں کہ اس وقت سب سے زیادہ ظلم و ستم کا شکار اہل اسلام ہی ہیں۔ گردش حالات میں سب سے بڑے محبوب بھی ہم ہی ہیں۔

بظاہر امنِ عالم کی دھنیں بجتی رہتی ہیں  
ہماری قتل گاہیں ہر گھڑی بجتی ہی رہتی ہیں

میرے والد محترم کے خوبصورت الفاظ تھے..... ”کافد کے بدن تھے، مسائل کی دھوپ میں جل گئے۔ موم کے دماغ تھے، کشک کشک کی آنچ میں پکھل گئے۔“ حرص و ہوس یا بھیک کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے کہ صدیوں سے ہمارا حراج ہے کہ ہم ”ایٹائے عہد“ اور جاں فشانی سے جی چراتے



## اے مجبورِ اعظم

ہر تاج سیاست ترے قدموں میں پڑا ہے  
 تو اپنی بلندی میں ہمالہ سے بڑا ہے  
 بت گرہوں، فرنگی ہوں کہ ہوں نگِ وطن میر  
 سب مل کے بھی پہنا نہ سکے تجھے زنجیر  
 تو فرقہ پرستی سے ہمیشہ رہا ہے زار  
 ہر اپنے پرانے کی محافظ تری تلوار  
 اے مردِ مجاہد تو اصولوں پہ لڑا ہے  
 تو اپنی بلندی میں ہمالہ سے بڑا ہے  
 یہ بامِ یہ دیوار یہ درِ بیچ رہے ہیں  
 تہذیب کے تاجر ہیں یہ گھر بیچ رہے ہیں  
 سونے کے قفس میں ہیں مسلمان نظر بند  
 سب ہو گئے دشمن کی غلامی پہ رضا مند  
 تو عشق کے مقتل میں اکیلا ہی کھڑا ہے  
 تو اپنی بلندی میں ہمالہ سے بڑا ہے  
 روتی ہے جنازے پہ ترے مسجدِ اعلیٰ  
 صدمے سے تری موت کا سورج ہوا کالا

باپ کا عظیم بیٹا تھا۔ اُس نے شیروں کی طرح زندگی گزاری۔ مگر یہ اُس مردِ حق کی بدقسمتی تھی کہ  
 اپنوں نے ہی اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ اُس کو میدانِ کارزار میں تنہا چھوڑا۔ یہ اُسی کے خون کی سزا  
 ہے کہ آج تک قوم و ملت شرمِ ناک غلامی پر رضامند ہے۔ اور آج بھی ان ہی غداروں کی نسل،  
 مملکتِ خداداد کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہے۔

کبھی ہم فاتحِ عالم تھے، اب محرومِ عالم ہیں  
 خود اپنی لاش رکھ کر سامنے مصروفِ ماتم ہیں  
 وہ ایک مردِ آہن تھا، جس نے طاغوتی قوتوں کے آگے سر جھکانے کے بجائے شہادت کو ترجیح  
 دی۔ خود شیپو سلطان کے اپنے تاریخی الفاظ تھے۔

”مومن کا مقصودِ حیاتِ اول و آخر جہاد ہے۔ جن لوگوں نے جہاد ترک کیا، وہ دشمنوں کی  
 خوراک بن گئے۔ زندگی کی محبت نے انہیں بزدل و ناکارہ بنادیا اور پھر وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیے  
 گئے۔ جذبہ جہاد اور اپنی مفوں میں مکمل اتحاد ہی اہل ایمان کی سب سے بڑی سیاسی قوت ہے۔“

اسماء خان آصف



شیخ ولی محمد صحیح النسل عرب تھا اور قریش کے ایک ممتاز قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آباد اجداد صدیوں سے مکہ معظمہ میں آباد تھے۔

شیخ ولی محمد ایک متوسط درجے کا تاجر تھا۔ فطرتاً قناعت پسند ہونے کی وجہ اس کی زندگی بہت آرام و آسائش سے گزر رہی تھی۔ ایک بار اُسے تجارت میں اس قدر نقصان ہوا کہ نوبت فاقہ کشی تک آ گئی۔ بڑے تاجر، ولی محمد سے اپنے قرضوں کا مطالبہ کر رہے تھے اور اس کے پاس دینے کے لئے ایک درہم بھی نہیں تھا۔

ایسے سنگین لمحات میں ولی محمد نے اپنے احباب سے رجوع کیا تو دوستوں نے اسے انتہائی گمراہ کن مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

”ولی محمد! تیری نجات اسی میں ہے کہ تُو رقوم کی ادائیگی کے تمام وعدوں سے منحرف ہو جا۔ اس طرح تیرے اثاثے بھی فروخت ہونے سے بچ جائیں گے، بیوی بچے پر غربت و افلاس کے تاریک سائے بھی نہیں پڑیں گے اور اس معاشرے میں تیری شخصیت کا بھرم بھی رہ جائے گا۔“

شیخ ولی محمد اپنے دوستوں کا یہ مشورہ سن کر حیران رہ گیا۔ پھر اُس کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔

”ایک جھوٹے، بد دیانت اور خائن کی شخصیت کا بھرم ہی کیا؟“ شیخ ولی محمد کا لہجہ بہت اداں تھا۔ ”تم نے مجھے ساری زندگی کی رفاقتوں کا یہ صلہ دیا؟“

”یہ بھی بہت ہے کہ ہم لوگ تجھے نجات کا راستہ بتا رہے ہیں۔“ دوستوں نے بڑی بے حسی کے ساتھ جواب دیا۔

”یہ نجات کا راستہ ہے یا میری ذلت و بربادی کی رہ گزر؟“ شیخ ولی محمد کے لہجے میں گہری تلخی پوشیدہ تھی۔ ”اگر دوست ہو تو میرے غرق ہونے کا تماشا کیوں دیکھ رہے ہو؟ آگے بڑھ کر دیکھو کیوں نہیں کرتے؟ اور مجھے کھینچ کر ساحل تک کیوں نہیں پہنچاتے؟“

”آخر تُو کہنا کیا چاہتا ہے ولی محمد؟“ دوست اس کی بات کا مفہوم سمجھ گئے تھے مگر جان بوجھ کر انجان بن رہے تھے۔

”تم سب پر اللہ کا فضل و کرم ہے۔“ بات کرتے ہوئے شیخ ولی محمد کی زبان لڑکھڑانے

پیاسا گیا دنیا سے مگر دے گیا احساس  
تجھتی ہے فقط کوثر و تنیم سے یہ پیاس

وہ جیت کے بھی ہار گئے وقت کی بازی  
تُو ہار کے بھی جنگِ وفا جیت گیا

تُو سلطنتِ شہرِ خدا داد کا بانی  
دریاؤں میں اب تک ہے ترے خوں کی روانی

تیری ہی روایت کے امیں قائد اعظم  
آزادی افکار یہ مینار یہ پرچم

یہ ارضِ حسین، پاک زمین، ملکِ خدا  
تا حشر سائیں گے شہادت کی یہ روداد

بے نام و نشان ہو گئے ملت کے وہ غدار  
تُو آج بھی زندہ ہے مرے صاحبِ کردار

پرچم تیرا تاریخ کے سینے میں گڑا ہے  
تُو اپنی بلندی میں ہمالہ سے بڑا ہے

اے شیخ اعظم  
اے شیخ اعظم

(خان آصف)

گئی۔ وہ ایک غیرت مند شخص تھا مگر صورت حال کی نزاکت نے اسے دوستوں کے سامنے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”اگر تم چاہو تو میں تمام تاجروں کے قرضوں سے سبک دوش ہو سکتا ہوں۔“

”وہ کس طرح؟“ زمانہ ساز دوستوں نے بڑی حیرت کے ساتھ پوچھا۔

”اگر تم سب لوگ تھوڑی تھوڑی رقم بھی مجھے دے دو تو میرے کانحوں سے قرض کا یہ بوجھ با آسانی اتر سکتا ہے۔“ شیخ ولی محمد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنے ہو، اس لئے بے وقت مطالبہ نہیں کرو گے۔ حالات درست ہوتے ہی تم سب کی قس ادا کر دوں گا۔“

”مجھے کیا معلوم کہ ہم لوگ کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں؟“ دوستوں نے بڑے عیارانہ انداز میں بہانہ تراشا۔ ”ہمارے قیمتی لباسوں اور ظاہری رہن بہن پر نہ جا۔ یہ تو دنیا داری کے طریقے ہیں ورنہ ہماری مالی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ اس لئے ہمیں معاف کر دے کہ ہم تیرے کسی کام نہیں آ سکتے۔“ بات بات پر جان دینے کی قسمیں کھانے والے احباب نے بڑی سفاکی کے ساتھ کھلا جھوٹ بولا۔

دوستوں کا جواب سن کر شدت غم سے شیخ ولی محمد کا چہرہ دھواں ہو گیا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوستوں سے قرض نہیں، بھیک مانگ رہا ہو۔ پھر سالہا سال کے رفیق جو ریاکاری اور جھوٹی دوستی کی قبا پہنے ہوئے تھے، اسے آفات و مصائب کے گرداب میں چھوڑ کر چلے گئے۔ مجبوراً شیخ ولی محمد نے تاجروں سے درخواست کی کہ وہ اسے کچھ دن کی مہلت دے دیں مگر سوداگروں نے بھی اس کی کوئی اہتمام نہیں سنی۔ تھک پار کر ولی محمد عزیزوں اور رشتے داروں کے دروازوں پر بھی گیا لیکن بربادی اس کا مقدر بن چکی تھی اور سوال سے پہلے ہی تمام دروازے بند کئے جا چکے تھے۔

آخر ولی محمد نے تاجروں کا قرض اتارنے کے لئے بیوی کے زیورات فروخت کر دیئے مگر مطلوبہ رقم ادا نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ اسے روزمرہ کے استعمال کا سارا ساز و سامان اور اپنا آبائی مکان تک بیچ دینا پڑا۔ اب وہ تمام آسائشوں سے محروم ایک ایسے مکان میں مقیم تھا، جس کی چھت پرانی لکڑیوں اور کھجوروں کے پتوں سے تعمیر کی گئی تھی اور دیواریں ٹاٹ کے پردوں سے اٹھائی گئی تھیں۔

شیخ ولی محمد کی غیرت مند اور حساس بیوی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور بیمار پڑ گئی۔ شیخ ولی محمد نے ایک تاجر کے یہاں معمولی تنخواہ پر ملازمت اختیار کر لی۔ مسلسل فکر اور غم انگیز خیالات نے اس کی بیوی کو دق کے موذی مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ مقامی طبیبوں نے اچھی غذا نہیں اور قیمتی تجویز کرنے کے ساتھ مریضہ کو خوش و خرم رہنے کی تاکید کی۔ مگر بد قسمتی سے اس شکستہ حال عورت کو ان تینوں میں سے کوئی چیز بھی میسر نہ آ سکی۔ انجام کار کچھ دن بعد بڑی کرب ناک حالت میں شیخ ولی محمد کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ اپنے پانچ سالہ بیٹے محمد

علی کے ساتھ اس دنیا میں تنہا رہ گیا تھا، جہاں اس کے سینکڑوں قریبی عزیز موجود تھے۔ شریک حیات سے دائمی جدائی بڑا جانگزا حادثہ تھی۔ شیخ ولی محمد اس حادثے کو بھی برداشت کر لیتا مگر وہ اپنے ان عزیزوں کے چہرے دیکھنا نہیں چاہتا تھا جو ہر موڑ پر سامنے کھڑے ہوئے اس کا مذاق اڑاتے نظر آتے تھے۔

آخر شدید عالم جبر میں شیخ ولی محمد نے اپنا آبائی شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن اس نے اپنے مالک سے درخواست کی کہ وہ اسے کسی تجارتی قافلے کے ساتھ بغداد بھیج دے۔ کئے کا وہ سوداگر شیخ ولی محمد کی محنت و دیانت داری سے بہت خوش تھا۔ اس لئے ایک کام کے آدمی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر جب شیخ ولی محمد نے اپنی مجبوریاں بیان کیں تو وہ بادل نا خواستہ راضی ہو گیا۔ بغداد روانہ ہونے سے ایک دن پہلے شیخ ولی محمد، خانہ کعبہ میں حاضر ہوا، نماز ادا کی اور بیت اللہ کی دیواروں سے لپٹ کر گریہ و زاری کرنے لگا۔

”اے اللہ! تیری اس نشانی کی قسم! اہل مکہ نے مجھ پر یہ متبرک زمین تنگ کر دی۔ میں اس دیار پاک کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا کہ یہاں تیرا پہلا گھر ہے، جسے تیرے ظہیل نے تعمیر کیا۔ اور میں اس شہر مقدس کو چھوڑنا بھی کیسے کہ یہاں میرے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے، جو تیرے سب سے بڑے رسول، سب سے بڑے صادق اور سب سے بڑے امین ہیں۔ تو حاضر و ناظر ہے، اس لئے خوب جانتا ہے کہ میں ایک بہت کمزور انسان ہوں۔ عزیزوں اور دوستوں کا تحقیر آمیز سلوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ ہجرت رسول کے صدمے میں مجھ پر یہ طویل و دشوار گزار سفر آسان کر اور غریب الوطنی کے عالم میں میری مدد فرما کہ سب شاہ و گدا تیری مدد کے محتاج ہیں۔“

”شیخ ولی محمد بچپن کے ساتھ رو رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ وہ چونک کر مڑا۔ سامنے ایک سفید ریش بزرگ کھڑے تھے جن کے چہرے پر ایک عجیب سی روشنی تھی۔ شیخ ولی محمد بزرگ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

”صادق اعظم (ﷺ) کا غلام ہے تو ہمیشہ سچ بولنا۔۔۔۔۔ اور امین اعظم (ﷺ) کی اُمت میں ہے تو کبھی خیانت نہ کرنا۔ تُو نے لوگوں کو امانتیں لوٹا دیں، اچھا کیا ورنہ ہلاک ہو جاتا۔“ یہ کہہ کر روشن چہرہ بزرگ ایک طرف جانے لگے۔

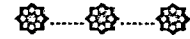
شیخ ولی محمد حیران تھا کہ ایک اجنبی شخص کو اس کے ذاتی حالات کس طرح معلوم ہو گئے؟ وہ تیز قدموں سے چلا ہوا بزرگ کے قریب پہنچا اور بڑے مؤدب لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”میرا یہ سفر کیسا رہیگا؟ اور کیا میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاؤں گا؟“

”اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا؟“ بزرگ نے پُر جلال لہجے میں کہا۔ ”جو کچھ بتایا گیا ہے، اس پر عمل کر۔ زسوا ہونے سے سچ جائے گا۔“

بزرگ کا جلال روحانی دیکھ کر شیخ ولی محمد مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اور دوسرے

دن اپنے دس سالہ بیٹے محمد علی کو لے کر ایک تجارتی قافلے کے ساتھ بغداد روانہ ہو گیا۔



دراصل شیخ ولی محمد، بغداد اس لئے آیا تھا کہ یہاں تجارت اور روزگار کے بہتر مواقع حاصل تھے۔ وہ دوبارہ دولت جمع کر کے اپنا کھویا ہوا معاشرتی وقار بحال کرنا چاہتا تھا۔ شیخ ولی محمد کی شدید خواہش تھی کہ اس مقصد میں کامیاب ہو کر مکہ معظمہ واپس لوٹے گا اور جن عزیزوں اور دوستوں نے گردش کے وقت اسے دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیا تھا، انہیں بتائے گا کہ وہ ماضی کی تمام تر روایتوں کے ساتھ ابھی زندہ ہے۔ شیخ ولی محمد اپنے ان ہی سگتے ہوئے خیالات کے سہارے شب و روز زحمت کرتا رہا۔ مگر کئی سال گزرنے کے باوجود اسے بغداد میں بھی سکون و اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ روزِ اوّل کی طرح اس کے سارے خواب تشنہ تعبیر تھے۔ مجبوراً وہ بہتر مستقبل کی تلاش میں ہندوستان پہنچا۔ کچھ سالوں تک دہلی میں جدوجہد جاری رکھی لیکن جب خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو ایک مقامی دوست کے مشورے پر گلبرگہ (دکن) چلا آیا۔ یہاں شیخ ولی محمد کی سوئی ہوئی قسمت نے عجیب انداز سے کروٹ لی۔ اب اس کا بیٹا، محمد علی جوان ہو چکا تھا۔

گلبرگہ میں شیخ ولی محمد کی ملاقات حضرت سید گیسو دراز بندہ نوازؒ کی درگاہ کے بھادر سے ہوئی۔ (حضرت سید محمد گیسو درازؒ سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلیفہ اکبر تھے۔ دکن کے لوگ فرط عقیدت و محبت میں آپ کو ”بندہ نواز“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں) سید گیسو درازؒ کی بارگاہ کے سجادہ نشین شیخ ہادی، شیخ ولی محمد کو اس لئے عزیز رکھتے تھے کہ وہ قبیلہ قریش کا ایک معزز فرد تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ قربت گہری دوستی میں بدل گئی۔ محمد علی ایک خوب صورت، تعلیم یافتہ اور صالح نوجوان تھا۔ شیخ ہادی کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ محمد علی کو فرزندگی میں قبول کر کے اپنی جوان سال بیتی کے نازک فریضے سے سبکدوش ہو جائیں۔ شیخ ہادی نے کسی تامل کے بغیر اس رشتے کو منظور کر لیا۔

شیخ ہادی کی بیٹی سے شادی کے بعد محمد علی کو گلبرگہ میں ایک خاص مقام حاصل ہو گیا تھا۔ شیخ ولی محمد نے جین کی سانس لی۔ مگر اس کے سکون کی یہ مدت بہت مختصر تھی۔ محمد علی کے پہلے بیٹے کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھا کہ اچانک آخری سفر پر روانگی کا حکم آپہنچا۔ آخر شیخ ولی محمد چند روز بیمار رہ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

باپ کے انتقال کے بعد محمد علی، گلبرگہ سے ترک سکونت کر کے ریاست بیجاپور چلا آیا۔ یہاں اس نے کئی سال تک پُر آسائش زندگی بسر کی۔ مگر بیجاپور کے زوال کے بعد محمد علی، نقل مکانی پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ اپنی بیوی اور چار لڑکوں شیخ الیاس، شیخ محمد علی، شیخ محمد امام اور شیخ محمد کے ساتھ خلیج کو لار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کو لار میں محمد علی کے بہت سے ششما مقیم تھے۔ اس لئے یہاں اسے کسی قسم کی مالی دشواری پیش نہیں آئی اور وہ غریب الوطن ہونے کے باوجود پُر سکون

اور آبرو مندانہ زندگی گزارنے لگا۔

پھر جب شیخ محمد علی کا انتقال ہو گیا تو اس کے تین لڑکے تلاش معاش میں کو لار سے نکل کھڑے ہوئے۔ سب سے بڑا بھائی شیخ محمد الیاس اپنی بیوی اور بیٹے شیخ حیدر کو کو لار میں چھوڑ کر تنہا چلا گیا۔ دو بھائی شیخ محمد امام اور شیخ علی محمد، کرناٹک جا کر وہیں ملازم ہو گئے۔ صرف چوتھا اور آخری بھائی، شیخ فتح محمد کو لار ہی میں مقیم رہا۔

چند سال بعد شیخ حیدر نے راجہ میسور کرشناؤری کی ملازمت اختیار کر لی۔

میسور کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ 1399ء میں دارکا سے دو بھائی وجیارا اور کرشنا راجا جنوب کی طرف سے آئے اور ہڈناڈ میں مقیم ہو گئے جو میسور کے قریب ہے۔ ہڈناڈ کے راجہ کی بیٹی دیواجی ایک انتہائی پُرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ دیواجی کے خُسن کا شہرہ سن کر قرب و جوار کے کئی راجہ، زمیندار اور جاگیردار اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان سب میں کاروگ بلی کا راجہ، دیواجی کو جنوں کی حد تک چاہتا تھا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ ہڈناڈ کے راجہ کو دیواجی کے رشتے کا پیغام بھیجے مگر وہ خاندانی اعتبار سے ہندوؤں کی ایک نچ ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنے اسی احساس کسری کے باعث کاروگ بلی کا راجہ، دیواجی کے لئے شادی کا پیغام نہ بھیج سکا اور دل ہی دل میں کسی گیلی نکلڑی کی مانند سلگتا رہا۔

پھر جیسے ہی کچھ دن بعد ہڈناڈ کے راجہ کا انتقال ہوا، اس کی آتش شوق پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ کاروگ بلی کے عاشق مزاج راجہ نے کسی تاخیر کے بغیر اپنے ایک اچلی کو خط دے کر ہڈناڈ کی رانی کے پاس بھیج دیا۔ رانی، کاروگ بلی کے راجہ کا خط پڑھ کر غصے سے کانپنے لگی۔ ”اس کم ذات کی یہ ہمت کیسے ہوئی کہ وہ ایک اعلیٰ نسب خاندان سے رشتہ کے بارے میں سوچ بھی سکے۔“

کاروگ بلی کے اچلی نے رانی ہڈناڈ کا ایک ایک لفظ راجہ کے گوش گزار کر دیا۔ اپنے ذوق ہوس کی تکمیل کے لئے ایک بہانہ اُس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ فوجی نقطہ نظر سے ہڈناڈ ایک معمولی ریاست تھی۔ راجہ کاروگ بلی نے رانی کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ایک مختصر سی جنگ کے بعد ہڈناڈ پر قبضہ کر لیا۔ اب اس کے راستے میں کوئی دیوار حائل نہیں تھی اور وہ علی الاعلان دیواجی سے جبری شادی کی تیاریاں کر رہا تھا۔

اس قدر رنگین لمحات میں وجیارا اور کرشنا راجا کی عیار عقل نے بڑے عجیب گل کھلائے۔ ان دونوں شاطر بھائیوں نے رانی ہڈناڈ کو یقین دلایا کہ وہ کسی بھی حال میں اس بد نصیب راجہ کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ آخر وجیارا اور کرشنا راجا نے بڑی ہوشیاری سے ایک منصوبہ بنایا اور عین شادی کے دن راجہ کاروگ بلی کو قتل کر دیا۔ یہ خبر سنتے ہی مقتول راجہ کی فوج بدحواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ پھر کچھ دن بعد وجیارا نے دیواجی سے شادی کر لی اور ہڈناڈ کا راجہ بن گیا۔ جب تک وجے نگر کی سلطنت قائم رہی، ہڈناڈ کی ریاست سر جھکا کر اسے خراج ادا



گر شیخ فتح محمد کو یہ ملازمت ملا نہیں آئی۔ راجہ کرشنا اپنے چند درباریوں کے ہاتھوں میں کچھ جلی بنا ہوا تھا۔ یہ منافقوں، بدکاروں، عیاروں اور خوشامدیوں کا ایک گروہ تھا جو درپردہ میسور پر حکومت کر رہا تھا۔ ان سب کی ایک ہی خواہش تھی کہ حکومت سے وابستہ ہر شخص، راجہ کرشنا کے ساتھ ان کی خدمت گزاری کے فرائض بھی انجام دے۔ شیخ حیدر ہر زمانے اور ہر موسم میں جینے کا ہنر جانتا تھا، اس لئے وہ ہندو فتنہ گروں کی جماعت سے کسی نہ کسی طرح نباہ کر رہا۔ گر شیخ فتح محمد کو دربار میسور میں چند ماہ گزارنا بھی مشکل ہو گئے۔ وہ فطرتاً ایک بہادر، فرض شناس اور غیرت مند شخص تھا۔ اس نے اپنی ملازمت کے دوران ایک بار بھی راجہ کرشنا کو ہاتھ جوڑ کر سلام نہیں کیا۔ شیخ فتح محمد جب بھی دربار میں حاضر ہوتا تو رسم تعظیم ادا کرنے کے لئے اپنی گردن کو ہلکا سا خم دیتا۔ اس کے برعکس ہندو ملازم، راجہ کرشنا کو سر دربار سجھے کیا کرتے تھے۔ میسور کے فتنہ گروں کو فتح محمد کی یہ ادائیں پسند نہیں آئی۔ نتیجتاً وہ اس کے دشمن ہو گئے۔ پھر انہوں نے کئی بار اشاروں میں فتح محمد کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ ریاست کا کوئی ملازم ان کے تعاون کے بغیر سکون و آسودگی بسر نہیں کر سکتا۔

”میں نے دربار میسور میں صرف اپنی خدمات فروخت کی ہیں، اپنا سر نہیں بیچا ہے۔“ شیخ فتح محمد نے ہندو فتنہ گروں سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”اس حقیر کی ملازمت کا تو ذکر ہی کیا، اگر کبھی حالات یہ رخ اختیار کر لیں کہ میری زندگی تمہارے رحم و کرم کی محتاج ہو کر رہ جائے تو میں ایسے جینے پر آمادہ ہوں کہ تیرے دوں گا۔“

شیخ فتح محمد کی صاف گوئی نے فتنہ گروں کی نفرت میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ انجام کار وہ سب کے سب فتح محمد کے خلاف راجہ کرشنا کے کان بھرنے لگے۔ اڑتے اڑتے شیخ حیدر کو بھی اس سازش کی خبر ہو گئی۔ اس نے تہائی میں پچھا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

”آپ میر اور ذہانت سے وقت گزارنے کی کوشش کریں۔ سارا میسور جانتا ہے کہ وہ کتنے بااثر لوگ ہیں۔ آپ کی بے باکی سے میرے عہدہ و منصب کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“

شیخ فتح محمد نے بڑی اداں نظروں سے نتیجے کی طرف دیکھا اور پھر یکایک مکرانے لگا۔

”مطمئن رہو۔ میں تمہیں کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کروں گا۔ یہ میری ذات کی جنگ ہے اور میں اسے اکیلا ہی لڑوں گا۔“

فتنہ گروں کی جماعت، راجہ کرشنا کو فتح محمد کے خلاف بھڑکاتی رہی مگر اس نے کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ راجہ کے نزدیک شیخ فتح محمد ایک لائق فوجی افسر تھا اور ریاست میسور کو ایسے جانناز کی سخت ضرورت تھی۔ جب ہندو فتنہ گروں کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا تو انہوں نے میسور کی ایک خوب صورت طوائف شائی کو فتح محمد کے پیچھے لگا دیا۔ اس وقت فتح محمد نوجوان بھی تھا اور غیر شادی شدہ بھی۔ طوائف شائی کو سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنی عشوہ طرازیوں سے فتح محمد کی سرکش جوانی کو زیر کرے اور اسے شراب نوشی و قمار بازی کا عادی بنا دے۔ اس طرح

کرتی رہی۔ پھر جیسے ہی دے مکر کا زوال ہوا تو راجہ اوڈیر نے اپنی گردن سے غلامی کا طوق اتار پھینکا اور 1566ء میں سرنگاپٹم کو میسور کا دارالحکومت بنا دیا۔ مگر یہ ریاست زیادہ دن تک اپنی آزادی برقرار نہ رکھ سکی اور سلاطین بیجاپور کی باج گزار بن گئی۔ جنوبی ہند کی اسلامی ریاستیں ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی تھیں اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر مغل سلطنت کے لئے خوف ناک سیاسی مسائل پیدا کرتی رہتی تھیں۔

آخر اس مستقل عذاب سے نجات پانے کے لئے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے 1684ء میں جنوبی ہند پر حملہ کر دیا۔ تین سال کی طویل خونریزی کے بعد یہ سیاسی مہم اپنے انجام کو پہنچی اور 1687ء میں ہندوستان کے سیاسی نقشے سے بیجاپور کی سلطنت کا وجود مٹا دیا گیا اور مغل فوجیں تمام جنوبی ہند پر قابض ہو گئیں۔

عالمگیر نے جنوب کے نئے انتظام کے لئے دو صوبے داریاں قائم کیں۔ ایک ارکاٹ کی، دوسری سرا کی۔ سرا کا صوبہ بالا گھاٹ میں تھا، جس میں میسور واقع ہے۔ سرا کا پہلا مظہر گورنر قاسم خان کو بنایا گیا، جس نے میسور فتح کیا تھا۔ اس کے بعد ذوالفقار خان گورنر مقرر ہوا۔ اسی کے عہد میں مسلمان میسور کے گرد و پیش میں آباد ہونے لگے۔ بیجاپور کے کچھ مسلمان گھرانے پہلے ہی سے یہاں آباد تھے۔ پھر سقوط بیجاپور کے بعد وہاں کی ایک بڑی آبادی مغل فوجوں کے ساتھ مل کر بلاری، انت پور اور میسور منتقل ہو گئی۔ اسی لئے میسور میں جس قدر بھی مسلمان آباد تھے، ان میں تقریباً نوے فیصد کا تعلق ریاست بیجاپور سے تھا۔ اس وقت میسور کے راجہ چک ریوا اوڈیر کی حیثیت ایک آسودہ حال جاگیردار سے زیادہ نہیں تھی۔ 1696ء میں مرہٹوں نے سرانٹھانا شروع کیا اور وہ توسیع سلطنت کا جنوبی جذبہ لے کر سرنگاپٹم پر حملہ آور ہوئے۔ مگر اس وقت شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ جنوبی ہندوستان میں موجود تھا۔ اس لئے مرہٹے ناکام و نامراد لوٹ گئے۔ وقت کی رفتار کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے میسور کے راجہ چک ریوا نے، اورنگ زیب کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

”آج سے میں شہنشاہ کی مکمل غلامی کا اعلان کرتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی راجہ چک ریوا نے بے شمار قیمتی تحائف عالمگیر کی خدمت میں ارسال کئے۔ جواب میں شہنشاہ اورنگ زیب نے راجہ کو جگ دیوا کا خطاب بخشا، نوبت و وقار رکھنے کی اجازت دی اور راجہ کے بیٹے کے لئے ہاتھی دانت کا ایک تخت بھی عطا کیا۔ مگر جیسے ہی 1707ء میں عالمگیر کا انتقال ہوا تو ایک طرف سرا کا حاکم نواب بن بیٹھا اور دوسری طرف میسور کے راجہ خود مختار ہو گئے۔ اور اسی آزاد ریاست میں شیخ حیدر نے راجہ کرشنا اوڈیر کی ملازمت اختیار کی تھی۔

کچھ دن بعد ہی شیخ حیدر نے راجہ میسور سے اپنے سب سے چھوٹے چچا، شیخ فتح محمد کی سفارش کی۔ نتیجتاً کرشنا اوڈیر نے شیخ فتح محمد کو بھی اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا۔

مفسدوں کی یہ جماعت، فتح محمد کو راجہ کرشنا کی نظروں میں ایک ادبائش اور شرابی فوجی افسر ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔

طوائف شانتی تو بہ شکن حسن کی مالک تھی۔ اس لئے اُسے یقین کامل تھا کہ چند ملاقاتیں ہی شیخ محمد کو گمراہ کر دیں گی اور وہ اپنی دستار اور نکوار اُس کے قدموں میں رکھ دے گا۔ مگر شانتی اس وقت حیران رہ گئی، جب فتح محمد نے انتہائی دلنواز اور شائستہ لہجے میں اسے سمجھایا۔

”میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمان کے لئے دنیا کی ہر عورت قابل احترام ہوتی ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔“

”سپاہی! میں تیری بہادری پر مر مٹی ہوں۔“ شانتی نے منصوبے کے عین مطابق بڑے پیادہ انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس پوری ریاست میں تجھ جیسا سورما اور کوئی نہیں۔“

”میں نے بھی تم جیسی خوب صورت عورت آج تک نہیں دیکھی۔“ شیخ فتح محمد کے لہجے سے اسلامی تہذیب کی مکمل عکاسی ہو رہی تھی۔ ”کاش! تمہارے جسم کی طرح تمہارا کردار بھی اتنا ہی دلکش ہوتا۔“

فتح محمد کی بات سن کر طوائف شانتی سناٹے میں آ گئی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم کس کے اشارے پر یہ گری ہوئی حرکت کر رہی ہو۔“ شیخ محمد نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کسی کا آلہ کار بننے کے بجائے چپ چاپ اپنے گھر کی طرف لوٹ جاؤ۔ میں اپنے دشمنوں سے خود ہی نمٹ لوں گا۔“

شانتی اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسے مرد کو دیکھ رہی تھی، جو با اختیار ہوتے ہوئے بھی ہوس کار نہیں تھا۔ شیخ فتح محمد کے کردار نے میسور کی طوائف کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بے اختیار اس کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔

”سپاہی! میں بھی عام عورتوں کی طرح آبرو مندانہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں مگر یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیں گے۔“

”وہ کون لوگ ہیں؟“ شیخ فتح محمد نے شانتی سے پوچھا۔  
”راجہ کے بولہبوس درباری اور میسور کے ادبائش جاگیردار و زمیندار۔“ حالانکہ شانتی، فتح محمد کے محفوظ کمرے میں تھی مگر پھر بھی اس پر ان لوگوں کا اس قدر خوف غالب تھا کہ وہ بار بار مڑ کر دروازے کی طرف دیکھتی تھی۔

”مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے خاتون! لیکن میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ شیخ فتح محمد نے ناسف آمیز لہجے میں کہا۔ ”وہ سب کے سب تمہاری ہی قوم کے لوگ ہیں اور بد قسمتی سے میں ان کا ایک معمولی ملازم ہوں۔“

”اور اگر میں مسلمان ہو کر تمہاری قوم میں شامل ہو جاؤں؟“ شانتی نے اس طرح کہا جیسے

کسی ڈوبتے ہوئے شخص کو ساحل تک پہنچنے کے لئے کوئی مضبوط سہارا مل گیا ہو۔

”میرا مذہب کسی پر جبر نہیں کرتا۔“ شیخ فتح محمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تم شوق سے اسلام قبول کر سکتی ہو مگر تبدیلی مذہب کے باوجود تمہیں ان لوگوں کے طاقتور خونی پنجوں سے نجات نہیں مل سکتی۔ ایک تو یہ کہ میسور میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ وہ ایک غم زدہ عورت کی چیخ کن کر اپنے دل میں درد تو محسوس کر سکتے ہیں مگر تمہاری مدد کے لئے گھروں سے نہیں نکل سکتے۔ اور اس سلسلے میں سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ تمہارا مسلمان ہونا ان بھیڑیوں کو بہت گراں گزرے گا۔ اس لئے اگر تم اپنا مذہب بدلنا چاہتی ہو تو خاموشی سے مسلمان ہو جاؤ اور اس وقت تک انتظار کرو جب تک مسلمانوں کو ریاست میسور میں فیصلہ کن طاقت حاصل نہ ہو جائے۔“

شانتی نے دوبارہ فتح محمد کے قدم چھوئے اور واپس جانے لگی۔ پھر یکایک مڑی اور اُداس لہجے میں بولی۔ ”وہ سب کے سب آپ کی عزت اور جان کے دشمن ہیں۔ ہر قدم پر ان سے ہوشیار رہئے گا۔“

”تم جس مذہب کو اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہو، اس کے بنیادی عقائد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ ہی موت اور زندگی دیتا ہے اور اسی کی بارگاہ جلالی سے انسانوں کے لئے عزت اور ذلت تقسیم ہوتی ہے اور کائنات کی ہر طاقت اُسی کے کرم کی محتاج ہے۔ اور اس کے لامحدود اختیار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ تم میری طرف سے مطمئن ہو کر جاؤ اور صرف اپنا خیال رکھو۔“

دوسرے دن ہی شانتی نے دربار میسور کے ان فتنہ گردوں سے کہہ دیا۔  
”فتح محمد ایک پتھر ہے اور میں اس پتھر کو پگھلانے کی طاقت نہیں رکھتی۔“ میسور کی طوائف، شیخ فتح محمد کی ہدایت کے مطابق بڑی ہوشیاری سے گفتگو کر رہی تھی۔

”تو پھر تیرے حسن پر لعنت ہے۔“ ایک فتنہ گرد، دیوان رائے غضب ناک ہو کر بولا۔ یہ شخص قوم کا بنگالی تھا اور اسے راجہ کرشنا کے دربار میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔

”دیوان رائے! تم کیوں اپنے دماغ کو جلاتے ہو؟“ دوسرا فتنہ گرد، سورج مل انتہائی سرد لہجے میں بولا۔ ”ایک طوائف اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے؟ پھر بھی اس نے ہمیں یہ تو بتا دیا کہ فتح محمد ایک بھاری چٹان ہے۔“ سورج مل مرہٹہ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ وہ اپنے دشمن سے خوش گالیاں کھا کر بھی ہنستا رہتا تھا اور پھر گالیاں دینے والے کو اس زہریلے سانپ کی طرح ڈس لیتا تھا، جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ ”بس، اب تو اپنے گھر جا شانتی! تیرا کام ختم ہو چکا۔ ہم اس چٹان کو توڑنے کے لئے کوئی دوسرا تیشہ ڈھونڈ لیں گے۔“

شانتی خوش خوش گھر چلی گئی۔ اب وہ ایک پاکیزہ اور آزاد زندگی کے خواب دیکھ رہی تھی۔

فتح محمد، میسور سے کولار واپس آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے ایک معزز خاندان میں شادی کر لی۔ 1131ھ میں فتح محمد کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شہباز رکھا گیا۔ پھر 1132ھ میں دوسرا لڑکا، ولی محمد پیدا ہوا جو کچھ دن بعد ہی انتقال کر گیا۔ کولار میں فتح محمد کی مالی حالت بہتر نہیں تھی اس لئے وہ تلاش معاش میں سراپہنج گیا۔ سرا کے صوبے دار عبدالرسول خان نے اسے بالا پور کی قلعہ داری پر مقرر کیا۔ یہاں فتح محمد نے اپنی دیانت داری، ذہانت اور بہادری سے بڑی عزت حاصل کی۔ سرا کا صوبے دار اس پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ شیخ فتح محمد کے شب و روز انتہائی پرسکون انداز میں گزر رہے تھے کہ ایک واقعے نے اس کی زندگی میں نیا انقلاب برپا کر دیا۔

سرا کا نامور زمیندار، میر اکبر علی خان ایک خاندانی جاگیردار تھا۔ لیکن گردشِ وقت نے اُس کی معاشی حالت بگاڑ کر رکھ دی اور وہ صوبیدار سرا کا مقروض ہو گیا۔ میر اکبر علی خان بروقت زمین کا لگان ادا نہ کر سکا تھا۔ اس لئے صوبیدار نے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ علی اکبر خان نے آئندہ فصل کی آمد پر چھ ماہ کی مہلت طلب کی۔ صوبیدار سرا نے اس کی شرافت و نجابت کو دیکھ کر چشم پوشی کی۔ بد قسمتی سے اگلی فصل بھی خراب ہو گئی۔ نتیجتاً اکبر علی خان پر قرض کا بوجھ دوگنا ہو گیا۔ اس بار صوبیدار کے مطالبے میں شدت آ گئی۔ مجبوراً اکبر علی خان نے تمسک لکھ کر دے دیا جس کی نمایاں شرط یہ تھی کہ اگر میر علی اکبر خان چھ ماہ تک مطلوبہ رقم ادا نہ کر سکا تو پھر صوبیدار عبدالرسول خان کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اس کی جائیداد نیلام کر کے واجب الادا رقم حاصل کر لے۔

میر اکبر علی خان اپنے مالی وسائل کے باعث اس حقیقت سے باخبر تھا کہ وہ مقررہ مدت میں قرض کی ادائیگی نہ کر سکے گا۔ اور انجام کار اس کی جائیداد نیلام ہو جائے گی۔ چوراہے پر بزرگوں کی عزت کی بولیاں لگائے جانے کے تصور سے میر اکبر علی خان بیمار پڑ گیا۔ پھر یہی غم اسے دیکھ کی طرح اندر سے چاٹنے لگا۔ آخر معاہدے کے چار ماہ بعد اس غیرت مند زمیندار کا انتقال ہو گیا۔

چھ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد صوبیدار نے قرض کی وصولیابی کے لئے اپنے کچھ کارندوں کو میر اکبر علی خان کے علاقے میں بھیجا۔ وہاں صورتِ حال یکسر بدلی ہوئی تھی۔ کارندوں نے واپس آ کر صوبیدار کو بتا دیا کہ میر اکبر علی خان دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کی بیوہ قرض کی ادائیگی سے معذور ہے۔

صوبیدار نے اب کی بار شیخ فتح محمد کو اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ میر اکبر علی خان کی بیوہ کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے اور تمام جائیداد نیلام کر کے سرکاری مال گزاری حاصل کر لی جائے۔

شیخ فتح محمد ایک درد مند انسان تھا۔ اسے صوبیدار کا یہ جارحانہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔ اس

مگر دیوانے رائے اور سورج مل نے اس کی آنکھوں سے سارے خواب چھین لئے۔ دربار میسور کے فتنہ گر اس عورت کو کس طرح زندہ رہنے دیتے جو ان کے ایک خوف ناک منصوبے میں شریک رہ چکی تھی۔ آخر شنائی کو اس حالت میں قتل کر دیا گیا جب وہ خفیہ طور پر مسلمان ہو چکی تھی۔ جب شیخ فتح محمد نے یہ خبر سنی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کسی قریبی عزیز کو قتل کر دیا گیا ہو۔ دربار میسور کے فتنہ گر اس کے تصور سے بھی زیادہ عیار ثابت ہوئے تھے۔ شیخ فتح محمد نے شنائی کے حق میں دعائے خیر کی اور اپنے پیچھے شیخ حیدر سے ملا۔

”میری اوجھ سے ایک بے گناہ عورت کی جان چلی گئی۔“ فتح محمد نے بڑے کرب ناک لہجے میں اپنے پیچھے، شیخ حیدر کو شنائی کے قتل کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”اہل میسور کو اس کی موت کا غم نہیں ہو گا کہ وہ ان کی نظروں میں محض ایک طوائف تھی۔ مگر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ مرنے سے پہلے مسلمان ہو گئی تھی۔“

شیخ حیدر کو سکستہ سا ہو گیا۔

”اب میں یہاں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹھہروں گا۔“ اچانک فتح محمد کے لہجے سے نفرت و غضب کی آگ برسنے لگی۔

”ہاں چچا! آپ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔“ شیخ حیدر بدحواسی کے عالم میں بول رہا تھا۔ ”میں پہلے ہی کہتا تھا کہ ان فتنہ گروں کے ہاتھ بہت دراز ہیں۔ انہوں نے شنائی کو قتل کر کے تمہیں تسمیہ کی ہے۔“

”کیسی تسمیہ؟“ فتح محمد کی آواز میں شدید غصے کی آمیزش تھی۔

”یہی کہ وہ شنائی کی طرح تمہیں بھی.....“ شیخ حیدر نے بات نامکمل چھوڑ دی تھی۔

”میں موت سے ڈر کر نہیں جا رہا ہوں۔“ فتح محمد کے لہجے میں وہی آگ تھی۔ ”میں اس لئے جانا چاہتا ہوں کہ یہاں رہ کر ضبطِ غم سے میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ تمہاری ملازمت بھی خطرے میں پڑ جائے اور یہ فتنہ گر میرے رشتے کے حوالے سے تمہیں بھی جانی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔“

شیخ حیدر بھی چاہتا تھا کہ جلد از جلد سازش کے اس طوفان کا زور ٹوٹ جائے۔ اس لئے گفتگو کے دوران بار بار اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتا رہا۔

پھر شیخ فتح محمد دربار میں حاضر ہوا اور اس نے اپنی دستار اتاری اور تلوار کھول کر راجہ کرشنا کے قریب تخت پر رکھ دی۔

میسور کا حکمران بار بار ترکِ ملازمت کا سبب دریافت کرتا رہا مگر فتح محمد کا ایک ہی جواب دیا۔ ”میرے گھر یلو مسائل مجھے وطن سے دور رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔“

پھر جب فتح محمد دربار سے جانے لگا تو شیخ حیدر نے دیکھا کہ دیوانے رائے، سورج مل اور دوسرے فتنہ گروں کے ہوتوں پر ایک خبیث مسکراہٹ قہقہہ کر رہی تھی۔



کے پیروں میں فرض کی زنجیر تھی اور زنجیر صوبیدار سرا کے ہاتھوں میں تھی۔ مجبوراً شیخ فتح محمد، میر اکبر علی خان کے علاقے کی طرف کھینچتا چلا گیا۔

پھر جب اس نے مرحوم جاگیردار کی بیوہ سے گفتگو کی تو حیران رہ گیا۔

”آپ سب کچھ نیلام کر دیجئے۔ میں جھو بیدار سے کسی رعایت کی طلب گار نہیں۔“ میر اکبر علی خان کی بیوہ کے لہجے میں بڑی استقامت تھی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ صوبیدار خان صاحب، مرحوم پر رحم کھائے اور پھر یہاں کے لوگ میرے شوہر کی قبر کی طرف اشارے کر کے کہیں کہ وہ سو رہا ہے میرا اکبر علی خان، سرکار کا مراعات یافتہ۔“

شیخ فتح محمد ایک بیوہ خاتون کے لہجے کا یہ طعراق دیکھ کر بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ اس موضوع پر کل بات کرے گا۔

شیخ فتح محمد نے پوری رات جاگ کر گزاری۔ وہ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ فتح محمد نے مقامی لوگوں سے سنا تھا کہ ایک جوان لڑکی کے علاوہ میر اکبر علی خان مرحوم کی کوئی دوسری اولاد نہیں ہے۔ وہ رات بھر یہی سوچتا رہا کہ خان صاحب کی جائیداد نیلام ہونے کے بعد ان کی غیرت مند بیوہ اور عفت مآب بیٹی کہاں سر چھپاتی پھریں گی؟ اور ایسے سنگین لمحات میں کون انہیں پناہ دے گا؟ آخر طویل غور و فکر کے بعد شیخ فتح محمد ایک خاص نتیجے پر پہنچ گیا۔

دوسرے دن اس نے میر اکبر علی خان کی بیوہ سے انتہائی نیاز مندانہ لہجے میں کہا۔

”اگر آپ مجھے اپنی فرزندگی میں قبول فرمائیں تو میں یہ ساری رقم ادا کر دوں گا۔“ جیسے ہی شیخ فتح محمد کی بات مکمل ہوئی، پردے کے پیچھے سے بیوہ اکبر علی خان کی تیز کراہ اُبھری۔ ”تمہاری ہمدردیاں بھی تجارت کی خوب صورت قبائلی لپٹی ہوئی ہیں۔“ شدت کرب سے لاوارث خاتون کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ ”تم سے تو بہتر صوبیدار عبدالرسول خان ہے، جس نے کھلی تجارت کی۔ مگر تم غم گساری کے لباس میں سوداگر بن کر آئے۔ اب کون کس پر اعتبار کرے گا؟“

”محترم خاتون! آپ نے میری بات سمجھنے میں غلطی کی۔“ شیخ فتح محمد رک رک کر بول رہا تھا۔ ”اللہ میری نیت کو خوب جانتا ہے۔ اسی کی ذات بے نیاز کی قسم! میں خان صاحب مرحوم کے گھرانے کی مجبوریاں خریدنے نہیں بلکہ اپنے آپ کو اس حویلی کے دروازے پر فروخت کرنے آیا ہوں۔“

بیوہ اکبر علی خان کی غلط فہمی دور ہو گئی اور انہوں نے کسی تاخیر کے بغیر شیخ فتح محمد سے اپنی بیٹی مجیدہ بیگم کی شادی کر دی۔



1722ء میں ضلع کو لار کے ایک چھوٹے سے قصبے بوری کوٹ کے مقام پر مجیدہ بیگم کے بطن سے ایک خوب صورت لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس علاقے کے مشہور درویش حیدر علی شاہ کے نام

پر حیدر علی رکھا گیا۔ بچے کی پیدائش سے پہلے مجیدہ بیگم نے حیدر علی شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ درخواست کی تھی۔

”بابا! میرے حق میں دعا فرمائیے کہ اللہ مجھے خوش بخت اور نیک فرزند عطا کرے۔“

”بی بی! لڑکیاں بھی تو اللہ کی نعمت ہوتی ہیں۔“ حیدر علی شاہ نے دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ مجیدہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”بابا! میں جانتی ہوں، اللہ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔“ مجیدہ بیگم لا جواب ہو کر رہ گئی تھی۔

”پھر لڑکے کے لئے اصرار کیوں؟“ حیدر علی شاہ نے پوچھا۔

”میرے والد مرحوم کی کوئی اولاد نہ رہے تھی۔“ یہ کہتے کہتے مجیدہ بیگم رونے لگی۔ ”بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے میری والدہ محترمہ نے بڑے آزار برداشت کئے تھے۔“

درویش حیدر علی شاہ بہت دیر تک مجیدہ بیگم کو یہ راز سمجھاتے رہے کہ اکثر بیٹے بھی ماں باپ کے لئے باعث آزار بن جاتے ہیں مگر اس کا یہی اصرار تھا کہ وہ ایک صالح اور خوش نصیب بیٹے کے لئے دعاؤں کی طلب گار ہے۔

آخر حیدر علی شاہ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر مجیدہ بیگم سے کہا۔

”جب خدا تجھے فرزند کی دولت سے سرفراز کر دے تو اس کا نام میرے نام پر رکھنا اور اسے ایک بار میرے پاس ضرور لے کر آنا۔“

کچھ دن بعد شیخ فتح محمد اور مجیدہ بیگم اپنے نومولود بیٹے حیدر علی کو لے کر درویش حیدر علی شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بزرگ بہت دیر تک اس بچے کو دیکھتے رہے، جس کا چہرہ غیر معمولی طور پر روشن تھا اور پیشانی کشادہ تھی۔ پھر حیدر علی شاہ نے عجیب سی مستی کے عالم میں فرمایا۔ ”ایک وقت میں ایک ہی حیدر علی رہ سکتا ہے۔“

شیخ فتح محمد اور مجیدہ بیگم ایک درویش کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھے۔ مگر کچھ دن بعد حیدر علی شاہ کا انتقال ہو گیا تو انہیں درویش کے الفاظ کی گونج سنائی دی۔

”ایک وقت میں ایک ہی حیدر علی رہ سکتا ہے۔“

اس واقعے سے شیخ فتح محمد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا نومولود بیٹا، حیدر علی کوئی عام بچہ نہیں ہے۔ وہ اکثر مجیدہ بیگم سے کہا کرتا تھا۔

”مجھے تو سرکاری کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ مگر تم حیدر علی کی تربیت سے بے خبر نہ ہو جانا کہ یہ دنیا میں آیا اور حیدر علی شاہ دنیا سے چلے گئے۔ یقیناً یہ کوئی راز ہے۔ لیکن میں اپنی کم علمی کے سبب اس راز کو سمجھنے سے عاجز ہوں۔“



ابھی حیدر علی صرف پانچ سال کا تھا کہ وقت نے عجیب انداز سے کروٹ لی۔ ایک دن

کچھ دیر بعد دیوں بلی کے محاصرے میں شیخ حیدر زخمی ہو کر انتقال کر گیا مگر اس وقت تک یہ دونوں بھائی اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے تھے۔



حیدر علی ذہین بھی تھا اور خوش گفتار بھی۔ اس نے بہت جلد وزیر نندراج کے دل میں گھر کر لیا۔ یہاں تک کہ نندراج نے ایک محترم اور عالی نسب شخص پیر زادہ شاہ میاں کی بیٹی سے حیدر علی کی شادی کرادی۔ اس وقت حیدر علی کی عمر انیس سال تھی۔ شادی کے تمام اخراجات خود وزیر اعظم میسور نے ادا کئے تھے۔

ایک سال بعد حیدر علی کے ایک لڑکی پیدا ہوئی مگر بے احتیاطی کے سبب اس کی بیوی فالج کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ پھر جب بیماری نے طویل کھینچا تو اس نے حیدر علی کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دے دی۔

1743ء میں حیدر علی نے میر علی رضا خان کی ہمیشہ فاطمہ بیگم سے دوسری شادی کر لی۔ حیدر علی کو عام انسانوں کی طرح اولاد زینہ کی شدید خواہش تھی مگر آٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا تھا۔ آخر حیدر علی کی والدہ، مجیدہ بیگم درویش حیدر علی شاہ کے مزار پر حاضر ہوئیں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ با آواز بلند کہا۔

”آپ کا یہ فرمان تو پورا ہو چکا کہ ایک وقت میں ایک ہی حیدر علی رہ سکتا ہے۔ مگر جو حیدر علی دنیا میں موجود ہے، وہ بہت بے سکون ہے۔“ اسی رات مجیدہ بیگم نے درویش حیدر علی شاہ کو خواب میں دیکھا۔ بزرگ نہایت مہربان لہجے میں فرما رہے تھے۔

”حیدر علی سے کہو کہ وہ ٹیپوستان کے دربار میں حاضری دے۔ پھر اُسے سکون مل جائے گا۔“

اس بشارت کے بعد حیدر علی بعد احترام و عقیدت ارکاٹ پہنچا اور حضرت ٹیپوستان کے مزار پر حاضر ہوا۔ اس نے گریہ و زاری کے ساتھ وہ دعا کی، جو حضرت ذکریا علیہ السلام نصف شب کے سنائے میں مانگا کرتے تھے۔

”اے میرے رب! مجھے تہانہ چھوڑ کہ تُو بہتر وارث دینے والا ہے۔“

پھر 1752ء میں دیوں بلی کے مقام پر حیدر علی کے یہاں ایک خوب صورت لڑکا پیدا ہوا۔ (دیوں بلی، شمال مشرق کی جانب بنگلور سے بائیس میل دور ایک مشہور قصبہ ہے) حیدر علی نے حضرت ٹیپوستان کی نسبت سے اپنے بیٹے کا نام فتح علی ٹیپو سلطان رکھا۔



ٹیپو سلطان کی پیدائش کے وقت حیدر علی ایک عام فوجی افسر تھا لیکن بیٹے کی ولادت کی

اچانک شیخ فتح محمد کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت شہباز کی عمر دس سال تھی۔

”مجیدہ بیگم! اب تمہاری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔“ فتح محمد نے سوگوار لہجے میں کہا۔

”شہباز کو یہ احساس نہ ہونے دینا کہ تم اس کی سوتیلی ماں ہو۔“

مجیدہ بیگم نے شہباز کو اس طرح سینے سے لگالیا کہ اس کی آغوش کی گرمی حقیقی ماں جیسی تھی۔ ابھی اس الم ناک واقعہ کو ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ سرا کی صوبے داری کے لئے عبدالرسول خان اور نواب طاہر محمد خان میں جنگ چھڑ گئی۔ شیخ فتح محمد، عبدالرسول خان کی حمایت کر رہا تھا۔ نواب طاہر محمد خان کو کامیابی حاصل ہوئی اور شیخ فتح محمد میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

مجیدہ بیگم پر آفات و مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک بیوہ اور دو معصوم بچے۔ ہر طرف بے چارگی و محرومی کا گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ابھی عدت کا زمانہ بھی نہیں گزرا تھا کہ عباس قلی خان کے کارندے سرکاری رقم کی وصولیابی کے لئے مجیدہ بیگم کے گھر آ پہنچے۔ عباس قلی خان، بالا پور کا حاکم تھا اور جنگ میں نواب طاہر محمد خان کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی مجیدہ بیگم سے اٹھارہ ہزار روپے کی ادائیگی کا مطالبہ کر دیا۔ یہ وہ رقم تھی جو کسانوں سے وصول کرنے کے بعد شیخ فتح محمد کو سرکاری خزانے میں جمع کرنی تھی۔ مگر عباس قلی خان نے اپنی دانشمنی نکالنے کے لئے غیر وصول شدہ رقم، فتح محمد کے حساب میں درج کر دی۔ مجیدہ بیگم نے پورے زور و شور کے ساتھ اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا مگر اس کی فریاد سننے والا کون تھا؟ شیخ فتح محمد قبر میں سو رہا تھا اور صوبیدار عبدالرسول خان جنگ ہار چکا تھا۔ پھر کون ایک بیوہ کی مدد کو آتا۔

آخر عباس قلی خان کے حکم پر مجیدہ بیگم کے گھر کا تمام اثاثہ لوٹ لیا گیا۔ اس کے کارندے کھانے کا اناج اور استعمال کے کپڑے تک اٹھا کر لے گئے۔ ظلم کا یہ سلسلہ اسی مقام پر ختم نہیں ہوا۔ عباس قلی خان نے شیخ فتح محمد کے دونوں بیٹوں شہباز اور حیدر علی کو دو بڑے بڑے نقاروں میں بند کر کے ان پر چڑا منڈ وادیا اور ہوا جانے کے لئے نقاروں میں سوراخ کر دیئے گئے۔

مجیدہ بیگم نے اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے ایک ہمدرد پڑوسی کو شیخ حیدر کے پاس میسور بھیجا۔ شیخ حیدر اپنے جانباز چچا کا انجام اور چھوٹے بھائیوں کی حالت زار سن کر رو پڑا۔ اس نے فوراً ہی اٹھارہ ہزار روپے ادا کر کے شہباز اور حیدر علی کو عباس قلی خان کی قید سے چھڑایا۔ پھر مجیدہ بیگم اور دونوں بچوں کو اپنے پاس سرنگاپٹم بلا لیا۔

شہباز اور حیدر علی اس زمانے کی رسم کے مطابق کسی مدر سے میں جانے کے بجائے شہسواری، شمشیر زنی، تیر اندازی اور دیگر فنون حرب سیکھنے لگے۔

دونوں بھائی فطرتاً ذہین اور بہادر تھے اس لئے بہت جلد میسور کے تمام سپاہیوں میں نمایاں نظر آنے لگے۔ اس وقت راجہ کرشنا دوم میسور کا حکمران تھا۔ مگر پردہ سارے اختیارات وزیر نندراج کو حاصل تھے۔ شیخ حیدر، شہباز اور حیدر علی کو نندراج کے پاس لے گئے جس نے انہیں چھوٹے فوجی دستوں کا افسر مقرر کر دیا۔

کے دو اہم مہرے تھے۔ وزیراعظم میسور جانتا تھا کہ مسلمان فوجی ہی میسور کی سرحدوں کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ان ہی کے ذریعے ان کے اقتدار کو استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی فوج میں مسلمان سپاہیوں کی بھرتی عام کر دی تھی اور اسی بنیاد پر وہ حیدر علی کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

وزیراعظم نندراج کا یہ نیارنگ دیکھ کر حیدر علی شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ دو آقاؤں کے درمیان گھرا ہوا ایک ادنیٰ خدمت گار تھا اور ہر آقا اُسے اپنی ذات کے لئے وفادار رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یکایک حیدر علی کی سماعت میں راجہ کرشنا کے وہ الفاظ گونجنے لگے، جب میسور کے حکمران نے ملازمت کے بعد اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا ”حیدر علی! میں جانتا ہوں کہ تم مسلمان ہو۔ اور ایک مسلمان کسی بھی حالت میں بددیانت نہیں ہوتا۔“ جواب میں حیدر علی نے چونک کر میسور کے حکمران کی طرف دیکھا تھا۔

”تم ہمیشہ میرے وفادار رہو گے اور اگر کبھی وقت پڑا تو ریاست کے دفاع کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دو گے۔“ راجہ کرشنا نے ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

”میں ایک سپاہی کے فرائض سے بخوبی آگاہ ہوں۔“ حیدر علی نے جوابا کہا تھا۔ ”بلند و بانگ دعوے کرنا ایک سپاہی کا شعار نہیں ہوتا۔ پھر بھی آپ دیکھیں گے کہ میں ریاست میسور کی خدمت کس طرح کرتا ہوں۔“ گویا حیدر علی نے راجہ کرشنا کے سامنے اپنی وفاداری کا حلف اٹھا لیا تھا۔

پھر جب حیدر علی، راجہ کی خلوت سے باہر آیا تھا تو وزیراعظم نندراج نے اُسے تنہائی میں طلب کرتے ہوئے وہی الفاظ دہرائے تھے۔

”تم میسور کی داخلی سیاست کے بیچ دخم میں الجھنے کے بجائے صرف میرے وفادار رہو گے۔ میں ریاست کا نگران اعلیٰ ہوں، اس لئے میری وفاداری دراصل ریاست ہی کی وفاداری ہے۔“ حیدر علی نے اپنی ملازمت کے آغاز میں راجہ کرشنا اور وزیراعظم نندراج کی باتوں کو محض ایک رسمی کارروائی سے تعبیر کیا تھا۔ مگر جیسے جیسے دن گزرتے گئے، اسے اندازہ ہوتا چلا گیا کہ میسور کی حدود کے اندر بھی ایک جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اور اس جنگ میں راجہ کرشنا اور نندراج دو حریفوں کی مانند ایک دوسرے کے مقابل صف آراء ہیں۔

پھر آہستہ آہستہ راجہ کرشنا پسپا ہوتا چلا گیا۔ وہ بظاہر میسور کا خود مختار حکمران تھا۔ مگر در پردہ سارے اختیارات نندراج کی ذات کے گرد سمٹ کر رہ گئے تھے۔

حیدر علی بنیادی طور پر راجہ کرشنا ہی کا طرف دار تھا اور اسے اپنا محسن سمجھتا تھا۔ مگر انتظامی امور میں سارا عمل ڈل نندراج کا تھا، اس لئے وہ اسی کا تابع ہو کر رہ گیا تھا۔

ٹیپو سلطان کے عقیقے کی تقریب میں راجہ کرشنا اور نندراج کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ وزیراعظم میسور کی یہ نوازشات بے سبب نہیں تھیں۔ نندراج اسے مکمل طور پر خرید کر

خوشی میں اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر جشن منایا۔ اس تقریب میں وزیراعظم میسور، نندراج بھی بہ نفس نفیس شریک ہوا۔ اس نے حیدر علی کو بہت سے قیمتی تحائف دیئے اور اپنے ہاتھ سے ٹیپو سلطان کو سونے کا ایک خوبصورت ہار پہنایا۔ پھر بڑے پرجوش لہجے میں اپنے فوجی افسر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

”حیدر علی! بھگوان نے تجھے تیری زندگی کی سب سے بڑی دولت بخش دی کہ اس دولت کے بغیر انسان ادھر رہے۔ آج تو مکمل ہو گیا۔ میں تیری اس خوشی میں اپنے جذبوں کی سچائی کے ساتھ شریک ہوں۔ تیرے بیٹے پر ہمیشہ دیوتاؤں کا سایہ رہے۔“

وزیراعظم نندراج اپنی مذہبی رسموں کے مطابق ٹیپو سلطان کو درازی عمر اور بلند اقبالی کی دعائیں دے رہا تھا۔ مگر حیدر علی کے چہرے پر اُدا سی چھائی ہوئی تھی۔ نندراج نے اُس کا سبب پوچھا تو وہ خاموش نہ رہ سکا۔

”میں نے اس تقریب میں شرکت کے لئے مہاراج سے بھی درخواست کی تھی۔ مگر نہ وہ خود تشریف لائے اور نہ اپنے کسی نمائندے کو بھیجا۔“ حیدر علی کے لہجے سے کرب نمایاں تھا۔

”انہیں میری خوشی اور حوصلہ افزائی کے لئے ہر حال میں یہاں آنا تھا۔ ان کے محل سے میرے مکان تک کا فاصلہ ہی کتنا ہے؟ بالفرض یہ فاصلہ زیادہ بھی ہوتا تو اس سے کیا فرق پڑتا؟ ان کے برق رفتار گھوڑے اور کس دن کام آتے؟ میں مہاراج کا نمک خوار ہوں۔ ان کے اقتدار کے لئے خون بہاتا ہوں اور ہر وقت اپنی جان تھیلی پر لئے پھرتا ہوں۔ مگر وہ.....“ حیدر علی نے بظاہر اپنی بات نامکمل چھوڑ دی تھی لیکن وزیراعظم نندراج سمجھ گیا تھا کہ یہ جاننا ز سپاہی کیا کہنا چاہتا ہے۔

”مہاراج کا خیال ہے کہ تم میرے آدمی ہو، اس لئے وہ تم سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔“ نندراج نے مسکراتے ہوئے حیدر علی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”مگر تمہیں کس بات کی فکر ہے؟ تم میرے ہاتھ مضبوط کرو۔ پھر دولت بھی تمہارے قدم چومے گی اور عہدہ و منصب بھی تمہاری غلامی کریں گے۔“

حیدر علی، میسور کی داخلی سیاست اور اقتدار کی کشمکش سے کسی حد تک واقف تھا مگر آج وزیراعظم کی گفتگو نے کئی اور خفیہ گوشے بے نقاب کر دیئے تھے۔ نندراج ایک ذہین سیاست دان تھا۔ اس نے اپنی شاطرانہ چالوں سے راجہ کرشنا کو ڈیر دوم کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ نندراج احکام جاری کرتا اور میسور کا حکمران سرکاری کاغذات پر مہر لگاتا۔ راجہ کرشنا ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونے کی بہت کوشش کرتا مگر اس کی حالت دلدل میں پھنسے ہوئے اس شخص کی سی تھی، جو ذرا سی حرکت کے ساتھ مزید گہرائی میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ حکومت کے ہر شعبے پر نندراج کے اپنے آدمی قابض تھے۔ اور وہ راجہ کرشنا کے ساتھ کئی سال سے شطرنج کے کسی مہرے کی طرح سلوک کر رہا تھا۔ حیدر علی اور اس کا بڑا بھائی شہباز بھی نندراج کی بساط سیاست



لئے حاضر ہوا تھا۔

دعا کے بعد حیدر علی نے حضرت ٹیپوستان کی درگاہ کے مجاور کو کچھ تحائف پیش کئے اور مزار کے گرد جمع ہو جانے والے ضرورت مندوں میں نقد رقم تقسیم کی۔ پھر وہ سرنگا پٹم لوٹ آیا۔



حیدر علی کے خاندان والے اسے بچپن میں منحوس کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ جب وہ پانچ سال کا تھا تو اس کا باپ شیخ فتح محمد میدان جنگ میں مارا گیا تھا اور اسی واقعے کو بنیاد بنا کر لوگوں نے حیدر علی کی قسمت سے نحست کو وابستہ کر دیا تھا۔ پھر شیخ فتح محمد کے قتل کے بعد بھی جب آفات و مصائب کا سلسلہ جاری رہا تو بڑے تحقیر آمیز انداز میں یہ پیش گوئی کی گئی کہ فتح محمد کا گھرانہ ہمیشہ کے لئے ذلت و بربادی کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ کچھ کہنے والوں کی زبانیں یہاں تک دراز ہو گئیں کہ اب فتح محمد کے بیٹے اور میر اکبر علی خان کے نواسے یا تو در در کی خاک چھانٹتے ہوئے بھوکے مانگیں گے یا پھر کسی جاگیردار کی ملازمت اختیار کر کے غلامانہ زندگی بسر کریں گے۔ شیخ فتح محمد کی بیوہ مجیدہ بیگم نے برسوں اپنے عزیز واقارب کی یہ دل آزار باتیں سنیں اور شب و روز خون کے گھونٹ پیئے۔ پھر جب اس کے دونوں بیٹے شہباز اور حیدر علی، فنون سپہ گری سیکھنے کے بعد راجہ میسور کی فوج میں باعزت عہدوں پر فائز ہو گئے تو ان تحقیر آمیز باتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

مجیدہ بیگم بیک وقت کئی غموں کی آگ میں جلی تھی۔ پچیس چھپیس سال کی عمر میں کسی عورت کا بیوہ ہو جانا ہی اتنا بڑا غم تھا کہ اسے برداشت کرتے کرتے پتھر بھی پکھل جاتے ہیں۔ پھر گھر کی چار دیواری تک کا نیلام ہو جانا اور سب سے بڑھ کر اولاد کا تاریک مستقبل..... غموں کا یہی وہ سمندر تھا، جسے مجیدہ بیگم تنہا ہی رہی تھی۔ فتح محمد کے انتقال کے بعد اکثر عزیزوں اور محلے داروں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر کے آسودہ حال زندگی بسر کرے۔ مجیدہ بیگم ایک انتہائی خوب صورت عورت تھی۔ شوہر کے قتل کے بعد کئی جاگیرداروں اور زمینداروں نے اس سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ خود مجیدہ بیگم کا تعلق بھی ایک بڑے جاگیردار خاندان سے تھا۔ اس لئے وہ جاگیرداروں کی ابواش و فطرت سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے اپنے خاندان میں بھی ایسے کئی مظاہرے دیکھے تھے کہ ایک شخص کی چار چار بیویاں تھیں اور وہ سب کی سب کنیزوں اور لونڈیوں کی طرح زندگی گزار رہی تھیں۔ شوہر ساغر و صراحی اور سیم تن رقاصوں سے اپنی راتیں روشن کر لیتے اور مظلوم بیویاں کانٹوں کی تیج پر سلگتی رہتیں۔

مجیدہ بیگم نے شادی کا پیغام دینے والے عزیزوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔  
”میں کسی رنگین مزاج جاگیردار کو یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ مجھے ایک غم زدہ عورت سمجھ کر خود غرضانہ ہمدردیوں کا اظہار کرے اور پھر اپنے گھر کی باندی بنالے۔ اگر کوئی مرد پارسا بھی شادی کا پیغام بھیجتا تو میں اس رشتے کو ٹھکرا دیتی۔ بس جو ہونا تھا، ایک بار ہو چکا۔ میرے لئے

اپنے اقتدار کا استحکام چاہتا تھا۔ حیدر علی کو راجہ کرشنا کی عدم شرکت سے بہت تکلیف پہنچی تھی مگر اس نے اپنی فطری ذہانت سے کام لیتے ہوئے اس سیاسی طوفان کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔  
”میں آپ کے لطف و عنایت کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔“ حیدر علی نے مندرجہ بالا کے دیئے ہوئے قیمتی تحائف کا شکریہ ادا کیا۔

”ان کی کیا حیثیت ہے حیدر علی؟“ مندرجہ بالا نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اور بھی قیمتی تحائف تمہارا انتظار کد ہے ہیں۔“  
یہ کہہ کر وزیر اعظم میسور اپنے محل کی طرف چلا گیا۔ اور حیدر علی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا جو دو اثر دھوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔



تقریب ختم ہوتے ہی حیدر علی نے تمام خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور ٹیپو سلطان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جو اس کے خوابوں کی تعبیر تھا۔  
ٹیپو کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور پُر آب ہونے کی وجہ سے ان میں ایک خاص چمک تھی۔ رنگ کھلتا ہوا گندی تھا، ناک خم دار تھی اور چہرے کے خدو خال بہت زیادہ نازک تھے۔ اور سب سے زیادہ نمایاں بات یہ کہ ٹیپو کے ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے۔ جسمانی اعتبار سے مجموعی طور پر وہ ایک خوب صورت بچہ تھا۔ مگر حیدر علی اپنے فرزند کی ظاہری نزاکت دیکھ کر پریشان سا ہو جاتا تھا اور اکثر اپنی شریک حیات فاطمہ بیگم کو مخاطب کر کے کہتا تھا۔  
”میں ٹیپو کو ایک سخت جان سپاہی بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ نرم و نازک بچہ شمشیر اور گرز کا بوجھ کس طرح برداشت کر سکے گا؟“

”آپ ابھی سے کیوں پریشان ہوتے ہیں؟“ فاطمہ بیگم شوہر کی باتیں سن کر مسکرانے لگیں۔ ”جس نے اسے پیدا کیا ہے، وہی طاقت و استقامت بھی بخشے گا۔“  
”مگر ظاہری آثار بھی تو کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔“ حیدر علی اپنی بیوی سے بحث کرنے لگتا۔  
”ٹیپو سپاہی زادہ نہیں، کسی شاعر کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔“  
پھر جب ٹیپو ایک سال کا ہو گیا تو حیدر علی اسے اپنے ہمراہ لے کر دوبارہ ارکاٹ پہنچا اور حضرت ٹیپوستان کے مزار پر حاضر ہوا۔

”اے اللہ! میرے اس بیٹے کو تیرے ایک ولی کے نام نامی سے نسبت ہے۔“ حیدر علی انتہائی پُرسوز لہجے میں دعا مانگ رہا تھا۔ ”اس نرم و نازک گلاب کو وقت کی خونی آندھیوں سے محفوظ رکھ کہ اول و آخر تو ہی اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔ ٹیپو کو اسلام کا سپاہی بنا کر اسے آہنی اعصاب بخش دے کہ تمام طاقتوں کا سرچشمہ تیری ہی ذات لم یزل ہے۔“  
موصوم ٹیپو بڑی حیرت سے کبھی اپنے باپ کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتا اور کبھی زائرین کے اس ہجوم کو جو حضرت مستان کی بارگاہ جلال میں عقیدت کے پھول نذر کرنے کے

نمایاں تھے۔ ہر قوم نے اس زرخیز خطے میں قدم بھانے اور ”سونے کی چٹیا“ کو پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی صرف انگریزوں اور فرانسیسیوں کو حاصل ہوئی۔ ان دونوں قوموں کی سیاست کا تقریباً ایک ہی انداز تھا کہ ہندوستان کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجاؤں اور نوابوں کو ایک دوسرے سے لڑایا جائے۔ پھر جو کمزور پڑے، اسے بھاری قیمت کے عوض جدید اسلحہ اور فوجی طاقت فراہم کی جائے۔ اور جب وہ جنگ میں غالب آجائے تو اپنے علاقے کے سارے وسائل انگریزوں یا فرانسیسیوں کے پاس رہن رکھ دے اور خود ہمیشہ کے لئے غلامی کا طوق پہن لے۔

ہندوستان کے خود غرض اور عاقبت ناندیش حکمران ان بازی گروں کے اشاروں پر رقص کر رہے تھے۔ اور یہ ”سفید کیکڑے“ آہستہ آہستہ سونا اگلنے والی زمین پر اپنی گرفت مضبوط کرتے جا رہے تھے۔ اس وقت انگریزی کمپنی کا منتظم وارن ہیسٹنگز تھا اور فرینچ کمپنی، ڈوہلی کے نگرانی میں کام کر رہی تھی۔ فرانسیسیوں نے اپنی تمام تر توجہ جنوبی ہندوستان پر مرکوز کر دی تھی لیکن انگریز بنگال، بمبئی، جنوبی ہند، غرض ہر طرف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے تمام جانشین انتہائی نااہل ثابت ہوئے اور عظیم مغلیہ سلطنت بہت تیز رفتاری سے اپنے زوال کا سفر طے کرنے لگی۔ جب دوسرے طالع آزمائوں کو دہلی پر ”مرد بیمار“ کا لگان ہونے لگا تو مرہٹوں اور نظام الملک اول والی حیدر آباد دکن نے شہنشاہیت کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ نظام الملک تو اپنے خواب کی تعبیر حاصل نہ کر سکا لیکن مرہٹے اپنی کوششوں میں اس قدر کامیاب ہوئے کہ ایک طرف پنجاب سے لے کر بنگال تک اور دوسری طرف جنوبی ہندوستان میں تھاجور تک ان کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اس کے برعکس نظام الملک کے اقتدار کا دائرہ صرف حیدر آباد اور اس کے مضافات تک سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اگر احمد شاہ ابدالی پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی قسمت کا فیصلہ نہ کر دیتا تو بہت ممکن تھا کہ شیواجی کی قوم پورے ہندوستان پر اپنا پرچم لہرا دیتی۔

جنوبی ہندوستان (صوبہ کرناٹک) میں نوابین ارکاٹ شاہان مغلیہ کی نیابت کر رہے تھے۔ جب تک دہلی میں کچھ نہ کچھ طاقت باقی تھی، اس وقت تک دکن کا صوبیدار ہی نوابین ارکاٹ کی تاجرگی کرتا تھا۔ مگر نادر شاہ درانی نے 1738ء میں دہلی کی رہی سہی قوت بھی تباہ کر ڈالی۔ اس قتل عام کے بعد مرہٹوں نے آگے بڑھ کر کرناٹک پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر طویل خوزیر جنگوں کے بعد نظام الملک نے مرہٹوں کو اس علاقے سے بے دخل کر کے میر انوار الدین کو ارکاٹ کا نواب بنادیا۔

1743ء تک ارکاٹ پر نواب سعادت اللہ خان کا خاندان حکومت کرتا تھا۔ اس خاندان کا آخری نواب، محمد سعید خان تھا جو 1740ء میں تخت نشین ہوا اور 1743ء میں ارکاٹ کی حکومت سے محروم ہو گیا۔ محمد سعید خان ایک کم عمر لڑکا تھا، جسے اس کے خاندان والے ناپسند کرتے تھے۔

فتح محمد کی یادیں ہی بہت ہیں۔ اس جیسے وفادار اور جانناز شوہر کے بعد کسی ساتھی کی آرزو کرنا میرے نزدیک گناہ ہے۔“

پھر مجیدہ بیگم نے اپنے بچوں کے جوان ہونے تک ایسی بے داغ زندگی بسر کی کہ بدترین دشمن بھی اس کے کردار پر انگلی تک نہ اٹھا سکے۔

پھر جب ٹیپو سلطان پیدا ہوا تو شدت جذبات سے مجیدہ بیگم بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ حاسد اور بدخواہ اس موقع پر بھی خاموش نہ رہ سکے۔ کہنے والوں نے بڑے جارحانہ انداز میں کہا۔

”حیدر علی پیدا ہوا تو شیخ فتح محمد قتل ہو گیا..... اور اب ٹیپو پیدا ہوا ہے تو.....“

مجیدہ بیگم نے بڑے اذیت و کرب کے ساتھ لوگوں کی باتیں سنیں اور پھر وہ روز و شب ایک ہی دعا مانگنے لگی۔

”اے ہمیشہ قائم رہنے والے! میرے شوہر کی نسل کو بے نام و نشان نہ کرنا۔“

مجیدہ بیگم کی دعائیں جاری رہیں اور حاسدوں کا گروہ اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ کب شیخ فتح محمد کے گھر پر کوئی مصیبت نازل ہو اور ٹیپو سلطان بھی دنیا والوں کی نظر میں ایک منحوس بچہ قرار پائے۔“



ارکاٹ میں حضرت ٹیپو مستان کے مزار پر حاضری دینے کے بعد جیسے ہی حیدر علی سرنگا پٹم واپس آیا، ایک خونی معرکہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

ریاست میسور کے علاقے پائین گھاٹ میں شورش برپا ہو گئی۔ باغیوں کا اس قدر زور تھا کہ ریاست کی سلامتی کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ مجبوراً وزیر اعظم نندراج، حیدر علی کو اپنے ہمراہ لے کر سرنگا پٹم سے باہر نکلا۔ باغیوں سے کئی جنگیں ہوئیں اور ہر جنگ میں کامیابی کا سہرا حیدر علی کے سر رہا۔ نندراج نے خوش ہو کر حیدر علی کو ”ڈنڈیگل“ کا گورنر بنادیا۔ اب وہ چار ہزار سپاہیوں اور ڈیڑھ ہزار سواروں کا فوجی افسر تھا۔ اس کے ساتھ ہی حیدر علی کو ہاتھی، نقارہ اور پاکی رکھنے اور اپنی فوج بھرتی کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی تھی۔

جب حیدر علی، گورنر کے عہدے کا حلف اٹھا رہا تھا تو مخالفین کے سینوں میں آتش حد بھڑک رہی تھی اور دوسری طرف اس خاندان کے ہمدرد با آواز بلند کہہ رہے تھے کہ ٹیپو ایک خوش بخت بچہ ہے جس کے دنیا میں آتے ہی باپ کی ترقیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔



پائین گھاٹ کی بغاوت کے چند ماہ بعد ہی کرناٹک میں اتری پھیل گئی اور پورا علاقہ ایک نئی سیاسی جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

یورپ سے جو قومیں ہندوستان آئیں، ان میں ڈچ، جرمن، پرتگالی، انگریز اور فرانسیسی

تحریر کیا۔  
”حضور والا کو معلوم ہے کہ میرے والد مرحوم، انگریزوں کے کیسے دوست اور کمپنی کے کیسے وفادار تھے۔ میں اسی دوستی اور وفاداری کے نام پر سرکار سے فوجی امداد کی درخواست کرتا ہوں۔ اگر فوری طور پر میری خبر گیری نہ کی گئی تو کمپنی کا یہ جاں نثار بھی اپنے باپ کی طرح زمین کی خوراک بن جائے گا۔“

ابھی ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر انوار الدین کے بیٹے والا جاہ محمد علی کے درمیان خط و کتابت جاری تھی کہ ناصر جنگ نے کڑیہ کے پٹھان نواب کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر مدراس پر حملہ کرے اور ایک ایک انگریز کو اس علاقے سے باہر نکال دے۔ اگر ناصر جنگ کا یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو ہندوستان میں کمپنی کی طاقت برائے نام ہی رہ جاتی۔ لیکن بد قسمتی سے ناصر جنگ خود ایک سازش کا شکار ہو گیا اور کڑیہ کے پٹھانوں نے اسے قتل کر دیا۔ ناصر جنگ کے مرتے ہی والا جاہ محمد علی بھاگ کر ”ترچناپلی“ میں محصور ہو گیا۔

چند صاحب کا ستارہ عروج پر تھا۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ دار الحکومت ارکاٹ سے نکلا اور اس نے ترچناپلی کا محاصرہ کر لیا۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ والا جاہ محمد علی کے دن بھی پورے ہو چکے تھے۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ محمد علی نے ڈوبتے ڈوبتے راجہ میسور سے بھی مدد کی درخواست کی۔ اس نے فوجی معاہدے کے مطابق طے پایا تھا کہ فتح کی صورت میں کرناٹک کا ایک حصہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا اور ترچناپلی کا علاقہ ریاست میسور کے متبوضات میں شامل ہو جائے گا۔ راجہ میسور اس فوجی تعاون کے خلاف تھا مگر وزیر اعظم نندراج اور حیدر علی اپنی فوج لے کر ترچناپلی کی طرف بڑھے۔

دوسری طرف مدراس کے انگریز گورنر نے ایک عجیب چال چلی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر چند صاحب کی غیر موجودگی میں اس کے پایہ تخت ارکاٹ پر قبضہ کر لیا جائے تو وہ ترچناپلی کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو جائے گا اور اس کی حکومت خطرے میں پڑ جائے گی۔

غرض اسی منصوبہ سازی کے تحت انگریزی فوج نے لارڈ کلائیو کی قیادت میں ارکاٹ پر قبضہ کر لیا۔ چند صاحب اور فرانسس فوج کے لئے یہ ایک ہمت شکن اور پریشان کن خبر تھی مگر پھر بھی اس نے ترچناپلی کا محاصرہ نہیں اٹھایا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح والا جاہ محمد علی پر قابو حاصل کر کے انگریزوں سے سودے بازی کی جائے اور جب اسے سیاسی مفادات حاصل ہو جائیں تو وہ ارکاٹ کی نوابی کے دعویدار کو قتل کر کے ہمیشہ کے لئے اس فتنہ گر سے بچھا چھڑا لے۔

اسی دوران حیدر علی کی فوج بھی ترچناپلی کے نواح میں داخل ہو گئی اور چند صاحب کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ابھی وہ حیدر علی سے نبرد آزما ہونے کی تدبیریں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے ایک اور بری خبر ملی۔ فرانس کی حکومت نے اپنے ذہن ترین گورنر ڈوبلے کو واپس بلا لیا تھا۔ ڈوبلے کے جاتے ہی فرانسس سپاہیوں میں بددلی پھیلنے لگی۔

محمد سعید خان کے مخالفین میں سرفہرست اسی خاندان کا ایک فرد حسین دوست خان عرف چندا صاحب تھا۔ چندا صاحب، نواب سعادت اللہ خان مرحوم کا داماد تھا اور وہ اسی رشتے سے ارکاٹ کی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف اقتدار کا بھوکا ایک اور شخص میر انوار الدین گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے محمد سعید خان کی خاندانی مخالفتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور آصف جاہ نظام الملک اول کی تائید سے ارکاٹ کی حکومت حاصل کر لی۔

والی دکن کے ساتھ انگریز بھی میر انوار الدین کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ میر انوار الدین کی انگریز دوستی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ چند سال پہلے جب انوار الدین کے باپ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک جہاز میں حج کا سفر کیا تھا تو انگریزوں نے اس کی خوب خاطر تواضع کی تھی اور اس طرح دونوں کے درمیان منافقانہ دوستی کے رشتے مضبوط ہو گئے تھے۔

میر انوار الدین تقریباً پانچ سال تک ارکاٹ کا حکمران رہا۔ پھر جب 1748ء میں نظام الملک اول کا انتقال ہو گیا تو حصول اقتدار کے لئے ناصر جنگ اور مظفر جنگ میں لڑائی چھڑ گئی۔ میر انوار الدین نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے ناصر جنگ کا ساتھ دیا۔ حسین دوست خان عرف چندا صاحب بھی اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے ارکاٹ کی نوابی کے حصول کے لئے مظفر جنگ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

جب سے انگریز اور فرانسس ہندوستان آئے تھے، ان دونوں میں تجارتی رقابت کی بنیاد پر اکثر جنگیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر ان لڑائیوں کے اثرات صرف ان ہی دو قوموں تک محدود رہتے تھے اور مقامی حکمران کسی بھی جنگ میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے فرینچ کمپنی کے نگران ڈوبلے نے میر انوار الدین کو ایک خط تحریر کیا۔  
”مہربان دوست کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دونوں قوموں کے یکساں نفع اور نقصان کی جنگ ہے۔ اس لئے تم پر لازم ہے کہ غیر جانبداری کی روش اختیار کرو۔“

مگر انوار الدین پر ڈوبلے کی اس درخواست کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجبوراً فرانسس گورنر نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کی مدد کی۔ آخر یہ سیاسی کشمکش 1749ء میں ”آرموز“ کی جنگ پر اختتام پذیر ہوئی۔ میر انوار الدین میدان جنگ سے فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا اور مظفر جنگ، کی مدد سے حسین دوست خان عرف چندا صاحب ارکاٹ کا نواب بن گیا۔

”آرموز“ کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد فرانسسوں کی طاقت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور انگریز اپنے آپ کو بہت زیادہ کمزور محسوس کرنے لگے تھے۔ طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لئے فرنگیوں نے ناصر جنگ کو اپنے تعاون کی پیش کش کی مگر ناصر جنگ ایک محب وطن حکمران تھا اور وہ انگریزوں کے خوفناک عزائم سے بخوبی واقف تھا، اس لئے اس نے صاف انکار کر دیا۔

اسی دوران میر انوار الدین کے بیٹے، والا جاہ محمد علی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام ایک خط



”حیدر علی، ڈنڈیگل کے گورنر ہیں۔ ترچناپلی کے محاصرے کے وقت میسوری افواج ان ہی کے زیر قیادت جنگ کر رہی تھیں۔“ کھنڈے راؤ نے نواب ارکاٹ سے اپنے آقا کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ میسور کا وہی جاننا ہے جس نے چندا صاحب اور فرانسیسی فوجوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔“

”حیدر علی کچھ بھی ہو، میں اسے نہیں جانتا۔“ نواب والا جاہ محمد علی کے غرور کا وہی انداز تھا۔ ”میں اپنے ہم رتبہ لوگوں سے بات کرنے کا عادی ہوں۔ یہ میری توہین ہے کہ ایک ادنیٰ فوجی افسر مجھے حاکمانہ انداز میں خط تحریر کرے۔ اگر راجہ میسور کوئی عریفہ بھیجتا تو شاید میں غور کرتا کہ اسے کس طرح جواب دیا جائے۔“ نواب ارکاٹ کا دماغ تو پہلے ہی آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ اب اسے اپنا جسم بھی زمین کی سطح سے بلند محسوس ہو رہا تھا۔

”حیدر علی اس معاملے میں راجہ میسور ہی کی نیت کر رہے ہیں۔“ کھنڈے راؤ نہایت حاضر جواب انسان تھا۔ اس لئے وہ بڑی خوب صورتی سے نواب ارکاٹ کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیسا معاملہ؟“ یکایک والا جاہ محمد علی غضب ناک نظر آنے لگا۔ ”حضور نے وعدہ کیا تھا کہ فتح کی صورت ترچناپلی کا علاقہ ریاست میسور کے حوالے کر دیا جائے گا۔“ کھنڈے راؤ نے کسی خدمت گار کی مانند سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”حیدر علی بھی جھوٹ بولتے ہیں اور راجہ میسور بھی۔“ نواب ارکاٹ بہت زیادہ مشتعل ہو گیا تھا۔ ”کیا ترچناپلی کسی بقال کی دکان پر بکنے والی سبزی ہے کہ میں اسے اٹھا کر راجہ میسور کے دامن میں ڈال دوں؟“



کھنڈے راؤ واپس پہنچا اور اس نے نواب ارکاٹ کی تمام گفتگو حیدر علی کے گوش گزار کر دی۔

”اس حیلہ کرنے بڑا دھوکا دیا، حیدر علی!“ وزیر اعظم نندراج شدت غضب میں بار بار اپنے سر کے بال نوچ رہا تھا۔ ”کیسی بچوں کی طرح مات کھاٹی ہے۔ اب میں راجہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“ حیدر علی پر بہت دیر تک حیرت و سکوت کی کیفیت طاری رہی۔

”سرکار! مجھے ترچناپلی کے نہ ملنے کا کوئی غم نہیں۔“ کھنڈے راؤ نے اس جذباتی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدر علی کو مشتعل کرنے کی کوشش کی۔ ”دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس مغرور نواب نے آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ بھگوان نے میری سماعت چھین لی ہوئی یا میں اس کی بات سننے کے لئے زندہ نہ رہتا۔ اب تو سوتے جاگتے یہی الفاظ میرا تعاقب کرتے رہیں گے۔“ کون حیدر علی؟

دراصل کھنڈے راؤ، میسور کی رائیوں کا ایجنٹ تھا جسے ایک خاص مصلحت کے پیش نظر

حیدر علی کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی فوج ہمیشہ دشمن پر شب خون مارا کرتی تھی اور جو کچھ ملتا تھا، بے دریغ لوٹ لیا کرتی تھی۔ ترچناپلی کی جنگوں میں بھی حیدر علی نے یہی حکمت عملی تیار کی۔ بے خبری کے عالم میں بار بار کے ان حملوں نے فرانسیسیوں اور چندا صاحب کو زندگی سے بیزار کر دیا تھا۔ حیدر علی کی فوج کا ہر شب خون کامیابی سے ہمسار ہوتا تھا۔ نتیجتاً دوسرے مال و متاع کے ساتھ بہت سی فرانسیسی توپیں بھی حیدر علی کے ہاتھ آئیں۔ چندا صاحب کی فوجی طاقت روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ انجام کار اس کے خلاف ایک گہری سازش کی گئی۔ اس سازش میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ انگریز اپنی فریب کارانہ سیاست میں کامیاب ہوئے اور ہندوستان کا یہ جاننا سپاہی بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ چندا صاحب کے مرتے ہی ہندوستان میں فرانسیسی اقتدار بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

والا جاہ محمد علی انگریزوں کی بندوٹوں کے سائے میں ارکاٹ کا نواب بن گیا۔ کمپنی کی طرف سے فرنگی مفادات کی نگرانی کے لئے میجر لارنس بطور ریڈینٹ مقرر ہوا۔

محمد علی نے معاہدے کے مطابق کرناٹک کا بہت بڑا علاقہ کمپنی کے نام کر دیا۔ اب تک ہندوستان میں کمپنی کی اپنی کوئی زمین نہیں تھی۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں انگریزوں کی حکومت کی پہلی بنیاد رکھی گئی۔



والا جاہ محمد علی نے جشن تاجپوشی بڑی دھوم سے منایا۔ اس تقریب میں انگریزوں کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ دراصل یہ فرنگیوں ہی کا جشن تاجپوشی تھا۔ وہ شراب کے نشے میں بدمست ہو کر دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ کرناٹک کے زمینداروں نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے مجبور کسانوں کی نوعمر خوبصورت لڑکیوں کو ان کے گھروں سے اٹھوا کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اس وقت ارکاٹ کے محل میں ہر طرف تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اہل غیرت کے سینوں میں اندھیرا تھا۔ نواب والا جاہ محمد علی، انگریزوں کی خوشنودی کے لئے قدم قدم پر غلاموں کی طرح بچھا جا رہا تھا اور سنگ مرمر کے فرش پر صرف دو رقیق سیال بہہ رہے تھے۔ ایک ہندوستانیوں کی عزت و آبرو کا خون اور دوسرے پرنگی شراب۔

ابھی یہ ہنگامہ کیف و نشاط جاری تھا کہ نواب محمد علی کے نام حیدر علی کا خط موصول ہوا۔ ”والی ارکاٹ پر لازم ہے کہ ایقائے عہد کے سلسلے میں ہر قسم کی تاخیر سے گریز کیا جائے۔“ ”یہ حیدر علی کون ہے؟“ نواب والا جاہ محمد علی نے بڑے متکبرانہ انداز میں خط لانے والے قاصد کھنڈے راؤ سے پوچھا۔

کھنڈے راؤ، قوم کا مرہٹہ تھا اور ہر وقت حیدر علی کی خدمت گزاری میں مصروف رہتا تھا۔ تعلیم یافتہ بھی تھا اور ذہین بھی۔ اسی لئے حیدر علی نے کھنڈے راؤ کو اپنا قاصد بنا کر ارکاٹ بھیجا تھا۔

کی آواز بہت زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ ”آپ کو تو شاید منصوبہ سازی کرنے میں کچھ دیر لگے گی۔ مگر میں اسی وقت پورے نکل میں آگ لگا دوں گا۔ پھر سارے میسور کو معلوم ہو جائے گا کہ حیدر علی کس کا نام ہے اور رانی کا کتنا کون ہے۔“

حیدر علی کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر رانی کا کتنا سہم گئی اور پھر اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

”بے شک! تم ایک فرض شناس اور اعلیٰ ظرف سپاہی ہو۔ اس لئے امید رکھتی ہوں کہ میرا یہ راز اسی کمرے کی چار دیواری میں دفن ہو جائے گا۔“

”امید نہیں، یقین رکھئے کہ آپ کی عزت میری اپنی عزت ہے۔“ حیدر علی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس واقعہ کے بعد رانی کا کتا، حیدر علی کی بدترین دشمن بن گئی تھی۔ اس نے کئی بار اس جانناز سپاہی کو ذلیل کرنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ ناکام رہی۔ پھر جب کھنڈے راؤ، مرہٹہ راجہ کرشنا کے حلقہ خاص میں شامل ہوا تو رانی کا کتا کی بن آئی۔

کھنڈے راؤ کی شخصیت میں کوئی خاص کشش تو نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ ایک دراز قامت اور مضبوط جسم رکھنے والا مرد تھا۔ فطرتاً عیار بھی تھا اور اوباش بھی۔ اس لئے رانی کا کتا بہت جلد اس کے نزدیک آ گئی۔ کھنڈے راؤ کو دربار میسور میں کچھ مضبوط سہاروں کی ضرورت تھی اور رانی کا کتا اپنی مجبوریوں کے سبب بڑی آسانی سے اس کا آلہ کار بن سکتی تھی۔ آخر دونوں میں ایک خفیہ معاہدہ طے پا گیا کہ پہلے حیدر علی اور نندراج کو راستے سے ہٹایا جائے گا۔ پھر راجہ سے نجات حاصل کر کے میسور کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ کھنڈے راؤ اس قدر عیار انسان تھا کہ اس نے ایک وقت میں راجہ کرشنا اور رانی کا کتا سے الگ الگ معاہدے کئے تھے اور اب وہ اسی معاہدے کے تحت حیدر علی کو نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ کھنڈے راؤ کی فریب کاری کا کمال یہ تھا کہ اس نے وزیر اعظم نندراج کو نیکر نظر انداز کر دیا تھا اور حیدر علی کی توہین کا بہانہ بنا کر مگرچھ کے آنسو بہا رہا تھا۔

کچھ دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد حیدر علی نے دوسرا خط نواب ارکاٹ کے نام تحریر کر لیا اور اسے کھنڈے راؤ کے حوالے کر دیا۔ حیدر علی بالکل پڑھا لکھا نہیں تھا۔ مجبوراً دوسروں سے خط لکھواتا اور آخر میں دو آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دیتا۔ بس یہی اس کے دستخط ہوتے تھے۔

حیدر علی نے اپنے دوسرے خط میں نواب ارکاٹ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”تو نے اسلام دشمنوں کے ہاتھوں اپنا پورا علاقہ فروخت کر دیا مگر مجھے تھوڑی سی زمین نہیں دی۔ خیر! میں عنقریب تجھے بتاؤں گا کہ حیدر علی کون ہے؟“

ابھی نندراج اور حیدر علی، ترچنپلی کے گرد و نواح میں خیمہ زن تھے کہ ریاست میسور ایک نئے طوفان کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس طوفان کی ذمہ داری راجہ کرشنا اور رانیوں پر عائد ہوتی تھی۔

لازمیت دے کر حیدر علی اور نندراج کے پیچھے لگا دیا گیا تھا۔ کھنڈے راؤ کچھ دن پہلے پونا سے دربار میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا مگر اس کی عیاریوں اور سازشوں سے تنگ آ کر مرہٹوں کے پیشوا، بالاجی باجی راؤ نے اسے علاقہ بدر کر دیا تھا۔ آخر کھنڈے راؤ تلاش معاش میں میسور پہنچا اور اس نے اپنی پُر فریب باتوں سے راجہ کرشنا کو یقین دلایا کہ وہ ہر الجھے ہوئے مسئلے کا حل پیش کر سکتا ہے۔

راجہ نے اس شرط کے ساتھ اسے ملازم رکھ لیا کہ وہ بہت جلد ریاست کو دزیوں کے چنگل سے نجات دلادے گا۔ راجہ کا راز دار ہونے کی وجہ سے رانی لکشمی، رانی دیواجی مٹی اور دوسری رانیاں بھی اس کے قریب آ گئیں۔

ان ہی رانیوں میں ایک جواں سال رانی کا کتا بھی تھی جو کئی سال سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی۔ رانی کا کتا کی شادی سولہ سال کی عمر میں چامراجہ ہفتم سے ہوئی تھی۔ چامراجہ نے 1731ء سے 1734ء تک میسور پر حکومت کی۔ اس نے برسر اقتدار آتے ہی تمام وزیروں کو برطرف کر دیا تھا۔ پھر جیسے ہی وزیروں کو موقع ملا، انہوں نے چامراجہ کے خلاف سازش کر کے اسے قید میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد زہر دے کر ہلاک کر ڈالا۔ ہندوؤں کی رسم کے مطابق رانی کا کتا دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی۔ محل کی رنگین فضا میں اور کچھ جوانی کے تقاضے، رانی کا کتا کی زندگی بڑی عذاب ناک حالت میں گزر رہی تھی۔ پھر جب میسور میں ہر طرف حیدر علی کے کارناموں کی گونج سنائی دینے لگی تو رانی کا کتا اس وجہہ و شکیل انسان کے عشق میں مبتلا ہو گئی جس کا قد چھ فٹ تھا اور جس کی باربع شخصیت صنف نازک کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیتی تھی۔ حیدر علی، کا کتا کے سینے میں اٹھنے والے طوفان سے بے خبر اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف تھا کہ ایک دن رانی اپنے جذبہ شوق سے مجبور ہو کر میسور کے سپاہی کی خلوت میں داخل ہوئی۔ پھر جب کا کتا نے اپنی حالت دل بیان کی تو حیدر علی سناٹے میں آ گیا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ غیرت و شرم سے حیدر علی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ”کہاں آقا اور کہاں ایک معمولی خدمت گار۔“ اس نے طوفان کو روکنے کی کوشش کی۔

”عشق میں کوئی آقا اور کوئی خدمت گار نہیں ہوتا۔“ رانی کا کتا کے لہجے کی وارفتگی ناقابل بیان تھی۔

”میں عشق کے آداب سے ناواقف سہی مگر اپنے فرائض سے بے خبر نہیں۔“ یکا یک حیدر علی کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ ”آپ میری ماں کی طرح ہیں اور ایک ماں کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس رشتے کے تقدس کو برقرار رکھے۔“

بازی ہارتے دیکھ کر رانی کا کتا نے ہوس پرست عورتوں کی طرح ”تریاجرت“ کا مظاہرہ کیا اور حیدر علی کے خلاف شدید اشتہامی کارروائی کرنے کی دھمکی دی۔

”رانی! آپ نے ایک سپاہی کے بارے میں بہت ہی غلط اندازے قائم کئے۔“ حیدر علی

کچھ دن بعد بلونت راؤ کو ہٹا کر گوپال راؤ کو سرا کا صوبیدار بنا دیا گیا۔ یہ ایک سخت گیر مرہٹہ سردار تھا۔ گوپال راؤ نے صوبیداری کے منصب پر فائز ہوتے ہی راجہ کرشنا سے ایک کروڑ روپے کی فوری ادائیگی کا مطالبہ کر دیا۔ راجہ اتنی بڑی رقم کہاں سے دیتا؟ وہ تو خود پائی پائی کو ترس رہا تھا۔ آخر گوپال راؤ نے باضابطہ انداز میں ان علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، جو بطور نہانت پیش کئے گئے تھے۔ اب میسور کی حکومت صرف سرنگاپٹم اور اس کے مضافات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

یہ خبر سنتے ہی راجہ نے اپنی بے چارگی کا ماتم شروع کر دیا۔ ”اگر میری بات مان لی جاتی تو ریاست کو یہ برے دن دیکھنا نہ پڑتے۔“  
سرنگاپٹم پر اب بھی وزیروں کی حکمرانی تھی۔ اس لئے لوگوں کی زبانیں خاموش تھیں مگر وہ دل ہی دل میں نندراج کو گالیاں دے رہے تھے۔

راجہ کرشنا، وزیروں اور ان کے خاندان والوں پر تو اپنا غصہ نہ اتار سکا لیکن حیدر علی کے بیوی بچے کو محل کے اس گوشے میں بھیج دیا گیا جہاں ادنیٰ درجے کے خدمت گار رہتے تھے۔ ٹیپو سلطان اس وقت دو برس کا ہو چکا تھا اور اس نے ایک سال سے اپنے باپ کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

فاطمہ بیگم نے بڑی مشکل سے ایک معتبر شخص کے ذریعے اپنے شوہر کو یہ پیغام بھیجا۔  
”راجہ نے آپ کی خدمات کا یہ صلہ دیا ہے کہ والدہ صاحبہ، میں اور ٹیپو غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر وقت دو چار ہندو سپاہی ہماری کونٹری کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں اور آپ کے لئے انتہائی فحش کلمات استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ایک غدار مسلمان تھا۔ آزمائش کے وقت فرار ہو گیا۔ مجھے ہر گھڑی ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ لوگ ٹیپو کو قتل نہ کر دیں۔ ایک دن انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر حیدر علی واپس نہ آیا تو اس کے جرم کی سزا اس کے بیٹے کو دی جائے گی۔ میری درخواست ہے کہ آپ سنی منگل کو چھوڑ کر کسی دوسری ریاست میں چلے جائے اور اس شہر کی طرف رخ بھی نہ کیجئے کہ اب یہ شہر عزت داروں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔“

حیدر علی نے اپنے ایک معتمد سپاہی شجاعت خان سے فاطمہ بیگم کا خط پڑھوا کر سنا۔ جب شجاعت خان آخری سطر تک پہنچا تو حیدر علی کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بیک وقت غیظ و غضب اور اذیت و کرب کے آثار نمایاں تھے۔ پھر یکایک اُس نے شجاعت خان کے ہاتھ سے خط چھین لیا اور سیدھا وزیراعظم نندراج کے پاس پہنچا۔

”کیا ہوا حیدر علی؟“ نندراج اپنے فوجی افسر کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر گھبرا سا گیا۔  
حیدر علی نے اپنی بیوی کے خط کے حوالے سے تمام واقعات سناتے ہوئے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مہاراج مجھے میری خدمات کا یہ صلہ دیں گے۔“

نندراج کی غیر حاضری میں راجہ نے وزیروں کی سیاسی قید سے آزاد ہو کر خود مختار ہونا چاہا تو نندراج کے چھوٹے بھائی دیوراج نے محل پر گولہ باری شروع کر دی۔ راجہ اور رائیوں نے گھبرا کر دوبارہ وزیروں کی اطاعت کر لی مگر سازشوں کا بازار پھر بھی گرم رہا۔

میسور کی فوج کے ایک بڑے حصے نے گنگارام کی قیادت میں وزیروں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس طرح پوری ریاست میں شورش پھیل گئی۔ یہ ایک بڑا سیاسی فتنہ تھا، جسے وزیراعظم نندراج کے خیال میں شہباز اور حیدر علی ہی کچل سکتے تھے۔ آخر ان دونوں بھائیوں نے دو مہینے کے مختصر سے عرصے میں باغیوں کے تمام علاقوں پر قبضہ کر کے باغی گنگارام کو قید میں ڈال دیا۔ نندراج، حیدر علی کے اس کارنامے سے بہت خوش تھا۔ اسے برملا اعتراف کرنا پڑا۔

”میسور کی بھا کے لئے حیدر علی کی ذات ناگزیر ہے۔ پوری ریاست میں اس جیسا زیرک، دُور بین، شجاع اور بروقت صحیح فیصلہ کرنے والا کوئی دوسرا فوجی افسر موجود نہیں۔“

بغاوت کے مکمل خاتمے کے بعد نندراج واپس پلٹا مگر صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے میسور کے بجائے ”ستی منگل“ میں مقیم ہو گیا۔ حیدر علی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اسی دوران نظام الملک میر نظام علی خان والی دکن نے میسور پر حملہ کر دیا اور سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ کرشنا نے اپنا قاصد بھیج کر حملے کا سبب دریافت کرنا چاہا تو میر نظام علی خان نے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں جواب دیا۔

”کیا تجھے یاد نہیں رہا کہ تیری فوجوں نے والا جاہ محمد علی کا ساتھ دیا تھا؟ یہ اسی گناہ کی سزا ہے۔“

راجہ کرشنا نے دوبارہ قاصد کو درخواست دے کر میر نظام علی خان کی خدمت میں بھیجا۔  
”آپ نہیں جانتے کہ میں کس قدر بے دست و پا حکمراں ہوں۔ اس گناہ کا ذمہ دار وزیر نندراج اور اس کا معتمد حیدر علی ہے۔“

آخر نظام علی خان نے راجہ سے ایک بہت بڑی رقم لے کر محاصرہ اٹھالیا اور واپس چلا گیا۔ نظام دکن کے جاتے ہی مرہٹوں کا پیشوا، بالاجی باجی راؤ ایک لشکر جہاز کے ساتھ راجہ کرشنا سے خراج وصول کرنے کے لئے میسور کی طرف بڑھا مگر ریاست میں رکھا ہی کیا تھا؟ میر نظام علی خان خزانے کا صفایا کر کے بہت دُور جا چکا تھا۔ آخر راجہ کرشنا نے ایک کروڑ روپے کی ادائیگی کا وعدہ کر کے جان بچائی۔ بالاجی باجی راؤ نے ضمانت طلب کی تو راجہ نے ریاست کا ایک بڑا حصہ مرہٹوں کی نگرانی میں دے دیا۔ پیشوا بالاجی باجی راؤ جاتے جاتے سرا کی صوبیداری کا بھی خاتمہ کر گیا۔ نواب دلاور خان کو کولار میں جاگیر دے کر اس کی جگہ بلونت راؤ مرہٹہ کو سرا کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔

بڑی خوف ناک صورت حال تھی۔ راجہ کرشنا بھکاری بن چکا تھا اور ریاست میسور کسی قریب المرگ مریض کی طرح آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔

ہوئے تھے۔ وزیراعظم نے اپنے غیر متعصب ہونے اور حیدر علی کو ہندوؤں پر ترجیح دینے کی بات بڑے پرجوش لہجے میں کہی تھی۔ مگر حیدر علی جانتا تھا کہ نندراج کھلا جھوٹ بول رہا ہے۔ ریاست میسور کے سپاہی بے عقل بھی تھے اور بزدل بھی..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ وہ چند سکوں اور معمولی سے عہدوں کے لئے کسی بھی وقت اپنی وفاداریاں فروخت کر سکتے تھے۔ راجہ کرشنا اور وزیراعظم نندراج کی یہی مجبوریاں ان دونوں کو حیدر علی اور دوسرے مسلمان سپاہیوں کے قریب لے آئی تھیں۔

حیدر علی انتہائی ذہین ہونے کے باوجود ایک کھلے دل کا انسان تھا۔ وہ بہت دنوں راجہ کرشنا اور نندراج کو اپنا محسن سمجھ کر ریاست میسور کے لئے جان کی بازی لگاتا رہا..... مگر حیدر علی کی والدہ، بیوی اور بچے کے ساتھ پیش آنے والے واقعے نے فریب اور ریاکاری کے سارے طلسم کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اور اب وہ ایک نئے ارادے اور منصوبے کے ساتھ نندراج سے گفتگو کرنے آیا تھا۔ وزیراعظم میسور، حیدر علی کا چہرہ دیکھ دیکھ کر اس کی جذباتی کیفیت کو محض ایک دریائی سیلاب سمجھ رہا تھا، جو دو چار دن کی سرکشی کے بعد آہستہ آہستہ اتر جاتا تھا۔ نندراج کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ حیدر علی ایک سمندر ہے اور سمندری طوفان میں بہت سی موجیں زیر آب بھی چھلکتی رہتی ہیں۔ اور موقع ملے ہی ان کی آن میں سب کچھ بہا کر لے جاتی ہیں۔

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ریاست میسور کی ملازمت ترک کر کے کہیں اور چلا جاؤں۔“ حیدر علی انتہائی تلخ لہجے میں بول رہا تھا۔ ”والا جہ محمد علی میرے لئے کیا برا ہے؟ وہ یہی تو چاہتا ہے کہ میں اس کے راستے سے ہٹ جاؤں۔ پھر اس دنیا کی ساری نعمتیں میرے قدموں میں ڈھیر کر دی جائیں گی۔ راجہ کرشنا نے یہ نہیں سوچا کہ اگر میں نواب اراکٹ کا ساتھ دوں تو وہ مجھے سونے میں تول دے گا..... اور پھر مجھ پر غداری کا الزام بھی نہیں آئے گا۔“ یہ کہہ کر حیدر علی واپس جانے کے لئے مڑا۔

نندراج گھبرا کر آگے بڑھا اور اس نے حیدر علی کا بازو پکڑ لیا۔

”تم مجھے اس عالم بے جا رگی میں تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟“ وزیراعظم میسور کی آنکھوں کے سامنے جواں سال بچہ لگ گیا تھا۔ اسے اپنی شخصیت اور مستقبل اداؤں کی رات کی طرح تاریک نظر آرہے تھے۔ ”تم نے تو عہد کیا تھا کہ آخری سانس تک میرا ساتھ دو گے۔“ مجھے اٹھائے عہد کی باتیں یاد دلانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ سب سے پہلے عہد شکنی کس نے کی؟“ حیدر علی کے لہجے میں وہی ناگواری تھی۔ ”میری والدہ، بیوی اور بچہ ریاست میسور میں کسی یرغمالی یا اچھوت کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر میں گناہ گار تھا تو مجھے طلب کر کے کڑی سے کڑی سزا دی ہوتی۔“

”میں تو تمہارا مجرم نہیں ہوں حیدر علی؟“ نندراج کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

”میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ ریاست میسور کا حقیقی مالک کون ہے، آپ یا راجہ کرشنا؟“

”تمہیں مہاراج سے کوئی توقع رکھتی بھی نہیں چاہئے تھی۔“ نندراج نے بڑی ذہانت سے پچھلے ہوئے لوہے پر بھرپور ضرر لگائی اور حیدر علی کو راجہ کرشنا کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ ”تم تو ریاست میسور کے نئے نئے ملازم ہو، اس لئے پہلے ہی زخم کی سوزش سے جچ اٹھے ہو۔ میری طرف دیکھو حیدر علی!“ نندراج نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تو زخموں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ کس کس زخم کو شمار کروں؟ اس خود غرض انسان کا پتہ نہیں چلتا ورنہ اب تک سر عام نندراج کی چتا پھونکی جا چکی ہوتی اور وزیراعظم میسور کی راکھ ہوا میں اڑ رہی ہوتی۔“ ”میں بھی ہر حال میں مسلمان رہوں گا اور آپ بھی اپنا مذہب تبدیل نہیں کریں گے۔“ حیدر علی نے ہواؤں کے رخ کو پیچھاتے ہوئے کہا۔

وزیراعظم نندراج نے چونک کر حیدر علی کی طرف دیکھا۔ ”میں تمہاری بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔“

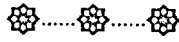
”اگر میں کسی محاذ پر شکست کھا جاؤں تو آپ بڑی آسانی سے یہ کہہ کر میری پوری شخصیت کو داغ دار بنا دیں گے کہ میں ایک مسلمان تھا، اس لئے ریاست میسور سے غداری کر کے اپنے ہم مذہبوں سے جاملے۔“ حیدر علی کے لہجے میں تلوار سے بھی زیادہ کاٹ تھی۔ نندراج کے پاس حیدر علی کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ چند لمحوں کے لئے وہ بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔ پھر بڑی مشکل سے اس نے اپنی بدحواسی پر قابو پایا اور حیدر علی کو مطمئن کرنے کے لئے رُک رُک کر بولنے لگا۔

”میں راجہ کرشنا کی طرح متعصب اور تنگ نظر نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں تمہیں ہندو سپاہیوں پر ترجیح کیوں دیتا؟ تم خوب جانتے ہو کہ میری قوم میں بھی بے شمار سورا موجود ہیں مگر میں نے پھر بھی تمہارا انتخاب کیا۔ آخر کیوں؟“ نندراج بہت بڑا شاطر تھا، اس نے حیدر علی کے سوال کا جواب دیتے دیتے خود بھی ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔

وزیراعظم میسور، حیدر علی کو صرف ایک جانباز سپاہی سمجھتا تھا۔ اُس کے خیال میں یہ مسلمان فوجی افسر، سیاست کی انجھی ہوئی چالوں کو سمجھنے سے قاصر تھا، اس لئے نندراج اپنی عادت کے مطابق حیدر علی سے بھی الفاظ کی بازی کھیل رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بڑی آسانی سے حیدر علی کو شکست دے کر لا جواب کر دے گا۔ مگر حیدر علی، نندراج کے اندازوں سے بھی زیادہ ذہین تھا۔ چند سالہ ملازمت کے دوران اس پر یہ حقیقت ظاہر ہو چکی تھی کہ راجہ کرشنا اور وزیراعظم نندراج اپنی اپنی ضرورتوں کے پیش نظر اسے اس وقت تک آلہ کار بنا کر رکھنا چاہتے تھے، جب تک سیاسی تجارت میں سود و در سود کا سلسلہ جاری رہے۔ اور جب زیاں کا کاروبار شروع ہو جائے تو اسے اچھوت بنا کر زندہ چھوڑ دیا جائے یا پھر کسی خفیہ سازش کے ذریعے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

راجہ کرشنا تو بے نقاب ہو چکا تھا، مگر نندراج کے چہرے پر ابھی کئی دبیز پردے پڑے





حیدر علی نے اپنے معتمد ساتھی، شجاعت خان کو خلوت میں طلب کیا اور فاطمہ بیگم کے خط کا جواب تحریر کرانے لگا۔

”آپ کا خط موصول ہوا، جس کا ہر لفظ میرے دل میں زہر آگیاں نثر کی طرح اتر گیا ہے۔ اور اس وقت بھی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میرے ذہن پر آہنی گرزوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اتنی دُور رہ کر بھی مجھے آپ کی پریشانیوں کا احساس ہے۔ مگر فی الوقت ان کا علاج ممکن نہیں۔ آپ کو بہر حال صبر کرنا ہو گا۔ میرے خاندان کی تاریخ ہی کچھ اس طرح ہے کہ کسی بھی مرد کو سکون و اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ شاید میں بھی اپنی تاریخ کی اسی روایت کو زندہ رکھنے کے لئے در بدر مارا مارا پھر رہا ہوں..... اور غالباً تمہیں اور تمہارے بیٹے کو بھی آزمائش کے اسی دور سے گزرنا پڑ رہا ہے..... مگر ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ اللہ نے ہمیں کبھی بے آبرو نہیں کیا۔ ہمارے بزرگ قتل تو ہو گئے لیکن بے وقار نہیں ہوئے۔ تم بھی اسی کے فضل و کرم کا سامان تلاش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی دشمن کی دست درازی سے محفوظ رہو گی اور شیو بھی۔ تمہارا یہ مشورہ پسند نہیں آیا کہ میں ریاست میسور آنے کے بجائے کسی اور طرف چلا جاؤں۔ یہ واپسی مجھ پر قرض ہے اور میں اس قرض کو اتارے بغیر جین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ میرا انتظار کرو۔ مجھے آنا ہے اور میں آؤں گا۔ خواہ اس سفر میں اپنی جان سے ہی گزر جاؤں۔ والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کرنا اور بعد احترام میری یہ درخواست پیش کر دینا کہ میں پہلے سے بھی زیادہ ان کی دعاؤں کا محتاج ہوں..... اور شیو کو احساس دلاتی رہنا کہ میں اس کے بہت قریب ہوں۔ میرے ہونٹ اس کے رخساروں پر ہیں اور اس کا سر میرے سینے پر ہے۔ میرے بیٹے کو عام ہندوستانی عورتوں کی طرح چاند اور ستاروں سے مت بہلانا اور اسے لوریاں دینے کے بجائے ان مردانہ شجاع کے نفعے سنانا جو موت کے راگ کو دنیا کا سب سے دلکش راگ سمجھتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ میری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کریں گی۔“

حیدر علی نے شجاعت خان سے یہ خط لکھوا کر سنا اور بڑے تاسف آمیز لہجے میں بولا۔

”ایسے مواقع پر اپنے اُن پڑھ ہونے کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ کاش! مجھے بھی کتاب، قلم، کاغذ اور روشنائی کا ہنر آتا۔ پھر یہ مجبوری لاحق نہ ہوتی۔“

”جب تک آپ کے جاں نثار زندہ ہیں تو مجبوری کس شے کا نام ہے؟“ شجاعت خان نے اپنے آقا کو احساس محرومی سے نجات دلانے کے لئے انتہائی پُر جوش لہجے میں کہا۔

”مجبوری تو مجبوری ہی ہوتی ہے شجاعت خان!“ حیدر علی چند لمحوں کے اندر محرومی کے اس گرداب سے نکل گیا اور حسب عادت مسکرانے لگا۔ ”میں بھی کیا کرتا؟ والد محترم کے انتقال کے بعد ایسی خونی آندھیاں چلیں کہ قدم زمین پر جتے ہی نہیں تھے۔ خاندان کے بزرگوں نے قلم کی جگہ تلواریں ہاتھ میں دے دی۔ اسی سے آج تک کھیل رہا ہوں۔ اگر یہ کھیل بند کر کے کتاب اور

حیدر علی نے نندراج سے ایک اور سوال کر ڈالا۔

”ظاہری مالک تو وہی ہے۔“ راجہ کرشنا کے لئے نندراج کے چہرے سے شدید نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”مگر میں اسے میسور کی ملکیت سے محروم کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ اقتدار کی کھلی جنگ ہے۔“

”مگر میں اس جنگ میں فریق بننا نہیں چاہتا۔“ حیدر علی نے کسی رعایت اور تکلف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا اور بہت غور سے وزیر اعظم میسور کے رد عمل کا جائزہ لینے لگا۔

”مگر میں تمہارے تعاون کے بغیر یہ جنگ لڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ حیدر علی کا انداز سن کر نندراج بدحواس نظر آنے لگا تھا۔

”آپ کے پاس تو بے شمار سوراخ موجود ہیں۔“ حیدر علی کے ہونٹوں پر شدید طنز یہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ وہ نندراج کو اسی کے الفاظ سے شکست دینا چاہتا تھا۔ حیدر علی خوب جانتا تھا کہ اگر ریاست میسور میں اس کا نعم البدل موجود ہوتا تو راجہ کرشنا اور نندراج کبھی اُس کی ناز برداریاں نہ کرتے۔ ”جہاں بہادروں کی اتنی بڑی فوج ہو، وہاں مجھ جیسے غدار کی کیا ضرورت ہے؟“

”تم جیسا کوئی نہیں حیدر علی!“ آخر نندراج اس مسلمان جانناز سپاہی کے آگے جھک گیا۔

”تم تنہا آدمی ہو جو میرے منصوبے کو تکمیل تک پہنچا سکتے ہو۔“ وزیر اعظم میسور کا انداز گفتگو خوشامدانہ ہو گیا تھا۔

حیدر علی یہی چاہتا تھا کہ نندراج اس کے سامنے مکمل طور پر بے نقاب ہو جائے اور کھل کر اپنی بے جا چارگی کا اعتراف کر لے۔

”میں صرف ایک شرط پر آپ کے ساتھ کام کر سکتا ہوں کہ جن سپاہیوں نے مجھے غدار کہا ہے، ان سب کی زبانیں سرعام کاٹ دی جائیں گی اور ان کا منہ کالا کر کے انہیں میسور کی گلیوں میں پھرایا جائے گا۔“ یہ کہہ کر حیدر علی چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا اور گہری نظروں سے نندراج کی طرف دیکھنے لگا۔

”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ وزیر اعظم میسور کی آمادگی کا اظہار ایسا ہی تھا کہ اگر حیدر علی، نندراج سے زمین بوس ہونے کے لئے کہتا تو وہ بے دریغ اپنے فوجی افسر کو سجدہ کر لیتا۔

”ابھی میری شرط مکمل نہیں ہوئی ہے مہاشنتری!“ حیدر علی بڑے آزادانہ لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ ”اگر اس الزام تراشی میں مہاراج بھی ملوث پائے گئے تو انہیں بھی بھرے دربار میں مجھ سے معافی مانگنی ہو گی۔ میرے دل کا زخم بہت گہرا ہے، اس کی ٹیسس مجھے ایک لمحے کے لئے جین سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ یاد رکھئے کہ میں اس سے کم پر راضی نہیں ہوں گا۔“

نندراج نے حیدر علی کی ایک ایک شرط مان لی اور وہ مرد جانناز اس طرح اپنی قیام گاہ کی طرف گیا کہ اس کے دل و دماغ میں ایک حشر سا برپا تھا۔

قلم ہاتھ میں لے لوں تو خدا ہی جانتا ہے کہ اہل دنیا میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔“ حیدر علی کچھ دیر کے لئے اپنے ماضی میں سفر کرنے لگا تھا۔ پھر وہ یکایک حال کی طرف لوٹا۔ ”میری اس مجبوری کو میرا بیٹا ٹیپو دُور کرے گا شجاعت خان! میں اس کے ہاتھ میں تلوار بھی دوں گا اور قلم بھی۔“

پھر جب شجاعت خان خط لے کر سستی منگل سے سرنگاپٹم کی طرف جانے لگا تو حیدر علی نے اُسے ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس سفر میں سخت احتیاطی تدابیر کرے اور ہر قدم پر اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔



وزیر اعظم نندراج کا کھویا ہوا اقتدار بحال ہونے کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ کسی طرح ایک کروڑ روپے کی کثیر رقم پیشوائے پونا، بالاجی باجی راؤ کو ادا کر کے ریاست میسور کے رہن رکھے ہوئے علاقے واکرار کرانے۔ اسی خوف ناک صورت حال میں انتہائی رازداری کے ساتھ ایک بند کمرے میں نندراج اور حیدر علی کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔

”مہامنتری! یہ رقم اتنی معمولی نہیں ہے کہ ہم چند ساہوکاروں سے قرض لے لیں اور حالات سازگار ہوتے ہی انہیں واپس لوٹا دیں۔“ حیدر علی اپنے چہرے سے بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ”میری کئی راتیں اسی فکر میں جاگتے گزر گئی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں۔“ نندراج اپنے اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لئے جام پر جام پی رہا تھا مگر پھر بھی اس کی بدحواسی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ”کچھ بھی کرو، تمہیں ہر حال میں بالاجی باجی راؤ کا یہ قرض ادا کرنا ہے۔ اگر تم ناکام رہے تو میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں گا۔ میں چہرے کی اس سیاہی کے ساتھ میسور کے لوگوں کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔“

نندراج اقتدار کا بھوکا ایک خود غرض انسان سہی مگر وہ آڑے دھنوں میں حیدر علی کے بہت کام آیا تھا۔ اور اسی کی حوصلہ افزائی سے حیدر علی آج اس مقام تک پہنچا تھا۔ یہی سوچ کر حیدر علی، نندراج کی تنگناری کر رہا تھا۔ اس کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ شکست و رسوائی کی ان جائگداز ساعتوں میں وزیر اعظم میسور کو تنہا چھوڑ کر چلا جائے۔

آخر مزید کئی راتوں کا خون کرنے کے بعد حیدر علی نے اتنی بڑی رقم کے حصول کے لئے ایک ایسی ترکیب سوچ لی، جس پر حیدر علی جیسا شخص ہی عمل کر سکتا تھا۔ یہ ترکیب بے شمار خطرات سے بھری ہوئی تھی اور ان خطرات میں جان کے زیاں کا اندیشہ بھی موجود تھا۔ مگر حیدر علی نے نندراج کے احسانات کا بارگراں اتارنے اور اپنی ذات کی بقا کے لئے اس پر بیچ راستے پر قدم رکھ دیا، جس کا ہر موڑ براہ راست موت کی طرف جاتا تھا۔

حیدر علی نے ”سستی منگل“ کے گرد و نواح کے علاقوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ وہ اور اس کے

سپاہی رات کے اندھیرے میں آسودہ حال زمینداروں اور جاگیرداروں کی تجویزوں پر حملہ آور ہوتے اور جس قدر رقم ملتی، اسے نندراج کے خزانے میں جمع کر دیتے۔

اس لوٹ مار کا خاص پہلو یہ تھا کہ حیدر علی نے انسانی خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا۔ وہ زمینداروں سے سخت لہجے میں بات کرتا اور ان کی ساری دولت جبراً چھین لیتا۔ اگر کوئی جاگیردار مزاحمت کرتا تو بس اس قدر مار پیٹ سے کام لیا جاتا کہ وہ حیدر علی کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو جاتا۔ متوسط طبقے کے گھرانوں پر چھاپے مارنے کا انداز بالکل مختلف ہوتا۔

”مجھے اس وقت ایک بڑی رقم کی شدید ضرورت ہے۔“ حیدر علی ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا جن کی مالی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم کوئی جاگیردار یا زمیندار نہیں ہو مگر پھر بھی جتنی رقم خوشی سے دے سکتے ہو، اس میں پس و پیش نہ کرو۔ اگر موسم سازگار ہو گیا تو میں تمہاری ساری رقم واپس لوٹا دوں گا۔“

حیدر علی نے مہاجنوں اور ساہوکاروں کو جی بھر کے لوٹا۔ ان لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ بہت سخت تھا۔

حیدر علی کو لوٹ مار کے اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے ایک سال گزر گیا لیکن ایک کروڑ کی رقم پوری ہونے ہی میں نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی حیدر علی جھنجھلا جاتا اور انتہائی تلخ لہجے میں نندراج سے کہنے لگتا۔

”مہامنتری! میں آپ کی خاطر ایک لیرا بن کر رہ گیا ہوں۔“

”اتنی جلدی گھبرا گئے حیدر علی؟“ وزیر اعظم میسور انتہائی خوشامد لہجے میں کہتا۔

”کیسی گھبراہٹ؟“ حیدر علی کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ ”میں موت سے نیچے آزمائی کر سکتا ہوں مگر کبھی کبھی طاقت کے استعمال سے ڈر گئے لگتا ہے۔“

”بس کچھ دن اور۔“ نندراج کا انداز گفتگو بھکاریوں جیسا ہوتا۔ ”میں دن رات رقم کا شمار کرتا رہتا ہوں۔ پچاس لاکھ کے قریب ہو گئے ہیں۔ ہم نے آدھا راستہ طے کر لیا ہے۔“

حیدر علی، وزیر اعظم کی باتیں سن کر گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اگر صرف نندراج کا معاملہ ہوتا تو احسانات کا بوجھ اتارنے کے لئے پچاس لاکھ کی رقم بہت تھی۔ لیکن اپنے گھر باعزت واپسی کے لئے ضروری تھا کہ بالاجی باجی راؤ کی باقی رقم بھی جمع کی جائے۔ یہ خیال آتے ہی حیدر علی کے جسم میں آگ سی بھر جاتی اور پھر وہی آگ اسے سرشام گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیتی۔

اس دوران شجاعت خان کئی بار سرنگاپٹم جا کر حیدر علی کی والدہ مجیدہ بیگم، بیوی فاطمہ بیگم اور بیٹے ٹیپو سلطان سے مل چکا تھا۔ حالات بدستور تھے۔ راجہ کے ملازم دونوں وقت ان لوگوں کو کھانا پہنچا دیا کرتے تھے۔ کچھ نامعلوم مرد اور عورتیں ہر وقت مکان کی نگرانی کرتے رہتے تھے مگر خوش قسمتی سے اس طویل عرصے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ شجاعت خان حلیہ بدل کر فقیرانہ لباس میں حیدر علی کے گھر والوں سے ملا تھا اور اس نے اپنے آپ کو ان لوگوں کا

رشتے دار ظاہر کیا تھا۔

جب حیدر علی اس کشاکش میں بہت زیادہ تھک جاتا تو شجاعت خان سے اپنے بیٹے کے بارے میں گفتگو کرنے لگتا۔

”تُو نے ٹپو کو دیکھا، وہ کیسا لگتا ہے؟“ حیدر علی کے لہجے میں ناقابل بیان حسرت پوشیدہ ہوتی۔

”خدا نظر بد سے بچائے، صاحبزادے بہت خوب صورت ہیں۔ بالکل چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتے ہیں۔“ شجاعت خان اس طرح ٹپو کا ذکر کرتا جیسے وہ خود اپنے بچے کی تعریف کر رہا ہو۔

”تُو نے غلط مثال دی شجاعت خان!“ حیدر علی مصنوعی غصے کا اظہار کرنے لگتا۔ ”تیری آنکھیں دھوکا کھا گئیں۔ ٹپو تو ایک سورج ہے، بادلوں کی پہنچ سے دُور، روشن اور چڑھتا ہوا سورج۔“

شجاعت خان انتہائی محبت آمیز لہجے میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا۔

”صاحبزادے اب بولنے بھی لگے ہیں۔ ماشاء اللہ بہت شیریں اور دلکش آواز ہے۔ مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ بابا کب آئیں گے؟“

حیدر علی فوراً منہ پھیر لیتا اور شجاعت خان کو یہ راز سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ ایک اتنی اعصاب رکھنے والا باپ، بیٹے کی معصوم باتیں سن کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔



آخر ایک سال کی مزید جدوجہد کے بعد حیدر علی ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

رقم شمار کرتے وقت شدت جذبات سے وزیراعظم نندراج کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر جب وہ آخری روپیہ بھی گن چکا تو اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”حیدر علی! میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔ تم نے میری لاج رکھ لی۔“

”آپ کے احسانات کا مجھے بہت پاس رہتا تھا مہاشتری!“ حیدر علی بھی اس موقع پر جذباتی نظر آ رہا تھا۔

”خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں یہ قرض ادا کر دیا۔“

”میرا احسان ہی کیا تھا حیدر علی۔“ خوشی کی زیادتی سے نندراج کی سانس پھولنے لگی تھی۔

”وہ تو ایک معمولی سی ملازمت تھی۔ مگر جواباً تم نے جو کچھ کیا، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ میرے تصور اور اندازے سے بھی زیادہ۔ اگر میرا وہ احسان قرض تھا تو تم نے سود در سود سے بھی زیادہ ادا کر دیا۔“ نندراج بار بار چاندی کے روپیوں سے بھری ہوئی ان بوریوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔

”ہم مسلمان ہیں مہاشتری!“ حیدر علی نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا۔ ”ہمارے مذہب میں احسان چھوٹا ہو یا بڑا، بہر حال احسان ہوتا ہے اور احسان کا بدلہ سوائے احسان کے کچھ نہیں

ہوتا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ نندراج نے ممنونیت کے لہجے میں کہا۔

”آپ کو معلوم ہی تو نہیں مہاشتری!“ حیدر علی کا لہجہ اُداس بھی تھا اور شکایت آمیز بھی۔

”اگر معلوم ہوتا تو اہل میسور یہ کیوں کہتے کہ حیدر علی غدار تھا اور آزمائش کے وقت ریاست کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا گیا۔“

”دیوتاؤں کی قسم! میں اس الزام سے بری الذمہ ہوں۔“ نندراج نے بے اختیار کہا۔

”مجھے تمہارے زخم کی سوزش کا خوب اندازہ ہے کہ میں بہت جلد اس کا اندمال کروں گا۔ مجھے سرنگا پٹم پہنچنے تو دو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“



اور پھر کچھ دنوں بعد ہی نندراج نے ایک کروڑ روپے گھوڑوں اور خچروں پر لا د کر سرنگا پٹم روانہ کر دیے۔

راجہ کرشنا نے وہ رقم مرہٹوں کو ادا کرنے کے بجائے سرکاری خزانے میں جمع کر دی اور خاموشی سے وقت کی نئی کروٹ کا انتظار کرنے لگا۔

نندراج کے اس عمل سے وزیروں میں ناقابل بیان خوشی کی لہر دوڑ گئی جیسے وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گئے ہوں اور وہ نئے انداز سے وزیراعظم کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ دوسری طرف رانیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ بار بار کھنڈے راؤ سے مشورے کر رہی تھیں کہ اب کیا ہوگا؟

کھنڈے راؤ بے عقل عورتوں کو بڑے ریاکارانہ انداز میں جھوٹی تسلیاں دے رہا تھا۔

”ابھی میری کمان میں بہت سے تیر باقی ہیں۔ فی الحال حیدر علی کی ماں، بیوی اور بچے کو اس کے پرانے مکان میں منتقل کر دیا جائے۔“

”اگر حیدر علی کو یہ راز معلوم ہو گیا کہ میں نے اس کے گھر والوں کے ساتھ یہ جارحانہ سلوک کیا تھا؟“ رانی کا منہ تنہائی میں کھنڈے راؤ کے سینے پر سر رکھے کسی سپہ ہونے بچے کی طرح سوال کر رہی تھی۔

کھنڈے راؤ کے ہونٹوں پر ایک فریب کار مسکراہٹ ابھر آئی۔

”حیدر علی کو کون بتائے گا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہے؟ میرے مہرے اتنے کمزور نہیں۔ اگر کسی نے زبان کھولی تو اس کی چتا کو آگ لگانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔“

”پھر حیدر علی کے بیوی بچے کو جس بے جا میں رکھنے کا الزام کس کے سر جائے گا؟“ رانی کا منہ کھنڈے راؤ کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

”راجہ کرشنا کے سر۔“ کھنڈے راؤ آہستہ آہستہ اپنی شاطرانہ چالوں کے اسرار کھول رہا تھا۔

کھنڈے راؤ کے اس ریاکارانہ مظاہرے پر راجہ کرشنا کو تو کوئی حیرت نہ ہوئی کہ وہ اسی کا آدمی تھا۔ مگر نندراج کے لئے کھنڈے راؤ کا یہ خوشامد نہ طرز عمل بڑا حیران کن تھا۔ وزیراعظم میسور نے بہت غور سے اس دراز قامت مرہٹے کی طرف دیکھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ حیدر علی ان تمام باتوں سے بے نیاز نظر آ رہا تھا اور جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس نے استقبالیہ جشن کے سلسلے میں رسمی طور پر راجہ کرشنا کا شکریہ ادا کیا اور بہت تیز رفتاری سے محل میں داخل ہو گیا۔ اہل خانہ کو پرانے مکان میں دیکھ کر حیدر علی کو سخت تعجب ہوا تھا مگر اس نے وقتی طور پر اپنے ذہن سے تمام خیالات کو جھٹک دیا اور والدہ مجیدہ بیگم کے سامنے کسی خدمت گار کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ حیدر علی اپنی والدہ کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ لوگ اس کی مثال پیش کیا کرتے تھے۔ مجیدہ بیگم نے زارہ قطار روتے ہوئے بیٹے کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ٹیپو کی طرف اشارہ کیا جو بڑی حیرت سے حیدر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”سپاہی! تم کیسے ہو؟“ حیدر علی اپنے چار سالہ بیٹے ٹیپو سے مخاطب ہوا تو شدت جذبات سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”آپ کون ہیں؟“ ٹیپو کا لہجہ بہت شیریں تھا مگر آنکھوں سے حیرت اور اجنبیت کا تاثر نمایاں تھا۔

”سپاہی! میں تمہارا بابا ہوں۔“ حیدر علی نے جھک کر ٹیپو کو آغوش میں لے لیا۔ وہ شروع ہی سے اپنے بیٹے کو سپاہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

”میرے بابا تو دشمنوں سے جنگ کرنے بہت دور گئے ہوئے ہیں۔“ ٹیپو نے رک رک کر کہا۔ اس کی آنکھیں مستقل حیدر علی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

حیدر علی نے فاطمہ بیگم کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔

”صاحب! آپ اس وقت گھر سے نکلے جب ٹیپو ایک سال کا تھا۔“ رقت کے سبب فاطمہ بیگم کو بات کرنے میں بہت زیادہ دشواری پیش آرہی تھی۔ ”تین سال بعد گھر لوٹے ہیں۔ آپ نے وقت کا شمار نہیں کیا۔“

”بیگم! بچ کہا آپ نے۔ فاصلے انسانی خدوخال کو صرف دھندلا ہی نہیں کرتے، مٹا بھی دیتے ہیں۔“ اس جذباتی فضا نے حیدر علی کو بھی زلا دیا تھا۔ ”والد صاحب جب مجھ سے بچھڑے تھے تو میری عمر پانچ سال تھی۔ مجھے ان کے چہرے کے نقش و نگار آج بھی یاد ہیں۔ مگر وہ گھر سے نکلے تو لوٹ کر نہیں آئے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ٹیپو زندگی بھر اپنے بابا کو یاد کرتا رہتا اور مجبور بابا وقت کے غبار میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتا۔ مگر اللہ نے تم لوگوں کی دعائیں سن لیں۔ میں جانتا ہوں کہ تیشی کے کہتے ہیں۔ خدا میرے دشمنوں کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔“

پھر جب آہستہ آہستہ جذبات کا چڑھا ہوا سیلاب اتر گیا تو حیدر علی نے اپنی والدہ مجیدہ بیگم سے ان کی در بدری کے بارے میں پوچھا۔ جواباً مجیدہ بیگم اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکیں کہ

”اور اگر راجہ نے انکار کر دیا؟“ رانی کانتا کے دلکش چہرے پر خوف و ہراس کے گہرے سائے لرز رہے تھے۔ ”تم نہیں جانتے پران! کہ حیدر علی کیسا جلا آدمی ہے۔ مجھے اس کی وابستگی کا سن کر بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے بہت پرارتھنا کی تھی کہ وہ کسی جنگ میں مارا جائے مگر دیوتاؤں نے میری ایک بھی نہیں سنی۔“ رانی کانتا اپنے ناآسودہ جذبول کی غلام تھی، اس لئے کھنڈے راؤ کو پران (محبوب) کہہ کر پکارتی تھی اور اس شخص کو جلا دیکھتی تھی، جس نے اسے ماں کا درجہ دیا تھا۔

کھنڈے راؤ جیسے بازی گر انسان نے رانی کانتا کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اب ساری ڈوریاں اس کے ہاتھ میں تھیں اور وہ ایک جوان بیوہ کو کھٹکتی کی طرح نچا رہا تھا۔

”راجہ کے انکار سے کیا ہوگا؟ وہ لاکھ انکار کرے مگر حیدر علی اس کی کوئی بات تسلیم نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ وہ ریاست کا حاکم ہے اور اس کے حکم کے بغیر اتنے بڑے کام کی تکمیل ممکن نہیں۔“

کھنڈے راؤ کی دلیل سن کر رانی کانتا نے ایک جاندار فقہرہ لگایا۔ اب اس کے سرے سارا بوجھ اتر گیا تھا۔

”میں نے حیدر علی اور راجہ کرشنا کے درمیان نفرت کا بیج بو دیا ہے۔“ کھنڈے راؤ خوب صورت رانی کی قربت اور نشے کی شدت کے اثر سے بیٹھا جھوم رہا تھا۔ ”بس اب ایک ہی کام باقی رہ گیا ہے کہ کسی طرح حیدر علی اور نندراج میں ٹھن جائے۔ پھر میسور کا تخت تمہارے قدموں کے نیچے ہوگا۔“

اگرچہ رانی کانتا نے شراب نہیں پی تھی لیکن اس کی آنکھیں کسی بادہ کش کے مانند خمار آلود نظر آ رہی تھیں اور وہ دوبارہ میسور کی حکمرانی کے خواب دیکھ رہی تھی۔

کھنڈے راؤ کے منصوبے کے مطابق دوسرے دن ہی مجیدہ بیگم، فاطمہ بیگم اور ٹیپو سلطان کو پرانے مکان میں منتقل کر دیا گیا جو ایک اعلیٰ فوجی افسر کے شانیاں شان تھا۔



پھر چند روز بعد وزیراعظم نندراج اور حیدر علی بھی سرنگا پٹم پہنچ گئے۔

راجہ کرشنا نے سیاست و مصلحت سے کام لیتے ہوئے قلعے سے باہر نکل کر حیدر علی اور نندراج کا استقبال کیا۔ اب وہ نئے انداز سے دوسری بازی کھیل رہا تھا۔

عیار کھنڈے راؤ ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں حیدر علی کے قدموں میں جھک گیا اور چیخ کر کہنے لگا۔

”میرا مالک واپس آ گیا اور اس کے ساتھ ہی میسور کی قسمت بھی لکھی گئی۔ سیاہ رات بھی ڈھل گئی۔ اب ہر طرف سورج کی تیز روشنی ہوگی اور دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی۔“





سپہ سالار کا عہدہ سنبھالتے ہی حیدر علی سب سے پہلے بیٹے کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ ہوا۔ ٹیپو اب چار سال کا ہو گیا تھا۔

اس وقت سرنگاپٹم میں سید اکرام بخاری کے فضل و کمال کی دھوم تھی۔ سید موصوف کا پورا خاندان دہلی میں آباد تھا۔ شاہان مظاہر اس خاندان کا بہت احترام کرتے تھے۔ علمی اور مذہبی خدمات کے سلسلے میں مغل حکمرانوں نے سید اکرام بخاری کے بزرگوں کو بڑی بڑی جاگیریں بطور نذر پیش کی تھیں۔ مگر سید صاحب سارے عیش و آرام چھوڑ کر ریاست میسور میں مستقل طور پر مقیم تھے اور برسوں سے تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ سید صاحب نے سرنگاپٹم میں اپنا ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا مگر وہ چند مخصوص بچوں ہی کو درس دیا کرتے تھے۔

حیدر علی نے اپنے معتمد شجاعت خان کے ذریعے سید اکرام بخاری کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ وہ ٹیپو سلطان کی تعلیم و تربیت کے لئے محل تشریف لے آیا کریں۔

حیدر علی کا پیغام سن کر سید صاحب غضب ناک ہو گئے۔

”ضرورت مند وہ ہے یا میں؟..... علم اس طرح حاصل کیا جاتا ہے؟..... وہ میرے در پر سوالی بن کر کیوں نہیں آیا؟“

شجاعت خان لرز کر رہ گیا۔ اس نے ایسا باجروت انسان آج تک نہیں دیکھا تھا۔ سید چٹائی کے فرش پر بیٹھے تھے مگر لہجے میں شہنشاہوں سے زیادہ رعب و جلال تھا۔

شجاعت خان نے واپس جا کر یہ واقعہ سنایا تو حیدر علی خود حاضر خدمت ہوا اور اس نے ٹیپو کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں سید اکرام بخاری سے درخواست کی۔ سید صاحب نے حیدر علی سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ہر کس و نا کس کو تعلیم نہیں دیتے۔

”پہلے میں دیکھوں گا کہ تیرا بچہ علم کی امانت کا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی ہے یا نہیں؟“

حیدر علی دوسرے دن ٹیپو سلطان کو لے کر سید اکرام بخاری کی درس گاہ میں پہنچا۔ سید صاحب بہت دیر تک ٹیپو کے معصوم اور نازک چہرے کو دیکھتے رہے۔ پھر بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

”ہاں! میں اس پر اپنا خون جگر صرف کروں گا۔ یہ میرے علم کا بار گراں اٹھا لے گا۔“ سید صاحب نے دوران گفتگو کئی بار بڑے والہانہ انداز میں ٹیپو کو پیار کیا۔ ”یہ وہی بچہ ہے، جسے میں برسوں سے ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”آپ کسے ڈھونڈ رہے تھے؟“ حیدر علی نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔

”یہ تیرے بچھنے کی باتیں نہیں۔“ سید صاحب نے اسی قلندرانہ شان کے ساتھ جواب دیا۔

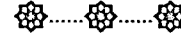
”مقررب ساری دنیا جان لے گی کہ میں کسے ڈھونڈ رہا تھا۔“



وہ نقاب پوش سپاہی تھے جو ہر وقت ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

حیدر علی سمجھ گیا کہ اس کے خلاف منظم سازش کی گئی ہے اور اصل مجرم دیز پردوں کے پیچھے حرکت کر رہے ہیں۔

”آپ لوگ کسی قریبی شخص سے بھی اس واقعے کا ذکر نہ کریں۔“ حیدر علی نے اپنے اہل خانہ کو ہدایت کی۔ ”مجھے کسی نئے طوفان کے آثار نظر آرہے ہیں۔“



حیدر علی کے سرنگاپٹم پہنچنے کے دوسرے دن ہی راجہ کرشنا نے ایک بہت بڑی سرکاری تقریب کا اہتمام کیا۔

جب سارے درباری اور معززین شہر جمع ہو گئے تو راجہ میسور نے حیدر علی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے فخر ہے کہ میری ریاست میں اس جیسا جانباز موجود ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو سرنگاپٹم بھی نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ میرے خاندان کا بھی نام و نشان مٹ جاتا۔ یہ حیدر علی کے طاقتور بازوؤں ہی کا کمال ہے کہ وہ ڈوبتی ہوئی تیا کا کھیلون ہار بنا اور اسے کھینچ کر کنارے تک لے گیا۔ میں حیدر علی کی بہادری کو پر نام کرتا اور اسے ہاروک شردھا (دلی عقیدت کے جذبات) پیش کرتا ہوں۔“

راجہ کرشنا کے دائیں ہاتھ پر وزیر اعظم نندراج کی نشست تھی اور بائیں ہاتھ پر حیدر علی بیٹھا تھا۔

مختصر سے وقفہ رسکوت کے بعد راجہ کرشنا نے حیدر علی کو ”فتح حیدر بہادر“ کا خطاب دینے ہوئے اسے میسور کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔

”آج سے حیدر علی ہی مرہٹوں سے گفتگو کرنے کا مجاز ہوگا۔“

حیدر علی کے سالارِ انواج مقرر ہونے پر نندراج نے بے حد خوشی کا اظہار کیا تھا کہ اس طرح اس کا ایک معتمد زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ مگر جب راجہ کرشنا نے مرہٹوں کے حوالے سے مذاکرات کے تمام اختیارات حیدر علی کو سونپ دیئے تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

حیدر علی نے اپنی نشست پر کھڑے ہو کر راجہ کرشنا کو سلام پیش کی اور بہترین الفاظ میں اس کی نوازشات کا شکریہ ادا کیا۔ جواباً والی میسور بھی کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے سونے کا ایک مرصع ہار، حیدر علی کو پہنایا جس میں قیمتی ہیرے جگمگا رہے تھے۔

اس تقریب کے موقع پر سرکاری زنان خانے میں حیدر علی کی والدہ مجیدہ بیگم اور بیوی فاطمہ بیگم بھی موجود تھیں۔ رانی لکشم با اور رانی دیواجی منی نے ان دونوں کو بھی سونے کے ہار پہنائے۔ رانی کانتا، حیدر علی کی اس ترقی کو برداشت نہ کر سکی اور اس کے سینے میں حد تک انکارے دہکنے لگے۔

ٹیپو کو سید اکرام بخاری کے کتب میں داخل کرانے کے بعد حیدر علی نے اپنی بیوی فاطمہ بیگم سے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ آنے والا دن میدان جنگ میں گزرے گا یا قبر میں کئے گا۔“

شوہر کی بات سن کر فاطمہ بیگم پریشان نظر آنے لگیں تو حیدر علی نے انہیں ٹوک دیا۔

”تم ایک مرد جانناز کی شریک حیات ہو۔ میں اپنے ذاتی مسائل بیان کر کے تمہیں الجھانا نہیں چاہتا۔ تمہاری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے بچے کی نگہداشت پر پوری توجہ دو۔ خوش قسمتی سے ٹیپو کو سید صاحب جیسا استاد کامل میسر آ گیا ہے۔ اسے ان کی درس گاہ سے کبھی الگ نہ کرنا اور خود بھی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی رہنا۔ تم انہیں اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق و مہربان پاؤ گی۔“

اس مختصر سی گفتگو کے بعد حیدر علی نے بیوی کو اپنے کمرے سے رخصت کر دیا اور پوری رات اس طرح ٹہلتا رہا جیسے اسے کوئی سنگین مسئلہ درپیش ہو۔

پھر صبح ہوتے ہی حیدر علی نے اپنی فوج کو سرنگا پٹم کی حدود سے نکل کر سرا کے صوبیدار گوپال راؤ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

یہ بڑا عجیب فیصلہ تھا۔ راجہ کرشنا نے حیدر علی کو مرہٹوں سے سیاسی معاملات طے کرنے کا اختیار ضرور دیا تھا مگر کسی کو یہ اُمید نہیں تھی کہ حیدر علی مذاکرات کے بجائے جنگ کا انتخاب کرے گا۔ فوج کی روانگی کے وقت راجہ تو خاموش رہا مگر وزیراعظم نندراج کسی قدر ناگوار لہجے میں بول اٹھا۔

”تم نے مجھ سے مشورہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی؟“

”میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ حیدر علی نے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”مہاشنتری اطمینان رکھیں کہ میں آپ کے مفادات کے خلاف کوئی کام نہیں کر رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر حیدر علی گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا اور نندراج پریشان نظروں سے اُٹھتے ہوئے غبار کو دیکھنے لگا۔

حیدر علی کی آمد کی خبر سن کر مرہٹہ فوج بھی سرنگا پٹم کی طرف بڑھی۔ میسور کے برق رفتار سپاہیوں نے گوپال راؤ کو نصف فاصلہ بھی طے کرنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ دونوں فوجیں چن ٹین کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہو گئیں۔ اسی رات حیدر علی کے لشکر نے ایک خوفناک شب خون مارا۔ مرہٹہ فوج اپنا سارا ساز و سامان اور بہت سی لاشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بالآخر چینی ٹین کی شکست نے گوپال راؤ کو مجبور کر دیا کہ وہ ریاست میسور کے تمام علاقے خالی کر کے سرا کی طرف لوٹ جائے۔

حیدر علی کا یہ دوسرا بڑا کارنامہ تھا جس کے باعث پورے میسور پر اُس کی ہیبت قائم ہو گئی۔ والی میسور اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ راجہ کھنڈے راؤ اور رائیوں کے درمیان خفیہ

مشورے شروع ہو گئے۔ ان سب کے نزدیک نندراج اور دوسرے وزیروں سے نجات حاصل کرنے کا یہی موسم تھا۔

آخر عیار کھنڈے راؤ نے ایک ایسی ترکیب ڈھونڈ نکالی جو نندراج کے اقتدار کے خاتمے کا سبب بن گئی۔ کھنڈے راؤ، پونا کے دربار میں ایک طویل عرصہ گزار چکا تھا۔ اس لئے حکومت کے بہت سے رازوں سے واقف تھا۔ اس نے ایک ماہر کارنگر سے پیشوا بالاجی باجی راؤ کی مہر بنوائی۔ پھر مرہٹی زبان میں راجہ کرشنا کے نام ایک فرمان تحریر کیا۔

”گوپال راؤ میرے ہی حکم پر میسور کے تمام علاقے خالی کر کے سرا کی طرف واپس لوٹ گیا ہے۔ اگر تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو نندراج اور دوسرے وزیروں کو فوری طور پر برطرف کر دو۔ نافرمانی کی صورت میں سرنگا پٹم میری پہنچ سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

پیشوا نے پونا، بالاجی باجی راؤ کا جعلی خط لے کر کھنڈے راؤ، حیدر علی کے پاس پہنچا۔ حیدر علی نے کئی بار اس خط کے ایک ایک حرف کو سنا اور پھر پونا کی سرکاری دستاویز کے ساتھ تہائی میں نندراج سے ملا۔ وزیراعظم میسور کو پہلے تو اس بات پر یقین ہی نہیں آیا مگر جب خود اس نے بالاجی باجی راؤ کا حکم نامہ پڑھا تو سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا۔

”آپ مطمئن ہو کر اپنی جاگیر پر چلے جائیں۔“ حیدر علی نے نندراج کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت دیتا ہوں۔ اس وقت میسور کو بچانے کی یہی ایک صورت ہے کہ آپ استعفیٰ دے دیں۔ حالات سازگار ہوتے ہی دوبارہ آپ کو وزارت عظمیٰ کا منصب پیش کر دیا جائے گا۔“

مجبوراً مہاشنتری نندراج، اس کے چھوٹے بھائی دیو راج اور دوسرے منتر یوں نے اپنے اپنے استعفیٰ پیش کر دیے اور حیدر علی نے ان سب سے اسناد وزارت لے کر راجہ کرشنا کے حوالے کر دیں۔

جس روز نندراج، سنی منگل کی طرف روانہ ہوا، اسی رات راجہ کرشنا نے کھنڈے راؤ اور اپنے چند خاص مصاحبوں کے ساتھ ”سری رنگ ناتھ“ کے مندر میں بڑا ہنگامہ خیز جشن منایا۔ یہ سرنگا پٹم کا سب سے بڑا مندر تھا اور اسی مندر کے طویل و عریض تہہ خانے میں راجہ کرشنا اپنے خفیہ منصوبے بنایا کرتا تھا۔

میسور کی رعایا اسے ایک ہمدرد اور نیک دل حکمران کی حیثیت سے جانتی تھی مگر درپردہ وہ انتہائی ظالم اور اباوش انسان تھا۔ اس نے مندر کے شریف النفس پجاری سوامی دیانند کو نکل کر کے میسور کے ایک شعبہ باز بحیرہل کو اس اعلیٰ منصب تک پہنچایا تھا۔ بڑے پجاری کی جگہ حاصل کرتے ہی بحیرہل نے راجہ کرشنا کے حکم پر مندر سے ملحق کئی سرنگیں اور تہہ خانے تعمیر کرائے تھے کہ اگر کبھی حکمران خاندان پر برا وقت پڑ جائے تو زیر زمین پناہ گاہوں کو استعمال کر کے دشمنوں سے محفوظ رہا جاسکے۔

اس کے بیوی بچے کو قتل کر دیا جائے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ خود ہی مر جائے گا۔“  
 ”ہمیں کھنڈے راؤ!“ راجہ کرشنا نے انتہائی خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”تو حیدر علی کو جانتا نہیں۔ اگر اس کی بیوی اور بچہ ہلاک ہو گئے تو پھر نہ جانے ہر گھر سے کتنی لاشیں اٹھیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پوری ریاست ہی کو شمشان بنا ڈالے۔“  
 ”مہاراج! آپ اس کے بچے کو قتل کیوں نہیں کرتے؟“ یکا یک بھیرول درمیان میں بول اٹھا۔ ”میرے یہ چیلے کس دن کام آئیں گے؟ حیدر علی کے بیٹے کو بھی کوئی کنواری لڑکی سمجھ کر اغوا کر لیں گے۔ پھر بازی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔“ بھیرول کے چہرے پر بڑی بے حیائی اور سفاکی برس رہی تھی۔

”خاموش رہ سوامی!“ راجہ کرشنا نے بھیرول کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تو نے سپہ سالار میسور کے بیٹے کو کسی مزدور و کسان کی لڑکی سمجھا ہے؟ وہ ٹیپو کی تلاش میں تیری بنائی ہوئی ایک ایک سرنگ اور ایک ایک تہہ خانے کو کھدوا ڈالے گا۔ میں جانتا ہوں کہ راج بھون (محل) کا کیا حشر ہوگا۔ شاید وہ اسے بھی مسمار کر دے۔ میں جانتا ہوں کہ حیدر علی کس ارادے کا انسان ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔“

بھیرول نے آج تک حیدر علی کو نہیں دیکھا تھا مگر راجہ کرشنا کی باتیں سن کر اس جیسے جاہل اور پتھر انسان کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

کھنڈے راؤ کی عیار آنکھیں بھیرول کے چہرے پر مرکوز تھیں اور اس کا فتنہ گردماغ، مندر کے تہہ خانے سے نکل کر خیالات کی مختلف شاہراہوں میں بھٹک رہا تھا۔

”آپ کے کتنے چیلے ہوں گے سوامی؟“ کھنڈے راؤ نے انتہائی سرد لہجے میں بھیرول سے پوچھا۔

”سینکڑوں۔“ شعبہ باز سوامی نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔

”تو پھر اپنے چیلوں کو حکم دیتے کہ وہ اس بار کسی خوب صورت لڑکی کے بجائے حیدر علی کو اغوا کر لیں۔“ کھنڈے راؤ کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

”مجھے مذاق سوچا ہے کھنڈے راؤ! اور ہماری جان پر بنی ہوئی ہے۔“ یکا یک راجہ کرشنا غضب ناک نظر آنے لگا۔ ”اگر حیدر علی کو آج ہی قابو میں نہیں کیا گیا تو آنے والا کل اسے بہت زیادہ طاقتور بنا دے گا۔ جو شخص کھڑے کھڑے نند راج جیسے مضبوط انسان کو میسور کی ریاست سے بے دخل کر سکتا ہے، وہ کسی دن مجھ سے بھی آنکھیں پھیر سکتا ہے۔ پھر میرا اور میرے خاندان کا کیا انجام ہوگا؟ میں نے حیدر علی کو سپہ سالار اس لئے بنایا تھا کہ وہ مجھے نند راج اور دوسرے وزیروں سے نجات دلانے میں معاون ثابت ہو۔ میری چال کامیاب ہوگی۔ اب میں حیدر علی کو ایک دن بھی اس منصب پر برقرار رکھنا نہیں چاہتا۔“

”پر بھو! میں آپ کی اسی مشکل کو آسان کرنے کی تدبیر سوچ رہا ہوں۔“ کھنڈے راؤ کا

ان تہہ خانوں میں ایک خاص کمرہ راجہ کرشنا کے لئے وقف تھا۔ دہری شخصیت رکھنے والا میسور کا یہ حکمران اکثر راتوں کو اسی کمرے میں دادِ عیش دیا کرتا تھا۔ بھیرول کے سینکڑوں چیلے، جوگیوں کے بھیس میں مگر نگر گھومتے اور خوب صورت لڑکیوں کو اغوا کر کے ان ہی زمین دوز عشرت کدوں میں پہنچا دیتے۔ راجہ کرشنا، رعایا کے سامنے دیوتاؤں کی پوجا کرتا اور پھر سوامی بھیرول کے کمرے سے گزر کر اس تہہ خانے میں چلا جاتا جو رات کے اندھیرے میں بھی ”راجہ اندر کے اکھاڑے“ کی طرح روشن رہتا تھا۔ یہاں وہ جی بھر کے شراب پیتا اور اپنی پسندیدہ لڑکی کو بے آبرو کر کے وحشیانہ تہقہ لگاتا۔ پھر وہ نصیب لڑکی، دیوداسیوں کی طویل قطار میں شامل کر دی جاتی اور زندگی بھر حکومت کے دوسرے اہلکاروں کی خدمت کرتی رہتی۔

نند راج اور دوسرے وزیروں سے نجات حاصل کر کے راجہ کرشنا، سری رنگ ماتھ کے مندر پہنچا اور اس نے بھیرول سے کھنڈے راؤ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”سوامی! یہ ہے میرا دماغ، جس نے نند راج اور اس کے ساتھیوں کو گرجھ کی طرح نگل لیا۔ آج میں اس کی بدولت آزاد ہوا ہوں۔“ راجہ نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں کھنڈے راؤ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”آج تو اس کی سیوا کر۔ اب یہی میرا دایاں بازو ہے۔“

راجہ کا اشارہ پاتے ہی سیم تن اور نوخیز رقاصاؤں کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے پورا تہہ خانہ گونج اٹھا۔ پھر جب آدھی رات کے قریب ہنگامہ ناؤ نوش سرد ہوا تو میسور کے حکمران نے بڑے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”کھنڈے راؤ! ابھی میں آزاد کب ہوا ہوں؟ پہلے نند راج کا غلام تھا، اب ہندو مذہب کے دشمن کا غلام ہوں۔“ راجہ کرشنا کا اشارہ حیدر علی کی طرف تھا۔

”نند راج کو تو یہ سمجھو کہ زندہ چھوڑ دیا کہ وہ بہر حال اپنا ہم مذہب ہے۔“ یکا یک نفرت و غضب کی آگ سے کھنڈے راؤ کا چہرہ جلنے لگا۔ ”مگر حیدر علی کو اس دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں اس کا سر کاٹ کر دیوی کی بھیئت چڑھاؤں گا۔ شیواجی کے جاہ و جلال کی قسم! اور رنگ زیب کی پوری قوم سے مرہٹوں کی توہین کا انتقام لوں گا۔“

یہ کہہ کر کھنڈے راؤ اپنے دائیں جانب جھکا اور اس نے راجہ کرشنا سے سرگوشی کرتے ہوئے کچھ کہا۔

چند لمحوں کے لئے راجہ کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے مگر پھر اچانک اس کی آنکھوں سے خوف کا رنگ جھلکنے لگا۔

”سوامی بھیرول بھی اپنا خاص آدمی ہے۔ اس کے سامنے پردہ داری کی ضرورت نہیں۔“ راجہ کرشنا نے کھنڈے راؤ کی سرگوشی کے جواب میں کہا۔

عیار کھنڈے راؤ نے ایک نظر بھیرول کی طرف دیکھا اور پھر والی میسور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میرے ذہن میں حیدر علی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے دو ترکیبیں ہیں۔ ایک یہ کہ

ہماری پیش کردہ توجہ کو بلا تاخیر قبول کر لے۔“  
 راجہ کرشنا اپنی آنکھوں میں خود مختاری اور آزادی کے خواب سجا کر محل کی طرف لوٹ گیا۔



کھنڈے راؤ روزانہ مندر آتا۔ سوامی بھیرول کے چیلوں کو حیدر علی پر حملے کی مشق کراتا اور پھر رات گئے تک شراب اور نوخیز داسیوں سے دل بہلاتا۔ راجہ کرشنا کی عنایت سے اسے بھیرول کا عشرت کدہ میسر آ گیا تھا، اس لئے کھنڈے راؤ کی زندگی بڑے نشاط انگیز ہنگاموں کے درمیان بسر ہو رہی تھی۔ رانی کاٹا اس کی مستقل غیر حاضری کی شکایت کرتی تو وہ اسے بڑی آسانی سے یہ کہہ کر بہلا دیتا۔

”رانی! میں یہ سب کچھ تمہاری ہی حکمرانی کے لئے کر رہا ہوں۔“ اگرچہ ادو باش کھنڈے راؤ چند مہینوں ہی میں اس بیوہ عزت کی قربت سے اکتا گیا تھا لیکن وہ سیاست و مصلحت کے پیش نظر رانی کاٹا سے بڑے غماز آلود اور سحر کار لہجے میں گفتگو کرتا۔ ”دیوالی کی آخری رات کو حیدر علی کے مکان میں خوفناک اندھیرا ہو گا اور تمہارے خوابوں کے محل میں نئے چراغ جلیں گے۔ میں ان چراغوں میں اپنا خون شامل کرنے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔“

رانی کاٹا، کھنڈے راؤ کی مسرور کن باتوں سے بہل جاتی اور عجیب سی سرشاری کے عالم میں اس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر نئے انداز سے پرانے خواب دیکھنے لگتی۔

کھنڈے راؤ نے اپنی ہوس کی تکمیل کے لئے بھیرول جیسے غلیظ انسان کی روحانی شخصیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور ایک ہی ملاقات میں اسے ”سوامی“ کے درجے سے بلند کر کے ”مہاتما“ بنا ڈالا تھا۔ غرض ریاست میسور کے تمام منافق، جھوٹے، احسان فراموش اور بدکار ایک ہی مرکز پر جمع تھے۔ میسور کے چند ہندو سپاہی بڑی رازداری کے ساتھ بھیرول کے چیلوں کو خنجر کا وار کرنے اور تلوار چلانے کی تربیت دے رہے تھے۔



آخر دیوالی کی اختتامی تقریب کا دن آپہنچا اور ریاست میسور کے دستور کے مطابق حیدر علی اس تقریب میں شرکت کرنے کے لئے اپنے گھر سے نکلے ہی والا تھا کہ اس کے معتد بہ خاص شجاعت خان نے کہا۔ ”سرکار! آپ فولادی بکتر پہننا بھول گئے۔“  
 ”کیا میں کسی میدان جنگ میں جا رہا ہوں کہ آہنی زہ پہن کر گھر سے نکلوں۔“ حیدر علی نے کسی قدر ہنسی کے ساتھ کہا۔

”آپ کے اہل خانہ کے ساتھ جو عذاب ناک واقعہ پیش آیا تھا، وہ اس حقیقت کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ آپ کا اپنا گھر، تلحہ اور میسور کا ایک ایک گوشہ زمین آپ کے لئے میدان جنگ ہے۔“ شجاعت خان نے درخواست گزاری کے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ حفاظتی تدابیر اختیار کئے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔“

لہجہ اسی طرح سرد تھا۔ ”حیدر علی کے اغوا سے میری مراد ہے کہ اسے سوامی جی کے چیلوں کے ہاتھوں قتل کر دیا جائے۔“  
 ”وہ کس طرح؟“ راجہ کرشنا پر وحشت طاری ہو گئی۔ ”کہیں تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے کھنڈے راؤ؟“

”مہاراج! دیوالی کا تیسرا قریب ہے۔“ کھنڈے راؤ نے اپنے خوفناک منصوبے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میسور کے قانون کے مطابق ریاست کا سپہ سالار بھی ان مذہبی تقریبات میں شرکت کا پابند ہوتا ہے۔ پھر جیسے ہی حیدر علی یہاں پہنچے گا، سوامی جی کے چیلے مندر کی طرف سے تقسیم کیا جانے والا پرشاد اسے پیش کریں گے۔ حیدر علی کسی جہت کے بغیر اس مٹھائی کو اپنے حلق سے اُتار لے گا اور پھر چند لمحوں میں ہمیشہ کے لئے گہری نیند سو جائے گا۔“  
 راجہ کرشنا نے چونک کر کھنڈے راؤ کی طرف دیکھا۔ ”اگر کسی وجہ سے یہ تدبیر ناکام ہو گئی..... اور حیدر علی نے زہر آلود مٹھائی کھانے سے انکار کر دیا تو؟“

”سوامی جی کے تمام چیلے بظاہر جوگیوں کے لباس میں ہوں گے۔ ان سب کو شمشیروں اور خنجروں سے مسلح کر دیا جائے گا۔“ کھنڈے راؤ بڑے اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا، جیسے یہ کسی طاقتور شخص کو قتل کرنے کے بجائے اسے محبت و عقیدت کے ہار پہنانے کی تقریب ہو۔  
 ”سوامی جی کے چیلے اگر حیدر علی کو زہر دینے میں ناکام ہوئے تو وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس پر حملہ کر دیں گے اور پھر سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔“

”وہ میسوری انواج کا سپہ سالار ہے کھنڈے راؤ! کوئی تہا سپاہی نہیں۔“ راجہ کرشنا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ دیوالی کی مذہبی تقریبات میں شرکت کرنے کے لئے پوری فوج لے کر تو نہیں آئے گا؟“ کھنڈے راؤ نے والی میسور کے خوف اور اندیشوں کو دُور کرنے کے لئے ایک مضبوط دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ سے زیادہ چند سپاہی اس کے ہمراہ ہوں گے اور سوامی جی کے چیلے بڑی آسانی کے ساتھ ان فوجوں کو سپہ سالار سے دُور کر دیں گے۔“

”میں تیری ذہانت کا شروع ہی سے مترف رہا ہوں کھنڈے راؤ!“ اب راجہ کرشنا مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ ”تیرا منصوبہ تو مکمل ہے مگر پھر بھی ہمیں سارے امکانات پر غور کر لینا چاہئے۔ بالفرض حیدر علی اس حملے میں زندہ بچ گیا تو وہ اپنے خلاف کی جانے والی سازش کی تحقیق ضرور کرائے گا۔ پھر ہم اسے کیا جواب دیں گے کہ حملہ آور کون تھے۔“

”پہلے تو حیدر علی بچے گا نہیں۔ اور اگر بچ گیا تو کہہ دیا جائے گا کہ یہ مندر راج کے آدمیوں کا کام ہے۔“ کھنڈے راؤ کا ذہن بہت دُور تک سوچ رہا تھا۔ ”حیدر علی نے براہ راست وزیر اعظم کو اس کے عہدے سے الگ کیا ہے، اس لئے مندر راج کی دشمنی اور انتقام کی بات بہت زیادہ منطقی ثابت ہوگی۔ نتیجتاً حیدر علی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا کہ وہ



کواس کی زمین سے بھی محروم کر دیا۔ اس المناک حادثے کے بعد وہ تلاشِ معاش میں سرنگا پٹم چلا آیا۔ شجاعت خان اس وقت اٹھارہ سال کا ایک قوی بیکل نوجوان تھا۔ مضبوط جسمانی ساخت کی وجہ سے اسے جلد ہی راجہ میسور کی فوج میں ملازمت مل گئی۔ یہاں وہ فوجی تربیت کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔ شب و روز کی مشقت اور ریاضت نے شجاعت خان کو سپاہیوں کے ہجوم میں نمایاں کر دیا۔ اور جب حیدر علی، ڈنڈیگل کا گورنر بنا تو اس نے نندراج سے کہہ کر اس ہوش مند سپاہی کو اپنے خاص دستے میں شامل کر لیا۔ پھر یہ راہ و رسم اتنی بڑھی کہ حیدر علی اسے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا۔ اور آج وہی شجاعت خان، حیدر علی کو مختلف نصیحتیں کرتا ہوا ”سری رنگ ناتھ“ کے مندر کی طرف جا رہا تھا۔



سوامی بھیرول نے حیدر علی کا پُر جوش استقبال کیا اور اسے اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دی۔ مگر حیدر علی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔  
”میں ایک مسلمان ہوں، کسی بت کدے میں داخل نہیں ہو سکتا۔“  
بھیرول تیزی سے واپس لوٹ گیا اور جاتے جاتے اپنے چیلوں کو اشارہ کر گیا کہ وہ منصوبے کے مطابق اپنی کارروائی شروع کر دیں۔

سوامی کے قزاق چیلے دیوالی کی تقریب کے حوالے سے اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے بدست ہو کر ناچنے لگے۔ حیدر علی پہلے بھی اس قسم کے مظاہرے دیکھ چکا تھا، اس لئے اسے سادھوؤں کے پُر جوش رقص پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ سوامی کے چیلوں نے بڑی ہوشیاری سے حیدر علی اور شجاعت خان کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ چاہتے تو یہی تھے کہ حیدر علی تہارہ جائے مگر شجاعت خان اپنے سپہ سالار کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ پھر بھی یہ لٹیرے سادھو، حیدر علی کے باقی سپاہیوں کو اس سے دُور رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پھر یکا یک سوامی بھیرول کا ایک چیلا، تھالی لے کر آگے بڑھا جس میں لوبان کے ساتھ دیگر خوشبوئیں بھی سلگ رہی تھیں۔ سادھو نے منافقانہ عقیدت کے ساتھ حیدر علی کی آرتی اُتاری اور جب وہ سالار میسور کے ماتھے پر تک لگانے لگا تو حیدر علی پیچھے ہٹ گیا۔  
”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

فوراً ہی دوسرا سادھو آگے بڑھا جس کے ہاتھ میں مختلف مٹھائیوں سے بھرا ہوا ایک تھال تھا۔  
”سینا پتی! یہ پرشاد کھا لیجئے۔“ سادھو نے مٹھائی کا ٹکڑا، حیدر علی کی طرف بڑھا دیا۔  
”رک جائیں سرکار!“ شجاعت خان نے مداخلت کی اور اسی تھال سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر سادھو کو دیا۔ ”اس خوشی کے موقع پر پہلے آپ کھائیں مہاراج!“  
سادھو کے چہرے کا رنگ فاق ہو گیا۔ ”ہم کسی غیر ہندو کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھاتے۔“

حیدر علی نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور لباس کے نیچے فولادی بکتر پہن لیا۔ اس کے بعد ریاست میسور کا سپہ سالار اپنے ہمراہ دس سپاہی لے کر مندر کی طرف روانہ ہوا۔ شجاعت خان بھی حیدر علی کے ساتھ تھا اور اسی نے ان سپاہیوں کا انتخاب کیا تھا۔ یہ سپاہی نہ صرف مسلمان تھے بلکہ حیدر علی کے انتہائی وفادار بھی تھے۔

”میں نے سرکار سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ آپ کسی دعوتِ طعام میں آنکھیں بند کر کے شریک نہیں ہوں گے۔“ شجاعت خان نے راستے میں حیدر علی سے کہا۔ ”چاہے اس دعوت کا اہتمام خود راجہ کرشنا ہی نے کیوں نہ کیا ہو۔“

”شجاعت خان! تو اپنی عقل سے زیادہ سوچنے لگا ہے۔“ حیدر علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”دماغ پر اتنا زور نہ دیا کر۔ تو تو یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے سائے پر بھی شک کرنے لگوں۔“

”سرکار کچھ بھی کہیں مگر میرا اس دنیا پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔“ شجاعت خان نے آہستہ سے کہا۔ ”کسی کی ترقی سے خوش ہونے کے لئے پہاڑ سے بڑا دل چاہئے۔ کیا اپنے اور کیا بیگانے، سبھی کے سینوں میں چوٹیوں سے بھی زیادہ چھوٹے دل ہیں۔ پھر آپ کسی سے کیا توقع رکھتے ہیں؟“

حیدر علی نے اپنے بائیں جانب پلٹ کر تعریفی نظروں سے شجاعت خان کو دیکھا۔ ”تو بہت محبت کرنے والا انسان ہے شجاعت خان! مگر تجھے اندازہ نہیں کہ میں بھی تجھ سے بہت محبت کرتا ہوں۔“

”خوب اندازہ ہے سرکار! جب ہی تو اس دروازے پر آ پڑا ہوں۔“ یہ کہتے کہتے شجاعت خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

شجاعت خان، بنگلور کا رہنے والا ایک معمولی کسان تھا۔ ایک سال بنگلور میں خوفناک بارش ہوئی جس کے نتیجے میں کچا مکان گر گیا اور شجاعت خان کے بوڑھے ماں باپ طبعے میں دب کر مر گئے۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کے باعث شجاعت خان نے اپنی مختصر سی زمین بوڑھے زمیندار امراؤ خان کے پاس رہن رکھ دی۔ ماں باپ نے بچپن ہی میں شجاعت خان کی ملگنی خاندان کی ایک خوب صورت ترین لڑکی زینت جہاں سے طے کر دی تھی۔ مگر اس سال بنگلور میں ہونے والی خوفناک بارشیں صرف انسانوں اور کھڑی فصلوں ہی کو نہیں بلکہ تمام جذبوں اور رشتوں کو بھی ہمارا کر لے گئیں۔ زینت جہاں کے ماں باپ نے بھوک اور افلاس سے تنگ آ کر اپنی نوخیز اور سیم تن بیٹی کی شادی بوڑھے اور سیاہ فام زمیندار امراؤ خان سے کر دی۔

شادی سے پہلے زینت جہاں نے رورو کر شجاعت خان کی بہت منت و سماجت کی کہ وہ اسے یہاں سے کہیں دُور لے جائے۔ مگر شجاعت خان کی غیرت نے فرار کے اس شرمناک فعل کو گوارا نہیں کیا۔ آخر سانسوں کے سیلاب میں زینت جہاں کو بوڑھے امراؤ کی دلہن بنا دیا گیا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ دو سال کے اندر ہی اندر امراؤ خان نے سودور سود کا حساب لگا کر شجاعت خان

”تو پھر ہم کسی غیر مسلم کے ہاتھ سے یہ مٹھائی کیوں کھائیں؟“ شجاعت خان کے لہجے سے شدید طنز جھلک رہا تھا۔ ”اگر تو ہمارے ہاتھ سے نہیں کھاتا تو پھر اپنے ہاتھ سے کھا۔“ شجاعت خان نے چیخ کر کہا۔ ”تجھے یہ مٹھائی کھانا ہی پڑے گی۔“  
سادھو کے لئے اب کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے یہ کہتے ہوئے مٹھائی کا تھال زمین پر پھینک دیا۔

”سپاہی! تو نے اپنا ہاتھ لگا کر بھگوان کے پرشاد کو ناپاک کر دیا۔“  
شجاعت خان بے قابو ہو گیا۔ ”نا بخوار! تو جس چیز کو چھو لے، وہ پاک..... اور ہم جس شے کو مس کر دیں، وہ ناپاک..... میں یہ مٹھائی تیرے حلق میں اتار کر ہی دم لوں گا۔“  
بات بگڑ چکی تھی۔ اچانک چاروں طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔  
”بھگوان کے بھگتو! دیوالی مناؤ اور خون کے چراغ جلا نا شروع کر دو۔“

یہ کہتے ہی سواری کے تمام جیلوں نے اپنے گروے لباس کے نیچے چھپی ہوئی تلواریں اور خنجر نکال لئے۔ حیدر علی اور شجاعت خان سنبھل گئے مگر اس عمل میں انہیں کچھ دیر لگی۔ بھیرول کے بہت سے چیلے بیک وقت حیدر علی پر حملہ آور ہوئے تھے مگر انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ سالار میسور اپنے لباس کے نیچے اتنی زڑہ پہنے ہوئے ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سادھوؤں کی شمشیریں بے اثر ثابت ہوئیں۔ مگر شجاعت خان کے بازوؤں اور سینے پر کئی گہرے زخم نمایاں ہو چکے تھے۔  
پھر دیکھتے ہی دیکھتے حیدر علی کی شمشیر بھی بے نیام ہو گئی اور سادھوؤں کے سر اُن کے جسموں سے الگ ہو کر زمین پر گرنے لگے۔ اسی دوران شجاعت خان نے چیخ چیخ کر حیدر علی کے باقی سپاہیوں کو بھی خبردار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں مندر کے باہر کھلے میدان میں جنگ چھڑ گئی۔  
آخر ایک گھنٹے کی شدید مزاحمت کے بعد حیدر علی نے بھیرول کے مسلح چیلوں پر قابو پایا۔ سو سے زیادہ ہلاک ہو چکے تھے۔ کچھ شدید زخمی حالت میں زمین پر پڑے ہوئے تھے اور باقی فرار ہو چکے تھے۔ اس تصادم میں حیدر علی کے بھی تین سپاہی جاں بحق ہوئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد سرنگاپٹم میں ایک کہرام سا برپا ہو گیا۔ حیدر علی کی پوری فوج نے ”سری رنگ تاتھ“ کے مندر کا محاصرہ کر لیا۔ شجاعت خان بہت زیادہ زخمی تھا۔ اسے رتھ میں ڈال کر فوجی چھاؤنی تک پہنچایا گیا۔ راجہ کرشنا اور کھنڈے راؤ بھی حیدر علی کی مزاج پرسی کے لئے مندر پہنچ گئے۔

پھر زخمی سادھوؤں کو راجہ کرشنا کے حکم پر اسی رات قید خانے میں قتل کر دیا گیا۔ جرم کے سارے نشانات مٹائے جا چکے تھے۔ حیدر علی نے صحیح صورت حال جاننے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ راجہ کرشنا اور کھنڈے راؤ نے حیدر علی پر کئے جانے والے اس حملے کو مندر راج اور دوسرے وزیروں کی سازش قرار دیا۔ حیدر علی ذاتی طور پر اس الزام کو مانتے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مگر واقعے کا پس منظر اس قدر غبار آلود تھا کہ سالار میسور کو کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ مجبوراً اُس

نے خاموشی اختیار کر لی۔  
سید صاحب بھی حیدر علی کی مزاج پرسی کے لئے اس کے گھر تشریف لائے اور کھلے لفظوں میں سالار میسور کو نصیحت کی۔  
”وہ یہود و نصاریٰ ہوں یا ہنود، مسلمانوں کا کوئی دوست نہیں ہے۔“  
اس کے بعد سید صاحب نے حیدر علی کو چاندی کی ایک انگٹھی پیش کی جس پر قرآن کریم کی یہ آیت درج تھی۔

”میرے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کار ساز ہے۔“  
”اللہ نے تمہیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا۔“ سید صاحب انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرما رہے تھے۔ ”اس خوشی کے موقع پر ایک فقیر تمہیں اور کیا دے سکتا ہے؟ بہر حال اسے قبول کر لو۔“  
”آپ مجھ گناہ گار کے گھر تشریف لے آئے، بس میرے لئے یہی اعزاز کافی ہے۔“ سید صاحب کی شفقت و مہربانی دیکھ کر حیدر علی رونے لگا۔ ”آپ سید زادے ہیں اور میں آپ کے در کا ادنیٰ ترین غلام۔“

یہ کہہ کر حیدر علی نے انگٹھی کو بوسہ دیا اور پھر سید صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنے دست مبارک سے انگٹھی پہنا دیں۔  
سید اکرام بخاری نے حیدر علی کو انگٹھی پہنائی اور بہت سی دعائیں دے کر اپنی خانقاہ کی طرف لوٹ گئے۔

طویل علاج کے بعد شجاعت خان کے مہلک زخم مندمل ہوئے اور وہ مرتے مرتے بچا۔ حیدر علی نے اپنے جاں نثار ساتھی کا جشنِ صحت بہت دھوم دھام سے منایا اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تو سچ کہتا تھا شجاعت خان! یہ دنیا اعتبار کے قابل نہیں رہی۔“



ٹیپو سلطان ایک غیر معمولی ذہین لڑکا تھا۔ اس نے ایک سال کے مختصر سے عرصے میں ناظرہ قرآن شریف ختم کیا۔ پھر جب سید صاحب کے حکم پر ٹیپو نے بہترین حفاظ کی موجودگی میں کتاب الہی کی تلاوت کی تو تمام علماء یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مشکل ترین مقامات پر بھی ایک پانچ سالہ بچے کی زبان نہیں لڑکھڑائی اور وہ دریا کی روانی کی طرح قرآن مقدس کی قرأت کرتا رہا۔ پھر جب مرحبا اور آفرین کی صداؤں سے سید اکرام بخاری کی خانقاہ گونجنے لگی تو حیدر علی کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے اور اس نے بے اختیار کہا۔

”یہ سب سید عالی مقام کی محبتوں کا صدقہ ہے کہ مجھ ان پڑھ کے بچے پر علم کا سایہ پڑا۔ خدا میری عمر دیوں کا ازالہ کر دے اور ٹیپو کو صاحبِ سیف و قلم بنادے۔“  
حیدر علی کی اس دعا کے جواب میں سید اکرام بخاری اور دیگر علمائے کرام نے با آواز بلند

آہا۔ حیدر علی سپاہیوں کی جنگی مشقیں دیکھنے فوجی چھاؤنی جا چکا تھا۔ شجاعت خان نے مختصر آمجدہ بیگم اور فاطمہ بیگم کو سید صاحب کی شکستہ حالت کے بارے میں بتایا اور پھر وہ سید صاحب حیدر علی کے پاس پہنچا۔

حیدر علی نے اپنی ساری مصروفیات ترک کر دیں اور گھوڑے پر بیٹھ کر تیز رفتاری کے ساتھ سید اکرام بخاری کی درس گاہ کی طرف روانہ ہوا۔

”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سید صاحب کے کسی قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔“ شجاعت خان نے اپنا گھوڑا حیدر علی کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ ”وہ غم سے بہت زیادہ غڑھال نظر آرہے تھے۔“

”خدا ہی جانے کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔“ حیدر علی کے لہجے میں شدید اضطراب پوشیدہ تھا۔ ”کسی سے دل کا حال کہتے بھی تو نہیں۔“ سالار میسور بار بار گھوڑے کو ایزدے رہا تھا کہ یہ طویل فاصلہ جلد از جلد ختم ہو جائے۔

حیدر علی نے کئی مرتبہ تیز دستک دی مگر پس دیوار کوئی آہٹ تک سنائی نہیں دی۔ آخر سالار میسور نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔

”سید صاحب! حیدر علی آپ کی مزاج پر سی کو حاضر ہے۔ خدا کے واسطے دروازہ کھولے۔“ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور خدا کا واسطہ کام آگیا۔ کچھ دیر بعد سید صاحب نے دروازہ کھولا۔ انہیں دیکھ کر حیدر علی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ سید صاحب برسوں کے بیمار نظر آرہے تھے۔ اور اس وقت بھی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔

”میں اس یقین کے ساتھ حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے اپنے غم میں ضرور شریک کریں گے۔“ حیدر علی نے کسی سوالی کے لہجے میں کہا۔

سید صاحب نے اشکبار آنکھوں سے سالار میسور کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کے لئے کہا۔ جب حیدر علی اور شجاعت خان درس گاہ میں داخل ہو گئے تو سید صاحب نے دروازہ بند کر دیا۔

”میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا کہ تُو آئے تو اپنے سینے پر رکھی ہوئی آگ کی سیل اتار بیچوں۔“ مجھ سے اس غم کی پیش برداشت نہیں ہوتی۔ سید تو جل چکا، اب میری روح بھی پختگی جا رہی ہے۔“ سید اکرام بخاری کسی بچے کی طرح ہلکے ہلکے کر رہے تھے۔ ”گھر کے بھیدیوں نے گھر میں آگ لگا دی اور غدار گیدڑوں نے میرے شیر کو مار ڈالا۔“

سید صاحب کی حالت زار دیکھ کر حیدر علی کی آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں مگر وہ گھر کے بھیدیوں اور ”شیر کے قتل“ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔

”سید عالی مقام! یہ گھر کے بھیدی کون ہیں اور آپ کا شیر کون تھا؟“ حیدر علی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

آئین کہا۔

پھر سالار میسور نے تمام حفاظ اور علماء کو قیمتی نذریں پیش کیں۔ سید صاحب نے یہ سارے تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بس حیدر علی کی خوشنودی کے لئے ایک دستار اپنے سر پر باندھ لی۔ حیدر علی نے سید صاحب کو پیش کی جانے والی ساری نذریں ان کے شاگردوں میں تقسیم کر دیں۔ سید اکرام بخاری نے سالار میسور کے اس عمل پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

شیو سلطان بیک وقت عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس نوعمری کے باوجود وہ درس کے دوران اپنے استاد سے بڑے عجیب عجیب سوال کرتا۔ سید صاحب، شیو کی ذہانت اور بے باکی سے بہت خوش ہوئے۔ مگر جب ان کے عمر رسیدہ شاگرد، ایک بچے کے اس عمل پر اعتراض کرتے تو سید صاحب سختی سے انہیں خاموش ہو جانے کا حکم دیتے۔

”اسے کچھ نہ کہو۔“ سید صاحب بڑی محبت سے شیو کی پشت پر ہاتھ رکھ دیتے۔ ”اسے بولنے دو۔ بڑی بے زبانی کا دور آنے والا ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے منہ میں زبائیں ہوں گی۔۔۔ مگر کوئی بولے گا نہیں۔ سب گونگے بن جائیں گے۔ صرف میرا یہ شاگرد بولے گا۔ میرا جانا زبیا، شیو۔ اللہ میری زندگی کے ماہ و سال بھی اس کی عمر میں شامل کر دے۔“ یہ کہتے کہتے سید صاحب رونے لگتے اور درس گاہ کے در و دیوار پر گہرا سکوت طاری ہو جاتا۔

پھر ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ شجاعت خان، شیو سلطان کو اپنی مگرانی میں سید صاحب کی درس گاہ تک پہنچایا کرتا تھا۔ جب تک درس جاری رہتا، شجاعت خان بھی سید صاحب کے مکان کے دروازے پر کسی پیرے دار کی طرح کھڑا رہتا۔ اور پھر درس ختم ہو جانے کے بعد شیو کو اپنے ساتھ لے کر محل واپس آتا۔ حیدر علی نے شجاعت خان کو کئی بار سمجھایا تھا کہ وہ یہ معمولی سی ذمے داری کسی دوسرے سپاہی کو سونپ دے مگر شجاعت خان ہر مرتبہ ایک ہی دلیل پیش کرتا۔

”یہ معمولی ذمے داری نہیں ہے سرکار! میں شہزادے کو کسی دوسرے شخص کے حوالے نہیں کر سکتا۔ مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے۔“ شجاعت خان جوش محبت میں شیو کو شہزادہ کہہ کر پکارتا تھا۔ حیدر علی مسکرا کر خاموش ہو جاتا۔ شجاعت خان کے روز و شب شیو کے لئے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ اس روز بھی شجاعت خان، شیو کو لے کر سید صاحب کی درس گاہ پہنچا۔ سید صاحب نے حسب معمول دروازہ کھولا تو شجاعت خان انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ سید صاحب کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”تم جاؤ شجاعت خان! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جب دل سنبھل جائے گا تو درس کا سلسلہ جاری کر دوں گا۔“ یہ کہہ کر سید اکرام بخاری نے دروازہ بند کر لیا۔

شجاعت خان آوازیں دیتا رہ گیا۔ وہ شیو کے استاد گرامی کی مزاج پر سی کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ مگر سید صاحب نے دروازہ نہیں کھولا۔ شجاعت انتہائی پریشانی کے عالم میں شیو کو لے کر محل واپس

”تو میرے شیر کو نہیں جانتا؟“ شدت غم کے باعث سید صاحب کے لئے بات کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ ”بنگال میں نواب سراج الدولہ کو شہید کر دیا گیا۔ اس کے سوا میرا شیر کون ہو سکتا ہے؟“

”نواب سراج الدولہ شہید کر دیئے گئے؟“ حیدر علی کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ سنبھلا اور انتہائی حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ ”میری معلومات تو یہی ہیں کہ ابھی سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان جنگ جاری ہے۔ پھر آپ کو کیسے خبر ہو گئی کہ نواب شہید کر دیئے گئے؟“

حیدر علی کو اس بات پر حیرت تھی کہ اتنی دور ہونے والی لڑائی کے بارے میں ایک گوشہ نشین انسان کس طرح باخبر ہو سکتا ہے۔

”مجھے خبر نہیں ہو گی تو پھر کسے ہو گی؟“ شدید رقت کے سبب سید صاحب کی آواز ڈوبتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”مرنے والا میرے ہی جسم کا ایک حصہ تھا۔ جب اسے کاٹ کر میرے بدن سے الگ کیا گیا تو پھر تکلیف کے محسوس ہو گی؟..... مجھے یاد دنیا والوں کو؟“

حیدر علی عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ سید صاحب کے احترام میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا اور ان کی بات ماننے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ مجبوراً خاموش ہو گیا۔

سید صاحب بہت دیر تک اپنے دل کا غبار نکالتے رہے۔

”آج ان گیدڑوں نے میرے ایک شیر کو قتل کیا ہے، کل دوسرے کو مار ڈالیں گے۔ اے اللہ! میری آنکھیں کب تک یہ خوں رنگ تماشا دیکھیں گی؟ میرے شیروں کو فتح و نصرت کی زندگی دے یا پھر ان گیدڑوں پر اپنا خوف ناک عذاب نازل کر۔ اور اگر تیری مشیت میں کچھ اور ملے ہو چکا ہے تو پھر اپنے اس گناہ گار بندے اکرام بخاری کو دنیا سے اٹھالے۔“

پھر کچھ دیر بعد سید صاحب اسی شکستہ حالت میں اٹھے اور حیدر سے کہا۔ ”آؤ! تم لوگ بھی میرے شیر کی غائبانہ نماز جنازہ میں شریک ہو جاؤ۔“

حیدر علی اور شجاعت خان نے وضو کیا اور پھر درس گاہ میں صرف تین آدمیوں نے نواب سراج الدولہ کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ حیدر علی دل سے یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ سراج الدولہ شہید ہو چکا ہے۔ مگر وہ سید صاحب کے حکم کے احترام میں نماز ادا کرنے کے لئے مجبور تھا۔

دوسرے دن سید صاحب کے تمام شاگردوں نے جن میں ٹیپو بھی شامل تھا، سراج الدولہ کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن شریف کا ختم کیا۔ حیدر علی پڑھا لکھا نہیں تھا، اس لئے کتاب الہی کی تلاوت تو نہ کر سکا مگر سید صاحب کی دعا میں شریک ہوا۔ سید صاحب نے اس قدر گریہ زاری کے ساتھ سراج الدولہ کی مغفرت کی دعا کی کہ دیگر حاضرین کے ساتھ معصوم ٹیپو بھی رونے لگا۔ سید صاحب اپنی دعا کے دوران بار بار سراج الدولہ کے لئے شیر کا لفظ استعمال کر رہے تھے۔

جب دعا ختم ہو گئی تو معصوم ٹیپو نے بڑے حیرت زدہ لہجے میں سید صاحب سے پوچھا۔

”آپ کا شیر کون تھا؟ شیر تو ایک خطرناک جانور کو کہتے ہیں۔“

انتہائی شکستہ ہونے کے باوجود سید صاحب، ٹیپو کے اس بے ساختہ سوال پر مسکرانے لگے۔ ”شیر خطرناک نہیں ہوتا بیٹے! اللہ نے اسے شجاعت و طاقت بخشی ہے، اس لئے وہ دوسرے جانوروں پر حکمرانی کرتا ہے۔ میرا شیر انسان تھا اور آدمیوں پر حکومت کرتا تھا۔ مگر اُسے گیدڑوں نے مل کر مار ڈالا۔“

”ایک سید صاحب کا لہجہ سوگوار ہو گیا تھا۔“

”گیدڑ، شیر کو کس طرح مار سکتے ہیں؟“ معصوم ٹیپو نے اپنے استاد گرامی سے انتہائی ذہانت کا ایک اور سوال کر ڈالا۔

”بیٹے! جب تُو بڑا ہو جائے گا تو اس راز کو سمجھ لے گا کہ گیدڑ، شیر کو کس طرح مارتے ہیں۔“ سید صاحب، نواب سراج الدولہ کی شہادت کا ناخوشگوار واقعہ سنا کر معصوم ٹیپو کے ذہن پر برا اثر ڈالنا نہیں چاہتے تھے اس لئے انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے کم سن شاگرد کو ”شیر اور گیدڑ“ کے استعاروں میں الجھا کر بات ختم کر دی تھی۔

مگر بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ ”شیر اور گیدڑ“ کے الفاظ، ٹیپو سلطان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ اکثر تنہائی میں اپنے باپ سے ان ہی دو جانوروں کے بارے میں مختلف سوالات کرتا۔ حیدر علی بڑی وضاحت کے ساتھ ٹیپو کے سامنے شیر کی صفات بیان کرتا۔ یہاں تک کہ ٹیپو بے اختیار پکار اٹھتا۔

”بابا! میں بھی بڑا ہو کر شیر بنوں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ یہ گیدڑ مجھے کس طرح مارتے ہیں۔“

پھر ٹیپو، سید صاحب کے سامنے بھی اپنے اسی عزم کا اظہار کرنے لگا۔

سید صاحب اپنے معصوم شاگرد کی باتیں سن کر وارفتہ ہو جاتے اور اس کی کشادہ پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہتے۔

”مجھے پیدا کرنے والے نے شیر ہی پیدا کیا ہے۔ اور تُو میرا سب سے بڑا شیر ہے۔ اللہ تجھے گیدڑوں کی مکاری سے محفوظ رکھے۔“

پھر کچھ دن بعد ہی ریاست میسور کے در و بام اس الم ناک خبر کی بازگشت سے گونجنے لگے۔ ”جنگِ پلاسی میں انگریزوں کو فتح ہوئی اور نواب سراج الدولہ شہید کر دیئے گئے۔“

حیدر علی بیک وقت حیرت و اضطراب میں مبتلا تھا۔ اضطراب یوں کہ ایک جانناز مسلمان حکمران نے عیارِ فرنگیوں سے شکست کھائی اور آزاد ہندوستان روز بروز انگریزوں کے بچھائے ہوئے دامِ غلامی سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور حیرت یوں کہ سینکڑوں میل کا فاصلہ حائل ہونے کے باوجود سید صاحب کو ایک ماہ قبل سراج الدولہ کی شہادت کی خبر کس طرح ہو گئی تھی۔

آج حیدر علی کو اندازہ ہوا تھا کہ یہ یورپا نشین کون ہے اور اللہ نے اسے کیسی زبردست بینائی عطا کی ہے۔

پھر جب اس جنگ کی تمام تر تفصیلات حیدر علی تک پہنچیں تو اس کی آنکھوں میں نفرت کا



سری رنگ ناتھ کے مندر کے قریب پیش آنے والے حادثے نے حیدر علی کو بہت زیادہ متاثر بنا دیا تھا۔ اگرچہ شجاعت خان نے بار بار اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ سوامی بھیرول سے اس واقعے کے بارے میں باز پرس کرے لیکن حیدر علی ہر مرتبہ یہ کہہ کر بات کو ٹال دیتا۔

”شجاعت خان! ہم لوگ ہندوؤں کی مملکت میں رہتے ہیں۔ یہاں کا حکمران ہندو ہے اور ہم اس کی حکومت کے ملازم ہیں۔ ہماری فوج میں بھی اکثریت، ہندو سپاہیوں کی ہے۔ اور بھیرول ان کا مذہبی پیشوا ہے۔ اگر میں نے سوامی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو میسور کی رعایا کے جذبات مشتعل ہو سکتے ہیں۔“ حیدر علی نے اس نازک موقع پر انتہائی صبر و ضبط اور ذہانت کا مظاہرہ کیا تھا۔

تاہم سالار میسور نے شجاعت خان کے کہنے سے اپنے چند معتمد سپاہی، مندر کے قریب متعین کر دیے تھے۔ شجاعت خان کو شک تھا کہ حملہ آور سادھوؤں کا کوئی نہ کوئی تعلق سوامی بھیرول سے ضرور ہے۔ شجاعت خان نے کھنڈے راؤ پر بھی شبہ ظاہر کیا تھا کہ وہ راجہ کرشنا کا آدمی ہے۔

”اگر میں تیری بات مان لوں تو پھر مجھے اپنی آدمی سے زیادہ فوج پر بھی شک کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس کی اکثریت ہندو سپاہیوں پر مشتمل ہے۔“ حیدر علی نے کھنڈے راؤ کے حوالے سے شجاعت خان کے شبہات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا۔ ”کھنڈے راؤ دل و جان سے میرا وفادار ہے۔“

حیدر علی کا یہ دعوئی محض اس لئے تھا کہ کھنڈے راؤ اکثر مواقع پر راجہ کرشنا سے اپنی بیزارگی کا اظہار کرتا رہتا تھا۔

کھنڈے راؤ کی وفاداری کے سلسلے میں حیدر علی کے پُر زور دلائل سن کر شجاعت خان مجبوراً خاموش ہو جاتا۔

کئی ماہ کی مسلسل نگرانی کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آخر حیدر علی کے تجربوں نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ مندر کے قرب و جوار میں اس مخصوص جلیے کا کوئی سادھو نظر نہیں آیا اور ان لوگوں نے ایک بار بھی کھنڈے راؤ کو مندر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ البتہ مہاراج پابندی کے ساتھ روزانہ شام کی عبادت میں شرکت کرنے کے لئے مندر آتے ہیں۔ اور یہ بات سرگٹا پٹم کا ہر شخص جانتا ہے کہ راجہ کرشنا ایک عبادت گزار حکمران ہے جو سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے باوجود شام کی پوجا میں بلا ناغہ شرکت کرتا ہے۔

اس تحقیق و جستجو کے بعد کھنڈے راؤ کی شخصیت شکوک و شبہات کے الزام سے بری ہو چکی تھی۔ مگر حیدر علی اور شجاعت خان کو یہ راز معلوم نہیں تھا کہ راجہ کرشنا اور کھنڈے راؤ کے جاسوسوں نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ حیدر علی کے آدمی دن رات مندر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ نتیجتاً کھنڈے راؤ نے اپنا راستہ بدل دیا اور وہ ان خفیہ سرنگوں سے گزر کر سوامی بھیرول کے

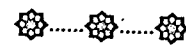
غبار بھر گیا اور سینہ غصے کی آگ سے جلنے لگا۔ انگریزوں نے یہ جنگ شجاعت و ہنرمندی سے نہیں جیتی تھی۔ فرنگی بس ایک ہی فن جانتے تھے کہ بے ضمیروں کو کتنی قیمت میں خریدا جاسکتا ہے۔ نواب سراج الدولہ کے چار معتمد سالار میر جعفر، میر قاسم، دلچرام اور جگت سیٹھ انگریزوں کی سبائی ہوئی نیلام گاہ میں فروخت ہو گئے۔ سراج الدولہ اپنے پچاس ہزار پیدل سپاہیوں، اٹھارہ ہزار سواروں اور پچاس توپوں کے ساتھ ”بھاگیرتی“ ندی کے پاس خیمہ زن تھا۔ پھر یکایک نواب کسی آندھی کی طرح آگے بڑھا اور اس نے تمام انگریزی فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ اب ایک ایک فرنگی، سراج الدولہ کے دم و کرم پر تھا۔ نواب کو یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں انگریز سپاہی تہ تیغ کر دیئے جائیں گے یا انہیں غلام بنالیا جائے گا مگر اس وقت سراج الدولہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اس کے کسی سپاہی کی تلوار، فرنگیوں کے خلاف بے نیام نہیں ہوئی۔

سراج الدولہ کی جس فوج نے انگریزوں کا محاصرہ کیا تھا، وہ خدا اور میر جعفر کے تحت تھی۔ اور میر جعفر، انگریزوں کے ہاتھ جنگل کی قسمت کا سودا کر چکا تھا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ ارکاٹ کے نواب، والا جاہ محمد علی نے بھی اپنی فوج انگریزوں کی مدد کے لئے محاذ جنگ کی طرف روانہ کر دی تھی۔ بس ایک جاں نثار میر مدن تھا، جس نے ایسے سنگین لمحات میں بھی سراج الدولہ کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا۔ مردوں کی طرح لڑا اور مردوں ہی کی طرح جام شہادت پی کر رخصت ہو گیا۔ میر مدن کے شہید ہوتے ہی سراج الدولہ نے میدان جنگ چھوڑ دیا اور اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ مرشد آباد چلا گیا۔ مگر یہاں بھی نواب کے لئے کوئی عافیت گاہ نہیں تھی۔ چند روز بعد ہی میر جعفر کے سپاہیوں نے سراج الدولہ کو گرفتار کر لیا اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر اس کو جانناز کو شہید کر ڈالا۔

اب حیدر علی اس راز کو سمجھا تھا کہ سید صاحب کے نزدیک گھر کے بھیدی کون تھے اور کہاں طرح ایک شیر کو گیدڑوں کی فوج نے مل کر مارا تھا۔ اس المناک واقعے کے بعد حیدر علی اکثر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی باتیں بہت غور سے سنتا۔ سید صاحب کے آنسوؤں میں گئے تھے مگر چہرے پر اب بھی وہی کرب و اذیت کا رنگ نمایاں تھا۔ بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے یکایک ان کے ہونٹوں سے آہ سرد نکل جاتی اور بڑے پُرسوز لہجے میں یہ شعر پڑھنے لگتے۔

غزالاں تم تو واقف ہو، کبوجھوں کے مرنے کی دیوانہ مر گیا آخر کو دیرانے پہ کیا گزری

(یہ شعر راجہ رام نرائن موزوں نے سراج الدولہ کی شہادت سے متاثر ہو کر کہا تھا۔ راجہ رام نرائن، سراج الدولہ کا معتمد ساتھی تھا اور خود بھی نواب کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جنگ رہا تھا)



”بازی اُلٹ چکی ہے۔ اب ہمارے پاس کھنڈے راؤ کی شکل میں آخری مہرہ باقی رہ گیا ہے۔ اسی کو آگے بڑھایا جائے۔“

پھر کچھ دن بعد دونوں رانیوں اور راجہ کرشنا نے حیدر علی سے کہا۔  
 ”یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اتنی بڑی ریاست میں کسی وزیر کا وجود ہی نہ ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ کھنڈے راؤ کو میسور کا وزیر اعظم بنا دیا جائے۔ وہ تمہارا بھی وفادار ہے اور ریاست کے لئے بھی خیر خواہی کے جذبات رکھتا ہے۔“

حیدر علی نے کسی پس و پیش کے بغیر کھنڈے راؤ کے سلسلے میں رانیوں اور راجہ کی سفارشات قبول کر لیں اور اسے نندراج کی جگہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز کر دیا۔  
 شجاعت خان نے کھنڈے راؤ کی بہت مخالفت کی مگر حیدر علی نے یہ کہہ کر اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

”شجاعت خان! تو مخلص بھی ہے اور ذہین بھی..... مگر امور سیاست کی گہرائیوں کو سمجھنا تیرے بس کی بات نہیں۔“



وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ 1761ء میں سیاست کے اُفق پر احمد شاہ ابدالی کا تباہ کن چہرہ ابھرا۔

اس جانباز افغان نے مرہٹوں کی سو سالہ جنگی تیاریوں کا ایک دن میں خاتمہ کر دیا۔ پانی پت کا میدان جو ابراہیم لودھی اور رانا سانگا کی ہلاکت و بربادی کے لئے مشہور ہے، اسی میدان میں مرہٹوں کا جاہ و جلال بھی دفن ہو گیا۔ مرہٹوں کی یہ شکست اتنی عبرت ناک تھی کہ پیشوائے پونا، بالاجی باجی راؤ کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ چند ماہ بسترِ علالت پر ایڑیاں رگڑتا رہا۔ پھر اس طرح دنیا سے رخصت ہوا کہ مرتے وقت اس کے چہرے پر ذلت و بربادی کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ بالاجی باجی راؤ کی موت کے بعد مادھو راؤ ”پیشوائے پونا“ کے منصب پر فائز ہوا اور شکست خوردہ مرہٹہ انوار کی از سر نو تنظیم کرنے لگا۔

مرہٹوں کی شکست نے حیدر علی کی بہت سی مشکلات کو آسان بنا دیا تھا اور اب وہ سکون و اطمینان کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

کئی سال پہلے کرناٹک کے علاقے میں فرانسیسی فوج نے چندا صاحب کی حمایت کی تھی۔ انگریز، فرانسیسیوں سے انتقام لینے کے لئے سخت بے چین تھے۔ مرہٹوں کی شکست کے فوراً بعد فرنگیوں نے نواب ارکاٹ کو اکسایا اور والا جاہ محمد علی نے آگے بڑھ کر پاٹلی جڑی پر حملہ کر دیا۔ فرانسیسیوں نے حیدر علی سے امداد طلب کی اور اس کے صلے میں ”چنچی“ اور ”تیاگرھ“ کے علاقے دینا قبول کئے۔ حیدر علی نے فوری طور پر اپنے برادرِ نسبتی سید محمد کی قیادت میں ایک فوج پاٹلی جڑی کی طرف روانہ کی۔ مگر راستے میں دوسرے سیاسی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔

کمرے تک پہنچتا تھا جو حیدر علی کے خجروں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔

حیدر علی نے اپنے ساتھ پیش آنے والے انتہائی ناخوشگوار واقعے کی یادوں کو ذہن سے کسی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا اور وہ نئے انداز سے اپنی فوج کی تنظیم و تربیت کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان فوجی ملازمت اختیار کریں تاکہ اسے ہندوؤں کے غلبے سے نجات حاصل ہو جائے۔ مگر حیدر علی کی مجبوری یہ تھی کہ ریاست میسور میں نسبتاً کم مسلمان آباد تھے۔ پھر بھی شجاعت خان کی درپردہ کوششوں سے کافی مسلمان، حیدر علی کی مخصوص فوج میں شامل ہو چکے تھے اور وہ سیاسی اعتبار سے روز بہ روز طاقتور ہوتا جا رہا تھا۔

میسور کی رانیاں، راجہ کرشنا اور کھنڈے راؤ، حیدر علی کے ان اقدامات سے بے خبر نہیں تھے۔ یہ سب کے سب روزانہ محل کے ایک خاص کمرے میں جمع ہوتے اور حیدر علی کی طاقت کو محدود رکھنے کے سلسلہ میں مختلف تجویزیں پیش کرتے مگر ان تجویزوں پر عمل کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

”جلد از جلد اس مست ہاتھی کے پیروں میں زنجیر ڈالی جائے۔ ورنہ یہ عنقریب تاج و تخت کو بھی روند ڈالے گا اور ہمارے جسموں کو بھی۔“ ایک دن رانی دیواجی متی نے انتہائی براہِ مہم لہجے میں کہا۔ ”اس سے تو بہتر تھا کہ ہم نندراج، دیوراج اور دوسرے وزیروں کے غلام رہتے۔ کم سے کم وہ ہندو تو تھے۔“ رانی دیواجی متی انتہائی متعصب عورت تھی اور مسلمانوں کے لئے نفرت کے شدید ترین جذبات رکھتی تھی۔

”آخر میں کیا کروں؟“ راجہ کرشنا شدید بے چارگی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ ملتا رہتا اور جب خیالات کی گھٹن حد سے زیادہ بڑھ جاتی تو سر کے بال نوچنے لگتا۔ ”سوچتے سوچتے میرا ذہن شل ہو گیا ہے۔“

رانی لکشمی ما کے تعصب کا بھی وہی عالم تھا مگر وہ فطرتاً سمندر کی طرح ایک گہری عورت تھی اور دوستی کی نقاب پہن کر ہتھ پھٹتے اپنے دشمن کو ڈسنے کا ہنر جانتی تھی۔

”حیدر علی سے اس طرح نجات حاصل نہیں ہوگی۔ ہمارے چہروں پر برسنے والی یہ وحشت اسے اور زیادہ محتاط بنا دے گی۔“ رانی لکشمی ما، راجہ کرشنا اور دوسرے لوگوں کو پرسکون رہنے کی تلقین کرتی۔ ”اگر حیدر علی کو ہماری نیتوں پر ذرا بھی شبہ ہو گیا تو وہ اس خاندان کے اقتدار کا آخری دن ہوگا۔“

ان خفیہ نشستوں کے دوران رانی کا نسا خاموش بیٹھی راجہ کرشنا اور دوسری رانیوں کی گفتگو سنتی رہتی تھی۔ کھنڈے راؤ نے اسے چپ ہی رہنے کا مشورہ دیا تھا کہ اسی خاموشی میں اس کے لئے عافیت تھی۔

آخر طویل غور و خوض اور باہم مشوروں کے بعد رانی لکشمی ما نے یہ تجویز پیش کرنے ہوئے کہا۔

پھر جب سید مخدوم ان مسائل کو حل کرنے کے بعد پاٹلی چری کی طرف بڑھے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہیں دوران سفر خبر ملی کہ والا جاہ محمد علی اور انگریزوں نے مل کر پاٹلی چری کو فتح کر لیا ہے۔ مجبوراً سید مخدوم کی فوج واپس پٹلی اور ارکاٹ کے قریب خیمہ زن ہو گئی۔

اسی زمانے میں مرہٹوں کی شکست کی خبر سن کر میر نظام علی خان والی دکن کا چھوٹا بھائی بسالت جنگ، صوبہ سرا کو مرہٹوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے آگے بڑھا اور اس نے قلعہ ”ہوسکوٹہ“ کا محاصرہ کر لیا۔

بسالت جنگ، قلعہ کشائی کے فن سے ناواقف تھا اس لئے حیدر علی سے امداد کا طالب ہوا۔ حیدر علی نے اس کے سامنے چند شرائط پیش کیں جن کی رو سے فتح حاصل کرنے کے بعد قلعے کے تمام ساز و سامان پر بسالت جنگ کا قبضہ ہو جائے گا۔ ہوسکوٹہ اور اس کے مضافات، حیدر علی کو مل جائیں گے۔ بسالت جنگ دربار دہلی میں سرا کی صوبے داری کے لئے حیدر علی کی جاگیر میں شامل ہو جائے گا۔ بسالت جنگ نے سالار میسور کی تمام شرائط مان لیں اور حیدر علی نے چند روز میں قلعہ ”ہوسکوٹہ“ فتح کر لیا۔

پھر اسی سال مغل شہنشاہ کا سفیر، حیدر علی کے نام سرا کی صوبے داری کا فرمان لے کر میسور آیا۔ اس کے ساتھ ہی حیدر علی کو شہنشاہ کی طرف سے ایک شمشیر زرنگار، سونے کی پاکی اور نقارہ و نشان عطا ہوئے اور ”نواب“ کا خطاب دیا گیا۔

حیدر علی کی شہرت اور ترقی کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ راجہ کرشنا اور میسور کی رانیوں کے ہوش و حواس اڑ گئے تھے۔ ساری ساری رات محل کے خفیہ کمروں میں باہم مشورے ہوتے۔ حیدر علی کو بے دست و پا کرنے کے لئے ہزاروں تدبیریں سوچی جاتیں مگر کوئی ایک ہنر بھی کارگر ثابت نہ ہوتا۔

سوامی بھیرول کے کہنے پر دُور دُور کے علاقوں سے مشہور جادوگروں کو محل میں طلب کر کے حیدر علی کی ہلاکت و بربادی کے لئے سینکڑوں خوفناک منتر بھی پڑھوائے گئے۔ مگر حیدر علی جیسے صحیح العقیدہ مسلمان اور عاشقِ رسول پر ان سفلی عملیات کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ سارے تانترک (جادوگر) تھک ہار کر اپنے اپنے علاقوں کو واپس لوٹ گئے اور جاتے جاتے راجہ کرشنا سے یہ خوف ناک راز بھی کہہ گئے تھے۔

”اس شخص کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس پر آسمان کا سایہ ہے۔“

مجبور ہو کر کھنڈے راؤ نے حیدر علی پر وہ تباہ کار حربہ بھی آزما ڈالا، جس نے بڑے بڑے مردانِ شجاع کو ہوس کا غلام بنا کر بزدلوں کی موت مر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ عیار مر ہٹے نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے پریوش رقا صائیں میسور میں جمع کی تھیں اور پھر انہیں کینروں کا لباس پہنا کر حیدر علی کی خلوت کا شریک بنانا چاہا تھا۔ مگر وہ جاننا سپاہی شراب و شباب کے سائے سے بھی گریزاں رہتا تھا۔ اس لئے کھنڈے راؤ کا یہ ناپاک منصوبہ اسی کے منہ پر اُلٹ

گیا۔ اور حیدر علی نے ایسی تمام عورتوں کو محل سے نکال دیا۔

حیدر علی، راجہ کرشنا کو بھی میسور کی حدود سے نکال کر بڑی آسانی کے ساتھ حکومت پر قبضہ کر سکا تھا۔ لیکن وہ احسان فراموش نہیں تھا۔ ”سرا“ کا صوبے دار بننے کے بعد حیدر علی، راجہ کرشنا کا ملازم نہیں رہا تھا بلکہ خود راجہ کرشنا قانونی طور پر اس کے ماتحت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ ریاست میسور، سلطنتِ مغلیہ کی خراج گزار تھی۔ نتیجتاً یہاں کا راجہ بھی صوبہ دار سرا کے تابع ہوتا تھا۔ اگر حیدر علی کم ظرف ہوتا تو راجہ کرشنا کو اپنے آگے خم ہونے پر مجبور کر دیتا۔ لیکن وہ احسان شناس تھا، اس لئے شکرگزاری کے طور پر راجہ کرشنا کے احترام میں نذر پیش کرتا تھا۔



اب ٹیپو سلطان تقریباً دس سال کا ہو چکا تھا۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ اسے بچپن ہی سے فوجی تربیت بھی دی جا رہی تھی۔

ایک دن حیدر علی نے ٹیپو کو امتحان کی غرض سے سرنگا پٹم کی فوجی چھاؤنی میں طلب کیا اور اپنے سب سے ماہر شمشیر زن، سر بلند خان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے بیٹے سے کسی دشمن کی طرح مقابلہ کر۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں کہ ٹیپو نے شمشیر زنی کا ہنر سیکھا ہے یا تلوار کو کسی کھلونے کی طرح استعمال کیا ہے؟“

سر بلند اور ٹیپو کے درمیان ایک گھنٹے تک مقابلہ ہوتا رہا۔ ٹیپو کے حملہ آور ہونے اور دفاع کرنے کا انداز قابلِ دید تھا۔ اس دوران ٹیپو کے جسم پر ہلکی سی خراش تک نہیں آئی تھی مگر نو عمری کے سبب وہ بہت جلد تھک گیا تھا۔

ٹیپو کو پسینے میں شرابور دیکھ کر سر بلند خان نے اپنا ہاتھ روک لیا اور پلٹ کر حیدر علی سے کہا جو دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ قریب ہی کھڑا ہوا شمشیر زنی کا یہ مقابلہ دیکھ رہا تھا۔

”میں نے اپنا سارا ہنر آزمایا اور ہر لمحے بھی محسوس کرتا رہا کہ میرا مقابلہ ایک دس سالہ بچے کے بجائے کسی پختہ کار سپاہی سے ہے۔“ سر بلند خان بڑے پُراثر لہجے میں ٹیپو کی تعریف کر رہا تھا۔

حیدر علی نے ایک عجیب سے احساسِ فخر کے ساتھ مسکراتے ہوئے بیٹے کی طرف دیکھا۔ پھر ابو حماد کو طلب کیا جو ایک عربی نسل سپاہی تھا اور ٹیپو کو تیر اندازی کی تربیت دیا کرتا تھا۔

”تیری شب و رو کی محنت کیا رنگ لائی ابو حماد؟“ حیدر علی نے ٹیپو کے دوسرے استاد سے پوچھا۔

”عزتِ مآب خود ملاحظہ کر لیں گے کہ میں نے کیا سکھایا اور صاحبِ زادے نے کیا سیکھا۔“ یہ کہہ کر ابو حماد نے دو بانس زمین میں نصب کئے پھر ان بانسوں میں ایک مضبوط ڈوری باندھی گئی۔ اس ڈوری میں تھوڑے فاصلے پر مٹی کے چھوٹے چھوٹے دس گولے الگ الگ

دھاگوں میں بندھے ہوئے لٹک رہے تھے۔ ابوحماد نے ٹیپو کو اشارہ کیا۔ ٹیپو تیر کمان لے کر ایک بانس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ حیدر علی اور دوسرے فوجی افسر بڑی حیرت سے اس پر اسرار تماشے کو دیکھ رہے تھے۔

ابوحماد نے ڈوی کو کئی بار زور زور سے ہلایا۔ مٹی کے گولے مختلف سمتوں میں تیزی سے گردش کرنے لگے۔

”کیا آپ کی مملکت میں کوئی ایسا ماہر فن ہے جو ایک ہی تیر سے ان حرکت کرتے ہوئے دھاگوں کو کاٹ دے؟“

”یہ ممکن نہیں۔“ حیدر علی نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

”مگر میرا یہ شاگرد، ٹیپو سلطان اسے ممکن بنا دے گا۔“ ابوحماد نے پُر غرور لہجے میں کہا۔

ٹیپو سلطان چند لمحوں تک نشانہ لئے ہوئے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے بازو کو حرکت ہوئی۔ یکایک تیر چھوٹنے کی مخصوص آواز اُبھری اور دوسرے ہی لمحے تمام دھاگے کٹ گئے اور مٹی کے گولے زمین پر گر پڑے۔

”شاباش فرزند!“ جوش مسرت میں حیدر علی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار چیخ اٹھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ابوحماد کے کاندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ ”تُو بہت بڑا انسان ہے ابوحماد! میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تُو نے اپنا بے مثال فن میرے بیٹے کو سکھا دیا۔“

اس کے بعد حیدر علی نے ٹیپو کے دونوں استادوں کو انعام و اکرام سے نوازا اور بیٹے کو مزید محنت اور ریاضت کی تلقین کی۔



سرا کا صوبے دار بننے ہی حیدر علی نے ”آبس نگر“ اور ”مدگری“ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ مجبوراً تمام پالیگار سرداروں نے اسے خراج دینا منظور کر لیا۔

حیدر علی کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے راجہ اور رانیوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ آخر کھنڈے راؤ کے مشورے پر حیدر علی کے خلاف ایک بھیاٹک سازش کی گئی۔ راجہ کرشنا نے پیشوائے پونا، مادھوراؤ کو ایک خفیہ خط ارسال کرتے ہوئے لکھا۔

”مقدس پیشوا کو معلوم ہونا چاہئے کہ میسور میں ہندو دھرم بھی خطرے میں ہے اور ہندوؤں کے جان و مال بھی۔ اگر آپ نے ہماری خبر گیری نہ کی تو مغل شہنشاہ کی حمایت سے سپہ سالار حیدر علی بہت جلد دارال حکومت پر قبضہ کر لے گا اور ایک ہندو ریاست ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔“

اس کے ساتھ ہی راجہ کرشنا نے مادھوراؤ کو یہ پیشکش بھی کی تھی کہ حیدر علی سے جنگ کے سلسلے میں جس قدر بھی اخراجات ہوں گے، وہ ریاست میسور کے خزانے سے ادا کئے جائیں گے۔

احمد شاہ ابدالی سے شکست کھانے کے بعد مرہٹے سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے ٹڈال ہوا چکے تھے۔ مادھوراؤ کو راجہ کرشنا کی یہ پیشکش بہت زیادہ سودمند نظر آئی۔ اس نے بلا تاخیر اپنے سپہ سالار ایسا جی پنڈت کو ایک بڑی فوج کے ساتھ میسور کی طرف روانہ کر دیا۔

ایسا جی پنڈت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا۔ میسور کے ہندو سپاہی اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ مرہٹہ لشکر کو ایسے خفیہ راستوں سے گزارا گیا کہ حیدر علی کو دشمن کی نقل و حرکت کی خبر تک نہ ہو سکی۔ یہ راز اس وقت کھلا جب ایسا جی پنڈت، سرنگا پٹم کے قریب پہنچ گیا۔ مرہٹہ سالار بے خبری کے عالم میں حیدر علی کو گرفتار کرنا چاہتا تھا۔

عام راستوں پر راجہ کرشنا کے جاسوس متعین تھے اس لئے حیدر علی کا سرنگا پٹم سے ٹکنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ مجبوراً اس نے اندھیری رات کا انتخاب کیا اور موسلا دھار بارش میں بیوی بچوں کو لے کر سید اکرام بخاری کے مکان پر پہنچا۔

سید صاحب، حیدر علی اور اُس کے اہل خانہ کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

حیدر علی نے مختصر اتمام صورت حال بیان کی اور بیوی بچوں کو سید صاحب کے مکان پر چھوڑ کر دریائے کاویری کی طرف چلا گیا۔ بس نسبتاً یہی ایک محفوظ راستہ تھا۔ دریا کے کنارے پہنچ کر حیدر علی کو اندازہ ہوا کہ جیسے موسم بھی اس کے خلاف سازشیں کر رہا ہو۔ دریا میں شدید طغیانی آئی ہوئی تھی۔

یکایک حیدر علی کو اپنے قریب ہی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ راجہ کے جاسوس سپاہی یہاں بھی آ پہنچے تھے۔

زنجیر غلامی یا غرقابی؟..... حیدر علی نے اپنے آپ سے سوال کیا اور دوسرے ہی لمحے دریائے کاویری میں کود پڑا۔

اندھیری رات، طوفانی بارش، خوف ناک سیلاب..... غرض وہ کون سی آفت تھی، جو اس وقت حیدر علی پر نازل نہیں ہو رہی تھی۔

دریائے کاویری میں کودتے ہی حیدر علی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ موت اس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ کئی بار سرکش موجوں نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ مگر وہ ہر مرتبہ اپنے راستے پر لوٹ آیا۔ حیدر علی کو ناک کی سیدھ میں تیر کر دریا عبور کرنا تھا۔ اگر سیلابی پانی کی وجہ سے اس کا زاویہ بدل جاتا تو پھر جی دشوار یوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ حیدر علی رات کی تاریکی میں بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ اور پھر یہ عین ممکن تھا کہ راجہ کرشنا کے جاسوس سپاہی اسے گرفتار کر لیتے۔ مجبوراً حیدر علی کو دریا کی خاص حدود کے اندر تیرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن بلا خیر موجیں اس سے کسی دشمن کی طرح مزاحم تھیں۔ حیدر علی ایک مایہ ناز تیراک تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اب تک غرق ہو چکا ہوتا یا بے رحم موجیں اسے بہا کر بہت دور لے گئی ہوتیں۔

ایک بار ایسا خوف ناک بھنور پڑا کہ حیدر علی کسی تنکے کی مانند چکرانے لگا۔ سپہ سالار میسور



چھوڑے گا۔“

حیدر علی کی سخت گیری کی وجہ سے راجہ کرشنا، سالار میسور کو راکشش سے تشبیہ دے رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ حیدر علی دوستوں کا قابلِ اعتماد دوست اور دشمنوں کا کھلا دشمن ہے۔ اب جبکہ راجہ کرشنا نے مرہٹہ فوج کو میسور کی سیاست میں مداخلت کی اجازت دے کر خود کو حیدر علی کا دشمن ظاہر کر دیا تھا تو پھر یہ ممکن نہیں تھا کہ حیدر علی اسے معاف کر دے۔ راجہ کرشنا کو پورا یقین تھا کہ وہ بے خبری کے عالم میں حیدر علی کو گرفتار کر لے گا۔ مگر جب حیدر علی سینکڑوں جاسوسوں کی موجودگی میں محل سے نکل کر چلا گیا تو راجہ کرشنا پر وحشت طاری ہو گئی۔

”مہاراج! اگر آپ کی نظر میں حیدر علی، راکشش ہے تو ہم اس سے بھی بڑے راکشش ہیں۔“ ایسا جی پنڈت کو اپنے سپاہیوں کی کثرت کا بڑا نشہ تھا۔ ”آپ صبر تو کریں۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو دن کی بات ہے۔ وہ یہیں کہیں چھپ گیا ہو گا۔ ہمارے پنڈت بہت جلد اسے گرفتار کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیں گے۔“

”جنگلوں کرے ایسا ہو جائے۔“ راجہ کرشنا نے شدید مایوسی کے لہجے میں کہا۔

”ایسا ہی ہو گا مہاراج!“ مرہٹہ سالار نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

کھنڈے راؤ بہت دیر سے خاموش بیٹھا ایسا جی پنڈت اور راجہ کرشنا کی گفتگو سن رہا تھا۔ پھر یکایک اُس کا چہرہ فرط مسرت سے دھکنے لگا۔

”مہاراج! آپ حیدر علی کی گرفتاری کے لئے ایک بڑے انعام کا اعلان کر دیں۔ پھر ہماری مشکل بہت جلد آسان ہو جائے گی۔“ کھنڈے راؤ کے فتنہ گردہن نے سیاست کی بساط پر ایک نئی اور بڑی عجیب چال چلی۔ ”آپ اعلان کے ساتھ یہ وضاحت بھی کر دیں کہ اگر کوئی عام شخص حیدر علی کا پتہ بتائے گا تو اسے ایک لاکھ روپے کے ساتھ وزارت کا عہدہ پیش کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی سپاہی گرفتار کر کے حیدر علی کو مہاراج کے سامنے پیش کرے گا تو اسے میسور کی افواج کا سالار بنا دیا جائے گا۔“

راجہ کرشنا اور ایسا جی پنڈت نے کھنڈے راؤ کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ ضرورت اور ہوس کے بازار میں اکثر لوگوں کے ضمیر پرک جاتے ہیں۔ عیار کھنڈے راؤ، انسان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ راجہ کرشنا، سرنگا پٹم کے گلی کوچوں میں اعلان کرانے کے لئے اپنے ڈھنڈور چیوں کو طلب کرتا، کھنڈے راؤ کے ذہن میں ایک اور ترکیب ابھری۔

”مہاراج! اب حیدر علی کو گرفتاری سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“ کھنڈے راؤ اس قدر جذباتی ہو رہا تھا کہ اس کی آواز جذباتی چیخ میں بدل گئی تھی۔

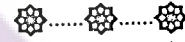
راجہ کرشنا اور مرہٹہ سالار نے چونک کر کھنڈے راؤ کی طرف دیکھا۔

”میں اسی دن کا انتظار کر رہا تھا۔“ کھنڈے راؤ نے انتہائی پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”ہمارا

پراپتا کرا وقت تھا کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ پھر اسی گرداب کا جگر چاک کرنے ہوئے اس نے دعا مانگی۔

”اے خروبر کے مالک! اگر تیری رضا یہی ہے کہ میرا سفینہ حیات غرق ہو جائے اور میں پانی کی خوراک بن جاؤں تو مجھے دریا کی تہہ میں اتار دے تاکہ میرے دشمن مرنے کے بعد مجھ پر قابو نہ پا سکیں۔ اور اگر تو اس کمزور و ناتواں انسان کو ساحلِ مراد تک پہنچا دے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوگی کہ تیرے ہی فضل و کرم سے ساری کشتیاں کناروں کے سائبان تک پہنچتی ہیں۔“ آخر شدید اور طویل کشمکش کے بعد حیدر علی نے بھنور کا سینہ چیر دیا اور دریائے کادیری کو عبور کر کے اس محفوظ مقام تک پہنچ گیا جہاں سے وہ اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ بظاہر حیدر علی کے دست و پاشل ہو چکے تھے مگر اس کے اندر کبھی نہ تھکنے والا ایک انسان موجود تھا اور وہ اپنی اسی غیر معمولی قوتِ ارادی کے سہارے انتہائی تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔

پھر صبح ہوتے ہوتے حیدر علی، سرنگا پٹم کی سرحدوں سے بہت دُور نکل گیا اور صرف بیس گھنٹے کے مختصر سے وقت میں بنگلور پہنچ گیا جہاں اُس کی خاص فوج کا ایک حصہ موجود تھا۔ (یہ بات فوجی نظام کے ماہرین کے لئے آج بھی حیران کن ہے کہ حیدر علی نے اتنے مختصر سے وقت میں اس قدر طویل فاصلہ کس طرح طے کیا تھا۔)



صبح ہوتے راجہ کرشنا، وزیر اعظم کھنڈے راؤ اور مرہٹہ سالار، ایسا جی پنڈت پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ حیدر علی رات کے اندھیرے میں سرنگا پٹم سے فرار ہو چکا ہے۔

”اب کیا ہو گا؟“ راجہ کرشنا وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

”کچھ بھی نہیں ہو گا۔“ کھنڈے راؤ نے عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”حیدر علی کا دور

اقتدار ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ ایک مفور مجرم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔“

”نہیں کھنڈے راؤ!“ راجہ کرشنا نے انتہائی خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”اب وہ ایک ذہنی شیر

ہے اور ہمارے لئے پہلے سے زیادہ خطرناک بن چکا ہے۔ جب تک وہ قتل نہیں ہو جاتا یا گرفتاری کے بعد اسے پنجرے میں نہیں ڈال دیا جاتا، اس وقت تک میں چین کی نیند نہیں سو سکتا۔“

”قتل یا گرفتاری اس کا مقدر ہے مہاراج!“ مرہٹہ سالار ایسا جی پنڈت نے راجہ کرشنا کو

تسلیم دیتے ہوئے کہا۔ ”جلد یا بدیر ہم اس سے نجات حاصل کر لیں گے۔ اب وہ ایک ایسا سپہ سالار ہے، جس کا کوئی لشکر نہیں۔ آخر ایک تنہا انسان کہاں تک بھاگے گا؟“

ایسا جی پنڈت کی اس دلیل نے کسی حد تک راجہ کرشنا کا خوف کم کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔

”حیدر علی کو جلد از جلد گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کر دو۔ تم نہیں جانتے کہ وہ انسان کے روپ میں ایک راکشش ہے۔ ایسا راکشش، جو زیادہ دن تک آزاد رہا تو کسی کو زندہ نہیں

”اس کا مطلب ہے کہ حیدر علی ابھی تک سید کے مکان میں موجود ہے۔ اگر رات بھر کی ہمرانی کے سلسلے میں تمہارا دعویٰ درست ہے تو پھر حیدر علی دن کے اُجالے میں سفر نہیں کر سکتا۔ ہمارے تمام جاسوسوں کی اطلاعات یہی ہیں کہ فرار کے تمام ممکنہ راستوں پر سخت پہرے ابھی تک موجود ہیں۔“

”ہم مہاراج کے نمک خوار و وفادار ہیں اور غلط بیانی ہماری عادت نہیں۔“ جاسوس سپاہیوں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”ہم دن چڑھے محل واپس آئے اور ہم نے رات کے اندھیرے میں اس مکان سے حیدر علی کو نکلنے نہیں دیکھا۔“

حالانکہ حیدر علی پندرہ منٹ سے زیادہ سید اکرام بخاری کے مکان میں نہیں ٹھہرا تھا، اس نے مختصر سے وقت میں تمام صورت حال سے سید صاحب کو آگاہ کیا تھا اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ مکان سے نکل کر دریائے کاویری کی طرف چلا گیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ جب حیدر علی دروازے کی طرف بڑھنے لگا تھا تو سید صاحب نے اسے روک کر دل ہی دل میں کچھ پڑھا تھا اور اس کے چہرے پر دم کر دیا تھا۔ یہ ان ہی آیات الہی کی برکت تھی کہ حیدر علی مکان سے نکل کر راجہ کرشنا کے جاسوسوں کے بہت قریب سے گزرا تھا مگر وہ کھلی اور نگراں آنکھوں کے باوجود اسے دیکھ نہیں سکے تھے۔

”مہاراج کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔“ کھنڈے راؤ نے والی میسور کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”حیدر علی یہی سوچ کر سید کے مکان میں داخل ہوا ہو گا کہ اس طرف کسی کا خیال نہیں جائے گا اور پھر موقع ملے ہی وہ کسی دوسری طرف فرار ہو جائے گا۔“ کھنڈے راؤ اپنی ذہانت کے مطابق جاسوسوں کی فراہم کردہ اطلاع میں نئے نئے پیدا کر رہا تھا۔ ”مگر اس احمق کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ مہاراج کے جاسوس اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔“

کھنڈے راؤ کی بات مکمل ہوتے ہی راجہ کرشنا کسی درندے کی طرح دھاڑا۔ ”پھر کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟..... سید کا مکان محل سے کتنی دور ہے؟ اپنے ہمراہ فوج کا ایک پورا دستہ لے جاؤ اور اس فقیر کے مدرسے کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ اتمام حجت کے طور پر سید سے کہو کہ وہ حیدر علی اور اس کے گھر والوں کو ہمارے حوالے کر دے۔ اگر وہ تمہارا مطالبہ مان لے تو اس بوڑھے کے ساتھ درگزر سے کام لینا کہ وہ اس سلسلے میں زیادہ قصور وار نہیں ہے۔ اور اگر وہ انکار کرے تو اس کا مکان اور مدرسہ دونوں مہاراج کے ڈالو۔“

راجہ کرشنا کا حکم پاتے ہی جاسوسوں کے ہمراہ پانچ سو سپاہی سید اکرام بخاری کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت حیدر علی تنہا تھا یا زیادہ سے زیادہ دس سالہ شیو اس کے ساتھ تھا۔ اس طرح صرف دو انسانوں کو گرفتار کرنے کے لئے راجہ کرشنا نے اپنی فوج کا ایک پورا دستہ بھیج دیا تھا۔

جب میسور کے ہندو سپاہی، سید اکرام کے مکان کے قریب پہنچے تو ان کے دل کی دھڑکنیں

تیز دھار خنجر، حیدر علی کی شہ رگ پر رکھا ہے۔ اب وہ فرار ہوتا تو کجا، اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی ماں، بیوی اور بچے کو فوری طور پر ریغال بنالیا جائے۔“

ابھی وزیراعظم میسور کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ راجہ کرشنا بدحواس ہو کر بول اٹھا۔ ”تُو نے سچ کہا کھنڈے راؤ! اب حیدر علی کے دن پورے ہو چکے۔ اور میرے سر پر رکھا ہوا فکر و پریشانی کا پہاڑ ہٹ گیا۔“

راجہ کرشنا نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر حیدر علی کی والدہ، بیوی اور بچوں کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے چند سپاہی بھیجے۔ شیو کی پیدائش کے آٹھ سال بعد حیدر علی کے یہاں ایک اور خوب صورت لڑکا پیدا تھا۔ سالار میسور نے اس کا نام کریم شاہ رکھا تھا۔ اور اس وقت کریم شاہ دو سال کا تھا۔ راجہ کرشنا کے سپاہی بہت دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالی مکان کو دیکھتے رہے۔ وہاں حیدر علی کے گھر والوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

جب سپاہیوں نے یہ اطلاع راجہ کرشنا کو دی تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ ”حیدر علی خود بھی چلا گیا اور گھر والوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ اس وقت ہمارے جاسوس سپاہی کیا کر رہے تھے؟ بھنگ پیئے اور نہ پڑے تھے؟“ راجہ کرشنا کے منہ سے کف اُڑ رہا تھا اور وہ بے دریغ اپنے خنجروں کو گالیاں بک رہا تھا۔

پھر فوراً ہی ان جاسوسوں کی طلبی ہو گئی جنہیں حیدر علی کے اہل خانہ کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔

”ہم صرف جاسوس ہیں مہاراج! اور ہمارا کام اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہے۔“ سپاہیوں نے بیک زبان کہا۔

”کتو! تم نے تو اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں۔“ راجہ کرشنا کی بدزبانی کا وہی عالم تھا۔ ”اگر تمہاری آنکھیں کھلی ہوتی تھیں تو بتاؤ کہ حیدر علی اور اس کے گھر والے کہاں گئے؟“

”ہم نے انہیں شیو کے استاد سید اکرام بخاری کے مکان میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔“ جاسوس سپاہیوں نے حیدر علی کے بارے میں نئی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

راجہ کرشنا کے دھواں دھواں چہرے پر اچانک خوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ ”پھر.....؟“

والی میسور اپنے جاسوس سپاہیوں سے کسی نئے سراغ کی توقع کر رہا تھا۔ ”ہم طوفانی بارش میں ساری رات کھڑے بیٹھتے رہے مگر حیدر علی یا کوئی دوسرا شخص باہر نہیں آیا۔“ سپاہیوں نے اپنی کارکردگی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”پھر تم کب تک اکرام بخاری کے مکان کی نگرانی کرتے رہے؟“ راجہ کرشنا نے پُر جوش لہجے میں ایک اور سوال کیا۔

”جب صبح تک کوئی مکان سے باہر نہیں آیا تو مجبوراً ہم لوگ محل کی طرف لوٹ آئے۔“ راجہ کرشنا چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا، پھر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

ہیں۔ چاہے ہندوستان بھر کی فوج میسور کی حفاظت کے لئے یہاں پہنچ جائے مگر اب میری ریاست کو ان جادو گروں سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

ایسا جی پنڈت اور کھنڈے راؤ محل واپس لوٹ آئے تھے اور راجہ کرشنا کو بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ تسلیاں دے رہے تھے۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ بوڑھا کوئی شعبہ باز ہو اور اس نے نظر بندی کے فن کا سہارا لے کر ہماری آنکھوں پر سیاہ پردہ ڈال دیا ہو۔ مگر کب تک؟ اس کا جادو حیدر علی کو بچا نہیں سکتا۔“

”یہ میرے لئے بہت برا شگون ہے پنڈت!“ راجہ کرشنا نے مرہٹہ سالار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تو کچھ بھی کہہ لے مگر میرے اقتدار کا خاتمہ ہو چکا۔ ایسی انہونی تو میری آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھی۔“

آخر ایسا جی پنڈت شدید جھنجھلاہٹ کی حالت میں کھڑا ہو گیا۔

”آپ جو کچھ سوچتے ہیں، سوچتے رہیں اور مجھے آزادی کے ساتھ میرا کام کرنے دیجئے۔“

مرہٹہ سالار نے تلخ لہجے میں اپنی بات مکمل کی اور کھنڈے راؤ کو ساتھ لے کر محل کے اس مخصوص کمرے سے نکل گیا۔

اب سرنگاپٹم میں دو مختلف سرگرمیاں جاری تھیں۔ ایک طرف سری رنگ ناتھ کے مندر میں ”ہون“ ہو رہا تھا اور سینکڑوں سادھوؤں کے ساتھ مل کر میسور کی بدحواس رانیاں، راجہ کرشنا کے اقتدار کے تحفظ کے لئے پراختہ کر رہی تھیں، غریبوں میں صدقات تقسیم کئے جا رہے تھے اور خود راجہ کرشنا بت کے قدموں پر سر رکھے ہوئے گریہ و زاری کر رہا تھا۔

”بھگوان! اس بار مجھے اور میرے سنگھان (تخت) کو بچالے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنا سارا دھن تیرے چرنوں میں لا کر رکھ دوں گا۔“

اور دوسری طرف ایسا جی پنڈت اور کھنڈے راؤ نے باہم مشورے کے بعد حیدر علی کی گرفتاری پر ایک گراں بہا انعام کا اعلان کر دیا تھا۔ ریاست میسور کے ڈھنڈ درجی، سرنگاپٹم کے گلی کوچوں میں چیختے پھر رہے تھے۔

”حیدر علی جہاں بھی ہو، راجہ کرشنا کے دربار میں حاضر ہو جائے۔ اگر اس نے دودن کے اندر اس حکم کی تعمیل نہ کی تو اس کے بیوی بچوں کو قتل کر دیا جائے گا۔“

اس اعلان کو سننے کے بعد سرنگاپٹم کے مسلمانوں میں صف ماتم بچھ گئی تھی اور متعصب ہندو قفس کرنے لگے تھے۔ مگر ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی، جنہیں حیدر علی کے بارے میں یہ اعلان سن کر بہت افسوس ہوا تھا۔ یہ وہ سادہ دل ہندو تھے، جو سیاسی مفادات سے بے نیاز تھے اور حیدر علی کو میسور کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

خود حیدر علی کی والدہ، بیوی اور بچوں نے بھی یہ ظالمانہ اعلان سنا اور ان کے چہروں پر خوف و ہراس کے سائے لرزنے لگے۔

تیز ہو گئیں۔ اگرچہ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے لیکن حیدر علی کے رعب و جلال سے ان کے دل کانپ رہے تھے۔ اب راجہ کرشنا کے سپاہیوں اور سید اکرام بخاری کے مکان کے درمیان تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ ان سب نے اپنی شمشیریں بے نیام کیں اور خوف ناک عزائم کے ساتھ آگے بڑھے۔ مگر اچانک تمام سپاہیوں اور جاسوسوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ پریشان نظروں سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور آپس میں سوال کر رہے تھے۔

”وہ مکان کہاں چلا گیا؟ ابھی تو ہماری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔“

مختصر یہ کہ راجہ کرشنا کے سپاہی شدید حیرت و اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر بھٹکتے رہے مگر انہیں سید صاحب کا وہ مکان دکھائی نہیں دیا جو تھوڑی دیر پہلے ایک فرلانگ کے فاصلے سے صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر جب سپاہیوں نے اس محیر العقول واقعہ کی اطلاع والی میسور کو دی تو بیک وقت راجہ کرشنا، مرہٹہ سالار اور ایسا جی پنڈت اور وزیر اعظم کھنڈے راؤ چیخ اٹھے۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ سب تمہارا فریب نگاہ ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“

”تو پھر مہاراج خود چل کر مشاہدہ کر لیں کہ صحیح صورت حال کیا ہے۔“

ابھی راجہ کرشنا اس ناقابل یقین واقعہ کے بارے میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ مرہٹہ سالار اور وزیر اعظم کھنڈے راؤ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مہاراج! آپ زحمت نہ کریں۔ ہم خود دیکھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارے سپاہیوں کی نظروں کا دھوکا ہے یا کچھ اور؟“

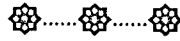
مرہٹہ سپہ سالار اور کھنڈے راؤ کے ساتھ بھی من و عن ہی صورت حال پیش آئی تھی کہ ایک فرلانگ کا فاصلہ باقی رہ جانے کے بعد یکایک سید صاحب کا مکان ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

ایسا جی پنڈت اور کھنڈے راؤ بڑی شکستہ حالت میں واپس لوٹے تھے۔ ان دونوں کے چہروں پر خوف و دہشت کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ پھر جب انہوں نے لرزتی آوازوں میں اپنا مشاہدہ بیان کیا تو راجہ کرشنا کی بدحواسی عروج کو پہنچ گئی۔

”تم بھی دھوکا کھا گئے۔“ راجہ کرشنا کی وحشت کا یہ عالم تھا کہ وہ سینکڑوں گواہوں کو جھٹلا رہا تھا۔ ”مجھے کسی کی بات پر یقین نہیں۔ میں خود چل کر دیکھوں گا کہ وہ ایک بوڑھے فقیر کا مکان ہے یا راجہ اندر کی سبھا کا کوئی طلسم۔“

پھر جب راجہ کرشنا کے ساتھ بھی یہی صورت حال پیش آئی تو وہ ہذیانی انداز میں چیختے لگا۔

”یہ جادو ہے..... کھلا جادو..... افسوس! میں اتنے بڑے جادوگر کی اپنی ریاست میں پرورش کرتا رہا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حیدر علی نے اپنے بیٹے کو اس بوڑھے جادوگر کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیوں بھیجا تھا۔ وہ سب کے سب سید سے جادو کا علم سیکھ رہے۔“



حیدر علی اس صورت حال سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کی فوج بہت مختصر تھی مگر وہ اپنی زندگی کی آخری بازی کھیل رہا تھا۔ اس لئے اس نے ایک ایک سپاہی سے ملاقات کی اور اپنے ہر جانباز کو اس جنگ کا مقصد سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اگر تم کثرت سے ڈر گئے تو پھر تمہیں شکست و بربادی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ موت مہر دوں اور تمہ خانوں میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ میدان جنگ میں موت کا استقبال کرو۔ اپنی قلت سے فکرمند نہ ہو کہ فتح و نصرت ان سب چیزوں سے ماوراء ہے۔ بہت سے لوگ جیت کر بھی ہار جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ہار کر بھی فاتح ہی قرار پاتے ہیں۔“

اس مختصری تقریر کے بعد حیدر علی نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دستے کو بنگور سے دور محفوظ علاقے میں بھیج دیا گیا تاکہ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں یہ فوجی دستہ عقب سے دشمن پر حملہ آور ہو سکے۔ قبل از وقت اپنی فوج کو ترتیب دے کر حیدر علی خود قلعہ بند ہو گیا۔

کھنڈے راؤ کا لشکر آندھی اور طوفان کی رفتار سے بنگور پہنچا۔ کھنڈے راؤ کا خیال تھا کہ حیدر علی کے فوجی دستے بنگور کی سرحدوں پر مزاحمت کریں گے۔ مگر جب اسے راستے میں ایک سپاہی بھی نظر نہیں آیا تو وہ خوشی سے چیخ اٹھا۔

”آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کر لو۔ اب حیدر علی کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ قلعے سے نکل کر ہمارا مقابلہ کرے گا اور شکست کی ذلت سے دوچار ہو گا..... یا پھر سامانِ رسد ختم ہو جانے کے بعد ہتھیار ڈال دے گا اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے گا۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو وہ خوفِ رسوائی سے گھبرا کر خودکشی کر لے گا۔“

تصوراتی فتح کے نشے سے سرشار کھنڈے راؤ کا لشکر تیز رفتاری کے ساتھ قلعے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر جب میسور کی فوج اور بنگور کے قلعہ کے درمیان ایک میل کا فاصلہ رہ گیا تو حیدر علی نے اپنے لشکر کو یلغار کا حکم دیا۔

کھنڈے راؤ کے لئے یہ صورت حال انتہائی حیران کن تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حیدر علی اس طرح قلعہ کے دروازے کھول کر باہر نکلے گا اور کسی شکاری درندے کی طرح اس کی فوج پر چھٹ پڑے گا۔ کھنڈے راؤ اپنی کثرتِ فوج کے باعث احساسِ برتری میں مبتلا تھا۔ اس لئے تھوڑی ہی دیر میں اس نفسیاتی دباؤ سے نکل گیا اور بڑے متکبرانہ انداز میں اپنے سپاہیوں کے حوصلے بڑھانے لگا۔

”یہ صحرائی گیدڑوں کا ایک غول ہے جو بہت جلد میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہو گا۔“

کھنڈے راؤ کی لاف زنی کے برعکس حیدر علی کا ہر سپاہی شیر ہو رہا تھا اور جاں فروشی کے اس جذبے نے جنگ کا فلسفہ ہی بدل ڈالا تھا۔ حیدر علی کے تمام فوجیوں نے معرکہ آرائی سے

”تم سب میرے پاس حیدر علی کی امانت ہو۔“ سید صاحب نے مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے اللہ سے اس معاملے میں بھی خُسن ظن رکھتا ہوں کہ وہ مجھے حیدر علی کے سامنے شرمندہ نہیں کرے گا اور میں اس وقت تک دنیا سے نہیں جاؤں گا، جب تک اس کی امانت اسے واپس نہ لوٹا دوں۔ تم بھی اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اگر راجہ کرشنا کے آدمی تم پر قابو پا سکتے تو اب تک اس فقیر کا گھر مسار کیا جا چکا ہوتا۔“

سید صاحب کی باتیں سن کر مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم کے بے قرار دل ٹھہر گئے۔



میسور کے سپاہیوں کے ساتھ مل کر مرہٹہ فوجی جگہ جگہ چھاپے مار رہے تھے۔ مگر حیدر علی ان کی دسترس سے بہت دور اپنی منتشر فوج کو دوبارہ جمع کر رہا تھا۔ سالار میسور نے اپنے برادر نسبتی، سید محمد دم کو خط لکھا کہ فوراً بنگور چلے آئیں۔ سید محمد دم، فرانسسیوں کی مدد کے لئے اپنا لشکر لے کر پانڈ پجری کی طرف روانہ ہوئے تھے مگر جب انہیں راستے میں خبر ملی کہ انگریزوں اور والا جاہ محمد علی نے مل کر پانڈ پجری فتح کر لیا ہے تو وہ ارکاٹ کے قریب خیمہ زن ہو گئے تھے۔ تقریباً پندرہ دن بعد راجہ کرشنا کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ حیدر علی بنگور پہنچ گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی والی میسور پر وحشت و بدحواسی کا ایک اور دورہ پڑا۔

”نہ جاسوسوں کی نگرانی کام آئی اور نہ انعام کا لالچ۔ اُسے جانا تھا اور وہ چلا گیا۔“ راجہ کرشنا پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ ”اب اُسے واپس آنے سے کون روک سکتا ہے؟“

”ہم اُسے روکیں گے مہاراج!“ مرہٹہ سپہ سالار ایسا جی پنڈت نے کسی قدر ناگوار لہجے میں کہا۔ ”آپ کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو کالے بادل دیکھ کر ہی یقین کر لیتا ہے کہ موسلا دھار بارش ہوگی، پھر خوفناک سیلاب آئے گا اور وہی سیلاب اس کے گھر بار کو بہا کر لے جائے گا۔ حیدر علی کے بنگور چلے جانے سے آخر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟“ ایسا جی پنڈت اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ ”اب اس کی حیثیت ایک مفروز مجرم سے زیادہ نہیں۔ وہ محض ایک گیدڑ ہے جو کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ادھر ادھ بھاگتا پھر رہا ہے۔“

”جلدی کرو پنڈت!..... جلدی کرو۔“ راجہ کرشنا کسی بات سے مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

”اب اس کا سراغ مل گیا ہے تو ایک لمحہ بھی برباد نہ کرو اور زمینجیریں لے کر بنگور پہنچ جاؤ۔ پنڈت! میں تجھے سونے میں تول دوں گا۔ بس تو حیدر علی کو زنجیر پہنا دے۔“

آخر چند گھنٹوں کے غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ جلد از جلد بنگور کا محاصرہ کر لیا جائے۔ مرہٹہ سپہ سالار اور کھنڈے راؤ، حیدر علی کو سنبھالنے کے لئے زیادہ مہلت دینا نہیں چاہتے تھے۔

پھر دوسرے دن ہی کھنڈے راؤ کی قیادت میں ایک لشکر جرار بنگور کی طرف روانہ ہوا۔ ایسا جی پنڈت، سرنگاپٹم ہی میں ٹھہر گیا اور جنگ کے نتائج کا انتظار کرنے لگا۔



پہلے قسم کھائی تھی کہ وہ ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے، چاہے اس کشمکش میں ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

کھنڈے راؤ نے یہ صورت حال دیکھی تو گھبرا گیا۔ اس کے مستقبل کا انحصار بھی اسی جنگ کے نتیجے پر تھا۔ اگر وہ یہ جنگ ہار جاتا تو پھر اس کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوتی۔ اس نے حیدر علی سے کھلی غداری کی تھی..... اور حیدر علی، غداروں کو کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کھنڈے راؤ نے اپنے سوراؤوں کو آواز دی۔

”ارجن کے نام لیواؤ! تم ان مٹھی بھر سپاہیوں پر قابو نہیں پاسکتے؟ تمہیں یہ جنگ ہر حال میں جیتنا ہے ورنہ تمہاری بہو بیٹیاں، حیدر علی کی ہوس گاہ میں غلام ہو جائیں گی اور تمہاری عبادت گاہوں کو مسمار کر دیا جائے گا۔“ عیار کھنڈے راؤ اپنا مطلب نکالنے کے لئے بڑی متعصبانہ اور زہر آلود تقریر کر رہا تھا۔

ہندو سپاہیوں کے سینوں میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور وہ دیوانہ وار حیدر علی کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ میسوری افواج کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ حیدر علی کے سپاہیوں کو سنبھلنے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑا۔ کھنڈے راؤ سمجھا کہ حیدر علی کی فوج پسپا ہو رہی ہے، اس لئے وہ اور زیادہ وحشیانہ انداز میں چیخنے لگا۔

”اور آگے بڑھو میرے بہادر!..... گیدڑ اپنے غار کی طرف بھاگ رہا ہے۔ مگر خبردار! اے واپس جانے نہ دینا کہ یہ شیروں کی تو ہیں۔“

حیدر علی کی جنگی حکمت عملی ہی کچھ اس طرح تھی کہ اگر کھنڈے راؤ کا لشکر حاوی آگیا تو وہ پلٹ کر قلعہ بند ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے حیدر علی کی فوج ایک قطار میں جنگ کر رہی تھی اور اس نے اپنے سپاہیوں کو محصور ہونے سے بچایا تھا۔ حالانکہ کھنڈے راؤ مسلسل یہی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح حیدر علی کی فوج کو اپنے گھیرے میں لے لے۔“

ابھی یہ کشمکش جاری تھی کہ تین اطراف سے ایک شور بلند ہوا۔ حیدر علی کے دو خفیہ فوجی دستوں نے دائیں اور بائیں جانب سے کھنڈے راؤ کے لشکر پر حملہ کر دیا اور تیسرا محفوظ دستہ عقب سے حملہ آور ہوا۔ حیدر علی کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ کھنڈے راؤ کے سپاہیوں کی توجہ تقسیم ہو گئی اور ان میں بے چینی پھیل گئی۔ حیدر علی نے اس انتشار سے پورا فائدہ اٹھایا اور چند گھنٹوں میں ہزاروں دشمن سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اگرچہ حیدر علی کے حملہ آور سپاہیوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن کھنڈے راؤ یہی سمجھا کہ بیک وقت کی لشکر اس کے حریف کی مدد کو اپنے ہیں۔ وہ عیار مرہٹہ برہمن مرد میدان نہیں تھا، اس لئے آزمائش کے وقت گھبرا گیا اور پھر شدید بدحواسی کے عالم میں میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔

فرار کی کوشش میں ہزاروں ہندو سپاہی قتل ہو گئے اور ہزاروں زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ حیدر علی نے یہ جنگ محض تائید غنیمت کے سہارے جیتی تھی ورنہ اصولی اعتبار سے اس کی او

کھنڈے راؤ کی عددی طاقت میں کوئی توازن نہیں تھا۔ حیدر علی بظاہر کمزور تھا مگر اس کے حوصلے پہاڑوں سے زیادہ بلند تھے۔ کھنڈے راؤ دیکھنے میں تو اتنا نظر آتا تھا مگر اندر سے دیمک زدہ کٹڑی کی طرح کھوکھلا تھا۔ حیدر علی صاحب اقبال تھا، اس لئے اس کا نام سن کر بھی لوگ ڈر جاتے تھے۔ کھنڈے راؤ خوشامدی اور امیروں کے تلوے چاٹنے والا تھا، اس لئے اس کی موجودگی بھی رائیگاں تھی اور نعرے بھی بے اثر تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حیدر علی لائق ترین سپہ سالار تھا۔ اس کے برعکس کھنڈے راؤ کرائے کے فوجی لے کر میدان جنگ میں ”مداری“ کا تماشا دکھانے چلا آتا تھا۔ حیدر علی کی طرف سے غیرتیں، وفاداریاں اور جذبات لڑ رہے تھے..... اور کھنڈے راؤ کی جانب سے چند سٹکوں کے لئے یومیہ اجرت پر جنگ کی جارہی تھی۔ بس دونوں حریفوں میں یہی فرق تھا..... اور اسی فرق نے حیدر علی کو غالب و فاتح بنادیا۔ اور کھنڈے راؤ کو مغلوب و مفتوح کر دیا۔

کھنڈے راؤ جنگ ہار چکا تھا۔ مگر بھاگتے بھاگتے اس نے اپنی عیاری کی کمان سے فریب کا آخری تیر چھوڑا۔ بنگلور کی سرحد سے دور نکل جانے کے بعد اس نے لشکر کو ٹھہر جانے کا حکم دیا اور پھر اپنے ایک قاصد کو یہ پیغام دے کر حیدر علی کے پاس بھیجا۔

”تیرے بیوی بچے میرے قبضے میں ہیں۔ اگر تو خود کو میرے حوالے کر دے تو میں ان کی جان بخشی کا وعدہ کرتا ہوں ورنہ سرنگا پنم جینتے ہی انہیں اس بے دردی کے ساتھ قتل کرادوں گا کہ صدیوں تک میسور کے درود دیوار ان کے لرزہ خیز انجام کے قصے بیان کیا کریں گے۔“

قاصد کا بیان سنتے ہی چند لمحوں کے لئے حیدر علی سناٹے میں آگیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی تیر اس کے دل میں پیوست ہو گیا ہے..... مگر وہ غیر معمولی اعصاب کا انسان تھا۔ دوسرے ہی لمحے سنبھل گیا۔

”میں اپنے بیوی بچوں کو خوب جانتا ہوں۔ وہ میری آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر بخوشی رضامند ہو جائیں گے۔“ حیدر علی انتہائی بڑجالال لہجے میں کھنڈے راؤ کے قاصد سے مخاطب تھا۔ ”میں نے تمام عمر انسانی زندگی کی قدر کی ہے۔ ناگزیر حالات کے سوا کبھی خون نہیں بہایا۔ عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانا تو میرے مسلک میں دنیا کا سب سے شرم ناک فعل ہے۔ پھر بھی اگر زندگی اور موت کا مالک میرے اہل خانہ کے سلسلے میں ایسا ہی کوئی فیصلہ کر چکا ہے تو پھر بھی میں راضی بہ رضا ہوں۔ حکم بھی اللہ کا اور ملک بھی اللہ کا۔“

پھر جب کھنڈے راؤ کا قاصد ناکام و نامراد واپس جانے لگا تو حیدر علی نے اسے سخت لہجے میں پکارا۔

”اور کھنڈے راؤ سے کہہ دینا کہ اس کا قرض ابھی باقی ہے۔ میں اپنے ذمے کسی کا حساب نہیں رکھتا۔ یہی میری عادت ہے۔ اس لئے بہت جلد واپس آؤں گا۔“

کھنڈے راؤ کا چھوڑا ہوا تیر اسی کی طرف لوٹ آیا۔ قاصد نے حیدر علی کا جواب دہرایا تو

اسی دوران سابق وزیر اعظم میسور نندراج کو حیدر علی اور مرہٹہ فوج کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کا حال معلوم ہوا۔ اس نے بلا تاخیر اپنے ایک معتبر آدمی کو ایسا جی پنڈت کے نام خط دے کر سرنگاپٹم روانہ کیا۔ اس خفیہ مکتوب میں نندراج نے مرہٹہ سالار کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ ایک عیار شخص کے فریب میں آکر مرہٹہ قوم کے ساتھ ذاتی و قار کو بھی داؤ پر لگا دیں گے۔ آپ نہیں جانتے کہ کھنڈے راؤ کون ہے۔ وہ انتہائی شکستہ حالت میں میسور آیا تھا اور حیدر علی نے ازراہ کرم سرکاری ملازموں میں شامل کر کے اسے بھوک اور افلاس سے نجات دی تھی۔ کھنڈے راؤ اس قدر بے غیرت اور نمک حرام شخص ہے کہ پہلے اس نے سازش کر کے مجھے میسور سے نکلوا دیا اور اب وہ اپنے آقا، حیدر علی کی زندگی کے درپے ہے۔ گزشتہ تعلقات کی بنیاد پر میں آپ کو خیردار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ کھنڈے راؤ سے ہوشیار رہیے۔ وہ موقع ملے ہی آپ کی زندگی اور عزت کا سودا کرنے سے بھی باز نہیں رہے گا۔۔۔۔۔ آپ کا مخلص، نندراج۔“

ایسا جی پنڈت نے نندراج کا خط پڑھا تو سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس نے اپنے جنگی منصوبے کو جاری رکھنے کے بجائے انتہائی رازداری کے ساتھ حیدر علی کو خط لکھا۔

”اگر تم اخراجات جنگ ادا کر دو تو میری فوج سرنگاپٹم سے واپس چلی جائے گی۔“

ایسا جی پنڈت کا خط پڑھ کر حیدر علی کو یوں محسوس ہوا جیسے مصائب کے گھنے سیاہ بادل یکایک چھٹ گئے ہوں اور اُمیدوں کا روشن و تابناک سورج نکل آیا ہو۔ حیدر علی نے فوراً مرہٹہ سالار کے خط کے جواب میں لکھا۔

”میں نقد رقم کی صورت میں اخراجات جنگ ادا کرنے سے فی الوقت معذور ہوں۔ اگر مذکورہ رقم کے بدلے میں تمہیں بارہ محل کا علاقہ منظور ہے تو میں قانونی دستاویز اس خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔“

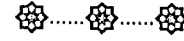
ایسا جی پنڈت نے حیدر علی کا جواب پڑھتے ہی اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ خیمے اکھاڑ لے اور بارہ محل پر قبضہ کرنے کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہو جائے۔

راجہ کرشنا نے یہ صورت حال دیکھی تو بدحواس ہو کر چیخنے لگا۔ ”تُو مجھے آفتوں کے گرداب میں تہا چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے پنڈت؟“

”مہاراج! میں نے آپ کے ساتھ بڑے خسارے کا سودا کیا۔“ مرہٹہ سالار کا لہجہ نہایت سرد تھا۔ ”اس جنگ میں مجھے جانی نقصان بھی ہوا اور مالی بھی۔ اب میں مزید گھانا برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اگر تُو چلا گیا پنڈت! تو حیدر علی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ راجہ کرشنا روہا ناظر آنے لگا تھا۔

شدت غم سے وزیر اعظم میسور کا چہرہ نیلا پڑ گیا اور پھر فوراً ہی کھنڈے راؤ نے اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا۔ سرنگاپٹم پہنچنے تک، راستے بھر وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ کھنڈے راؤ کو خدشہ تھا کہ کہیں حیدر علی واقعتاً اس کے تعاقب میں نہ آ رہا ہو۔



جب اس شکست فاش کی خبر سرنگاپٹم پہنچی تو راجہ کرشنا کے محل میں ایک کہرام مچ گیا۔ والی میسور کے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے۔ حیدر علی کی مختصری فوج نے اپنے سے دس گنا بڑی فوج کے چہرے پر ذلت و بربادی کی سیاہی مل کر اسے اس کے علاقے کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ راجہ کرشنا ایک ہی دن میں برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اس کے نفرت و غضب کا یہ حال تھا کہ اس نے کھنڈے راؤ کی صورت دیکھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

کھنڈے راؤ اس وقت سرنگاپٹم کا سب سے زیادہ معتب اور لعنت زدہ انسان تھا۔ اس نے تہائی میں مرہٹہ سالار ایسا جی پنڈت کے پاؤں پکڑ لئے۔

”میں کیسا بھی ہوں مگر تیرا ہم قوم ہوں۔ مجھے راجہ کے قہر و غضب سے بچالے ورنہ میسور کی زمین مجھ پر تنگ ہو جائے گی۔“

ایسا جی پنڈت کچھ دیر تک کھنڈے راؤ کو سخت ست کہتا رہا کہ اس کی ناکارہ قیادت نے مرہٹہ فوج کے وقار کو بھی خاک میں ملا دیا۔

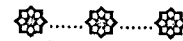
جواب میں کھنڈے راؤ نے ایسا جی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

”پنڈت! اب تیرے سوا مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تجھے شیوا جی کے جاہ و جلال کا واسطہ میری حالت زار پر رحم کر۔“

آخر کار مرہٹہ سالار نے راجہ کرشنا سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! کھنڈے راؤ کو معاف کر دیں کہ اس شکست میں اس کا کچھ زیادہ قصور نہیں ہے۔ ہماری جنگی حکمت عملی میں کہیں کوئی کمی رہ گئی۔ دوسرے یہ کہ وہ علاقہ بھی ہمارے سپاہیوں کے لئے اجنبی تھا۔ اس لئے متوقع نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ بہر حال آپ فکر مند نہ ہوں کہ آئندہ میں خود میسور کی افواج کی قیادت کروں گا اور عقرب شکست کے اس داغ کو دھوڑا لوں گا۔“

ایسا جی پنڈت کی سفارش پر راجہ کرشنا نے کھنڈے راؤ کو معاف کر دیا تھا مگر اب بھی اس کے دل و دماغ پر حیدر علی کی دہشت طاری تھی۔



راجہ کرشنا، ایسا جی پنڈت اور کھنڈے راؤ میں مسلسل مشورے ہو رہے تھے۔ اب کی بارہ تینوں حیدر علی کو مکمل طور پر تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ اپنے ان خوف ناک عزائم کی تکمیل کے لئے مرہٹہ سالار سوچ رہا تھا کہ وہ پیشوائے پونا مادھو راؤ سے مزید تازہ دم فوج سرنگاپٹم بھیجے کی درخواست کرے۔

کھنڈے راؤ کیا جواب دیتا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اسے اپنے عقب میں موت کے قدموں کی تیز چاپ سنائی دے رہی تھی۔

”یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوا کھنڈے راؤ!“ راجہ کرشنا نے آگے بڑھ کر اپنے وزیر اعظم کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا۔ ”وہ اس ریاست کا سیاہ ترین دن تھا جب تو میسور کی حدود میں داخل ہوا اور میں نے تجھے اپنے مشیروں کے حلقے میں شامل کیا تھا۔ کاش! تیری پیدائشی نخواست میرے اس خوشحال علاقے پر سایہ قلع نہ ہوتی۔“

تھپہ کھا کر کھنڈے راؤ کا خون کھول اٹھا تھا۔ مگر پھٹتے ہوئے گولوں کی آوازیں سن کر اس کے خون میں اٹھنے والے جھاگ فوراً ہی بیٹھ گئے۔

اس کے ساتھ ہی حیدر علی کے نقیبوں کی پر شور صدائیں سنائی دینے لگیں۔

”کھنڈے راؤ کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ورنہ یہ عالیشان محل ایک کھنڈر میں تبدیل ہو جائے گا۔“

نقیبوں کی آوازیں سن کر میسور کی رانیاں رونے لگیں۔ جیسے ہم راج (فرشتہ اجل) انہیں پکار رہا ہو۔

”مہاراج! جلد از جلد اس حرام کار کا قصہ پاک کریں۔“ رانی لکشم مانے کھنڈے راؤ کے منہ پر تھوکتے ہوئے کہا۔

گردشِ وقت بھی کیا ہوتی ہے کہ چند لمحے گزرتے ہی انسان ”محبوب“ سے ”معتوب“ بن جاتا ہے۔ اسی آفاقی اصول کے مطابق رانیوں کا مشیر خاص، ایک بہ یک سب سے بڑا لعنت زدہ انسان بن گیا تھا۔ کل تک جو شخص رونقِ محفل تھا اور محل کے رہنے والے اسے ”میر مجلس“ کہہ کر پکارتے تھے، آج اُس کی حیثیت ایک خارش زدہ کتے سے زیادہ نہیں تھی، جسے اس کے آقا ٹھکرا رہے تھے اور وہ بار بار دُم ہلا کر آنکھوں کی خاموش زبان سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے باہر نہ نکالو کہ ہزاروں شیر میری تاک میں ہیں۔“

رانی لکشم ما کی بات سنتے ہی راجہ کرشنا نے اپنے خدمت گاروں کو طلب کرتے ہوئے کہا۔ ”قلعے سے باہر جا کر حیدر علی سے کہہ دو کہ وہ گولہ باری بند کر دے۔ ہمیں اس کا مطالبہ منظور ہے۔“

جیسے ہی خدمت گار واپس جانے کے لئے مڑے، کھنڈے راؤ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ ہذیبانی انداز میں چیخ اٹھا۔

”مہاراج! یہ میرا ذاتی جرم نہیں کہ میں چپ چاپ اکیلا ہی پچانسی پر چڑھ جاؤں۔“

کھنڈے راؤ کی فطری عیاری ایک بار پھر جاگ اٹھی تھی۔ ”اس جرم میں آپ اور رانیاں بھی برابر کی شریک ہیں۔“

راجہ کرشنا اور رانیوں نے گھبرا کر کھنڈے راؤ کی طرف دیکھا۔

”مہاراج! یہ آپ کا دردِ دوسرے ہے، یہ آپ کا مسئلہ ہے۔“ ایسا جی پنڈت نے انتہائی بے رخی کے لہجے میں جواب دیا۔ ”اب میں ایک دن بھی سرنگاپٹم میں نہیں ٹھہر سکتا۔“

راجہ کرشنا نے مرہٹہ سالار کو بہت بڑی رقم کا لالچ دیا۔ مگر ایسا جی پنڈت نے والی میسور کی اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔

پھر کھنڈے راؤ کو مرہٹہ سالار کی واپسی کی خبر ملی تو اس نے گریہ و زاری کرتے ہوئے حسبِ عادت ایسا جی پنڈت کے پیروں پر سر رکھ دیا اور اس سے کچھ دن ٹھہر جانے کی درخواست کی۔

جواب میں مرہٹہ سالار نے کھنڈے راؤ کے چہرے پر ایک زوردار ٹھوک لگائی۔ جب وزیر اعظم میسور تکلیف کی شدت سے بے چین ہو کر سیدھا کھڑا ہوا تو ایسا جی پنڈت نے شدید نفرت کے عالم میں اس کے منہ پر ٹھوک دیا۔

”جب تو اپنے آقا کا وفادار نہیں ہو سکتا تو پھر میں کس طرح تیرے بعدوں پر اعتبار کروں؟“

ایسا جی پنڈت کے جاتے ہی سرنگاپٹم کے درود پوار پر ایسی دہشت طاری ہو گئی کہ ایک آباد اور بارونق شہر کی قبرستان کی طرح ویران نظر آنے لگا۔



اس دوران حیدر علی کے برادرِ ہمتی سید محمد دوم اپنی فوج لے کر ارکاٹ سے جنگلور پہنچ گئے۔ اب حیدر علی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ آگے بڑھ کر سرنگاپٹم پر قبضہ کر لے۔ اپنے اسی منصوبے کے تحت حیدر علی برقِ رفقاری کے ساتھ سرنگاپٹم پہنچا اور اس نے محل پر گولہ باری شروع کر دی۔

گولہ باری کے ساتھ ساتھ حیدر علی کے نقیب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

”یہ گولہ باری اس وقت تک جاری رہے گی، جب تک کھنڈے راؤ کو ہمارے حوالے نہ کر دیا جائے گا۔“

جیسے ہی چند گولے قلعے کی فصیل سے ٹکرائے اور محل میں خوفِ ناک دھماکوں کی آواز مچ گئی، راجہ کرشنا اور میسور کی رانیوں میں بدحواسی پھیل گئی۔ حیدر علی کی فوجوں کو اتنے قریب دیکھ کر محل کے سارے مکین اپنی آزادی اور زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اب ان کے سامنے مستقبل کی وہ ہی صورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ حیدر علی انہیں پابندِ سلاسل کر کے زنداں کے کسی تاریک گوشے میں ڈال دے گا یا اگر اس نے رحم دلی سے کام لیا تو سارا مال و متاع اور تمام اختیارات چھین کر سرنگاپٹم سے نکال دے گا۔ یہی سوچ سوچ کر کمزور اعصاب کے لوگ بین کر رہے تھے اور راجہ کرشنا، رانیوں کی موجودگی میں کھنڈے راؤ پر برس رہا تھا۔

”بد بخت! تو نے دیکھا کہ حیدر علی واپس آ گیا۔“

پھر سینکڑوں زبانیں کھل جائیں گی۔ میرے رازداروں کو صرف میرے انجام کا انتظار ہے۔ اگر یہ انجام ان کی توقعات کے خلاف ہوا تو وہ سب کے سب حیدر علی کے پاس پہنچ جائیں گے اور پھر کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔“

کھنڈے راؤ کی یہ چال کامیاب ہوئی اور راجہ کرشنا نے اپنے ایک معتمد کو یہ پیغام دے کر حیدر علی کے پاس بھیجا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں کھنڈے راؤ کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ سرنگاپٹم پر حملے کی خبر سننے ہی وہ رات کی تاریکی میں کہیں فرار ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وزیراعظم اس وقت کہاں ہے؟“

راجہ کرشنا کا پیغام سن کر کھنڈے راؤ نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

”ہاں مہاراج! آپ کی یہی دوستانہ روش ہم سب کو حیدر علی کے قہر و غضب سے محفوظ رکھے گی۔ اگر پھر کبھی آپ کے ذہن میں یہ دوسوہ پیدا ہوا کہ دھوکا دے کر مجھے تباہی طاعت کے اس سیلاب کے حوالے کر دیا جائے تو یاد رکھیے کہ میں اس طوفان میں اکیلا نہیں ڈوبوں گا، میرے ساتھ پورا راج گھرانہ غرق ہو جائے گا۔“

راجہ کرشنا کے قاصد نے والی میسور کا پیغام حرف بہ حرف حیدر علی کو منتقل کر دیا۔

”اب مجھے کسی کا اعتبار نہیں رہا۔“ حیدر علی انتہائی تند و تیز لہجے میں بولا۔ ”مہاراج سے کہنا کہ میں اپنی روایتوں کا احترام کرتا ہوں ورنہ اب تک قلعے کی اینٹ سے اینٹ بچکی ہوتی۔ پھر سب کو پتہ چل جاتا کہ کھنڈے راؤ کہاں چھپا ہوا ہے۔“

قاصد کے منہ میں راجہ کرشنا کی زبان تھی، اس لئے وہ دیوی دیوتاؤں کی جھوٹی قسمیں کھا کھا کر حیدر علی کو یقین دلایا تھا کہ واقعتاً کھنڈے راؤ، سرنگاپٹم سے فرار ہو چکا ہے۔

”بس! تو خاموش ہو جا۔“ حیدر علی نے قاصد کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ اگر کھنڈے راؤ فرار ہو چکا ہے تو دوسرا کھنڈے راؤ پیدا کر دیں۔ میں انہیں صرف چند گھنٹوں کی مہلت دیتا ہوں۔ اس دوران میری توپیں مکمل طور پر خاموش رہیں گی۔ اگر والی میسور نے یہ قیمتی وقت بھی حیل و حجت میں گزار دیا تو ان سے کہہ دینا کہ میں اپنے قول کا پکا ہوں۔ پھر میری توپیں آگ نہیں، موت اُگلیں گی۔“

قاصد کی ناکام واپسی نے راجہ کرشنا کے وحشت و اضطراب میں نیا اضافہ کر دیا تھا۔ ”تو کن رہا ہے کھنڈے راؤ! کہ حیدر علی کیا چاہتا ہے؟“

”میں نہیں جانتا کہ حیدر علی کون ہے۔“ عیار کھنڈے راؤ نے پوری طاقت سے راجہ کرشنا کی دکھتی رگ کو دبا دیا تھا اور اس اُلجھتی ہوئی بازی کو مزے لے لے کر کھیل رہا تھا۔ ”حیدر علی کی خواہش کا یہاں کیا ذکر ہے؟ آپ صرف میری طرف دیکھئے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“

بڑی عجیب صورت حال تھی۔ اگر راجہ کرشنا، کھنڈے راؤ کو حیدر علی کے حوالے کر دیتا تو

”میں تو اس ریاست کا ایک معمولی ملازم تھا جسے آپ نے ایک خاص مقصد کے حصول کے لئے سر پر بٹھایا۔“ اب کھنڈے راؤ ٹھہر ٹھہر کر اپنے مخصوص لہجے میں بول رہا تھا۔ ”یہ میں ہی تھا جس نے آپ کو نند راج اور دوسرے وزیروں سے نجات دلائی۔ مجھے بڑا دکھ ہے کہ آپ نے اتنی جلد میرے اس عظیم الشان کارنامے کو فراموش کر دیا۔“

کھنڈے راؤ کی اس اشاراتی گفتگو کا مفہوم سمجھتے ہی راجہ کرشنا اور میسور کی رائیوں کے چہرے اتر گئے تھے۔

”نند راج کے بعد آپ حیدر علی سے بھی نجات چاہتے تھے۔“ کھنڈے راؤ نے راجہ کرشنا اور رائیوں کے ٹوٹتے ہوئے اعصاب پر ایک اور بھرپور ضرب لگائی۔ ”ایک ادنیٰ درجے کا خدمت گار، سالار میسور کے خلاف کس طرح سازش کر سکتا ہے؟ یہ آپ ہی کی ذات محترم تھی جس نے پیشوائے پونا، مادھو راؤ سے خفیہ خط و کتابت کی اور.....“

”بس کھنڈے راؤ!..... بس!“ راجہ کرشنا بدحواس ہو کر چیخ اٹھا۔

”نہیں مہاراج! آپ کو میری پوری بات سنی ہوگی۔“ کھنڈے راؤ سنبھل چکا تھا اور موت کے منہ میں ہوتے ہوئے بھی پوری ذہانت اور احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی کی آخری بازی کھیل رہا تھا۔ ”میں آپ کی تنہائیوں کا سب سے بڑا رازدار ہوں۔ اگر مجھے حیدر علی کے حوالے کیا گیا تو پورے سرنگاپٹم میں آگ لگ جائے گی۔ میں نہیں جانتا کہ اس آگ میں کیا کیا جلے گا..... مگر مجھے اتنا اندازہ ضرور ہے کہ یہ آگ آپ کے وجود اور اقتدار دونوں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔“

عیار کھنڈے راؤ، محل کے مکینوں کے سامنے اپنے حقیقی رنگ میں ظاہر ہو چکا تھا۔

وزیراعظم کے خوفناک تیوروں نے راجہ کرشنا کو شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔

”مہاراج! اس کی فطری خباثت عیاں ہو چکی ہے۔“ اب کی بار رانی دیواجی مٹی لب کٹا ہوئی۔ یہ رانی تمام رائیوں میں زیادہ ذہین اور معاملہ فہم تھی۔ ”اب ہمارے سامنے صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے کہ اسے بے دریغ قتل کر کے اس کی لاش کو زمین میں دبا دیا جائے یا رات کے پچھلے پہر دریائے کاویری کی موجوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح رازدار کے ساتھ تمام راز بھی دفن ہو جائیں گے۔“

رانی دیواجی مٹی نے بڑی ذہانت کے ساتھ کھنڈے راؤ سے پیچھا چڑھانے کی تجویز پیش کی تھی۔

چند لمحوں کے لئے کھنڈے راؤ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ مگر وہ بہت حاضر دماغ انسان تھا۔ فوراً ہی تاریکی کا حصار توڑ کر روشنی میں آگیا۔ ”بے شک! آپ اپنے رازداں کو قتل کرا سکتے ہیں مگر رازداں پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔“ کھنڈے راؤ نے انتہائی مختصر سے وقت میں ایک نیا اور موثر جھوٹ تراش لیا تھا۔ ”اب آپ کا یہ راز بہت سے سینوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ میں سرنگاپٹم میں تنہا نہیں ہوں۔ اب یہاں میرے کچھ رازداں ہیں۔ اگر میری زبان بند کی گئی تو



چاک کیا تو اسی وقت زندگی کی کتاب سے تیرا نام بھی کھرچ دیا جائے گا۔  
 ”میں ایسا کیوں کروں گا مہاراج!“ کھنڈے راؤ نے حسبِ عادت آگے بڑھ کر راجہ کرشنا کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ ہندوستان کا عیار ترین شکاری اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا تھا۔

”سیدھا کھڑا ہو کھنڈے راؤ! اور میری بات غور سے سن۔“ راجہ کرشنا نے وزیرِ اعظم کے سر پر ہلکی سی ٹھوک لگائی۔ پھر جب کھنڈے راؤ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تو والی میسور نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ ”میں تجھے بچانے کے لئے حیدر علی سے ایک معاہدہ کئے لیتا ہوں۔ جب تک تو اپنی زبان بند رکھے گا، تیری موت بھی تجھ سے دور کھڑی رہے گی۔ اور جیسے ہی تیرے ہونٹوں کو جنبش ہوئی، حیدر علی اسی وقت تیرا گلا گھونٹ دے گا۔“

کھنڈے راؤ فطرتاً بزدل اور کمینہ تھا، اس لئے بے غیرتی کی زندگی پر راضی ہو گیا۔  
 حیدر علی کی دی ہوئی مہلت کے ختم ہونے سے پہلے ہی قاصد، راجہ کرشنا کا یہ پیغام لے کر پہنچ گیا۔

”اگر تم مجھے کھنڈے راؤ کی زندگی کی ضمانت دو تو میں اسے تمہارے حوالے کئے دیتا ہوں۔“  
 حیدر علی نے کسی تردد کے بغیر راجہ کرشنا کی یہ شرط مان لی۔  
 پھر کھنڈے راؤ چند سپاہیوں کے گھیرے میں اس طرح قلعے سے باہر نکلا کہ اس کے چہرے پر خاک اڑ رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

حیدر علی، کھنڈے راؤ کو دیکھ کر ہنسنا۔ سالار میسور کی ہنسی میں ساری دنیا کی نفرتیں اور خاندانِ پوشیدہ تھیں۔

”پرہو (مالک)! اچھ پر دیا کیجئے۔“ کھنڈے راؤ یہ کہتا ہوا حیدر علی کے قدموں کی طرف جھکا۔ مگر دوسرے ہی لمحے سالار میسور کی ایک زوردار ٹھوک اس کے منہ پر پڑی اور وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

”تیرا منہ، کتے کے منہ سے بھی بدتر ہے کھنڈے راؤ!“ حیدر علی کی قہر آلود آواز گونجی۔ ”کتا جب اپنے مالک کے کتوے چاٹتا ہے تو اس کی یہ ادا بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مگر تیری قدم بوی کی حرکت میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔“ اس کے ساتھ ہی حیدر علی نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ کھنڈے راؤ کو زنجیریں پہنا کر قید خانے میں ڈال دیں۔

کھنڈے راؤ پر قابو پانے کے بعد حیدر علی نے راجہ کرشنا کو دوسرا پیغام بھیجا کہ قلعے کے اندر موجود تمام سپاہی باہر آ جائیں اور اپنے اپنے ہتھیار جمع کر دیں۔

راجہ کرشنا اور میسور کی رانیوں نے بڑے اذیت و کرب کے ساتھ حیدر علی کے اس ”پیغام“ کو حکم کو سنا مگر وہ سب کے سب اس قدر مجبور تھے کہ حرفِ احتجاج تک بلند نہ کر سکے۔ اب والی میسور بے دست و پا تھا۔ اور میسور کی طاقت و رانیاں ایک ہی رات میں بے جان کھ

سازش کا پورا منصوبہ طشت از پام ہو جاتا۔ اس صورت میں راجہ گھرانے کی زندگی اور آبرو کو سنگین خطرات بھی لاحق ہو سکتے تھے۔ اور اگر وہ کھنڈے راؤ کو بچانے کی کوشش کرتا تو راجہ محل کھنڈے میں تبدیل ہو جاتا اور پھر مصالحت کی دھندلی سی امید بھی باقی نہ رہتی۔ آخر راجہ کرشنا اور میسور کی تمام رانیاں باہم مشورے کے لئے کھنڈے راؤ کو تنہا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ جب راجہ گھرانے کے اور لوگوں کے ساتھ رانی کا ناتا بھی جانے لگی تو کھنڈے راؤ نے اسے آنکھوں کے اشاروں سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس کی بھرپور وکالت کرے۔ رانی کا ناتا نے دم طلب نظروں سے کھنڈے راؤ کی طرف دیکھا تھا اور نگاہوں کی زبان سے اپنی مجبوریاں بیان کی تھیں کہ اس سلسلے میں وہ کچھ نہیں کر سکتی۔

رانی کا ناتا کا خاموش جواب پا کر کھنڈے راؤ کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے تھے، جن کا واضح مطلب یہی تھا کہ اگر اسے حیدر علی کے سپرد کیا گیا تو وہ رانی کا ناتا کو بھی بے نقاب کر دے گا۔ کھنڈے راؤ کی حالت گرداب میں پھنسنے ہوئے اس شخص کی تھی، جو غرقابی سے بچنے کے لئے اُنلے سیدھے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ ایک طرف وہ راجہ کرشنا کو دھمکیاں دے رہا تھا اور دوسری طرف رانی کا ناتا کو غضب ناک انداز میں تہیہ کر رہا تھا۔

کھنڈے راؤ کو یقین تھا کہ وہ راجہ گھرانے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو تمام خطرات سے محفوظ کر لے گا۔ مگر وزیرِ اعظم کی ساری خوش فہمیوں نے اس وقت دم توڑ دیا، جب تھوڑی دیر بعد راجہ کرشنا، رانیوں کے ہمراہ واپس آیا اور انتہائی مطمئن لہجے میں کہنے لگا۔

”کھنڈے راؤ! میں بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تجھے ہر حال میں حیدر علی کے پاس جانا ہوگا۔۔۔۔۔ کیا کروں۔۔۔۔۔“

ابھی راجہ کرشنا کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ کھنڈے راؤ چیخ اٹھا۔ ”میری گرفتاری کا انجام جانتے ہیں مہاراج؟“

”جو تیرا جی چاہے کر۔“ راجہ کرشنا سنبھل چکا تھا۔ ”میں ایک شخص کے لئے ہزاروں انسانوں کو موت کے حوالے نہیں کر سکتا۔“

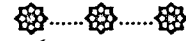
راجہ کرشنا کی بے باکی دیکھ کر کھنڈے راؤ سناٹے میں آ گیا۔ پھر اچانک گدا اگر نہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”مہاراج! اس وقت مجھے آپ کے دم کی شدید ضرورت ہے۔“

”میں اس سلسلے میں اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ حیدر علی سے تیری زندگی کی ضمانت طلب کر لوں۔“

”مہاراج! آپ کو دیوتاؤں کی قسم! حیدر علی سے میری زندگی مانگ لیجئے۔“ کھنڈے راؤ نے بھکاریوں کی طرح دونوں دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مگر اس کی ایک شرط ہے۔“ اب راجہ کرشنا کی باری تھی۔ والی میسور اپنے شکار سے مزے لے لے کر کھیل رہا تھا۔ ”اگر تو نے حیدر علی کے خلاف کی جانے والی سازش کا پردہ

چلیاں بن کر رہ گئی تھیں۔



جب سرنگاپٹم کی پوری فضا خطرات سے پاک ہو گئی تو حیدر علی ایک فوجی دستے کے ساتھ سید اکرام بخاری کے مکان کی طرف بڑھا۔ اس کے ذہن میں مختلف اندیشے سر اُبھار رہے تھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ راجہ کرشنا اور کھنڈے راؤ نے کہیں اس کے بیوی بچوں کو قتل نہ کر دیا ہو..... کبھی خیال کرتا کہ سید صاحب اور شجاعت خان بھی دشمنوں کے مظالم کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ غرض امید و بیم کی عجیب حالت میں حیدر علی، سید صاحب کے مکان تک پہنچا۔ اس نے اپنے فوجی دستے کو دُور ٹھہر جانے کا حکم دیا تھا۔

حیدر علی نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی اور پھر فوراً ہی شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر بلند آواز میں پکارنے لگا۔

”سید صاحب! حیدر علی آپ کے دیدار کے لئے حاضر ہوا ہے۔“

جیسے ہی حیدر علی کی آواز کی گونج ختم ہوئی، مکان کے اندر بیک وقت کئی آوازوں کا ہلکا ہلکا مبہم سا شور سنائی دینے لگا۔ پھر دروازہ کھلا اور سید صاحب کا نورانی چہرہ نظر آیا۔

”خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیریت ہیں۔“ حیدر علی مضطرب ہو کر گھٹنوں کے بل جھک گیا اور سید اکرام بخاری کے ہاتھوں کو بوسے دینے لگا۔ ”میں تو مایوس ہو چکا تھا کہ شاید اس زندگی میں دوبارہ آپ کی زیارت نصیب نہ ہو سکے۔“

سید صاحب نے اپنے کمزور ہاتھوں سے حیدر علی کے دونوں بازوؤں کو پکڑ لیا۔ ”جب خدائے عظیم و جلیل کا بندہ ہے تو اس کی رحمت سے مایوسی کیوں؟“

حیدر علی آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ ”بہت گناہ گار ہوں، اس لئے اُس کے قہر سے ڈر لگتا ہے۔“

”جب تک اس سے ڈرتا رہے گا، تجھ پر کوئی قہر نہیں ٹوٹے گا۔“ یکایک سید صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ”اُو نے اپنے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرنے کے بجائے میری مزاج پرسی کی۔ خدا تجھے جزائے خیر دے۔“ یہ کہہ کر سید صاحب نے حیدر علی کا ہاتھ پکڑا اور اسے مکان کے اندر لے گئے۔

عجیب ہیجان انگیز صورتِ حال تھی۔ حیدر علی کے اہل خانہ فرطِ مسرت سے رو رہے تھے اور سالار میسور دُھندلی آنکھوں سے ایک ایک چہرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

بیٹے کی جدائی کے صدمے سے غدا حال مجیدہ بیگم..... شوہر کے فراق میں بے حال ناظم بیگم..... باپ کی آغوشِ محبت سے محروم دس سالہ شیو سلطان اور دو سالہ کریم شاہ..... اور آقا کی دوستانہ شفقتوں کے لئے ترستا ہوا شجاعت خان۔

بہت دیر تک خوشی میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں کے چراغ روشن رہے اور نشاطِ آمیز سکینوں کا جشن برپا رہا۔ پھر جب آتشِ فراق بجھ گئی اور موسمِ بہار کی طرب انگیز ہوائ نے سینہ چاکوں کے

سارے زخم بھر دیئے تو سید صاحب، حیدر علی سے مخاطب ہوئے۔

”اپنی امانتوں کا شمار کر لے۔ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟“ اس جذباتی فضا میں سید صاحب خود بھی بے حال تھے اور مسلسل رو رہے تھے۔ ”تیری امانتوں کے اس بارگراں نے میری کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ چند دنوں میں اتنا بوڑھا ہو گیا جیسے میں نے صدیوں کا سفر طے کیا ہے۔ میں اپنے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ دنیا والوں نے تو میری ہلاکت کا سارا سامان جمع کر لیا تھا۔ مگر یہ اسی ذاتِ بے نیاز کا کرم ہے کہ مجھ بے سروسامان کی شکستہ کشتی کو ساحل تک پہنچا دیا۔“

حیدر علی بھی زار و قطار رو رہا تھا۔ ”منافقوں کی اس ہستی میں آپ کے سوا میرا ہمدرد و غم گسار اور کون تھا؟ پھر میں کہاں جاتا؟“

”بس بہت ہو چکا۔ اب کبھی مجھے کسی آزمائش میں مبتلا نہ کرنا۔“ سید صاحب بزرگانہ اور مشفقانہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”آئندہ میں تیری ایک نہیں سنوں گا۔ معاذ اللہ! اُو مجھے کیسے امتحانوں میں ڈال گیا تھا۔“

”آخری زحمت اور دوں گا۔“ حیدر علی نے اس بچے کی طرح کہا جسے یقین ہو کہ اس کا باپ ہر حال میں اس کی ضد پوری کر دے گا۔

”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔“ سید صاحب نے اسی مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”بس اب محل کی طرف لوٹ جا۔ اپنے دل کی کہے جاتا ہے، ان غریبوں کی طرف نہیں دیکھتا جو ایک دن میں ہزاروں بار جیتے ہیں اور ہزاروں بار مرتے تھے۔“ سید صاحب نے مبہم الفاظ میں حیدر علی کے اہل خانہ کی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”فرشِ خاک پر سوتے سوتے اور سوکھے گلے کھاتے یہ لوگ بیمار پڑ گئے ہیں۔ اُو ان کا خیال کیوں نہیں کرتا؟“

جیسے ہی سید صاحب خاموش ہوئے، حیدر علی کی والدہ، مجیدہ بیگم بول اُٹھیں۔

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں سید صاحب؟ آپ کے احسانات کا قرض تو ہماری سلیس بھی نہیں اُتار سکیں گی۔“

”کیسا احسان اور کیسا قرض؟“ سید صاحب اپنے مخصوص پُر جلال لہجے میں بولے۔

”بس! اب تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ مجھ فقیر سے تمہاری میزبانی نہیں ہو سکتی۔ اور ہاں! اس دوران تم لوگوں نے یہاں جو کچھ دیکھا ہے، اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ ورنہ یہ بوڑھا پورے شہر میں بدنام ہو جائے گا۔“

حیدر علی نے بڑی حیرت سے سید صاحب کی بات سنی مگر وہ اُن کے اس مخصوص اشارے کو نہ سمجھ سکا۔ ”بس ایک رات کی بات اور ہے۔ کل راجہ کرشنا سے سارے معاملات طے پا جائیں گے۔ پھر میں اپنی ان امانتوں کو واپس لے جاؤں گا۔“ یہ کہتے کہتے ایک بار پھر حیدر علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”اچھا اچھا، ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔“ سید صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں مسکراتے

اقتدار ہونے کی نشانی ہے۔“

”اگر حیدر علی کے ارادے غیر ہوتے تو وہ کبھی آپ کی خدمت میں تحائف ارسال نہ کرتا۔“ رانی لکشم نے اپنی بات کے حق میں پُر زور دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”اور باریابی کی اجازت طلب کرنا بھی اس حقیقت کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ وہ ابھی تک آپ کا فرمانبردار ہے۔ اگر اس کی نیت میں خلل واقع ہو چکا ہوتا تو وہ درندوں کی طرح محل میں چلا آتا اور سب کچھ تہہ بالا کر کے رکھ دیتا۔“

راجہ کرشنا نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور اس کے دیران چہرے پر آسودگی کا گہرا رنگ نمایاں ہو گیا۔

اس بار والی میسور کے دربار میں شجاعت خان، حیدر علی کے نمائندہ خاص کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ راجہ کرشنا نے شجاعت خان کو اپنی مخصوص نشست گاہ میں طلب کیا اور حیدر علی کے بھیجے ہوئے تحائف دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”حیدر علی کو اجازت کی کیا ضرورت تھی؟ وہ ہمارا معتمد خاص ہے۔ جب جی چاہے، چلا آئے۔“

دراصل راجہ کرشنا، شجاعت خان سے گفتگو کر کے صحیح صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مگر شجاعت خان کی مسلسل خاموشی نے والی میسور کے اس منصوبے کو نامہ بنادیا تھا۔ آخر راجہ کرشنا یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”حیدر علی سے کہو کہ ہم بہت بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم نے کئی ماہ سے اپنے جاننا سالار کو نہیں دیکھا ہے۔“

شجاعت خان دل ہی دل میں اُس کی ریاکارانہ باتوں پر مسکرایا پھر نصف قد تک جھک کر رخصتی سلام پیش کیا اور مضبوط قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا محل سے نکل گیا۔



دوسرے دن حیدر علی اپنے بڑے بیٹے ٹیپو سلطان اور چند منتخب سرداروں کے ساتھ محل میں داخل ہوا۔ تمام فوج نے آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا اور محل کے ہر دروازے پر بڑے بٹھادیے گئے تھے۔

آج حیدر علی کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ شاہانہ رفتار کے ساتھ محل کی راہداریوں سے گزر رہا تھا۔ والی میسور کے محافظ سپاہی، حیدر علی کو دیکھ کر احتراماً سر جھکا لیتے اور وہ بے نیازانہ آگے بڑھ جاتا۔ آخر تمام فاصلے ختم ہوئے اور حیدر علی اس مخصوص کمرے میں داخل ہو گیا، جہاں راجہ کرشنا اور میسور کی تینوں رانیاں دیواجی منی، لکشم اور کانتا موجود تھیں۔

حیدر علی نے دروازے میں کھڑے ہو کر والی میسور کی نشست کا جائزہ لیا اور پھر ایک ایک قدم پُر زور دیتا ہوا راجہ کرشنا کے سامنے پہنچ گیا۔ آج حیدر علی نے خلاف معمول راجہ کرشنا کو

ہوئے کہا۔ ”معاملات تو طے پا گئے۔ پھر کیا باقی ہے؟ کوئی تاجور، کوئی خاک بسر، یہی اس نظام ہے۔ جب قدرت اپنے انعامات لٹا رہی ہو تو انسان کو دامن وسیع کر لینا چاہئے۔ کوئی عمارے پر راضی ہو گیا اور کسی نے تاج زر نگار پہن لیا۔ دینے والے نے تو کوئی کمی نہیں کی تھی، اب یہ اپنے اپنے حوصلے اور طلب کی بات ہے۔ تو بھی اپنے معاملات درست کر لے۔“

حیدر علی نے بہت غور سے سید اکرام بخاری کی اشاراتی گفتگو سنی، پھر بڑے ادب سے سلام کیا اور ٹیپو سلطان اور شجاعت خان کو ساتھ لے کر اپنے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں شجاعت خان نے حیدر علی کو بتایا، راجہ کرشنا اور کھنڈے راؤ کے سینکڑوں سپاہی روزانہ سید صاحب کے مکان پر حملہ کرنے کے لئے آتے تھے اور پھر ناکام و نامراد لوٹ جاتے تھے۔ نہ انہیں مکان نظر آتا تھا اور نہ مکین۔ خدا ہی جانے کہ یہ کیا راز تھا؟ ہم لوگ گھر کے درپچوں سے حملہ آوروں کو دیکھ سکتے تھے مگر ان کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے تھے یا پھر کچھ کے لئے ان کی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی تھی۔ مگر کار.....“

”بس، خاموش ہو جا شجاعت خان!“ حیدر علی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا تجھے سید صاحب کی ہدایت یاد نہیں رہی؟..... اسی کو خیانت کہتے ہیں۔“

شجاعت خان لرز کر رہ گیا۔

”اللہ مجھے معاف کرے۔ میری نیت میں کوئی خلل نہیں تھا۔ میں تو آپ کو سید صاحب کا مقام بتانا چاہتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کس طرح اپنے چہرے پر نقاب ڈالے رہتے ہیں۔“

”احق!“ اس بار حیدر علی نے شجاعت خان کو ڈانٹ دیا۔ ”ایک اٹھوا، سید کا مقام دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہیں جل کر خاک نہ ہو جائے۔“



دوسرے دن حیدر علی نے راجہ کرشنا کی نذر کے لئے چند تحائف بھیجے اور باریابی کی اجازت چاہی۔ میسور کی رانیوں اور راج گھرانے کے دوسرے ہوش مند افراد نے حیدر علی کے اس طرز عمل کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ پھر رانی لکشم ہتھکڑیاں لگاتے ہوئے بولی۔

”مہاراج! غلام، غلام ہی رہتا ہے۔ حیدر علی جنگ تو جیت گیا، مگر اس کی عادت نہیں بدلتی۔“

”کیسی عادت؟“ راجہ کرشنا نے چونک کر سوال کیا۔

”حیدر علی بچپن سے راج گھرانے کے سامنے سر جھکانے کا عادی ہے۔“ رانی لکشم نے اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے ایک اور ہتھکڑیا لگایا۔ ”فاج ہوتے ہوئے بھی وہ ہمارے دروازے پر سر اٹھا کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ وہ جیت کر بھی ہار گیا..... اور ہم ہار کر بھی جیت گئے۔ اب ہمارا

اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں۔“

”وہ کیسے؟“ راجہ کرشنا، رانی لکشم کی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ ”ہمارے سارے وفادار فوجی غیر مسلح ہو چکے ہیں۔ چند محافظوں کے سوا کسی سپاہی کے پاس تلوار تک نہیں۔ یہ تو بے

رائوں کی بات مان کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ ”یہ سب کچھ خدمت گاروں کی حماقت کے سبب ہوا۔“ راجہ کرشنا نے کھلا جھوٹ بولا تھا اور اسی وجہ سے اس کی زبان میں ہلکی سی کلفت تھی۔ ”خیر! حیدر علی مسکرایا۔ ”اپنے خادموں کو حکم دیں کہ وہ دومیڈ کرسیوں کا انتظام کریں تاکہ میں اطمینان سے اپنی گفتگو جاری رکھ سکوں۔ اس کے ساتھ ہی ریاست کے میرنشی کو بھی طلب فرما لیجئے۔“

راجہ کرشنا نے کسی پس و پیش کے بغیر حیدر علی کی ہدایت پر عمل کیا مگر وہ میرنشی کے ذکر پر بری طرح چونک اٹھا تھا۔

دونوں کرسیاں والی میسور کے قریب بچا دی گئیں۔ حیدر علی چند قدم آگے بڑھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری کرسی خالی پڑی تھی، جسے راجہ کرشنا اور رائیاں بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”تم لوگ بھی اندر چلے آؤ۔“ حیدر علی نے بلند آواز میں کہا۔ اور دوسرے ہی لمحے ٹیپو سلطان دیگر نو بجی افسروں کے ساتھ راجہ کرشنا کی نشست گاہ میں داخل ہو گیا۔ ان افسروں میں شجاعت خان بھی شامل تھا۔

”سپاہی! یہاں بیٹھ جاؤ۔“ حیدر علی نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹیپو سے کہا۔

دس سالہ بچے نے باپ کا حکم سنا مگر کرسی پر بیٹھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ”پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھو۔“ حیدر علی نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ کرسی تمہارے ہی لئے ہے۔“

جب ٹیپو سلطان کرسی پر بیٹھ گیا تو حیدر علی دوبارہ بیٹے سے مخاطب ہوا۔ ”جان پدرا! غور سے سنو کہ تمہارا باپ کس سے کیا گفتگو کر رہا ہے۔ آئندہ تمہیں بھی ایسے ہی مسائل سے واسطہ پڑے گا۔“

یہ کہہ کر حیدر علی نے والی میسور کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ مہاراج کرشنا ہیں، ریاست میسور کے مالک۔ انہیں تم خوب پہچانتے ہو۔ ان کی سیاست کا کمال یہ ہے کہ اپنے جاں نثاروں اور وفاداروں کو بھیڑ بکریوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وقت پڑنے پر اچھوتوں کو بھی گلے لگا لیتے ہیں اور مطلب نکل جانے کے بعد اپنے محسنوں کو بھی قتل کرا دیتے ہیں۔ اگر خدا کا کرم شامل حال نہ ہوتا تو آج تم، تمہارا باپ، تمہاری دادی اور ماں اور تمہارا چھوٹا بھائی، سب کے سب قبروں میں سو رہے ہوتے۔“

حیدر علی بڑے عجیب انداز میں راجہ کرشنا کے جرائم کی فہرست پیش کر رہا تھا جسے سن کر والی میسور کے چہرے پر گناہ گارانہ سیاہی پھیل گئی تھی۔

”یہ بڑی سنگین تہمت ہے مجھ پر۔ دیوتاؤں کی قسم! میں بے قصور ہوں۔“ آخر راجہ کرشنا

درباری انداز میں سلام نہیں کیا تھا۔ سالار میسور کی یہ بدلی ہوئی ادا دیکھ کر راجہ کرشنا اور رائوں کے مطمئن چہروں پر وحشت برسنے لگی تھی۔ جب حیدر علی دروازے میں داخل ہوا تھا تو رائوں گھرانے کے یہ چاروں افراد بڑے متکبرانہ انداز میں زرنگار کرسیوں کی پشت سے سر لگائے اور پاؤں پھیلائے آنے والے کے انتظار میں اس طرح بیٹھے تھے جیسے وہ ان کا کوئی ادنیٰ خدمت گار یا مسوروٹی غلام ہو۔ حیدر علی کو دیکھ کر بھی ان چاروں کے زاویہ نشست میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مگر جب حیدر علی سلام کے بغیر طویل درمیانی فاصلہ طے کر کے راجہ کرشنا کے دروازے گیا تو والی میسور نے گھبرا کر اپنا زاویہ بدلا اور جھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سپہ سالار کی طرز دیکھنے لگا۔ راجہ کے ساتھ تینوں رائیاں بھی اسی کیفیت سے دو چار تھیں۔

”تو اپنی روش بھول گیا حیدر علی!“ راجہ کرشنا سنبھل کر تند و تیز لہجے میں سالار میسور سے مخاطب ہوا۔

”میں کچھ نہیں بھولا ہوں مہاراج! آپ ہی بدل گئے۔“ حیدر علی نے بہت آہستہ لہجے میں جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک انتہائی آسودہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”تو نے ہمیں سلام تک نہیں کیا۔“ یکا یک راجہ کرشنا کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔

”آپ نے تو سارے رشتے ہی توڑ ڈالے۔ پھر کیا سلام اور کہاں کا ادب؟ ان چیزوں کا تعلق صرف دل سے ہے۔“ حیدر علی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ ”جب پورا سینہ ہی منافقتوں اور نفرتوں کے غبار سے بھر جائے تو پھر کیا باقی رہ جاتا ہے؟“

”یہ سب تیرا وہم ہے۔“ راجہ کرشنا بے دست و پا ہونے کے باوجود اپنی اسی روایتی ہندو دھرم کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”وہم انسانی دماغ کی پیداوار ہے۔ اس لئے اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔“ حیدر بدستور مسکراتے ہوئے گفتگو کر رہا تھا۔ ”مگر آنکھیں تو دھوکا نہیں کھا سکتیں۔“

”آخر تیری آنکھوں نے کیا دیکھ لیا؟“ راجہ کرشنا نے ابھی تک نوشتہ دیوار نہیں پڑھا تھا وہ ماضی کے خواب ناک ظلم میں گرفتار تھا۔

”میں بارہا آپ کی اس نشست گاہ میں داخل ہو چکا ہوں۔“ حیدر علی نے اپنی گوارہ کمرے کے چاروں گوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آج سے پہلے یہاں کئی کئی موجود تھیں جن پر معززین ریاست بیٹھا کرتے تھے۔ مگر اس وقت آپ حضرات کی کرسیاں

سوا یہاں ایک کرسی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔“

حیدر علی کے اس سوال پر راجہ کرشنا بدحواس ہو گیا۔ والی میسور نے اپنے ایک منصوبے کے تحت ساری کرسیاں اٹھوا دی تھیں اور حیدر علی کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اندازاً چاہتا تھا کہ اس میں غلامانہ خوباتی ہے یا وہ اپنے آپ کو بدل کر باغی ہو چکا ہے۔

”میں نے قصد ایسا نہیں کیا۔“ اب راجہ کرشنا کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس



کلمات سے یاد کر رہے ہیں اور قلعے کے مکین سمجھ رہے ہیں کہ حیدر علی، مہاراج کے حضور سلامی پیش کر رہا ہے۔“

چپے ہی حیدر علی خاموش ہوا، ریاست کے میرنشی پنڈت سندر لال نے باریابی کی اجازت

پائی۔ پھر تھوڑی دیر بعد حیدر علی کی ہدایت کے مطابق ایک قانونی دستاویز تیار ہو گئی، جس کا متن اس طرح تھا۔

”اب میری صحت اس قابل نہیں رہی کہ میں سیاسی امور کی نگرانی سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ اس لئے ریاست کے سارے اختیارات حیدر علی کے سپرد کرتا ہوں۔ آج سے وہی میسور کے حکمران ہیں۔“

نیچے راجہ کرشنا کی مہر تھی جو اس نے کانپتے ہاتھوں سے کانڈ پر ثبت کی تھی۔ دوسری دستاویز کے ذریعے راجہ کرشنا اور اس کے اہل خاندان کے لئے تین لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر علیحدہ کر دی گئی تھی۔



اس کے بعد حیدر علی اپنی پوری فوج کے ساتھ سید اکرام بخاری کے مکان پر پہنچا۔ پوری نفاذ فوجی بیڑ کی رجز بہ دھن سے گونج رہی تھی۔ سید صاحب گھبرا کر مکان سے باہر نکل آئے۔ ہر طرف فوجیوں کے سر ہی سر تھے۔

”یہ سب کچھ کیا ہے؟“ سید نے گھبرا کر حیدر علی سے پوچھا جو شیخو سلطان اور اپنے فوجی افسروں کے ساتھ دروازے پر کھڑا تھا۔

”میسور کی فوج اپنے سالار کو سلامی دینے کے لئے حاضر ہوئی ہے۔“ حیدر علی نے مختصر سا جواب دیا اور پلٹ کر اپنے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”دوسرے ہی لمحے سرنگاپٹم کی فضا خوف ناک دھماکوں سے لرز اٹھی۔ حیدر علی کی توپیں، سید صاحب کو سلامی پیش کر رہی تھیں۔

شیخو سلطان اور تمام فوجی افسروں نے سلامی کی رسم ادا کی۔ سب سے آخر میں حیدر علی نے سید صاحب کی خدمت میں فوجی سلام پیش کیا اور انتہائی بلند آواز میں پکار کر کہا۔

”ریاست میسور کا اقتدار حیدر علی کے قدموں کے نیچے اور حیدر علی کا تخت و تاج سید کے قدموں کے نیچے۔“

محبت و عقیدت کے اس پُر جوش مظاہرے پر سید اکرام بخاری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”حیدر علی! تجھے یہ غیبی انعام مبارک ہو۔“ سید صاحب نے بے اختیار میسور کے نئے حکمران کو گلے لگا لیا۔

سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ ہڈیاں انداز میں جھنجھا۔

”آپ کی سیاست سے تو دیوتاؤں کا تقدس بھی محفوظ نہیں۔“ یکایک حیدر علی مسکرانے لگا۔ ”وہ بے چارے پتھر کے بے جان بت آپ کے جھوٹ کے خلاف احتجاج کرنے یہاں تو نہیں آئیں گے۔“

راجہ کرشنا گردن تک حالات کی دلدل میں اتر چکا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے آپ کو بچانے کی آخری ناکام کوشش کی۔

”یہ اس کتے کھنڈے راؤ کا منصوبہ تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ محل کے باہر کیا ہوتا رہا۔“ ”وہ دو کوڑی کا غلام اس قدر با اختیار ہو گیا تھا کہ مرہٹہ فوج سرنگاپٹم میں داخل ہو گئی اور آپ کو خبر تک نہ ہو سکی۔“ اگرچہ حیدر علی کی آواز معمول سے زیادہ بلند تھی لیکن پھر بھی اس کے لہجے سے راجہ کرشنا کے لئے احترام ظاہر ہوا تھا۔ ”میرے سر کی بولی لگائی تھی، آپ کے ہر کارے گلے میں ڈھول ڈال کر گلی گلی چیتنے پھرے اور آپ کو خبر تک نہ ہو سکی۔ آخر یہ کسی بے خبری تھی؟ میرے بیوی بچوں کو یہ غلام بنانے کے لئے اس فرشتے کے گھر پر یلغار لگی گئی جس کا وجود اس ریاست کے لئے باعثِ رحمت ہے۔“

راجہ کرشنا اپنا مقدمہ ہار چکا تھا۔ ذلت و بربادی کو اتنے قریب دیکھ کر پاگل ہو گیا اور سالار میسور کو گالیاں بکنے لگا۔

”تو نمک حرام اور احسان فراموش ہے حیدر علی! تو بھوک اور افلاس کی گلیوں میں پڑا ہوا خاک کا ایک حقیر ذرہ تھا۔ میری نگاہ کرم نے تجھے چمکایا اور امارت کے آسمان تک پہنچا دیا۔“

”اگر میں نمک حرام ہوتا تو آپ اس وقت پس دیوار زنداں ہوتے یا شمشان گھاٹ میں آپ کی چتا کی آگ بجڑ کر رہی ہوتی۔“ حیدر علی ابھی تک شائستہ اور نرم لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

”میں نے سرنگاپٹم کے لوگوں میں آپ کا وقار قائم رکھنے کے لئے تحائف ارسال کئے اور باریابی کی اجازت چاہی۔ یہ میری احسان شناسی کا کھلا ثبوت ہے کہ میں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا رہا ہوں۔ اگر آپ مجھ پر قابو پا لیتے تو میری لاش میسور کی شاہراہوں پر پھینچی جا رہی ہوتی۔

آپ اس ریاست کی بات کر رہے ہیں جس پر گوپال راؤ مرہٹہ نے قبضہ کر لیا تھا اور آپ کے قبضے میں صرف تین تین دہات باقی رہ گئے تھے۔ یہ میری ہی جرأت و مردانگی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی مختصر سی جاگیر کو ہزاروں میل تک وسیع کر دیا۔“ یکایک حیدر علی کے چہرے پر اذیت و کرم

کے گہرے سائے نمایاں ہو گئے اور وہ بہت زیادہ جذباتی نظر آنے لگا تھا۔ ”آپ نے مجھے بڑے آزار پہنچائے ہیں اور بڑی غلطیاں دی ہیں۔ اگر میں احسان فراموش ہوتا تو آپ کی

زبان کاٹ کر اپنے پیروں سے مسل دیتا۔ لیکن میری شرافتِ نسبی مجھے اس عمل سے روکتی ہے۔ کاش! آپ میری اس اعلیٰ ظرفی کو محسوس کرتے کہ میں نے جو کچھ کہا، ایک بند کمرے میں کہا

اور آپ کی محترم ذات کو رعایا کے سامنے تماشائیں بنایا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آپ مجھے

کھنڈے راؤ کی زندگی بڑی عذاب ناک حالت میں گزر رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دقت اتنی تیزی سے کروٹ لے گا اور راتوں رات سالار میسور، نواب حیدر علی بن جائے گا۔ اور پھر اس کی ذلت و بربادی کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان شروع ہو جائے گی۔ کھنڈے راؤ کے دہم دنگان میں بھی نہ تھا کہ حیدر علی اسے اتنی شرم ناک سزا دے گا کہ دیکھنے والے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گے۔ حیدر علی نے کھنڈے راؤ کا پنجرہ قلعے کے چوراہے پر نصب کرایا تھا تاکہ نکل کے رہنے والے آتے جاتے اس کی بے چارگی کا تماشا دیکھ سکیں۔ دن میں کئی وقت لوگ ادھر سے گزرتے اور بلند آواز میں ایک دوسرے کو مخاطب کر کے کہتے۔

”وہ رہا نواب صاحب کا طوطا، کھنڈے راؤ.....!“

ایک دن حیدر علی ادھر سے گزرا اور اس نے حسب عادت اپنے طوطے کی مزاج پرسی کی۔ ”کھنڈے راؤ! تجھے یہاں دانے پانی کی تنگی تو نہیں ہے؟“

”اب مجھے آب و دانہ نہیں، موت چاہئے۔“ کھنڈے راؤ گھٹنوں کے بل حیدر علی کے سامنے جھک گیا۔ ”اب مجھ سے یہ رسوائی برداشت نہیں ہوتی۔ اپنے کسی ملازم کو حکم دیجئے کہ وہ ایک ہی وار میں میرا سر قلم کر ڈالے اور مجھے اس عذاب مسلسل سے نجات دیدے۔“

حیدر علی مسکرایا۔ ”میرے اور راجہ کرشنا کے درمیان یہی معاہدہ طے پایا تھا کہ میں تجھے اس طرح حفاظت سے رکھوں گا جیسے کوئی شخص اپنے طوطے کو پالتا ہے۔“

”اپنے اس معاہدے کو توڑ دیجئے مالک!“ کھنڈے راؤ بھکاری کی مانند گڑ گڑایا۔

”تو خوب جانتا ہے کہ حیدر علی وعدہ خلائی نہیں کرتا۔“ نواب میسور کے لہجے میں توپوں جیسی گرج تھی۔ ”اگر تو اپنی زندگی سے اتنا ہی بیزار ہے تو میں تیرے قتل کا حکم کیوں جاری کروں؟ تو خود پنجرے کی آہنی سلاخوں سے سر پھوڑ کر مر جا۔“

”مالک! میرا جرم اتنا سنگین نہیں تھا کہ مجھے اتنی عبرت ناک سزا دی جاتی۔“ یکایک کھنڈے راؤ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ”میں تو راجہ کرشنا اور رانیوں کی بساط سیاست کا ایک ادنیٰ مہرہ تھا۔ جہاں چاہا آگے بڑھا دیا اور جب چاہا، موت کے منہ میں جھونک دیا۔“

کھنڈے راؤ جانتا تھا کہ اگر اس نے حیدر علی کے خلاف کی جانے والی سازش کو بے نقاب کر دیا تو راجہ کرشنا اپنا معاہدہ توڑ کر والی میسور کو اس بات پر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ سابق وزیر اعظم کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ شروع میں کھنڈے راؤ، راجہ کرشنا کی تنبیہ سے خوف زدہ ہو گیا تھا مگر حیدر علی کی طرف سے دی جانے والی ذلت آمیز اور تکلیف دہ سزا نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔

”راجہ کے ساتھ تمام رانیاں بھی آپ کے خون کی پیاسی ہیں..... اور رانی کانتا تو انتقام کے راستے پر بہت آگے جا چکی ہے۔ اس نے آپ کے کٹے ہوئے سر پر بہت بھاری انعام مقرر کیا ہے۔“ کھنڈے راؤ نے شروع کے دنوں میں قید خانے سے کئی بار خفیہ طور پر رانی کانتا کو

پھر حیدر علی، سید صاحب اور اپنے اہل خانہ کو لے کر نکل پینچا۔ دوسرے دن دربار آراستہ کیا گیا اور جب رسم تاجپوشی کا وقت آیا تو حیدر علی، سید صاحب کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

سید صاحب کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر اس دعا کے ساتھ حیدر علی کے سر پر تاج رکھ دیا۔ ”اے مالک الملک! اپنے اس کارندے کی دیکھری کرنا کہ یہ بہت ضعیف و ناتواں ہے۔“ جیسے ہی سید صاحب نے حیدر علی کو تاج پہنایا، مجیدہ بیگم زار و قطار رونے لگیں اور پھر اپنی نشست خاص سے اٹھ کر اسی کمرے کے ایک گوشے میں سجدہ ریز ہو گئیں۔ ان کی سماعت میں مبارکباد کی پر شور آوازیں گونج رہی تھیں۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو جانے والے بچے کو اہل دربار ”نواب حیدر علی خان بہادر“ کہہ کر پکار رہے تھے۔



جشن تاجپوشی سے فارغ ہو کر نواب حیدر علی نے محل کے درمیانی حصے میں ایک بہت بڑا پنجرہ نصب کرایا۔ قلعے کے کمین بڑی حیرت سے اس پنجرے کو دیکھ رہے تھے جس میں ایک ہاتھی آرام سے داخل ہو سکتا تھا۔ دوسرے لوگ تو اس پنجرے کے سلسلے میں کوئی سوال نہ کرتے مگر شجاعت خان پوچھ بیٹھا۔

”سرکار! قلعے کے بیچ میں یہ پنجرہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ آخر یہ کس کام آئے گا؟“

”میں اس میں اپنا طوطا پالوں گا۔“ نواب حیدر علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”طوطا؟“ شجاعت خان پاگلوں کی طرح حیدر علی کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”وہ کسی عام آدمی کا نہیں، نواب حیدر علی کا طوطا ہے۔“ والی میسور کے ہونٹوں کی

مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی تھی۔

پھر دیکھنے والوں نے اپنی آنکھوں سے بڑا عجیب منظر دیکھا۔ نواب حیدر علی کے حکم پر کھنڈے راؤ کو قید خانے سے نکال کر اس طویل و عریض پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ سرکار کا ملازم صبح و شام کھنڈے راؤ کو کھانے کے لئے دودھ اور چاول دیا کرتے تھے۔

جب کبھی کوئی مہمان قلعے میں آتا تو حیدر علی اسے اپنے ہمراہ لے کر پنجرے کے پاس پہنچ جاتا اور کھنڈے راؤ سے مخاطب ہو کر کہتا۔

”یہ صاحب مجھ سے بار بار تیرے متعلق دریافت کر رہے تھے۔ میں انہیں کیا بتاؤں؟ اب

تو خود ہی ان سے اپنا تعارف کرادے۔“

جواب میں کھنڈے راؤ زور زور سے کہنے لگتا۔ ”میں کھنڈے راؤ ہوں..... اپنے آقا

نواب حیدر علی کا طوطا۔“

پھر جب حیدر علی اپنے مہمان کے ساتھ واپس چلا جاتا تو کھنڈے راؤ گھٹنوں میں منہ

کر رونے لگتا۔

پیغام بھیجا تھا کہ وہ راجہ کرشنا پر دباؤ ڈال کر اسے آزاد کرانے کی کوشش کرے۔ مگر رانی کا ناساں طرح انجان بن گئی تھی کہ جیسے کھنڈے راؤ کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ سابق وزیر اعظم کو رانی کا ناساں کی یہ بے وفائی بہت گراں گزری تھی۔ اس لئے اب وہ ایک ہوس پرست بیوہ کی خلوتوں کے راز بھی بڑی صفائی کے ساتھ حیدر علی کے سامنے بیان کر رہا تھا۔ ”ان سب نے مل کر پیشوائے پونا ماہو راؤ سے ساز باز کر کے ایسا جی پنڈت کو سرنگا پیٹم پر حملے کی دعوت دی تھی۔“

”کوئی اور بات کر۔ یہ بہت پرانا قصہ ہے۔“ حیدر علی نے اسے جھڑک دیا۔

”یہ قصہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے پر بھو!“ کھنڈے راؤ پورے راج گھرانے کو اپنے انتقام کی آگ کا ایندھن بنا دینا چاہتا تھا۔ ”آج بھی آپ کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ اور ان سازشوں کا چال راج محل سے سری رنگ ناتھ کے مندر تک بچھا ہوا ہے۔ راجہ اور انیوں نے بڑے بت کے قدموں پر سر رکھ کر قسم کھائی ہے کہ جب تک آپ کو قبر میں نہیں سلا دیں گے، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“

”یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کھنڈے راؤ! کہ پہلے کون مٹی میں ملے گا۔“ حیدر علی نے بے نیازانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ ”مگر تو نے مجھے یہ بات بتانے میں بہت دیر کر دی۔ اب کوئی بھی اعتراف تیری سزا کو کم نہیں کر سکتا۔“

”مالک! میں تو برباد ہو چکا۔“ کھنڈے راؤ اتنے دنوں میں حیدر علی کا مزاج آشنا ہو چکا تھا اور وہ خوب جانتا تھا کہ اب رحم کی کوئی درخواست بھی والی میسور کے فیصلے کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ ڈوبنے سے پہلے چاہتا تھا کہ راجہ کرشنا اور فریب کار رانیاں بھی اس طوفان میں غرق ہو جائیں۔ ”مجھے اپنی ہلاکت کا کوئی غم نہیں۔ میں آپ کے اعتبار کا قاتل سہی مگر میری ایک بات یاد رکھئے گا کہ دشمنوں کو پرورش نہیں کیا جاتا۔ اس سے پہلے کہ راجہ کرشنا آپ کی قبر کھود دے، اسے اور اس کے اہل خاندان کو شمشان گھاٹ تک پہنچا دیجئے۔“ کھنڈے راؤ کو حیدر علی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اپنے نفس کی تسکین کے لئے راج گھرانے کی ذلت و بربادی چاہتا تھا۔

”پر بھو! میں نے راج نیتی میں یہی سبق سیکھا ہے کہ ناکام سیاست داں، دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہے۔ اور کامیاب سیاست داں، دشمن کے گھر میں داخل ہو کر اس کے دفاعی نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ آپ بھی راجہ کرشنا اور رانیوں کو منصوبہ سازی کی مہلت نہ دیجئے اور ان کے فساد دماغوں میں اپنی میٹھی ٹھونک دیجئے۔“ کھنڈے راؤ، نواب حیدر علی کو مسلسل درغلز رہا تھا۔ والی میسور نے بڑے پرسکون انداز میں کھنڈے راؤ کی طرف دیکھا۔ ”تو نے ابھی سری رنگ ناتھ کے مندر کا ذکر کیا تھا۔“ حیدر علی نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کے بارے میں تو اور کیا جانتا ہے؟“

”ہاں! وہی تو ہے آپ کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا مرکز۔“ کھنڈے راؤ نے تیز

”وہ سب کے سب بھیرول کے چیلے ہیں اور راجہ کرشنا کے تعاون سے جوتشیوں کے لباس میں گاؤں گاؤں گھوم کر ڈاکے ڈالتے ہیں اور کسانوں اور مزدوروں کی خوب صورت لڑکیوں کو اغوا کر کے ”دیوداسیاں“ بنا دیتے ہیں۔ اور پھر وہ بہر دیاسوامی ان دیوداسیوں کو ہوس کے قتل میں راجہ کرشنا کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔“ کھنڈے راؤ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بیان کر دیا تھا۔

حیدر علی کچھ دیر تک پنجرے کے قریب خاموش کھڑا رہا۔ پھر کھنڈے راؤ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”راجہ اور رانیوں کی سازشوں سے تو میں بہت پہلے باخبر ہو چکا تھا۔ مگر آج تو نے ایک بہت کام کی بات بتائی ہے۔ میں اس کے صلے میں تیری سزا کی جتنی کم کئے دیتا ہوں۔“

کھنڈے راؤ نے گھبرا کر پُر امید نظروں سے والی میسور کی جانب دیکھا۔

”آج کے بعد سے قلعے کا کوئی مکین تیری بے چارگی کا مذاق نہیں اڑائے گا۔“

”بس؟“ کھنڈے راؤ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس افشائے راز کے سلسلے میں حیدر علی سے اپنی رہائی کی توقع رکھتا تھا۔

”تجھ جیسے شخص کے ساتھ میری یہ مہربانی بھی بہت ہے۔“ حیدر علی نے بلند آواز میں کہا۔ ”اگر تو سوامی بھیرول جیسے انسان دشمن بھیڑیے کو بے نقاب نہ کرتا تو محل کے رہنے والے تجھے ایک جانور ہی سمجھتے رہتے۔“ اس کے ساتھ ہی حیدر علی نے نیا حکم جاری کر دیا کہ آئندہ کوئی شخص کھنڈے راؤ سے تحقیر آمیز سلوک نہیں کرے گا۔



اقدار سنبھالتے ہی حیدر علی نے اپنے معتمد میر رضا علی خان کو سپہ سالار اور شجاعت خان کو نائب کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ کھنڈے راؤ سے یہ خوف ناک اطلاع پاتے ہی حیدر علی نے میر علی رضا خان اور شجاعت کو خلوت میں طلب کر لیا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ راجہ کرشنا ایسے شرم ناک کاموں کی سرپرستی کرے گا۔“ حیدر علی نے اپنے دونوں معتمدین کے سامنے بھیرول کے حوالے سے تمام واقعات بیان کرتے ہوئے کہا۔

”سرکار! میں نے تو پہلے ہی اپنا شبہ ظاہر کیا تھا کہ سوامی بہت خطرناک انسان ہے۔“ شجاعت خان نے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”تیرے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے۔ مگر میں اس وقت بھیرول کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے محذور تھا۔“ حیدر علی کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ ”راجہ کرشنا میرے اس عمل کو ہندو مذہب میں مداخلت کا نام دے کر رعایا کے جذبات کو بھڑکا سکتا تھا اس لئے میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی مگر اس بدکار سوامی کا چہرہ میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔“

”پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“ سالار میر علی رضا خان نے اپنی شمشیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”محض چند گھنٹوں کی بات ہے، سوامی بھیرول کو گرفتار کر کے نواب بہادر کے حضور میں پیش کر دیا جائے گا۔“

”نہیں۔“ حیدر علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہندوؤں کی عبادت گاہ کا تقدس ہمارے پیش نظر ہے۔“ بھیرول کو گرفتار کرنے کے لئے ریاست کے سپاہی مندر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس طرح ایک نئی ہنگامہ آرائی کا اندیشہ ہے۔ کوئی اور ترکیب سوچی جائے، ہم اس بیٹھڑیے کو زنجیریں بھی پہنا دیں اور حکومت بھی نیک نام رہے۔“

میر علی رضا خان اور شجاعت خان بہت دیر تک سوامی بھیرول پر قابو پانے کی مختلف تدبیریں سوچتے رہے مگر کوئی ایک بھی ایسی ترکیب ذہن میں نہ آئی، جس سے حیدر علی مطمئن ہو جاتا۔ آخر طویل غور و خوض کے بعد والی میسور نے اپنے فوجی افسروں کے سامنے ایک تجویز پیش کی۔

”ہمارے فوجی سادہ لباس میں مندر کے محاصرے کے ساتھ سرنگ کے خفیہ راستے پر پہنچا قبضہ کر لیں۔“ حیدر علی نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ پیش بندی اس لئے ضروری ہے کہ کہیں بھیرول فرار نہ ہو جائے۔“

”مگر ہم سرنگ کے خفیہ راستے تک کس طرح پہنچیں گے؟“ میر علی رضا خان اور شجاعت خان نے بیک زبان کہا۔

”اس راستے تک تمہاری رہنمائی کھنڈے راؤ کرے گا۔“ حیدر علی نے اپنے بیچیدار منصوبے کا ایک اور گوشہ بے نقاب کر دیا۔

”یہ چال انتہائی کارگر ثابت ہوگی نواب بہادر! لیکن ہم سوامی پر ہاتھ کس طرح ڈالیں گے؟ وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتا اور ہم مندر میں داخل نہیں ہو سکتے۔“

”مندر کا محاصرہ تو اس لئے ہے کہ اندر کا کوئی شخص باہر نہ جاسکے۔“ حیدر علی نے اپنے معتد افسروں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میں سوامی کے تمام چیلوں کو ایک ہی وقت میں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ اب رہا بھیرول کا مسئلہ تو میں اسے اس کی پناہ گاہ سے نکلنے پر مجبور کر دوں گا۔“ اس کے بعد حیدر علی ادھر ادھر کی گفتگو کرتا رہا پھر آدھی رات کے قریب وہ علی رضا خان

اور شجاعت خان کے ہمراہ اپنی خلوت گاہ سے باہر نکلا۔ قلعے کے سارے مکین اور دوہام گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بس حیدر علی کے محافظ سپاہی جاگ رہے تھے۔ والی میسور کو سامنے پا کر سپاہیوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ حیدر نے انہیں سرگوشی کے انداز میں سمجھایا کہ وہ اپنی جگہ خاموشی کے ساتھ پہرہ دیتے رہیں اور محل کے اس حصے پر گہری نظر رکھیں جہاں راجہ کرشنا اور اس کے اہل خاندان رہتے ہیں۔ اگر راجہ کرشنا کا کوئی محافظ سپاہی اس طرف آنے کی کوشش کرے تو اسے وہیں روک دیا جائے۔

تمام احکامات جاری کر کے حیدر علی نے اس خدمت گار کو طلب کیا جو کھنڈے راؤ کو دونوں رات کھانا پہنچایا کرتا تھا۔ خدمت گار کا نپتا ہوا والی میسور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حیدر علی اسے اپنے ہمراہ لے کر بنجرے کے قریب پہنچا۔ کھنڈے راؤ اس وقت سکون کی نیند سورہا تھا۔

”دروازہ کھول کر اسے جگا دے۔“ حیدر علی نے بہت آہستہ لہجے میں خدمت گار کو حکم دیا۔ پھر جب خدمت گار نے کھنڈے راؤ کو جھجھوڑا تو وہ چیختا ہوا چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”یہ کون بکثت ہے جس نے میری نیند خراب کر دی۔“

”خاموش!..... نواب بہادر دروازے پر موجود ہیں۔“ خدمت گار نے تیز سرگوشی میں کھنڈے راؤ کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

کھنڈے راؤ شدید بدحواسی کے عالم میں چارپائی سے نیچے اتر آیا اور دروازے کے قریب پہنچ کر حیدر علی سے مخاطب ہوا۔ ”مالک! آپ اس وقت؟“

”باہر آ!“ حیدر علی کی سرگوشی اُبھری۔

کھنڈے راؤ لرزتے قدموں کے ساتھ بنجرے سے نکلا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ باز کر حیدر علی کے چہرے کے تاثرات کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”سرنگ کے خفیہ راستے تک ان لوگوں کی رہنمائی کر۔“ حیدر علی نے کھنڈے راؤ کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تُو نے اپنی عادت کے مطابق کسی نئی فریب کاری سے کام لیا تو تیرے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ایاچ بنا دوں گا۔“

اس کے بعد میر علی رضا خان، اور شجاعت خان، کھنڈے راؤ کو ساتھ لے کر قلعے سے نکل گئے۔ پھر رات کی تاریکی میں سینکڑوں سپاہی، سری رنگ ناتھ کے مندر کی طرف دوڑ رہے تھے اور نقب فوجیوں کا ایک دستہ میر علی رضا خان، شجاعت خان اور کھنڈے راؤ کے ہمراہ اس گھنے جنگل کی طرف جا رہا تھا جہاں مندر کی سرنگ کا خفیہ راستہ نکلتا تھا۔

منجھوتے ہوتے ہوتے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ کھنڈے راؤ کو واپس لا کر دوبارہ بنجرے میں بند کر دیا گیا تھا اور میر علی رضا خان اور شجاعت خان، مندر کے قریب پہنچ کر عام سپاہیوں میں شامل ہو گئے تھے۔



گاجن کی موجودگی میں وہ بیماری سے زیادہ کوئی ڈاکو نظر آتا تھا۔  
”نواب سے کہہ دو کہ ہم راج بھون میں ضرور پدھاریں گے۔“ سوامی بھیرول نے  
بڑے متکبرانہ لہجے میں کہا اور انتہائی کریمہ آواز میں ”ہری اوم، ہری اوم“ کا درد کرنے لگا۔



جشن تاجپوشی میں راجہ کرشنا کے ساتھ میسور کی رانیاں بھی شریک ہوئی تھیں مگر وہ سب  
کے سب اس حیرت میں مبتلا تھے کہ کئی ماہ گزر جانے کے بعد تخت نشینی کے حوالے سے یہ ہنگامہ  
آرائی کیسی ہے؟ اور اتنی بڑی تقریب ایک مختصر سے کمرے میں کیوں منعقد کی گئی ہے؟ اور ان  
کے علاوہ دوسرے معززین ریاست یہاں کیوں موجود نہیں ہیں۔ آخر راجہ کرشنا سے یہ صورت  
حال برداشت نہ ہو سکی اور وہ میسور کے حکمران سے پوچھ بیٹھا۔

”حیدر علی! یہ کیسی تقریب ہے کہ جہاں ہم پانچ افراد کے علاوہ کوئی چھٹا شخص موجود نہیں؟“

اس وقت کمرے میں صرف راجہ کرشنا، تین رانیاں اور حیدر علی موجود تھے۔

راجہ کا سوال سن کر حیدر علی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ”مہاراج! آپ تو اس درباری رسم  
سے بخوبی واقف ہیں کہ کسی ریاست کے فرمانروا کو کس طرح مخاطب کیا جاتا ہے۔“ والی میسور کا  
لوہہ انتہائی تلخ تھا۔ ”اب میں آپ کی فوج کا سالار نہیں، نواب حیدر علی خان بہادر ہوں۔“  
حیدر علی کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر راجہ کرشنا کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور اسے  
محسوس ہونے لگا کہ یہ جشن تاج پوشی نہیں، کوئی اور ہی تقریب ہے۔

مختصر سے وقفہ مسکوت کے بعد حیدر علی دوبارہ راجہ کرشنا سے مخاطب ہوا۔ ”اس تقریب کے  
مہمان خصوصی صرف پانچ ہیں۔ چار آچکے ہیں اور ایک کا انتظار ہے۔“ اب کی بار حیدر علی کے  
ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

اب راجہ کرشنا کو یقین ہو چلا تھا کہ تھوڑی دیر بعد کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے۔  
اس لئے وہ بار بار وحشت زدہ نظروں سے حیدر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور حیدر علی کی نظریں  
مستقل دروازے پر مرکوز تھیں۔ والی میسور کو سوامی بھیرول کی آمد کا انتظار تھا۔

حیدر علی نے بہت پہلے یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ اگر بھیرول اپنے چیلوں کے ساتھ قلعے میں  
داخل ہو تو کسی بہانے اس کے تمام چیلوں کو کمرے سے باہر روک کر حراست میں لے لیا  
جائے۔ اور تنہا بھیرول کو نشست گاہ میں بھیج دیا جائے۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد ایک خدمت گار کمرے میں داخل ہوا۔ تیز قدموں سے والی  
میسور کے قریب پہنچا اور جھک کر سرگوشی میں حیدر علی کو بتایا کہ بھیرول کے پچاس چیلوں کو  
حراست میں لے لیا گیا ہے اور سوامی تنہا اس کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ حیدر علی کے ہونٹوں پر  
ایک آسودہ مسکراہٹ ابھری اور اس نے اپنے دائیں جانب جھک کر خدمت گار سے سرگوشی میں  
کہہ کہا۔

دوسرے دن نواب حیدر علی نے اپنے ایک معتمد خاص کو یہ پیغام دے کر بھیرول کے پاس بھیجا۔

”معزز سوامی یقیناً اس حقیقت سے باخبر ہوں گے کہ میسور کی انتظامی صورت حال ہمارے  
چکی ہے اور اب راجہ کرشنا کے بجائے میں خود اس ریاست کا منتظم اعلیٰ ہوں۔ امرائے سلطنت  
کی تجویز ہے کہ میرے جشن تاجپوشی کی تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جائے۔ میں ذاتی طور  
پر ان ہنگامہ آرائیوں کا قائل نہیں..... مگر مشیران سیاست کے خیال میں یہ تقریب بہت ضروری  
ہے چنانچہ میں آپ جیسی محترم ہستی کو بصد خلوص اس تقریب میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں۔  
ہندوؤں کے روحانی پیشوا کی حیثیت سے اگر آپ اس تقریب میں شریک نہیں ہوئے تو میرا  
جشن تاجپوشی بے رنگ اور نامکمل رہ جائے گا۔ مجھے آپ کے تعاون اور دعاؤں کی بے  
ضرورت ہے۔“

جب حیدر علی کے خادم خاص نے یہ پر تکلف دعوت نامہ، سوامی بھیرول کو پڑھ کر سنایا تو  
خوشی سے پاگل ہو گیا اور ہندیائی انداز میں بڑبڑانے لگا۔

”ہم اس تقریب میں شرکت کرنے کے لئے راج محل ضرور آئیں گے اور نواب کو اپنے  
آشیرداد سے سرفراز کریں گے کہ ہمارے آشیرداد کے بغیر میسور کی کوئی حکومت کامیابی سے  
ہمکنہ نہیں ہوگی۔“

حیدر علی کے خادم خاص نے گہری نظروں سے بھیرول کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ  
لیا اور مطمئن نظر آنے لگا۔ سوامی نے بڑی آسانی سے نواب کے بچھائے ہوئے جال کی طرف  
اپنی گردن بڑھادی تھی اور نادیدہ پھندے آہستہ آہستہ تنگ ہوتے جا رہے تھے۔  
”مگر ہمیں ایک اُلجھن درپیش ہے۔“ یکا یک سوامی بھیرول، نواب حیدر علی کے اچلی سے  
مخاطب ہوا۔

”کیسی اُلجھن مہاراج؟“ حیدر علی کے خادم خاص نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔  
اُسے والی میسور کی طرف سے ایسی نیازمندی کا حکم دیا گیا تھا کہ کہیں بھیرول کسی شک میں نہ  
نہ ہو جائے۔

”ہم اپنے مخصوص چیلوں کے بغیر آج تک کسی دعوت میں شریک نہیں ہوئے۔“ یہ بات  
کہتے کہتے بھیرول کے چہرے پر عجیب سا تاثر نمایاں تھا جیسے وہ خود بھی کسی ریاست کا حکمران  
ہو اور اپنے مصاحبوں کے ہجوم کے بغیر کسی تقریب میں شرکت نہ کرتا ہو۔

”آپ اپنے تمام چیلوں کے ہمراہ محل میں تشریف لاسکتے ہیں۔“ حیدر علی کے خادم خاص  
نے برجستہ کہا۔ ”نواب بہادر کا یہی حکم تھا۔ دراصل آپ کے جلال روحانی کے سبب مجھ پر ایک  
دہشت سی طاری تھی اس لئے میرے حافظے سے یہ بات محو ہو گئی۔“  
سوامی بھیرول نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور موٹی موٹی مونچھوں پر ہاتھ بھیرنے

ہرمانی کے لباس کو بھی دھجیوں میں تبدیل کر دیں گے۔“ حیدر علی نے اتمام حجت کے طور پر کہا۔ مگر راجہ کرشنا بار بار ہندو رعایا کے پاس جانے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

آخر حیدر علی کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ چیخ کر بولا۔ ”آپ سے پہلے میں خود باؤں گا اپنی رعایا کی عدالت میں اور اس پاپی بھیرول کا مقدمہ پیش کر کے پوچھوں گا کہ اصل جرم کون ہے۔“

جب راجہ کرشنا پر اس سنبھہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو حیدر علی نے اپنے خدمت گاروں کو آواز دی۔

دوسرے ہی لمحے چند سپاہیوں کے ہمراہ کھنڈے راؤ کمرے میں داخل ہوا اور حیدر علی کے ہاتھ کا اشارہ پاتے ہی سابق وزیر اعظم نے راجہ کرشنا اور سوامی بھیرول کی ذات سے وابستہ تمام شرمناک افسانے حرف بہ حرف دہرا دیئے۔

رائیوں نے بدحواس ہو کر راجہ کرشنا کی طرف دیکھا، جو پوری ریاست میں نیک اور عبادت گزار حکمران کی حیثیت سے مشہور تھا۔ راجہ ان عورتوں کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکا اور اپنے جاہ و منصب کو فراموش کر کے کھنڈے راؤ کو گالیاں دینے لگا۔

”یہ میرے خلاف گھناؤنی سازش ہے۔“ راجہ کرشنا کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ حیدر علی سے مخاطب ہوا۔ ”تو نے ایک باؤلے کتے کو اس کے آقا پر چھوڑ دیا ہے۔ مگر یاد رکھ کہ میں تیری اس ذلیل حرکت کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”میں نے تو آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر قدرت کا نظام انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔“ حیدر علی کا ضبط و تحمل قابل دید تھا۔ ”انسان خود ہی اپنے چہرے پر سیاہی مل کر مجمع عام میں پلٹا ہے اور چیخ چیخ کر کہتا ہے..... لوگو! میرا اصلی چہرہ دیکھو کہ میں کتنا گناہ گار ہوں۔“

راجہ کرشنا غصے میں بھرا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا تو حیدر علی نے اسے ٹوک کر کہا۔ ”یہ بڑی شرافت ہے کہ میں ایک بار پھر بند کمرے میں آپ کا حساب کر رہا ہوں۔ ورنہ جی تو یہ چاہتا ہے کہ جس ہندو رعایا کا نام لے کر مجھے دھمکیاں دی جا رہی ہیں، اسی کے سامنے آپ کا اعمال نامہ پیش کروں۔“

راجہ کرشنا پھر بھی نہیں مانا اور تیز رفتاری سے دروازے کی طرف بڑھا مگر وہاں مسلح سپاہیوں کو جوڑ پاکر واپس لوٹ آیا۔

”حساب سے پہلے آپ کو جانے نہیں دوں گا مہاراج!“ حیدر علی کا لہجہ قدرے سخت تھا۔ پھر والی میسور، سوامی بھیرول سے مخاطب ہوا۔ ”میرے سینکڑوں سپاہی مندر کا محاصرہ کر چکے ہیں۔ وہ عبادت گاہ کے اندر بھی داخل ہو سکتے تھے مگر میں ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرتا ہوں۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ تو اپنے نائب پجاری کے نام خط لکھ دے کہ وہ مندر میں موجود تمام پجاریوں اور دیوتاؤں کے ساتھ مل کر حاضر ہو جائے۔“

اس پر اسرار صورت حال کو برداشت کرتے کرتے راجہ کرشنا اور رائیوں کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔

خدمت نگار کے جاتے ہی سوامی بھیرول گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دو مسلح سپاہی تھے۔

بھیرول کو دیکھتے ہی راجہ کرشنا اور دو رائیاں اپنی اپنی نشستوں پر اس طرح اچھل کر کھڑے ہو گئے جیسے کسی زہریلے کیڑے نے ان کو کاٹ لیا ہو۔

”نواب بہادر! یہ کیسی تقریب ہے کہ ہر طرف مسلح فوجی ہی نظر آتے ہیں۔ نہ کوئی جشن ہے، نہ کوئی ہنگامہ۔“ سوامی بھیرول لڑکھاتی زبان میں بول رہا تھا۔

”ہنگامہ تو اب شروع ہو گا بہرہ پیچ!“ حیدر علی کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

بھیرول کانپ کر رہ گیا۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ راج محل کے بجائے کسی قید خانے میں آ پہنچا ہے۔

”اپنے جرائم کی پوری فہرست میرے سامنے پیش کر۔“ حیدر علی کی زبان سے الفاظ اس طرح ادا ہو رہے تھے جیسے کسی آتش فشاں کا لاوا ابل رہا ہو۔ ”مجھ پر حملہ کرنے والے سادھو کون تھے؟ اور مندر کے زیر زمین تہہ خانوں میں کس قسم کا کاروبار ہوتا ہے؟“

اس سے پہلے کہ سوامی بھیرول، حیدر علی کے سوال کا جواب دیتا، راجہ کرشنا انتہائی درشت لہجے میں بول اٹھا۔

”تو کون ہوتا ہے ہمارے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے والا؟“

”اپنے لہجے کو درست کیجئے مہاراج! کہیں میرے اندر کا حکمران بیدار نہ ہو جائے۔ پھر ماضی کے سارے حوالے اور رشتے خاک ہو جائیں گے۔“ حیدر علی نے انتہائی قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کے مذہب کا نہیں، میری رعایا کی عزت و آبرو کا مسئلہ ہے۔

اس پاکھنڈی کے پروردہ لیرے غریب کسانوں اور مزدوروں کی پیٹیاں اغوا کر رہے ہیں۔ اور ان سینٹا جیسی لڑکیوں کے مظلوم ماں باپ میرے نظام حکومت کو کوس رہے ہیں۔ آخر حیدر علی کب تک ہزاروں سسکیاں، آہیں، فریادیں اور بددعائیں اپنے نامہ اعمال میں جمع کرائے گا۔“

راجہ کرشنا کو چند لمحوں کے لئے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور انتہائی تند و تیز لہجے میں کہنے لگا۔ ”یہ سوامی جیسے مہاتما پر سنگین تہمت ہے۔ میں اسی وقت اپنی ہندو رعایا کے سامنے جاؤں گا اور پوری ریاست کو چیخ چیخ کر بتاؤں گا کہ پہلے اس غاصب نے میرے

اقتدار پر قبضہ کیا اور اب ہندو دھرم کو مٹا دینا چاہتا ہے۔“ راجہ کرشنا اس خوف سے بھیرول کی پُر زور وکالت کر رہا تھا کہ کہیں سوامی اُس کی وابستگیوں کی سیاہ داستانیں حیدر علی کے روبرو بیان نہ کر دے۔

”مہاراج! آپ ایک بھیڑیے کی حمایت ترک کر دیں ورنہ اس کے تیز دانت آپ کی

بھیرول نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو حیدر علی کی پُر جلال آواز گونجی۔

”اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دو۔“

سلح سپاہی آگے بڑھا اور اس نے اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔

بھیرول جانتا تھا کہ حیدر علی اپنا حکم واپس لینے کا عادی نہیں ہے۔ مجبوراً اس نے مندر کے نائب پجاری دھرم داس کے نام ایک مختصر سا خط لکھا جس کا مضمون حیدر علی کی خواہش کے مطابق تھا۔

اس کے بعد حیدر علی اس طویل و عریض کمرے میں چلا آیا جہاں وہ ہفتے میں ایک دن عوام کی شکایات سنا کرتا تھا۔ راجہ کرشنا، میسور کی رائیاں اور سوامی بھیرول بھی نواب حیدر علی کی قبر کے لئے مجبور تھے۔ وحشت زدہ چہروں، مڈھال جسموں اور لرزے قدموں کے ساتھ وہ پاؤں بھی اسی کمرے میں داخل ہو گئے جہاں حیدر علی بنے انہیں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد سپہ سالار میر علی رضا خان اور اس کے نائب شجاعت خان نے سوامی بھیرول کے سینکڑوں چیلوں کو زنجیروں میں جکڑ کر نواب حیدر علی کے سامنے حاضر کر دیا۔ سادھو نمائندوں کے ساتھ سینکڑوں نوخیز لڑکیاں بھی تھیں جنہیں جبراً دیودایاں بنا دیا گیا تھا۔ بھیرول کے چیلوں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اعتراف کر لیا کہ وہ سوامی بھیرول کے نام کے پابند تھے، اس لئے نواب بہادر پر حملہ آور ہوئے تھے۔

اور بھیرول نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ وہ راجہ کرشنا کا ذاتی ملازم ہے اور ان ہی حکم پر اس نے حیدر علی کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ راجہ کرشنا احتجاجاً پاگلوں کی طرح چیخا مگر حیدر علی نے اُسے ڈانٹ دیا۔ ”یہ میرے پیدا گواہ نہیں ہیں جو کسی عہدے یا انعام کی لالچ میں آپ پر تہمتیں تراش رہے ہیں۔“

”اور ان مظلوم و معصوم لڑکیوں کا مندر میں کیا کام ہے؟“ حیدر علی دوبارہ سوامی کے چیل سے مخاطب ہوا۔

”یہ مندر کی نہیں، دراصل مہاراج کرشنا کی دایاں ہیں۔“ بہت سے سادھو بیک بولے۔ ”جب مہاراج ان سے اکتا جاتے ہیں تو یہ دوسرے سرداروں کی سیوا کرتی ہیں۔“

”اب آپ کی پارسائی ثابت کرنے کے لئے اور کتنے گواہ پیش کروں؟“ ایک حیدر مڑ کر راجہ کرشنا سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے میں شدید حقارت پوشیدہ تھی۔ ”کیا ان گناہوں کے لئے آپ کا محل نا کافی تھا؟ ہوس پرستی کی یہ کون سی منزل تھی کہ عبادت گاہ کا تقدس بھی برباد کر ڈالا؟“

اپنی سیاہ کاریوں کے سینکڑوں گواہوں کو سامنے پا کر راجہ کرشنا کا سارا جاہ و جلال ختم ہوا تھا اور اب وہ کسی لعنت زدہ مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ حیدر علی نے میر علی رضا خان کو حکم دیا کہ ان تمام لٹیروں کو عمر بھر کے لئے حوالہ زندان کر دیا جائے۔

جائے۔ اپنے چیلوں کے ساتھ بھیرول بھی کمرے سے باہر جانے لگا تو حیدر علی نے چیخ کر کہا۔ ”وہ تیرے ماتحت ہیں، اس لئے دوسرے درجے کے مجرم ہیں۔ اور ایسے مجرموں کے لئے قید کی سزا زیادہ مناسب ہے۔“

”میں بھی دوسرے درجے کا مجرم ہوں، نواب بہادر!“ موت کے منہ میں کھڑے ہو کر بھی سوامی بھیرول جرب زبانی سے باز نہیں آیا تھا۔ ”مجرم اوّل تو مہاراج کرشنا ہیں۔ پھر میرے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں؟“

”نہیں بھیرول! تو بہت بڑا مجرم ہے۔“ حیدر علی نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں کہا اور اپنی نشست سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان دیودایوں کے قریب پہنچ گیا جو نیم برہنہ لباسوں میں سر جھکائے کھڑی کانپ رہی تھیں۔

والی میسور ان مظلوم لڑکیوں کو دیکھ کر پسینے میں نہا گیا تھا اور اُس کی نظریں مسلسل فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ ”میں اپنی بیٹیوں کو اس حالت میں کس طرح دیکھوں؟“ حیدر علی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے کسی شیر کی طرح دھاڑا۔ ”کیا حکومت میسور کے پاس چار گز کپڑا نہیں جو میری بیٹیوں کے جسم ڈھانپ دے؟“

حیدر علی کی آواز سے پورے محل میں زلزلہ سا آگیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی اس طویل و عریض کمرے میں خوب صورت چادروں کے انبار لگ گئے۔ حیدر علی نے خود اپنے ہاتھوں سے ایک ایک دیوداسی کے جسم پر چادر ڈالی۔ پھر انتہائی رقت آمیز لہجے میں ان مظلوم لڑکیوں سے مخاطب ہوا۔

”اب بتاؤ میری بیٹیو! کہ تم پر کیا گزری؟ تم کون ہو اور تمہیں اس حال تک کس نے پہنچایا؟“

اس پرسش حال پر تمام دیودایاں سسک سسک کر رونے لگیں۔ کبھی وہ راجہ کرشنا کی طرف دیکھتیں اور کبھی سوامی بھیرول کی طرف۔ ان کی آنکھوں میں خوف و دہشت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

”بولو کہ میں نے تمہاری زبانوں پر لگے ہوئے پیرے ہٹا دیئے ہیں۔“ حیدر علی کسی شفیق باپ کی طرح دیودایوں کو تسلیاں دے رہا تھا۔ ”بولو کہ تمہارے ہونٹ آزاد ہو چکے ہیں۔ آج یوم حساب ہے۔ کہہ ڈالو جو کچھ تمہیں کہنا ہے۔ آج تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔ مت ڈرو کہ میں تمہارا محافظ ہوں۔ آسمان سے اُترا ہوا دیوتا نہیں، اسی زمین سے پیدا ہونے والا انسان ہوں جسے تمہاری مدد کے لئے بھیجا گیا ہے۔“

پھر دیودایوں نے اس طرح اپنی داستانِ الم سنائی کہ حیدر علی کی آنکھیں ہی نہیں، اس کا پورا سید بھی آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ سپہ سالار میر علی رضا خان کے ساتھ کمرے میں موجود تمام

میں اسے تہارے سامنے پیش کر دیتا۔“ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو بائیں ہاتھ پر اپنے باپ کے قریب ہی کھڑا تھا۔ ”مجھے مفعدوں اور شریکوں سے سخت نفرت ہے۔ میں ریاست میسور کو تہارے لئے عزت و آبرو کا مسکن اور امن و خوش حالی کا گہوارہ بنانا چاہتا ہوں۔ اس کام میں میری مدد کرو۔“

”ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“ ہزاروں ہندو دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔ حیدر علی کی تقریر کے بعد سوامی بھیرول کو مجمع عام میں قتل کر دیا گیا۔ پھر جب اس کا خون میں نہایا ہوا جسم ساکت ہو گیا تو حیدر علی نے بلند آواز میں ہجوم کو مخاطب کر کے کہا۔ ”یاد رکھنا کہ میرے دور حکومت میں ہر پاکھنڈی کا یہی انجام ہوگا۔“



حیدر علی کے ہر کارے گاؤں گاؤں گھوم کر ان گم شدہ لڑکیوں کے بارے میں اعلان کر رہے تھے، جنہیں اغوا کر کے دیوداسیاں بنا دیا گیا تھا۔ آخر کئی ماہ کی طویل جستجو کے بعد دیوداسیوں کے ماں باپ کا پتہ چلا۔ پھر ان سب کو راج محل میں لایا گیا۔ اس دوران تمام لڑکیاں نواب حیدر علی کی مہمان تھیں اور ان سے راج کماریوں جیسا سلوک کیا جا رہا تھا۔

والی میسور نے ایک بار پھر رام لیلا میدان میں جلسہ عام منعقد کیا اور ہزاروں ہندوؤں کی موجودگی میں تمام مظلوم لڑکیوں کو ان کے ماں باپ کے سپرد کر دیا۔ سوامی بھیرول اور اس کے جیلوں کی جمع کی ہوئی دولت جو مندر کے تہہ خانوں سے برآمد کی گئی تھی، اسے دیوداسیوں میں بارے سے تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی حیدر علی نے اعلان کیا کہ ان لڑکیوں کی شادی کے بارے اخراجات حکومت میسور ادا کرے گی۔ ستم رسیدہ لڑکیوں اور ان کے باپوں کے نام رکاری دفتر میں پہلے ہی درج کر لئے گئے تھے۔ متاثرہ مزدوروں اور کسانوں کی تالیفِ قلب کے لئے حیدر علی نے ریاست کے خزانے سے بھی ایک بڑی رقم بطور انعام دی تھی۔

انصاف اور رحم دلی کا یہ اعلیٰ مظاہرہ دیکھ کر غریب ہندو طبقے کے جذبات بے قابو ہو گئے تھے اور ہزاروں غیر مسلم بڑے والہانہ انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔

”نواب دیوتا کی بے ہو۔“

جب نعروں کا شور ختم ہو گیا تو نواب حیدر علی کی طرف سے مندر کے نئے پجاری کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایک چالیس سالہ برہمن پنڈت موہن داس تھا۔

حیدر علی نے دو ماہ کی تحقیق و جستجو کے بعد موہن داس کا انتخاب کیا تھا۔ موہن داس ایک انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ سرنگاپٹم کے باشندے اس کے علم و فضل اور بلند کرداری کے دل سے قائل تھے۔ موہن داس اتنا غیر متد تھا کہ اس نے ہندو دھرم کے نام پر کبھی کوئی نذر قبول نہیں کی تھی۔ وہ چند سرمایہ دار ہندوؤں کے بچوں کو تعلیم دے کر گزراوقات کیا کرتا تھا۔ اسی سال کی عمر میں موہن داس نے ایک غریب برہمن لڑکی سے شادی کی جو پہلی

سپاہی بھی ان معصوم لڑکیوں کی بربادی کے مریضے سن کر زار و قطار رونے لگے۔

”اے دیوتا! تجھے کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزری۔“ دیوداسیاں ہچکیوں اور آنسوؤں کی لہر پر اپنی تباہی کے نوے سنار ہی تھیں۔ ”قوم کے باپ نے ہمارے سروں سے اوڑھنیاں اُتار دیں، کپڑے تار تار کر دیئے اور ہماری آبرو کا خون کر ڈالا۔ اُن داتا نے ہماری عزت کے کھلیاؤں میں آگ لگا دی۔ گھر لوٹ لئے گئے، کھڑی فصلیں برباد ہو گئیں۔ ایسا سوکھا پڑا کہ زمین کی کوکھ تک جل گئی۔ تو بہت دیر سے آیا دیوتا!..... بہت دیر سے آیا۔“ کئی دیوداسیاں حیدر علی کے قدموں سے لپٹی رو رہی تھیں۔ ”اب ہم جینا نہیں چاہتے۔ اپنے ہاتھ سے قتل کر کے ہمیں اس پانی جیون سے کتنی دیدے۔ تو ہی ہماری ٹوٹی ہوئی تینا کا کھيون ہار ہے۔ ہم پر دیا کر دیوتا!..... دیا کر۔“

”تم زندہ رہو گی۔“ حیدر علی نے ایک دیوداسی کو اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا۔

”تمہیں اپنے اس باپ کی خوشی کے لئے زندہ رہنا ہوگا۔“

پھر والی میسور تیزی سے پلٹا اور راجہ کرشنا کے قریب پہنچ کر بہت سخت لہجے میں بولا۔ ”میں اپنی ذات کے حوالے سے آپ کے تمام جرائم معاف کر چکا ہوں مگر اپنی قوم کی ان بیٹیوں کا مقدمہ کس عدالت میں لے جاؤں اور کس سے انصاف طلب کروں؟“

راجہ کرشنا نے اپنی دستار اُتار کر حیدر علی کے قدموں پر رکھ دی۔ ”مجھے میری قوم کے سامنے زسوانہ کرنا۔“ راجہ کرشنا، والی میسور سے بھیک مانگ رہا تھا۔ ”یہ مجھ پر تیرا آخری احسان ہوگا۔“



دوسرے دن حیدر علی نے ہندو عمامدین شہر کوکل میں طلب کر کے انہیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ پھر بھی اُس نے راجہ کرشنا کے جرائم کی پردہ پوشی کی تھی اور مذہب کی آڑ میں ان لرزہ خیز مظالم کا ذمے دار سوامی بھیرول اور اس کے جیلوں کو ٹھہرایا تھا۔ سرنگاپٹم کے معزز ہندوؤں نے جن میں برہمن اور راجپوت بھی شامل تھے، اتفاق رائے کے ساتھ حیدر علی سے کہہ دیا۔

”آپ بھیرول اور اس کے جیلوں کو کڑی سے کڑی سزا دیں اور اپنی مرضی سے مندر کے نئے پجاری کا انتخاب کریں۔ ہمیں آپ پر اعتبار ہے۔“

حیدر علی نے ہندو قوم کے سرداروں کو اعتماد میں لے کر ”رام لیلا“ میدان میں ایک جلہ عام منعقد کیا اور پھر بڑے اثر انگیز لہجے میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”میں اعلیٰ ظرفی اور رواداری کا سفیر ہوں، اس لئے تنگ نظری اور تعصب سے بلند ہوں۔ کسی مجرم کو اس لئے معاف نہیں کیا جائے گا کہ وہ مسلمان ہے۔ اور کسی مظلوم کو اس لئے انصاف سے محروم نہیں رکھا جائے گا کہ وہ ہندو ہے۔ اگر بھیرول کی جگہ میرا بیٹا بیٹھتا تو



اسی طرح دو سال گزر گئے۔ اب سریتا دیوی تیرہ سال کی ایک باشعور لڑکی تھی، جسے دیوی دیوتاؤں کے بے حجاب مجسموں نے وقت سے پہلے جوان کر دیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ ٹیپو سلطان کے عشق میں گرفتار ہوتی جا رہی تھی۔

حیدر علی نے سریتا کی نگاہوں کا بدلا ہوا زاویہ دیکھا تو چونک اٹھا۔ والی میسور کو یوں لگا جیسے قلعے کی مضبوط دیواریں کانپ رہی ہیں اور خوف ناک آندھی میں اس کے تخت و تاج اڑے جا رہے ہیں۔

حیدر علی نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فاطمہ بیگم کو تمام صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا: ”مجھے اس خوب صورت لڑکی کے ارادے بہت خطرناک نظر آتے ہیں۔“

”میں نے تو کبھی ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔“ ٹیپو سلطان کی والدہ فاطمہ بیگم نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”مجھے آپ کی اس بے خبری پر تعجب ہے اور افسوس بھی۔“ حیدر علی کی آواز سے ہلکی سی تلخی نمایاں تھی۔ ”آپ دن بھر محل میں رہتی ہیں مگر کبھی سریتا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ٹیپو کو کیسی عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔“

”میں سریتا کے اس عمل کو بچپن کی رفاقت اور انسیت سے زیادہ کوئی دوسرا نام دینے کے لئے تیار نہیں۔“ فاطمہ بیگم، پنڈت موہن داس کی بیٹی کی پر زور وکالت کر رہی تھیں۔ ”وہ بہن بھائیوں کی محبت کو ترسی ہوئی ایک غم زدہ لڑکی ہے۔ اور سریتا کی یہی محرومی اسے ٹیپو کے قریب لے آئی ہے۔“

”اب ہمیں اس کی بے تکلفانہ آمد و رفت پر پابندی عائد کرنی ہوگی۔“ حیدر علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”نواب بہادر! یہ آپ فرما رہے ہیں؟“ فاطمہ بیگم کے لہجے سے شدید حیرت نمایاں تھی۔ ”پنڈت موہن داس آپ ہی کے اصرار پر اپنی بیٹی اور ماں کو اپنے محل میں چھوڑ گیا تھا۔ اب آپ اس سے کس طرح کہیں گے کہ وہ سریتا کو یہاں سے کہیں اور لے جائے۔ موہن داس ایک غیر متدبیر شخص ہے وہ یقیناً اپنی بیٹی کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دے گا۔ مگر والی میسور کے اس فیصلے کا سبب ضرور پوچھئے گا۔ پھر کیا آپ اسے یہ بتائیں گے کہ سریتا، ٹیپو سے محبت کرنے لگی ہے اور اس کا بے پناہ حسن، ولی عہد سلطنت کے لئے خطرناک صورت حال پیدا کر رہا ہے۔ یہ تو اس شخص کی بڑی تحقیر ہوگی، جس نے آپ پر اعتبار کر کے پجاری کا منصب قبول کیا اور پھر آپ کو اپنی عزت و ناموس کا نگہبان ٹھہرایا۔“

فاطمہ بیگم کے سوالات بڑے عجیب تھے۔ حیدر علی سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن سکا تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بہت دیر بعد آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔

”کچھ کچھ ہو، ہمیں بہر حال اس طوفان کی موجودگی کو محسوس کرنا ہوگا۔ ابھی زیر آب مچلنے

پجی کی پیدائش کے فوراً بعد مر گئی۔ اب اس کی یادگار دس گیارہ سالہ ایک حسین و جمیل لڑکی سریتا دیوی تھی جو اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ پنڈت موہن داس نے سریتا دیوی کو اتنی کم سنی میں اس قدر علوم سکھا دیئے تھے کہ وہ اپنی ذہانت اور گفتگو کے اعتبار سے بیس پچیس سالہ دو شیزہ نظر آتی تھی۔ جب حیدر علی نے پنڈت موہن داس سے بڑے پجاری کا منصب قبول کرنے کے لئے کہا تو اس نے اپنی بیٹی اور بوڑھی ماں کی تنہائی کا عذر پیش کیا۔

”راج محل کا ایک حصہ برہمنوں اور پجاریوں کے لئے وقف ہے۔“ حیدر علی نے موہن داس کی اس مجبوری کا حل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ماں اور پجی وہاں تنہائی محسوس نہیں کریں گے۔ پھر میں اور میرے اہل خانہ بھی تو محل میں موجود ہیں۔“

”آخر آپ میرے لئے اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں نواب بہادر!“ پنڈت موہن داس مسلسل اپنا دامن پجارہا تھا۔ ”سرنگاپٹم میں تو سینکڑوں خاندان برہمن موجود ہیں۔“

”مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے موہن داس! میں ریاست کی تعمیر کر رہا ہوں اور تم بھی تعمیری نظریات رکھتے ہو۔“ حیدر علی نے موہن داس کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

جب موہن داس نہیں مانا تو حیدر علی نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نہیں آؤ گے تو پھر کوئی دوسرا سوا می بھیرول آجائے گا۔ پھر کچھ لیرے گیر والباس پہن کر مندروں میں پناہ ڈھونڈیں گے۔ پھر قوم کی بیٹیوں کو دیوداسی بنا کر ہوس کی بھینٹ چڑھایا جائے گا۔“

آخر موہن داس نے سر جھکا دیا۔ پھر خود سری رنگ ناتھ کے مندر میں چلا گیا اور اپنی بیٹی سریتا اور بوڑھی ماں کو راج محل بھیج دیا۔

حیدر علی اور اس کے اہل خانہ، سریتا دیوی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس محبت کے نتیجے میں سریتا دیوی بھی خود کو نواب خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگی تھی۔ اسے ٹیپو سلطان بہت پسند تھا۔ وہ ٹیپو کو پیار سے ”کنور“ کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ ٹیپو فطرتاً شرمیلا لڑکا تھا، اس لئے سریتا دیوی سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

سریتا صبح سویرے پوجا پاٹھ کے لئے مندر چلی جاتی۔ کئی گھنٹے تک اپنے باپ موہن داس سے مذہب، نجوم اور دست شناسی کی تعلیم حاصل کرتی اور پھر واپس آ کر ٹیپو کا انتظار کرنے لگتی۔ مگر ٹیپو کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ سریتا کی طرف پلٹ کر دیکھتا۔ حیدر علی نے اس کا نظام الاوقات اس طرح مقرر کیا تھا کہ پہلے وہ سید صاحب سے درس لیتا، پھر فوجی چھاؤنی پہنچ کر جنگی تربیت حاصل کرتا اور شام کے وقت محل واپس آتا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر مطالعے میں مصروف رہتا۔ اس دوران اگر سریتا تنہائی میں محفل ہوتی تو وہ چند باتیں کرنے کے بعد اپنے کمرے سے رخصت کر دیتا۔ سریتا کبھی کبھی چہرے اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے مکان کی طرف واپس چلی جاتی۔

”بابا! وہ ستاروں کا علم جانتی ہے۔“ ٹیپو سلطان ہر چیز سے بے نیاز اس لڑکی کی باتیں کر رہا تھا جسے حیدر علی نے ایک خوفناک طوفان سے تشبیہ دی تھی۔ ”اسے یہ علم اس کے باپ نے سکھایا ہے۔ سرتانے کئی بار میرا ہاتھ دیکھ کر مجھے بھی بتایا تھا کہ میں اپنے دشمنوں سے ہوشیار رہوں۔“ حیدر علی، ٹیپو کی باتیں سن کر سنائے میں آ گیا۔

”وہ لڑکی تمہیں گمراہ کر رہی ہے فرزند!“ یکا یک حیدر علی کی آواز بلند ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر ہلکے ہلکے غصے کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ ”تم مسلمان ہو اور تمہارے مذہب میں ایسے علوم کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ ستاروں کی چالیں اور ہاتھ کی لکیریں تمہیں تمہارے مستقبل کی کیا خبر دیں گی؟“

ٹیپو حیرت و پریشانی کے عالم میں باپ کے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ سرتانہ ایک ہندو لڑکی ہے؟“ حیدر علی نے اسی تند و تیز لہجے میں ٹیپو سلطان سے سوال کیا۔

”کسی کے ہندو ہونے سے کیا ہوتا ہے بابا محترم!“ ٹیپو سلطان نے بڑی جرأت کے ساتھ جواب دیا۔ ”ہمارے محل میں، شہر میں، ریاست میں، فوج میں بے شمار ہندو ہیں۔“

ٹیپو کی ذہانت اور حاضر جوابی دیکھ کر حیدر علی کے سینے میں ناقابل بیان خوشی کی تیز لہر اٹھی مگر وہ بے قابو نہیں ہوا اور اس نے اسی طرح سخت لہجے میں کہا۔

”مجھے کسی کے ہندو ہونے پر اعتراض نہیں ہے۔ ہندو بھی میری رعایا ہیں اور میں مسلمانوں کی طرح ان کی بھی خبر گیری کرتا ہوں۔ مگر مجھے یہ پسند نہیں کہ تمہارا معصوم ذہن کسی ”سرسے مذہب“ کے اثرات قبول کرے۔ سرتانہ ایک برہمن زادی ہے جسے خود میں نے ہی اس محل میں پناہ دی ہے۔ بچپن کی بات اور تھی مگر اب میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ وہ ہر وقت تمہارے قریب رہے۔“

ٹیپو سلطان نے پوری سعادت مندی کے ساتھ باپ کا حکم سنا مگر وہ سرتانہ کی قربت میں بڑھتا ہوا خطرہ کا ادراک نہ کر سکا۔

”میرے محبوب بیٹے!“ جوش جذبات میں حیدر علی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹیپو کے قریب پہنچ کر بڑی شفقت سے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ بڑے بڑے مردان شجاع کو عورتوں کی قربت نے تباہ کر دیا ہے۔ تم لاکھ سچے سبھی لیکن میرا یہ حکم بھنبر (پنجرہ) کی آست میں ہو، جس کی حیا اور پاکیزگی پر قیامت تک سارا عالم گواہی دیتا رہے گا۔ تم نسبی اعتبار سے ایک سپاہی زادے ہو۔ گردش وقت کے زیر اثر تمہارا باپ کتاب کو نہ چھو سکا اور ان پڑھ رہ گیا۔ اب میں تمہیں علم کی قاپہنا کر اپنی جہالت کا داغ مٹانا چاہتا ہوں۔ اس لئے کتاب تمہاری عروں ہے اور تلوار تمہاری محبوب۔ اس کے سوا کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔“ یہ

والی موجوں نے شدت اختیار نہیں کی۔ اگر یہ موجیں سمندر کی سطح پر ابھر آئیں تو بڑی تباہی ہو گی۔ جس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔“

سادہ لوح فاطمہ بیگم ایک بار پھر حیرت زدہ نظروں سے حیدر علی کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ اب بھی شوہر کی اس بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھیں کہ ایک معصوم دوشیزہ کس طرح ان کے بیٹے کی زندگی میں طوفان اٹھا سکتی ہے۔

”آپ فی الوقت سرتانہ کو ٹیپو سے دور رکھنے کی کوشش کیجئے۔“ والی میسور نے اپنی شریک حیات کو پہلی احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”مسلل نگرانی کرتی رہیں کہ وہ لڑکی تنہائی میں ولی عہد سلطنت کے قریب نہ ہونے پائے۔“

فاطمہ بیگم خاموش بیٹھی رہیں۔ بظاہر انہوں نے شوہر کے حکم کے آگے سر جھکا دیا تھا مگر دل سے اس لڑکی پر شبہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھیں جسے وہ اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگی تھیں۔



حیدر علی نے متوقع طوفان کو روکنے کے لئے صرف اسی ایک تدبیر پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ والی میسور نے دوسرے دن ہی ٹیپو سلطان کو فوجی چھاؤنی کے مخصوص کمرے میں طلب کر لیا۔

”جان پدر! اب تم بارہ سال کے ہو گئے ہو۔“ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو اس کے سامنے بادب کھڑا تھا۔ ”کیا تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے؟“ والی میسور کی آواز سے کسی قدر سختی جھلک رہی تھی۔

ٹیپو سلطان، باپ کا بدلا ہوا لہجہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”بابا محترم! کیا میں کسی نا فرمانی کا مرتکب ہوا ہوں؟“

”نہیں فرزند!“ حیدر علی نے فوراً ہی اپنی آواز میں نرمی پیدا کر لی۔ ”میں تمہیں تمہارے قرائن یاد دلانا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر والی میسور کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا پھر محبت بھری نظروں سے ٹیپو سلطان کے دلکش اور معصوم چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت ٹیپو سر جھکائے کسی مجھے کی مانند ایسا تادہ تھا۔

”پنڈت موہن داس کی بیٹی سرتانہ کسی لڑکی ہے؟“ اچانک حیدر علی نے ٹیپو سے ایک عجیب سوال کر ڈالا تھا۔

ٹیپو نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا اور پھر بہت معصومانہ لہجے میں بولا۔ ”وہ بہت اچھی لڑکی ہے بابا! دن رات ہماری حکومت کی ترقی کے لئے دعائیں کرتی ہے۔“ ٹیپو سلطان ایک نازک ترین صورت حال سے بے خبر سرتانہ دیوی کی تعریفیں کر رہا تھا۔ ”وہ آپ کے بارے میں کہتی ہے کہ مہاراج بہت سی جنگیں لڑیں گے، پھر انہیں فتح حاصل ہوگی۔“

”وہ چار دن کی لڑکی یہ بات کس طرح کہتی ہے؟“ والی میسور نے حیران ہو کر کہا۔ ”کامیابی کسے کہتے ہیں اور جنگ کیا ہوتی ہے، اسے کیا معلوم؟“

کہتے کہتے حیدر علی کی آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی تھی۔

باپ کی یہ جذباتی حالت دیکھ کر ٹیپو سلطان بے قرار ہو گیا اور آگے بڑھ کر حیدر علی سے لپٹ گیا۔ ”ایسا ہی ہوگا بابا محترم!..... ایسا ہی ہوگا۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“

”اس طرح نہیں فرزند!“ حیدر علی نے ٹیپو کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

”پھر آپ کس طرح مطمئن ہوں گے؟“ ولی عہد سلطنت نے بعد احترام عرض کیا۔

والی میسور نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر عہد کرو کہ تم کبھی شراب پیو گے، رقص و سرور اور بازی میں دلچسپی نہیں لو گے، محل کی کینز، کسی عورت خصوصاً چنڈت موہن داس کی بیٹی سربیتا سے ام وراہ نہیں رکھو گے۔ اگر اتفاقاً اس لڑکی سے آمناسا مانا ہو جائے تو اس کی باتوں پر دھیان نہیں ملے گا۔“

ٹیپو نے کسی تردد کے بغیر حیدر علی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور من و عن الفاظ دہرائے جو کچھ دیر پہلے والی میسور کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

”اور اگر ایسا نہیں ہوا؟“ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”اگر میں اپنے عہد پر قائم نہ رہوں تو نواب بہادر کو اختیار ہے کہ میرے لئے جہیز چاہیں منتخب کریں۔“ ٹیپو سلطان کے لہجے میں سپاہیوں جیسی استقامت تھی۔

حیدر علی شدت جذبات سے متغلوب ہو کر جھکا اور اس نے ٹیپو سلطان کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ”مرحبا میرے وارث مرحبا! ایک باپ اپنے بیٹے سے یہی توقع رکھتا ہے۔ والی میسور سیدھا ہوا۔ ”زندگی کے سمندر میں اترنے سے پہلے ضروری ہے کہ موجوں کے قافلہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور تیراکی میں اتنی ریاضت کر لو کہ یہ بے رحم پانی آسانی کے ساتھ تمہارے جسم کو اپنی غذا نہ بنا سکے۔ میں تمہیں ایک سخت چٹان کی حیثیت سے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاخ گل کی طرح نہیں کہ ذرا سی ہوا چلی اور درخت سے جدا ہو گئی۔“

ٹیپو سلطان بہت غور سے باپ کی نصیحتیں سن رہا تھا۔

”جان پدر! اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں۔“ یہ کہتے کہتے حیدر علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”آج تم خدا کے فضل و کرم سے بارہ سال کے ہو گئے ہو۔ تمہیں کیا خبر کہ اس طویل عرصے میں تمہارے باپ نے مالک دو جہاں کے سامنے کتنی بار دامن پھیلا یا ہے اور نصف کے سناٹے میں کتنے آنسو بہائے ہیں۔ سنو میرے بیٹے! غور سے سنو!..... آج تک میں تمہارے حوالے سے بس ایک ہی دعا مانگی ہے کہ اے قادر مطلق! میرے بچوں کو داغ بلی نہ دینا اور انہیں میری زندگی ہی میں جوانی کی منزل تک پہنچا دینا اور انہیں ان عذابوں سے رکھنا جن سے تیرا یہ گناہگار بندہ حیدر علی گزرا ہے۔ میرے محبوب فرزند! تجھے کیا خبر کہ تیرا غیرت مند اور شجاع دادا، شیخ فتح محمد کو ایٹانے عہد کے جرم میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اور اس وقت

تیرے باپ کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ میں تجھے کس طرح بتاؤں کہ اس کے بعد کیسی آندھیاں چلیں اور کیسے طوفان آئے۔ تیرے باپ کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا۔ خدا تجھے وہ وقت نہ دکھائے کہ تو بھیڑیوں کے زرخے میں تنہا رہ جائے۔ اس لئے میرے بیٹے! خدا کے بعد اپنی شمشیر پر بھروسہ کر۔ جو ہاتھ اس کا بوجھ نہیں اٹھاتے، وہ زمین پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ اور زمین اپنے بوجھ کو زیادہ دن برداشت نہیں کرتی۔“

حیدر علی نے اپنے دوریشی اور زندگی کے دوسرے حادثات کا ذکر اس قدر اثر انگیز لہجے میں کیا تھا کہ ٹیپو سلطان بھی رونے لگا۔

”بابا محترم! میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے کان بند کر لئے ہیں۔ آپ کے سوا کسی کی آواز نہیں سنوں گا۔“

حیدر علی نے لوہے کو کھینچنے دیکھا تو ایک اور ضرب لگائی۔

”تم تو سید صاحب کے شیر ہو فرزند!..... اور شیر کو غزالوں کی صحبت زیب نہیں دیتی۔ اپنے جاہ و جلال کی حفاظت کرو۔ ورنہ گیدڑوں کے یہ غول تمہیں تماشا بنا کر رکھ دیں گے۔“

اس کے بعد حیدر علی نے فوجی چھاؤنی میں ٹیپو کی مستقل رہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ ولی عہد سلطنت کی تمام کتابیں اس طویل و عریض کمرے میں منتقل کر دی گئی تھیں جہاں سونے کے لئے پتھر کا تخت فرش تھا اور دیکھنے کے لئے مختلف آلات حرب و ضرب تھے، جنہیں جاہ جادویاروں پر آویزاں کر دیا گیا تھا۔ ٹیپو علی الصباح بیدار ہوتا، فجر کی نماز ادا کرتا اور سید صاحب کی درس گاہ چلا جاتا۔ دوپہر کے قریب فوجی چھاؤنی واپس آتا، کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتا، پھر نماز ظہر کے بعد مغرب تک جنگی مشقوں میں مصروف رہتا۔ رات گئے تک نامور مسلمان سپہ سالاروں کے حالات زندگی اور جنگی منصوبوں کا مطالعہ کرتا، پھر تھک کر اسی فرش پر سو جاتا۔ حیدر علی نے ٹیپو کی پشت کے نیچے سے ریشمی بستر کھینچ لیا تھا اور اب ولی عہد سلطنت ایک جھانکشی سپاہی کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ کبھی کبھی والی میسور نصف شب کے قریب اچانک فوجی چھاؤنی پہنچ کر ٹیپو کو پتھر کے فرش پر سوتے ہوئے دیکھتا اور اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھر آتی۔ پھر دبے قدموں چلتا ہوا بیٹے کے قریب پہنچتا اور جھک کر ٹیپو کی پیشانی کا بوسہ لیتا۔

رخصت ہوتے وقت بڑی رازداری کے ساتھ شجاعت خان سے پوچھتا۔ ”ٹیپو نے اس تبدیلی کو جبراً قبول کیا ہے یا خوشی سے؟“

”میں نے اپنی زندگی میں کسی دوسرے بیٹے کو شہزادے سے زیادہ سعادت مند نہیں پایا۔“ شجاعت خان کی آواز پر جذبات کا غلبہ ہوتا اور چہرے سے عجیب سی خوشی جھلک رہی ہوتی۔

”تو مجھے خوش کرنے کے لئے ٹیپو کی کسی کمزوری کو چھپا تو نہیں رہا ہے شجاعت خان!“ حیدر علی اپنے نائب سپہ سالار سے سخت لہجے میں مخاطب ہوتا۔

”سرکار خوب جانتے ہیں کہ اس زبان کو کبھی جھوٹ سے نسبت نہیں رہی۔“ شجاعت خان

”آپ نے صرف اپنے ایک شک اور وہم کی بنیاد پر ٹیپو کو مجھ سے جدا کر دیا۔“ فاطمہ بیگم نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں شوہر کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ کچھ بھی سمجھیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اب ٹیپو کے لوریاں سننے کے دن نہیں رہے۔“  
 حیدر علی کا لہجہ جذبات سے نیکر عاری تھا۔ ”میں نے وقت سے پہلے اس کے دل و دماغ پر جنگی فضا مسلط کر دی ہے کہ جلد یا بدیر اسے دشمن کے مقابل صف آرا ہوتا ہے۔ براہ کرم ٹیپو کے سر سے اپنی جذباتی محبت کا آئجل ہٹا لیجئے اور اسے فولادی خود پہننے دیجئے۔ ورنہ وہ مڑ مڑ کر آپ کی طرف دیکھتا رہے گا اور دشمن اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ آپ اسے صرف اپنی دعائیں دیجئے اور دعاؤں کی قبولیت کے لئے محل کے کسی آراستہ کمرے کی ضرورت نہیں۔ وہ عازہ جنگ پر بھی سنی جاسکتی ہیں۔“

فاطمہ بیگم، شوہر کی دلیلوں کے سامنے لاجواب ہو کر رہ گئیں۔ مگر ان کے چہرے پر گہری اندر دگی چھائی ہوئی تھی۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے دل سے شوہر کے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

حیدر علی سے فاطمہ بیگم کے دلی تاثرات پوشیدہ نہ رہ سکے اور اس نے ایک بے قرار ماں کی تالیفِ قلب کے لئے لہجہ بدل کر کہا۔ ”محل سے فوجی چھاؤنی اتنی دور بھی نہیں۔ آپ جب چاہیں، اپنے بیٹے سے ملاقات کر سکتی ہیں۔“

”اب میں اتنی کمزور بھی نہیں کہ فوجی چھاؤنی تک کھینچی چلی جاؤں اور بیٹے کی محبت میں شوہر کے فیصلے کا احترام نہ کر سکوں۔“ یہ کہہ کر فاطمہ بیگم کھڑی ہو گئیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی حیدر علی کے کمرے سے نکل گئیں۔

رخصت ہوتے وقت والی میسور نے بہت غور سے شریکِ حیات کے چہرے کو دیکھا۔ اب وہاں اذیت و کرب کے بجائے گہرا ٹھہراؤ تھا جیسے سمندر مد و جزر کے فطری عمل سے گزر کر خاموش ہو گیا ہو۔

فاطمہ بیگم نے تو بیٹے کی جدائی میں اپنے اندر کے طوفان کو چھپا لیا تھا مگر سریتا دیوی ایک سنے طوفان کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ وہ نوخیز دوشیزہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ سارا سارا دن ٹیپو کا انتظار کرتی اور جب رات کا ایک پہر بیت جاتا تو تھکے تھکے قدموں سے اپنے مکان کی طرف چلی جاتی۔

آخر جب کئی دن گزر گئے تو وہ ایک روز فاطمہ بیگم سے پوچھ ہی بیٹھی۔ ”راج مانا! کنور کہاں چلے گئے؟“

فاطمہ بیگم نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

”بھئی! مہاراج نے ٹیپو کو جنگی تربیت کے لئے فوجی چھاؤنی بھیج دیا ہے۔“ فاطمہ بیگم، کمرے سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ خود ان کے کوئی لڑکی نہیں تھی، اس لئے وہ سریتا کو بھی اپنی

بے جھجک ہو کر جواب دیتا۔ ”جو کہہ دیا، سو کہہ دیا۔“

”مجھے خبر ہے۔ مگر پھر بھی تیری محبت کے انداز سے ڈرتا رہتا ہوں۔“ ایک بیک حیدر علی کی آواز مدہم ہو جاتی۔ ”ٹو ٹیپو کو بچانے کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔“

حیدر علی نے شجاعت خان کی جس محبت کا حوالہ دیا تھا، وہ ایک مثالی محبت تھی۔ شجاعت خان نے بس زینت جہاں سے عشق کیا تھا اور جب زینت جہاں، بوڑھے امراؤ خان کی دہلیز بن کر چلی گئی تو شجاعت خان نے اس آگ کو سینے کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔ مگر وہ آگ سلگتی ہی رہتی تھی۔ پھر ٹیپو پیدا ہوا تو محبت کا شعلہ دوبارہ بھڑکا مگر اس بار عشق کا انداز مختلف تھا۔ شجاعت خان نے اپنی زندگی ٹیپو کے لئے وقف کر دی تھی۔ اگر ٹیپو اس سے نذرانہ جان طلب کرتا تو شجاعت خان ہنستے ہنستے اپنے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ دیتا۔

بے شمار مواقع آئے جب اس کی طرف خوب صورت عورتیں متوجہ ہوئیں۔ بڑے بڑے گھرانے کے لوگوں نے اس سے اپنی لڑکیوں کا رشتہ کرنا چاہا مگر شجاعت خان نے اس قسم کی باتوں کو کبھی لائق التفات نہیں سمجھا۔ خود حیدر علی نے کئی بار اس پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”شجاعت خان! مجھ سے تیری ویران زندگی اور سونا گھر نہیں دیکھا جاتا۔“

شجاعت خان پوری توانائی کے ساتھ مسکراتے لگتا۔ ”سرکار! میری زندگی ویران کہاں ہے؟ وہ ہر وقت تو میرے ساتھ رہتی ہے اور آپ اس گھر کو ویران کہتے ہیں جہاں دن رات یادوں کا جشن برپا رہتا ہے۔“

حیدر علی جانتا تھا کہ شجاعت خان نے ہونٹوں پر قسم سجا لیا ہے مگر اس کے دل کے زخم رستے ہی رہتے ہیں۔

”ٹو شادی کر لے شجاعت خان!..... میں تیرے گھر کو آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں سرکار!..... ایسا حکم نہ دیجئے جس پر مجھ سے عمل نہ ہو سکے۔“ یہ ایک شجاعت خان سنجیدہ ہو جاتا۔ ”میں نے سر آپ کے نام کر دیا ہے مگر دل کسی اور کی ملکیت ہے اور مجھ سے یہ بددیناقتی نہیں ہوگی۔“

اس رات فوجی چھاؤنی میں بھی حیدر علی نے شجاعت خان کی اسی محبت کے حوالے سے ٹیپو کا ذکر پھیرا تھا۔

”ہاں سرکار! مجھے شہزادے سے عشق تو ہے اور میں ان پر جان بھی دے سکتا ہوں۔“ شجاعت خان نے انتہائی بڑبوش لہجے میں کہا۔ ”مگر میرا عشق تخریب کار نہیں ہے۔ میں شہزادے کو بگڑنے نہیں دوں گا۔ خاتمِ بدین! اگر وہ بگڑے تو شجاعت خان یہاں نہیں ہوگا۔“

حیدر علی مطمئن ہو کر محل میں واپس چلا گیا۔ مگر فاطمہ بیگم، والی میسور کے اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھیں۔ حیدر علی نے ٹیپو پر یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ ولی عہدِ سلطنت صرف جمعہ کے روز محل آتا اور رات اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزار کر دوسرے دن واپس چلا جاتا۔



بٹی کی طرح سمجھتی تھیں۔

”بہت سے فوجی ہیں مگر کوئی سپاہی اس طرح تو اپنے گھر سے دور نہیں رہتا۔“ سریتا انتہائی ذہین اور حاضر جواب لڑکی تھی، اس لئے اس نے ایک معقول دلیل کا سہارا لیا تھا۔  
”دوسرے فوجیوں کے کیا معمولات ہیں، مجھے نہیں معلوم۔ مگر ٹیپو ایک ایسا سپاہی ضرور ہے جو اپنے گھر کے بجائے فوجی چھاؤنی میں رہتا ہے۔“ فاطمہ بیگم کے لہجے میں بڑی خلش تھی۔  
پھر جب ٹیپو پہلی بار جمعہ کے روز راج محل آیا تو سریتا کی خوش ناقابل بیان تھی۔ ”دوسرے لوگوں کی پروا کئے بغیر دیوانہ وار دوڑتی ہوئی ٹیپو کے پاس پہنچی اور بڑے بے تکلفانہ انداز میں بولی۔

”کنورا! تم آگے؟ اب تو واپس نہیں جاؤ گے؟..... یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہر وقت گھوڑے اور تلواریں..... تو پیس، ہندو قیس، تیر، نیزے اور کمانیں۔“ سریتا بے ٹھکان بولے جا رہی تھی۔  
”یہی تو زندگی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“ ٹیپو اپنے باپ حیدر علی کے لہجے میں بولتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ولی عہد سلطنت کا انداز اجنبیوں جیسا تھا۔  
سریتا کے دل پر چوٹ سی لگی اور وہ کسی مجتہد کے مانند کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔  
پھر رات کو موقع ملے ہی سریتا دیوی، ٹیپو کے کمرے میں داخل ہو گئی جہاں ولی عہد سلطنت کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔

”کنورا! تم اتنے دن سے کہاں تھے؟“ سریتا بے تکلفی کے ساتھ ٹیپو کے سامنے بیٹھ گئی۔  
”اب تو نہیں جاؤ گے؟“ سریتا کے لہجے سے معصوم محبت کی پہلی پھوار برس رہی تھی اور آنکھوں میں ان جذباتوں کے چراغ روشن تھے، جنہیں ٹیپو کی یادوں کے سوا کسی دوسرے مرد کے تصور نے چھوا تک نہیں تھا۔

”میں بس ایک رات کا مسافر ہوں سریتا!“ ٹیپو کا لہجہ بہت سرد اور بے نیازانہ تھا۔ ”کل صبح ہوتے ہی اپنی منزل کی طرف واپس چلا جاؤں گا۔“

”کیا اتنے دنوں تک تمہیں میری یاد بھی نہیں آئی؟“ سریتا کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔  
”تم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تمہارے انتظار میں مجھ پر کیا گزری؟“ ٹیپو کی چند روزہ جدائی نے سریتا کو بے قابو کر دیا تھا اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود اپنے دل کی بات چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ ”میرے تو دن رات ہی بدل گئے کنورا! نہ کتابوں میں دل لگتا ہے اور نہ پوجا میں۔“ جی بھی خفا خفا سے رہتے ہیں۔“

”اب مجھے کسی کی یاد نہیں آتی سریتا!“ ٹیپو سلطان کے لہجے میں وہی بے رخی تھی۔ ”بہت کام ہیں، بہت ذمہ داریاں ہیں۔ ان سے فرصت ملے تو کسی کو یاد کروں گا۔“  
”میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں کنورا!“ سریتا دیوی جھنجھلا کر بولی۔ ”کیا میں بھی تمہیں یاد نہیں آتی؟“

یہ سوال کر کے سریتا اُمید و نیم کی حالت میں ٹیپو کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے، آنکھوں میں عجیب عجیب سے رنگ ابھر کر ڈوب رہے تھے اور سانسیں رُک رُک سی محسوس ہو رہی تھیں۔ برہمن زادی کو یقین تھا کہ ولی عہد سلطنت اُس کی ذاتی حیثیت کو کسی بھی حالت میں نظر انداز نہیں کر سکتا مگر جب ٹیپو کے لیوں کو جنش ہوئی تو سریتا کی خوب صورت آنکھیں پتھر کر رہ گئیں اور اس کے دلکش چہرے پر خاک اُڑنے لگی۔

”مجھے تم بھی یاد نہیں آتیں سریتا!“ ٹیپو نے بڑی معصومیت اور بے باکی کے ساتھ جواب دیا۔ اُس کے لہجے میں کوئی تکلف یا بناوٹ نہیں تھی۔

”مگر میں تو تمہاری یادوں کے بغیر ایک سانس بھی نہیں لے سکتی۔“ آخر سریتا نے کھلے لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔

ایک تو ٹیپو کا لڑکپن، دوسرے فطرت کا خاص راجان اور تیسرے حیدر علی کا طویل نصیحت نامہ۔ غرض یہی وہ عوامل تھے کہ جن کے زیر اثر وہ کر ٹیپو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ سامنے بیٹھی ہوئی ایک خوب صورت ترین لڑکی نے اپنا اندازانہ دل اس کے قدموں پر رکھ دیا ہے۔

”بس اب تم جاؤ۔“ ٹیپو کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ ”مجھے اپنا سبق یاد کرنا ہے۔ اگر کل صبح جواب نہ دے سکا تو سید صاحب بہت سخت سزا دیں گے۔“  
”اور میرے سبق کا کیا ہو گا کنورا! میں تو سب کچھ بھول گئی۔“ ٹیپو کی بے حسی دیکھ کر سریتا رونے لگی تھی۔

اگرچہ ٹیپو والی میسور کے حکم پر سختی سے عمل کر رہا تھا لیکن مزاجاً وہ اتنا سخت نہیں تھا کہ ایک لڑکی کے آنسوؤں کا اثر ہی نہیں لیتا۔ سریتا کے دھواں دھواں چہرے اور سرخ آنکھوں نے اسے بے قرار کر دیا تھا۔ ”آخر اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو تمہیں کوئی دکھ نہیں دیا۔ پھر تم کیوں روتی ہو؟“ ٹیپو کی وہی معصومیت برقرار تھی۔

”تم مجھ سے اتنی دُور کیوں چلے گئے کنورا؟“ شدت جذبات کے سبب سریتا کی آواز کھٹی کھٹی تھی اور لفظ بمشکل اس کے ہونٹوں کی قید سے آزاد ہو رہے تھے۔ ”تمہیں دیکھے بغیر میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔“

”عورت اور مرد ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔“ سریتا سے پیچھا چھڑانے کے لئے ٹیپو نے ایک ایسا بات کہہ دی تھی جس کا حقیقی مفہوم وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

”کیوں نہیں رہ سکتے؟“ سریتا بحث پر اُتر آئی تھی۔ ”راج محل میں کتنی ہی عورتیں، مردوں کے ساتھ رہتی ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ ٹیپو ایک بار پھر سریتا کی موجودگی سے بیزار نظر آنے لگا تھا۔ ”بابا محترم کا یہی حکم ہے۔“

حیدر علی کے رعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ اس کا نام سن کر بھی لوگوں کی سانسوں کا توازن بگڑ

کو صلیب عشق پر چڑھا دیا گیا۔“

”ٹوکس کا ذکر کر رہا ہے؟“ والی میسور کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

”کل تک تو دوسروں ہی کے فسانے سنا رہا مگر آج برسوں بعد اپنا قصہ چھیڑا ہے۔“ شجاعت خان کی آنکھوں سے بھی خون بہہ رہا تھا اور آواز بھی ڈنکی تھی۔ ”سرکار! اگر میں اپنے عہد کا پابند نہ ہوتا تو آپ کو ہرگز نہ بتاتا کہ میرے کانوں نے کیا سنا اور آنکھوں نے کیا دیکھا؟ آپ کے اندیشے درست تھے۔ ہنڈت کی بیٹی، شہزادے کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے۔“

”میں نے فاطمہ بیگم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی کے ارادے بہت خطرناک نظر آ رہے ہیں۔“ حیدر علی کے لہجے سے وہی احساس طمانیت جھلک رہا تھا جو کسی مشکل سوال کو حل کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

”مگر یہ وہ عشق نہیں ہے سرکار!“ شجاعت خان بڑی بے باکی سے بول رہا تھا۔ ”یہ تو وہ عشق ہے جو گھربار، دھن، دولت، ایمان، دھرم غرض انسان کی ہر چیز کو چہرے محبوب میں غلام کرا دیتا ہے۔ برسوں سے در بدر پھر رہا ہوں۔ مگر میں نے آج تک وقت کے آئینے میں اپنے سوا کوئی دوسرا چہرہ نہیں دیکھا۔ راہداری میں بہت اندھیرا تھا لیکن پھر بھی میری آنکھوں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ اس لڑکی کے خدوخال شجاعت خان ہی سے ملتے ہیں۔ وہ میرا ہی دوسرا عکس ہے۔“

”کیا بے سروپا باتیں کر رہا ہے؟“ حیدر علی نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے بولنے دیجئے سرکار!“ شجاعت خان نے والی میسور کی تنبیہ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ”امانت دار ہوں، اس لئے ایک بات پوری دیانت کے ساتھ بیان کروں گا۔ قبر میں بھی جانا ہے اور خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ آپ کی محبت میں کسی دوسرے کی حق تلفی نہیں کر سکتا۔“ حیدر علی کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے اور وہ ناگواری کے انداز میں شجاعت خان کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

”اس لڑکی کو بدلا نہیں جاسکتا۔ برہمن زادی کا سینہ بھی صاف ہے اور قول بھی سچا ہے۔“ شجاعت خان عجیب سی سرمستی کے عالم میں گفتگو کر رہا تھا۔ ”زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہنڈت اسے کسی زینت جہاں کی طرح ڈولی میں بٹھا کر کسی امراؤ خان کے حوالے کر دے۔ مگر شجاعت خان کے دل کو کیسے بدلے گا کہ جب اسے محبوب کے رخسار نہ مل سکے تو اس نے اپنے لب کواری کی تیز دھار پر رکھ دیئے۔ اس طرح بھی پیاس نہیں بجھی تو کسی دن جلتے ہوئے انگاروں پر ہونٹ رکھ دے گا۔ پھر آگ، آگ میں مل جائے گی۔ اس کے بعد شاید..... شاید.....“ شجاعت خان نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی یا سینے کی آگ نے اس کی زبان کو جلا ڈالا تھا۔

”کو اپنا ذکر درمیان میں کیوں لے آیا؟“ حیدر علی نے انتہائی تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”سرکار! یہ میں ہی تو ہوں جسے دوسری بار زنجیریں پہنا کر مقتل کی طرف لے جایا جا رہا

جاتا تھا مگر سریتا کے جذبوں کی سرکشی نے والی میسور کے حکم کا بھی کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ ”اگر تم یہاں نہیں آسکتے کنور! تو میں تمہیں دیکھنے کے لئے روزانہ تمہارے پاس آسکتی ہوں۔“ سریتا کی دیوانگی دیکھ کر ٹیپو گھبرا گیا۔ ”اگر تو نے فوجی چھاؤنی میں قدم رکھا تو میں زندگی بھر نہ تیری صورت دیکھوں گا اور نہ تجھ سے بات کروں گا۔“ یکا یک ٹیپو کے اندر ریاست میسور شہزادہ بیدار ہو گیا تھا۔ ”تو ہندو ہے اور میں مسلمان..... پھر تیرا میرا ساتھ ہی کیا۔“ ٹیپو جڑ جڑبذبات میں وہ بات بھی کہہ گیا جو اسے زبان پر نہیں لانی چاہئے تھی۔

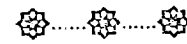
”ہاں! میں ہندو ہوں مگر تمہاری خاطر اپنا دھرم بھی چھوڑ سکتی ہوں۔“ عشق کی آگ نے سریتا کو سر سے پاؤں تک جلا ڈالا تھا اور اب اسے ٹیپو کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ”خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں تجھ سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔“ آخر پلپلی قوت برداشت جواب دے گئی۔

سریتا، ٹیپو کی مسہری کے قریب فرش پر بیٹھی تھی۔ دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھی اور ولی میسور کے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ ”کنور! میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ مگر مجھ سے بد رشتہ نہ توڑنا۔ اگر کبھی سامنے آ جاؤں تو مجھے پہچان لینا۔“

ٹیپو کا غصہ سرد ہو گیا اور اسے اس پاگل لڑکی پر ترس آنے لگا۔ ”تو جب تک ہوش میں رہی، میں تجھ سے ترک تعلق نہیں کروں گا۔“

سریتا کا بچنے جسم کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ ”کنور! میں ہوش میں رہنے کی پوری کوشش کروں گی۔ لیکن اگر کبھی پاگل پن کی لہر آجائے تو یہ سوچ کر معاف کر دینا کہ ایک غریب اور کمزور لڑکی تھی۔ بہک گئی ہوگی۔“ اتنا کہہ کر سریتا مڑی اور اس طرح واپس جانے لگی جیسے اس کے پاؤں آبلوں سے بھر گئے ہوں۔

اگر سریتا کو ذرا بھی ہوش ہوتا تو ٹیپو کی خواب گاہ سے نکلتے ہی دیکھ لیتی کہ دروازے کے قریب ایک دروازہ قائم سایہ کھڑا ہے جس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے ہیں۔ اور یہ سایہ، شجاعت خان کے سوا کسی دوسرے شخص کا نہیں تھا جو حیدر علی کے حکم سے انتہائی رازداری کے ساتھ سریتا کی نگرانی کر رہا تھا۔



اسی رات جب شجاعت خان، حیدر علی کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کی آنکھیں سرخ رہی تھیں اور چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ ”کیا ہوا شجاعت خان؟ تو نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“ حیدر علی نے شدید حیرت لہجے میں اپنے معتمد خاص کو مخاطب کیا۔

”کچھ نہیں سرکار! یہ حادثہ کم و بیش ہوتے ہی رہتے ہیں۔“ ریاست میسور کے نائب آسالا نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ”آج ایک اور شجاعت خان

حیدر علی نے چند ہی دنوں میں صوبہ سرا کی بغاوت فرو کر دی اور پھر بالا پور اور نندی گڑھ کی طرف متوجہ ہوا۔

بالا پور کا پالیگار راجہ، حیدر علی سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا تھا مجبوراً اس نے پنکنڈہ کے راجہ مراری راؤ سے امداد طلب کی۔ پھر یہ دونوں مل کر حیدر علی کے مقابل صف آراء ہوئے۔ اذواج میسور، طوفان کی طرح آگے بڑھیں اور دشمن کو ایک ہی حملے میں پسپا کر دیا۔ راجہ مراری راؤ شکست کھا کر پنکنڈہ کی طرف فرار ہو گیا۔ حیدر علی کی فوجیں اس کے تعاقب میں روانہ ہوئیں۔ پہلی لڑائی گوری بندہ پر ہوئی جس میں مراری راؤ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ راجہ بھاگ کر پنکنڈہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ ایک مہینے تک محاصرہ جاری رہا۔ آخر راجہ مراری راؤ نے اپنے آپ کو حیدر علی کے سپرد کر دیا۔

اسی دوران والی میسور نے اپنے سالار میر علی رضا خان کو نندی کی طرف روانہ کیا۔ آخر ایک مہینے کے بعد راجہ نندی کو شکست ہوئی اور میر علی رضا خان نے راجہ اور اس کے اہل خانہ کو گرفتار کر کے بنگلور روانہ کر دیا۔ راجہ نندی کے دو لڑکے مسلمان ہو گئے۔ حیدر علی نے بدرالزماں خان نامہ کو نندی کے علاقے پر قلعہ دار مقرر کیا۔ یہ ریاست میسور کا ایک معزز سردار تھا۔ بالا پور اور پنکنڈہ کو فتح کرنے کے بعد حیدر علی کچھ دنوں کے لئے صوبہ سرا میں ٹھہر گیا۔ ابھی وہ سرنگاپٹم جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ محافظ سپاہیوں نے ایک فریادی نوجوان کو حیدر علی کی خدمت میں پیش کیا جو والی میسور کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگا۔

”میں نے آپ کے انصاف کے بہت چرچے سنے ہیں سمرات!“ نوجوان نے اپنی داستانِ الم بیان کرتے ہوئے کہا۔ میں سے مسلل آنسو بہہ رہے تھے۔ ”اسی لئے آپ کی شرن (پناہ) میں چلا آیا ہوں۔“ ”تو اپنا حال بیان کر!“ حیدر علی نے ہندو نوجوان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم تیرے ساتھ انصاف کریں گے کہ تو مطمئن ہو جائے گا۔“

”میرا نام مہادی ہے سمرات!“ نوجوان نے اپنی داستانِ الم بیان کرتے ہوئے کہا۔ میں راجہ بدور کا حتمی لڑکا ہوں۔ راجہ کے انتقال کے بعد رانی نے ایک برہمن وزیر سے ناجائز تعلقات قائم کر لئے ہیں اور دونوں نے مل کر مجھے میرے جائز حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ انہیں رات دن عیش و عشرت کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں۔ رعایا بدل ہو گئی ہے اور ہر طرف بد امنی پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ رانی اپنی اصلاح کر لے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس بدکار عورت نے اپنے آشنا وزیر کے ساتھ سازش کر کے مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی۔ ایک رات رانی کے آدمیوں نے میرا گلا گھونٹا اور مجھے مردہ سمجھ کر ایک مندر میں دفن کر گئے۔ مگر ابھی میری زندگی باقی تھی۔ مندر کے ایک پجاری نے مٹی ہٹا کر مجھے باہر نکالا اور صیحت کی کہ میں اب بھی بدل کر ریاست بدور سے نکل جاؤں۔ اب میں آپ کے پاس آیا ہوں اور انصاف چاہتا ہوں کہ مجھے میرا حق دلایا جائے۔ میں آپ کو اس احسان کے عوض ہمیشہ خراج ادا کرتا رہوں گا۔“

”ہے۔“ شجاعت خان کی آواز میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا تھا۔ ”میں نے آج تک کسی کے سامنے اپنی بربادی کا مرثیہ نہیں پڑھا مگر اس لڑکی کی تباہی کا نوحہ ضرور پڑھوں گا۔ ہائے مریتا دیوی! ظالم عشق نے اس معصوم کو بھی نہیں چھوڑا۔“

شجاعت خان سرنگاپٹم کے محل سے بنگلور کے ایک دیہات میں پہنچ گیا تھا اور والی میسور کا ذہن سیاست کی مختلف شاہراہوں میں بہت تیزی سے سفر کر رہا تھا۔

آخر طویل سکوت اور غور و فکر کے بعد حیدر علی، شجاعت خان سے مخاطب ہوا۔ ”پنڈت موہن داس کو کسی دوسرے مندر کا پجاری بنا کر اس شہر سے رخصت کر دے۔ ہم یہ خوبصورت بلا بھی اسی کے ساتھ چلی جائے گی۔“

شجاعت خان نے بڑی اذیت کے ساتھ والی میسور کی طرف دیکھا۔ ”سرکار! اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ راج محل سے رخصت ہو کر تو وہ مر ہی جائے گی۔“

”تو جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اپنے ہوش و حواس کو بیٹھا ہے شجاعت خان!“ حیدر علی کے لہجے میں آمرانہ سختی تھی۔ ”سریتا ایک ہندو لڑکی ہے۔ اگر اس کا پاگل پن شدت اختیار کر گیا تو پوری ریاست میں فساد برپا ہو جائے گا اور راجہ کرشنا دھب کی آڑ لے کر میرے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔“

شجاعت خان نے بہت جلد اس نازک صورت حال کو محسوس کر لیا۔ ”آپ درست کہتے ہیں۔ سریتا کو اس شہر سے رخصت کر دینا ہی بہتر ہے۔“

”میں خود پنڈت موہن داس سے بات کروں گا۔“ حیدر علی پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا چکا تھا مگر ابھی اس کا نفاذ باقی تھا۔ ”وہ سریتا کی شادی کر دے یا اسے لے کر کہیں دور چلا جائے۔“



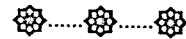
دوسرے دن حیدر علی، سریتا کے سلسلے میں پنڈت موہن داس سے بات کرنا چاہتا تھا کہ اچانک ایک اور ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ریاست کے جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ صوبہ سرا میں بغاوت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں جن کا فوری تدارک ضروری ہے۔

حیدر علی بہت عجلت میں اپنی فوج لے کر سرا کی طرف روانہ ہوا۔ شجاعت خان نے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو والی میسور نے منع کر دیا۔

”تمہارا سرنگاپٹم میں رہنا بہت ضروری ہے۔ میں اس بغاوت کو تو کچل ڈالوں گا لیکن اگر خدا خواستہ اس لڑکی کی وجہ سے شیو باغی ہو گیا تو میں اپنی زندگی کی جنگ ہار جاؤں گا۔“

”ایسا نہیں ہو گا سرکار!“ شجاعت خان نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ”میں شہزادے کو فوج جانتا ہوں۔“

”پھر بھی تم اس لڑکی پر گہری نظر رکھو اور میری واپسی کا انتظار کرو۔“



”اگر تیرے بیان کردہ واقعات درست ہیں تو تجھے انصاف ضرور ملے گا۔“ حیدر علی ہندو نوجوان مہابدی کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔  
دوسرے دن والی میسور نے اپنے ایک معتمد کو شجاعت خان کے نام ایک خفیہ خط لکھا۔  
سرنگاپٹم روانہ کر دیا۔ خط میں صرف چند سطر پر تحریر تھیں۔  
”میں ایک ضروری مہم پر جا رہا ہوں۔ تم سریتا کی نگرانی جاری رکھو۔ بہت جلد واپس آؤں گا۔“  
شجاعت خان کو نئی ہدایات بھیجنے کے بعد نواب حیدر علی اپنی فوج لے کر ریاست بدنور کی طرف بڑھا۔

بدنور، میسور کے شمال میں واقع ہے۔ صوبہ بمبئی میں ضلع ”کیانرا“ کے قریب یہ ایک زرخیز اور مستحکم ہندو ریاست تھی۔ بدنور کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ 1564ء میں سلطنت ہنگری کے زوال پر وہاں کا سارا خزانہ اسی ریاست میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ بدنور کے مال و دولت کی داستانیں آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ یہ پورا علاقہ کوہستانی ہے جہاں قدم قدم پر قیمتی لکڑی کے گھنے جنگل اور دُشوار گزار پہاڑیاں موجود ہیں۔  
بدنور تک پہنچنے کے لئے ایک تنگ راستے کے سوا کوئی دوسری گزرگاہ نہیں تھی۔ اس راستے میں مزید پیچیدہ اور دُشوار بنانے کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ سارے قلعے اٹھ میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ ریاست بدنور کا پایہ تخت اس قلعے کی خوب صورت تھا کہ اکثر شاعروں نے اس کی تعریفیں لکھی ہیں۔ اس وقت ریاست کی آبادی پچاس ہزار کے قریب تھی لیکن شہر بہت کشادہ اور فراخ تھا۔ ہر مکان کے ساتھ ایک دکان موجود تھا جو انتہائی دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ شہر اہوں پر دو روپہ درخت لگے ہوئے تھے۔ پانی کی نہریں بہتی تھیں اور گلی کوچوں میں سنگریزوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔

نواب حیدر علی تیز رفتاری کے ساتھ ریاست بدنور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستے میں مزاحمت نہیں ہوئی کیونکہ تمام لوگ اس نوجوان مہابدی سے واقف تھے۔ پھر بھی حیدر علی اتنے محتاط انداز میں اپنا سفر جاری رکھا تھا کہ جب تک والی میسور کی فوج بدنور کے گرد و پیش میں نہیں پہنچ گئی، اس وقت تک رانی کو کچھ پتہ ہی نہیں چل سکا۔ پھر جب حیدر علی کا لشکر قریب خیمہ زن ہو گیا تو بدنور کی رانی اور اُس کے آشنا برہمن پر یہ راز کھلا کہ دشمن ان دروازے تک آپہنچا ہے۔

حیدر علی قتل و غارت کے بغیر ریاست کی تخت نشینی کے مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اس والی میسور نے اپنے ایک قاصد کو رانی بدنور کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا۔  
”واضح رہے کہ میں تمہارے اس خوب صورت علاقے کو تاخت و تاراج کرنے کی ہرگز یہاں نہیں آیا ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بدنور کی کشادہ گھٹیاں انسانی

حیدر علی قتل و غارت کے بغیر ریاست کی تخت نشینی کے مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اس والی میسور نے اپنے ایک قاصد کو رانی بدنور کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا۔  
”واضح رہے کہ میں تمہارے اس خوب صورت علاقے کو تاخت و تاراج کرنے کی ہرگز یہاں نہیں آیا ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بدنور کی کشادہ گھٹیاں انسانی



ابھی بازوئے قاتل نہیں ٹھہرے گا..... اور اگر ٹھہرے گا تو بستیاں ویران ہو چکی ہوں گی اور ریاست کے در و بام پر موت کا گہرا سناٹا طاری ہو چکا ہو گا۔ یہ سوچ کر لامبا نے میدان جنگ میں سفید جھنڈا لہرا دیا۔ حیدر علی نے لامبا کو امان بخش دی اور ریاست کے تمام سپاہیوں سے ہتھیار رکھوا لئے مگر کسی کو زنجیریں نہیں پہنائیں۔

قلعے کے دروازے بند تھے۔ حیدر علی کے حکم پر چاروں طرف سے کمندیں ڈالی گئیں اور والی میسور کے جانباز، موت سے بے نیاز اس طرح فصیل پر چڑھنے لگے جیسے وہ اپنی کسی پسندیدہ تفریح گاہ یا کوچہ محبوب کی طرف جارہے ہوں۔ پھر کچھ دیر بعد ہی حیدر علی کے پچاس سپاہیوں نے رانی کے محافظ دستے کو موت کی نیند سلا دیا۔ قلعے کے دروازے کھول دیئے گئے۔ مہابدی ایک فاتح کی حیثیت سے قلعے میں داخل ہوا اور رانی کو گرفتار کر کے نواب حیدر علی کے سامنے پیش کر دیا گیا۔



دوسرے دن دربار آراستہ کیا گیا جس میں ریاست کے تمام معززین اور شرفاء شریک ہوئے۔ رانی نے حیدر علی سے معافی مانگ لی تھی، اس لئے اسے بھی عزت و احترام کے ساتھ دربار میں آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ پھر جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو والی میسور نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ہماری یلغار کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ایک حق دار کو اس کا حق دلا دیں اور کسی خون خرابے کے بغیر واپس چلے جائیں۔ مگر رانی اور اس کے مشیروں نے ہماری طرف سے دیئے جانے والے سلامتی کے پیغام کا مذاق اڑایا۔ یہاں تک کہ ہم اپنی شمشیر بے نیام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب اگر ہزاروں انسان خاک و خون میں نہا گئے تو اس کی ساری ذمہ داری ریاست کے منتظمین پر عائد ہوتی ہے۔ بخدا اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔“ یہ کہہ کر حیدر علی، مہابدی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”نوجوان! یہ تمہارے اپنے ہی لوگ ہیں، تم انہیں بتاؤ کہ اس حملے کا سبب ہماری ذاتی غرض ہے یا تمہاری فریادیں؟“

مہابدی اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور بلند آواز میں حاضرین دربار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”یہ سمرات ہی کا کرم ہے کہ میں اس دربار میں موجود ہوں۔ ورنہ اب تک میری ہڈیاں بھی گل سڑ کر مٹی کے ہم رنگ ہو چکی ہوتیں۔ اور بدنور کے باشندوں کو تمام عمر اس بات کی خبر نہ ہوتی کہ ریاست کا حقیقی وارث کہاں گیا۔“ اس کے ساتھ ہی مہابدی نے رانی اور گیانی رام کی سازش کا تفصیلی حال بیان کیا اور پھر حیدر علی کا اشارہ پا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد والی میسور، رانی بدنور سے مخاطب ہوا۔ ”اب آپ سر دربار اعتراف کر لیجئے کہ مہابدی، راجہ کی کسی داشتہ کی نشانی نہیں بلکہ تاج و تخت کا جائز وارث ہے۔“

چھپانے کے لئے میرے چہرے پر یہ کیسی سیاہی مل دی؟“ بات کرتے وقت مہابدی کی زبان لڑکھڑاہتی تھی۔ اور وہ خوف سے سہا جا رہا تھا کہ کہیں حیدر علی اس پر شک نہ کرنے لگے۔ اور والی میسور اسے موت کے منہ میں تنہا چھوڑ کر واپس چلا جائے۔

”ٹو سچا ہے نوجوان!“ حیدر علی نے مہابدی کی دہشت کم کرنے کے لئے اس کے کانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”رانی جھوٹ بولتی ہے۔ اور اگر تو جھوٹا ہوتا تو اس علاقے کے سینکڑوں باشندے تجھے عزت و احترام کی نظر سے نہ دیکھتے۔ ہم راستے بھر ہر چیز کا جائزہ لیتے ہوئے آگے رہے تھے۔“

”پھر؟“ مہابدی نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی فائدہ زدہ انسان کسی سے روٹی کا مال کرے اور اسے اس بات کا یقین نہ ہو کہ دینے والا اسے جھڑک دے گا یا اس کی ضرورت پورا کر دے گا۔

”تو نے ہم سے انصاف مانگا تھا، اس لئے ہم تجھے انصاف ہی دیں گے۔“ حیدر علی نے چند الفاظ میں مہابدی کو مطمئن کر دیا۔ پھر فوراً ہی رانی بدنور کے نام دوسرا خط تحریر کر لیا۔

”ہم نے تمہیں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ اور اس بات کی وضاحت طلب نہیں کی تھی کہ مہابدی کون ہے؟ ہمارا یہ مزاج نہیں کہ ہم صرف ایک شخص کی گواہی پر ایک طرف فیصلہ ساز ہماری عدالت میں دونوں فریقوں کا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ بدنور کے تخت کے دارما قضیہ تو ایک طرف، تمہارا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم نے ہمارے حکم کی تو قیر نہیں کی۔ عورت ہونے کی وجہ سے ہم تمہیں کچھ دیر کی مہلت اور دے رہے ہیں۔ تمہارے حق میں بہتر ہو گا کہ وقت ضائع کئے بغیر قلعے سے باہر نکل آؤ اور اس حکم نامے کو سر پر رکھ کر ہمارے قلعے میں داخل ہو جاؤ۔“

رانی بدنور نے حیدر علی کا دوسرا خط پڑھا اور سوالیہ نظروں سے گیانی رام کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ سب اس کی دھمکیاں ہیں، جتنی چاہیں ہیں۔“ گیانی رام، رانی کو مسلسل غلامی دے رہا تھا۔ ”ہم ایک بڑی فوج رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم اپنے پسندیدہ جنگ کر رہے ہیں۔ حیدر علی اور اس کے لشکر کو تو یہاں سے بھاگنے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔“ ہوس پرست رانی، گیانی رام کے ہاتھوں کا کھلونا تھی، اس لئے حیدر علی کے حکم کی شدت محسوس نہ کر سکی اور اس نے والی میسور کے قاصدوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ خود اپنے بار جواب دینے کی عادی نہیں۔

حیدر علی نے وہ رات جنگ کی منصوبہ بندی میں گزاری اور پھر صبح ہوتے ہی پورے شور سے بدنور کی فوج پر حملہ کر دیا۔ رانی کے سپاہی شروع میں تو بہت سخت جان ثابت ہوئے مگر جب موج خوں ان کے سروں کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ گھبرا گئے۔ بدنور کا سپاہی لامبا ایک زیرک انسان تھا۔ اس نے اپنے کئی ہزار فوجیوں کی بھیبت دے کر انداز

”ہمارا مذہب بھی یہی کہتا ہے اور ہمارا مزاج بھی یہی ہے کہ ہم محبت کا بدلہ محبت سے دیتے ہیں۔ مہابدی نے سب لوگوں کے سامنے ہماری وفاداری کا حلف اٹھایا ہے۔ اس لئے ہم بھی اسے یقین دلاتے ہیں کہ وہ ہمارے دل سے کبھی دور نہیں ہوگا۔ جو لوگ دربار میں موجود ہیں، وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لیں کہ مہابدی کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے تاج پہنایا ہے۔ اگر کسی ہوس پرست نے اس تاج کو اتارنے کی کوشش کی تو ہم بھی سمجھیں گے کہ اس نے ہمارے تاج پر دست درازی کی ہے۔“ یہ رانی اور اس کے ہم نواؤں کے لئے کھلی سیبیہ تھی۔

رانی، والی میسور کا اشارہ سمجھ گئی اور اس نے دوبارہ کھڑے ہو کر انتہائی پُر جوش لہجے میں اپنے عہد کی تجدید کی۔ ”ہم میں سے ہر شخص، نواب بہادر کا مطیع و فرمانبردار رہے گا۔“

مہابدی کا جشن تاج پوشی سات دن تک جاری رہا۔ حیدر علی اپنے کام کی تکمیل کر کے جلد از جلد سرنگاپٹم لوٹ جانا چاہتا تھا لیکن مہابدی کے شدید اصرار پر اسے بدنور میں ٹھہر جانا پڑا۔ پھر جیسے ہی یہ رنگا رنگ جشن ختم ہوا، حیدر علی نے مہابدی کے سامنے اپنا مطالبہ دہرایا۔ ریاست کے نوجوان حکمران نے کسی جیل و حجت کے بغیر منگور کی بندرگاہ اور اس کے مضافات کا علاقہ والی میسور کے حوالے کر دیا۔

حیدر علی فوراً ہی منگور پر قبضہ کرنے کے لئے بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔



حیدر علی کے جاتے ہی رانی نے اپنے چہرے پر بڑا ہوا مصلحت کا نقاب اُتار کر تار تار کر دیا۔ اور اب وہی عیار و ہوس کا عورت اپنے مخصوص کمرے میں گیلانی رام کے ساتھ مسلسل شراب پی رہی تھی۔ دورانِ بادہ نوشی کبھی اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار اُبھر آتے اور کبھی دانت بھر لگا کر ہنسنے لگتی۔

”مہارانی! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ گیلانی رام اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”کیا تو سمجھتا ہے کہ میں پاگل ہو گئی ہوں؟“ رانی نے اپنے آشنا کو بری طرح چھیڑ کر دیا۔ اگرچہ یہ خوبصورت برہمن ہوس کے سفر میں اس کا شریک تھا لیکن پھر بھی وہ اس سے غلاموں کی طرح سلوک کرتی تھی۔

”میں نے آج تک آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھا۔“ برہمن سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ رانی نے غضب ناک نظروں سے اپنے آشنا کی طرف دیکھا اور جموٹی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے میں ٹپٹپنے لگی۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچی۔ برہمن نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

”چھوڑ دے مجھے۔“ اس وقت رانی پر کسی زخمی شیرنی یا چوٹ کھائی ہوئی ناگن کا گمان ہوتا تھا۔ ”مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں، میں اب بھی حیدر علی اور اس کے غلام مہابدی کو تنہا حکمت دے سکتی ہوں۔“

والی میسور کے حکم کی تعمیل میں رانی کو بھی اپنی نشست پر ایستادہ ہونا پڑا۔ پھر اس عیار عورت نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ رک کر اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور حیدر علی سے معافی طلب کی۔

”آپ میری مجرم نہیں، اس نوجوان کی قصور وار ہیں۔“ نواب حیدر علی نے مہابدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی تالیفِ قلب کر دیجئے۔ میں مطمئن ہو جاؤں گا۔“ رانی بدنور نے کسی جھجک کے بغیر مہابدی سے بھی معافی مانگ لی۔ ”اقتدار کی ہوس نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ آنجنابی شوہر کے رشتے سے تو میرا بھی بیٹا ہے اور میں اپنے بیٹے سے بہت شرمندہ ہوں۔“

مہابدی ایک سیدھا سادا نوجوان تھا۔ فریب کار عورت کی باتوں سے فوراً ہی بہل گیا اور سر دربار کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

”مجھے راج ماتا سے کوئی شکایت نہیں۔ میں ہمیشہ ان کا احترام کرتا رہوں گا۔“ ”معززین دربار! کیا آپ لوگ ہمارے انصاف سے مطمئن ہیں؟“ یکایک حیدر علی کی بارعب آواز گونجی۔ ”کہیں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی؟“ ”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔“ بیک وقت بہت سے درباری پکار اُٹھے۔ ”حق بہ حق دار رسید، یہی انصاف ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔“

حیدر علی نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ اہل دربار پر نظر ڈالی اور پھر اپنے ہاتھ سے مہابدی کو تاج پہنایا۔

”نوجوان! تجھے مبارک ہو۔“ والی میسور نے انتہائی پُر جوش لہجے میں کہا۔ حیدر علی کی مبارک باد کے ساتھ ہی پورا دربار حاضرین کی مبارک بادوں کے شور سے گونجنے لگا۔ اس ہنگامے میں کسی نے رانی کی طرف نہیں دیکھا جس کا چہرہ کچھ دیر کے لئے مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی اور انتہائی جبر کے عالم میں اپنے اس بیٹے کو تاج پوشی کی مبارک باد دینے لگی، جسے وہ کچھ دن پہلے زندہ دفن کرا چکی تھی۔

جب مبارک بادوں کا شور ختم ہو گیا تو حیدر علی نے پہلے رانی بدنور، پھر دوسرے درباریوں سے مہابدی کی وفاداری کا حلف لیا۔ آخر میں ریاست کے نئے حکمران نے حیدر علی کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”میں سمرات کا شکر گزار ہوں کہ صرف ان کی بدولت مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ آج سے ریاست بدنور، ریاست میسور کی خراج گزار رہے گی اور میں اپنی آخری سانس تک نواب حیدر علی خان بہادر کا وفادار رہوں گا۔“

جواباً حیدر علی نے مہابدی کو گلے لگا کر اپنی قربت کا اظہار کیا اور پھر انتہائی پُر جلال لہجے میں اہل دربار سے مخاطب ہوا۔

درگاہی کی آنکھیں چھلک اٹھیں اور آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ”اب اس برے وقت کو تم ہی ٹال سکتے ہو۔“

”میری حماقت کے سبب ہندو مذہب کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے؟“ نوجوان راجہ کا منہ حیرت سے کھلا کھلا رہ گیا۔

”اب بیٹے دنوں کی باتیں دہرانے سے کیا فائدہ؟“ رانی کی آواز میں مزید رقت پیدا ہو گئی تھی۔ ”تم نے جذبات سے مغلوب ہو کر ایک ایسے شخص کو ریاست پر حملے کی دعوت دے دی جو ہندوؤں کا بدترین دشمن ہے۔ کاش.....“ رانی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔“ مہابدی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”نواب حیدر علی قول کے پکے انسان ہیں۔ اگر وہ متعصب ہوتے تو ریاست کے ایک ہندو سپاہی کو بھی زندہ نہ چھوڑتے۔ آخر انہیں روکنے والا کون تھا؟“

”ابھی تم بچے ہو مہابدی!“ رانی درگاہی نہایت عیاری سے نوجوان حکمران کے گرد اپنی باتوں کا جال پھیلا رہی تھی۔ ”ابھی تو تم نے صرف منگور کی بندرگاہ تھالی میں رکھ کر پیش کی ہے۔ اب اس علاقے کا انتظام مکمل ہو جائے گا تو واپسی پر وہ بدنور پر بھی قبضہ کر لے گا۔ پھر تم اقتدار سے بھی جاؤ گے اور اپنی جان سے بھی۔“

”اگر نواب بہادر کو یہی کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر چکے ہوتے۔“ مہابدی مسلسل حیدر علی کی وکالت کر رہا تھا۔ ”انہوں نے مجھ سے وہی طلب کیا، جس کا معاہدہ طے پا چکا تھا۔“ میں نے اس شخص کی آنکھوں میں بڑی بے نیازی دیکھی ہے۔“

”وہ اتنا ہی مکار انسان ہے۔“ اچانک رانی درگاہی غضب ناک نظر آنے لگی تھی۔ ”وہ ندی نالے کی طرح نہیں کہ چند بوندوں میں ابل پڑے۔ سمندر کی مانند گہرا ہے۔ اس وقت اس کی فطرت کا پتہ چلتا ہے، جب وہ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ آپ میرے معصوم بیٹے کو بتائیں، آچاریہ جی! کہ حیدر علی کون ہے۔“ درگاہی نے ایک بوڑھے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

یہ بوڑھا، آچاریہ دیانند تھا جس کی داڑھی مونچھیں صاف تھیں اور لمبے لمبے بال کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

”سیاسی طوفان کو دیکھتے دیکھتے اور اس کے تھپڑے کھاتے کھاتے میری تو عمر ہی گزر گئی ہے مہاراج!“ بوڑھا آچاریہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ ”میرے چہرے کی ہر جھری کے پیچھے ایک تباہ کار طوفان کی تاریخ چھپی ہوئی ہے بالکل! مجھ سے سنو کہ حیدر علی کون ہے۔ وہ ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے ریاست میسور کی فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ اور آج وہ صرف میسور ہی کا مالک نہیں بلکہ آس پاس کے علاقوں پر بھی قبضہ کر چکا ہے۔ اس کی توسیع کا جذبہ ابھی سرد نہیں ہوا۔ حیدر علی کے سینے میں بھڑکنے والی حرص کی آگ نے کل ایک ہندو ریاست کو جلا کر راکھ کر دیا تھا، اب دوسرے کی باری ہے۔ راجہ کرشنا کے انجام پر نظر رکھو۔ کل وہ حیدر علی کا محسن

برہمن سمجھ گیا کہ احساس شکست نے رانی کے دماغ پر برا اثر ڈالا ہے۔ ”آپ اسے تقریباً لکھا سمجھ کر بھول جائیں۔ تیرا مکان سے نکل چکا ہے۔ اب اسے واپس لوٹنا نہیں جاسکتا۔“ برہمن بڑے خوشامدانہ لہجے میں رانی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اگر میں زندہ ہوں تو چھوٹے ہوئے تیر کو واپس آنا ہی ہوگا۔“ رانی کے لہجے میں بڑی تمکنت تھی، بڑا غرور تھا۔ ”تو کیسا مرد ہے کہ اب تک مجھے نہیں پہچانا۔ میں رانی درگاہی ہوں، جس نے دل کی خاطر اپنی ماں مریدا کو بھی ٹھوکر ماری۔ پھر میں ایک مسلمان کی ٹھوکر دے کر کس طرح رہوں گی؟ اور کل کا لڑکا مجھ پر کیسے حکومت کرے گا؟ نہیں گیانی رام! یہ ممکن نہیں۔ یا تو میں خود مر جاؤں گی یا ایسا طوفان اٹھاؤں گی کہ زمین آسمان ایک کر دوں گی۔“

برہمن گیانی رام نے رانی درگاہی کو بہت سمجھایا مگر وہ بار بار یہی کہتی رہی۔ ”مجھے سوچ دے، مجھے سوچنے دے۔ ابھی وقت میرے ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔“

”آخر آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ گیانی رام کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”حیدر علی اور مہابدی کی موت کے بارے میں۔“ ایک بیک رانی کے ہونٹوں پر بڑی مٹی خیز اور آسودہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

”یہ کیسے ہوگا؟“ گیانی رام، رانی کی بات پر حیران ضرور تھا لیکن اس کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ کسی طرح حیدر علی اور مہابدی راستے سے ہٹ جائیں اور ان کی عیاشانہ آزادی کے وہی دن دوبارہ لوٹ آئیں۔

”ٹوکل صبح ریاست کے تمام پنڈتوں اور پجاریوں کو محل میں طلب کر۔ پھر میں تجھے بتاؤں گی کہ میرا منصوبہ کیا ہے۔“ رانی درگاہی نے گیانی رام کو حکم دیا اور رات کا آخری جام لے کر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔



دوسرے دن قلعے کے مکینوں نے بڑی حیرانی سے یہ منظر دیکھا کہ ریاست کے تمام پجاری، پنڈت، برہمن اور آچاریہ محل کے ایک خاص کمرے میں جمع ہو رہے تھے۔ رانی درگاہی خود دروازے پر کھڑے ہو کر ان کا استقبال کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد مہابدی کے خدمت گار جاسوسوں نے اسے یہ اطلاع دی تو وہ کچھ فکر مند سا نظر آنے لگا۔ پھر اپنی ذہنی خلش کو دور کرنے کے لئے خود ہی اس کمرے میں چلا آیا جہاں ہندو قوم کے مذہبی سرداروں کا اجتماع تھا۔

”اچھا ہوا کہ تم آگئے بیٹے!“ رانی درگاہی نے مہابدی کو اپنے مشتقانہ لہجے میں مخاطب کیا جیسے وہ اس کی حقیقی ماں ہو۔ ”اگر تم نہیں آتے تو کچھ دن بعد ہم خود تمہیں زحمت دیتے۔“

اس دوران اپنے منصوبے کے مطابق تمام مذہبی پیشواؤں کو خشے میں اتار چکی تھی۔

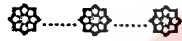
”آخر بات کیا ہے راج مانا؟“ مہابدی کی حیرت بدستور تھی۔

”بیٹے! تمہاری نادانی کی وجہ سے ہندو دھرم پر بڑا سنگین وقت آ پڑا ہے۔“

کہاں گیا۔“  
”راج ماما جو کچھ بھی کہیں گی، اسی پر عمل ہوگا۔“ راجہ مہادی، رانی کے بتائے ہوئے طلسم کا اسیر ہو چکا تھا۔ ”دیوتا میرے اس گناہ کو معاف کریں کہ میں نے ہندو ریاست کا اہم ترین علاقہ ایک مسلمان کے حوالے کر دیا۔“

جب رانی درگاوتی کو اندازہ ہو گیا کہ مہادی اپنے دماغ سے کام لینے کے بجائے اس کے ذہن سے سوچ رہا ہے تو وہ بے جھجک ہو کر اپنے منصوبے کی تفصیلات بتانے لگی۔  
”حیدر علی واپسی میں اسی راستے سے گزرے گا، جہاں وہ پہلی بار خیمہ زن ہوا تھا۔ ہم اسی جگہ سرنگیں بچھا کر بارود بھر دیں گے اور زمین کے اندر ہی اندر ایک طرف راستہ نکال دیں گے۔ پھر جیسے ہی حیدر علی وہاں ٹھہرے گا، مندر کے راستے سے سرنگوں میں آگ لگا دی جائے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے کھیل ختم ہو جائے گا۔“

رانی درگاوتی کا منصوبہ ہر اعتبار سے مکمل تھا۔ مہادی اور محل میں موجود تمام پنڈتوں کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ خیالوں ہی خیالوں میں ایک ہندو دشمن حکمران کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ ریاست کے پنڈت اور آچاریہ محل میں پُر تکلف کھانے کھا رہے تھے اور سینکڑوں مزدور مندر کے قریب سے طویل زیر زمین سرنگیں کھود رہے تھے۔



نواب حیدر علی کو بندرگاہ منگلور کے انتظامات میں تقریباً دو ماہ لگ گئے۔ پھر وہ اپنے دارالحکومت سرنگاپٹم پہنچنے کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ ریاست بدنور کی طرف بڑھا۔  
والی میسور کی تباہی کا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ مہادی کے جاسوس سپاہی ریاست کی سرحدوں سے نکل کر حیدر علی کے لشکر کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر انہیں اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ محل کے خفیہ اجلاس میں شریک ہونے والا برہمن پنڈت دینا ناتھ ریاست کی آخری سرحد سے بھی کئی میل آگے جا چکا تھا۔ پنڈت دینا ناتھ انتہائی عالم و فاضل، اپنی قوم کا ہمدرد اور باکردار برہمن تھا۔ راجہ بدنور کے مرنے کے بعد جب رانی درگاوتی اور گیلیا رام کے تعلقات کی خبریں عام ہوئیں اور رعایا پر نئے نئے مظالم ڈھائے جانے لگے تو یہ دینا ناتھ ہی تھا، جس نے دے دے لفظوں میں رانی کی بدکاریوں کے خلاف سب سے پہلے آواز بلند کی تھی۔ رانی نے تنبیہ کے طور پر پنڈت کا منہ کالا کر کے کٹی گئی پھر لیا تھا۔ اس کے بعد دینا ناتھ کے چندہ سالہ لڑکے کو سپاہیوں نے اس قدر زد و کوب کیا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچا۔ آخر اپنی اولاد اور گھر والوں کی زندگی خطرے میں دیکھ کر پنڈت نے رانی درگاوتی سے معافی مانگ لی تھی اور یہ عہد کیا تھا کہ وہ آئندہ اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرے گا۔ بظاہر دینا ناتھ کے ہونٹوں پر جبری مہر لگ گئی تھی مگر اس کے سینے میں نفرتوں کا جوالا کبھی پروش پا رہا تھا۔ وہ رات رات بھر اپنے دیوتاؤں کے بتوں پر سر رکھ کر فریاد کرتا رہتا۔ پھر دیوانوں کی طرح پتھر کے مجسموں سے مخاطب ہو کر کہتا۔

تھا اور آج نواب بہادر کا غلام۔ میری یہ بات کتنی ہی تلخ و گراں سہی، مگر آپ کا حشر بھی راجہ کرشنا کے انجام سے مختلف نہیں ہوگا۔“ آچاریہ دیانند نے کئی حوالوں اور دلیلوں کے ساتھ حیدر علی کے خلاف اتنی نفرت انگیز تقریر کی کہ ریاست کا نو جوان حکمران بڑی آسانی سے بہک گیا اور اس کے ذہن میں مذہبی تعصب کی خوف ناک آندھیاں چلنے لگیں۔

پھر جب آچاریہ دیانند کی تائید میں دوسرے پنڈتوں اور پجاریوں کی آوازیں کا شور بلند ہوا تو مہادی گھبرا گیا اور ہاتھ جوڑ کر ہندو دھرم کے رکھوالوں سے پوچھنے لگا۔

”اس میں کوئی سدیہہ (شک) نہیں کہ مجھ سے گھور پاپ ہو گیا۔ لیکن یہ سب کچھ انجانے میں ہوا۔“ مہادی کے چہرے پر وحشت برسنے لگی تھی۔ ”آپ لوگ راجہ نیتی (سیاست) کے بھی بڑے گیلیا ہیں اور دھرم کے بھی۔ مجھے بتائیے کہ آخر اس کا آپاٹ کیا ہے؟“

”اس کے سوا کچھ نہیں کہ حیدر علی کو قتل کر دیا جائے۔“ آچاریہ دیانند کے بجائے رانی درگاوتی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ مہادی کے لہجے سے شدید حیرت نمایاں تھی۔ ”نواب بہادر تو ہماری دسترس سے بہت دور جا چکے ہیں۔“

”وہ بہت جلد واپس آئے گا اور اسی راستے سے گزرے گا۔“ رانی درگاوتی نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”منگلور سے میسور جانے کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ ریاست بدنور سے گزرے اور ہم اسے ہلاک کر ڈالیں۔“

”راج ماما! میں آپ کے منصوبے کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔“ مہادی کی حیرت کا وہی عالم تھا۔ ”ہماری فوج نواب پر حملہ کرے گی یا ان کے خیمے پر شب خون مارا جائے گا یا انہیں کئی دعوت میں زہر دے کر ہلاک کیا جائے گا؟“

”نہیں۔“ رانی درگاوتی کی آواز بہت سرد تھی۔ ”قتل کے یہ تینوں طریقے نامکن العمل ہیں۔ ہم فوجی اعتبار سے اسے شکست نہیں دے سکتے۔ شب خون اس لئے نہیں مارا جاسکتا کہ وہ احمق نہیں ہے، اپنے خیمے کو حملہ آوروں کے لئے کھلا نہیں چھوڑے گا۔ اسے کھانے میں زہریوں نہیں دیا جاسکتا کہ تمہارے جشنِ تاجپوشی میں اس نے اس وقت تک کھانا نہیں کھایا جب تک ریاست کے ملازموں نے وہ غذا اپنے حلق سے نیچے نہیں اتار لی۔“

”پھر؟“ راجہ مہادی، سر سے پاؤں تک ایک سوال بن کر رہ گیا تھا۔

”اسے بے خبری کے عالم میں قتل کیا جائے گا۔“ یکایک رانی درگاوتی کے ہونٹوں پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”حیدر علی کے نام لیوا برہمنوں یہ سوچ سوچ کر ماتم کیا کریں گے کہ نواب قتل ہو گیا اور انہیں اپنے حکمران کو بچانے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔“ رانی اس طرح حیدر علی کی موت کا ذکر کر رہی تھی، جیسے اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی لذت حاصل ہو رہی ہو۔ ”حیدر علی کی لاش بھی نہیں بچپائی جائے گی۔ اس کے سپاہی ڈھونڈتے پھریں گے کہ نواب کا جسم



بجائے جانے لگے۔ آگے بڑھتے ہوئے فوجی اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے۔ حیدر علی، لشکر کے قلب میں  
قادر بڑی حیرت سے بگل کی آوازیں سن رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ والی میسور نے اپنے سپہ سالار میر علی رضا خان سے پوچھا۔

”نواب بہادر کی طرح میں بھی صورت حال سے بے خبر ہوں۔ یقیناً کوئی خاص واقعہ پیش  
آیا ہے۔“ یہ کہہ کر میر علی رضا خان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دی اور شاہراہ کے کنارے سے نکل  
کر رُوح کے اگلے دستے تک پہنچ گیا۔ چند سپاہی دینا ناتھ کو اپنے ہمراہ لے کر حیدر علی کی طرف آ  
رہے تھے۔

پھر جب پنڈت نے سازش کا تفصیلی حال سنایا تو حیدر علی سنائے میں آ گیا۔

”تو دوستوں کے درمیان تفرقہ تو نہیں ڈال رہا ہے پنڈت؟“ والی میسور کا لہجہ غضب  
ہاں تھا۔ ”اگر ایسا ہوا تو تیری ساری زندگی ایک عذاب بن کر رہ جائے گی۔“

”مجھ جیسے لاکھوں انسان آپ پر قربان۔“ دینا ناتھ کے لہجے میں بڑی عقیدت تھی۔ ”اگر  
میں چاہتا ہوتا تو اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر یہاں کیوں آتا؟“

”تو خود بھی ہندو ہے اور ہندو ریاست کا ایک انتہائی قیمتی راز میرے ہاتھ فرخت کر رہا  
ہے۔ آخر کس امید پر؟“ حیدر علی کی آواز بدستور تلخ تھی۔

”میں کون ہوں، اس پر غور کرنے کا وقت نہیں ہے نواب بہادر!“ دینا ناتھ کے لہجے میں  
ناہزی تھی، التجا تھی۔ ”آپ اپنی خبر لیجئے۔“

حیدر علی کچھ دیر تک پنڈت کے چہرے کے تاثرات اور لہجے کی بے ساختگی پر غور کرتا رہا،  
پھر اس نے اس راستے کو ترک کر دیا، جس پر زیر زمین بارودی سرنگیں تعمیر کی گئی تھیں۔ والی  
میسور کے تمام سپاہی باغوں، کھیتوں اور کچے راستوں سے گزر کر شہر میں داخل ہوئے اور دیکھتے  
ہی دیکھتے قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔

مہابدی اور رانی درگاوتی نے قلعے سے نکل کر حیدر علی تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن میسور کے  
پاہیوں نے یہ کہہ کر انہیں دروازے پر ہی روک دیا۔

”نواب بہادر کا حکم ہے کہ قلعے سے باہر کوئی نہیں جائے گا۔“

”میں اس ریاست کا حکمران ہوں۔“ مہابدی اقتدار کے نشے میں بول رہا تھا۔ ”مجھے کون  
روک سکتا ہے؟“

ایک سینکڑوں شمشیریں بے نیام ہو گئیں اور کچھ دیر تک فضا میں عجیب سی جھنکار سنائی دیتی  
رہی۔

”تو پھر ہماری لاشوں سے گزر کر چلے جائے۔“ ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔

مہابدی اور رانی درگاوتی کے چہروں پر خوف و ہشت کی پرچھائیاں لرزے لگیں اور وہ  
اگلے قدموں قلعے میں واپس چلے گئے۔

”درگا! تیری اپار شستی (لاحد و طاقت) کو کیا ہوا؟ تو میری مدد کو کیوں نہیں آتی؟ کیا تیرا  
نام رکھ کر گناہ کرنے والی عورت ہر قانون سے آزاد ہوتی ہے؟..... مہادیو شکریا! تیری خدائی میں  
یہ نا انصافی کیوں؟ تو اس پاپی عورت سے اپنے پیاریوں کی توہین کا انتقام کیوں نہیں لیتا؟.....  
اور اے فنا کے دیوتا شیوا! تو آسمان سے کوئی عذاب نازل کیوں نہیں کرتا؟“

پنڈت دینا ناتھ تقریباً چھ ماہ تک اسی طرح گریہ و زاری کرتا رہا۔ پھر جب پتھروں سے  
نکراتے نکراتے تھک جاتا تو عبادت کے کمرے سے نکل کر گھر کے آگن میں کھڑا ہو جاتا اور  
تاروں بھرے آسمان کی طرف منہ کر کے سسکنے لگتا۔

”ہے کوئی جو اس طاقتور سے مجھ کمزور کا بدلہ لے؟“ پھر خود ہی اپنی گھٹی گھٹی آواز سن کر  
”کوئی نہیں..... کوئی نہیں۔“

آخر پنڈت دینا ناتھ پتھروں سے مایوس ہو گیا تو اس نے ایک دن عجیب سے انداز سے  
دعا مانگی۔ ”میرے سارے عقائد بے اثر ٹھہرے، زندگی بھر کی ریاضت رائیگاں گئی۔ تو پھر اے  
مسلمانوں کے خدا! تو ہی میری فریاد سن لے۔“

ابھی پنڈت دینا ناتھ کو یہ نئی دعا مانگتے ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ حیدر علی اپنا لشکر  
جرار لے کر بدنور پہنچ گیا اور اس نے ایک دن رانی درگاوتی کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس  
نا قابل یقین واقعے نے پنڈت کے عقائد کی عمارت میں گہرا شکاف ڈال دیا تھا۔ اب اس کے  
دل میں اپنے دیوتاؤں کی طرف سے ہزاروں بدگمانیاں اور وسوسے پیدا ہونے لگے تھے۔ جب  
دینا ناتھ نے مہابدی کے جشن تاجپوشی میں حیدر علی کو قریب سے دیکھا اور اس کی تقریریں تو وہ  
میسور کے حکمران سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ پنڈت حیدر علی سے مل کر اپنی اس ذہنی شکست کا ذکر  
کرنا چاہتا تھا مگر ایک بے اثر شخصیت ہونے کے باعث وہ نواب کی بارگاہ میں رسائی حاصل نہ  
کر سکا۔ یہاں تک کہ مختصر سے قیام کے بعد حیدر علی منگور کی طرف چلا گیا اور دینا ناتھ اپنے  
دل میں ایک نامعلوم سی خلش کو دبائے ہوئے اداس اداس رہنے لگا۔

پھر جیسے ہی رانی درگاوتی نے حیدر علی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو دینا ناتھ پر وحشت کا  
طاری ہو گئی۔ رانی کے سامنے اس نے بڑی مشکل سے اپنے اعصاب پر قابو پایا مگر جب سرنگوں  
کو بارود سے بھر دیا گیا تو دینا ناتھ، ریاست بدنور سے نکل کھڑا ہوا اور اس ویران راستے میں جا  
پڑا، جدھر سے حیدر علی کی فوجیں واپس آنے والی تھیں۔

آخر کئی دن کے انتظار کے بعد راہوں سے غبار اٹھا اور حیدر علی کے شہسوار نمودار ہوئے۔  
پنڈت دینا ناتھ، والی میسور کے سپاہیوں کو دیکھ کر چیخنے لگا۔

”ٹھہر جاؤ!..... ٹھہر جاؤ! آگے خطرہ ہے۔ بہت بڑا خطرہ..... مجھے نواب بہادر کے پاس  
لے چلو۔“

اگلے دستے کے سپاہیوں نے فوراً ہی گھوڑوں کی لگا میں کھینچ لیں اور خطرے کے بگل

حیدر علی بہت دیر تک گہرے سکوت کے عالم میں ان سرگنوں کو دیکھتا رہا، پھر وہ آہستہ آہستہ مڑا اور اس نے دینا تاحہ کے کاندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

”تیرا بہت بہت شکریہ پنڈت! اب بتا، تو کیا چاہتا ہے؟ احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں۔“

دینا تاحہ نے رانی درگادتی کے مظالم کی داستان سنانے کے بعد بڑے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”جب میرے دیوتاؤں نے مجھے مایوس کر دیا تھا تو پھر مسلمانوں کا خدا ہی میرے کام آیا تھا اس لئے میری شدید خواہش تھی کہ خدا کے نام لیوا اس عذاب سے بچ جائیں جو زمین کے نیچے سے آنے والا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری یہ دعا بھی قبول ہوئی۔ اب میں خدا کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔“

حیدر علی نے بے اختیار ہو کر دینا تاحہ کو گلے لگا لیا۔ ”تو میرا بھائی ہے پنڈت! تجھے تیرے خدا نے سب کچھ دے دیا۔ تو بڑا خوش نصیب ہے۔ دنیا بھی تیری اور آخرت بھی تیری۔“



تمام بارودی سرگنوں کو تباہ کرنے کے بعد حیدر علی، محل میں داخل ہوا۔ والی میسور کے حکم پر پہلے ہی راجہ مہابدی، رانی درگادتی اور برہمن گیانی رام کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

حیدر علی کی عدالت آراستہ ہوئی۔ تینوں مجرموں کو زنجیریں پہنا کر سردار بار لایا گیا۔ رانی درگادتی اور گیانی رام نے پہلے کی طرح رو رو کر معافی مانگی مگر والی میسور نے ان کی طرف سے اپنے کان بند کر لئے تھے۔ پھر جب راجہ مہابدی نے رحم کی درخواست کی تو حیدر علی نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

”تو ازلی بد نصیب ہے تو جوان! تجھے یہ تاج و تخت راس نہیں آئے۔ اب پتھریلی زمین اور تنگ دھاریک کوٹھری ہی تیرا مقدر ہے۔ ہم نے بہت چاہا کہ تو عزت مندانہ زندگی بسر کرے۔ مگر ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اس کائنات کا مالک تو کچھ اور ہی چاہتا ہے۔“

مہابدی نے اپنی بریت کے لئے رانی درگادتی اور گیانی رام کو بنیادی مجرم قرار دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے مذہب کے نام پر فریب دیا گیا۔ میں ایک اکیلا کیا کرتا؟ ہندو دھرم کے تمام رکوالے یک زبان تھے۔ آخر میں بہک گیا۔“

”تو اکیلا نہیں تھا مہابدی!“ حیدر علی کے لہجے میں آگ برس رہی تھی۔ ”تو ریاست کا مختار محل تھا۔ اور پھر ہم بھی تو تیری پشت چٹائی کر رہے تھے۔ اپنے نقش خباثت کو مجبوری کا نام دیتا ہے۔ ہم نے ہی تجھے تاج پہنایا اور تو نے ہماری ہی قبر کھودنے کے انتظامات کئے۔ تو احسان فراموش بھی ہے اور ناقابل اعتبار بھی۔“

مہابدی بہت رویا، گورگڑایا مگر والی میسور نے اس کی ایک نہیں سنی۔ تاہم پنڈت دینا تاحہ کی اس گواہی پر کہ مہابدی نے ابتدا میں نواب بہادر کی پُر زور وکالت کی تھی، حیدر علی کو رحم آ گیا۔

”کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ شاید بساط اُلٹ گئی۔“ رانی درگا، دشت زدہ انداز میں بل رہی تھی۔ ”ظالم نے فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں چھوڑا ہے۔“

”خاموش ہو جا بد نصیب عورت!“ مہابدی نے انتہائی غضب ناک لہجے میں رانی درگادتی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تیری بد بختیاں تو مجھے بھی لے ڈوبیں گی۔“ یہ کہہ کر مہابدی پلٹا اور بھاگتا ہوا قلعے کے دروازے پر پہنچا اور حیدر علی کے پہرے دار سپاہیوں سے درخواست کرنے لگا۔

”مجھے سمرات کے پاس لے چلو۔ میں تم لوگوں پر اپنے الطاف و کرم کی بارشیں کر دوں گا۔“

”دنیا کا بڑے سے بڑا خزانہ بھی ہم سے ہماری وفاداریاں نہیں خرید سکتا۔“ ایک سپاہی نے بلند آواز میں کہا۔

”میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مجھے خبر ہے کہ تم ناقابل فروخت ہو۔“ مہابدی لہجہ بدل کر براہ راست خوشامد پر اُتر آیا تھا۔ ”میرا اس وقت سمرات سے ملنا بے حد ضروری ہے۔“

”راجہ صاحب! ہم صرف سپاہی ہیں جو حکم کے بغیر ایک قدم آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔“ مہابدی کی خوشامد کے جواب میں حیدر علی کے سپاہی نے بھی اپنا لہجہ بدل ڈالا تھا۔ ”ہم آپ کو کہاں لے جائیں؟ ہمیں خود پتہ نہیں کہ اس وقت نواب بہادر کہاں ہیں۔“

”تو پھر اتنا ہی بتا دو کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟“ مہابدی کو اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہا تھا۔

”راجہ صاحب! ہوش میں آئیں۔ اور ایک سپاہی کے فرائض کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ اب کی بار سپاہی نے کسی قدر تلخ لہجے میں جواب دیا۔

مہابدی ایک بار پھر دوڑتا ہوا قلعے میں پہنچا اور خفیہ راستوں سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر راستے پر حیدر علی کے سپاہی متعین تھے۔ قلعے کے ایک خفیہ دروازے پر ریاست کے سپاہیوں کی لائیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ مہابدی کے ان محافظوں نے حیدر علی کے سپاہیوں کو روکنا چاہا تھا جس کے نتیجے میں انہیں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ مہابدی نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے محافظوں کے مُردہ جسم دیکھے اور قلعے کی بلند دیواروں پر حسرت زدہ نظر کی۔

”افسوس! میں نے اپنے ہاتھوں سے سب کچھ لٹا دیا۔“



ٹھوڑی دیر میں پنڈت دینا تاحہ کی رہنمائی میں حیدر علی کا ایک فوجی دستہ مندر کے قریب اس مکان تک پہنچا جس کے اندر سے کئی میل لمبی ایک سرگ بنائی گئی تھی۔ اور پھر اس سرگ سے مختلف سمتوں میں کئی سرنگیں نکالی گئی تھیں۔ حیدر علی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تمام سرنگیں بارود سے بھری ہوئی تھیں۔ اگر اس بارود میں بروقت آگ لگا دی جاتی تو والی میسور کے علاوہ سینکڑوں سپاہی لقمہ اجل بن جاتے اور ہزاروں فوجی شدید زخمی ہو کر ہمیشہ کے لئے ہلاک یا ایاچ ہو جاتے۔

ہاؤن ہے جس کا رنگ سب سے الگ اور سب سے نمایاں ہے۔ خدا شہزادے کی عمر دراز کرے۔“

حیدر علی نے فوراً ہی دوسرا خط فاطمہ بیگم کے نام تحریر کر لیا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ٹیپو کے دژن کے برابر چاندی تول کر غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرادی جائے۔

پھر حیدر علی نے تنہائی میں شجاعت خان کا خط پڑھوا کر سنا۔

”سرکار! یہاں کے حالات معمول پر ہیں۔ شہزادے کو اپنی تعلیم اور جنگی تربیت کے سوا دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ شہزادے کے دل میں سرتیا دیوی کے لئے کوئی خاص جذبہ موجود نہیں۔ اس رات کے بعد سے برہمن زادی نے شہزادے کی غلط کا رخ نہیں کیا ہے۔ بس دُور ہی سے ولی عہد سلطنت کو دیکھ لیتی ہے اور چپ چاپ اپنے گھر کی طرف چلی جاتی ہے۔ بظاہر اس طوفان کا زور ٹوٹ چکا ہے مگر سرتیا کے چہرے کی زردی بتاتی ہے کہ وہ طوفان اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے اور اندر ہی اندر دل کی دیواروں کو ہمار کر رہا ہے۔ ویسے یہ بات بڑی عجیب ہے کہ گزشتہ ایک سال سے سرتیا، سید صاحب کی درگاہ میں اس وقت حاضری دیتی ہے، جب شہزادے وہاں موجود نہیں ہوتے۔ میں نے ایک بار اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ سید صاحب سے فارسی زبان سیکھ رہی ہے۔ مجبوراً مجھے برتاؤ پر اعتبار کرنا پڑا۔ اب میرے اندر اتنی جرأت تو نہیں کہ سید صاحب کی بارگاہ میں حاضری دلاں اور ان سے سوال کروں کہ برہمن زادی یہاں کیوں آتی ہے۔“

شجاعت خان کا خط پڑھ کر حیدر علی سناٹے میں آ گیا تھا۔



نواب حیدر علی کو شجاعت خان کی اس اطلاع نے پریشان کر دیا تھا کہ سرتیا دیوی باقاعدگی کے ساتھ سید اکرام بخاری کی درس گاہ میں حاضری دیتی ہے۔ اس سلسلے میں شجاعت خان کا اعتراف بھی بجا تھا کہ وہ سرتیا دیوی کے حوالے سے سید صاحب سے باز پرس کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ شجاعت خان تو کجا خود حیدر علی میں بھی اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ سید صاحب سے اس قسم کا کوئی سوال کر سکتا۔ والی میسور کئی دن تک اس نازک مسئلے پر غور کرتا رہا کہ آخر برہمن زادی نے سید صاحب کی بارگاہ کا رخ کیوں اختیار کیا ہے۔ حیدر علی کے ذہن میں سرتیا کی اس حرکت کا بس ایک ہی مفہوم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ٹیپو سلطان کی قربت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مگر شجاعت خان کی فراہم کردہ اطلاع اس کے برخلاف تھی۔

حیدر علی نے کئی بار اپنے معتمد خاص کا خط پڑھا۔ شجاعت خان نے واضح الفاظ میں تحریر کیا تھا کہ سرتیا دیوی سید صاحب سے فارسی زبان سیکھ رہی ہے اور وہ اسی وقت درس گاہ میں داخل ہوتی ہے، جب ٹیپو سلطان رخصت ہو کر فوجی چھاؤنی چلا جاتا ہے۔

حیدر علی کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس کے علاوہ نواب کو جنوبی ہند کی دوسری زبانوں دکنی

اور اس نے راجہ بدنور کو قتل کرنے کے بجائے ہمیشہ کے لئے حوالہ زنداں کر دیا۔ رانی درگاوتی اور گیانی رام کو قتل کرا کے ان کی لاشیں چوراہے پر لٹکوا دی گئیں اور رعایا کو گم دیا گیا کہ وہ ان دونوں بدکاروں کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔

پھر اسی روز حیدر علی، بدنور کے تخت پر ایک حکمران کی حیثیت سے جلوہ افروز ہوا اور ریاست کا قدیمی نام بدل کر اپنے نام پر ”حیدرنگر“ رکھا۔ اس معرکہ آرائی کے نتیجے میں ایک دست و عریض علاقے کے علاوہ ایک بڑا خزانہ بھی اس کے ہاتھ آیا۔ حیدر علی نے نقد رقم کا شمار کھاتہ خزانے میں بارہ کروڑ کے قریب نفرتی سکے موجود تھے۔ اب وہ مالی حیثیت سے نواب نہیں، کئی شہنشاہ کے برابر تھا۔ حیدر علی نے اس خوشی میں اپنے تمام سپاہیوں میں ڈیڑھ سال کی خواہ بلور انعام تقسیم کی۔

چنڈت دینا تا تھا پر اس قدر انعام و اکرام کی بارش کی کہ غریب برہمن سر سے پاؤں تک بم و زر میں نہا گیا۔ چنڈت پہلے ہی اپنے مذہب سے بیزار ہو چکا تھا، حیدر علی کا یہ برادر اسلحہ دیکھ کر پورے گھرانے کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور ”حیدرنگر“ کے گلی کوچوں میں گھوم کر اپنے سابق ہم مذہبوں کو بتانے لگا کہ اس نے اسلام کیوں قبول کیا۔ دینا تا تھا کی اس تبلیغ کے نتیجے میں ریاست کے سینکڑوں ہندو مسلمان ہو گئے اور ریاست بدنور، جہاں مسلمانوں کی کوئی عبادت گاہ نہیں تھی، وہاں پہلی مسجد دینا تا تھا کی مگرانی میں تعمیر کی جانے لگی۔



حیدر علی نے اپنی فتوحات کی خبر دیتے ہوئے شجاعت خان کے نام خط تحریر کر لیا تھا کہ نئی مصروفیات کے سبب مزید چھ ماہ تک سرنگاپٹم نہیں پہنچ سکے گا۔ مزید یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ٹیپو سلطان کے روز و شب کا حال تفصیل سے لکھے۔

کچھ دن بعد سرنگاپٹم سے دو خط موصول ہوئے۔ ان میں سے ایک خط ٹیپو کا تھا اور دوسرا شجاعت خان کا۔ ٹیپو نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا۔

”بابا محترم کو مسلسل فتوحات مبارک ہوں۔ کاش! میں بھی نواب بہادر کے ساتھ شریک جنگ ہوتا۔ آپ کو یہاں سے گئے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں چند دنوں کے لئے حاضر ہو کر عزت مآب کے دیدار سے شرف یاب ہو جاؤں۔ آپ! سچائی..... ٹیپو۔“

حیدر علی نے بیٹے کا مختصر سا خط سنا تو جوش جذبات میں آبدیدہ ہو گیا۔ پھر اپنے سپہ سالار سے مخاطب ہو کر بولا کہ

”علی رضا خان! تو نے دیکھا کہ میرے بیٹے نے میری کمی کو پورا کر دیا۔ یہ ٹیپو کی نہیں میری اپنی تحریر ہے۔ کیونکہ اس کے قلم کی روشنائی میں میرا خون شامل ہے۔“

”بے شک نواب بہادر!“ میر علی رضا نے انتہائی عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ آپ کا

اور کسری، تامل، مرہٹی اور تنگلو زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ ان تمام زبانوں میں روائی کے ساتھ بات چیت ہی نہیں، طویل تقریریں بھی کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ حیدر فرانسسی زبان میں بھی واجبی گفتگو کر لیا کرتا تھا۔ اس کی فوج میں فرانسیسی سپاہیوں کا بھی دستہ شامل تھا اور اسی وجہ سے نواب کو اس غیر ملکی زبان سے بھی تھوڑی بہت واقفیت حاصل تھی۔ کسری زبان کو سرکاری اور عوامی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ مگر جب حیدر علی نے ریاست میسور کی عنان حکومت سنبھالی تو دیگر احکامات کے ساتھ یہ حکم بھی جاری کیا گیا تھا کہ عوام فارسی زبان سیکھنے کی کوشش کریں۔ اسی حکم کے تحت بہت سے ہندو بھی فارسی زبان سیکھنے مصروف تھے۔

سریتا دیوی نے بھی اسی سرکاری حکم کو بنیاد بنا کر پنڈت موہن داس سے اپنی خواہش اظہار کیا تھا کہ وہ سید اکرام بخاری سے فارسی زبان سیکھنا چاہتی ہے۔ شروع میں پنڈت کی اس خواہش پر بڑی حیرت ہوئی تھی مگر جب سریتا نے یہ دلیل پیش کی کہ وہ اپنے علم اضافہ کرنا چاہتی ہے تو موہن داس نے بہت غور و فکر کے بعد اسے اجازت دے دی۔ اور ایک دن خود سریتا دیوی کو لے کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

سید صاحب نے کسی تکلف کے بغیر انکار کر دیا۔

”پنڈت! تمہاری قوم کے لوگ اس بات کو افسانہ بنا ڈالیں گے کہ ایک ہندو لڑکی ایک مسلمان سے علم حاصل کرتی ہے۔“

”میں اپنی قوم سے پہلے بھی خوف زدہ نہیں ہوا اور آج بھی مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ پنڈت موہن داس نے جرات مندانہ لہجے میں کہا۔ ”میں اپنی بیٹی کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ صرف علم کے لئے پیدا ہوئی ہے اور میں اُس کی اس خواہش کا احترام کرنے کے لئے مجبور ہوں۔“

”سرنگپٹم میں فارسی زبان کے اور بھی کئی عالم ہیں۔“ سید صاحب نے دامن بچایا۔

”تمہارا مقصد کہیں بھی پورا ہو جائے گا۔“

”مگر میں کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔“ پنڈت موہن داس نے صاف صاف کہا۔ ”خود اپنی کے پنڈتوں پر بھی نہیں۔“

”پھر میں کہاں کا فرشتہ ہوں؟“ سید صاحب حسبِ عادت مسکرانے لگے۔

”مگر میں نے آپ کو فرشتہ تسلیم کر لیا ہے۔“ پنڈت موہن داس، سید کی بارگاہ میں خیمہ تھا۔ ”میں اپنی بیٹی کو یہاں اس لئے بھی لے کر آیا ہوں کہ وہ ایک مرد آزاد کو بہت قریب دیکھ سکے، پھر اندازہ ہو سکے کہ حقیقی گیمانی کیا ہوتا ہے اور دودوان (عالم) کسے کہتے ہیں۔“

سید صاحب نے ایک نظر اس تیرہ چودہ سالہ خوب صورت لڑکی کی طرف دیکھا، جس پر زردہ ہو گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ سید صاحب کا دل کھل گیا۔

اور غلط نظر آ رہی تھی۔ آخر سید صاحب نے ایک برہمن زادی کو اپنی درس گاہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔

سریتا ایک غیر معمولی ذہین لڑکی تھی۔ وہ سید صاحب سے بیک وقت فارسی اور عربی زبانیں سیکھ رہی تھی۔ جب اس کا سبق ختم ہو جاتا تو برہمن زادی، سید صاحب سے اسلام کے بارے میں مختلف سوالات کرتی رہتی۔

”آپ کے مذہب میں ایک خدا کے سوا دوسرے دیوتاؤں کا انکار کیوں ہے؟ اسلام بہتر مذہب ہے یا ہندو دھرم؟ اگر مسلمان سچے ہیں تو ہندو جھوٹے ہوں گے۔۔۔۔ اور ہندو سچے ہیں تو ہر مسلمان جھوٹے ٹھہریں گے۔ مگر دونوں اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ایک وقت میں دونوں انسان کس طرح سچے ہو سکتے ہیں؟ کوئی ایک تو یقیناً جھوٹا ہو گا۔ آخر ان میں سے کون سا سچا ہے اور جھوٹا کون؟“

سید اکرام بخاری ایک نوعمر ہندو دوشیزہ کی باتیں سن کر حیران رہ جاتے۔ پھر اس احتیاط کے ساتھ مذہب اسلام کی تشریح کرتے کہ سریتا دیوی کے عقائد پر کوئی ضرب نہ پڑے۔

سید صاحب اکثر اس موضوع پر سوچا کرتے کہ آخر ایک ہندو لڑکی کو اسلام کے بارے میں اس قدر جنس کیوں ہے؟ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے کہ سریتا کے گھرانے پر نواب خاندان کے بے شمار احسانات ہیں۔ حیدر علی نے اس کے باپ، موہن داس کو گوشہ گنہاری سے نال کر بڑے پجاری کے منصب تک پہنچایا ہے۔ اور بیگمات نے ایک بے ماں کی بچی کو بے پناہ محبت دی ہے۔ شاید اسی تاثر کے سبب وہ مذہب اسلام کی حقیقت جاننا چاہتی ہے۔ اب سید صاحب کو یہ بات کون بتاتا کہ شیخ سلطان کی محبت اور اس کا ایک رکی سا جملہ ہر وقت سریتا کے دل و دماغ میں طوفان اٹھاتا رہتا ہے۔ شیخ نے لڑکپن کی معصومیت کے زیر اثر سوچے سمجھے بغیر برہمن زادی کے سامنے اپنے باپ حیدر علی کا یہ جملہ دہرایا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور سریتا ایک ہندو لڑکی ہے۔ اس لئے دونوں ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اسی دن سے وہ محبت کی ماری دوشیزہ، مذہب اسلام کی حقیقت جاننے کے لئے بے چین رہنے لگی تھی۔ اور پھر یہی اضطراب اُسے سید صاحب کی بارگاہ تک لے گیا تھا۔

سریتا کا عشق عجیب عشق تھا۔ وہ شیخ کی ذات سے وابستہ ہر چیز سے محبت کرتی تھی۔ شیخ عقیدت مسلمان تھا، اس لئے سریتا بھی اسلام کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ سید صاحب، کرنا کہ مذہب عشق کی وارفتگی سے بے خبر اسے درس دیتے رہتے اور آخر میں یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دیتے۔

”اگر اس کائنات کے مالک نے تمہارے ذہن کو کشادہ کر دیا اور ہدایت کی راہیں کھول دیں تو ایک دن تم خود ہی سمجھ جاؤ گی کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔“

سریتا، سید صاحب کی ایک ایک بات کو بہت غور سے سنتی۔ اس نے ایک سال کے مختصر



”ججے کیا دکھ پہنچا ہے لوٹڈی بیچے!“ حیدر علی نے آنے والے نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نواب حیدر علی کا یہ خاص طرز کلام تھا کہ وہ جب بھی کسی کو آواز دیتا تو لوٹڈی بیچے کہہ کر پکارتا۔ عام ملازم تو نواب کے اس انداز گفتگو کو کسی جبر و اکراہ کے بغیر برداشت کر لیتے لیکن معزین مملکت، امراء اور اعلیٰ افسران کے چہروں کا رنگ بدل جاتا اور وہ انتہائی اذیت میں مبتلا ہو جاتے۔ سرداران قوم نے کئی بار آپس میں مشورے کئے کہ وہ نواب کے اس تحقیر آمیز طرز مخاطب کے خلاف احتجاج کریں مگر ہر مرتبہ حیدر کے رعب و جلال کے سبب ان کی آوازیں ان کے سینوں ہی میں گھٹ کر رہ گئیں۔ آخر ان سب نے مل کر فراست علی بیگ کو اس بات کے لئے آمادہ کیا کہ وہ کسی مناسب موقع پر نواب بہادر کی توجہ اس طرف مبذول کرائے اور والی میسور کو احساس دلانے کا ان کی یہ طرز گفتار شرفاء کی دل آزاری کا سبب بن جاتی ہے۔

فراست علی بیگ، نواب کا بہت منہ چڑھا مصاحب تھا۔ حیدر علی اکثر اس کی گستاخانہ ٹوئیں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امراء سلطنت نے فراست علی بیگ کا ہمارے کر اپنا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایک دن بھرے دربار میں حیدر علی نے میر علی رضا خان کو ”لوٹڈی بیچے“ کہہ کر مخاطب کیا تو شدت کرب سے سالار میسور کا سرخ و سفید چہرہ دھواں ہو گیا۔ نواب کا مصاحب خاص فراست علی بیگ اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ حیدر علی کی بات مکمل ہوتے ہی وہ اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور نہایت عاجزانہ انداز میں عرض کرنے لگا۔

”حضور! بادشاہوں کو یہ الفاظ زیب نہیں دیتے۔“

فراست علی بیگ کی اس جرأت پر تمام درباری حیران رہ گئے تھے۔ ان کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں اور وہ پھرائی ہوئی آنکھوں سے حیدر علی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اہل دربار کا خیال تھا کہ نواب کی آتش جلال بھڑک اٹھے گی اور فراست علی بیگ ہمیشہ کے لئے مقرب قرار دے دیا جائے گا۔ مگر اس وقت حاضرین کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب حیدر علی مسکراتے ہوئے بڑے شگفتہ انداز میں اپنے مصاحب خاص سے کہنے لگا۔

”ٹو مجھ سے کس بات کی شکایت کر رہا ہے لوٹڈی بیچے!“ نواب حیدر علی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ ”کیا تجھے آج تک اس بات کی خبر نہیں ہوئی کہ میں خود بھی لوٹڈی بیچے ہوں؟“

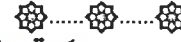
نواب کا اپنی ذات کے بارے میں یہ اعتراف سن کر اہل دربار کو سکتہ سا ہو گیا تھا اور انہیں اپنی ساعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیداری کی حالت میں والی میسور کی گفتگو سن رہے ہیں یا مجرگوں کی خواب دیکھ رہے ہیں۔

”مگر نواب، حیدر علی کی حیثیت ہی کیا ہے؟ دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ بھی لوٹڈی کے

سے عرصے میں اسلامی عقائد، تہذیب اور تمدن کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کر لیا کہ ایک عام مسلمان بھی ان موضوعات پر اس سے گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

حیدر علی محض اپنے شک کی بنیاد پر اس راز تک پہنچ گیا تھا کہ سریتانے نیپو ہی کی وجہ سے سید اکرام بخاری تک رسائی حاصل کی ہے۔ مگر شجاعت خان کی ارسال کردہ اطلاعات باعث اس کا شبہ حقیقت کا رنگ اختیار نہ کر سکا اور وہ مطمئن ہو کر حکومت کے کاموں پر مصروف ہو گیا۔ تاہم اس نے مزید احتیاط اور پیش بندی کے طور پر شجاعت خان کے جواب دیتے ہوئے لکھا۔

”حیدر نگر کے انتظامات کے سلسلے میں ابھی یہاں میرا قیام بہت ضروری ہے۔ تم ولایت سلطنت کی کارگزاری کا جائزہ لیتے رہو اور ساتھ ہی ساتھ اس لڑکی پر بھی نظر رکھو۔ میں نے زندگی میں کچھ ایسے سیلاب بھی دیکھے ہیں جن کے دور تک آثار نہیں ہوتے۔ بستی والے سے گہری نیند سوتے رہتے ہیں..... اور ان کی آنکھ اس وقت کھلتی ہے جب سیلاب گہرا داخل ہو کر سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔“



حیدر نگر پر والی میسور کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ لیکن پرتگیزیوں کی طرف سے انگریزی کا خطرہ بدستور قائم تھا۔ پرتگیزی گوا سے نکل کر سابقہ ریاست بندور کے کئی اہم علاقوں قابض ہو گئے تھے۔ حیدر علی نے کچھ دن تک پرتگیزیوں سے مراسلت جاری رکھی اور سمجھانے کی کوشش کی کہ اب یہ ریاست اس کے زیر انتظام ہے۔ اس لئے وہ چپ چاپ علاقے کی طرف لوٹ جائیں۔ مگر پرتگیزیوں پر حیدر علی کے اس صلح پسندانہ رویے کا کمال نہیں ہوا۔ آخر والی میسور نے گوالیار پر حملہ کر دیا اور اس تیز رفتاری سے آگے بڑھا کہ تک پہنچ گیا۔ حیدر علی کے اس اقدام کے سبب گوا کی آزادی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ پرتگیزیوں نے گھنے ٹیک دیئے اور ”کاردار“ کا پورا علاقہ والی میسور کے حوالے کر دیا۔ پرتگیزیوں کے فتنے سے نجات پانے کے بعد نواب نے ”حیدر نگر“ میں کسکال قائم اپنے نام کا سکہ ضرب کرایا۔ اس کے ساتھ ہی ریاست میں نئی تعمیرات کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ والی میسور ”حیدر نگر“ کو خوب صورت ترین شہر بنانا چاہتا تھا۔

اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ جس کی وجہ سے حیدر علی کو فوری طور پر واپس آنا پڑا۔ ایک دن وہ حیدر نگر کے دربار میں موجود تھا کہ قلعے کے پہرے دار نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”ایک شگفتہ حال فریادی بہت دور سے آیا ہے اور نواب بہادر کے میں باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔“

حیدر علی نے کسی تاخیر کے بغیر فریادی کو سر دربار طلب کر لیا۔ وہ ایک جوان سال تھا جس کا لباس گردوغبار میں اٹا ہوا تھا اور چہرے پر شدید تھکن اور نقابت کے آثار نمایاں تھے۔

ہوئیں کہ اب کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے میرا عہد اور میرا حلف مجھے واپس کر دیجئے۔ میں اپنی حسرت ناکام کی لاش اٹھائے ہوئے دہلی واپس چلا جاؤں گا۔“

حیدر علی، اسد برلاس کی گفتگو سن کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک سزاوارہ سالہ نوجوان کے سینے میں مذہب اور قوم پرستی کا ایسا سمندر موجزن ہو گا۔

”اٹو اپنا عہد کیوں توڑنا چاہتا ہے؟“ حیدر علی نے مشفقانہ لہجے میں سوال کیا۔ ”اور اگر تجھے عہد ہی توڑنا تھا تو پھر مجھے بتائے بغیر دہلی چلا گیا ہوتا۔“

”میں مغلوں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں نواب بہادر!“ اسد برلاس کے لفظوں سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔ ”قلعہ معلیٰ کا عیش و آرام تو آپ ہی کی خاطر چھوڑا تھا۔ پھر آپ کو اطلاع دیے بغیر کیسے چلا جاتا؟“

”تیرے خواب کس لئے بکھرے اور تیری آنکھیں کیوں زخمی ہوئیں نوجوان؟“ حیدر علی، منزل نوجوان اسد بیگ سے بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا۔

”میری پشت پر کوڑوں کے تین گہرے نشانات موجود ہیں نواب بہادر!“ یکایک اسد بیگ کا دلش چہرہ شدت کرب سے دھواں ہو گیا تھا۔ ”اور یہ کوڑے مجھ پر شہزادہ ٹیپو سلطان نے برمائے ہیں۔ اگر گناہ گار ہوتا تو موت کی سزا پر بھی اُف نہ کرتا۔ لیکن قلق تو یہی ہے کہ مجھے بے جرم و خطا مارا گیا ہے، ہزاروں انسانوں کے سامنے۔“ یہ کہتے کہتے اسد بیگ کی پلکیں بھیک گئی تھیں۔

یہ انکشاف سن کر حیدر علی کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور چند لمحوں کے لئے آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ پھر وہ اس طرح بولا جیسے اس کی آواز بہت دور سے آرہی ہو۔ ”میرے بیٹے، ٹیپو نے یہ حرکت کی؟ مجھے یقین نہیں آتا۔“

”اگر ان کے ہونٹوں پر جبر کی مہریں نہ لگائی جاتیں ہوں تو پھر سرنگاپٹم میں اس واقعے کے ہزاروں گواہ موجود ہیں۔“ اسد بیگ کے لہجے میں اعتماد بھی تھا اور بے باکی بھی۔ ”جب میسور والے بھی اقتدار کے نشے میں مست ہیں تو پھر میں غریب الوطنی کے آزار کیوں جھیلوں؟ دہلی میں بھی تو یہی ہو رہا ہے۔ نفس پرستی وہاں بھی ہے اور یہاں بھی۔ عدل و انصاف کا خون وہاں بھی شور مچا رہا ہے اور یہاں بھی۔ پھر دونوں میں کیا فرق ہے؟ اسی لئے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اہل شہر مجھ سے واپسی کا سبب پوچھیں گے تو کہہ دوں گا کہ سرزمین ہند پر ہر جگہ اہل اسلام مر چکے ہیں۔ بس ان کی لاشیں اٹھائی جانا باقی ہیں۔“ اسد بیگ کی آنکھوں سے بننے والے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آ گئی تھی۔

منزل نوجوان کی گفتگو سن کر حیدر علی تڑپ اٹھا تھا۔

”اگر یہ سچ ہے تو پھر ٹیپو نے تجھ پر مشق ستم نہیں کی بلکہ اپنے باپ کی پشت پر کوڑے مارے ہیں۔“ اچانک نواب کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ ”میں تجھے انصاف کے بغیر دہلی نہیں

سوا کچھ نہیں۔“ یہ کہتے کہتے والی میسور اپنی کرسی زرنگار پر کھڑا ہو گیا تھا اور پورے دربار میں اس کی بارعب آواز گونج رہی تھی۔ ”ہم سب لوٹنی بیچے ہیں۔ بی بی بچے تو صرف وہی ہیں، جن کا اسم گرامی حسینؑ ہے۔ اور بی بی بھی بس ایک ہی ہیں جن کا نام نامی حضرت فاطمہ الزہراءؑ ہے۔“

جوش عقیدت میں نواب کا سر جھک گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ حیدر علی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت سے مثالی محبت تھی۔ اور اسی محبت میں اس نے زندگی بھر نہ صرف اہل دنیا کو بلکہ اپنے آپ کو بھی لوٹنی بچہ کہہ کر پکارا۔ اس واقعے کے بعد کی وزیر یا امیر کو اس سلسلے میں حیدر علی سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ آج ایک بار پھر ”حیدر“

تکر کے دربار میں والی میسور نے اجنبی فریادی کو لوٹنی بچہ کہہ کر پکارا تھا۔

”جو کچھ تجھے کہنا ہے، بے خوف و خطر کہہ دے۔ تیرے ساتھ پورا انصاف کیا جائے گا۔“

”نواب بہادر! اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے شدید دکھ پہنچا ہے۔ مگر میں اہل دربار کے سامنے فریاد نہیں کر سکتا۔“ اجنبی کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ ”میری فریاد سننے کے لئے تنہائی کی شرط ضروری ہے۔ اگر عزت تاب یہ شرط پوری نہیں کر سکتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔“

حیدر علی، اجنبی کی جرات و بے باکی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر اپنے ایک خدمت گار کو کم دیتے ہوئے بولا۔

”دربار برخواست ہونے تک فریادی کو ہماری نشست گاہ خاص میں ٹھہرایا جائے۔ اس کے لئے نئے لباس اور کھانے کا انتظام کیا جائے۔“

معمول کی درباری کارروائی سے فارغ ہو کر حیدر علی اپنے اس کمرے میں پہنچا جہاں خاص لوگوں سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ والی میسور نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اجنبی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا حلیہ بدل چکا تھا مگر چہرے سے اذیت و کرب کے آثار نمایاں تھے۔

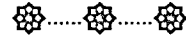
”اب بتا کہ تجھ پر کیا گزری ہے؟“ حیدر علی نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟“

”میں آپ کی فوج کا ایک سپاہی ہوں۔“ والی میسور کے سامنے اجنبی دست بستہ کھڑا اور کسی جھجک کے بغیر اپنی روداد بیان کر رہا تھا۔ ”میرا نام اسد برلاس ہے اور میں مغل قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔ دہلی یوں چھوڑ دی کہ مغل شہنشاہ شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ حیثیت رکھتا۔ آپ کی جرات و مردانگی کے بہت قصے سنے تھے اس لئے سرنگاپٹم چلا آیا اور فوجی ملازمت اختیار کر لی۔ سوچا تھا کہ آپ ہندوستان میں اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لے آئیں گے۔ ان

لئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے وفاداری اور جہاں غاری کا حلف اٹھایا۔“ اسد برلاس انتہائی باوقار لہجے میں بول رہا تھا۔ ”مگر ایک ماہ پہلے میرا خواب بکھر گیا اور آنکھیں اس قدر دنی

جانے دوں گا۔ ابھی یہاں کچھ لوگ زندہ ہیں۔ جب ہمارے جنازے اٹھ جائیں تو پھر دہلی کے گلی کوچوں میں منادی کر دینا کہ سرزمین ہند سے اہل اسلام بھی اٹھ گئے۔“

اس کے بعد حیدر علی نے میر علی رضا خان کو ”حیدر نگر“ کا قلعہ دار مقرر کیا اور خود اسد بیک اپنے ہمراہ لے کر برق رفتاری کے ساتھ سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو گیا۔



نواب حیدر علی کسی اطلاع کے بغیر سرنگاپٹم پہنچا تھا۔ والی میسور کی آمد کی خبر نہ دارالحکومت میں پہنچ سکی تھی۔ تمام اراکین سلطنت حیرت و پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ حیدر علی سیدھا اپنی والدہ مجیدہ بیگم کی خدمت میں پہنچا اور سر جھکا کھڑا ہو گیا۔ ماں نے حسب عادت پہلے بیٹے کو گلے سے لگایا، سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دے لگیں اور پھر یکایک چونک اٹھیں۔

”بیٹے! تم چہرے سے کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ پہلے تو کبھی اس طرح ماں کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔“

حیدر علی جبراً مسکرایا۔ ”ام محترم! طویل سفر نے تھکا دیا ہے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔“

نواب نے جان بوجھ کر حقیقت حال کو چھپایا کہ کہیں مجیدہ بیگم انصاف کے راستے کی دیوانہ نہ جائیں۔ حیدر علی کبھی اپنی ماں کا حکم نہیں ٹالتا تھا۔ اس لئے اسے اندیشہ تھا کہ کہیں مجیدہ بیگم کی محبت میں مجبور ہو کر اس کے ارادوں کو زنجیر نہ پہنا دیں۔ نتیجتاً نواب نے مصلحت پسندی کا کام لیا اور اپنی بیوی سے رسمی گفتگو کرنے کے بعد فوجی چھاؤنی چلا گیا۔ مغل نوجوان اسد بیک بھی اس کے ساتھ تھا۔

چھاؤنی میں زلزلہ سا آ گیا۔ نہ جشن فتح، نہ استقبال، نہ کوئی اعلان، نہ کوئی جلوس۔ کچھ پُر اسرار آمد تھی۔ ہر سپاہی کی صورت ایک سوال بن کر رہ گئی تھی۔

شجاعت خان، حیدر علی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ ”سرکار! آپ کسی اطلاع کے بغیر؟“

”جب ریاست کے منتظمین اپنے فرائض سے غافل ہو کر بندگان خدا کے حقوق کا خون ڈالیں تو پھر سربراہ کو ہی اپنی مملکت میں کسی جاسوس کی طرح داخل ہونا پڑتا ہے۔“

”میں سمجھ نہیں سکا سرکار!“ شجاعت خان کا چہرہ فق ہو گیا اور حیرت کی زبانی سے اس کا آنکھوں میں عجیب عجیب رنگ ابھر کر ڈوبنے لگے۔

”چپ ہو جا، لوٹری بچے!“ حیدر علی نے اپنے معتمد خاص کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”ٹیپو کوڑا ہماری خدمت میں پیش کر۔“

جب شجاعت خان اُداس چہرے اور تھکے قدموں کے ساتھ والی میسور کے کمرے سے نکل کر جانے لگا تو حیدر علی نے پکار کر کہا۔ ”سید صاحب کی خدمت میں میرا سلام پیش کر دینا۔“

عرض کرنا کہ ایک خاص مقدمے میں ان کی گواہی درکار ہے۔“

شجاعت خان نے گھبرا کر حیدر علی کی طرف دیکھا مگر اسے دوسرے ہی لمحے اپنا زاویہ بدل دیا۔ والی میسور کے چہرے پر غیظ و غضب کی آگ بھڑک رہی تھی۔

شجاعت خان کے جاتے ہی حیدر علی نے اسد بیک کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا اور انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

”نوجوان! اب بتا کہ ٹیپو نے تیری پشت پر کوڑے کیوں مارے تھے؟“

”میں خود کو ایک اچھا شہسوار سمجھتا ہوں۔ اس لئے سالانہ گھڑ دوڑ کے مقابلے میں شریک ہوا تھا۔“ اسد بیک نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ”میری شدید خواہش تھی کہ یہ مقابلہ جیتوں مگر میسور کے شہزادے کو میری فتح گوارا نہیں تھی۔ جب میرا گھوڑا، ٹیپو سلطان کے گھوڑے سے آگے نکلا تو یک بیک دلی عہد سلطنت کے ہاتھ کو جنبش ہوئی۔ پھر گھوڑے کے جسم پر پڑنے والا چابک میری پشت پر برسنے لگا۔ میں نے دو چابک برداشت کر لئے اور مقابلہ جاری رکھا۔ مگر نیرے چابک نے میری پیٹھ پر تیسرا نشان بنا دیا تو میں نے اپنے گھوڑے کی لگا میں کھینچ لیں اور مقابلے میں شریک ہونے والے شہسواروں کی صف سے نکل کر میدان کے ایک گوشے میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک مقابلہ جاری رہا۔ بالآخر ٹیپو سلطان فاتح قرار پائے۔ بلاشبہ وہ بہت اچھے شہسوار ہیں مگر میرے ہنر اور حوصلے کو زنجیر کیوں پہنائی گئی؟ کاش! کھلی فضا میں امتحان ہوتا۔ مگر امتحان لینے والے سب کے سب جانبدار تھے۔ ساری دنیا شہزادے کو فتح کی مبارکباد دیتی رہی لیکن کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تیری پشت خون سے رنگین کیوں ہے؟ بس اسی لمحے میرے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ پھر ان کے بہتے ہوئے لبو سے میری آنکھیں چپکے لگیں اور سارے منظر دھواں ہو گئے۔“

حیدر علی جو آفات و مصائب کے ہجوم میں مسکراتا رہتا تھا، اس وقت اس کے چہرے پر بجرمانہ اُداسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ شدید اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا اور بار بار اس کی زبان سے ایک ہی جملہ ادا ہو رہا تھا۔

”تیرا فیصلہ درست تھا نوجوان! کوئی بھی غیرت مند انسان اس فضا میں سانس نہیں لے سکتا۔ مگر میں تجھے اتنی بڑی بدگمانی کے ساتھ یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔“



پھر جب خدمت گار نے سید اکرام بخاری کے آنے کی اطلاع دی تو حیدر علی دیوانہ وار اپنے کمرے سے نکلا۔ سید صاحب کے عقب میں ٹیپو سلطان اور شجاعت خان بھی موجود تھے۔ والی میسور نے فوجی انداز میں سید صاحب کو سلام کیا پھر احتراماً نصف قد تک جھک گیا۔ سید صاحب نے اپنی روایتی محبت کے ساتھ حیدر علی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تجھ پر ہمیشہ اللہ کی رحمت سایہ لگن رہے۔“

حیدر علی سیدھا ہوا تو ٹیپو سلطان نے چند قدم آگے بڑھ کر باپ کی خدمت میں ایک سپاہی

”اسی میدان میں، ہزاروں انسانوں کے سامنے یہ نوجوان تہاری پشت پر تین دڑے مارے گا۔ بس یہی انصاف ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“ والی میسور نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

ابھی حیدر علی کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ مثل نوجوان اسد بیگ پکار اٹھا۔  
 ”بس نواب بہادر!..... انصاف ہو چکا۔ میں نے شہزادے ٹیپو کو معاف کر دیا۔ اب ان کی طرف میرا کوئی حساب نہیں ہے۔“

”تیرے معاف کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“ حیدر علی نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ ”انصاف کے اپنے تقاضے ہیں، جنہیں بہر حال پورا ہونا ہے۔“

”آپ مدعی کی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے نواب بہادر!“ اسد بیگ بڑی جرأت و استقامت کے ساتھ بول رہا تھا۔ ”اللہ نے قتل جیسے سنگین جرم میں بھی مدعی کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو جان کے بدلے جان طلب کرے یا خون بہا لے کر مجرم کو معاف کر دے۔ پھر یہ تو ایک عام سا جرم ہے۔ ایسے کھیل تو نوابوں اور شاہوں کی مملکت میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ مگر آج اندازہ ہوا کہ حکومت میسور کوئی تماشہ گاہ نہیں۔ وہاں عدالت بھی ہے اور منصف بھی۔ میں نواب حیدر علی خان بہادر کی عظمتوں کو سلام کرتا ہوں اور شہزادے ٹیپو کو بھی کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔“

ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان نے والی میسور کو حیران کر دیا تھا۔ اتنی نوعمری میں اس قدر تحمل، تدبیر اور وقار؟..... حیدر علی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی مملکت میں ایک ایسا سپاہی بھی موجود ہے۔

”نوجوان! تُو نے مجھے شکست دے دی۔“ حیدر علی کے لہجے میں اسد بیگ کے لئے احترام بھی تھا اور محبت تھی۔

”آپ فاتح ہیں نواب بہادر! اور فاتح ہی رہیں گے۔“ یہ کہتے کہتے اسد بیگ نے عقیدتاً کرچکا لیا تھا۔ ”آپ نے میرے دل کو فتح کر لیا۔ اور یہی بڑی فتح ہے۔“

”تیرا شکریہ نوجوان! مگر میرا انصاف ابھی باقی ہے۔“ یہ کہہ کر حیدر علی نے تمام سپاہیوں کو فنی چھاؤنی کے میدان میں جمع ہونے کا حکم دیا۔

سید اکرام بخاری، اسد بیگ اور شجاعت خان حیران نظروں سے حیدر علی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر والی میسور کیا چاہتا ہے۔



تھوڑی ہی دیر میں پورا میدان سپاہیوں سے بھر گیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے نقیب کھڑے کر دیئے گئے تاکہ وہ نواب کا پیغام آخری سپاہی تک پہنچا دیں۔ جب سارے انتظامات مکمل ہو گئے تو حیدر علی اپنے فوجیوں سے مخاطب ہوا۔

”آج میں تمہیں یہ منظر دکھانا چاہتا ہوں کہ میری مملکت میں کوئی شخص بھی قانون سے

کی حیثیت سے فوجی سلام پیش کیا۔ حیدر علی نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور منہ پھیر کر سید صاحب سے مخاطب ہوا۔

”میں ہرگز آپ کو زحمت نہ دیتا۔ مگر اس مقدمے کا فیصلہ آپ کی گواہی کے بغیر ممکن بھی تو نہیں۔“ یہ کہہ کر حیدر علی نے سید صاحب سے کمرے کے اندر تشریف لے چلنے کی درخواست کی۔ سید صاحب کے پیچھے والی میسور، پھر سلطان ٹیپو، پھر شجاعت خان کمرے میں داخل ہوئے۔ اسد بیگ نے ایک بزرگ کو سامنے پا کر ادب سے سلام کیا۔ ٹیپو سلطان نے مثل نوجوان کو دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ شجاعت خان بھی بدحواس نظر آنے لگا۔

سید صاحب کرسی پر تشریف فرما ہوئے تو نواب حیدر علی بھی برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹیپو سلطان کو اسد بیگ کے قریب کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ پھر اسد بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید اکرام بخاری سے مخاطب ہوا۔

”یہی وہ مدعی ہے، جس نے آپ کے شاگرد ٹیپو کے خلاف میری عدالت میں دعویٰ دائر کیا ہے۔“

سید صاحب نے بہت غور سے اسد بیگ کی طرف دیکھا اور بہت آہستہ لہجے میں فرمانے لگے۔ ”نوجوان! آخر ٹیپو نے کیا جرم کیا ہے؟“

اسد بیگ نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی تفصیلات بیان کیں تو سید صاحب کا روشن چہرہ بگھ کر رہ گیا۔

”فرزند! تم نے مجھے بہت مایوس کیا۔“ سید صاحب کی آواز میں بڑی خلش تھی۔ ”یہ کیا ظلم ہے اور کیسی ناانصافی ہے؟ میں نے تو آج تک تمہیں ایسا کوئی سبق نہیں دیا۔“

ٹیپو اس قدر غیر متدبر اور حساس لڑکا تھا کہ اپنے استاد کے الفاظ کا ہلکا سا نشتر برداشت نہ کر سکا اور بے اختیار رونے لگا۔

”وہ میری اضطرابی غلطی تھی، جس پر بعد میں مجھے شدید ندامت محسوس ہوئی۔ اس نوجوان کو میں نے بہت تلاش کیا تاکہ اس سے معافی مانگ کر اپنے جرم کی تلافی کر سکوں۔ مگر میں اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ شخص نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔“

”کھو نہیں گیا تھا۔“ حیدر علی نے انتہائی تند و تیز لہجے میں ولی عہد سلطنت کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے جبر و ستم کے خلاف احتجاج کرنے میرے پاس حیدر مگر گیا تھا۔“

”بابا محترم! میں اپنی اس غلطی پر بہت نادم ہوں۔“ ٹیپو کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آ گئی تھی۔ ”میں نے اپنے استاد گرامی کو بھی آزار پہنچایا، آپ کو بھی اور اس نوجوان کو بھی۔“

”ندامت اور معافی سے کام نہیں چلے گا فرزند!“ حیدر علی کا لہجہ بدستور غضب ناک تھا۔

”آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان..... اور زخم کے بدلے زخم۔“

ٹیپو بدحواس ہو کر باپ کی طرف دیکھنے لگا۔



مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم بھی بیٹے کے قریب کھڑی چپ چاپ رو رہی تھیں۔  
 ”خود ہی زخم دیتا ہے اور خود ہی مرہم لگاتا ہے۔“ پوتے کی پشت پر جما ہوا خون دیکھ کر  
 مجیدہ بیگم خاموش نہ رہ سکیں۔ ”سزا دیتے وقت تیرا دل نہیں تڑپا، اب آنسو بہا رہا ہے؟“ مجیدہ  
 بیگم کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

”اُم محترم!“ حیدر علی نے پلٹ کر اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔ ”سزا اسے نواب بہادر نے  
 دی تھی، جو سربراہ مملکت ہے..... اور رو رہا ہے حیدر علی جو اس وقت باپ ہے، اور صرف باپ۔“  
 تھوڑی ہی دیر میں سریتا بھی وہاں پہنچ گئی اور شیخو کے زخموں کو دیکھ کر بے اختیار رونے لگی۔  
 ”لوکی! تجھے یہاں آنے کی اجازت کس نے دی؟“ حیدر علی نے غضب ناک لہجے میں  
 برہنہ زادی سے سوال کیا۔ وہ انتہائی کوشش کے باوجود اپنی نفرت کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔  
 سریتا دیوی کو سکتہ سا ہو گیا۔ چند لمحوں تک وہ کسی بت کی طرح ساکت کھڑی رہی۔ پھر وہ  
 لڑکھائی زبان کے ساتھ بمشکل اپنا مدعا بیان کر سکی۔

”مہاراج! کیا میں اس گھر کی فرد نہیں ہوں؟ اور کیا مجھے کنور کے دکھوں میں شریک ہونے  
 کا کوئی حق نہیں ہے؟“ سریتا کے لفظوں میں دل کا درد شامل تھا۔ ”اس سے پہلے تو مجھے اجازت  
 لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پھر آج یہ تبدیلی کیوں؟ کیا آج مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا  
 ہے مہاراج؟“ سریتا کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔  
 ”اب اس گھر سے تیرا کوئی تعلق نہیں۔“ حیدر علی نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا  
 تھا اور وہ ایک لمحہ مضائقے بغیر شیخو اور سریتا کے درمیان ہمیشہ کے لئے ایک آہنی دیوار کھینچ دینا  
 چاہتا تھا۔ ”آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ ہم سے تیرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“  
 سریتا کچھ دیر کے لئے خاموش کھڑی رہی مگر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر حیدر علی کو  
 محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے برہنہ زادی کی روح پگھل رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں  
 کو جنبش ہوئی۔

”اتنی محبت دی کیوں تھی کہ آج بھکاری کی طرح ٹھکرا دیا؟..... شاہوں کے کھیل بھی عجیب  
 ہوتے ہیں۔ خوش ہوئے تو مسند وزارت بخش دی۔ ناراض ہوئے تو پس دیوار زنداں ڈال دیا یا  
 اس کے خنم سے منتقل سجا دیا۔“

نواب حیدر علی، سریتا کی گفتگو سن کر حیران رہ گیا۔ ڈیڑھ سال کے مختصر سے عرصے میں وہ  
 بہت بدل گئی تھی۔ شاید یہ سید صاحب کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا  
 تھا کہ دوبارہ سریتا کی آواز اُبھرے۔

”میں جا رہی ہوں مہاراج! مگر اس گھرانے سے میرا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ آپ تاج و  
 تخت والے ہیں، اس لئے رشتوں کے توڑنے پر پورا اختیار رکھتے ہیں۔ مگر ہم اہل دل اور  
 غریب لوگ ہیں۔ اگر رشتہ توڑنا بھی چاہیں تو نہیں توڑ سکتے۔“ یہ کہہ کر سریتا دیوی چند قدم آگے

بالا تر نہیں ہے۔ یہ میرا بیٹا شیخو سلطان ہے جس سے ایک جرم سرزد ہوا اور آج اسے سرعام سزا دی  
 جا رہی ہے۔“

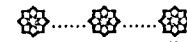
نقیبوں کی آوازیں دور تک گونجتی چلی گئیں۔ پھر شیخو سلطان کے جرم کی مکمل روداد بیان کی  
 گئی۔ اس کے بعد حیدر علی نے اپنے ہاتھوں سے دلی عہد سلطنت کی پیٹھ پر تین کوڑے لگائے۔  
 یہ تازیانے اتنی طاقت سے مارے گئے کہ شیخو کی پشت پر نشانات اُبھر آئے۔ اور وہ نشانات، اس  
 بیگ کے جسم پر ابھرے ہوئے نشانات سے مختلف نہیں تھے۔ تیرہ سالہ شیخو کے منہ سے ہلکی سی چیخ  
 بھی نہیں نکلی مگر تکلیف برداشت کرتے کرتے اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور پورا بدن پسینے میں نہا  
 گیا تھا۔

فوجی چھاؤنی کے میدان پر قبرستان جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سزا کی تکمیل کے بعد تمام سپاہی  
 اپنی اپنی بیرکوں کی طرف واپس جانے لگے اور بہت دیر تک صرف نقیبوں کی آوازیں گونجتی  
 رہیں۔

”انصاف..... انصاف اور صرف انصاف۔“

”شیخو! آج تمہاری تربیت مکمل ہو گئی۔“ سید صاحب بڑے عجیب لہجے میں اپنے شاگرد  
 سے مخاطب تھے۔ ”اگر تم نے اس انصاف کو دل سے قبول کیا تو نجات پا جاؤ گے ورنہ ساری  
 زندگی جھکتے رہو گے اور پھر یوم حساب سر پر پہنچے گا۔ تم نے دیکھا کہ میں بھی مجبور تھا اور تمہارا  
 باپ بھی۔ نہ وہ تمہیں سزا سے بچا سکا اور نہ میں۔ اسی میدان کی طرح حشر کے میدان میں بھی  
 لوگ جمع ہوں گے اور وہاں بھی تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا، سوائے اللہ کی رحمت کے۔“  
 ”اب میرے دل میں کوئی غلش نہیں استرا کرے گی!“ شیخو کا لہجہ پُر سکون تھا۔ ”اس سزا کے  
 بعد مجھ پر کسی کا قرض باقی نہیں رہا۔ مگر پھر بھی اسد بیگ کا مقروض ہوں کہ اس نے مجھے کھلے دل  
 سے معاف کر دیا تھا۔“

”اسد بیگ سے بھی اپنا حساب صاف کر لو۔ اسے حکومت دینا۔ بڑا عجیب نوجوان ہے۔“  
 یہ کہہ کر سید صاحب پیادہ پا ہی اپنی درس گاہ کی طرف جانے لگے۔ حیدر علی نے بہت اصرار کے  
 ساتھ سواری پیش کی مگر سید صاحب نے انکار کر دیا۔



پورے شہر میں یہ خبر عام ہو چکی تھی اور سرنگا پٹم کے درو دیوار پر درشت آمیز سکوت طاری  
 تھا۔ راج محل کے کمین آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے کہ کیا نواب  
 بہادر، اولاد کا جرم بھی معاف نہیں کر سکتے؟

اور نواب حیدر علی ایک کمرے میں شیخو سلطان کے زخموں پر مرہم لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔  
 ”جان پدرا! تمہارے آئینہ جیسے جسم پر غلاظت لگ گئی تھی، میں نے اسے صاف کر دیا۔“  
 والی میسور کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”مجھ سے میرے احکام کی تفصیل مت پوچھ! غیرت مند انسان ہے، پریشان ہو جائے گا۔“  
اس نے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس پر خاموشی سے غل کر۔ وقت بہت کم ہے۔“  
پنڈت موہن داس، راج محل سے باہر نکلا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔



سریتا اسی روز اپنے کچے مکان میں منتقل ہو گئی مگر جاتے جاتے والی میسور سے اتنا ضرور کہہ گئی۔  
”مہاراج! آسمان تک کے فاصلے بھی میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔“

برالونگ اور گہرا اشارہ تھا۔ نواب حیدر علی ایک پندرہ سالہ لڑکی کے دعوے کا جواب نہ دے سکا مگر دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔  
حیدر علی کے اشارے پر کئی معزز برہمنوں نے سریتا دیوی کے لئے اپنے لڑکوں کے رشتے بھیجے۔ مگر سریتا نے انکار کر دیا۔

”جب میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تو پھر اس وضاحت کی ضرورت کیا ہے کہ فلاں گھرانہ معزز ہے اور فلاں خاندان محترم!“  
پنڈت موہن داس نے بیٹی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں نے نواب بہادر سے وعدہ کیا ہے۔ میری لاج رکھ لے سریتا!“  
”نواب بہادر کون ہوتے ہیں میری زندگی کا سودا کرنے والے؟“ سریتا کے دلکش چہرے پر شدید غصے کے آثار نمایاں تھے۔

”ہر بیٹی کو ایک نہ ایک دن تو رخصت ہونا ہی پڑتا ہے۔“ پنڈت موہن داس جھکا جا رہا تھا۔  
”مگر میری رخصتی کا وقت ابھی نہیں آیا۔“ نرم و نازک لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے چٹان بن گئی تھی۔ ”جب وقت آئے گا تو اس شان سے رخصت ہوں گی کہ دنیا والے دیکھتے رہ جائیں گے۔“  
آخر موہن داس نے بیٹی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

”پتا جی! میں کس سے شادی کروں؟ جتنے بھی رشتے آئے ہیں، وہ سب کے سب ہندو ہیں۔“ ایک بیک سریتا کے ہونٹوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔  
”کیا تو ہندو نہیں ہے؟“ موہن داس پاگلوں کی طرح بیٹی کا چہرہ دیکھتے لگا۔  
”ہاں! میں ہندو نہیں ہوں۔“ سریتا نے بے جھجک ہو کر کہا۔  
”پھر کون ہے؟“ خوف رسوائی سے موہن داس رونے لگا۔  
”ابھی تو میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں کون ہوں؟“ سریتا نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، وقت آنے پر سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔“

سریتا دیوی کے اس اعتراف نے کہ اب وہ ہندو نہیں ہے، پنڈت موہن داس پر عجیب سی نیکی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ وہ بار بار وحشیانہ انداز میں بیٹی سے پوچھ رہا تھا۔

بڑھی اور ٹیپو کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

”کنورا! میں جا رہی ہوں۔ مگر تم اپنا بہت خیال رکھنا۔“ سریتا کے ہونٹوں سے محبت کا سمندر ابل پڑا تھا۔ ”یہ زمین تمہارے دشمنوں سے بھری ہوئی ہے۔ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔“ یہ کہہ کر سریتا دیوی تیز قدموں سے باہر چلی آئی۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

ٹیپو کو پہلی بار برہمن زادی کے لئے اپنے دل میں ایک عجیب سی خلش کا احساس ہوا۔ اسے اپنے باپ کا رویہ گراں گزرا تھا مگر وہ احترام کے پیش نظر خاموش رہا۔  
”بیٹے! تمہیں اس معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا جارحانہ سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ مجیدہ بیگم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے محسوس نہیں کیا مادر گرامی! کہ ٹیپو کو دیکھ کر اس کا کیا حال ہو گیا تھا۔“ حیدر علی کے لہجے کی گھنی بدستور تھی۔ ”اس کی آنکھوں کے آنسو آپ سب کے آنسوؤں سے مقدار میں زیادہ تھے۔ آخر یہ کیا ہے؟“

”برسوں کی رفاقت کا نتیجہ۔“ نواب کی والدہ نے معصومانہ انداز میں جواب دیا۔  
”آپ ان آنسوؤں کی حقیقت نہیں جانتیں۔“ حیدر علی نے مجیدہ بیگم کی وکالت کو اب مسترد کر دیا۔ ”براہ کرم آئندہ مجھے اس سلسلے میں پریشان نہ کیا جائے۔ آپ کو کیا معلوم کہ کیا طوفان ولی عہد سلطنت کے تعاقب میں ہے۔“

دوسرے دن حیدر علی نے کئی احکام جاری کئے۔ پہلا حکم یہ کہ پرانے قلعہ کو آہستہ آہستہ ہمسار کر کے نیا قلعہ تعمیر کیا جائے اور راجہ کرشنا کی رہائش گاہ کو اس طرح الگ کر دیا جائے کہ اس کا قلعہ سے براہ راست کوئی تعلق نہ رہے۔

دوسرا حکم سلطنت کے تمام ملازمین پر بدہشت طاری کر دینے والا تھا۔ حیدر علی نے ان تمام افراد کو برطرف کر دیا تھا جو سالانہ گھڑ دوڑ کے منتظرین تھے اور جنہوں نے ٹیپو کے جرم کی پردہ پوشی کی تھی۔

تیسرا حکم شیعاعت خان کے لئے تھا۔  
”تو مجھ کے لئے میری نظروں سے دور ہو جا۔ یہ کم سے کم سزا اس لئے ہے کہ تو نے بہر حال ٹیپو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی..... مگر تیرا بڑا گناہ یہ ہے کہ تو نے مجھے بے خبر رکھا۔“  
چوتھا حکم پنڈت موہن داس کے لئے تھا۔ حیدر علی نے سری رنگ ناتھ کے مندر کے بڑے پجاری کو خلوت میں طلب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”پنڈت! تو اپنی بیٹی اور ماں کو لے کر آج ہی اپنے آبائی مکان میں منتقل ہو جا۔ اور جلد قدر جلد ممکن ہو، سریتا کی شادی کر دے۔ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
”نواب بہادر!“ پنڈت موہن داس سر سے پاؤں تک مجسم ہوا، بن کر رہ گیا تھا۔

”ہیری زبان پر ”برہما“ اور ”ایشور“ کا نام کیوں نہیں آیا؟ ہمارے نزدیک وہی اس ہنات کا خالق ہے۔“ بات کرتے وقت پنڈت موہن داس کے لہجے میں وہی برہمی تھی۔  
 ”پتا جی! اب مجھے ان لفظوں سے اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ اور اللہ کا نام اچھا لگتا ہے۔“ سریتا دیوی اس قدر اطمینان سے گفتگو کر رہی تھی جیسے مذہبی عقائد کے بجائے عام گھر بولتاؤں میں زیر بحث ہوں۔

پنڈت موہن داس کا غصہ اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ ”اب میں سمجھا کہ تجھے کس نے گمراہ کیا ہے۔“  
 ”مجھے کون گمراہ کر سکتا ہے؟“ سریتا نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

”وہی بوڑھا، سید۔“ مذہب کا معاملہ آیا تو پنڈت موہن داس کے دل سے سید صاحب کا مارا احترام رخصت ہو گیا۔ ”اسی شخص نے میری معصوم بچی کو ہندو دھرم سے برگشتہ کیا ہے۔“  
 ”سید صاحب کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے۔“ سریتا دیوی نے بڑی عقیدت و محبت سے سید اکرام بخاری کا نام لیا۔ ”وہ تو راستے کا جلتا ہوا دیا ہیں جس کی روشنی میں بھٹکے ہوئے مسافر اپنی منزل تک پہنچتے ہیں۔“

”تو کل سے سید کے گھر بھی نہیں جائے گی۔“ پنڈت موہن داس نے چیخ کر کہا۔ ”بس یکے چکی فارسی زبان۔ بھگوان ہی جانے کہ اس شخص نے تجھے کیا کیا سکھا دیا کہ میرا پڑھایا ہوا مارا پاٹھ (سبق) بھول گئی اور دیوتاؤں تک کو فراموش کر بیٹھی۔“

”ایک نے اپنے گھر سے نکال دیا، دوسرا کھٹکشا حاصل کرنے سے روک رہا ہے۔ جس کی نہ مانو، وہی ناراض۔ کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں۔ یہ کیسا نظام اور کیسا انصاف ہے؟..... آپ کا حکم ہے تو سید صاحب کے یہاں بھی نہیں جاؤں گی پتا جی! مگر میری ایک بات غور سے سن لیجئے کہ میں ٹھاری نہیں کروں گی۔ چاہے وہ مرد کسی دیس کا سمرات ہی کیوں نہ ہو۔“ سریتا دیوی کی استقامت قابل دید تھی۔

”تو شادی کیسے نہیں کرے گی۔“ پنڈت موہن داس کسی آسیب کی طرح کھڑا ہو گیا اور اس نے بیٹے کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔

”بس یہ ہے آپ کا گیان اور زندگی بھر کی تپتیا (ریاضت)؟“ سریتا نے اپنی جگہ سے جہنم تک نہ کی۔ سکون سے بیٹھی رہی اور اس کے ہونٹوں پر ایک تنھیک آمیز مسکراہٹ ابھر آئی۔  
 ”اور آپ بھی کیا کریں کہ ہندو دھرم میں ناری کا یہی امتحان (مقام) ہے۔ زندگی بھر سیوا کرنا، بیروں میں بٹھایا، جب چاہا دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا اور جب چاہا زندہ جلا دیا۔“ سریتا نے بڑے تلخ لہجے میں تی کی وحشیانہ رسم کی طرف اشارہ کیا تھا۔

بیٹی کی بات سن کر پنڈت موہن داس کا اٹھا ہوا ہاتھ وہیں رک گیا مگر اس کی ماں، بھلا دیوی جتنی ہونی آئی اور بھوک شیرینی کی طرح پوتی پر چھٹی۔

”تو نے اپنا دھرم کہاں بیچ ڈالا؟..... اگر تو ہندو نہیں ہے تو پھر تیرا نیا دھرم کیا ہے؟“  
 ”میرے دھرم کو یہاں سمجھنے والا کوئی نہیں۔“ سریتا انتہائی مطمئن لہجے میں جواب دے رہی تھی۔ ”پھر میں کسی کو کیسے بتاؤں کہ میرا دھرم کیا ہے؟“  
 ایک ایک موہن داس پاگلوں کی طرح چیختے لگا۔

”تو خود بھی متاثر ہونے لگا اور مجھے بھی ساری قوم کے سامنے رسوا کر دے گی۔ اگر یہ بات دروازے سے باہر چلی جائے تو لوگ کیا کہیں گے؟ موہن داس جیسے گیانی اور بھگت کی بیٹی ناستک (منکر خدا) ہو گئی ہے؟..... پھر تو ہی بتا کہ میں کہاں ٹھہروں؟ کیا میرے پیروں کو چھونے والے خود مجھے سچ نہیں بتا دیں گے؟“

”کسی کو یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ میں ہندو نہیں رہی ہوں۔“ نو عمر سریتا نے اپنے تجربہ کار باپ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنی زبان کھولیں گے تو بات دروازے سے باہر جائے گی۔ ہونٹ سی لیں گے تو بات بھی سینے کی گہرائیوں میں دفن ہو جائے گی۔ پھر آپ کے قدموں کو چھونے والے ہزاروں ہندو کس بنیاد پر بڑے پجاری سے سوال کریں گے؟“  
 ”مگر میں نواب بہادر کو کیا جواب دوں گا؟“ موہن داس نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد تیری شادی ہو جائے۔“

”نواب بہادر کا میری شادی سے کیا تعلق ہے؟“ سریتا کے لہجے میں بڑی بے باکی تھی۔  
 ”انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی رعایا کے ذاتی معاملات میں بے جا مداخلت کریں۔ ہاں! انہیں یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ہمیں اپنے خوب صورت محل سے نکال کر ہماری جھونپڑی تک پہنچا دیں۔ سو نواب بہادر نے اپنا وہ اختیار استعمال کر لیا۔ اب انہیں ہم سے کیا شکایت ہے؟“  
 سریتا اس قدر ذہانت کی باتیں کر رہی تھی کہ حیرت کی زیادتی سے پنڈت موہن داس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”ہاں! ان کا ایک اختیار ابھی باقی ہے۔“ مختصر سے وقفہ رسکوت کے بعد سریتا دیوی دوبار اپنے باپ سے مخاطب ہوئی۔ ”وہ ہمیں اپنی مملکت سے بھی نکل جانے کا حکم دے سکتے ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو میں نواب بہادر سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی، خوشی خوشی اپنا گھر بھی چھوڑ دوں گی اور اپنی دھرتی بھی۔ کیونکہ ساری زمین ”اللہ“ کی ہے اور وہ مجھے کہیں بھی پناہ دیدے گا۔“  
 سریتا کی زبان سے ”اللہ“ کا لفظ سن کر پنڈت موہن داس کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور انتہائی غضب ناک لہجے میں بیٹی سے کہنے لگا۔ ”تیری زبان پر اللہ کا نام کیوں آیا؟ یہ لفظ تو صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔“

”اس زمین پر بسنے والے ہر شخص کو اللہ ہی کا نام لینا چاہئے۔ کیونکہ وہی زمین و آسمان کا مالک ہے اور ہم سب کا پیدا کرنے والا ہے۔“ سریتا نے باپ کے غصے کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ اور وہ ہر قسم کے دباؤ سے بے نیاز ہو کر اپنے دل کی بات کہہ رہی تھی۔

ایرام ثابت ہو چکا تھا، اس وقت بھی والی میسور نے راج گھرانے کی عزت و آبرو کی خاطر اپنے ہونٹ کی لئے تھے اور رانی کا منہ کو بدترین رسوائی سے بچالیا تھا۔

حیدر علی نے اپنی اسی اعلیٰ ظرفی کے باعث پنڈت موہن داس کو بھی تنہائی میں بلا کر سمجھایا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنی بیٹی کی شادی کر دے۔ والی میسور کی یہ بات صرف کمرے کی دیواروں اور موہن داس نے سنی تھیں۔ حیدر علی ایک محکوم انسان کی ذات کو تماشا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ پھر نواب نے دوسرے برہمنوں کو سریتا کے رشتے کے لئے مشورہ دیتے وقت بھی بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا تھا۔

”موہن داس ایک غریب مگر خوددار شخص ہے۔ اس کی بیٹی جوان ہو چکی ہے۔ اس لئے تم لوگ موہن داس کے سر سے اس بوجھ کو اتار دو جسے اٹھائے اٹھائے اس کی کمر ٹوٹی جاتی ہے۔“ اس احتیاط کا بس ایک ہی مقصد تھا کہ کسی شخص کو اس بات پر شک نہ ہو جائے کہ سریتا، شیخو سلطان سے والہانہ عشق کرتی ہے اور حیدر علی اس لڑکی سے نجات حاصل کرنے کے لئے خطرانہ چال چل رہا ہے۔

والی میسور کو یقین تھا کہ اس کا منصوبہ کامیابی سے ہم کنار ہو جائے گا۔ مگر جب پنڈت موہن داس نے سریتا کے انکار کی خبر دی تو حیدر علی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ جس طوفان کی آمد سے ڈرتا تھا، وہی طوفان اس کے دروازے تک آپہنچا ہے۔

”اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے نواب بہادر! کہ میں اس لڑکی کو اپنے ہاتھ سے زہر دے دوں۔“ حیدر علی کو خاموش پا کر موہن داس نے کسی قدر تیز آواز میں کہا۔ اس کے چہرے سے اپنی بیٹی کے لئے شدید نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

”نہیں پنڈت! یہ کھلا ظلم ہے۔“ اچانک حیدر علی کا لہجہ بدل گیا تھا۔ ”یاد رکھ کہ میں اپنی مملکت میں کسی ظالم کو برداشت نہیں کرتا۔ اگر تو نے ایسا کیا تو میں کوئی دلیل سے بغیر تجھے تختہ دار پہنچا دوں گا۔“

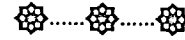
”اب وہ زہر ہی دینے کے قابل رہ گئی ہے حضور!“ والی میسور کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر موہن داس بہم گیا۔ ”اس نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں نے دنیا کی آسائشیں اس لئے ترک کی تھیں کہ دیوتاؤں کو راضی کر کے مکتی حاصل کر لوں گا۔ مگر دنیا بھی گئی اور دھرم بھی۔ بس ہر طرف آگ ہی آگ ہے۔ زمین زلزلے سے پھٹ جائے گی اور آسمان ٹوٹ جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے موہن داس رونے لگا۔

”اس نے کیا کہا پنڈت؟ مجھے تفصیل سے بتا۔“ حیدر علی کو خیال گزرا کہ کہیں سریتا کی زبان نہ بیک گئی ہو۔

”وہ کہتا ہے کہ اب ہندو دھرم سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔“ موہن داس زار و قطار رو رہا تھا۔

”ٹھیک کہتا ہے موہن داس۔ تجھ جیسی پاپن کو تو سو بار جلایا جائے۔ پھر تیری راکھ سبز کر تجھے دوبارہ زندہ کیا جائے اور پھر تیرے شریر میں آگ لگا دی جائے۔“ کل تک بولا دیوی پوتی پر جان چھڑتی تھی مگر جب رسموں کی بات آئی تو مامتا کے اس محبت سے ”خون آشام دیوی“ کا روپ دھار لیا تھا۔

موصوم سریتا بڑی حسرت سے دادی کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر انتہائی شکستہ لہجے میں بولی۔ ”دادی ماں! میں پاپن تو ایک بار جل چکی۔ پھر بھی آپ میری راکھ پر مشق ستم کیجئے، گوگملا بہائیے یا ہوا میں اڑا دیجئے۔ مگر میں شادی نہیں کروں گی۔“



موہن داس اور اس کی ماں بولا دیوی نے بڑے قہرناک انداز میں سریتا کو غصہ دھمکیاں دیں مگر جب ”سری رنگ ناتھ مندر“ کا سب سے بڑا پجاری تھک گیا تو سر جھکا کر ہوئے والی میسور کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

”نواب بہادر! میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں سریتا پر بہت دباؤ ڈالا مگر وہ ضدی لڑکی کسی طرح بھی شادی پر آمادہ نہیں ہے۔“

حیدر علی ان برہمنوں سے بھی اس قسم کی گفتگو سن چکا تھا، جو والی میسور کے ایماء پر موہن داس کے یہاں اپنے لڑکوں کا رشتہ لے کر گئے تھے۔ ان لوگوں نے حیدر علی کو بتایا تھا کہ سریتا اپنی مذہبی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے اور پھر اس کی عمر بھی کم ہے۔ اس لئے موہن داس چار ہفتہ سال سے پہلے اس کی شادی نہیں کرے گا۔ نواب نے اپنی اطلاعات کے بعد یہ سمجھا تھا کہ پنڈت گریز کا راستہ اختیار کر رہا ہے۔ نتیجتاً حیدر علی یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ وہ پرانی بیٹی کے سلسلے میں زیادہ اصرار نہیں کر سکتا تھا۔

سریتا کے راج محل سے رخصت کئے جانے پر بھی لوگوں میں بہت چمگیوئیاں ہوئی تھیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بڑے عجیب اشارے کئے گئے تھے۔ ویسے راجہ کرشنا نے کئی بار سوچا تھا کہ وہ ایک خویصورت ہندو لڑکی کے نواب گھرانے سے خصوصی تعلقات اور سید صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کے واقعے کو بنیاد بنا کر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کا بیج بوسے پھر کچھ دن بعد پوری ریاست میں فرقہ وارانہ فسادات کرا کے نفرت و تعصب کی فصل کاٹ لے۔ رانی لکشمی ماں اور رانی دیوا جی منی بھی اسے دن رات اسی قسم کے مشورے دیا کرتی تھیں۔ مگر راجہ کرشنا، حیدر علی کے بے داغ کردار کی وجہ سے اپنے منصوبے پر عمل کرنے سے قاصر تھا۔ رانی میسور نے ریاست کی ہر عورت کو محترم سمجھا تھا اور ہر جوان لڑکی کو بیٹی کا درجہ دیا تھا۔ اسی باعث بیشتر ہندو عورتیں اسے ”دیوتا“ کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ رانی کا منہ بڑی آسانی سے اس کی ہوس کا شکار ہو سکتی تھی لیکن حیدر علی نے جذبات کی شدید طغیانی میں بھی اپنے ہوش کے سفینے کو غرق نہ ہونے دیا تھا۔ پھر جب کھنڈے راؤ کے اشتراق سے رانی کا منہ پر حیدر علی کے خلاف سازش



نئی زندگی میں داخل ہوگی تو پرانی باتیں بھول جائے گی..... ویسے میں، سید صاحب سے بھی بات کر کے دیکھوں گا کہ ان کی تعلیم و تربیت تیری بیٹی پر کس قدر اثر انداز ہوئی ہے۔“  
”میں نے اس پر پابندی لگا دی ہے۔ اب وہ بھی سید صاحب کے گھر نہیں جائے گی۔“  
پنڈت موہن داس نے کہا۔  
پنڈت نے بڑی عقل مندی کا کام کیا۔“ حیدر علی، پنڈت کے اس فیصلے سے خوش نظر آ رہا تھا۔

اچانک موہن داس گھبرائی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بہت آہستہ سے بولا۔ ”اگر نواب بہادر برائے نامیں تو کچھ عرض کروں۔“

حیدر علی نے اپنے سر کی اثباتی جنبش سے موہن داس کی درخواست کا جواب دیا۔  
”میری بیٹی اور ماں کو راج محل سے رخصت کرنے کی کیا وجہ تھی؟“ موہن داس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”آپ نے اس روز کسی طوفان کی آمد کا ذکر کیا تھا۔ اور اب سریتا کی شادی کے لئے اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں؟“ موہن داس ایک بہت بڑھا لکھا انسان تھا۔ اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں والی میسور کی غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا اور نواب حیدر علی سے ایک ایسا سوال کر بیٹھا جسے زبان پر لاتے وقت بڑے بڑے جری انسانوں کو پسینہ آ جاتا۔  
حیدر علی نے بڑی حیرت سے موہن داس کی طرف دیکھا مگر اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

”کیا سریتا سے حضور کی شان میں کوئی گستاخی ہوگئی ہے؟“ موہن داس بہت گھما پھرا کر بات کر رہا تھا۔

حیدر علی پھر بھی خاموش رہا۔

”کہیں میری نادان بیٹی کے قدم تو نہیں لڑکھڑا گئے؟“ موہن داس سوال پر سوال کئے جا رہا تھا۔ ”اور حضور نے میری عزت بچانے کے لئے یہ راستہ اختیار کیا؟“

”پنڈت! میری خاموشی کو غنیمت سمجھ اور مجھ سے وہ سوال نہ کر جس کا جواب تجھ سے تیرے ہوش و حواس چھین لے۔“ حیدر علی کے لہجے میں بہت زیادہ ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر جب موہن داس نے مسلسل اصرار کیا تو والی میسور بھڑک اٹھا۔

”تیری بیٹی، ولی عہد سلطنت کے عشق میں پاگل ہوگئی ہے۔ اور سریتا کی اسی دیوانگی نے اسے ہندو دھرم سے برگشتہ کر دیا ہے۔ اور اب وہ مسلمان ہو کر ٹیپو کی قربت حاصل کرنا چاہتی ہے۔“

پنڈت موہن داس پر بہت دیر تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر وہ کسی بیمار انسان کے لہجے میں بولا۔

”بے شک! اس نے بڑا پاپ کیا۔ دھرتی نے آکاش سے ملنا چاہا۔ بھلا یہ کس طرح ممکن

حیدر علی کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ طوفان والی میسور کے گھر میں داخل ہوا تھا اور اس کی دیواریں آہستہ آہستہ سرکش پانی میں ڈبکی جا رہی تھیں۔

”پھر اس کا کس مذہب سے تعلق ہے؟“ حیدر علی کے لہجے سے ہلکی سی پریشانی جھلک رہی تھی۔ ”جب وہ ہندو نہیں ہے تو پھر کون ہے؟“

”اس کا اس نے اقرار نہیں کیا کہ اب وہ کس عقیدے پر عمل پیرا ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اسے ”اللہ“ کا نام اچھا لگتا ہے۔“ پنڈت موہن داس اس طرح بول رہا تھا جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز انکگ گئی ہو۔

سریتا کے بارے میں یہ انکشاف سن کر حیدر علی کو محسوس ہوا کہ اس کے گھر کی دیواریں سیلابی پانی میں غرق ہو چکی ہیں۔ شجاعت خان کی فراہم کردہ اطلاعات کے بعد میسور کو اس کا یقین ہو چکا تھا کہ سریتا، ٹیپو سلطان سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ مگر یہ بات جو علی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ایک ہندو وشنیزہ کا عشق جنون کی منزل تک پہنچ جائے گا وہ دل کی خاطر اپنا مذہب تک بدل ڈالے گی۔ یکایک والی میسور کی سماعت میں سریتا کے الفاظ گونجنے لگے، جو اس نے راج محل سے رخصت ہوتے وقت کہے تھے۔

”مہاراج! آسمان تک کے فاصلے بھی میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔“

اب حیدر علی کو سریتا کے الفاظ کی گہرائی کا اندازہ ہوا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں پہاڑیے ارادے؟ خدا کی پناہ! نواب نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر پنڈت موہن داس سے منہ نہ ڈھکیا۔  
”کیا تیری لڑکی مسلمان ہوگئی ہے؟“

”اس نے صاف صاف تو نہیں بتایا مگر مجھے شبہ ہوتا ہے کہ وہ مذہب اسلام کی طرف راغب ہے۔“ پنڈت موہن داس نے انتہائی غم زدہ لہجے میں کہا۔ ”اور یہ سب کچھ سید صاحب کی وجہ سے ہوا۔ میں نے ان پر حد سے زیادہ اعتبار کیا تھا مگر انہوں نے میرے ساتھ براہ کیا۔ سریتا کو ان کی صحبتوں نے بگاڑ دیا۔ نہ وہ سید صاحب کی درس گاہ میں جاتی اور نہ اس گمراہ ہوتی۔ آپ خود ہی بتائیے نواب بہادر! کہ اگر یہ بات ہندو قوم کو معلوم ہو جائے تو میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔“

موہن داس، سید صاحب کی صحبتوں کو سریتا کی گمراہی کا سبب قرار دے رہا تھا۔ حیدر علی کے ذہن میں فکر و پریشانی کے نئے نئے طوفان اٹھ رہے تھے۔ وہ پنڈت کو کیسے بتانا کہ کی بیٹی، سید صاحب کی وجہ سے مذہب اسلام کی طرف راغب نہیں ہوئی ہے بلکہ ٹیپو کی بیٹی جنون اسے اس منزل تک لے گیا ہے۔ پھر بھی والی میسور نے موہن داس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”حوصلہ رکھ پنڈت! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ابھی بچی ہے۔ نئے نئے خیالات کے ذہن کو پریشان کر رہے ہیں۔ اسے محبت سے سمجھا۔ بہت جلد تیری بات مان جائے گی۔ خبردار! اس پر جبر نہ کرنا۔ یہ عمر بغاوت کی عمر ہوتی ہے۔ اور جتنی جلد ممکن ہو، اس کی

س طرح ادا ہوگا؟ وہ دیوتاؤں کی منکر ہے، اس لئے اس کی سزا قتل کے سوا کچھ نہیں۔“  
”خدا کا منکر ہے، تو کیا میں تجھے قتل کرا دوں؟“ حیدر علی نے موہن داس سے ایک عیب سوال کر ڈالا تھا۔

پنڈت دیوتاؤں کی طرح والی میسور کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا۔  
”نواب بہادر! یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے۔ آپ اس میں مداخلت نہیں کر سکتے۔“  
”میں کسی کے مذہبی عقائد میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ مگر وہ لڑکی اللہ کا نام لیتی ہے، اس لئے کسی کو اس پرستم ڈھانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اسے پیار محبت سے سمجھا۔ شاید وہ دوبارہ اپنے دھرم کی طرف لوٹ آئے۔ ورنہ خاموشی سے وقت کا انتظار کر۔ اب وقت ہی اس کی تقدیر کا فیصلہ کرے گا۔“

پنڈت موہن داس بظاہر فرمانبرداری کے انداز میں سر جھکا کر چلا گیا لیکن درپردہ اس کے بیٹے میں نواب حیدر علی اور سید اکرام بخاری کے خلاف نفرتوں کا سمندر موجزن تھا۔



موہن داس جاتے ہی حیدر علی، سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام واقعات سنانے کے بعد کہنے لگا۔

”موہن داس کو شکایت ہے کہ آپ کی وجہ سے اس کی بیٹی گمراہ ہو گئی ہے۔“  
”میں نے اس کے دیوتاؤں کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولی۔“ سید صاحب کو موہن داس کی الزام تراشی سے دلی تکلیف پہنچی تھی۔ ”وہ خود اپنی بیٹی کو یہاں لے کر آیا تھا۔ سریتا ایک غیر معمولی ذہین بچی ہے۔ ہر شے کے بارے میں اسے تجسس رہتا ہے۔ اپنی اسی فطرت سے مجبور ہو کر وہ مجھ سے مذہب اسلام کے بارے میں مختلف سوالات کرتی رہتی تھی، اب میں نہیں جانتا کہ اس کے ذہن پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ویسے اس نے مجھ سے کبھی اس بات کا تذکرہ تک نہیں کیا کہ وہ اپنا آبائی دھرم چھوڑ چکی ہے۔“

”میں آپ کے پاس اسی امر کی تصدیق کے لئے حاضر ہوا تھا کہ اگر سریتا اسلام قبول کر چکی ہے تو پھر اسے ہندوؤں کے نرغے سے نکال لیا جائے ورنہ موہن داس جیسا جنونی شخص کسی دل اپنی بیٹی کو ہلاک کر ڈالے گا اور پھر میں تمام عمر یہ سوچ سوچ کر کفِ افسوس مٹا رہوں گا کہ میری بے خبری کے سبب ایک کلمہ گو کا خون ہو گیا۔“ حیدر علی کے لہجے میں بڑا گداز تھا۔

”سرتیتا نے میرے سامنے کبھی کلمہ نہیں پڑھا، اسی لئے میں اس کے ایمان کی تصدیق نہیں کر سکا۔ مگر بات یہاں تک پہنچی کس طرح؟“ سید صاحب حیران نظر آ رہے تھے۔

مجبوراً حیدر علی کو ٹیپو کے حوالے سے سریتا کے والد بہانہ عشق کی داستان اور پھر راج محل سے اس کی تہری رخصت تک کے سارے واقعات سید صاحب کے روبرو بیان کرنا پڑے۔

سرتیتا کے عشق چال سوز کی روداد سن کر سید صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ پھر بہت

ہے؟ میں بہت شرمندہ ہوں نواب بہادر! کہ جس لڑکی کو آپ نے باپ جیسی محبت دی، اسی نے آپ کو اتنا شدید آزار پہنچایا۔“ پنڈت نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”آپ مطمئن رہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح سریتا کو کنور کے راستے سے ہٹا دوں گا۔“  
”مگر اس پر کوئی ظلم نہ کرنا کہ وہ بہت معصوم اور پاکیزہ لڑکی ہے۔“ سریتا کے لئے حیدر علی کے دل میں چھپی ہوئی محبت ابھر آئی تھی۔ ”ٹو بڑے سے بڑے گھرانے میں اس کا رشتہ طے کر دے۔ میں خود سارے اخراجات برداشت کروں گا۔“ اگرچہ ٹیپو سلطان، سریتا کی طرف معمولی سی رغبت بھی رکھتا تھا لیکن حیدر علی ہر امکانی خطرے کو منادینا چاہتا تھا۔ اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ سریتا، شادی کے بندن میں جکڑ جائے۔ ”پنڈت! تو اپنی بیٹی کو آمادہ تو کر لے۔ میں راج کماریوں کی طرح اس کی شادی کروں گا۔“

موہن داس، حیدر علی سے وعدہ کر کے چلا گیا۔ پنڈت کا خیال تھا کہ سریتا، راج محل کی فضا سے متاثر ہو کر شاہانہ زندگی کے خواب دیکھنے لگی ہے۔ اور یہی خواب اسے ٹیپو سلطان کے قریب لے گئے ہیں۔



اسی کشمکش میں تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔  
پنڈت موہن داس نے نواب حیدر علی کے اشارے پر سریتا کو شادی کے بعد کی اسی شاہانہ زندگی کے خواب دکھائے مگر اس جانباز لڑکی کی آنکھوں میں نہ حرص کی چمک جاگی اور نہ چہرے پر ہوس کا رنگ ابھرا۔ سریتا پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ اگر کسی دیس کے سرائے کا رشتہ بھی آئے گا تو وہ اسے ٹھکرا دے گی۔ موہن داس نے جتنی بار شادی کا ذکر چھیڑا، سریتا نے اتنی ہی بار اپنے الفاظ دہرا دیئے۔ یہاں تک کہ پنڈت مشتعل ہو گیا اور اس نے سخت طیش کے عالم میں اپنی گلاب جیسی بیٹی کو نہایت بے دردی کے ساتھ زد و کوب کیا۔ اس تشدد میں موہن داس کی مال بھلا دیوی بھی شریک تھی۔ سریتا لہو لہان ہو گئی مگر اس نے باپ اور دادی کا جابرانہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔

پنڈت موہن داس دوبارہ والی میسور کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی شکست و ناکامی کی داستان سنانے لگا۔

”نواب بہادر! میرے ہاتھ تھک گئے مگر اس کا سر نہیں جھکا۔ میں نے اس کے پورے جسم پر زخم سچا دیئے مگر وہ انکار ہی کرتی رہی۔ بس اب تو یہی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں کہ مجھے اس کے قتل کی اجازت دے دیجئے۔“

”پنڈت! کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟“ شدت غضب سے حیدر علی کا چہرہ جلنے لگا۔ ”کیا میں نے تجھے متنبہ نہیں کی تھی کہ اس پر ہاتھ نہ اٹھانا؟“

”پھر میں کیا کروں؟“ پنڈت اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ ”آخر میرے“

بڑسوز لہجے میں کہنے لگے۔

”فراست و تدبیر سے کام لینا چاہیے مگر اتنا بھی نہیں کہ انسان اپنی عقل ہی کو خدا سمجھ لے۔“  
نواب! تو نے اپنے بیٹے سے بھی بدگمانی کی اور اس لڑکی سے بھی جو عشق کے سوا کچھ نہیں جانتی۔“  
”سید عالی مقام! مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا مگر اس لڑکی کے عشق بلاخیز سے بہت خوف زدہ رہتا ہوں۔“ حیدر علی رک رک کر بول رہا تھا۔ ”آپ نہیں جانتے کہ وہ کسی عجیب باتیں کرتی ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کی یہی عجیب باتیں کہیں ٹیپو کو گمراہ نہ کر دیں۔“  
”اسے عجیب پیدا کیا گیا ہے، اس لئے عجیب باتیں ہی کرے گی۔“ ٹیکا یک سید صاحب کی افسردگی ختم ہو گئی تھی اور ان کے چہرے پر جلال روحانی نمایاں ہو گیا تھا۔ ”نہ ٹیپو گمراہ ہو گا اور نہ سرتیبا بھگے گی۔ دونوں سید کے شاگرد ہیں۔ انہیں ان کے راستوں پر چلنے دے۔ اس لڑکی کو دلوں سے بچا اور نادان موہن داس کو آخری بار تنبیہ کر دے کہ وہ خالمانہ حرکتوں سے باز آجائے۔ اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔“ سید صاحب حالت جذب میں بول رہے تھے اور والی میز کے جسم پر لرزہ خاری تھا۔  
پھر جب حیدر علی، سید کی بارگاہ سے اٹھا تو اس کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر چکا تھا۔



دوسرے دن سرکاری کارندوں نے چٹت موہن داس، اس کی ماں بھلا دیوی اور بٹا کو نواب حیدر علی کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ سرتیبا سے پاؤں تک زخمی تھی۔ اس کے دل کے چہرے پر جگہ جگہ نیلے نشانات تھے اور آنکھوں میں غلغلگی کا غبار بھرا ہوا تھا۔  
”چٹت! تو نے اس کا یہ کیا حال بنا دیا؟“ حیدر علی قہر آلود لہجے میں موہن داس سے مخاطب ہوا۔ ”کیا تو نے میرا حکم نہیں سنا تھا؟..... ناخرمانی کی سزا جانتا ہے؟ کیا تو میرا غضب سے واقف نہیں؟ سرنگاپٹم کی گلیوں میں ہاتھ پھیلائے پھرے گا اور کوئی بچک دینے والا بھی نہیں ہو گا۔“

موہن داس اور بھلا دیوی کھڑے قہر قہر کانپ رہے تھے۔

”اور کیا تجھے سید صاحب نے گمراہ کیا ہے؟“ حیدر علی نے اپنا زاویہ تبدیل کیا اور سرتیبا سے مخاطب ہوا جو رد کی مجسم تصویر بنی ہوئی تھی۔

”وہ روشنی ہیں اور صرف روشنی۔“ سید صاحب کا ذکر کرتے ہوئے سرتیبا کی آنکھیں بھی آنکھیں تھیں۔ ”اگر وہ نہ ہوں تو پورا سرنگاپٹم اندھیرے میں ڈوب جائے۔“

”کیا تو مسلمان ہو گئی ہے؟“ حیدر علی نے سرتیبا سے دوسرا سوال کیا۔

”یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ میں جو کچھ بھی ہوں، وہ خوب جانتا ہے۔“ سرتیبا نے جواب دیا تھا، جسے سن کر حیدر علی چونک اٹھا تھا۔  
”کیا تو دیوتاؤں کی مکر ہے؟“ والی میسور نے برہمن زادی سے تیسرا سوال کیا۔

”ہاں! میں دیوتاؤں کی حقیقت سے انکار کرتی ہوں اور میرا ہندو دھرم سے کوئی تعلق نہیں۔“ سرتیبا نے کسی ہجک کے بغیر اپنی برہمنی اور بتادت کا اعلان کر دیا تھا۔  
”تو نے سن لیا چٹت؟“ نواب حیدر علی بادل کی طرح گرجا۔ ”اب تیرا تیری بیٹی سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ بچوں کے پجاری اور اللہ کے نام لینا ایک منزل کے مسافر نہیں ہو سکتے۔“  
اس کے بعد حیدر علی نے سرتیبا سے پوچھا۔ ”تیرے لئے ہمارے دلوں کے دروازے بھی کھلے ہیں اور محل کے بھی۔ تو کہاں رہنا پسند کرے گی؟“

سرتیبا نے راج محل میں واپس آنے سے انکار کر دیا اور اپنی رہائش کے لئے یتیم خانے کا انتخاب کر لیا۔ حیدر علی نے ہر شہر میں لاوارث بچوں کی پرورش کے لئے یتیم خانے تعمیر کرائے تھے جن کے اخراجات حکومت ادا کرتی تھی۔ یتیم خانوں کی عمارتیں شاعر اور ان کا ماحول انتہائی صاف ستھرا تھا۔ تمام بچوں کو اچھا لباس اور عمدہ غذا فراہم کی جاتی تھی۔ بچوں کی فطری صلاحیت کے مطابق پہلے انہیں ابتدائی تعلیم دی جاتی، پھر مختلف ہنر سکھائے جاتے تاکہ وہ جوان ہو کر ایک کارآمد شہری بن سکیں۔ جو بچے جسمانی طور پر مضبوط ہوتے، انہیں فوجی تربیت دی جاتی۔ متعلقین کو سخت ہدایت تھی کہ وہ بچوں کو احساس کمتری کا شکار نہ ہونے دیں اور ان کے ساتھ اس قدر ششمانہ سلوک کریں کہ وہ اپنے ماں باپ کی کمی کو محسوس نہ کریں۔ حیدر علی سال میں ایک بار تمام یتیم خانوں کا دورہ کیا کرتا تھا اور کچھ دیر کے لئے بچوں میں اس طرح کھل مٹ جاتا تھا جیسے وہ ان کا باپ ہو۔ بچوں کے لئے والی میسور کا حکم بھی یہی تھا کہ وہ اسے باپ کہہ کر پکاریں۔ یہاں مسلمان اور ہندو بچوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ تمام بچے حیدر علی کو باپ کہہ کر پکارا کرتے تھے اور خود بھی انہیں ”میرے بیٹا!“ کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔

سرتیبا نے بھی اپنی رہائش کے لئے سرنگاپٹم کے ایک ایسے ہی یتیم خانے کا انتخاب کیا تھا۔ جب حیدر علی نے بہت اصرار کیا کہ وہ راج محل واپس چلی جائے تو سرتیبا نے بڑے بے نیازانہ انداز میں کہا۔ ”میں مہاراج! ایک بار جس راستے کو چھوڑ دیا، سو چھوڑ دیا۔ ویسے بھی جن لوگوں کے ماں باپ نہیں ہوتے، ان کے گھر یتیم خانوں کے سوا کہیں اور نہیں ہو سکتے۔“



اگرچہ موہن داس ایک محبت کرنے والا باپ تھا لیکن سرتیبا کی باغیانہ روش نے اسے بیٹی کے خون کا بھلا سا بنا دیا تھا۔ وہ حیدر علی کی عدالت سے نکل کر سید حامندو پچنجا اور اپنے کمرے میں بند ہو کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ پھر رات کے وقت راجہ کرشنا کے سامنے گریہ و زاری کرنے لگا۔

”نواب بھاد اور سید نے مل کر میری بیٹی کو تباہ کر ڈالا۔ اسے جبراً مسلمان بنا کر یتیم خانے میں داخل کر دیا گیا ہے۔ کچھ دن بعد ایک خوب صورت برہمن زادی کسی مسلمان سردار کی بیوی کی خواہش بن جائے گی۔“ موہن داس کھلا جھوٹ بول رہا تھا مگر اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے

”اگر حیدر علی نے نہتے ہندوؤں کے خلاف طاقت استعمال کی تو بیٹھوائے پونا کا لشکر اس کی نذرں کو روند ڈالے گا۔“ راجہ کرشنا نے موہن داس کا خط پڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔  
جواب میں موہن داس کے ہونٹوں پر بھی زہر آلود مسکراہٹ ابھر آئی۔ اور پھر وہ بڑے خفاک ارادوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔



دوسرے دن راجہ کرشنا کے منصوبے کے مطابق موہن داس نے مندر کے منج پر کھڑے ہو کر حیدر علی اور سید صاحب کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ سننے والوں نے درمیان میں احتجاج کیا کہ نواب بہادر دیوتا ہیں تو موہن داس نے چیخ کر کہا کہ وہ دیوتا کے لباس میں راکش ہے۔ پھر جب پنڈت نے اپنی بیٹی سریتا کا حوالہ دیا تو مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ پوجا کے لئے آنے والے ہزاروں ہندوؤں کے چہرے بدلنے لگے اور پھر ان کی آنکھوں میں دالی میسرور کے لئے نزلوں کی پرجھائیاں ابھرنے لگیں۔

کوئی ایک ہفتے تک یہی عمل جاری رہا۔ موہن داس صبح شام رو رو کر حیدر علی کے مظالم اور ہندو قوم کی مظلومیت کے من گھڑی فسانے سناتا اور پجاریوں سے درخواست کرتا کہ اپنے گھروں سے نکل کر اس دیوتا کے خلاف احتجاج کرو۔

”اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو کل تمہاری بیٹیاں بھی ہوس کے متقل میں ذبح کر دی جائیں گی۔ تمہارے ہاتھوں کے تلک کھرچ دیئے جائیں گے۔ گلے میں پڑی ہوئی ڈنار توڑ دی جائے گی اور مندروں کی جگہ مسجدیں تعمیر کر دی جائیں گی۔“

موہن داس کی تقریریں اس قدر زہرناک تھیں کہ ہندوؤں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ اور حیدر علی کو اس طوفان کی خبر اس وقت ہوئی جب ہزاروں بت پرست، راج محل کے نیچے کھڑے چیخ رہے تھے اور پُرشور آوازوں میں سریتا دیوی کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

حیدر علی بلاتا خیر قلعے کے دروازے پر نمودار ہوا اور بت پرستوں کے ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”کل صبح سب کے سب، مندر سے ملحقہ میدان میں جمع ہو جاؤ۔ پھر میں تمہارے اس سوال کا جواب دوں گا۔“

حیدر علی کی بارعب آوازیں کرچیتے ہوئے ہندو ساکت ہو گئے اور پھر چپ چاپ اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے۔

ہجوم کے واپس جاتے ہی حیدر علی کے نقیب، سرنگاپٹم کی ٹلیوں میں آوازیں لگاتے پھر رہے تھے۔ ”کل اس شہر کا ایک ایک ہندو مندر کے میدان میں جمع ہو جائے۔ صرف بیمار لوگ اس حکم کے تابع نہیں۔“



کے لئے اس نے گریبان چاک کر لیا تھا اور بار بار سینہ پیٹ رہا تھا۔ ”اگر برہمن کی آمدولن کی تو پھر کیا بچے گا؟..... کچھ بھی نہیں۔ ہندوستان کا ایک ایک ہندو ہلاک و برباد ہو جائے گا۔ سریتا کے لئے کچھ کیجئے مہاراج! بس اب آپ ہی کا سہارا ہے۔“

راجہ کرشنا اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ حیدر علی اور سید اکرام بخاری کے خلاف اس کے دل میں نفرت و انتقام کے انگارے بھرے ہوئے تھے۔ راجہ کی نظر میں حیدر علی اس کی عزت کا رہزن اور اقتدار کا غاصب تھا۔ سید صاحب سے اسے اس لئے نفرت تھی کہ اگر وہ بوڑھا باپ کی کرامت کا مظاہرہ نہ کرتا تو حیدر علی کے بیوی بچے پر مغال بنا لئے جاتے اور آج سیاسی صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔ اپنی معزول کے بعد سے آج تک راجہ کرشنا، حیدر علی کے خلاف بے شمار منصوبے بنا چکا تھا مگر یہ سارے منصوبے اس کے اپنے ذہن میں پیدا ہوتے تھے اور کچھ دن زندہ رہ کر دماغ ہی میں مر جاتے تھے۔ آج جب موہن داس اس سے مدد مانگنے کے لئے آیا تو راجہ کرشنا کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔

”تیرا کام ہو جائے گا پنڈت! مگر تجھے ہمت سے کام لینا ہوگا۔“

”میں اپنی جان سے بھی گزرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ برہمن قوم کی آمد کا مسئلہ ہے۔“

موہن داس ایک با کردار برہمن تھا لیکن مذہب کے معاملے میں وہ انتہائی کٹر، تنگ نظر اور متعصب تھا۔ اگر حیدر علی درمیان میں نہ ہوتا تو وہ اب تک اپنی بیٹی سریتا کو بھی قتل کر چکا ہوتا۔

”تجھے نواب حیدر علی اور سید صاحب کو سرعام زسوا کرنا ہوگا۔“ راجہ کرشنا کے لہجے سے درندگی جھلک رہی تھی۔ ”پھر تجھے تیری بیٹی مل جائے گی۔“

”مگر یہ کیسے ممکن ہے مہاراج؟“ موہن داس پاگلوں کی طرح راجہ کرشنا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”ایک تہا آدمی نواب کو کس طرح ذلیل کر سکتا ہے؟“

”ٹو صبح اور شام کی پوجا میں حیدر علی کے مظالم کی داستانیں اس طرح بیان کرے گا کہ پوری ہندو قوم کے دل و دماغ جل اٹھیں۔“ راجہ کرشنا، موہن داس کو اپنے منصوبے کی تفصیلات سمجھا رہا تھا۔ ”تیری تقریروں کے چند مخصوص موضوعات ہوں گے۔ حیدر علی کی وجہ سے ہندو دھرم خطرے میں ہے۔ دیوتاؤں کے نام لیواؤں کی جاگیریں اور املاک لوٹی جا رہی ہیں۔ اب تک ہزاروں ہندوؤں کو جبرا مسلمان بنایا جا چکا ہے۔ سینکڑوں غریب ہندو ویشیز ان مسلمان سرداروں کی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں اور سب سے آخر میں تو اپنی بیٹی سریتا کا حوالہ دے کر پوری ہندو قوم سے انصاف مانگے گا۔“ راجہ کرشنا نے اپنی تمام سیاہ کاریوں کو حیدر علی کی ذات سے وابستہ کر دیا تھا۔

اس کے بعد راجہ کرشنا نے پنڈت موہن داس سے اسی مضمون کا ایک طویل خط پیشوائے پونا، مادھوراؤ کے نام تحریر کرایا جس میں پیشوائے پونا سے ہندو قوم کی فوری خبر گیری کے لئے درخواست کی گئی تھی۔



”میں نے پیشوا کا خط سن لیا۔ مگر کیا یہ دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہیں ہے؟“

حیدر علی نے مادھوراؤ کے قاصد سے سوال کیا۔  
اس سے پہلے کہ قاصد، والی میسور کے سوال کا جواب دیتا، دربار پوٹا سے آیا ہوا ایک گیلانی بول اٹھا۔ ”یہ ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں ہے۔“ گیلانی کا لہجہ بھی تلخ تھا اور چہرے پر کبھی ناگواری کے اثرات صاف نظر آرہے تھے۔

”پھر کیا ہے؟“ حیدر علی نے گیلانی کے مختصر آمیز روئے کو بھی بڑی ہوش مندی کے ساتھ برداشت کیا۔  
”یہ ہندو قوم کی موت اور زندگی کا معاملہ ہے۔“ گیلانی کا لہجہ کچھ اور تند و تیز ہو گیا تھا۔  
”اس وقت پیشوائے پونا ایک ہندو کے عزت و ناموس، جان و مال اور مذہبی عقائد کے محافظ و نگہبان ہیں۔ چنٹ موہن داس ایک محترم زمین ہیں اور آپ نے ان کی بیٹی سریتا دیوی کو جبرا مسلمان بنالیا ہے۔ موہن داس کے بھول انہوں نے بارہا آپ سے رحم کی درخواست کی مگر آپ نے اپنی طاقت کے نشے میں ایک کمزور ہندو کی فریاد نہیں سنی۔ مجبوراً انہوں نے پیشوائے پونا کی لازوال طاقت کا سہارا لیا۔ جب عدالتیں بند ہو جاتی ہیں اور انصاف مانگنے والوں کو حقارت سے ٹکرایا جاتا ہے تو پھر طاقت ہی فیصلہ کرتی ہے۔“

گیلانی نے پیشوا کی طاقت کو لازوال کہہ کر مادھوراؤ کو خدائی کے درجے تک پہنچا دیا تھا اور خود بھی اسی طاقت کے نشے میں بول رہا تھا کہ حیدر علی کے غیرت مند اور شجاع درباریوں کے چہرے غصے کو برداشت کرتے کرتے انگاروں کی طرح دھکنے لگے تھے۔

”یہ مجھ پر سنگین تہمت ہے۔“ حیدر علی کی آواز بلند ہو گئی تھی اور چہرے کا رنگ بگڑ گیا تھا۔  
”چنٹ موہن داس جھوٹا ہے، احسان فراموش اور ناشکرا ہے۔ میں نے ایک کچے مکان کی چار دیواری میں غربت و گناہی کی زندگی بسر کرنے والے کو بڑے پجاری کے منصب تک پہنچایا اور پھر وہ میرے ہی احسانات کو جھٹلانے لگا۔ اس کی بیٹی خود مسلمان ہوئی ہے اور یہ بات سارا سرنگٹھم جانتا ہے۔“

”ہمارے لئے محترم پیشوا کا یہی حکم ہے کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے تمام صورت حال کا جائزہ لیں، چنٹ موہن داس کا پورا مقدمہ سنیں اور سریتا دیوی سے دریافت کریں کہ وہ تبدیلی مذہب پر کیسے مجبور ہوئی؟“ اب کی بار دوسرا گیلانی بولا۔ اس کی آنکھوں میں بھی طاقت کا گہرا نثار تھا اور لہجے سے انتہائی رعوت جھلک رہی تھی۔ ”چنٹ موہن داس اور سریتا دیوی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہم اس شہر کے دوسرے ہندوؤں سے بھی ملاقات کریں گے۔ پھر ان سے پوچھیں گے کہ وہ آپ کے دور حکومت میں کس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں؟“

پیشوا مادھوراؤ کا خط اور ہندو گیلانیوں کی تنکیرانہ باتیں نواب حیدر علی خان بہادر کی خود بخارگی آوازوں پر ایک نازیبا نہ تھیں۔ تکلیف کی شدت سے والی میسور نے اپنی کرسی پر کئی بار پیلو

دوسرے دن مندر کا میدان ہندوؤں سے بھر گیا۔

حیدر علی، سریتا کو اپنے ہمراہ لے کر وہاں پہنچا۔ سریتا نے بت پرستوں کے جھوم کوٹیا کر اس نے اپنی مرضی سے ہندو دھرم چھوڑا ہے اور اس کے جسم پر زخموں کے جس قدر نشانات نظر آ رہے ہیں، وہ سب کے سب موہن داس کے تشدد کا نتیجہ ہیں۔  
سریتا کی زبان سے یہ اعتراف سن کر ہندوؤں کے چہرے اتر گئے۔  
پھر یکایک حیدر علی کی غضب ناک آواز گونجنے لگی۔

”میں چنٹ موہن داس اور یہاں موجود ہر شخص کو آٹھ دن کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر اس عرصے میں مجھ پر لگائے گئے اثرات ثابت نہیں ہوئے تو میں اس سازش میں شریک ہونے والے ایک ایک فرد کو بدترین سزا دوں گا۔“

یہ کہہ کر حیدر علی، ہندوؤں کے جھوم سے گزر کر چلا گیا اور بت پرستوں کی بھیڑ اس طرح ساکت کھڑی رہی جیسے مندر کا میدان کوئی شمشان ہے اور اس شمشان میں ہزاروں روہیں کی ہو گئی ہوں۔



حیدر علی کے اس اعلان کے تین دن بعد مادھوراؤ کا قاصد پیشوائے پونا کا خط لے کر سرنگٹھم پہنچا۔ قاصد کے ہمراہ پونا کے تین بڑے چنٹ بھی تھے۔ مادھوراؤ نے اپنے ظالم حیدر علی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”میں اپنے تین گیلانیوں کو سرنگٹھم بھیج رہا ہوں۔ تمہارے خلاف الزام ہے کہ تم نے چنٹ موہن داس کی بیٹی اور دوسرے کمزور ہندوؤں کو جبرا مسلمان بنالیا ہے۔ اگر تم ان گیلانیوں کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکتے تو میری فوجیں تیار کھڑی ہیں۔ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ اس بار صلح کی بات نہیں ہوگی۔ ہندو قوم پر کئے جانے والے ایک ایک ظلم کا حساب لوں گا۔ میری بیٹی یا کسی شہیرا کی وقت نیاں میں جائے گی جب تمہارے کاندھوں پر تمہارا سر موجود نہیں ہوگا۔“

پیشوائے پونا، مادھوراؤ کا خط سن کر نواب حیدر علی کے دل و دماغ ملگ اٹھے۔ وہ ایک خود مختار حکمران تھا لیکن مادھوراؤ کے خط سے یہی تاثر ملتا تھا کہ حیدر علی اس کا غلام ہے یا بجر خراج گزار ہے۔ پیشوائے پونا کے مختصر آمیز طرز تحریر نے والی میسور کے سینے میں آگ لگا دی تھی۔ کچھ دیر کے لئے حیدر علی بے قابو سا ہو گیا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ سر دربار مادھوراؤ کا خط چاک کر ڈالے اور قاصد سے کہہ دے کہ پیشوائے پونا کے خط کا یہی جواب ہے۔ مگر حیدر علی کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی قوت برداشت عطا کی گئی تھی۔ اس لئے وہ بدترین حالات میں بھی اپنے آپ کو مشتعل نہیں ہونے دیتا تھا۔ بس چند لمحوں کی بات تھی۔ طوفان آیا اور چپ چاپ گزر گیا۔ اب والی میسور انتہائی پرسکون نظر آ رہا تھا۔

بدلا مگر صورت حال کی سبب سے بے قابو نہیں ہونے دیا۔

”پنڈت موہن داس اور اس کی بیٹی کو دربار میں حاضر کرو۔“ یکا یک حیدر علی کی بارعب آواز گونجی۔

پیشوائے پونا کے قاصد اور ہندو گیانیوں کو محسوس ہوا کہ جیسے دربار میں زلزلہ سا آگیا ہے۔



ایک ہی وقت میں کچھ مسلح سپاہی پنڈت موہن داس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ اور کچھ سرنگاپٹم کے یتیم خانے کی جانب جہاں آج کل سرتیادویو مقیم تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد تمام سپاہی ناکام لوٹ آئے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ”ہم نواب بہادر کے حکم کی تعمیل سے قاصر رہے۔“

”وجہ.....؟“ حیدر علی کی آواز اتنی بلند تھی کہ حاضرین کو دربار سرنگاپٹم میں دوسری بار زلزلے کا احساس ہوا۔

”ہم نے بہت دیر تک پنڈت موہن داس کو آوازیں دیں مگر جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو مجبوراً ہم لوگوں کو گھر میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں ایک ناقابل یقین منظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ پنڈت موہن داس اور اس کی ماں بملا دیوی کی لاشیں آگن میں پڑی ہوئی تھیں اور ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ انہیں کسی نے بڑی سفاکی کے ساتھ قتل کر دیا ہے۔ دونوں ماں بیٹے کی گردنیں ان کے جسموں سے جدا ہیں.....“

ابھی سپاہی کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دربار پونا کا ایک گیانی اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور چیخ کر کہنے لگا۔

”یہ سارا ناک والی میسور کے خفیہ اشارے پر چایا گیا ہے تاکہ پنڈت موہن داس اور ان کی ماں، نواب بہادر کے خلاف گواہی نہ دے سکیں۔ ہمیں یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔“ گیانی کی آواز معمول سے بہت زیادہ تیز تھی۔

”خاموش ہو جا گیانی!“ یکا یک حیدر علی غضب ناک نظر آنے لگا۔ ”کیا تو دربار پونا میں اسی طرح اونچی آواز سے بولتا ہے؟..... پیشوائے تھے کو اپنا سفیر بنا کر بھیج دیا لیکن گنگو کا پلٹہ نہیں سکھایا۔ اگر مجھے آدابِ سفارت کا لحاظ نہ ہوتا تو تم سب کی زبانیں کاٹ کر مادھوراؤ کے پاس بھیج دیتا۔“

پونا کے قاصد اور گیانیوں کو حیدر علی کی شخصیت کے اس پہلو کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ سمجھ رہے تھے کہ مادھوراؤ کی فوجی طاقت کا ذکر آتے ہی والی میسور گھنٹوں کے بل بجک جائے گا۔ مگر جب حیدر علی نے گیانی کو سر دربار ڈانٹ دیا تو پیشوائے پونا کے چاروں نمائندوں کے چہروں پر خاک اڑنے لگی۔

اگر حیدر علی کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو پنڈت موہن داس اور بملا دیوی کے قتل کی خبر سن

کر گھبرا جاتا۔ لیکن وہ بہر حال ”مرد و بحران“ تھا۔ ایک لمحے کے لئے والی میسور کے چہرے پر تڑپیں کا ہلکا سا عکس اُبھرا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے سپاہیوں سے پوچھنے لگا۔

”اور سرتیا کہاں ہے؟“

”وہ یتیم خانے میں موجود نہیں ہے۔“ ریاست میسور کے سپاہی نے سہمے ہوئے لہجے میں

کہا۔ پونا کے نمائندوں کے چہروں پر ناقابل بیان خوشی جھلکنے لگی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ حیدر علی نے اپنی حیات کے سبب پنڈت موہن داس اور بملا دیوی کو قتل کرانے کے بعد سرتیا کو کہیں چھپا دیا ہے تاکہ والی میسور کے مظالم کے خلاف شہادت دینے والا کوئی گواہ باقی نہ رہے۔ ان کے خیال میں اب ریاست میسور پر مادھوراؤ کی فوج کشتی کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔

سپاہیوں کے اس انکشاف پر کہ سرتیا، یتیم خانے سے غائب ہے، حیدر علی کو تعجب ضرور ہوا تاہم اس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی یا حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

”بھروسہ کہاں چلی گئی؟“ والی میسور کے لہجے میں وہی ٹھہرا ہوا تھا۔

”یتیم خانے کے چوکیدار، ہریانے بتایا کہ سرتیا گزشتہ رات کسی کام سے باہر گئی تھی، پھر وہ لوٹ کر نہیں آئی۔“ سپاہیوں نے اپنی مختصر سی معلومات نواب حیدر علی کے گوش گزار کر دی تھیں۔

پنڈت موہن داس اور بملا دیوی قتل ہو چکے تھے۔ اور سرتیا کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ دشمنوں نے عجب جال چلی تھی کہ اپنے جرائم کا ہلکا سا سراغ تک نہیں چھوڑا تھا۔ سازش اتنی مکمل تھی کہ تمام جڑے ہلے پردہ تھے اور سارا الزام حیدر علی کے سر آ گیا تھا۔ اب وہ کس بنیاد پر ثابت کرتا کہ سرتیا نے اپنی مرضی سے ہندو مذہب ترک کیا تھا؟ اہل دربار نے محسوس کیا کہ آفات و مصائب کے ہجوم میں بھی مسکرانے والا، ذہنی طور پر اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ حیدر علی کے کشادہ ماتھے پر کئی بل لپٹا ہوا ہو گئے تھے اور وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

یکایک پیشوائے پونا کا قاصد اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور والی میسور کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”نواب بہادر! شاید اب سرنگاپٹم میں ہمارے قیام کی ضرورت باقی نہیں رہی۔“

”کیوں؟“ حیدر علی کے لہجے میں وہی طنطنہ تھا۔ وہ ایک لمحے میں اپنے خیالات کے گرداب سے نکل آیا تھا۔

”مذہبی سرچکے اور گواہ موجود نہیں۔ پھر اس مقدمے کا فیصلہ کیوں کر ہوگا؟“ مادھوراؤ کے قاصد کے ہونٹوں پر شدید طنزیہ مسکراہٹ تھی اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ قاصد کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”میرے خیال میں اب اس کا فیصلہ، محترم پیشوا پر چھوڑ دیجئے کہ وہی سب سے بڑے منصف ہیں۔“

”پیشوا کیوں؟“ ایک بار پھر نواب حیدر علی کی پیشانی ٹکٹوں سے بھر گئی۔ ”مقدمہ میری عدالت میں ہے اور فیصلہ پیشوا کریں گے؟“

”ہم لوگ پٹت موہن داس کے کریا کرم میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔“ پونا کے قاصد نے اپنی ایک اور خواہش کا اظہار کیا۔  
”میں نے تمہیں کہیں جانے سے نہیں روکا ہے۔ مگر شرط وہی رہے گی۔“ یہ کہہ کر حیدر علی اٹھ کھڑا ہوا۔



پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا مگر اس کے باوجود ہزاروں ہندو اپنے گھروں سے نکل کر پٹت موہن داس کے مکان پر جمع ہو رہے تھے۔  
موہن داس چونکہ ایک باکردار زمین تھا، اس لئے اکثر ہندو اسے عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور آج بھی عقیدت انہیں پٹت کی آخری رسوم میں شریک ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔ راجہ کرشنا نے اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ موہن داس کے قتل کی خبر ملتے ہی اس کے مکان پر پہنچ گیا تھا اور پٹت کے آخری دیدار کے لئے آنے والے لوگوں سے چیخ مچا کر کہہ رہا تھا۔

”اب کیا دیکھنے آئے ہو؟ موہن داس ہلاک نہیں ہوا، ہندو دھرم کو قتل کر دیا گیا ہے۔“  
راجہ کرشنا کی جذباتی تقریر سن کر سادہ لوح ہندو رونے لگے تھے۔ میسور کے سابق حکمران نے لوہے کو گرم پا کر بڑی عیاری کے ساتھ ایک اور کاری ضرب لگائی۔

”ابھی کیا ہوا ہے؟ بس خاموشی سے دیکھتے رہو کہ کیا کیا ہونے والا ہے۔ پہلے میرے اندر پر ڈاکہ ڈالا گیا، پھر ایک برہمن زادی کو اس کا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ جب بیڑائے پونا نے ہندوؤں کی دادرسی کے لئے اپنے نمائندوں کو بھیجا تو موہن داس کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔“ راجہ کرشنا دربار کی پوری کارروائی کو با آواز بلند بیان کر رہا تھا۔ اگرچہ وہ دربار سرگٹھم میں موجود نہیں تھا لیکن اس کے جاسوس ایک ایک لمحے کی خبر پہنچا رہے تھے۔ اور راجہ کرشنا ان ہی خبروں کو غلط انداز میں پیش کر کے ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”ابھی تم سب اپنے اپنے گھروں میں سکھ کی نیند سوتے رہو۔ پھر جب آنکھ کھلے گی تو تمہیں پڑے گا کہ دھوکوں کا سیلاب سب کچھ بہا کر لے گیا ہے۔ نہ تہجاری جانیں بچیں گی، نہ دیوتا اور نہ دھرم۔“

”پھر ہم کیا کریں مہاراج؟“ غم زدہ ہندوؤں نے سسکتی ہوئی آوازوں میں پوچھا۔ ”ہم بہت مجبور ہیں۔“

”مجبور نہیں، بے غیرت اور بزدل ہو۔“ راجہ کرشنا نے بڑے جارحانہ لہجے میں اپنی قوم کی غیرت کو لکڑا کر ”اور کچھ نہیں کر سکتے تو موہن داس جیسے ”مہاتما“ کی لاش کو لے کر سرگٹھم کی شاہراہوں پر نکل آؤ اور ساری دنیا کو بتاؤ کہ ہندوؤں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔“  
پٹت کی آخری کے جلوس کی قیادت کروں گا۔ اتنا جینو کہ آسمان سر پر اٹھا لو۔ محترم پیشوا کے

”آپ کا دامن بے داغ سہی مگر سننے والے تو یہی سوچیں گے کہ نواب بہادر نے اپنے غم کے سارے نشانات مٹا دیئے۔“ پونا کے قاصد کا لہجہ بہت سرد تھا مگر اس کی سانس کی زہریلا سائیں کی چمکناہٹوں سے ممانگت رکھتی تھیں۔

”پیشوا کے اپنی کو معلوم ہونا چاہئے کہ مجھے بزدلوں کی سیاست نہیں آتی۔“ حیدر علی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ اُبھر آئی جو ایک مرد شجاع اور فاتح کی مسکراہٹ تھی۔ ”یہ تمہارے چاکر کی سیاست ہو سکتی ہے کہ کسی شخص کو قتل کرو اور خود ہی مقتول کے سر ہانے بیٹھ کر اس کی موت پر بین کرنے لگو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے دشمنوں نے میری جتنی ہوئی رعایتوں سے فائدہ اٹھایا اور اندھیرے میں اپنی چال چل گئے۔ مگر ایسی بزدلانہ چال سے بازی نہیں جیتی جا سکتی۔“  
حیدر علی کی بارعب آواز سے سرگٹھم کا پورا دربار گونج رہا تھا۔ ”میرے دشمنوں کو چال پلٹے وقت یہ اندازہ نہیں رہا کہ ان کے مقابل شاطر کون ہے؟“

پیشوائے پونا کا قاصد بھی بڑا عیار تھا۔ وہ اپنے انداز گفتار سے ہندوؤں کے مشہور بات داں، چالکیہ کا شاگرد ہی معلوم ہوتا تھا۔ ”نواب بہادر کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟“ مادھوراؤ کے اپنی نے مکارانہ خصوصیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جس کے جاد و جٹال سے لوگ اپنے گھروں کے اندر بھی سپہ ہوئے رہتے ہیں، اس شخص کے خلاف سازش؟..... بڑی انہونی بات معلوم ہوتی ہے۔“

”میں اپنے دشمن کو پہچان گیا ہوں۔ مگر میرے مذہب میں بدگمانی حرام ہے۔“ والی میو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بس چند روز کی بات ہے۔ پھر میرے ہاتھ اور اس کے گریبان میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہے گا۔“

”نواب بہادر اپنے دشمن کو تلاش کریں لیکن ہمیں اجازت دیں کہ ہمارے لئے اتنے دن ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔“ مادھوراؤ کے اپنی نے لہجہ بدل کر بڑے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”تم لوگ میری مرضی کے بغیر سرگٹھم کی حدود سے باہر نہیں جاسکتے۔“ نواب حیدر علی نے پیشوائے پونا کے نمائندوں سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”جب تک تمہیں تمہارے سوال کا جواب نہیں مل جاتا، اس وقت تک تم حکومت میسور کے مہمان خصوصی ہو۔ جہاں جانا چاہو، آزادانہ سے جاؤ مگر میرے سپاہیوں کے پیروں میں۔“

”آخر ہمارے لئے یہ قید و بند کیوں؟“ مادھوراؤ کے قاصد نے سوال کیا۔  
”تمہاری حفاظت اور سلامتی کے لئے۔“ حیدر علی نے اپنے حکم کی وضاحت کی۔ ”جو لوگ پٹت موہن داس اور بملا دیوی کو قتل کرنے کے بعد سریتا کو تہیم خانے سے انکار کرتے ہیں، تمہیں بھی جانی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اور میں یہ نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔“ دینے والے نے موہن داس اور اس کی ماں کے بہیمانہ قتل پر بھی بہت آنسوئے۔ حالانکہ وہ میرے ہم مذہب ہی عقیدہ نہیں تھے۔“

حیدر علی نے ان ہندو نوجوانوں پر ایک اچھتی سی نظر ڈالی۔ کرائے کے غلام، والی میسور کے جلال کی تاب نہ لا سکے۔ ان کی نظریں جھک گئیں اور آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ حیدر علی تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ راجہ کرشنا، موہن داس کے گھر کے دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، سر پر دستار موجود نہیں تھی اور وہ خود کو چنڈت کی موت کے غم میں بہت زیادہ مغموم اور ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حیدر علی، میسور کے سابق حکمران کو دیکھ کر ٹھہر گیا اور بڑے معنی خیز انداز میں راجہ کرشنا سے مخاطب ہوا۔ ”مہاراج! آپ اور یہاں؟“

”آپ کو معلوم نہیں کہ مہاتما موہن داس کا قتل ہو گیا؟“ راجہ کرشنا کے لہجے سے شدید طنز جھلک رہا تھا۔

”اگر بے خبر ہوتا تو یہاں کیوں آتا؟“ حیدر علی نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”مگر یہ راز سمجھ میں نہیں آیا کہ چنڈت موہن داس نے یہی ”مہاتما“ کیسے ہو گیا؟ کل تک تو وہ آپ کی نظروں میں اس دنیا کا سب سے بڑا بالکل تھا۔ آپ تو سوامی بھیرول جیسے انسان ہی کو ”مہاتما“ کا درجہ دے سکتے ہیں۔ پھر یہ انقلاب کیوں؟“ حیدر علی نے چند الفاظ میں سب کچھ بیان کر دیا تھا مگر راجہ کرشنا نے والی میسور کی باتوں کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ وہ بڑی بے حیائی اور عیاری کے ساتھ سیاست کی بساط پر آخری بازی کھیل رہا تھا۔

”موہن داس ”مہاتما“ تھا اور اسی حیثیت سے وہ میسور کے اتھاس (تاریخ) میں امر ہو جائے گا۔“ راجہ کرشنا نے موہن داس کی تعریف کر کے جھوٹ اور منافقت کی عجیب مثال پیش کی۔ ”دھروں کی نظر میں موہن داس قتل ہوا ہے مگر میرے نزدیک اس نے ہندو دھرم کو بچانے کے لئے اپنی جان کی قربانی دی ہے۔ اسے شہید کیا گیا ہے اور میں اپنے شہید کو آخری سلام پیش کرنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔“ یکایک راجہ کرشنا کی آواز بلند ہو گئی تھی تاکہ دوسرے ہندو بھی اس کی گفتگوں سنیں۔

نواب حیدر علی، راجہ کرشنا کی بے حسی اور بے شرمی پر حیران رہ گیا۔ ”بے شک! آپ اپنے شہید کو آخری سلام پیش کریں مگر بہت احتیاط اور ذمے داری کے ساتھ۔ امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔“ والی میسور نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور راجہ کرشنا کے ہرے کے تاثرات دیکھے بغیر موہن داس کے گھر میں داخل ہو گیا۔

بلا درود خیر اور عبرت ناک منظر تھا۔ موہن داس اور اس کی ماں، بملا دیوی کے سر الگ الگ تھے۔ دونوں کی آنکھیں اٹکی ہوئی تھیں اور چہروں پر ناقابل بیان دہشت چہر کی لیکر دھڑک رہی تھی۔ مگر وہ کسی بھی طرح کی قوت کو یابی چھین لی۔ بس راجہ کرشنا کے خریدے ہوئے ان چند نوجوانوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو چنڈت کے گھر کے دروازے کے قریب کھڑے بیٹھے تھے۔

نمائندے یہاں موجود ہیں۔ ان کی سماعتوں تک اپنی آوازیں پہنچا دو۔ پونا کے لاکھوں پانی اس طرح پابہ رکاب ہیں کہ تم انہیں پکارو اور وہ تمہاری درد بھری فریاد سن کر دوڑ پڑیں اور عاصم حیدر علی کے تاج و تخت کو اپنے گھوڑوں کے سموں سے روند ڈالیں۔ قسمت نے تمہیں یہ آخری موقع دیا ہے۔ اگر اسے بھی گنوا دیا تو زندگی بھر اپنے سینے کھرچتے رہو گے اور تمہارے دشمنوں پر ہم رکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔“

راجہ کی یہ جذباتی تقریر سن کر ہندوؤں کے مجمع پر سناٹا چھا گیا تھا۔ پھر یکایک کی مشتعل ہندو نوجوانوں کی تیز آوازیں ابھریں۔ وہ اپنے دل کی طاقت سے نعرہ زنی کر رہے تھے۔ ”ایسا ہی ہوگا مہاراج! ہم مہاتما موہن داس کے قاتلوں سے انتقام لیں گے۔ اور ہندو دھرم کے دشمنوں کو اس دھرتی پر جیتے نہیں دیں گے۔“

ان تمام نوجوانوں کی آوازوں کو راجہ کرشنا نے اپنی دولت سے خرید لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان سب نے چیختے چیختے اپنے گلے پھاڑ لئے تھے اور گریبانوں کو چاک کر ڈالا تھا۔ پھر ہندوؤں کی باقی جہوم بھی ان جذباتی نعروں کے شور میں بہہ گیا۔ اور سرنگا چم کی فضا بت پرستوں کے ان مطالبے سے گونجنے لگی۔

”مہاتما موہن داس کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو۔“ اسی دوران نواب حیدر علی اپنے چند سپاہیوں کے ہمراہ موہن داس کے گھر پہنچا۔ والی میسور کو آتے دیکھ کر راجہ کرشنا نے ہندوؤں کے جہوم سے چیخ کر کہا۔

”وہ آ رہا ہے ہندو دھرم اور ”رام راج“ کا سب سے بڑا دشمن۔ اپنی آوازیں تیز کر دو اور اسے بتا دو کہ ہندو عظیم ترین اور انہیں کسی غیر ہندو کی غلامی قبول نہیں۔“ ایک بار پھر کرائے کے ہندو نوجوان گلا پھاڑ کر چیختے لگے۔ باقی جہوم کی آوازیں بھی ان کی آوازوں میں شامل تھیں۔

نواب حیدر علی، جہوم کے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑے سے اتر گیا اور شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ریاست میسور کے سپاہی کوشش کر رہے تھے کہ وہ حفاظتی تدبیر کے طور پر نواب کو اپنے جلو میں رکھیں مگر حیدر علی اس قدر تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا کہ تمام حفاظتی فوجی پیچھے رہ گئے تھے۔ والی میسور کو اپنی طرف آنا دیکھ کر بت پرستوں کی بھیڑ خود بخود قطاروں میں بٹ گئی۔ حیدر علی نے ایک لمحے کے لئے رک کر اپنے دائیں جانب نظر ڈالی تو چیختے والے ہندوؤں نے نظریں جھکا لیں اور وہ کسی پتھر کی طرح ساکت ہو گئے۔ پھر وہ اپنی بائیں جانب پلٹا اور اس کے رعب و جلال نے مشتعل ہندوؤں سے قوت گویائی چھین لی۔ بس راجہ کرشنا کے خریدے ہوئے ان چند نوجوانوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو چنڈت کے گھر کے دروازے کے قریب کھڑے بیٹھے تھے۔

”مہاتما موہن داس کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو۔“



”سرکار! میں اپنی خطا پر بہت شرمندہ ہوں۔ خدا کے لئے اب مجھے معاف کر دیا جائے۔ میں زیادہ دن تک آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ کی نظروں سے دور ہوئے ایک ماہ گزر گیا مگر کسی رات بھی چین سے نہیں سو سکا۔

والی میسور نے مسعود خاص کی یہ انتہائی کیفیت برداشت نہ کر سکا اور بے اختیار اس نے شجاعت خان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تجھ سے بچ کر چین سے تو میں بھی نہیں ہوں۔“ شجاعت خان کو پہیلی بار احساس ہوا تھا کہ حیدر علی کی محبت میں مسند کی طرح گہرائی ہے۔

”سرکار۔۔۔“ شجاعت خان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی حیدر علی نے شجاعت خان کو ڈانٹ دیا۔ ”ہر روز کی طرح آنسو بہاتا ہے۔ جا! راجہ کرشنا پر نظر رکھ۔ وہ فتنہ گر، موہن داس کے قتل کی آڑ میں پھر کوئی چال چل رہا ہے۔“

حیدر علی نے شجاعت خان کا قصور معاف کر دیا تھا۔ پھر وہ تیزی سے راج محل کی طرف چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد سرنگاپٹم کے کنگی کوچوں میں فوجی ہی فوجی نظر آ رہے تھے۔



ایک ایک سر پیر کے قریب محل کے صدر دروازے پر انسانی شور مٹائی دیا۔ قلعے کے ایک محافظ سپاہی نے فوراً ہی حیدر علی کو اطلاع دی کہ موہن داس کی آخری کا جلوس دروازے پر آ کر ٹھہر گیا ہے۔ اور راجہ کرشنا اس جلوس کی قیادت کر رہا ہے۔ والی میسور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر باہر نکل آیا۔ ہندوؤں کا جھوم پر شور مچنے لگا رہا تھا۔

”آج سرنگاپٹم میں ہندو بھی بے اماں ہیں اور ہندو دھرم بھی۔ نواب بھادرا! آپ کا انصاف کہاں ہے؟ مہاتما موہن داس قتل کر دیئے گئے اور آپ کا قانون، محل کی اونچی دیواروں کے سامنے میں کون کی نیند سوتا رہا۔ مہاتما کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کیجئے۔“

حیدر علی کو یہ راز سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ راجہ کرشنا ہندوؤں کے جھوم کو غلط کر پڑا فریب نروں کے ساتھ محل تک لے آیا ہے۔ والی میسور کسی حفاظتی انتظام کے بغیر تیزی سے آگے بڑھا اور راجہ کرشنا کے قریب پہنچ گیا جو بال بکھرائے، ننگے پاؤں مٹاہرن کے آگے کھڑا تھا۔

”آپ نے میری ہدایات کو لائق التفات نہیں سمجھا؟“ حیدر علی کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔ ”میں آخری بار تنبیہ کرتا ہوں کہ اپنی ذات کو متاثر نہ بنائیں۔ موہن داس کا قتل ایک عام قتل ہے۔ اس پر مذمتی نفرت و تعصب کی عمارت کھڑی نہ کریں۔ وقت کو گزرتا ہے اور وہ گزر جائے گا۔ پھر یہ سب بنیاد عمارت خود آپ ہی پر گر جائے گی اور کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔“

جواب میں راجہ کرشنا نے کچھ کہا مگر حیدر علی نے اسے دیوانے کی صدا سمجھ کر منہ پھیر لیا۔ ”شجاعت خان!“ والی میسور نے اپنے مسعود خاص کو مخاطب کیا۔ ”جب تک یہ مظاہرین برائے امن رہیں، انہیں کچھ نہ کہنا مگر جیسے ہی کوئی فتنہ گر قانونی حدود سے نکل کر شر انگیزی کے

قتل کیا تھا کہ اگر ہندو قوم اپنے مذہبی رہنما کی لاش دیکھے تو اس کے جذبات برا بھلا سمجھتا ہو جائے گا۔ حیدر علی کچھ دیر تک مردہ جسموں کے قریب کھڑا انسانی زندگی کی بے ثباتی پر غور کرتا رہا اور اچانک اس کی سماعت میں سید صاحب کے الفاظ گونجنے لگے۔

”موہن داس سے کہہ دو کہ وہ اپنی ظالمانہ حرکتوں سے باز آ جائے ورنہ اس کے پاس دفر بہت کم ہے۔“

سید اکرام بخاری کا خیال آتے ہی والی میسور کے جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری ہو گیا۔ سید صاحب قبل از وقت موہن داس کی ہلاکت سے باخبر ہو گئے تھے یا پھر پنڈت کی موت پر صاحب کی دل آزاری کا نتیجہ ہے کہ وہ ان کی شاگردیتا دیوی پر وحشیانہ مظالم ڈھا رہا تھا۔ ”حیدر علی کچھ دیر تک اپنے خیالات میں الجھتا رہا اور پھر موہن داس کی لاش پر آخری نظر ڈال کر آہستہ آہستہ باہر آیا۔

راجہ کرشنا کی ہدایت کے مطابق ہندو نوجوان چیخ رہے تھے۔ ”موہن داس کے قاتلوں ہمارے حوالے کیا جائے۔“

والی میسور سمجھ گیا تھا کہ یہ سب کچھ راجہ کرشنا کی شرارت ہے۔ ”مت کر دیا ہے میں مطالبہ کہ جس سے عدالت اور قانون پر حرف آئے۔“ ایک ایک حیدر علی کی بارعب آواز گونجی۔ چیخنے ہوئے جھوم پر سناٹا چھا گیا۔ ”کیا میں نے موہن داس کے قاتلوں کو اپنے محل میں بنادے رکھی ہے؟“ یہ کہتے کہتے والی میسور کے چہرے پر آتش جلال بھڑک اٹھی تھی اور اس کا لہجہ انتہائی غضب ناک ہو گیا تھا۔ ”میں پنڈت کے قاتلوں کو تمہارے حوالے کیوں کروں گا؟ کیا میں عدالت اتنی کمزور ہے کہ وہ مجرموں کو سزا دینے سے قاصر رہے گی؟ اس لئے ہوش دھواں میں گرفتار نہ رہو۔ ورنہ میرا قانون دیوانوں کو زنجیر پہنانا خوب جانتا ہے۔“ یہ کہہ کر راجہ حیدر علی واپس جانے کے لئے آگے بڑھا۔

راجہ کرشنا کے خریدتے ہوئے نوجوان اور دوسرے ہندو اس طرح خاموش ہو گئے تھے وہ اچانک قوت گویائی سے محروم ہو گئے ہوں۔

حیدر علی انسانی جھوم کے درمیان سے گزرتا ہوا چند قدم اور آگے بڑھا تو اسے شجاعت خان کے چاروں نمائندے نظر آئے۔ وہ سب کے سب مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں یہاں تک پہنچے تھے۔ والی میسور چند لمحوں کے لئے ان کے پاس ٹھہرا۔ ”اب اعذارہ ہو گیا ہو گا کہ آپ میری مملکت میں کتنے آزاد ہیں۔ مگر اس آزادی سے غلط فائدہ نہ اٹھانا کہ میں اپنے محافظوں میں کسی کی بے جا مداخلت پسند نہیں کرتا۔“

حیدر علی، پونا کے نمائندوں کو تنبیہ کرتا ہوا آگے بڑھا تو اسے شجاعت خان دکھائی دیا۔ اسے پہلے کہ والی میسور اپنے نائب سپہ سالار سے اس کی موجودگی کے بارے میں دریافت کر شجاعت خان خود ہی بول اٹھا۔

کے سائے میں محل سے نکل کر سید اکرام بخاری کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ سید صاحب اس وقت تہجد کی نماز ادا کر چکے تھے اور اپنے اورداد و وظائف میں مشغول تھے، دروازے پر مسلسل دستک سن کر باہر نکل آئے اور والی میسور کو اپنے سامنے پا کر حیران رہ گئے۔

”میرا نظام جاسوسی ناکارہ ثابت ہو چکا۔ اس لئے آپ کے پاس چلا آیا۔ میرے حق میں دماغے خیر سمجھئے۔“ یہ کہہ کر حیدر علی نے پیشوائے پونا کے قاصد کی آمد سے لے کر پنڈت موہن داس کے قتل اور سریتا کی روپوشی تک کے تمام واقعات سید صاحب کے گوش گزار کر دیئے۔ ”ہاہو راؤ پہلے ہی سرنگاپٹم پر حملہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اب موہن داس کا قتل اس کے لئے ایک جواز فراہم کر دے گا۔“

سید صاحب نے والی میسور کی زبانی سارے واقعات سنے اور گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر مختلف رنگ ابھر ابھر کر ڈوب رہے تھے۔ سید صاحب بہت دیر تک اسی حالت میں بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے آنکھیں کھول لیں۔ ”پنڈت نہیں مانا اور خاک و خون میں نہا گیا۔ اس کی آخرت تو خراب تھی ہی، نادان نے اپنی دنیا بھی خراب کر ڈالی۔“ سید اکرام بخاری عجیب سے عالم جذب میں بول رہے تھے۔ ”انہی کیا ہوا ہے؟ ابھی بہت خون بہے گا۔ پھر بہت سوں کی دنیا خراب ہوگی۔ منکر اور ناشکرے ہیں، اس لئے کئے کی موت مارے جائیں گے۔“ سید صاحب بہت پراسرار اور مبہم باتیں کر رہے تھے۔ نواب حیدر علی ایک مردِ خاک کے اشاروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔

”سید عالی مقام! پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟“ والی میسور نے بہت آہستہ سے کہا۔ سید کے جلال نے گرد و پیش کی پوری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جس کے اثرات سے حیدر علی کو اپنے دل کی دھڑکنیں بے ربط محسوس ہونے لگی تھیں۔

”کئی راتوں کا جاگا ہوا ہے، جبین سے جا کر سو جا۔“ سید صاحب کی جلائی کیفیت ختم ہو گئی۔ ”اب وہ حالتِ بحال میں نظر آ رہے تھے۔“

”کیسے سو جاؤں؟ کوئی سونے ہی کب دیتا ہے؟“ نواب حیدر علی کے لہجے میں انتہائی کرب بھی شامل تھا اور بے پناہ تنگی بھی۔

”عمدہ و منصب کا طلب گار ہے تو نیندیں بھی حرام کرنا ہوں گی اور آرام و آسائش کا خون بھی بہانا ہوگا۔“ سید صاحب کا لہجہ حسبِ سابق نرم مگر پُر سوز تھا۔

”منصب بھی خطرے میں ہے اور دستارِ فضیلت بھی۔“ حیدر علی کے اضطراب میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ”دشمنوں نے عجیب چال چلی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”مُن کیا اور ان کی چالیں کیا۔“ سید صاحب مسکرائے لگے۔ ”اپنے خدمت گاروں کو حکم دے کر وہ اسی وقت ایک بڑی اور پندرہ چھوٹی میٹھیں لے آئیں۔“

حیدر علی نے سید صاحب کی بات کو بڑی حیرت سے سنا۔ پھر وہ حجرے سے نکل کر

دائرے میں قدم رکھے، اسے بے دریغ گولی سے اڑا دیتا۔“ یہ حکم دے کر حیدر علی محل میں داخل چلا گیا۔

راجہ کرشنا کے اشارے پر مظاہرین کچھ دیر صدر دروازے پر کھڑے نعرہ زنی کرتے رہے، پھر یہ جلوس سرنگاپٹم کی مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا شمشان گھاٹ پہنچ گیا اور رات کے اندر سردیوں میں موہن داس اور بیلا دیوی کی چتاؤں کو آگ لگا دی گئی۔



تین دن تک راجہ کرشنا کی قیادت میں ماتمی جلوس نکالے جاتے رہے اور پنڈت موہن داس کے قاتلوں کو سخت ترین سزا دینے کا مطالبہ جاری رہا۔ اس دوران پیشوائے پونا کے نمائندے بھی جلوس کے ساتھ سرنگاپٹم کی مختلف شاہراہوں پر سفر کرتے اور مقامی ہندوؤں کی جذباتی کیفیات کا جائزہ لیتے رہے۔ اس وقت پورے ہندوستان میں نواب حیدر علی کا نام گروہ شعبہ جاسوسی سب سے زیادہ باصلاحیت اور فعال تھا۔ والی میسور کے سینکڑوں جاسوس موہن داس کے قاتلوں کی تلاش میں در بدر مارے پھر رہے تھے۔ مگر انہیں اب تک مجرموں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ رات گئے ناکامی کی حالت میں محل واپس لوٹے اور انتہائی شرمسارانہ لہجے میں نواب حیدر علی کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیتے۔

پیشوائے پونا کے نمائندے دن بھر جلوس کے ہمراہ گلیوں کی خاک چھانٹتے پھرتے اور رات کو والی میسور کے روبرو ہندو رعایا کے حوالے سے شدید طنزیہ گفتگو کرتے رہے۔

”نواب بہادر! عام لوگوں کا خیال ہے کہ آپ اس سلسلے میں غفلت سے کام لے رہے ہیں ورنہ اب تک مہاتما موہن داس کے قاتل اپنے انجام کو پہنچ چکے ہوتے اور سریتا کا کوئی نہ کوئی سراغ مل چکا ہوتا۔“

حیدر علی دل ہی دل میں سچ و تاب کھاتا رہتا مگر پونا کے نمائندوں کے سامنے مشتعل نہ ہوتا۔ ”قاتل بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔“

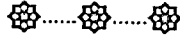
”آخر کب تک؟“ پیشوا مادھو راؤ کا قاصد جھنجھلا جاتا۔ ”ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔“

”ایک ہفتہ، ایک ماہ یا پھر ہو سکتا ہے کہ ایک سال تک تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑے۔“ حیدر علی فیصلہ کن لہجے میں جواب دیتا۔ ”انتظار کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔“

یہ تیسری رات تھی کہ حیدر علی ایک لمحے کے لئے نہیں سویا تھا۔ وہ رعایا جو اسے ”دیوتا“ کہہ کر پکارتی تھی، راجہ کرشنا کی باتوں میں آکر اس کے بے داغ کردار پر خشک کرنے لگی تھی۔ ریاست کا استحکام خطرے میں پڑ گیا تھا اور اسی وجہ سے حیدر علی بے خوابی کا شکار تھا۔ اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل اور سرخ تھیں اور اعصاب شکستہ ہوتے جا رہے تھے۔ تمام مشیران سیاست سر جوڑ بیٹھے تھے مگر اس مشکل ترین مسئلے کا حل نظر نہیں آ رہا تھا۔

یہ ایک حیدر علی کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی اور وہ چند سپاہیوں کے ہمراہ نصف شب

ہوتا ہے۔“ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ ناقابل یقین تھا۔ اگر یہی صورت حال کسی اور جگہ پیش آئی ہوتی تو حیدر علی اسے اپنی آنکھوں کا فریب یا ایک شعبہ باز کے فن کی کرشمہ سازی سمجھتا۔ لیکن اس وقت وہ سید اکرام بخاری کے مکان میں موجود تھا اور سید صاحب اپنی تمام ہنوں سے پاک تھے۔ حیدر علی چپ چاپ وہ رومال اٹھا کر محل کی طرف روانہ ہو گیا۔



مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم شدید بدحواسی کے عالم میں بار بار شجاعت خان سے پوچھ رہی تھیں۔ ”نواب بہادر کہاں گئے؟“ ”تو نے انہیں تنہا کیوں جانے دیا؟“ ”میں نے عرض کیا تھا۔ مگر سرکار راضی نہیں ہوئے۔“ شجاعت خان بھی بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

”خدا خیر کرے۔“ بیٹے کی مسلسل پریشانیاں نے ان جیسی آہنی اعصاب رکھنے والی خاتون کو بھی رُلا دیا تھا۔

”باب کی طرح ضدی ہے۔ جب کوئی فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر کسی کی نہیں سنتا۔“ مجیدہ بیگم کو متول شوہر شیخ محمد کی یاد آتی تو ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو کچھ اور تیز ہو گئے۔

”تُو خود جا کر کیوں نہیں دیکھتا کہ سرکار کہاں گئے ہیں؟“ فاطمہ بیگم نے شجاعت خان کو دانٹے ہوئے کہا مگر ان کی آواز سے بھی رقت جھلک رہی تھی اور آہستہ آہستہ پلکیں بھیگتی جا رہی تھیں۔

”میرے لئے سرکار کا یہی حکم ہے کہ قلعہ سے باہر نہ جاؤں اور ہر شخص کی حرکات و سکنات پر نظر رکھوں۔“ شجاعت خان نے والی میسور کی مادر گرامی اور شریک حیات سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے میں نے قلعے کے محافظ سپاہیوں کو اس کام پر مامور کر دیا ہے کہ سرکار کے نظر آتے ہی وہ آپ کو خبر کر دیں گے۔“

”تجھے کچھ اندازہ ہے کہ حیدر علی اس وقت کہاں جا سکتا ہے؟“ مجیدہ بیگم کا اضطراب حد سے گزر چکا تھا اور وہ شجاعت خان سے بار بار ایک ہی سوال کئے جا رہی تھیں۔

”یقیناً کوئی ایسی بات ہے کہ جسے پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ سرکار اتنی رازداری سے کام نہیں لیتے۔“ شجاعت خان خود بھی حیران و پریشان تھا۔ ایسی سنگین فضا میں آدھی رات کے وقت والی میسور کا صرف چند سپاہیوں کے ہمراہ کسی نامعلوم مقام کی طرف چلے جانا، ایک انتہائی باہر اعلیٰ تھا۔

ابھی خواتین معظمہ کی وحشتیں برقرار تھیں کہ قلعے کا ایک محافظ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ نواب بہادر تشریف لے آئے ہیں۔

”اے مالک! بخرو! تیرا شکر ہے کہ تُو نے میرے بیٹے کو اپنی امان میں رکھا۔“ مجیدہ بیگم

دروازے تک آیا اور اپنے تین سپاہیوں کو مطلوبہ تعداد میں لوہے کی میخیں لانے کا حکم دے کر برہ صاحب کے پاس واپس چلا گیا۔

سید صاحب نے ان تمام میخوں کو پانی سے دھویا، زیر لب کچھ پڑھتے رہے، پھر ایک ایک میخ پر دم کر کے اسے آنگن کے کچے فرش پر گاڑتے رہے۔ آخر میں سب سے بڑی میخ پر دم کیا اور ایک بھاری پتھر سے تین ضربیں لگائیں۔ ہر ضرب پر انتہائی قہر آلود لہجے میں سید صاحب کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے۔

”برباد گشت..... برباد گشت..... برباد گشت۔“

نواب حیدر علی کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں اور جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔ سید صاحب کا مکان اہل درد کے لئے سب سے بڑا عافیت کدہ تھا۔ لوگ رنج و الم کی شدت سے جیتنے ہوئے اس چار دیواری میں داخل ہوتے اور پھر اس طرح مسکرانے لگتے کہ جیسے کچھ دیر پہلے انہیں کوئی غم ہی نہیں تھا۔ خود حیدر علی نے بار بار سید صاحب کے مکان میں عجیب روشنی دیکھی تھی اور عجیب خوشبو محسوس کی تھی۔ مگر اس وقت والی میسور کو ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی قتل میں کھڑا ہے اور فضا پر ناقابل بیان دہشت طاری ہے۔

جب عمل مکمل ہو چکا تو سید صاحب، نواب حیدر علی سے مخاطب ہوئے۔ ”ان تمام میخوں کو ایک ایک کر کے اکھاڑ لے اور انہیں اپنے ساتھ لے جا۔“

حیدر علی جھکا اور اس نے اطمینان سے ایک آہنی میخ اکھاڑ لی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ تُو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ ”یہ کیا ہے سید صاحب؟“ والی میسور گہرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پوری آہنی میخ خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”یہ کوئی سیاست کی چال نہیں کہ تجھے آسانی سے سمجھا دوں۔“ ایک بار پھر سید صاحب کے لہجے کی جلالی کیفیت نمایاں ہو گئی تھی۔ ”جو کچھ تجھ سے کہا جا رہا ہے، اس پر خاموشی سے عمل کر۔ میرا بہت وقت برباد ہو گیا۔“

حیدر علی نے ایک ایک کر کے تمام میخیں اکھاڑ لیں۔ ان سب سے تازہ تازہ خون نکلا رہا تھا۔ سید صاحب دوبارہ اپنے حجرے میں گئے اور پھر فوراً ہی ایک بڑا سا رومال لے کر واپس آ گئے۔

”انہیں کپڑے میں باندھ کر اپنے ساتھ لے جا۔“ سید اکرام بخاری، والی میسور کو ہدایت دے رہے تھے۔ ”اور دربار میں تخت کے نیچے اس جگہ رکھ دے، جہاں ان پر تیرے قدم پڑنے رہیں۔ پھر صبح ہوتے ہی اعلان کرادے کہ پنڈت موہن داس کے قاتلوں کو دربار عام میں بے نقاب کیا جائے گا۔ پیشوائے پونا کے نمائندوں، سرنگاپٹم کے معزز ہندوؤں، برہمنوں، چارواہوں اور راجہ کرشنا کو اپنے روبرو طلب کر لے۔ جب یہ تمام لوگ جمع ہو جائیں تو ٹھیک بارہ بجے زوال کے وقت دربار میں داخل ہو کر تخت نشین ہو جا۔ پھر انتظار کر کہ پردہ غیب سے کھلائے۔“

حیدر علی نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔ اس نے پوری زندگی اپنی ماں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کی تھی۔ ”سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔“ حیدر علی کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ مجیدہ بیگم کو سننے میں دشواری پیش آرہی تھی۔

”کیا کہا سید صاحب نے؟“ یکایک مجیدہ بیگم کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

”فرمایا کہ کل تک انتظار کر۔“ حیدر علی نے جان بوجھ کر مبہم جواب دیا۔ والی میسور اپنی والدہ کا بے حد احترام کرتا تھا اور اسی جذبہ احترام سے مجبور ہو کر اس نے یہ تو بتا دیا کہ وہ سید اکرام بخاری کی خدمت میں حاضر ہوا تھا مگر سید صاحب کے مکان میں جو ناقابل یقین واقعہ پیش آیا تھا، حیدر علی نے اس طرف ہلکا سا اشارہ تک نہیں کیا۔

مجیدہ بیگم مطمئن ہو کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی فاطمہ بیگم نے شوہر کی پشت پر سر رکھ دیا اور انتہائی رقت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ ”اب آپ سو جائیے۔“

”خود آپ بھی تو نہیں سوئی ہیں۔“ حیدر علی نے آہستہ سے پلٹ کر فاطمہ بیگم کی طرف دیکھا جن کی آنکھیں بے خوابی اور انگباری کے سبب بہت زیادہ سرخ اور سوجی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ”میری نیندیں تو آپ کی نیندوں سے وابستہ ہیں۔“ جاں نثار بیوی نے رفاقت کا حق ادا کرتے ہوئے کہا۔

”میں نماز فجر کے بعد کچھ دیر کے لئے سو جاؤں گا۔“ حیدر علی نے بڑی محبت سے شریک حیات کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس لئے اب آپ سو جائیے۔“ فاطمہ بیگم کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر آئی اور پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی خواب گاہ کی جانب چلی گئی۔

حیدر علی نے نماز فجر ادا کی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ چوتھی رات تھی، جب اس کی پشت نے بستر کی نرمی محسوس کی تھی۔ لیکن ہی حیدر علی کی آنکھوں کے سامنے سید صاحب کے مکان کا خون آلود آہنی میٹوں کا منظر ابھر آیا۔ والی میسور کچھ دیر تک اپنے خیالات میں الجھتا رہا اور پھر تھک کر سو گیا۔



حیدر علی گیارہ بجے بیدار ہوا تو بڑی حد تک تازہ دم نظر آ رہا تھا۔ پھر ٹھیک بارہ بجے زوال کا وقت شروع ہوتے ہی والی میسور دربار عام میں داخل ہوا۔ پورا دربار خواہش و عوام سے بھرا ہوا تھا اور محل کے صدر دروازے پر ہزاروں ہندو جمع تھے جو حیدر علی کے اعلان کے مطابق چندت موہن داس کے قاتلوں کو دیکھنے کے لئے آئے تھے۔

والی میسور نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اس خون آلود کپڑے کی طرف دیکھا جو اس کے قدموں کے نزدیک ہی رکھا ہوا تھا۔ انتہائی حیرت کی بات تھی کہ تقریباً آٹھ گھنٹے گزر جانے کے بعد ابھی خون جم کر سیاہی مائل نہیں ہوا تھا اور اسی طرح سرخ اور تازہ نظر آ رہا تھا۔ حیدر علی ایک

کے منہ سے بے اختیار نکلا اور انہوں نے بہو کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ ”اسے کیا خبر کہ چر گھنٹوں کی اذیت نے مجھے اور بوڑھا بنا دیا ہے۔“

حیدر علی کی آمد کی خبر لانے والا سپاہی اپنی جگہ پہنچا ہی نہیں تھا کہ دوسرا سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور شجاعت خان سے مخاطب ہو کر بولا۔

”نواب بہادر آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔“

جواب میں شجاعت خان بھی دوڑا مگر اتنی دیر میں والی میسور دربار عام کے دروازے پر پہنچ کر ٹھہر گیا تھا۔

”اسے کھول دے۔“ نواب نے بھاری قفل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”سرکار! اس کی چابیاں میرے پاس نہیں ہیں۔“ والی میسور کی پراسرار حرکتیں دیکھ کر شجاعت خان گھبرا گیا تھا۔

”جلدی کر اور خود جا کر چابیاں لے آ۔“ نواب نے دوسرا حکم دیا۔ اس وقت والی میسور چادر اوڑھے ہوئے تھا اور اس نے سید صاحب کی دی ہوئی خون آلود میٹیں چادر میں چھپا رکھی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد شجاعت خان دربار عام کے محافظ سے چابیاں لے کر آیا اور اس نے قفل کھول دیا۔

نواب دروازے میں داخل ہوا اور بڑی تیزی کے ساتھ طویل و عریض کمرے کو عبور کر کے اپنے تخت کے قریب پہنچا اور چادر میں چھپا ہوا رومال نکال کر قالین پر رکھ دیا۔ پھر چونک کر کھڑا ہو گیا۔ پورا رومال خون میں ڈوبا ہوا تھا۔

”خدا کی پناہ!“ بے اختیار نواب کی زبان سے نکلا۔ ”یہ کس کا خون ہے؟“

چند لمحوں تک والی میسور کسی مجسمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا اس خون آلود رومال کو دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

”خدا جانے یا سید جانے۔ میں تو محض تماشائی ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“ یہ کہہ کر نواب تیز قدموں سے واپس آیا اور شجاعت خان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”اسے بند کر دے۔“

اور کسی کو اس کا پتہ نہ چلے کہ پچھلے پہر دربار عام کیوں کھلا تھا۔“

شجاعت خان دروازے میں قفل لگا چکا تو حیدر علی نے اسے دوسرا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”صبح ہوتے ہی سرنگ پٹم کی ایک ایک گلی میں یہ اعلان کرادے کہ کل موہن داس کے قاتلوں کو

دربار عام میں پیش کیا جائے گا۔“ اس کے ساتھ ہی پیشوائے پونا کے نمائندوں اور راجہ کرشنا کو بھی حاضر کرنے کا حکم دے کر نواب اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔

”اتنی رات گئے کہاں گیا تھا؟“ مجیدہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر لہجے غصہ جھلک رہا تھا۔



آئی۔ ”میں تو ہمیشہ آپ کو تخت پر اپنے قریب ہی بٹھایا کرتا تھا مگر جو شخص بلندی سے پستی کی طرف جانا چاہے، اسے کون روک سکتا ہے؟“

راجہ کرشنا کچھ دیر تک کسی زخمی سانپ کی طرح بل کھاتا رہا اور پھر انتہائی شکستگی کے عالم میں پیشوائے پونا کے نمائندوں کے قریب ہی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ احساس رسوائی نے میسور کے ساتھی حکمران کو تھکا ڈالا تھا۔ وہ لمبی لمبی سانس لے رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نواب حیدر علی کے لئے دنیا بھر کی نفرت موجزن تھی۔

پیشوائے پونا کے نمائندوں کے چروں پر بھی وحشت برس رہی تھی۔ موہن داس کے قتل اور ہندوؤں کی مظلومیت کے حوالے سے ان لوگوں نے بھی حیدر علی پر بہت طعنہ زنی کی تھی اور اب وہ خوف زدہ تھے کہ کہیں والی میسور انہیں سر دربار ذلیل و رسوا نہ کرے۔ اسی طرح سرنگاپٹم کے وہ ہندو رہنما بھی سہمے ہوئے تھے، جنہوں نے موہن داس کے ماتمی جلوس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور حیدر علی پر کھلے الفاظ میں الزام تراشی کی تھی کہ اسی نے پنڈت کے قاتلوں کو پناہ دی ہے۔ اور سرتا دیوی کی روپوشی میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ غرض دربار عام پر سکوت مرگ سا طاری تھا اور لوگوں کو اپنی سانسوں، یہاں تک کہ دلوں کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد راجہ کرشنا سنبھل گیا اور حسبِ عادت انتہائی ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ ”کہاں ہیں مہاتما موہن داس کے قاتل؟“ راجہ کرشنا اپنی ریاکاری اور منافقت سے باز نہیں آیا تھا۔

”دھیرج رکھیں مہاراج!“ حیدر علی کا انداز گفتگو بھی استہزاء ہیہ تھا۔ ”بس آنے ہی والے ہیں۔“ والی میسور نے یہ بات کہہ تو دی تھی مگر ذہنی طور پر وہ خود بھی پریشان تھا کہ موہن داس کے قاتل کہاں ہیں اور خود بخود دربار عام تک کس طرح پہنچیں گے۔ حیدر علی کبھی دروازے کی طرف دیکھتا اور کبھی خون آلود آہنی میٹوں کی طرف جن پر اس کے پاؤں رکھے ہوئے تھے۔ نواب نے خیالی طور پر سید اکرام بخاری سے رجوع کیا اور دل ہی دل میں ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”سید! دعا کریں کہ میری لاج رہ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی ایک تماشا بن کر رہ جاؤں۔“

ابھی حیدر علی، سید صاحب سے عاتبانہ درخواست کر ہی رہا تھا کہ اچانک قلعہ کا ایک محافظ سپاہی دربار میں داخل ہوا اور بلند آواز میں والی میسور سے عرض کرنے لگا۔

”کچھ شکستہ حال لوگ دروازے پر کھڑے چیخ رہے ہیں کہ انہیں نواب بہادر کے حضور میں لے چلو۔ وہ جانتے ہیں کہ سرتا دیوی کو کون لوگوں نے اغوا کیا ہے اور پنڈت موہن داس کے قاتل کون ہیں۔“

حیدر علی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جوشِ جذبات میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر چیخ کر بولا۔ ”ان حرام کاروں نے دارالحکومت کا امن و سکون غارت کر دیا تھا۔ بلا تاخیر انہیں یہاں

بار پھر الجھنے لگا مگر فوراً ہی اس نے پریشان خیالات کو ذہن سے جھٹک کر سید صاحب کی ہدایت کے مطابق آہنی میٹوں پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔

پھر والی میسور نے حاضرین دربار کی سب سے اگلی قطار پر نظر ڈالی۔ وہاں پیشوائے پونا کے چاروں نمائندوں کے علاوہ سرنگاپٹم کے تمام معزز ہندو موجود تھے مگر راجہ کرشنا غائب تھا۔ حیدر علی نے استقبالیہ انداز میں شجاعت خان کی طرف دیکھا۔

”سرکار! راجہ کرشنا نے اپنی بیماری کے باعث دربار عام میں حاضر ہونے سے معذرت طلب کی ہے۔“

”کیا وہ اتنے بیمار ہیں کہ اپنی آخری سانس پوری کر رہے ہیں؟“ حیدر علی نے انتہائی تیز لہجے میں کہا۔

”میں نے ان کے چہرے پر ایسی تو کوئی علامت نہیں دیکھی۔“ شجاعت خان کی آواز میں گہرا طنز پوشیدہ تھا، جسے اہل دربار آسانی سے محسوس کر سکتے تھے۔

”تعجب ہے کہ وہ پنڈت موہن داس کے ماتمی جلوس کی قیادت کرنے کے لئے تین دن تک تیز دھوپ میں سرنگاپٹم کی سڑکوں پر پیدل چلتے رہے اور انہیں تھکن کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ مگر آج جبکہ مقدمہ قتل کا فیصلہ ہونے والا ہے تو وہ بیماری کا عذر پیش کر رہے ہیں؟“ حیدر علی کی پُر جلال آواز سے پورا دربار گونج رہا تھا۔ ”اگر وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں تو انہیں پاکی میں ڈال کر یہاں حاضر کرو۔ وہی تو مہاتما موہن داس کے سب سے بڑا وکیل ہیں۔“

والی میسور کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اہل دربار پر دہشت سی طاری ہو گئی تھی اور وہ کی غیر معمولی واقفے کے رومنا ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ شجاعت خان اپنی نشست سے اٹھ کر تیز رفتاری کے ساتھ دربار عام سے نکل کر محل کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں راجہ کرشنا اس کا خاندان رہائش پذیر تھا۔



تھوڑی دیر بعد راجہ کرشنا اس طرح دربار عام میں داخل ہوا کہ اس کے چہرے پر شہِ ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ تخت کے قریب پہنچ کر اس نے تلخ لہجے میں والی میسور کو مخاطب کیا۔

”میں کہاں بیٹھوں؟“

”جہاں دوسرے معززین شہر بیٹھتے ہیں۔“ نواب حیدر علی کا انداز بے نیازانہ تھا اور وہ بجا

بار راجہ کرشنا کی بے چارگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”نواب! وقت سے ڈر اور مجھے تماشا نہ بنا۔“ راجہ کرشنا بے قابو ہو گیا۔ ”میں ان لوگوں کی صف میں بیٹھوں گا جو کل تک میرے غلام تھے؟“

”تماشا تو آپ خود بن رہے ہیں۔“ نواب حیدر علی کے ہونٹوں پر حقیر آمیز مسکراہٹ

نہیں تھے وہ کسی اذیت میں مبتلا ہوں۔ پھر تخت کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے اپنے سر فرش پر رکھ دیے۔ مگر ایک نوجوان گردن خم کئے کھڑا رہا۔ حاضرین نے سمجھا کہ آنے والے، نواب حیدر علی کو کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے پورا دربار ان کی جینوں سے گونجنے لگا۔

”نواب بہادر! ہمیں قتل کر دیجئے یا پھر معاف کر دیجئے کہ اب ہم سے یہ عذاب برداشت نہیں ہوتا۔“

”تم کون ہو؟ اور تم نے کیا جرم کیا ہے؟“ حیدر علی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ وہ سب کے سب سیدھے ہوئے اور پھر بیک زبان کہنے لگے۔

”ہم نے ہنڈت موہن داس اور اس کی ماں کو قتل کیا ہے۔ مگر اس ظالمانہ فعل میں ہماری اپنی مرضی کو دخل نہیں تھا۔ ہم سب کنور ونودکار کے حکم کے پابند تھے۔“

حیدر علی نے بہت غور سے ان تمام نوجوانوں کو دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر ان کی تعداد سولہ تھی۔ والی میسور کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی۔ سید صاحب نے جو آہنی میٹھی اس کے سپرد کی تھیں، ان کی تعداد بھی سولہ تھی۔ پندرہ چھوٹی میٹھیں اور ایک بڑی میٹھ۔ حیدر علی نے گھبرا کر ونودکار کی طرف دیکھا۔ تمام مجرم اسے اپنا سردار تسلیم کر رہے تھے اور اسی کے ایماء پر موہن داس اور ملا دیوی کو قتل کیا گیا تھا۔ اب والی میسور پر بڑی میٹھ کا مفہوم ظاہر ہو چکا تھا۔

”یہ ونودکار کون ہے؟“ حیدر علی نے اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو سر جھکائے کھڑا تھا اور اس کے جسم پر لرزش طاری تھی۔

”راجہ کرشنا کا حقیقی بھائی۔“ قاتلوں نے اپنے سردار کا تعارف کرایا۔

”تجھے اس سفاکی اور تشدد کی ضرورت کیوں پیش آئی لڑکے؟“ حیدر علی نے تہر آلود لہجے میں ونودکار سے سوال کیا۔

”میں اپنے دل سے مجبور تھا نواب بہادر! ونودکار کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جسم کے ماتھ ساتھ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔“ میں سرتیا سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر موہن داس نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً میں نے اسے اور اس کی ماں کو راستے سے ہٹا دیا کہ سرتیا کو حاصل کرنے کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی۔“

”کیا تو نے سرتیا کو حاصل کر لیا؟“ حیدر علی اتنی زور سے چیخا کہ اہل دربار اپنی نشستوں پر اٹھ بیٹھے اور ونودکار خوف و دہشت سے فرش پر گر پڑا۔ پھر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”میں نے سرتیا دیوی کو ناتھ آشرم (یتیم خانے) سے اغوا کر لیا تھا مگر اس کے دل و دماغ اور جسم پر قابو نہ پاسکا۔“ ونودکار نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا تھا۔

”اس وقت سرتیا دیوی کہاں ہے؟“ نواب حیدر علی نے راجہ کرشنا کے بھانجے سے پوچھا۔

”بھاراج کے تہہ خانے میں۔“ ونودکار نے اتنی آسانی سے یہ راز فاش کر دیا کہ اہل دربار حیران رہ گئے۔

لے آؤ۔ میں بہت دیر سے ان ہی کا انتظار کر رہا تھا۔“

حیدر علی کے تخت پر بیٹھے ہی اہل دربار نے دیکھا کہ راجہ کرشنا گھبرا کر اپنی نشست پر کود گیا اور انتہائی بدحواسی کے عالم میں والی میسور سے کہنے لگا۔

”کہاں ہیں مہاتما کے قاتل؟ انہیں ایسی دردناک سزا دی جائے کہ آنے والی سلسل میں ان کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔“

”آپ خاموشی سے بیٹھ جائیے اور درباری آداب کا احترام کیجئے۔“ حیدر علی نے راجہ کرشنا کو تخت لہجے میں تنبیہ کی۔ ”میری عدالت اور میرا قانون کسی کے مشوروں کے محتاج نہیں۔“

راجہ کرشنا کی وحشت کا یہ حال تھا کہ اس نے حیدر علی کی بات کو سنا ہی نہیں یا پھر والی میسور کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ راجہ نے نواب کی طرف پٹ پٹ کر

تھی اور اس کی نظریں مسلسل دروازے پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ پیشوائے پونا کے نمائندے اور دوسرے معزز ہندو بھی موہن داس کے قاتلوں کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ درباری آداب کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوتا اور والی میسور کی

جانب پیٹھ کر کے دروازے کی طرف دیکھنے لگتا۔

پھر جیسے ہی موہن داس کے قاتلوں کی نشاندہی کرنے والے دربار میں داخل ہوئے، راجہ کرشنا کی آنکھوں کے سامنے گہری تاریکی چھا گئی۔ اس نے کرسی کے بازوؤں کا سہارا لے کر

سنہیلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور چکرا کر فرش پر گر پڑا۔ دربار میں ہلچل سی مچ گئی۔ حاضرین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک راجہ کرشنا کو کیا ہو گیا؟ پیشوائے پونا کے نمائندے اور ہندو مذہبی رہنما بھی گھبرا کر اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے اور راجہ کرشنا کو اٹھانے کی کوشش

کرنے لگے۔

”آپ حضرات اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیے۔“ ایک بار پھر حیدر علی کی بارعب آواز گونجی۔

آپ کا نہیں، حکومت کا فرض ہے کہ راجہ کرشنا کو بہترین طبی امداد فراہم کرے۔ دیے مہاراجہ کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ مکمل طور پر صحت مند ہیں۔ دراصل ان سے مہاتما موہن داس کے قاتلوں کی گرفتاری کی خبر برداشت نہ ہو سکی۔ انسانی زندگی میں اتنی بڑی خوشی کا موقع شاذ و نادر ہی آتا

ہے۔“ حیدر علی کی گفتگو میں پوشیدہ طنز کو کوئی ایک درباری بھی محسوس نہ کر سکا۔ ہر شخص موہن داس کے قاتلوں کے بارے میں یقینی خبر سننے کے لئے بے قرار نظر آ رہا تھا۔

دربار کے محافظ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر راجہ کرشنا کو سہارا دیا اور اسے کرسی پر بیٹھا دیا۔ اس کے بعد حیدر علی نے اپنے مسلح سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو تخت کے قریب

لے آئیں جو موہن داس کے قاتلوں کا سراغ لگانے کے لئے دربار میں حاضر ہوئے ہیں۔

وہ سب کے سب نوجوان تھے اور سر جھکائے حاضرین کے درمیان سے گزرتے ہوئے تخت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اہل دربار نے سنا، ان کے ہونٹوں سے دہلی دہلی کراہیں نکلی تھیں۔

کے دھار کو مجرد کر رہے ہیں بلکہ منصف پر بھی بے بنیاد الزامات عائد کر رہے ہیں۔ فی الوقت آپ سکون سے بیٹھیں اور خاموشی اختیار کریں۔ اگر میرے فیصلے سے مطمئن نہ ہوں تو ہوائے نمائندوں سے فریاد کرنے کے بجائے خود اپنا مقدمہ لے کر پیشوا مادھو راؤ کی عدالت پہنچ جائیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“

راجہ کرشنا شدید بے چارگی کے عالم میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور حاضرین دربار کی طرف دیکھنے لگا۔ ہر چہرے پر انتہائی حیرت کا رنگ نمایاں تھا اور تمام آنکھوں میں بہت سے سوالات گڑبگڑ کر رہے تھے۔

ابھی دربار کی فضا پر گہرا سکوت طاری تھا کہ شجاعت خان، سریتا دیوی کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے دروازے میں داخل ہوا۔ جب میسور کا نائب سپہ سالار، حاضرین کے درمیان سے گزر کر تخت کی طرف بڑھ رہا تھا تو اکثر درباری اپنی جگہ کھڑے ہو کر سریتا دیوی کو دیکھ رہے تھے جو شجاعت خان کے ہاتھوں میں بے ہوش پڑی تھی اور جس کے خوبصورت چہرے پر بے شمار زخموں کے نیلے اور سرخ نشانات موجود تھے۔ یہ منظر اتنا دردناک تھا کہ نواب حیدر علی کو بھی تخت سے اتر کر نیچے آنا پڑا۔ والی میسور کچھ دیر تک سریتا کو دیکھتا رہا جس کی سانس بہت آہستہ چل رہی تھی۔

”یہ کہاں تھی؟“ حیدر علی کا لہجہ اُداس تھا اور چہرے پر اذیت و کرب کا گہرا عکس ابھر آیا تھا۔

”راجہ کرشنا کے تہہ خانے میں۔“ شجاعت خان کی آواز سے دل کا درد جھٹک رہا تھا۔ جیسے سریتا دیوی خود اس کی اپنی بیٹی ہو۔

”آپ حضرات بھی اس معصوم اور بے گناہ لڑکی کی حالت زار کا مشاہدہ کر لیں۔“ نواب حیدر علی نے پونا کے نمائندوں کو اشارہ کیا۔

پیشوا مادھو راؤ کا قاصد اور پونا سے آئے ہوئے تینوں گیلانی اٹھ کر والی میسور کے قریب پہنچے اور بے ہوش سریتا کو دیکھنے لگے جسے انتہائی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

”واقعاً یہ بڑی سفاکی ہے نواب بہادر!“ پونا کے نمائندوں کو بھرے دربار میں اعتراف کرنا پڑا۔

”اب آپ کو اس بات کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی کہ ریاست میسور میں ہندوؤں پر تشدد ہو رہا ہے یا مسلمان، ہندوؤں کے مظالم کا شکار ہیں؟“ یکایک حیدر علی کی آواز بلند ہو گئی۔

”آپ کے بقول اگر محترم پیشوا ہندوستان میں بسنے والے ایک ایک ہندو کے جان لیوا اور عزت و آبرو کے محافظ و نگہبان ہیں تو پھر میں کون ہوں؟ کیا مجھے حق نہیں پہنچتا کہ اُس بے گناہ مسلمان لڑکی کے بچنے والے خون کا حساب راجہ کرشنا سے طلب کروں اور پیشوا کو یہاں کہ اس شخص کا پورا نامہ اعمال سازشوں، فریب کاریوں اور دوسرے بے شمار گناہوں سے سبوا ہو چکا ہے۔“

حیدر علی نے شجاعت خان کی طرف دیکھا اور نیا حکم جاری کر دیا۔

”سرتا کو اسی وقت میرے سامنے پیش کرو۔ اگر راج محل کے سکین اس تہہ خانے کی نشاندہی نہ کر سکیں تو ایک ایک کمرے کی بنیادیں تک کھود ڈالو۔“

شجاعت خان کے دربار سے جاتے ہی نواب حیدر علی دوبارہ ونودکار سے مخاطب ہوا۔

”تو اپنی عمر دیکھ اور جرائم کی سنگینی کا اندازہ کر۔ آخر تو کسی کی شہ پر خون کے اس سمن میں اتر گیا تھا؟“

”مہاراج نے مجھے یقین دلایا تھا کہ نواب بہادر کا قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“ پندرہ سالہ ونودکار کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں شدت آگئی تھی۔

”مہاراج نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ مہمن داس اور بملا دیوی کے قتل سے دیوتا بہت خوش ہوں گے۔ اور اگر میں سرتا کو اپنی داشتہ بنالوں کا تو میرے لوک (دینا) اور پرلوک (آخرت) دونوں سدھر جائیں گے۔ میں نے جو کچھ کیا، دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے کیا۔ مجھے یہی سمجھایا گیا تھا کہ میں اس طرح ہوا دھرم کا سب سے بڑا سیوک کہلاؤں گا۔“

ونودکار کے خاموش ہوتے ہی راجہ کرشنا کھڑا ہو گیا اور ہدیبانی انداز میں پچھنے لگا۔

”جھوٹ بولتا ہے یہ لڑکا۔ اس سے میرا کوئی خاندانی رشتہ نہیں۔ یہ سب تیری سازشیں۔“

نواب! تو نے ان ہندو نوجوانوں کے منہ دولت سے بھر دیئے۔ پھر ان کی زبانیں میرے خلاف گواہی دینے لگیں۔“ راجہ کرشنا اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔

حاضرین دربار کا خیال تھا کہ راجہ کی بے ہودہ گفتگوں کر حیدر علی کا غصہ بھڑک اٹھے گا۔

خلاف توقع والی میسور مسکرا رہا تھا۔

یکایک راجہ کرشنا، مادھو راؤ کے نمائندوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”جب آپ لوگ پونا واپس جائیں تو محترم پیشوا کو میرا حال زار سنا کر عرض کرنا کہ یہاں کسی ہندو کی عزت اور جان محفوظ نہیں۔ دولت و اقتدار کے ذریعے ہندو جبراً مسلمان بنائے جاتے ہیں۔ ہندو کو ہندو سے قتل کر لیا جاتا ہے۔ اور پھر ہندو ہی ہندو کے خلاف گواہی دیتا ہے۔“

راجہ کرشنا خود اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں گردن تک پھنس چکا تھا۔ اس لئے مادھو راؤ طاقتور ہاتھ پکڑ کر حالات کی دلدل سے ٹکنا چاہتا تھا۔

پیشوائے پونا کے نمائندے کیا جواب دیتے؟ وہ خود پریشان نظر آرہے تھے اور انہیں اپنا بساط ہی اُلٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”ساری دنیا بدل گئی، دریاؤں نے اپنے راستے بدل دیئے اور بڑے بڑے مجرم گناہ کی دنیا سے نکل کر مسجدوں اور مندروں کی طرف چل پڑے۔ مگر ایک آپ ہیں کہ ابھی تک جھوٹ، منافقت، ریا کاری اور سازش کے مذہب پر عمل پیرا ہیں۔“ نواب حیدر علی کا لہجہ اب مزید

مگر اس سے گہری تضحیک جھلک رہی تھی۔

”آپ باہر کی سیپیہ کے باوجود نہ صرف عدالت

حیدر علی کی مدد گنت گنتوں کر پونا کے نمائندوں نے سر جھکا لئے۔ اس نئی صورت حال کو دیکھ کر وہ بہت زیادہ شرمسار نظر آ رہے تھے۔

”شجاعت خان! سریتا کو حرم سرا میں پہنچا کر طیب خاص سے کہہ دے کہ وہ اس جنگی علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ اب یہ والی میسور کی بیٹی ہے۔“

شجاعت خان، راجہ کرشنا اور ونودکار کے خلاف اپنے چہرے پر نفرت و غضب کے کئی رنگ سجائے تیز قدموں کے ساتھ دربار عام سے نکل کر حرم سرا کی طرف چلا گیا۔

شجاعت خان کے جاتے ہی حیدر علی دوبارہ تخت پر جلوہ افروز ہوا اور راجہ کرشنا کو حرم سرا کے کہنے لگا۔

”اگر ونودکار آپ کا حقیقی بھانجا نہیں تو پھر سریتا دیوی آپ کے محل کے تہہ خانے میں لے قید کی گئی تھی؟“

راجہ کرشنا کے پاس والی میسور کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انتہائی عیاں زمانہ اور جھوٹا ہونے کے باوجود وہ اس حقیقت کو چھپانے سے عاجز رہا۔

پھر بھرے دربار میں چند برہمنوں نے گواہی دی کہ ونودکار، مہاراج کا حقیقی بھانجا ہے اس کا باپ بچپن میں مر گیا تھا اس لئے راجہ کرشنا ہی نے اس کی پرورش کی ہے۔ ان شاہدوں کے بعد رسوائی کے خوف سے راجہ کرشنا کا چہرہ مٹھ ہو گیا اور اس نے کسی مجرم کی طرح گردن جھکا لی۔

”جب ریاست کے ذہین ترین جاسوس تمہارا سراغ لگانے میں ناکام ہو گئے تھے تو اب ایسی کیا قیامت گزری کہ تم لوگ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے؟“ نواب حیدر علی دوبارہ نواب سے مخاطب ہوا۔

”میں کل رات پرسکون نیند سو رہا تھا کہ اچانک مجھے اٹھ جانا پڑا۔“ ونودکار کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں اعتراف جرم کی وجہ بیان کر رہا تھا۔

ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے میرے دماغ میں جلتی ہوئی سیلاب آتار دی ہے۔ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگا۔ راج وید نے کئی دوائیں دیں مگر میرے دماغ میں لگی ہوئی آگ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ پھر کسی نے میرے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ نواب بہادر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرم کا اعتراف کر لے ورنہ یہ آگ تیرے پورے جسم میں بج جائے گی اور چند گھنٹوں میں تجھے جلا کر راکھ کر ڈالے گی۔“

پورے دربار پر سناٹا طاری تھا۔ مگر حیدر علی کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایک بار پھر والی میسور کو سید صاحب کی روحانی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ جہاں حکومت کے شمار وسائل ناکارہ اور بے اثر ثابت ہو چکے تھے، وہاں ایک فقیر بے سروسامان کا درویشانہ عمل کام آیا۔ اگر سید صاحب کی دعائیں شامل حال نہ ہوتیں تو ساری زندگی پنڈت مہنوں والی قاتلوں کا سراغ نہ ملتا اور ہندو رعایا کی نظر میں حیدر علی جیسے منصف مزاج حکمران کی

حیدر علی نے اپنی اس کوتاہی پر شدید غم امت کا اظہار کیا۔ پھر کچھ دیر بعد والی میسور

نواب کے طیب خاص کا بیان سن کر والی میسور بھی سوگوار نظر آنے لگا تھا۔ حیدر علی کچھ دیر تک سریتا کے کہنے پر کھڑا رہا۔ پھر طیب خاص کو علاج جاری رکھنے کا حکم دے کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

”آپ کی دعاؤں سے قاتل خود ہی عدالت میں چلے آئے۔ مگر سریتا کی طبیعت بہت نازب ہے، طیب نے اس کی زندگی سے مایوسی ظاہر کی ہے۔“

طیب کون ہوتا ہے انسانی زندگی اور موت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والا؟ سید صاحب اچانک برہم نظر آنے لگے تھے۔ ”اور نواب! خود تم نے بھی مجھے اطلاع دینے میں اتنی ہیر کردی۔ کیا تم اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ سریتا سے میرا بھی کوئی رشتہ ہے، مجھے اسی وقت اس کے پاس لے چلو۔“

نواب حیدر علی نے اپنی اس کوتاہی پر شدید غم امت کا اظہار کیا۔ پھر کچھ دیر بعد والی میسور



سید صاحب کے جانے کے بعد جب حیدر علی نے آہنی میخوں کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ اب ان کی اصلی رنگت نمایاں ہو گئی تھی اور کپڑے پر خون کا ہلکا سا نشان تک موجود نہیں تھا۔ والی میسور کے دل میں خیال آیا کہ وہ آہنی میخوں کو شجاعت خان کے ذریعے دربار بردکرا رہے۔ مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ کہیں اس کے اور سید صاحب کے درمیان رازداری کی شرط مجروح نہ ہو جائے۔



دوسرے دن سریتا کو ہوش آیا تو ٹیپو سلطان اس کے قریب موجود تھا۔ ولی عہد سلطنت کو اپنے سامنے پا کر سریتا گھبرا گئی۔  
”کنورا آپ یہاں؟“ اس نے بستر پر اٹھ کر بیٹھنا چاہا اور اس کو شش میں اس کے زخموں کے مکمل کئے۔ ”مجھے یہاں کون لایا؟..... میں تو راجہ کرشنا کی قید میں تھی۔“  
ٹیپو سلطان نے سریتا کو اس اندوہ ناک واقعہ کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا مگر یہ نہیں بتایا کہ پٹت موہن داس اور بللا دیوی کو قتل کیا جا چکا ہے۔  
”تم دروازے سے بے ہوش تھیں۔“ ٹیپو اپنے لہجے کی خلش کو سریتا سے پوشیدہ نہ رکھ سکا۔  
”کیا آپ بھی یہاں موجود تھے کنورا؟“ سریتا نے ٹیپو سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا تھا۔  
نرت جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”پھر میں کہاں ہوتا؟“ ٹیپو کو خود بھی سریتا سے بے پناہ افسوس تھا۔ مگر وہ عورت و مرد کی ال درایت محبت سے بہکا نہ تھا جسے محلات شاہی میں امیر زادوں کی تفریح طبع کے لئے ایک دلچسپ تماشا سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ولی عہد میسور انتہائی بے باک لہجے میں بول رہا تھا۔ ”اپنے ماں کو بلاؤں کے گرداب میں چھوڑ کر کہاں جاتا؟“  
ساتھی کا لفظ سن کر سریتا پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ”تم بھی دو راتوں سے جاگتے رہے ہو کنورا؟“ سریتا کی پوشیدہ آرزو بالآخر ہونٹوں پر آ کر چل گئی۔  
ٹیپو سلطان نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ولی عہد میسور کی آنکھوں میں جذبوں کی چٹائی اور پاکیزگی موجزن تھی۔

”بس کنورا! میں بامراد ہوئی۔“ سریتا کی آنکھوں سے اشکوں کا آبشار اُٹل پڑا۔ ”ان دو راتوں کے بدلے میں قیامت تک سرشار رہوں گی۔“

پھر جب سریتا کے ہوش میں آنے کی خبر حیدر علی تک پہنچی تو وہ اپنی درباری مصروفیات ترک کر کے اس مظلوم لڑکی کی عیادت کے لئے راج محل پہنچا اور اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا۔



سریتا چند روز میں اس قابل ہو گئی کہ دربار عام میں حاضر ہو کر اپنے اوپر کئے جانے والے ظلم کی روداد بیان کر سکے۔ پیشوائے پونا، راجہ کرشنا اور سرنگا پٹم کے تمام مذہبی رہنما اگلی

اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی سواری میں سید صاحب کو لے کر راج محل پہنچا۔ سریتا بدستور بے ہوش تھی اور طبیب خاص بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ سید صاحب نے آگے بڑھ کر سریتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر وہاں موجود سب لوگوں نے دیکھا کہ سید اکرام بخاری رو رہے تھے۔ سریتا کی بازیابی کی خبر سن کر ٹیپو سلطان بھی راج محل چلا آیا تھا اور اس وقت اس لڑکی کی تیار داری میں مصروف تھا، جس سے ملاقات پر حیدر علی نے سخت پابندی عائد کر دی تھی۔

ٹیپو سلطان کو محل میں موجود پاکر والی میسور نے بیٹے سے ناخوشگوار لہجے میں سوال کیا تو ”تم یہاں کیوں چلے آئے؟ کیا تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے؟“

”بابا محترم! میں اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوں مگر سریتا کی عیادت اور تیار داری مجھ پر فرض بھی ہے اور فرض بھی۔“ ٹیپو نے سر جھکاتے ہوئے والی میسور کو جواب دیا تھا۔ ”میں نواب بہادر سے درخواست گزار ہوں کہ مجھے اس وقت تک کے لئے محل میں ٹھہرنے کی اجازت دی جائے، جب تک سریتا صحت یاب نہیں ہو جاتی۔ حضور والا کو یاد ہو گا کہ ایک بار میں نے دن تک شدید بخار میں مبتلا رہا تھا اور سریتا نے مسلسل رات رات بھر جاگ کر میری خدمت کی تھی۔ آج میں اس کا قرض اُتارنا چاہتا ہوں۔“

بیٹے کا جواب سن کر حیدر علی خاموش ہو گیا تھا۔

اور اب ٹیپو سلطان بڑے افسردہ لہجے میں سید صاحب سے التجا کر رہا تھا۔ ”اسلام گراں سریتا کو آپ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔“

سید صاحب نے ایک نظر ٹیپو کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ سریتا کے سر پر رکھ دیا۔

”اے اللہ! اگر تیری مشیت میں اس بچی کا وقت پورا ہو چکا ہے تو اسے اسی وقت اپنے پاس بلا لے۔ اور اگر تو اپنی نام لیوا کو مزید زندہ رکھنا چاہتا ہے تو پھر اسے تماشا نہ بنا۔ تیرے عزت و جلال کی قسم! اس بے سہارا لڑکی کو آبرو و مندانہ زندگی عطا کر۔“

یہ کہہ کر سید صاحب نے سریتا کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سید صاحب کے آنسو، سریتا کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

”اے جان بے قرار! میں اللہ سے تیرے سکون دل کے لئے دعا کروں گا۔ مگر اس فانی میں سکون دل کہاں؟“

یہ کہہ کر سید صاحب کمرے سے جانے لگے تو حیدر علی بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر آیا۔ سرگوشی کے انداز میں عرض کرنے لگا۔

”اب میں ان آہنی میخوں کا کیا کروں؟ وہ ابھی تک دربار عام میں میرے تخت کے رکنی ہوئی ہیں۔“

”انہیں دریائے کاویری میں غرق کر دو۔“ سید صاحب نے چلتے چلتے کہا۔ ”اب ان ضرورت باقی نہیں رہی۔“

راجہ کے جاتے ہی حیدر علی نے فودکار اور اس کے چند رہ ساقیوں کو موت کی سزا سنائی۔ ابھی والی میسور کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ ایک شکستہ حال عورت چیختی ہوئی دربار میں داخل ہوئی۔

”نواب بہادر! مجھ پر رحم کیجئے کہ اس کے بغیر میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“ وہ غم زدہ عورت، فودکار کی ماں تھی جو والی میسور سے اپنے بیٹے کی زندگی مانگ رہی تھی۔

”ہم سے ہماری حیثیت کے مطابق مانگ اور وہ سوال نہ کر جسے ہم پورا نہ کر سکیں۔“ حیدر علی نے سوالیہ عورت کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ ”جس روز ہم نے ٹیپو سلطان کے جسم پر اپنے ہاتھ سے تازیانے لگائے تھے، اس روز یہ بات طے ہو چکی تھی کہ کسی بھی مجرم کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ میرے بیٹے کی جگہ اگر ولی عہد سلطنت بھی ہوتا تو ہم اس کے قتل کا حکم بھی جاری کر دیتے۔“ ریاست کے سپاہی فودکار کی ماں کو کھینچ کر دربار سے باہر لئے جا رہے تھے اور وہ بیوہ عورت بڑے دردناک انداز میں بین کر رہی تھی۔ آخر سریتا دیوی خاموش نہ رہ سکی اور والی میسور سے درخواست کرنے لگی۔

”نواب بہادر! ایک ماں کو اس کا بیٹا واپس کر دیجئے۔ میں اپنے باپ اور دادی کے قاتلوں کو معاف کرتی ہوں۔ اب ان لوگوں کی طرف میرا کوئی حساب نہیں ہے۔“

بڑی عجیب التجا تھی جسے سن کر حیدر علی بھی سناٹے میں آ گیا تھا۔

انجام کار والی میسور کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ سریتا دیوی نے دلیل سے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ وہ قصاص طلب کرے یا پھر خوں بہا لے کر قاتلوں کو معاف کر دے۔

”ایک ماں کے آنسو ہی میرے لئے خوں بہا کا درجہ رکھتے ہیں۔“ سریتا دیوی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اہل دربار کے دلوں میں اتر گئے تھے۔

اس واقعہ سے متاثر ہو کر فودکار، راجہ کرشنا کی بیوہ بہن، موہن داس کے قاتل اور دیگر ہندو مسلمان ہو گئے تھے۔

پیشوا کے نمائندے واپس جا چکے تھے اور مادھو راؤ سرنگاپٹم پر حملے کا جواز تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔

مجید بیگم حیدر علی اور فاطمہ بیگم کے اصرار کے باوجود سریتا دیوی یتیم خانے چلی گئی تھی اور چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف تھی۔



ایک دن حیدر علی دربار میں موجود تھا کہ محافظ سپاہیوں نے ایک ایسے شخص کو پیش کیا جو اپنے ظاہری طے سے پاگل نظر آ رہا تھا۔ سر اور داڑھی کے بڑھے ہوئے بال، پھینا ہوا لباس، بدنوں میں آٹے، پتھرانی ہوئی آنکھیں اور خشک زبان، ریاست کے سپاہی اسے پکڑے ہوئے تھے اور وہ اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

نشتوں پر بیٹھے تھے اور پورا دربار حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ سب لوگ موہن داس اور ہوا دیوی کے مقدمہ قتل کا فیصلہ سننے کے لئے بے چین تھے۔ تخت کے نیچے دائیں جانب تمام مجرم زنجیریں پہنے کھڑے تھے۔ سریتا دیوی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی والی میسور کے قریب پہنچی اور بڑے باوقار لہجے میں اہل دربار کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”میں چنڈت موہن داس کی بیٹی سریتا ہوں۔ میرے باپ اور دادی کو ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا۔ کاش! ایسا نہ ہوتا۔ راجہ کرشنا کے حکم پر مجھے یتیم خانے سے اغوا کیا گیا اور تہذیب کے جرم پر وہ سزا دی گئی کہ اب میرے پورے جسم پر زخموں کی لالہ کاری کے سوا کچھ نہیں۔ جب دشمنوں کے بازو شل ہو گئے اور وہ ایک کمزور لڑکی کو اس کے راستے سے نہ ہٹائے تو راجہ کرشنا کے بھانجے فودکار نے مجھے بے آبرو کرنا چاہا۔۔۔۔۔ مگر جس کی خاطر میں نے باپ دادا کا مذہب چھوڑا، اسی ذات نے میری دیگر ہری کی اور وہ ذات اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ نواب بہادر پر یہ سنگین تہمت ہے کہ وہ جبراً ہندوؤں کو مسلمان بنا رہے ہیں۔ میں نے ان جیسا اہل ظرف حکمران نہیں دیکھا۔ میرے باپ کی مثال پورے سرنگاپٹم کے سامنے ہے کہ ایک گناہ برہمن کو بڑے پجاری کے منصب تک پہنچایا اور ہندو دھرم کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ وہ خود ایک باکردار انسان ہیں، اس لئے ہر باکردار شخص کو عزت رکھتے ہیں۔“

سریتا دیوی کا بیان سن کر پیشوائے پونا کے نمائندے مطمئن نظر آنے لگے مگر راجہ کرشنا کا چہرہ مسخ ہو گیا۔

کچھ دیر تک دربار میں سناٹا طاری رہا، پھر یکایک حیدر علی کی بارعب آواز گونجی۔

”اگر میں تلوار اور طاقت کا استعمال کرتا تو اب تک مہاراج کرشنا کی چتا چھوگئی جا چکی ہوتی اور ان کے اہالیان خاندان، سرنگاپٹم کی گلیوں میں بھیک مانگتے پھر رہے ہوتے۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ عزت داروں کو عزت دی اور ذلیلوں کو معاف کر دیا۔ پھر بھی مجھ سے گلہ ہے تو میں انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے مہاراج کو پھانسی پر لٹکا سکتا ہوں کیونکہ موہن داس کے قتل کے سلسلے میں یہی بنیادی مجرم ہیں اور سب کچھ ان ہی کی شہ پر ہوا ہے۔“

اہل دربار کو اپنی سانسیں رکتی سی محسوس ہونے لگیں۔ آج والی میسور کی حالت غضبناک کچھ اور تھی۔

”آپ کھڑے ہو جائیں۔“ مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد حیدر علی، راجہ کرشنا سے خطاب ہوا۔ ”اور اسی وقت میرے دربار سے نکل جائیں۔ ایک چھوٹے، منافق اور بدکار شخص کی بھی سزا ہے کہ وہ جب تک زندہ رہے اور جس راستے گزرے، لوگ اسے دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھیں کہ وہ جا رہا ہے راجہ کرشنا جس کی زندگی نواب حیدر علی خان بہادر کی دی ہوئی بھیک سے بڑا کچھ نہیں۔“

راجہ کرشنا پسینے میں نہایا ہوا، لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ دربار سے نکل گیا۔

”نواب صاحب! میرے بیوی، بچے، ماں باپ اور قریبی رشتے دار قتل کئے جا چکے ہیں اب مجھے اس دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ درندگی کا یہ عمل کسی دوسرے انسان کے ساتھ نہ دہرایا جائے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ آپ تک کس طرح پہنچا ہوں۔ مالا بارہ مسلمانوں پر زندگی حرام ہو چکی ہے۔ جلدی کیجئے۔ اگر آپ نے تاخیر سے کام لیا تو ہزاروں ایمان موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ اجنبی شخص فرش پر گرا اور دوسرے ہی لمحے اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ عجیب فریادی تھا۔ والی میسور سے اپنے لئے کچھ نہیں مانگا۔ بس دوسروں کے مسائل کو الفاظ میں بیان کئے اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حیدر علی شدید حیرت میں ڈوبا ہوا تخت سے اتر آیا اور اس اجنبی کے مردہ جسم کو دیکھنے لگا جو دربار کے فرش پر پڑا تھا۔ فریادی کی آنکھیں نم ہوئی تھیں، جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ ویران آنکھوں سے ناقابل بیان کرب جھلک رہا تھا جیسے وہ آنے والے کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہو۔ اور پھر اسی مایوسی کے عالم میں بڑ جیات سے اٹھ کر چلا گیا ہو۔ حیدر علی نے اس خیال کے تحت طیب خاص کو طلب کر لیا کہ اجنبی شخص طویل سفر کی تھکان اور شدید تھکات کے باعث بے ہوش نہ ہو گیا ہو۔ طیب کچھ دیر تک اس نامعلوم شخص کی نبض دیکھتا رہا، پھر بڑے مایوسانہ انداز میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”افسوس کہ اس کی سانسوں کا شمار ختم ہو چکا۔“

”جو کچھ بھی ہے، وہ اپنے اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والا ہے۔“ والی میسور کے ساتھ تمام مسلمان درباریوں نے بلند آواز میں کہا۔

”آنے والا ہمارا مہمان خاص تھا، اس لئے اس کی تجہیز و تکفین بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔“ حیدر علی کے لہجے سے سوگواری کا رنگ نمایاں تھا۔ ”ہم اپنے مہمان کی میزبانی نہ کر سکتے اس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔“

حیدر علی اجنبی کے جنازے میں شریک ہوا اور سید صاحب سے نماز پڑھانے کے درخواست کی۔ اجنبی کی میت میں سنگ پٹم کے تمام امراء اور ہزاروں مسلمانوں نے اس طرح شرکت کی کہ جیسے ریاست میسور کی کوئی بہت معزز و محترم شخصیت دنیا سے اٹھ گئی ہو۔ اجنبی کی تدفین کے بعد نواب حیدر علی، سید صاحب کے ہمراہ ان کے مکان پر پہنچا اور واقعہ سنانے کے بعد عرض کرنے لگا۔

”اگرچہ فرشتہ اجل کی مداخلت نے اجنبی کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا مگر پھر بھی وہ لوگوں کو اتنا ضرور سمجھا گیا ہے کہ ملا بار کے مسلمان، ہندوؤں کے مظالم کا شکار ہیں اور ان عرصہ حیات تک ہو چکا ہے۔“ یہ کہہ کر والی میسور، سید صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

سید صاحب کا نورانی چہرہ دھواں ہو کر رہ گیا تھا اور وہ شدید اذیت میں مبتلا نظر آرہے تھے۔

”میں اس سلسلے میں آپ کے مشوروں کا محتاج ہوں۔“ حیدر علی کا لہجہ اُداس تھا۔

”میرا سیاست میں میرے مشورے تمہارے کیا کام آئیں گے؟“ سید صاحب نے کسی کلف کے بغیر نہایت سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

”یہ سیاسی مسئلہ نہیں، میرا اور آپ کا دردمشترک ہے۔“ والی میسور کی اُداسی کچھ اور بڑھ گئی۔

”سب کچھ جانتا ہوں مگر پھر بھی کوئی مشورہ دیتے ہوئے ڈرتا ہوں۔“ اچانک سید صاحب ٹالچے میں گفتگو کرنے لگے تھے۔

”آخر آپ کو کس بات کا ڈر ہے؟“ نواب حیدر علی نے سید صاحب کے اس تکلف پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا ہر لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔“

”یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے کہ ایک فقیر بے سروسامان کو اتنی اہمیت دیتے ہو۔ مگر پھر بھی میرا منصب نہیں کہ میں حکومت کو کوئی مشورہ دے سکوں۔“ سید صاحب کا لہجہ نہایت متفقانہ تھا لیکن پھر بھی وہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کچھ گریزاں سے نظر آ رہے تھے۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں تم سے ملا بار کے مسلمانوں کی مدد کے لئے کہوں اور تم میری بات مان بھی لو۔ مگر اچانک صورت حال بگڑ جائے تو پھر تم اپنے اس نقصان کا ذمہ دار مجھے ٹھہرانے لگو یا پھر تمہارے اہل اسطاعت پیچھے پھریں کہ اس ناکارہ بوڑھے نے ہمیں تباہ کر دیا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے سید محترم؟“ حیدر علی کا لہجہ بڑجوش تھا۔ ”میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔“

سید اکرام بخاری کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے، پھر بہت آہستہ لہجے میں فرمانے لگے۔

”نواب! میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ دنیاوی سیاست ایک خالص تجارت ہے اور اس تجارت میں اہل دنیا زیاں کی طرف نہیں دیکھتے۔ ان کی نظریں ہمہ وقت سود پر مرکوز رہتی ہیں۔ سیاست کے اسی اصول کے مطابق ملا بار کے مسلمانوں کی مدد کو جانا بظاہر ایک خسارے کا سودا ہے۔ اگر تم نقصان کا یہ سودا کرنا ہی چاہتے ہو تو اپنے ہم مذہبوں کی خبر گیری کے لئے چلے جاؤ۔ روز کو نکل ہوا، کس کا گھر جلا اور کس کی آبروریزی ہوئی، یہ سب عام سی باتیں ہیں اور عام باتوں پر اہل اقتدار زیادہ دھیان نہیں دیتے۔“

اتنا کہہ کر سید صاحب، والی میسور کی طرف بہت غور سے دیکھنے لگے۔ وہ گہری نظروں سے نواب حیدر علی کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔

ایکایک حیدر علی کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ گہبرا کر سید صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ آپ فرما رہے ہیں؟“ والی میسور کو اپنی سماعت پر شبہ ہونے لگا تھا۔

”ہاں، یہ میرے ہی الفاظ ہیں اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اہل اقتدار اس کی نفی نہیں کر سکتے۔“ سید صاحب کے لہجے میں غیر معمولی ٹھہراؤ تھا۔ ”آنے والا کیوں آیا اور پیچھے والے نے

دینا۔ محمد علی کیدان کی یہی صفات تھیں، جن کے باعث وہ ریاست میسور کے تمام فوجیوں میں ممتاز و بلند نظر آتا تھا۔ مگر اس میں ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ بعض مواقع پر وہ خود سری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ محمد علی کے اسی عیب کی وجہ سے نواب حیدر علی بھی اس سے شکی رہا کرتا تھا۔

آج جب میر علی رضا خان نے ملابار کے سیاسی حالات جاننے کے لئے ریاست میسور کا نمائندہ بھیجے کی تجویز پیش کی تو نواب حیدر علی نے اپنے ماہ نامہ تازہ سپہ سالار، محمد علی کیدان کی طرف دیکھا۔ والی میسور کا خیال تھا کہ وہ حسب عادت یا تو کھلی سرکشی اختیار کرے گا یا پھر برا سامنہ بنا کر اپنی ناگواری کا مظاہرہ کرے گا۔ مگر نواب حیدر علی اس وقت حیران رہ گیا جب محمد علی کیدان اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور پُر جوش لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”نواب بہادر! میرے سوا ملابار کوئی نہیں جائے گا۔ اجنبی فریادی کو میں نے اپنی آنکھوں سے مرنے دیکھا ہے۔ وہ بڑا جانناز شخص تھا کہ اپنا سب کچھ برباد ہو جانے کے بعد بھی دوسروں کو بچانے کے لئے یہاں چلا آیا تھا۔ وہ میرا دوست تھا، نا معلوم دوست۔“ یہ کہتے کہتے محمد علی کیدان کا لہجہ بہت اُداس ہو گیا تھا۔ ”بد قسمتی سے ہمارا ایک دوست تو چلا گیا مگر دوسرے دوستوں کو بچانے کی کوشش کی جانی چاہئے۔ اللہ ہمیشہ ہمارا مددگار رہے۔“ محمد علی کیدان کو اکثر سپاہی ”نولادی انسان“ کہہ کر پکارا کرتے تھے لیکن ملابار کے مظلوم مسلمانوں کی داستان الم سن کر وہ سرے پاؤں تک ایک تصویر درد بن گیا تھا۔ ”میں آج ہی ملابار چلا جاؤں گا۔ مگر نواب بہادر خوب جانتے ہیں کہ میں دوستوں کے گھر خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ اس وقت ہاتھ تک ہے اور دامن میں کچھ بھی نہیں، اس لئے حضور والا سے درخواست گزار ہوں کہ مجھے سرکاری خزانے سے ایک لاکھ روپے عنایت کئے جائیں۔ میں انہیں اپنے پریشان حال دوستوں میں تقسیم کروں گا۔“ اس خفیہ اجلاس میں شریک ہونے والے تمام امراء سلطنت اور فوجی افسر، محمد علی کیدان کی باتیں سن کر حیران رہ گئے۔ وہ بڑی زبانی شان کا سپاہی تھا۔

”تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا محمد علی!“ والی میسور نے اپنی مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”تجھ پر مالی غنیمت کے لاکھوں روپے قرض ہیں۔ پچھلا حساب بے باقی نہیں کرتا اور نئے قرض کے لئے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔“ نواب نے محمد علی کیدان کی اس خاص حرکت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ وہ کبھی کبھی مالی غنیمت کو سرکاری خزانے میں جمع کرانے کی بجائے ضرورت مندوں اور غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔

”ہاں سرکار! مجھے اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے۔ مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ کبھی اپنے تن پر ایک کوڑی خرچ نہیں کی۔“ محمد علی نے بھری محفل میں کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ”نواب بہادر تازہ ملازمتیں کرتے ہیں تو یہ غلام بھی کبھی کبھی جائے سے باہر ہو جاتا ہے۔ خدا آپ کا سایہ ہمارے کوزل پر تادیر قائم رکھے۔ یہ سارے ہنگامے بس سرکار کے دم سے ہیں۔“

نواب حیدر علی مسکرانے لگا۔

اسے تمہارے پاس کیوں بھیجا؟ میں یہ نہیں جانتا۔ میری ذاتی حیثیت بس اتنی تھی کہ مرنے والا کی نماز جنازہ پڑھا دوں اور اس کی مغفرت کے لئے مولائے کائنات کی بارگاہ کرم میں اپنے گناہ گار ہاتھوں کو پھیلا دوں۔ میرے بوڑھے جسم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ سرنگاپٹم سے کل کر مالابار چلا جاؤں اور قاتل ہندوؤں کے جوجم سے پوچھوں کہ تم نے بے جرم و خطا ایک مسلمان کو کیوں ہلاک کر ڈالا؟ نواب حیدر علی خان بہادر! میں اکرام بخاری، ایک بہت کمزور انسان ہوں۔ جب خود اپنے بھائیوں کے غموں کا ازالہ نہیں کر سکتا تو تمہیں کیا مشورہ دوں؟“

آج سید صاحب اس قدر عجیب انداز میں گفتگو کر رہے تھے کہ حیدر علی سنائے میں آگیا تھا۔ بہت دیر تک اس پر سکتہ سا طاری رہا پھر وہ آہستہ سے بولا۔

”میں اپنے بھائیوں کی مدد کو جاؤں گا۔“

”تمہاری مرضی۔“ سید صاحب کے لہجے میں وہی بے نیازی کارنگ تھا۔ ”جاؤ گے تو اپنے فائدے کے لئے جاؤ گے، کسی پر کوئی احسان نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اور اگر نہیں جاؤ گے تو وقت تمہارا انتظار نہیں کرے گا۔ ان مظلوموں پر جو گزرتا ہے، گزر جائے گی۔“

نواب حیدر علی، سید صاحب کے مبہم اشاروں کو سمجھ گیا تھا، اس لئے بہت مطمئن انداز میں اٹھا اور دعاؤں کی درخواست کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔



والی میسور نے فوری طور پر اپنے سپہ سالار، میر علی رضا خان کو حیدر نگر (بدنور) سے سرنگاپٹم طلب کر لیا۔ پھر وہ کئی دن تک اپنے امراء کے ساتھ طویل مشوروں میں مصروف رہا۔ حیدر علی نے تمام اراکین سلطنت سے فردا فردا ان کی رائے معلوم کی مگر کوئی ایک عہدیدار بھی ملابار حملہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

”نواب بہادر! ہم نہیں جانتے کہ وہ شخص کون تھا اور کن حالات میں ”دربار حیدری“ تک پہنچا تھا۔“ سپہ سالار میر علی رضا خان نے بعد احترام عرض کیا۔ ”جب تک صورت حال بالکل واضح نہ ہو جائے اس وقت تک ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے کسی معتبر شخص کو ملابار روانہ کر دیں۔ پھر اس کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں مناسب اقدام کیا جائے۔“

حیدر علی نے میر علی رضا خان کی رائے سے اتفاق کیا اور اپنے دوسرے سپہ سالار محمد علی کیدان کی طرف دیکھا۔

محمد علی کیدان ایک نہایت ہوشیار اور قابل سپہ سالار تھا۔ وہ انتہائی سنگین حالات میں بھی ایسی چالاک سے کام لیتا کہ میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ جانناز سپاہی ہونے کے علاوہ محمد علی ایک قلندر مزاج اور فقیر دوست انسان تھا۔ ایک ٹوپی اور چند پرانے کپڑوں کے سوا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا تھا۔ محمد علی کو جس قدر بھی دولت ملتی تھی، وہ اسے اسی وقت فقیروں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی جنگوں میں لوٹا ہوا خزانہ بھی ننگے اور بھوکے انسانوں کی نذر



”تو بہت ذہین ہے محمد علی! مگر کبھی کبھی بہتر دماغ میں کسی دیہاتی کی عقل سما جاتی ہے اور مذاق کی بات کو سنجیدہ گفتگو سمجھنے لگتا ہے۔“

فرط حیرت سے محمد علی کیدان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور کچھ دیر کے لئے وہ ہوش راسخ آنے لگا۔

”کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تجھے ملابار بھیج دوں گا؟“ یکایک والی میسور بہت زیادہ سنجیدہ لگ گیا تھا ”تو میرا دایاں بازو بھی ہے اور میرا دماغ بھی۔ اگر خدا خواستہ تجھے کچھ ہو گیا تو اس نقصان کی تلافی کون کرے گا؟..... کوئی بھی نہیں۔ تو اکیلا کئی کئی لشکروں پر بھاری ہے۔ لڑائی کی طرح چالیں چلتا ہے اور شیر کی مانند حملہ کرتا ہے۔ ریاست میں تیرا کوئی نعم البدل نہیں۔ اس لئے میں تیرے حوالے سے یہ معمولی معمولی بازیاں نہیں کھیل سکتا۔“

نواب حیدر علی کی زبان سے تعریفی کلمات سن کر محمد علی کی مضحکہ خیز حالت بدل گئی اور وہ اپنی گردن کو مزید اونچا کر کے احساس غرور کے ساتھ دیگر امراء سلطنت کی طرف دیکھنے لگا۔ طویل غور و فکر اور بحث کے بعد نواب حیدر علی نے اپنے شعبہ جاسوسی سے تین ایسے افراد کو طلب کیا جو تمام علاقائی زبانیں جاننے کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

”تم کل ہی ہندو لہاس میں ملابار کی طرف روانہ ہو جاؤ اور اہل ہندو کی صفوں میں شامل ہو کر مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لو۔“ والی میسور نے اپنے جاسوسوں کو حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ خفیہ فوجی اجلاس ختم ہو گیا۔

ملابار، ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر ایک زرخیز خطہ ہے، جسے آج کل ”کیرلا“ بھی کہا جاتا ہے۔ آغاز اسلام ہی سے عرب اس علاقے میں بغرض تجارت آتے رہے ہیں۔ عرب تاجروں کے کردار سے متاثر ہو کر بہت سے ہندو خاندان مسلمان ہو گئے تھے اور نو مسلموں کی یہ جماعت ”مپلہ“ کہلانے لگی تھی۔ پھر جیسے جیسے تبلیغ اسلام کا کام تیز تر ہوتا چلا گیا، مسلمانوں کی تعداد بھی روز بہ روز بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ مگر یہ ریاستیں کوئی سیاسی طاقت نہیں رکھتی تھیں۔ ملابار کے مسلمان اکثر اپنے طاقتور ہندو پڑوسیوں کی سرانگیزی کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد ہندوؤں کی فتنہ گری میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ عام دنیاوی معاملات میں ”مپلاؤں“ سے اس قدر تحقیر آمیز سلوک کرتے تھے جیسے مسلمان بھی ”اچھوتوں“ یا ”ہریجنوں“ ہی کی کوئی شاخ ہوں۔ جب تک مثل شہنشاہ اورنگزیب زندہ رہا، اس علاقے کے ہندو بھی اپنے آپ کو انتہائی امن پسند شہری ثابت کرتے رہے۔ مگر جیسے ہی عالمگیری کی آنکھیں بند ہوئیں، وہ اپنے مصنوعی خول سے باہر نکل آئے۔ اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مقامی ہندو، مسلمانوں پر حاوی ہوتے چلے گئے اور ایک دن یہ نوبت آگئی کہ تیسرے درجے کا ہندو بھی معمولی سی بات پر مسلمان شرفاء کو سزا دے گا۔

ذلیل کر دیا کرتا تھا۔ غریب اور کمزور مسلمانوں کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ہندو غنڈے ان کی دکانیں لوٹ لیتے۔ احتجاج کرنے والوں کو زد و کوب کرتے۔ اور کبھی کبھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے بے گناہ مسلمانوں کی جان بھی لے لیتے۔ اگر مرنے والے کے عزیز و

اتاقب فریاد کرتے تو ان سے کہا جاتا۔

”تمہارا غم کھانے والا قبر میں سو رہا ہے۔“ ہندو فتنہ گروں کا اشارہ اور ننگریب عالمگیری کی طرف ہوتا۔ ”اب تمہاری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہماری بھیڑ بکریاں بین کر ہو۔“

کئی سال سے یہی اذیت ناک صورت حال جاری تھی کہ ایک واقعے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ کناور کے ہندو راجہ کا تعلق ”ناڑ“ قوم سے تھا۔ اس کی جواں سال بیٹی، کناور کے ایک مسلمان رئیس زادے کی محبت میں اس قدر وارفتہ ہو گئی کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ ستر، راجہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ نے اسے بہت سمجھایا کہ ایک مسلمان کے عشق سے باز آ جائے ورنہ وہ اور اس کا خاندان پوری ہندو قوم کی نظروں میں محبوب بن جائے گا۔

ستر نے یہ کہہ کر ماں باپ کے ہر مشورے کو جھٹلادیا۔ ”عشق کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور کوئی قوم نہیں ہوتی۔ علی ہی میرا محبوب ہے اور علی ہی میرا دیوتا۔“

ماں باپ، ستر اسے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اس لئے بیٹی کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے اور انہوں نے پوری قوم کی مخالفت کے باوجود ستر کی شادی علی سے کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اپنے داماد کو تاج و تخت کا وارث بھی قرار دے دیا۔ شادی اور وراثت کے اعلان کے ساتھ ہی پوری ناڑ قوم نے اپنے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ وہ راجہ کناور کا تو کچھ نہ بگاڑ سکی مگر اس نے عام مسلمانوں کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ اجنبی مسلمان جو فریادی بن کر نواب حیدر علی کے دربار میں پہنچا تھا، اس کے پورے خاندان کو ہندو بد معاشوں کے ایک گروہ نے قتل کر ڈالا تھا۔ جب صورت حال انتہائی سنگین ہو گئی تو ایک دن علی نے اپنے خسر راجہ کناور سے ہندو قوم کے مظالم کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔

”میرے ہم مذہبوں پر اہل ہندو کی طرف سے روز ایک تازہ قیامت نازل ہوتی ہے، آپ اسے روکتے کیوں نہیں؟“ علی کا لہجہ تلخ بھی تھا اور اداس بھی۔

”بیٹے! میں اس طوفان کو کیسے روک سکتا ہوں؟“ راجہ کناور نے داماد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ کے پاس طاقت ہے، اقتدار ہے، فوج ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ آپ قتل و غارت کے اس سیلاب کو نہ روک سکیں۔“ علی نے اپنے زور بیان اور منطقی دلیل سے راجہ کناور کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”بظاہر تمہاری بات درست ہے مگر تم حقیقت حال سے واقف نہیں۔“ راجہ نے علی کو

”خوابوں“ اور ”خوش گمانوں“ کے حصار سے نکل جائیں۔ اور تمام مادی سہاروں سے بے نیاز ہو کر اپنی موت کا استقبال کریں۔“

عجب خط تھا جسے پڑھ کر شدت جذبات سے نواب حیدر علی کا چہرہ جلنے لگا۔ اہل دربار بڑی آسانی سے والی میسور کی دلی کیفیات کا اندازہ کر سکتے تھے۔ نواب کے جسم میں ایک آتش فشاں پوشیدہ تھا، جس کا لاوا حیدر علی کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

”اگر اللہ نے مجھے میسائی کی طاقت بخشی ہے تو پھر مسلمانانِ ملابار کے علاج میں کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔ شافی و کافی تو اسی کی ذاتِ پاک ہے۔ پھر بھی یہ گناہ گار و عاجز بندہ اپنے بھائیوں کی حالت زار سن کر خاموش نہیں بیٹھے گا۔“ حیدر علی نے ”مالاؤں“ کے وفد سے مخاطب ہوئے کہا۔

اس کے بعد والی میسور تمام رات اپنے امراءِ سلطنت اور مشیرانِ سیاست سے مشورے کرتا رہا۔ ”مالاؤں“ قوم جہاز رانی میں بڑی مہارت رکھتی تھی۔ اسی حوالے سے حیدر علی کو ”بحری بیڑہ“ بنانے کا خیال آیا۔ پھر جب اس نے اپنے مشیروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی تو وہ سب کے سب بڑی حیرت سے والی میسور کا منہ دیکھنے لگے۔ ان کے نزدیک ”بحری طاقت“ قائم کرنے کا منصوبہ وقت اور پیسہ برباد کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مگر حیدر علی کی دور بین آنکھیں اپنے مشیرانِ سیاست سے بہت آگے دیکھ رہی تھیں۔ والی میسور کی غیر معمولی ذہانت و تدبیر نے یہ راز پالیا تھا کہ مضبوط بحری بیڑے کے بغیر اس کا اقتدار زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ قدرت نے ملابار کے ”مالاؤں“ کی شکل میں ایک واضح اشارہ دیا تھا۔ اور حیدر علی نے اس اشارے کا مفہوم سمجھنے کے لئے چند لمحوں کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔

پھر دوسرے دن والی میسور کی طرف سے دو فرمان جاری کئے گئے۔ ایک علی کے نام تھا جس میں کنانور کے امیر زادے کو ”امیر البحر“ مقرر کیا گیا تھا۔

”تو جوان! میں تمہارے جذبہ غیرت و حمیت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہاری جاں سوزی کا صلہ یہی ہے کہ تمہیں اپنے حلقہٴ خاص میں شامل کر لوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم اپنی نگرانی میں ایک طاقتور بحری بیڑہ قائم کرو۔ اس ذیل میں جتنے بھی اخراجات آئیں، ثوری طور پر مجھے تحریر کرو۔ میرے سفارت کار، ریاست کنانور آنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ تم پر اور مسلمانانِ ملابار پر اللہ کی سلامتی ہو۔“

دوسرا فرمان دراصل ناتر قوم کے لئے تھا، جس میں راجہ کنانور کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ”علی کی وجہ سے آپ بھی ہمارے دوست ہیں۔ اور ہم اپنے کسی دوست کو مصیبت کے وقت تمہیں چھوڑتے۔ یہ اسی عائدانہ دوستی کا نتیجہ ہے کہ ہم آپ کے ذریعے پوری ناتر قوم کے لئے سلامتی کا بیج بکھیر رہے ہیں۔ مگر ہمارا یہ بیجا چند باتوں سے مشروط ہے۔ آپ اپنی قوم کو مل کے کھانا پکھانا میں بتا دیجئے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس کے وحشیانہ سلوک سے ہمیں

سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”طاقت و اقتدار، فوج سے حاصل ہوتے ہیں اور میں اپنی فوج پر کئی اختیار نہیں رکھتا۔“ یہ کہتے کہتے راجہ کا لہجہ اداں ہو گیا تھا۔

”اس کی وجہ؟“ علی کو اپنے خسر کے اس انکشاف پر شدید حیرت تھی۔ راجہ کنانور اپنے داماد کے اس سوال پر کچھ دیر تک تذبذب کی کیفیت سے دوچار رہا، پھر بہت آہستہ سے بولا۔

”میری اس بے اختیاری کی وجہ تمہاری اور ستمرا کی شادی ہے۔“ ستمرا، راجہ کنانور کی بیٹی کا نام تھا۔ ”میں نے تم دونوں کو شاد و آباد دیکھنے کے لئے اپنے آپ کو بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ میری پوری قوم مجھ سے خفا ہے۔ وہ میرے ساتھ تمہیں بھی اپنی نفرتوں کا ہدف بنا چاہتی ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں نے ہندو دھرم کی رسمن سے بغاوت کی۔ اور تمہارا جرم یہ ہے کہ تم مسلمان ہو۔ میری وجہ سے تمہارے گرد و طاقت کا ایک آہنی حصار کھینچا ہوا ہے اور ہندو قوم اس حصار کو عبور کر کے تم تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اس لئے وہ مسلمانوں کی جانوں سے کھیل کر اپنے انتقام کی آگ بجھا رہی ہے۔ درندگی کے اس کھیل کو صرف فوج روک سکتی ہے۔ اور فوج اپنی ہی قوم پر کبھی ہتھیار نہیں اٹھائے گی۔ اگر میں نے سپاہیوں پر جبر کیا تو ان کی بندوثوں اور تلواروں کا رخ میری طرف ہوگا اور پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔“

علی ایک حساس اور غیرت مند نوجوان تھا اس لئے زیادہ دن تک اپنی قوم پر ہندوؤں کے یہ مظالم برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ”مالاؤں“ کے ایک وفد کو میسور بھیجا۔ ملابار کے مسلمانوں کی یہ جماعت اس وقت میسور پہنچی جب حیدر علی اپنے تین جاسوسوں کو اس علاقے کی طرف روانہ کر چکا تھا۔ مالاؤں کے اس وفد نے بڑے دردناک انداز میں مقامی مسلمانوں کی حالت زار بیان کی اور ساتھ ہی علی کا ایک خط بھی والی میسور کی خدمت میں پیش کیا۔ علی نے اپنا عرضداشت میں صاف صاف تحریر کیا تھا۔

”ہندوستان میں اور بھی کئی مسلمان حکمران ہیں۔ مگر وہ سب کے سب اپنی ذات میں اس طرح گم ہیں کہ انہیں ایک لمحے کے لئے بھی اہل ایمان کی تکالیف کا خیال نہیں آتا۔ اب اس خرابے میں بس ایک آپ ہی کی شخصیت باقی رہ گئی ہے، جس سے دردمندی اور داری کی کوئی کمی جاسکتی ہے۔ یہ ان مظلوم مسلمانوں کے چند نمائندے ہیں جو آپ کے حضور پوری قوم کی طرف سے فریادی بن کر آئے ہیں۔ اگرچہ انہی لوگوں کے چہروں پر آپ کے کلمہ گویائیوں کی داستانِ الم تحریر ہے۔ لیکن پھر بھی اس بات کا امکان موجود ہے کہ یہ بدحواس نمائندے ان لوگوں کی ترجمانی سے عاجز رہ جائیں گے جو قتل کر دیئے گئے یا جن پر عتریب موت مسلط کی جانے والی ہے۔ آپ سے میری یہی التجا ہے کہ اگر ملابار کے مسلمان حضور والا کی توجہ کے منتظر نہیں تو اس بیمار قوم کے علاج کے لئے فوری اقدام کیجئے۔ اور اگر یہ عاجز و درماندہ لوگ آپ کے التفات کے لائق نہیں تو کسی تاخیر کے بغیر ان کی طرف سے منہ پھیر لیجئے تاکہ یہ جلد از جلد

بھرتنا اونچا اڑنے کی کوشش کرتی تھی، چاند کے فاصلے کچھ اور بڑھ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ٹھنک کر دوبارہ زمین پر گر گئی۔ چاروں طرف خوف ناک تنہائی تھی۔

نواب حیدر علی اور بیگمات نے بہت چاہا کہ وہ راج محل میں پرسکون زندگی گزارے۔ مگر نظریات غیر مندرجہ، اس لئے عنایات شاہانہ کو ٹھکرا کر یتیم خانے چلی گئی۔ بیشتر اوقات بے سہارا بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتی۔ حکومت کی طرف سے ملنے والی تنخواہ کا بڑا حصہ نادار بچوں میں تقسیم کر دیتی۔ سہ پہر کے وقت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی اور مذہبی مسائل دریافت کرتی۔ ایک دن سید صاحب نے اس کے نام اور لباس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

”بہن! تمہارا نام اور لباس دونوں ابھی تک ہندوانہ ہیں۔ تم اپنے دور گمراہی کی ان نشانوں کو بدل کیوں نہیں دیتیں؟ ابھی تک شاہراہوں پر بے پردہ پھرتی ہو۔ اب تمہیں اسلامی طرز معاشرت پر عمل کرنا چاہئے۔“

”میں مسلمان کہاں ہوں سید صاحب؟“ سریتا دیوی نے بے جھجک ہو کر کہا۔ ”ابھی تو ہندو مذہب چھوڑا ہے۔ کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کیا۔“

”پھر کون ہو؟“ سریتا دیوی کا جواب سن کر سید صاحب حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

”اللہ ہی جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔“ کچھ دیر تک سریتا نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر سید صاحب سے اجازت لے کر یتیم خانے چلی گئی۔ اور اب دروازے پر کھڑی ٹیپو سلطان کے گزرنے کا انتظار کر رہی تھی

سریتا دیوی کا کئی ماہ سے یہی معمول تھا کہ وہ صبح و شام یتیم خانے کے دروازے پر کھڑی ہو جاتی اور ٹیپو سلطان کا انتظار کرتی رہتی۔ یتیم خانہ فوجی چھاؤنی اور اس طویل و عریض میدان کے درمیان واقع تھا، جہاں ولی عہد سلطنت روزانہ جنگی مشقوں کے لئے جایا کرتا تھا۔ ٹیپو سلطان کے گزرنے سے پہلے سریتا اپنے کمرے سے نکل کر دروازے پر آتی اور پھر کچھ فاصلہ طے کر کے اس جگہ کھڑی ہو جاتی جو نسبتاً سناٹا تھی۔ ٹیپو کے آنے سے پہلے سریتا کی حالت مانگ بے آب کی سی ہوتی۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ جاتی اور آنکھوں سے وحشت جھلکتی گئی۔ پھر جیسے ہی ٹیپو کا گھوڑا نمودار ہوتا، سریتا کا سارا اضطراب ختم ہو جاتا اور اس پر سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ولی عہد سلطنت سریتا کے قریب پہنچ کر ٹھہر جاتا اور پھر گھوڑے سے اتر کر اس دوشیزہ کی حراں گیری کرتا، جسے عشق نے ساری دنیا سے بے گانہ کر دیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں کتور؟“ سریتا شرمائے ہوئے لہجے میں جواب دیتی اور پھر اس کی پیاسی آنکھوں میں ٹپٹپٹا آسودہ حسرتوں کے چراغ جل اٹھتے۔ ”میری زندگی اور موت کی حقیقت ای کیسی؟“ آپ خوش ہیں تو میں پوری توانائی کے ساتھ زندہ ہو۔ اور اگر آپ افسردہ و ملول ہیں تو پھر سمجھ لیں کہ مجھ پر نزع کی سی کیفیت طاری ہے۔“

اگرچہ اس وقت ٹیپو سلطان کی عمر تیرہ سال تھی لیکن وہ اتنا باشعور ہو چکا تھا کہ سریتا کے

نا قابل بیان اذیت پہنچی ہے۔ مگر ہم ”ناروں“ کے سابقہ مظالم کو صرف اس لئے معاف کرنے ہیں کہ کل تک ہمیں صورت حال کا علم نہیں تھا۔ آج جبکہ ہم اپنے ہم مذہبوں کی مظلومیت سے واقف ہو چکے ہیں تو پھر ان کے جسموں پر ہلکی سی خراش بھی برداشت نہیں کی جائے گی۔ اس لئے آپ کی قوم پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی مکمل حفاظت دے۔ یہ ہمارا واضح حکم ہے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کی گئی تو یاد رکھئے کہ مسلمان شہسواروں کے پاؤں رکابوں میں ہیں اور آنکھیں میرے ہاتھ کے اشارے پر مرکوز ہیں۔“

یہ دونوں فرمان جاری کرنے کے بعد نواب حیدر علی نے ”مالپلاؤں“ کے وفد کو انعام و اکرام سے نوازا اور اپنے پچاس سپاہیوں کے ہمراہ انہیں رخصت کیا۔ والی میسور کے سپاہی پانچ لاکھ کی ایک کثیر رقم لے کر روانہ ہوئے۔ یہ رقم کنانور اور دوسرے علاقوں کے ان مسلمانوں کے لئے تھی جو نارتھ قوم کے تشدد کا نشانہ بن کر تباہ و برباد ہو چکے تھے۔

اٹھارہ سالہ مغل نوجوان، مرزا اسد بیگ اس فوجی دستے کی قیادت کر رہا تھا۔ یہی نوجوان تھا جس کی پشت پر ٹیپو سلطان نے تازیانے برسائے تھے۔ اس واقعے کے بعد ولی عہد سلطنت نے مرزا اسد بیگ سے معافی مانگ لی تھی اور اسے اپنے حلقہ خاص میں شامل کر لیا تھا۔ ٹیپو سلطان کو اسد بیگ سے حقیقی بھائیوں کی طرح محبت تھی۔ اسد بیگ فرصت کے اوقات میں سید صاحب کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتا۔ سید صاحب بھی مغل نوجوان کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور اکثر حاضرین درس گاہ کو مخاطب کر کے فرماتے۔

”کاش! اسد بیگ کی طرح دوسرے مسلمان بھی قومی تفاخر اور قبائلی غرور کی لہجوں سے پاک ہو جائیں تو ملت اسلامیہ کے سارے مسائل ایک دن میں حل ہو جائیں گے۔“

نواب حیدر علی بھی مرزا اسد بیگ کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے فوجی دن کے ساتھ ریاست کنانور جانے کی خواہش ظاہر کی تو والی میسور نے انکار کر دیا۔

”اسد! تو ابھی بچہ ہے۔ میں تجھے آفات و مصائب کے ہجوم میں بھیجنا نہیں چاہتا۔“

”نواب بہادر! مجھے مسلمانوں کی خدمت کے اعزاز سے محروم نہ کیجئے۔“ مرزا اسد بیگ نے بڑے پُراثر لہجے میں درخواست کی۔

آخر حیدر علی کو مجبور ہو جانا پڑا۔ پھر اسد بیگ، ٹیپو سلطان سے اجازت لے کر بات کنانور روانہ ہو گیا۔

باپ اور دادی کے قتل کے بعد سریتا دیوی بچھ کر رہ گئی تھی۔ اگرچہ اس نے ہندو مذہب ترک کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ خونی رشتوں کو فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر اس پر بیک وقت مصیبتوں کے کئی پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ انجانے میں محبت کا رنگ گہرا ہو گیا۔ زمین پر بسنے والی مخلوق تھی لیکن چکور بن کر چاند کی طلب میں آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔

”اور یہ بی بھکارن ہوں؟“ سریتا، شجاعت خان کی بات کاٹتے ہوئے بڑے ناز و انداز سے کہتی۔ ”کیا میں شہزادی نہیں ہوں؟..... اپنے بابا کی شہزادی؟“ یہ کہہ کر سریتا، شجاعت خان کے بچے پر سر رکھ دیتی۔ وہ ریاست میسور کے نائب سپہ سالار کو ”بابا“ کہہ کر پکارتی تھی۔ اور شجاعت خان اسے اپنی حقیقی بیٹی کا درجہ دیتا تھا۔

”یہ شہزادیاں تیرے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں؟“ شجاعت خان انتہائی مدغور دلچسپی میں کہتا۔ ”میری بیٹی تو دلوں کی کائنات کی ملکہ ہے۔ سب سے حسین، سب سے سر بلند۔“

شجاعت خان نے بھی کئی بار سریتا کی بے پردگی اور ہندوانہ لباس پر اعتراض کیا تھا۔ مگر سریتا اپنے منہ بولے باپ سے بھی صاف صاف کہہ دیتی تھی۔ ”بابا! دل اور دماغ مسلمان نہ ہیں تو پھر لباس اور پردے میں کیا رکھا ہے؟ بے شک! میں نے بتوں سے انکار کر دیا ہے مگر اسلام کی منزل سے ابھی بہت دور ہوں۔ دعا کیجئے کہ منزل ہاتھ آ جائے ورنہ مجھ جیسا بد نصیب کون ہوگا کہ راستے کا غبار بن کر رہ گئی۔“

شجاعت خان حیران و پریشان اس نونیز لڑکی کا منہ دیکھتا رہتا جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی باہمی کرتی تھی۔

”بابا! میری یہ ظاہری حالت میں ایک راز ہے۔“ شجاعت خان کو پریشان دیکھ کر سریتا دیوی نورانی بول اٹھتی۔ ”آپ کا مجھ پر بڑا حق ہے۔ مگر اس راز کو جاننے کے لئے کبھی اپنا حق استعمال نہ کیجئے گا۔ اللہ میری پردہ داری کرے۔“ یہ کہہ کر سریتا، شجاعت خان کے قدموں سے ہل جاتی اور بے اختیار رونے لگتی۔

شجاعت خان گھبرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا۔ ”تو جس لباس میں رہے، میری بیٹی ہی رہے گی۔“



سرنگاپٹم کے کئی امراء، سریتا دیوی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ جب ان لوگوں نے والی ہور کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو حیدر علی کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے۔

”چار چار بیویاں، پچاسوں کنیریں، تمہیں شرم نہیں آتی؟ اپنے جھریوں بھرے چہرے نہیں دیکھتے کیا سارے آئینے ٹوٹ گئے؟ کب تک بواہوی کا یہ کاروبار جاری رکھو گے؟“

نواب حیدر علی کی حقیقت بیانی اور تلخ گفتاری نے امراء کے ہوش اُڑا دیے تھے۔ اور بار بار انعامات سے ان کی گردنیں جھک گئی تھیں۔ پھر بھی ایک امیر، نجیب الدولہ خاموش نہ رہ سکا۔

”میں تو اس بے سہارا لڑکی سے اس لئے شادی کرنا چاہتا ہوں کہ نواب بھادری خاندانی باہت پر کوئی حرف نہ آئے۔“

”تو کون ہوتا ہے، لونڈی بچے! میری خاندانی عظمتوں کی پاسپانی کرنے والا؟“ شدت و غلبہ سے والی میسور کا چہرہ جلنے لگا تھا۔ ”مجھے میرے خدا نے سر بلند کیا ہے اور آئندہ بھی وہی

عشق کی گہرائی کا مفہوم سمجھ سکے۔

”اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ شیخو، سریتا کو سمجھانے لگتا۔ ”تم انتہائی غیرت مند حیدر لڑکی ہو۔ مگر اپنے دل کے ہاتھوں ایک تماشا بن کر رہ گئی ہو۔ یہاں سے گزرنے والا سینکڑوں سپاہی اور دوسرے لوگ تمہیں عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔“

”تماشا تو میری ذات ہے کنورا! پھر تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟“ سریتا بڑے جذباتی لہجے میں سوال کرتی۔ ”کیا تمہیں میرے پاس آتے وقت کسی ذلت یا عداوت کا احساس ہوتا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ شیخو سلطان پوری استقامت کے ساتھ جواب دیتا۔ ”مجھے تو بس تمہارے اکیلے پن کا احساس ہے۔ اس دکھ بھری زندگی کا خیال ہے جو تم گزاردی ہو۔“

”مجھے کوئی دکھ نہیں کنورا! یہ کہتے کہتے سریتا، شیخو سلطان کے گھوڑے کی لگام پکڑ لیتا۔ ”تم مجھے نظر آتے رہو۔ جہاں سے اور جس زاویے سے دیکھوں، تمہاری ہی صورت دکھائی دے۔“

”یہی تو ممکن نہیں۔“ شیخو اُلجھنے لگتا۔ ”کاش تمہیں میری ذمہ داریوں کا احساس ہوگا! لہجہ بھی میرا نہیں۔ ہر سوچ اور ہر سانس پر نواب بھادری کے احکام کا قبضہ ہے۔“

”پھر بھی، جہاں تک ممکن ہو۔“ سریتا سر سے پاؤں تک بھکارن نظر آنے لگتی۔ ”میرے سکون کے لئے تو تمہارے چہرے کی ایک جھلک ہی کافی ہے۔“

”میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرے حوالے سے تم پر انگلیاں اٹھائیں۔“ شیخو، سریتا کو سمجھا کے لئے آخری دلیل کا سہارا لیتا۔

”وہ دن آنے تو دو کنورا!“ سریتا کا چہرہ شفق رنگ ہو جاتا۔ ”میں اسی دن کے انتظار میں زندہ ہوں کہ جب دنیا والے گلی گلی پکاریں گے، وہ جارہی ہے پیراگن، اپنے کنور کی جوگن۔“

شیخو سلطان خاموش ہو جاتا۔ مگر پابندی کے ساتھ روزانہ سریتا کے پاس ٹھہرتا، کچھ بات کرنا اور فوجی چھاؤنی کی طرف چلا جاتا۔

شجاعت خان مکمل طور پر اس صورت حال سے باخبر تھا۔ اسے پہلے ہی سریتا سے بے محبت تھی۔ مگر جب موہن داس اور بملا دیوی کو قتل کر دیا گیا تو شجاعت خان کی محبت میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اکثر سریتا دیوی سے ملنے یتیم خانے جایا کرتا تھا۔ شجاعت خان جب بھی سریتا کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے کر جاتا۔ کبھی کوئی لباس، کبھی سونے کا کوئی زیور۔

پھل، مٹھائی اور کھانا۔ سریتا اسے لاکھ منع کرتی مگر شجاعت خان یہ کہہ کر اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا۔

”تیرے اور شہزادے کے سوا میرا اس دنیا میں کون ہے؟“ یہ کہتے کہتے شجاعت خان آنکھوں میں سُلگتی ہوئی تمنائوں کا دھواں بھر جاتا اور آنسوؤں کو ضبط کرتے کرتے اس میں تشخ سا ہونے لگتا۔ ”شیخو کون چیزوں کی ضرورت نہیں کہ وہ خود نواب زادہ ہے۔“

خزانوں کا مالک ہے۔“



میرے خاندان کی آبرورکھے گا۔“  
”حضور والا! سارا سرنگا پٹم جانتا ہے کہ ولی عہد سلطنت نے اس برہمن زاوی کے عشق میں وقار شاہی کو یتیم خانے تک پہنچا دیا ہے۔“ نجیب الدولہ نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔  
نجیب الدولہ ایک زمانہ ساز انسان تھا۔ ایک طرف وہ نواب حیدر علی کی وفاداری کا دم بھرتا تھا، دوسری طرف نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی اور نظام علی خان، والی دکن سے بھی خفیہ مراسم رکھتا تھا اور انتہائی ہے کہ راجہ کرشنا سے بھی اس کے پوشیدہ تعلقات تھے۔ نواب حیدر علی کے رفیقوں نے اسے بس ایک ہی کام سونپا تھا کہ وہ اپنی شاطرانہ چالوں سے ریاست میں انتشار برپا کر رہے۔ فطرتاً اوباش تھا، اس لئے سریتا جیسی حسین دوشیزہ کو اپنے عشرت کدے میں داخل کر چاہتا تھا۔ پہلے اس نے حیدر علی کے سامنے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر جب والی میسور نے اسے ڈانٹ دیا تو وہ لہجہ بدل کر فتنہ انگیزی پر اتر آیا۔

”میں تو نواب بہادر کے عزت و جلال کی خاطر اپنی شخصیت کی قربانی پیش کر رہا ہوں۔ ورنہ اس بدنام لڑکی سے کون شادی کرے گا جو چار دن تک اوباش نوجوانوں کی قید میں رہ کر آئی ہو اور وحشیانہ تشدد سے اس کے جسم کا کوئی حصہ سلامت نہ ہو۔“ نجیب الدولہ انتہائی سرد لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ ”اگر حضور والا کو میری یہ قربانی منظور نہیں تو میرے الفاظ مجھے واپس کر دیئے جائیں۔“

نجیب الدولہ کی باتیں سن کر حیدر علی کے دل و دماغ جل رہے تھے۔ مگر والی میسور، سریتا دیوی کے سلسلے میں اس فتنہ گر کے الزام کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ سرنگا پٹم کے اکثر لوگ سریتا کو ایک آبرو باختہ لڑکی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نو دھار اور اس کے ساتھی نوجوانوں کی قید میں رہنے کے بعد سریتا اپنی عفت مابی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ بس حیدر علی اس راز سے واقف تھا کہ سید صاحب کی روحانی مداخلت کے باعث نو دھار، سریتا کے جسم پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ یہ صورت حال، والی میسور کے لئے اطمینان بخش تھی۔ مگر آج جب نجیب الدولہ نے سریتا کی آبروئی کا ذکر کیا تو حیدر علی کو اندازہ ہوا کہ سرنگا پٹم کے باشندے اس کے خوف سے اپنی زبانیں بند رکھتے ہیں ورنہ ان کے دلوں میں بڑی بڑی ٹیڑھ ہے۔

”وہ کچھ بھی سہی، مگر تو اس کے قابل نہیں ہے اوباش بوڑھے!“ نواب حیدر علی نے نجیب الدولہ کو بری طرح جھڑک دیا۔ نجیب الدولہ کا نپتے جسم کے ساتھ اٹھا اور لرزے قدموں سے چل گیا۔

”میرے سوا اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔“ ٹیپو سلطان نے بے جھجک ہو کر کہا۔ ”نہ وہ تانا وخت چاہتی ہے نہ مال و زر۔ اس نے کبھی مجھ سے میری ذات کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ بس ایک نظر میری صورت دیکھنا چاہتی ہے۔“

”اور تم؟“ حیدر علی نے اسی آہنی لہجے میں بیٹے سے سوال کیا۔

”میں بابا محترم کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔“ ٹیپو سلطان کی سعادت مندی مثالی مثبت رکھتی تھی۔

ولی عہد سلطنت کا جواب سن کر والی میسور کے چہرے پر شفقت و نرمی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ”فرزند اکل ہی سید صاحب سے رخصت کی اجازت لو۔ اب تم مکتب نہیں، محاذ جنگ بجاؤ گے۔“

ٹیپو سلطان کا ایک بہت اداں نظر آنے لگا۔

”میرے خاندان کی آبرورکھے گا۔“  
”حضور والا! سارا سرنگا پٹم جانتا ہے کہ ولی عہد سلطنت نے اس برہمن زاوی کے عشق میں وقار شاہی کو یتیم خانے تک پہنچا دیا ہے۔“ نجیب الدولہ نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔  
نجیب الدولہ ایک زمانہ ساز انسان تھا۔ ایک طرف وہ نواب حیدر علی کی وفاداری کا دم بھرتا تھا، دوسری طرف نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی اور نظام علی خان، والی دکن سے بھی خفیہ مراسم رکھتا تھا اور انتہائی ہے کہ راجہ کرشنا سے بھی اس کے پوشیدہ تعلقات تھے۔ نواب حیدر علی کے رفیقوں نے اسے بس ایک ہی کام سونپا تھا کہ وہ اپنی شاطرانہ چالوں سے ریاست میں انتشار برپا کر رہے۔ فطرتاً اوباش تھا، اس لئے سریتا جیسی حسین دوشیزہ کو اپنے عشرت کدے میں داخل کر چاہتا تھا۔ پہلے اس نے حیدر علی کے سامنے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر جب والی میسور نے اسے ڈانٹ دیا تو وہ لہجہ بدل کر فتنہ انگیزی پر اتر آیا۔

”میں تو نواب بہادر کے عزت و جلال کی خاطر اپنی شخصیت کی قربانی پیش کر رہا ہوں۔ ورنہ اس بدنام لڑکی سے کون شادی کرے گا جو چار دن تک اوباش نوجوانوں کی قید میں رہ کر آئی ہو اور وحشیانہ تشدد سے اس کے جسم کا کوئی حصہ سلامت نہ ہو۔“ نجیب الدولہ انتہائی سرد لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ ”اگر حضور والا کو میری یہ قربانی منظور نہیں تو میرے الفاظ مجھے واپس کر دیئے جائیں۔“

نجیب الدولہ کی باتیں سن کر حیدر علی کے دل و دماغ جل رہے تھے۔ مگر والی میسور، سریتا دیوی کے سلسلے میں اس فتنہ گر کے الزام کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ سرنگا پٹم کے اکثر لوگ سریتا کو ایک آبرو باختہ لڑکی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نو دھار اور اس کے ساتھی نوجوانوں کی قید میں رہنے کے بعد سریتا اپنی عفت مابی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ بس حیدر علی اس راز سے واقف تھا کہ سید صاحب کی روحانی مداخلت کے باعث نو دھار، سریتا کے جسم پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ یہ صورت حال، والی میسور کے لئے اطمینان بخش تھی۔ مگر آج جب نجیب الدولہ نے سریتا کی آبروئی کا ذکر کیا تو حیدر علی کو اندازہ ہوا کہ سرنگا پٹم کے باشندے اس کے خوف سے اپنی زبانیں بند رکھتے ہیں ورنہ ان کے دلوں میں بڑی بڑی ٹیڑھ ہے۔

”وہ کچھ بھی سہی، مگر تو اس کے قابل نہیں ہے اوباش بوڑھے!“ نواب حیدر علی نے نجیب الدولہ کو بری طرح جھڑک دیا۔ نجیب الدولہ کا نپتے جسم کے ساتھ اٹھا اور لرزے قدموں سے چل گیا۔

”میرے سوا اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔“ ٹیپو سلطان نے بے جھجک ہو کر کہا۔ ”نہ وہ تانا وخت چاہتی ہے نہ مال و زر۔ اس نے کبھی مجھ سے میری ذات کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ بس ایک نظر میری صورت دیکھنا چاہتی ہے۔“

”اور تم؟“ حیدر علی نے اسی آہنی لہجے میں بیٹے سے سوال کیا۔

”میں بابا محترم کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔“ ٹیپو سلطان کی سعادت مندی مثالی مثبت رکھتی تھی۔

ولی عہد سلطنت کا جواب سن کر والی میسور کے چہرے پر شفقت و نرمی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ”فرزند اکل ہی سید صاحب سے رخصت کی اجازت لو۔ اب تم مکتب نہیں، محاذ جنگ بجاؤ گے۔“

ٹیپو سلطان کا ایک بہت اداں نظر آنے لگا۔

ہم وقت قلم اور تلوار دونوں کی تعلیم دی ہے۔ یاد رکھو کہ مسلمان اسی متوازن شخصیت کا نام ہے، صاحبِ قلم بھی ہو اور صاحبِ سیف بھی۔ نواب بہادر ٹھیک کہتے ہیں کہ تم تاج و تخت کے وارث بھی ہو اور لاکھوں انسانوں کے حقوق کے نگران بھی۔ تم اگر چاہو تو کتاب و قلم ہمیشہ ہمارے غم گسار رہ سکتے ہیں۔ مکتب میں، مسجد میں، خلوت میں، جلوت میں، غربت میں، امارت میں، زندان میں، قتل میں، علم وہ رفیق ہے جو انسان کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔“

ٹیپو سلطان بظاہر خاموش تھا مگر اس کے چہرے پر طمانیت نہیں تھی جیسے وہ کسی ذاتی کشمکش میں مبتلا ہو۔

”آخر تم تلوار کو کیا سمجھتے ہو فرزند؟“ سید صاحب نے ٹیپو کو خاموش پا کر کہا۔ ”مگر تمہاری نشیمن دل و انصاف کے لئے بے نیام ہو تو وہ لمحہ ان علماء کی ساری زندگی پر بھاری ہے جو کتابوں کی درق گردانی کرتے رہتے ہیں۔ مگر کسی مظلوم کی چیخ سن کر اپنے گھر کے دروازے سے باہر نہیں نکلتے۔ اور اسی طرح اس مجاہد کی ایک رات کی قیمت کا اندازہ کرو جو مملکت کی برحدوں کی حفاظت کے لئے نرم بستر چھوڑ کر شب بیداری کرتا ہے۔ مردِ مجاہد کی وہ رات ایک گوشنیش زاہد کی عمر بھر کی عبادت سے زیادہ گراں ہے۔“

سید صاحب کی اس وضاحت نے ٹیپو کے ذہن کی گرہ کھول دی تھی اور اب وہ پرسکون نظر آنے لگا تھا۔ پھر جب دلی عہدِ سلطنت، دس گاہ سے اٹھ کر جانے لگا تو سید اکرام بخاری نے اپنے شاگرد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”ابھی تمہارا آخری سبق باقی ہے۔“

”آخری سبق؟“ ٹیپو سلطان نے حیران ہو کر عرض کیا۔ ”اسے بھی مکمل کر دیجئے استاد گرامی!“

”وہ آخری سبق سر دربار مکمل ہو گا۔“ سید صاحب نے پرجلال لہجے میں کہا۔ ”نواب بہادر کو میرا پیغام پہنچا دینا کہ کل وہ پاکی کا انتظام کر دیں۔ بوڑھا آدمی ہوں، اس لئے اپنے پیروں سے یہ طویل فاصلہ طے نہیں کر سکتا۔“

ٹیپو اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا واپس چلا گیا اور نیند آنے تک یہی سوچتا رہا کہ وہ آخری سبق کیا ہو گا۔



دربار آراستہ ہو چکا تھا اور والی میسر کو سید صاحب کی آمد کا انتظار تھا۔ امراءِ سلطنت اور دوسرے درباری بھی بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایکایک نقیب نے پکار کر کہا کہ سید صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ ابھی اس صدا کی گونج باقی تھی کہ نواب حیدر علی تخت سے اتر آئے اور سید صاحب کے استقبال کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹیپو سلطان، باپ کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چل رہا تھا۔ تمام امراءِ سلطنت اپنی

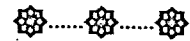
”جان پدر! حکمرانی کے لئے قلم سے زیادہ تلوار کی ضرورت ہوتی ہے۔“ حیدر علی نے اپنے حکم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”نواب بہادر! میں تلوار و قلم دونوں کا استعمال کروں گا۔“ ٹیپو نے بصد احترام اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

”بہر حال! میدانِ کارزار میں اپنے پہلے امتحان کی تیاری کرو۔“

ٹیپو سلطان دل گرفتگی کی حالت میں والی میسر کی خلوت گاہ سے نکلا۔ اسے سید صاحب کی محبتوں سے محروم ہو جانے کا بڑا قلق تھا۔

نواب حیدر علی بہت آسودہ اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت کے ساتھ ٹیپو سریتا کی نظروں سے دور کرنے کا جواز تلاش کر لیا تھا۔



دوسرے دن ٹیپو سلطان، سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دلی عہدِ سلطنت بہت اداں تھا اور اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔

سید صاحب نے اپنے شاگرد کی طرف بغور دیکھا مگر کوئی سوال نہیں کیا۔ جب ٹیپو کچھ تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا تو سید صاحب بے چین ہو گئے۔

”آج تم بہت جھکے جھکے نظر آتے ہو۔“ سید صاحب کا لہجہ کسی قدر جذباتی تھا۔ ”اگر طبیعت خراب ہے تو کل درس میں شامل ہو جانا۔“

سید صاحب کی بات سن کر ٹیپو نے سر اٹھایا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ”استاد گرامی! کتاب اور قلم سے میرا رشتہ ٹوٹنے ہی والا ہے۔ اب شاید ہی کبھی آپ کے درں میں شریک ہو سکوں۔ نواب بہادر کا یہی حکم ہے کہ قلم کے بجائے تلوار کی طرف دیکھوں۔“

ٹیپو نے سارا واقعہ سید صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ ”آپ سے جدائی کا تصور بھی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔“

”تم مجھ سے جدا کب ہو گے فرزند؟“ سید صاحب مسکرانے لگے مگر ان کے تبسم میں بھی اداں کا رنگ شامل تھا۔ ”تم سے یہ رشتہ تو مرنے کو بھی نہیں ٹوٹے گا۔ بے شک! میں جسامی طور بہت ناتواں ہوں لیکن اب اتنا بھی کمزور نہیں کہ تمہارے ساتھ جہاد میں شامل نہ ہو سکوں۔ جب تم باطل تو تون کے خلاف جنگ کر رہے ہو گے تو مجھے بھی اپنے دوش بہ دوش پاؤ گے۔ وہ میدانِ کارزار ہو یا درس گاہ کا کوئی پرسکون گوشہ، تم جہاں سے بھی اور جس زاویے سے بھی مجھے دیکھو گے، میں تمہیں نظر آتا رہوں گا۔ پھر تم کس ساعت فراق کی بات کر رہے ہو؟“

”ابھی میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا۔“ ٹیپو کے لہجے سے بدستور شکستگی کی جھلک نمایاں تھی۔ ”میں تلوار پر قلم کو ترجیح دیتا ہوں استاد گرامی!“

”تم بھول رہے ہو فرزند!“ یکایک سید صاحب کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ ”میں نے تمہیں

دربار پر سناٹا طاری تھا۔ نواب حیدر علی کی نظریں سید صاحب کے روشن چہرے پر مرکوز تھیں اور والی میسور اس سبق کو سننے کے لئے بے چین تھا جس کی خاطر یہ دربار آراستہ کیا گیا تھا۔ ٹیپو سلطان بھی سر سے پاؤں تک شوق اور تجسس کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ سید صاحب، امراء، ملک اور عام درباریوں سے خطاب کر چکے تھے۔ بس ولی عہد سلطنت کا آخری سبق باقی تھا۔

”فرزند! میرے سامنے آؤ۔“ یکا یک سید صاحب کی پُر جلال آواز گونجی۔ ٹیپو سلطان چند قدم آگے بڑھا اور استاد گرامی کے رو برو دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

”اپنے دونوں ہاتھوں کو دراز کر دو۔“ سید صاحب نے ولی عہد سلطنت کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ٹیپو حیرت زدہ تھا مگر اس نے کسی تاخیر کے بغیر اپنے دونوں ہاتھ سید صاحب کے سامنے پھیلا دیئے۔ پھر حاضرین نے سید صاحب کو اپنی نشست پر کھڑے ہوتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اہل دربار کو سکتہ سا ہو گیا۔ سید صاحب نے پوری طاقت سے ٹیپو کے ہاتھوں پر بید مارنا شروع کر دیئے۔ والی میسور کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود خاموش نہ رہ سکا۔

”سید صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

سید صاحب نے والی میسور کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اب ان کے بید کا ہدف ٹیپو سلطان کا نرم و نازک جسم تھا۔ سید صاحب بہت ضعیف تھے مگر ان کے ہاتھ پوری توانائی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ تکلیف کی شدت سے ولی عہد سلطنت کا چہرہ نیلگوں ہو گیا تھا لیکن اس نے استاد گرامی کے اس عمل کے خلاف کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا تھا۔

حیدر علی کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے گھبرا کر سید صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں رہنے دیجئے! آخر ٹیپو نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے کہ آپ سر دربار اس کے جسم پر بیدوں کی بارش کر رہے ہیں؟“ والی میسور کے لہجے سے انتہائی ننگی نمایاں تھی۔

”میرا ہاتھ چھوڑ دو نواب!“ سید صاحب کا لہجہ بھی سخت تھا۔ ”یہ استاد اور شاگرد کا معاملہ ہے تم درمیان میں حائل ہونے والے کون ہو؟ مجھے ٹیپو کو آخری سبق دینے دو۔“

”یہ ہے آپ کا آخری سبق؟“ حیدر علی کے لہجے سے شدید طنز جھلک رہا تھا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ بھی عام استادوں کی طرح شاگرد کے جسم پر تشدد کر کے اپنی استادانہ شان کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”کچھ بھی سمجھی نواب! مگر تم میرا ہاتھ چھوڑ دو۔“ سید صاحب کی آواز بلند تھی مگر ان کے لہجے میں اشتعال نہیں تھا۔

”میں اس وقت تک ہاتھ نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ اپنے اس عجیب و غریب سبق کی وضاحت نہیں کریں گے۔“ نواب حیدر علی کے لہجے کی تندی بدستور قائم تھی۔

نشستوں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ عجیب منظر تھا۔ حیدر علی کے استقبالیہ انتظامات دیکھ کر اہل دربار محسوس کر رہے تھے کہ آنے والا، ٹیپو سلطان کا استاد نہیں، کوئی باجبروت شہنشاہ ہے۔

نواب حیدر علی نے قلعہ کے دروازے پر سید اکرام بخاری کا استقبال کیا۔ سید صاحب، پائی سے اترے اور بید کے سہارے آگے بڑھنے۔ والی میسور اور ولی عہد سلطنت نے بعد احترام سید صاحب کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ سید صاحب نے سلام کا جواب دیا اور آہستہ آہستہ دربار کی طرف جانے لگے۔ نواب حیدر علی تھوڑے فاصلے سے سید صاحب کے بائیں طرف تھا اور ٹیپو سلطان اپنے استاد کے عقب میں کسی خدمت گار کی طرح چل رہا تھا۔

سید صاحب نے دربار حیدر علی میں داخل ہو کر مودب اور صف بستہ حاضرین پر نظر ڈالا۔ پھر رک کر حیدر علی سے مخاطب ہوئے۔

”نواب! مجھے فقیر کے لئے ان دنیاوی تکلفات کی کیا ضرورت تھی؟ یہ رکشیں تو اہل اقتدار ہی کو زیب دیتی ہیں۔“

”سید محترم! میں دوسروں کے دل کا حال تو نہیں جانتا مگر میرے لئے تو آپ ہی مقدار ہیں اور میرے دل و دماغ پر تو آپ ہی کی حکومت ہے۔“ والی میسور کا لہجہ اس کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔

سید صاحب نے ایک نظر حیدر علی کی طرف دیکھا اور پھر والی میسور سے دریافت کیا۔

”نواب! میری نشست کہاں ہے؟“

”تخت پر، میرے نزدیک۔“ حیدر علی کے ہر لفظ سے سید صاحب کے لئے بے پناہ عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

سید صاحب اس کرسی پر تشریف فرما ہوئے جو والی میسور کے دائیں جانب تھی۔ ٹیپو سلطان کی نشست حیدر علی کے بائیں طرف تھی مگر وہ اس پر نہیں بیٹھا اور اپنے استاد کی کرسی کے پیچے کسی خادم کی طرح کھڑا ہو گیا۔

”اللہ، والی میسور کو جزائے خیر دے کہ اس نے ایک اہل علم کی قدر کی۔“ سید صاحب اپنی نشست پر کھڑے ہو کر اہل دربار سے مخاطب ہوئے۔ حیرت انگیز طور پر ان کی آواز بہت بلند تھی اور پورے دربار میں گونج رہی تھی۔

”میں دنیا داروں کی طرح آداب سیاست نہیں جانتا مگر اس حقیقت سے باخبر ہوں کہ اس حکومت اور معاشرے پر کبھی زوال نہیں آئے گا جو عدل و انصاف پر قائم ہو گا اور علم کی عزت و تکریم کرے گا۔ اور وہ اہل علم کبھی رسوا نہیں ہوں گے۔“

”کے ہاتھوں میں فقر و قناعت کی زنجیریں ہوں گی۔ جب حکومت اہل علم کی طرف پیٹھ پٹائی کرے گی۔“

”امراء کے سامنے دست سوال دراز کر دیں تو سمجھ لیتا کہ ذلت و بربادی تم سے چند لمحے کے فاصلے پر موجود ہے۔ اس وقت سے ہمیشہ ڈرتے رہنا کہ اللہ کی گرفت بہت عجیب و غذاب بہت شدید ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر سید صاحب اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھ گئے۔

تجربہ کرنا ہی زندگی کوئی تماشا نہیں کہ چند بازی گرائے، اُچھلے کودے اور چلے گئے۔ ایک ایک دھڑکتے ہوئے اور ایک ایک سانس کا حساب کیا جائے گا۔“

سید صاحب کے آتش بار لہجے نے والی میسور پر سکتے طاری کر دیا تھا۔ امراء سلطنت کو سید صاحب کی گفتگو کے آئینے میں اپنے چہرے نظر آ رہے تھے، اس لئے ان کی نظریں جھک گئی تھیں۔

”فرزند! میری اس حرکت پر تمہارے احساسات کیا ہیں؟“ نواب حیدر علی کو جواب دے کر سید صاحب، ٹیپو سلطان سے مخاطب ہوئے۔

دلی عہد سلطنت خاموش کھڑا رہا مگر اس کے چہرے پر اذیت کا رنگ نمایاں تھا۔

”میں تمہارا جواب چاہتا ہوں۔“ سید صاحب نے بلند آواز میں کہا۔ ”مصلحت آمیز اور منافقانہ جواب نہیں، صاف اور سچا جواب۔“

”مجھے آپ کے اس عمل سے بہت دکھ پہنچا ہے۔“ ٹیپو سلطان رک رک کر بول رہا تھا۔

”اگر میں قصور وار ہوتا تو اس سزا کا مستحق تھا لیکن اس طرح نہیں کہ بھرے دربار میں ذلیل کیا جائے۔“

”مجھے بھی بہت دکھ ہے میرے شہزادے!“ سید صاحب نے بے قرار ہو کر ٹیپو کے کانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”مگر ذرا ان لوگوں کے غم کا اندازہ کر جو بے قصور ہوتے ہوئے بھی قتل کر دیے جاتے ہیں یا اپنی پوری زندگی قید خانے کے اندھیروں میں بسر کرتے ہیں۔ یا ان کے گھر لوگ کو آگ لگا دی جاتی ہے، یا ان کی عزت و آبرو کا خون کر دیا جاتا ہے۔“

سید صاحب کے بپتے ہوئے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آگئی تھی۔ ”میں نے تیرے نرم و نازک جسم پر اپنا آخری سبق تحریر کر دیا ہے۔ جب بھی ایسا کوئی مرحلہ درپیش ہو، تجھے تیری طاقت مفرد بنادے اور تیرا نفس سرکشی اختیار کرنے لگے تو میرے اس سبق کو یاد کر لینا۔ پھر ٹو گمراہ نہیں ہو گا اور فلاح پا جائے گا۔“

نواب حیدر علی، ٹیپو سلطان، امراء سلطنت اور تمام حاضرین دربار دم بخود تھے۔ سید صاحب کا آخری سبق بھی بہت عجیب تھا اور اس کا طریق کار بھی۔

”سید محترم! مجھے بڑی عداوت ہے کہ میں آپ کا بانی الضمیر سمجھنے سے قاصر رہا۔“ نواب حیدر علی اپنے سخت رڈیے پر پشیمان نظر آ رہا تھا۔

سید صاحب نے والی میسور کی اس معذرت کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ ”واللہ! میرے طرز عمل پر میرا نفس غالب نہیں تھا۔ میں نے جس طرح بہتر سمجھا، اپنا فرض ادا کر دیا۔ اگر میرے اس طریق کار سے کسی کو اذیت پہنچی ہو تو پھر میرا جرم ثابت ہو جاتا ہے۔“ سید صاحب کا اعتراف بھی بڑا عجیب تھا۔ ”اگر میرے اس عمل سے نواب بہادر کی اعلیٰ نسب پر حرف آیا ہو یا شہزادے کی شان اقتدار متاثر ہوئی ہو تو میں والی میسور سے درخواست کرتا ہوں کہ اہل دربار

سید صاحب نے بڑی اداس نظروں سے والی میسور کی طرف دیکھا اور انتہائی غصے میں کہنے لگے۔ ”نواب! تم بہت طاقتور ہو اور میں بہت کمزور۔ خواہ کتنی بھی کوشش کر لوں مگر تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکتا۔ اور ایک میرا ہی کیا، دنیا کے تمام ناتوانوں کا کیا حال ہے کہ وہ زور آدروں کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔“

سید صاحب کے لہجے میں عجیب خلش تھی۔ والی میسور نے گھبرا کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”مگر نواب! تم اس وقت کیا کر دو گے جب سب سے طاقتور ہاتھ تمہارا گریبان پکڑے گا؟“ سید صاحب نے والی میسور سے سوال کیا۔ ”کیا تم سر محشر، دست قدرت کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا سکو گے؟“

نواب حیدر علی حیران و پریشان نظر آنے لگا۔ آج اس کے نزدیک سید صاحب کی ہر بات انتہائی پیچیدہ اور پراسرار تھی۔

”جواب دو، نواب حیدر علی خان بہادر!“ والی میسور کو خاموش پا کر سید صاحب نے پوری شدت سے اپنا سوال دہرایا۔

”مگر اس سوال کا آپ کے موجودہ طرز عمل سے کیا تعلق ہے؟“ نواب حیدر علی بہت الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”بہت گہرا تعلق ہے۔“ یکا یک سید صاحب کی جلالی کیفیت نمایاں ہو گئی تھی۔ ”جب بچے کے جسم پر چوٹ لگی تو باپ کا دل کیوں بے قرار ہو گیا؟“

”اس لئے کہ میرا بیٹا بے قصور تھا۔“ والی میسور نے ہر جوش لہجے میں دلیل پیش کی۔

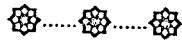
”مگر وہ کمزور باپ کیا کرے کہ جس کا بے قصور بیٹا مسلسل زخم کھاتا رہے مگر تمہارے طاقتور ہاتھ کو نہ پکڑ سکے؟“ سید صاحب نے حیدر علی کی دلیل کے جواب میں کہا۔

والی میسور سنائے میں آ گیا۔ اس کے پاس سید صاحب کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”نہ جانے کتنے بے قصور پس و پیوار زنداں ڈال دیئے گئے ہوں گے۔ اور نہ جانے کتنے بے گناہوں کو قتل میں لے جا کر ذبح کر دیا ہو گا۔“ یہ کہتے کہتے سید صاحب کی آنکھوں سے نمی اور لہجے سے رقت جھلکنے لگی تھی۔ ”ان کے عزیز و اقارب کے دل بھی خون روئے ہوں گے۔ مگر کس سے فریاد کرتے کہ نا طاقی کے احساس نے ان سے قوت گویائی چھین لی تھی۔ وہ تشدد کرنے والے طاقتور ہاتھ کو کس طرح پکڑتے کہ ان کے بازو بہت کمزور تھے۔ بس وہ عالم بے کسی میں آسمان ہی کی طرف دیکھتے رہے اور انصاف کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں بجھ گئیں اور سانسوں کا شمار تمام ہو گیا۔ طاقتور اپنے مظالم پر خوش تھے کہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور کمزور کفن اوڑھے زیر خاک سو رہے تھے کہ ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر شیطان نے انسان کو بڑے فریب میں مبتلا کر دیا کہ مٹی کا کھیل تھا، مٹی میں ملنے ہی ختم ہو



کے سامنے میری حقیر کی جائے..... اور نواب بہادر کا یہ عمل، انصاف کے عین مطابق ہوگا۔  
 ”معاذ اللہ!..... معاذ اللہ!“ حیدر علی مضطرب ہو کر درمیان ہی میں بول اٹھا۔ ”یہ آپ کا  
 فرمان ہے ہیں سید صاحب؟ آپ مکمل طور پر با اختیار ہیں کہ جس طرح چاہیں، اپنے شاگرد کو  
 سبق دیں۔ یہ میری کم نظری ہی تھی کہ میں آپ کے انداز تدریس کو سمجھ نہیں سکا۔“



سید صاحب نے حیدر علی کی بات پر کوئی ردیہاں نہیں دیا۔ اس وقت وہ براہ راست ٹیپو  
 مخاطب تھے۔ ”فرزند! تم بھی مجھ سے حساب طلبی کا پورا حق رکھتے ہو۔ اگر چاہو تو میرے جسم پر  
 ایسے ہی نشانات بنا دو۔ پھر میرا اور تمہارا حساب بے باق ہو جائے گا تا کہ تم بروز حشر یہ دیکھ  
 کر سو کہ اکرام بخاری تمہارا قرض دار ہے۔“

ٹیپو سلطان بے قابو ہو کر گھٹنوں کے بل جھکا اور سید صاحب کے قدموں سے لپٹ گیا۔  
 ”استا گرامی! میری بے خبری کو معاف فرمادیں۔ میں اپنے اللہ کو حاضر و ناظر جان کر عہد  
 کرتا ہوں کہ آخری سانس تک آپ کے اس سبق کو فراموش نہیں کروں گا۔“

سید صاحب نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اپنے شاگرد کو سینے سے لگا لیا۔ ”اے خدا! تیرا  
 شکر ہے کہ تو نے میری ریاضت کو رائیگاں جانے نہیں دیا۔“

یہ کہہ کر سید صاحب رخصت ہو گئے اور حاضرین دربار بہت دیر تک پتھر کے مجسموں کی  
 طرح ساکت بیٹھے رہے۔



سید صاحب کے آخری سبق کے بعد ٹیپو کا راستہ بدل گیا تھا۔ فوجی چھاؤنی سے راج محل کو  
 جانے والا راستہ اس راستے سے مختلف تھا جہاں صبح و شام کھڑے ہو کر سرتیاد یوں اپنے کونڈا  
 انتظار کرتی تھی۔ ٹیپو کو اس بات کا شدت سے احساس تھا اس لئے وہ بڑی مشکل سے وقت نکل  
 کر تہیم خانے پہنچا اور افسردہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”سرتیا! نواب بہادر کسی وقت بھی مجھے جنگی مہم  
 روانہ کر سکتے ہیں۔“

”پھر؟“ سرتیانے ٹیپو کی بات کاٹ دی اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب تم میرا انتظار نہ کرنا۔“ ٹیپو کے لہجے میں جھجک تھی۔ ”میں بہت مجبور ہوں۔“

”خدا تمہیں مجبور نہ کرے۔“ سرتیا کا ایک بہت سنجیدہ نظر آنے لگی۔ ”میں اس سے دعا

کروں گی کہ وہ تمہارے حصے کی مجبوریاں بھی میرے مقدّر میں لکھ دے۔ کنورا! تم مطمئن ہو کر

مخافہ جنگ کی طرف جاؤ اور اس طرح سرخرو ہو کر لوگوں کے بے شمار فتوحات کے تمنّے تمہارے سینے پر

جگمگا رہے ہوں۔ میرے انتظار کے بارے میں سوچ کر پریشان نہ ہونا کہ میں تو تمہارے

راستے کی دھول ہوں۔ جدھر سے بھی گزر دو گے، مجھے اپنے قدموں میں بچھا ہوا پاؤ گے۔“

ٹیپو، سرتیا کو بہت دیر تک سمجھاتا رہا مگر وہ ایک ہی بات کہتی رہی۔ ”میرے لئے زمانہ

فراق اور عہدِ وصال دونوں برابر ہیں۔ تم میری خاطر یہاں تک آئے، اس کے لئے شکر ہے کہ

اگرچہ طیبہ خاص نے تصدیق کر دی تھی کہ نوؤدکار اور اس کی ماں کی موت زہر خورانی  
 سے واقع ہوئی ہے لیکن حیدر علی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ والی میسور کے خیال میں  
 ان دونوں ماں بیٹے کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا اور اس خیال کا جواز موجود تھا کہ نوؤدکار اور اس  
 کی ماں نے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا اور راجہ کرشنا کو اپنی حقیقی بہن اور  
 بھانجے کا یہ عمل پسند نہیں آیا تھا۔ نتیجتاً وہ کچھ دن تک خاموش رہا اور پھر موقع ملنے ہی اس نے  
 دیوتاؤں کے باغیوں کا خون کر ڈالا تھا۔

سپر سالار محمد علی کمیدان اور نائب سپر سالار شجاعت خان کا بھی یہی خیال تھا۔

”نواب بہادر! اس بار آپ اس حرام کار کو معاف نہیں کریں گے۔“ محمد علی کمیدان بہت

زیادہ جذباتی نظر آ رہا تھا۔ ”اس فتنہ گرنے بیک وقت دو مسلمانوں کا خون کیا ہے اور ایک قاتل

کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا سر بھی قلم کر دیا جائے۔“

”میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں۔“ نواب حیدر علی بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ”مگر

میرے پاس کوئی گواہی موجود نہیں۔“

”پھر بھی آپ اسے عدالت عالیہ میں ضرور طلب کریں۔“ شدید غصے کے باعث محمد علی

کمیدان کے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ”اگر آپ نے اس سلسلے میں سکوت اختیار کیا تو

وہ بزدل و کمینہ اور شیر ہو جائے گا۔“

نواب حیدر علی نے سرکاری سطح پر دونوں نومسلموں کی تجہیز و تدفین کے انتظامات کئے۔

درباری عالموں کا فتویٰ تھا کہ مرنے والوں نے خودکشی کی ہے، اس لئے شرعی اعتبار سے ان کی نماز جنازہ پڑھانے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ آخر والی میسور نے سید اکرام بخاری سے رجوع کیا۔ سید صاحب نے درباری عالموں سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔  
”وہ دونوں اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے تھے پھر انہیں خودکشی کی کیا ضرورت تھی؟ یقیناً اہل ہنر کی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔ اگر آپ میں سے کوئی شخص ان کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے آمادہ نہیں تو پھر سارا عذاب و ثواب میری گردن پر۔ میں اپنے عزیزوں کو اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتا۔“

آخر سید اکرام بخاری نے ان دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی۔ سرنگاچم کے تمام مسلمان دربار اور اس کی میت میں شریک ہوئے تھے۔ خود والی میسور اور امرائے سلطنت بھی تدفین کے وقت موجود تھے۔

دفن کے بعد ہزاروں مسلمان چیخ چیخ کر حیدر علی سے مطالبہ کر رہے تھے۔

”نواب بہادر! یہ کھلا قتل ہے۔ مہاراجہ کرشنا اور سرنگاچم کے ہندو چنڈت موہن داس کے قتل پر ہنگامہ آرائی کر سکتے ہیں تو پھر ہمیں بھی اجازت دیجئے کہ ہم آپ کے انصاف کو اس وقت تک پکارتے رہیں جب تک ونود کمار اور اس کی ماں کے قاتل ہمارے حوالے نہیں کر دیئے جاتے۔“  
نواب حیدر علی نے مسلمانوں کے ہجوم کو یقین دلایا کہ عدالت بھی آراستہ ہوگی اور مجرموں کو سزا بھی دی جائے گی چاہے مجرم کتنے ہی معزز اور با اثر کیوں نہ ہوں۔

اور پھر جب حیدر علی مستر انصاف پر بیٹھا تو راجہ کرشنا نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ والی میسور نے انتہائی غضب ناک لہجے میں اپنے سپہ سالار محمد علی کیدان کو حکم دیا کہ وہ جبراً راجہ کرشنا کو عدالت میں حاضر کر دے۔

محمد علی کیدان غصے میں بھرا ہوا راج محل پہنچا اور راجہ کرشنا سے چلنے کے لئے کہا۔ راجہ کرشنا نے انتہائی ناگواری کے عالم میں کہا کہ وہ کسی کے حکم کا پابند نہیں ہے۔ اس تحقیق آمیز طرز گفتگو پر محمد علی کی آتش غضب بھڑک اٹھی۔ میسور کے سپہ سالار نے آگے بڑھ کر راجہ کرشنا کا گریبان پکڑ لیا اور چیخ کر کہا۔

”عزت سے نہیں چلے گا تو عام مجرموں کی طرح کھینچتا ہوا عدالت تک لے جاؤں گا۔“  
”اسے روکو!“ راجہ کرشنا نے اپنے محافظ سپاہیوں سے کہا۔ ”اس گستاخ کا ہاتھ کاٹ دو کہ اس نے تمہارے مہاراج کی سخت توہین کی ہے۔“

سپاہی اپنے آقا کو بچانے کے لئے آگے بڑھے تو محمد علی کیدان نے اپنی تلوار کھینچی۔  
”یقیناً میں اس وقت تمہا ہوں لیکن یاد رکھو کہ اگر میرے جسم پر خراش بھی آئی تو پورا راج محل خون میں ڈوب جائے گا۔“

محافظ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور محمد علی کیدان، راجہ کرشنا کو اس طرح کھینچتا ہوا

عدالت عالیہ تک لے گیا کہ اُس کی دستار سر سے گر گئی تھی۔

”نواب! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تیرے عہد حکومت میں شرفاء کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے۔“ راجہ کرشنا چیختا ہوا دربار میں داخل ہوا۔

”شریف اپنے اعمال سے شریف ہوتا ہے۔“ والی میسور نے غضب ناک لہجے میں کہا۔  
”ایک نافرمان کے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہیں کیا جاسکتا۔“

پھر جب نواب حیدر علی نے راجہ کرشنا سے ونود کمار اور اس کی ماں کی پراسرار حالت کے بارے میں دریافت کیا تو اس حیلہ ساز انسان نے عجیب تاویل پیش کرتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ دونوں اپنی اس جذباتی حرکت پر ہمیشہ ندامت کا شکار رہتے تھے۔ جب لوگوں نے زیادہ احتلامت کی تو انہوں نے زہر کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔ آخر اس میں کسی دوسرے کا کیا قصور ہے؟ میرے بجائے مرنے والوں سے پوچھا جائے کہ وہ خودکشی کی منزل تک کیوں پہنچے؟“

نواب حیدر علی نے بہت دیر تک جرح کی مگر راجہ کرشنا ایک ہی بات پر اصرار کرتا رہا۔ ”وہ دونوں دہانوں کے باغی تھے اور جرم کے اسی احساس نے انہیں خودکشی پر مجبور کر دیا۔“

والی میسور اور دوسرے امرائے سلطنت جانتے تھے کہ راجہ کرشنا بڑی بے شرعی کے ساتھ جھوٹ بول رہا ہے مگر اس کے خلاف کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ گواہوں کے بغیر فیصلہ کیسے ہوتا؟ حیدر علی کرسی انصاف پر بیٹھا چیخ دتا کہ پھر بڑے نفرت آمیز لہجے میں راجہ کرشنا سے مخاطب ہوا۔

”ٹوک ٹوک اپنی کمین گاہوں میں بیٹھا معصوم انسانوں کی جانوں سے کھیلتا رہے گا؟ آج تیرے خلاف کوئی گواہی دینے والا نہیں کہ وہ سب کے سب تیرے عزیز ہیں یا خدمت گار۔ مگر یاد رکھ کہ تیرا حشر قریب ہے۔ یہ خون ناحق ہزاروں پردوں میں بھی نہیں چھپے گا۔“

جیسے ہی والی میسور کی بات ختم ہوئی، محمد علی کیدان بول اٹھا۔ ”نواب بہادر! اس کے تمام ملازمین کو جج کر کے پرش کی جائے۔ بس چند تازیانوں کی ضرورت ہوگی پھر ایک ایک نمک خوار پکاراٹھے گا کہ پس پردہ مجرم کون ہے۔“

”نہیں محمد علی!“ والی میسور کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ ”اس نے تو سر سے پاؤں تک بے نیائی اڑھ لی ہے مگر میں اپنی سطح سے نہیں گر سکتا۔“

”تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔“ شدت غضب سے محمد علی کیدان کا چہرہ جل رہا تھا۔ ”آپ کا بیٹا ایک جانتا ہے کہ کس سے کس لہجے میں بات کی جاتی ہے۔“

صرف حیدر علی کے استعمال کے لئے تھا۔ اسی دروازے سے گزر کر والی میسور اپنی حرم سرا تک پہنچتا تھا۔ اہل دربار، سریتا کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ سر سے پاؤں تک زرد لباس پہنتے ہوئے

کی لاش کو دارالحکومت کے باشندوں کی عبرت کے لئے شہر کے چوراہے پر لٹکا دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد پورے سرنگاپٹم میں سریتا دیوی کی ذات موضوع بحث بن کر رہ گئی تھی۔ ہر شخص حیران تھا کہ ایک عام سی لڑکی کو اس مجرم کا نام کیسے معلوم ہو گیا جو ہزاروں پردوں میں پوشیدہ تھا اور جسے ریاست کے ماہر جاسوس بھی تلاش کرنے سے قاصر تھے۔ سریتا دیوی نجوی ہے، کاہنہ ہے یا کوئی روح اس کی تابع ہے یا وہ روحانیت کی کسی خاص منزل تک پہنچ گئی ہے؟ ہزاروں سوالات تھے جو لوگوں کے ذہنوں میں گردش کر رہے تھے۔ خود نواب حیدر علی نے بھی سربتاہے کی بار بار پوچھا تھا کہ اسے مجرم جنما پرشاد کا نام کس طرح معلوم ہوا؟ مگر وہ یہ کہہ کر دربار سے چلی گئی تھی۔

”بہت سیدھی سی بات ہے نواب بہادر! نہ کوئی مجرم باقی رہے گا اور نہ کوئی پارسا۔ بس سدا رہے نام اللہ کا۔“

والی میسور، سربتاہے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ آخر حیدر علی نے سید صاحب کے سامنے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لڑکی میرے لئے ایک معصہ بن کر رہ گئی ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس معصے کو حل کرنے کے لئے اتنے بے چین کیوں ہو؟“

سید صاحب نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ اس لڑکی کو اس کے مال پر چھوڑ دو۔ وہ تمہاری عظمت شاہانہ کے لئے بھی مسئلہ نہیں بنے گی۔“

والی میسور چپ چاپ سید کی بارگاہ سے اٹھ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سید صاحب، سربتاہے کے حوالے سے کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔

حیدر علی کی طرح سرنگاپٹم کے دوسرے لوگوں کے لئے بھی سربتاہے ایک معصہ بن کر رہ گئی تھی۔ کل تک وہ اس شہر کے ہندوؤں کے لئے ایک لعنت زدہ لڑکی تھی مگر آج وہی پتھر کے پجاری اس کے نام سے بھی خوف زدہ رہتے تھے اور چھوٹی ذات کے ہندو تو اس کے پاس مرادیں لے کر جانے لگے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک دیوی کا درجہ رکھتی تھی۔ خود سربتاہے کا یہ حال تھا کہ وہ ان تمام ہنگامہ آرائیوں سے بے نیاز روزانہ صبح و شام یتیم خانے کے دروازے پر آکر کھڑی ہو جاتی اور اپنے معمول کے مطابق ٹیپو کا انتظار کرتی رہتی۔ اور ٹیپو اس رہ گزر سے بہت دُور جنگی شوق میں مصروف تھا۔



علی کے امیرالمحرم ہوتے ہی ریاست کنانور کے ہندو بہم گئے اور ایک طویل عرصے کے بعد علاقے کے مسلمانوں کو بت پرستوں کے مظالم سے نجات ملی۔ کچھ دن بعد یہاں کے امیر نے اپنے داماد کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ علی ریاست کا باقاعدہ حکمران ہوتے ہی ایک مذہب سے بڑی بیڑہ تیار کر کے ساحل ملابار کے ان جزائر پر حملہ آور ہوا جو اب تک اسلامی فاطمیان کے حملوں سے محفوظ تھے۔ ان ہی جزائر کے قزاق پیشہ لوگ، ملابار کے ساحل پر آکر

تھی اور اس کے گلے میں پتھروں کی کئی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ دیکھنے والوں کو وہ ایک خوفناک خوب صورت جوگن نظر آتی تھی۔

”بیٹی! تم یہاں؟“ حیدر علی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا تمہیں پھر کسی نے کوئی آزار پہنچایا ہے؟“

”جتنے دکھ مقدر میں تھے، وہ لکھے جا چکے۔ اب کوئی نیا غم نہیں ہے نواب بہادر!“ سربتاہے بڑے عجیب لہجے میں بول رہی تھی۔ دو بے گناہ انسانوں کے قتل پر کوئی گواہی دینے والا نہیں تھا۔ اس لئے مجبوراً مجھے آنا پڑا۔ آپ راجہ کرشنا کے باورچی جنما پرشاد کو بلا کر اس سے باز پرس کیجئے۔ وہ بتا دے گا کہ نو دھکار اور اس کی ماں نے خودکشی کی ہے یا انہیں زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔“

”مگر تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟“ والی میسور کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

”بس بتانے والے نے بتا دیا۔ اس کا نظام بڑا عجیب ہے۔“ اہل دربار کو ایسا محسوس ہوا جیسے سربتاہے کی سی کیفیت طاری ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی باورچی جنما پرشاد کو عدالت میں حاضر کر دیا گیا۔ اس کے قدم لڑکھائے رہے تھے اور چہرے پر موت کی سی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ جنما پرشاد ایک لمحے کے لئے بھی حیدر علی کے جاہ و جلال کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے تخت کے قریب پہنچ کر زمین پر سر رکھ دیا اور پھر رو کر اعتراف کر لیا۔

”میں نے مہاراج کے حکم پر ان کی بیوہ بہن اور بھانجے کو کھانے میں زہر دیا تھا۔“

”یہ سب میرے خلاف سازش ہے۔“ راجہ کرشنا سر دربار دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔ اس عیار انسان نے جرم ثابت ہو جانے کے بعد خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے ایک نئی پالی چلی تھی۔ ”دولت کی لالچ دے کر میرے ہی خدمت گار کو میرے خلاف کھڑا کر دیا گیا۔ نواب اگر تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو قتل کر دے۔ تمنا کیوں بنا رہا ہے؟“

راجہ کرشنا کی فریب کاریوں نے حیدر علی کے دل و دماغ میں آگ لگا دی تھی جو علی کیلئے اس فتنہ گر کی موت کا مطالبہ کر رہا تھا مگر والی میسور نے نہایت صبر و تحمل سے کام لیا۔ راجہ کرشنا کیلئے سخت ترین سزا کا جواز موجود تھا لیکن حیدر علی ایسے ہر اقدام سے گریز کر رہا تھا۔ وہ اپنے مصلحتوں کے پیش نظر پیشوائے پونا، مادھوراؤ اور دوسرے ہندو راجاؤں کو اپنے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کا موقع فراہم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسے ریاست میسور کی بند رعایا کے جذبات کا بھی خیال تھا۔ غرض یہی وہ نزاکتیں تھیں کہ جن کے زیر اثر حیدر علی خون سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ والی میسور نے راجہ کرشنا کی نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔ اب وہ عیار و حیلہ گر انسان حیدر علی کی اجازت کے بغیر محل سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔

باورچی جنما پرشاد کو نو دھکار اور اس کی ماں کے قتل کے جرم میں پھانسی دے دی گئی اور

اس کی ہم میں تیرہ سالہ ٹیپو اپنے باپ کے ہمراہ تھا۔



ٹیپو کے شریک جنگ ہونے کی خبر سنتے ہی فاطمہ بیگم بے قرار ہو گئیں۔ بیٹے کے رخصت ہونے سے ایک دن پہلے فاطمہ بیگم نے خلوت میں شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔  
”کیا آپ کے فکر میں سپاہیوں کی کمی آگئی ہے؟“ فاطمہ بیگم کا لہجہ اداں بھی تھا اور تلخ بھی۔

نواب حیدر علی نے بڑی حیرت سے اپنی جاں نثار شریک حیات کی طرف دیکھا۔ ”بیگم! تم آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

”آخر ایسی کیا افتاد پڑی ہے کہ آپ ٹیپو کو اپنے ہمراہ لئے جا رہے ہیں؟“ اس وقت فاطمہ بیگم جذباتی ماں کے لہجے میں بات کر رہی تھیں جس کے لئے بیٹے کی جدائی کا تصور ناقابل برداشت تھا۔ ”آپ نے اتنا اہم فیصلہ کرتے وقت ٹیپو کے سن و سال کا اندازہ نہیں کیا۔ اس کی عمر کے بچے ابھی سرنگا پٹم کے گلی کوچوں میں کھیل رہے ہیں۔“

بیوی کی بات سن کر والی میسور کے چہرے پر عجیب سا رنگ اُبھر آیا۔ پھر وہ بہت آہستہ مگر بڑھال لہجے میں کہنے لگا۔

”نالیہ تم نے محمد بن قاسم کا نام نہیں سنا۔ وہ بھی اس وقت مردان کارزار کی سالاری کر رہا تھا جب اس کی عمر کے بچے عراق کی گلیوں میں کھیل رہے تھے۔ قبیلہ بنو ثقیف کا وہ تاریخ ساز پندرہ سال کی عمر میں گھر سے نکلا اور انیس سال کی عمر میں عظیم الشان فتوحات حاصل کر کے ایسے رخصت ہو گیا۔ پھر آپ کا بیٹا تو تنہا بھی نہیں ہے۔ اس کا باپ قدم بہ قدم اس کے ماتھے پر ہے۔ اگر آپ ٹیپو کے سلسلے میں کسی ناخوشگوار حادثے سے ڈرتی ہیں تو احتیاد رکھیے کہ قبر کی رات قبر میں کوئی ہے۔ نہ زندگی کی ایک ساعت کم کی جاسکتی ہے اور نہ موت کے کسی لمحے کو ہٹا جاسکتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمیں اپنے اللہ سے ہمیشہ خیر و فلاح کی توقع رکھنی چاہئے۔ اور خدا کا واسطہ دیا کہ کوئی لمحہ آیا تو آپ سن لیں گی کہ ٹیپو کی طرف رخ کرنے والی تمام شمشیریں، تیر اور نیزے آپ کے شوہر کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ اور آپ کے بیٹے کے بدن پر ہلکی سی فوٹال مک نہیں آئی۔“

حیدر علی کو اس کے ساتھی پتھر یا فولاد کا انسان کہا کرتے تھے۔ وہ آفات و مصائب کے جھوم کا ڈھواں رہتا تھا یا اس طرح خاموش رہا کرتا تھا کہ اس کے چہرے سے دلی کیفیات کا اندازہ نہیں لیا جاسکتا تھا۔ مختصر حیدر علی کے بارے میں عام رائے یہی تھی کہ وہ ایک انتہائی غیر متوقع شخص ہے جو گرد و پیش کے موسموں کا کوئی تاثر قبول نہیں کرتا۔ خود فاطمہ بیگم کو بھی اکثر یہی تاثر تھا کہ اس کی آنکھوں میں دھواں سا بھرا تھا جیسے بارش سے پہلے آسمان پر گہرے بادل چھا

مالاؤں کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بناتے تھے۔ علی نے ان جزیروں پر حملہ کر کے یہاں کے رہائشی گرفتار کر لیا اور اس کی دونوں آنکھیں نکلوادیں۔ راجہ کی گرفتاری کے بعد پورے علاقے پر غلبہ ہو گیا اور اس اولوالعزم نوجوان نے تمام جزیروں پر نواب حیدر علی کا پرچم لہرا دیا۔ انتظامی امور کی تکمیل کے بعد امیر البحر علی، راجہ کنائور کو لے کر منگھور پہنچا تو والی میسور نے اس کا پُر جوش استقبال کیا۔

”مجھے تم پر فخر ہے نوجوان!“ حیدر علی نے ریاست کنائور کے حکمران کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

مگر جب والی میسور جزائر ملابار کے معزول راجہ سے ملا اور اس کا حال زار سنا تو حیدر علی کے چہرے پر شدید ناگواری کے آثار اُبھر آئے۔

”کیا راجہ کی گرفتاری کافی نہیں تھی؟“ نواب نے انتہائی تلخ لہجے میں اپنے امیر البحر کو مخاطب کیا۔ ”مجھے تمہاری اس وحشانہ حرکت نے شدید اذیت پہنچائی ہے۔“

علی نے اپنے اس طرز عمل کی کئی توجیہات پیش کیں مگر والی میسور نے اس کا کوئی عذر تسلیم نہیں کیا۔ ”تم اس منصب کے لائق نہیں ہو۔“

علی کو امیر البحر کے عہدے سے معزول کرنے کے بعد نواب نے ملابار کے راجہ سے ملانگی اور اس بد نصیب حکمران کے لئے ایک معقول جاگیر وقف کر دی تاکہ وہ اپنی ناکارآمد زندگی سکون سے بسر کر سکے۔



علی کے اقتدار میں آتے ہی مالاؤں نے چین کا سانس لیا تھا۔ مگر جیسے ہی اس کے معزول ہونے کی خبر ملابار پہنچی تو ”نازروں“ نے سمجھا کہ نواب حیدر علی، مالاؤں کی حمایت و ستبردار ہو چکا ہے۔ ان شری پسندوں کو تو بہانہ چاہئے تھا۔ تمام فتنہ گرد ہندو اپنے گھروں سے آئے اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا۔

ایسے سنگین لمحات میں مالاؤں کا ایک وفد منگھور روانہ ہوا۔ نواب حیدر علی اس وقت دمشق میں مقیم تھا۔ جب وفد کے نمائندوں نے مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کی روداد سنائی تو والی میسور رونے لگا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے ایک سیاسی فیصلے کے اس قدر خوف ناک نتائج برآمد گئے۔ اللہ مجھے معاف کرے اور آپ لوگ بھی میری اس کوتاہی سے درگزر کریں۔ آپ کا نام ذاتی غم ہے۔ نازروں نے آپ پر نہیں، حیدر علی پر تلوار کھینچی ہے۔“  
مالاؤں کے وفد کو مطمئن کر کے حیدر علی منگھور سے سرنگا پٹم پہنچا۔ دارالحکومت انتظامات کیدان اور شجاعت خان کے سپرد کئے اور بیس ہزار سوار لے کر ملابار کی طرف



دروں کی طرح میدان میں اترے گا اور مردوں کی طرح دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہوا مر جائے گا۔  
 کاظم علیہ السلام! میں اس دنیا میں رہوں یا نہ رہوں مگر میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھئے گا کہ میں نے اپنے  
 لئے کوئی شایعہ گل پر چبکنے والا بلبل نہیں بنایا ہے کہ میسور کے زانغ و زغن (چیل کوئے) اس کا  
 ٹوٹ ٹوٹ کوچ کوچ کر رکھا جائیں۔ میں نے ٹیپو کو شہزاد بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور اب میں اسے  
 آسمانی نفاذ کا مشاہدہ کرانے کے لئے اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ آج کے بعد سے وہ  
 میرے درویش درویش خوں آسمان آندھیوں میں اڑے گا۔ دعا کیجئے کہ اللہ اسے نئی طاقت پر دواز  
 دے۔“

پھر ناظمہ بیگم نے اپنے بیٹے کو گلے لگا کر اس طرح رخصت کیا کہ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کے بجائے غیر معمولی چمک تھی اور ہونٹوں پر ایک آسودہ قسم نمایاں تھا۔

ٹیپو سلطان محاذِ جنگ کی طرف جانے سے پہلے یتیم خانے پہنچا اور سرتا دیوی سے ملا۔  
 ”ہو سکتا ہے کہ یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہو۔ میں نہیں جانتا کہ دوبارہ سرنگا یتیم آؤں  
 گا یا زندگی کا سفر راستے ہی میں ختم ہو جائے گا۔ اس لئے میری چند باتیں بہت غور سے سن لو۔“  
 سرتا دیوی، ٹیپو سلطان کی روانگی کا سن کر اداس ہو گئی تھی مگر دلی عہدِ سلطنت کے طرزِ کلام  
 سے اسے چونک جانے پر مجبور کر دیا۔

”تم نے راجہ کرشنا کی سازش کو بے نقاب کر کے اچھا نہیں کیا۔“ ٹیپو سلطان بہت زیادہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ”وہ عیار اور منتقم المزاج انسان ہے۔ جب اس نے اپنی حقیقی بہن اور مائیکے کو معاف نہیں کیا تو پھر وہ تمہیں بھی شدید نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ ان حالات

”آپ مطمئن رہیں فاطمہ بیگم!..... حیدر علی کا آپ سے وعدہ ہے کہ اس کی زندگی میں بچہ پر کوئی آج نہیں آئے گی۔ اللہ اپنے کمزور بندے کی مدد کرے اور اس کے وعدوں کا بلغم رکھے۔“

آج پہلی بار فاطمہ بیگم کو اندازہ ہوا تھا کہ ان کے شوہر کے سینے میں کیسا محبت بھرا راز ہے۔ نازک دل ہے جس کے گرد سیاسی مصلحتوں اور وقت کی ضرورتوں نے ایک آہنی حصار کھینچا ہے۔ فاطمہ بیگم نے بے قرار ہو کر حیدر علی کے کشادہ سینے پر سر رکھ دیا اور رونے لگیں۔

”نواب بہادر! مجھے اس اعزاز پر فخر ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں اور شیو آپ کا بیٹا ہے پہلی بار شیو سے جدا ہو رہی ہوں، اس لئے دل پر قابو نہیں رہا اور آپ سے شکایت کر بیٹھی۔“

”مجھے بھی آپ کی رفاقت پر ناز ہے فاطمہ بیگم!“ حیدر علی نے اپنی جاں نثار بیوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بھی بچوں کی خاطر اپنے آنسوؤں کو پی لیا ہے۔ آپ بھی اسے اشکوں کوٹیو سلطان اور شہزادہ کریم شاہ سے چھپا لیجئے۔“

جب فاطمہ بیگم ہر سکون ہو گئیں تو حیدر علی نے انہیں بہت نرم لہجے میں سمجھایا۔  
 ”ٹیپو ایک شاعر کا بیٹا ہوتا تو اسے درشے میں شاعری ملتی۔ اگر میں کوئی کارنگم ہوتا تو ٹیپو  
 اپنا ہنر دکھا دیتا۔ قسمت سے یہی ہوں، اس لئے شمشیر و سناں کے سوا بیٹھے کو کیا دے سکتا ہوں۔“

اس وقت میرا دل بھی بے قابو ہو جاتا تھا، جب ٹیپو آٹھ نو سال کی عمر میں، شدید سردی کے موسم میں، گرم بستر سے نکل کر صبح سویرے جنگی تربیت کے لئے فوجی چھاونی جایا کرتا تھا۔ اے مولیٰ! میرے اندر کا انسان جو بے پناہ محبت کرنے والا باپ ہے، مجھ سے کہا کرتا تھا کہ جیڑی!۔

ایک معصوم جان پر بڑا ظلم ہے..... مگر میں نے اس باپ کی آواز بھی نہیں سنی۔ میں اپنے  
 ناسازگار موسموں سے لڑنے والا ایک جھٹش سپاہی بنانا چاہتا تھا۔ سو میں نے جذبات کو زور  
 کر کے اپنا فرض ادا کیا۔ میں نے ٹیپو کے ہاتھ میں قلم بھی دیا اور تلوار بھی۔ اس نے اب تک

درس گاہ کی پرسکون فضا دیکھی ہے، مقل میں انسانی خون بہتے نہیں دیکھا۔ وہ اس کو اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔ چکا مگر ابھی تکوار کا امتحان باقی ہے۔ میں اسی لئے اس کو اپنے ہمراہ لے جاتا ہوں کہ وہ میری نگرانی میں اپنے سب سے بڑے امتحان کی تیاری کرے۔ میں نے پوچھا کہ اب

”نواب بہادر! میری اس جذباتی غلطی کو معاف فرما دیں۔“ فاطمہ بیگم ایک بار گرجا کر کہنے لگی، ”جو بہتر سمجھا، وہی کیا۔ اب میں نہیں جانتا کہ میری دی ہوئی تعلیم و تربیت سے آپ مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہو گئی ہے۔“

لگیں۔ ”آپ بہت فرض شناس باپ ہیں۔ غلطی تو ہم کم نظر لوگوں سے ہوئی۔“

مدی کے قریب نازروں کی فوج جمع تھی۔ بے یار و مددگار مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے ڈھاتے ہڑاپے آپ کو مرد میدان سمجھنے لگے تھے۔ اس لئے نواب حیدر علی کی فوج کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لائے اور بڑے پرجوش انداز میں مقابلے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

والی میسور نے پہلے دن اپنے مورچے قائم کئے اور دوسرے روز علی الصباح نازروں پر حملہ کر دیا۔ اپنی کثرت کے سبب قندہ گر ہندو اس جنگ کو ایک کھیل سمجھ رہے تھے۔ مگر دوپہر ہوتے ہوئے میدان اُن کی لاشوں سے بھر گیا۔ نیپو سلطان نے بھی کئی نازروں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ پہلا سالار میر علی رضا خان کو ہدایت تھی کہ وہ نیپو کے آس پاس رہے۔ ولی عہد سلطنت کو ملنے کا موقع دے مگر اس طرح کہ نیپو اپنی نا تجربہ کاری کے سبب دشمن سپاہیوں کے زرعے میں نہ آنے پائے۔

پھر جیسے ہی زوال کا وقت شروع ہوا، نازروں کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ نواب حیدر علی شہر میں داخل ہو گیا۔ سینکڑوں ستم رسیدہ مسلمان، عورتیں اور بوڑھے گھوڑوں کے سامنے لیٹ گئے اور چیخ کر فریاد کرنے لگے۔

”ہمیں بھی قتل کر دو کہ ہم جی کر کیا کریں گے؟ ہمارے کڑیل جوان مارے جا چکے، گھروں کو آگ لگا دی گئی اور عفت ماب دو شیرازوں کو ہندو غنڈے اٹھا کر لے گئے۔“

یہ داستان الم اس قدر جانگداز تھی کہ نواب حیدر علی انگبار آنکھوں کے ساتھ گھوڑے سے اتر آیا۔

ایک بوڑھی عورت نے آگے بڑھ کر والی میسور کا دامن پکڑ لیا۔

”ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ نواب حیدر علی ہماری مدد کو پہنچنے ہی والے ہیں۔ پھر آنے میں اتنا دیر کیوں ہوئی؟ اب آئے ہو تو کس لئے آئے ہو؟ سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ میرا جوان بیٹا قتل کر دیا گیا اور جوان بیٹی کو ہندو بھیڑیے میرے کمزور ہاتھوں سے چھین کر لے گئے۔ واپس جاؤ نواب! واپس جاؤ۔ تمہارا اقتدار سلامت رہے۔ ہمارا کیا ہے؟ درندوں کی بھوک مٹانے کے لئے پیدا ہوئے تھے، سو ان کی خوراک بن گئے۔“

بوڑھی عورت اپنے طرز گفتگو سے پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھی اس لئے اس کا شائبہ لب و لہجہ حیدر علی کے دل میں نشتر بن کر اتر گیا۔

”مجھے آنے میں دیر ہو گئی ماں! مگر میں واپس نہیں جاؤں گا۔ جو دنیا سے رخصت ہو گئے، اللہ ان کی مغفرت کرے۔ لیکن جو زندہ بچ گئے ہیں، انہیں درندوں کی خوراک بننے نہیں دوں گا۔“ والی میسور نے بوڑھی عورت کے دونوں بازو پکڑ لئے۔ ”خدا گواہ ہے کہ آپ کے اس بیٹے کی طرف سے غفلت نہیں ہوئی۔ بہت کام تھے اور فاصلہ بھی زیادہ تھا۔ آخر انسان ہوں، ہوا کی طرح تو سفر نہیں کر سکتا تھا۔ بے شک! میں آپ کے بیٹے کا نعم البدل نہیں ہوں، پھر بھی آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھیں۔“

میں بہتر یہی ہے کہ تم کچھ دنوں کے لئے راج محل منتقل ہو جاؤ۔“

”بس یہی بات تھی کنور؟“ سریتا نے سکون کی سانس لی۔ نیپو کی گفتگو مکمل ہونے سے پہلے اسے سینکڑوں دوسو سے پریشان کر رہے تھے۔

”ہاں!“ ولی عہد سلطنت نے اثبات میں سر کو جنبش دی

”کنور! پہلے تو یہ کہ میرے لئے راج محل اور اتھ آشرم (یتیم خانہ) دونوں برابر ہیں۔ میں کہیں بھی رہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ سریتا کے لہجے میں بڑی بے نیازی تھی۔

”دوسرے یہ کہ مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ پھر راجہ کرشنا میرا کیا بگاڑے گا؟ اور جب بات بگڑنے پر آئے گی تو پھر تمہارا سارا لشکر بھی اسے نہیں بنا سکے گا۔ اس لئے میری فکر چھوڑ دو اور اپنی منزل کی طرف دیکھو۔ کیسی کیسی فتوحات تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ فضا میں تمہارے ہی نقاروں کی گونج ہے۔ ایسی گونج جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔“ یہ کہتے کہتے سریتا پر عجیب جذب کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

نیپو جانتا تھا کہ سریتا راج محل واپس آنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوگی۔ مجیدہ بیگم، فاطمہ بیگم اور خود حیدر علی بھی بار بار اصرار کر چکے تھے مگر سریتا نے کسی کی بات کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا تھا اور اپنی ضد پر اس طرح قائم رہی تھی کہ باپ کا موروثی گھر تک چھوڑ دیا تھا۔ مجبوراً ولی عہد سلطنت کو بھی خاموش ہو جانا پڑا۔

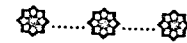
”پھر بھی تم اس سے ہوشیار رہنا۔“ نیپو نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”کنور! تمہارا بہت شکریہ کہ تم بے خبروں کی اس دنیا میں میری اتنی خبر رکھتے ہو۔“ سریتا کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

نیپو جانے کے لئے گھوڑے پر سوار ہوا تو سریتا آگے بڑھی اور اس نے گھوڑے کے سول کے نیچے سے کچھ خاک اٹھا کر اپنے اوپر ڈال لی۔

”اے خدا! کنور کی ساری مصیبتیں اور پریشانیاں میرے سر پر۔ زخم کے بدلے زخم اور جان کے بدلے جان۔ میرا یہ حقیر صدقہ قبول کر۔“

عجیب دعا تھی۔ نیپو مڑ کر سریتا کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔



نواب حیدر علی اپنے بیس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ بہت تیز رفتاری سے ملابار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب والی میسور کا لشکر کنا نور کے قریب پہنچا تو علی نے ریاست کی حدود سے علی کر بڑے والہانہ انداز میں استقبال کیا اور انتہائی عقیدت و محبت کے ساتھ نواب کی رکاب کو بہرہ دیا۔ حیدر علی کا دل اپنے سابق امیر البحر کی طرف سے صاف ہو گیا تھا۔ نتیجتاً والی میسور نے اس کی عزت افزائی کے لئے اسے بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔

”بندہ ہے کہ صورت حال پر قابو پاتے ہی ریاست کے کسی شریک کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“  
نواب حیدر علی نے تعریفی نظروں سے راجہ کنانور کی طرف دیکھا اور پھر اسے گلے لگا کر  
ذیل اسلام کی مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

”آج مجھے بہت خوشی ہے کہ میں کسی راجہ کا نہیں، اپنے دینی بھائی کا مہمان ہوں۔ آپ  
ملین رہیں اور پورے ہوش و حواس کے ساتھ ان فتنہ گروں پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ آج  
ریاست میسور آپ کی حلیف ہے۔“

اس کے بعد نواب حیدر علی نے راجہ کنانور اور اس کے داماد علی کی مدد سے ان ہندو فتنہ  
گروں کا سراغ لگایا، جو بے گناہ ماپلاؤں پر نئے نئے مظالم ڈھاتے رہتے تھے۔ والی میسور  
کے جاں نثار سپاہیوں نے ایک ایک ہندو فتنہ گر کو گرفتار کر لیا۔ بعض نازوں نے مزاحمت کی تو  
انہیں پاگل کتے کی طرح ہلاک کر دیا گیا۔ ان بد معاشوں کے گھروں سے سینکڑوں مسلمان  
لڑکیاں برآمد ہوئی تھیں جو طویل عرصے سے داشتاؤں کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔

نواب حیدر علی کے حکم پر تمام فتنہ گر ایک کھلے میدان میں جمع کئے گئے۔ پھر مظلوم مسلمانوں  
کو لایا گیا، جو اہل ہندو کے ہاتھوں اپنی عزت و آبرو، جان و مال گنوا چکے تھے۔

”تم طاقت کے نشے میں آج کے دن کو بھول گئے تھے۔“ نواب حیدر علی کی پر جلال آواز  
میدان میں دُور تک گونج رہی تھی۔ ”تو جان لو کہ یہ تمہارا یوم حساب ہے۔“

نازوں نے بہت سے حیلے تراشے، والی میسور کو سجدے کئے اور اس کے رحم کی بھیک  
اگلی مگر حیدر علی نے کسی ستم گر کی فریاد کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔

”مجھے اندازہ ہے کہ مظلوموں کی جماعت بھی اس طرح گڑ گڑائی ہوگی۔ مگر تم نے اپنی  
آنکھیں اور کان بند کر لئے ہوں گے۔“ حیدر علی کا لہجہ انتہائی قہر و غضب کا مظہر تھا۔ ”پھر مجھ  
سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں تمہاری گریہ و زاری سنوں اور موت کے خوف سے پتھرائے  
ہوئے تمہارے زرد چروں کی طرف دیکھوں؟ بس یہی انصاف ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“

پھر جس ہندو فتنہ گر نے کسی مسلمان کو قتل کیا تھا، ہر میدان اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ جس کسی  
نے گھر کو گھر کو آگ لگائی تھی، اس کے مکان کو بھی خس و خاشاک کی طرح پھونک دیا گیا  
اور سارا مال و متاع لوٹ کر ان مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا تھا جو اس فتنہ و فساد میں بے گھر  
ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نواب حیدر علی نے نازوں کے ہجوم کو مخاطب کر کے کہا۔  
”اگر میں تمہاری عفت ماب دوشیزاؤں کو مسلمانوں کے سپرد کر دوں اور وہ ان کے ساتھ  
داستان جیسا سلوک کریں؟“

چند لمحوں کے لئے ہندوؤں کے ہجوم پر موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر فضا میں بے شمار چیخیں  
کونے لگیں۔ ”نواب بہادر! رحم۔“

”اور میری بیٹی کا کیا ہوگا؟“ بوڑھی عورت کا شور و فغاں جاری تھا۔ ”اگر وہ زندہ بچ جائے گی  
تو اس کی زندگی پر کون گواہی دے گا؟“

”میں تمہاری بیٹی کو تلاش کروں گا۔“ حیدر علی کی آنکھوں میں نمی تھی اور ہونٹوں پر انتقام  
آگ۔ ”اپنے پیدا کرنے والے کی قسم! اس وقت تک واپس نہیں جاؤں گا، جب تک آپ  
آپ کی بیٹی سے نہیں ملا دوں گا۔“

بوڑھی عورت کو والی میسور کے اس خلوص نے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ حیدر علی کے سینے پر  
رکھ کر سسکتے لگی۔

”آپ کا بہت شکریہ نواب! کہ آپ نے اس بد نصیب عورت کے غم میں شرکت کی۔ لیکن  
میری زندگی تو درگور ہوگئی۔ اسے تلاش کرنے سے بھی کیا فائدہ؟ وہ اپنی آبرو کے دامن تار تار  
لے کر کہاں جائے گی؟ کون اس کے دریدہ لباس کو رفو کرے گا؟..... خدا کرے کہ وہ درندے  
اسے قتل کر دیں۔ زندگی بھر رسوائی سے تو موت بہتر ہے۔“

”آپ صبر تو کریں۔“ حیدر علی، بوڑھی عورت کو تسلیاں دے رہا تھا۔ ”میں آپ کو یقین  
دلاتا ہوں کہ آپ کی بیٹی پہلے سے زیادہ معزز و محترم ہوگی۔“

بوڑھی عورت روتے روتے خاموش ہوگئی تھی مگر اسے حیدر علی کی بات پر اعتبار نہیں آیا تھا۔  
والی میسور نے فوری طور پر علی سے مشورہ کرنے کے بعد پورے شہر کا محاصرہ کر لیا اور ساتھ  
ہی ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ تمام لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں۔ جو شخص بھی اس حکم کی  
خلاف ورزی کرتے ہوئے باہر نکلے گا، اسے بے دریغ قتل کر دیا جائے گا۔



راجہ کنانور نے نواب حیدر علی کا بڑ جوش استقبال کیا اور والی میسور سے راج محل میں باؤ  
کی درخواست کی۔ پھر ایک پُر تکلف دعوت کے بعد راجہ اور رانی نے خلوت میں نواب حیدر  
کے سامنے اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

”میں نازوں کی نظر میں ابھی تک ہندو ہوں۔ مگر اللہ جانتا ہے کہ اپنے بزرگوں کے  
مذہب سے میرا دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ میں دیوتاؤں کی نفی کر چکا ہوں اور اس اللہ پر ایمان رکھ  
ہوں جو اپنی ذات میں تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔“

”آخر یہ مصلحت پسندی کیوں؟“ نواب حیدر علی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کل  
کراپے عقیدے کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟“

”میں اپنی قوم سے دُور ہوں نواب بہادر!“ راجہ کنانور کے لہجے سے افسردگی اور غم  
کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”تنہا ہوں اس لئے دل کی بات کسی سے نہیں کہہ سکتا۔ پوری ناز قوم کے  
ساتھ ریاست کی فوج بھی میری مخالف ہے۔ اگر انہیں تبدیلیِ مذہب کا شبہ بھی ہوگا تو میرے  
گھرانے پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس لئے میں اپنے ایمان پر آپ کو گواہ بناتا ہوں۔ میرا آپ

”میں اب بھی وہی کہتی ہوں نواب بہادر!“ غم زدہ ماں بڑے جاگنداز لہجے میں اپنی دروں کی لاش پر نوحہ خوانی کر رہی تھی۔

”مگر میں آپ کی اور دوسرے غیرت مند مسلمانوں کی بیٹیوں کے وجود پر گواہی دیتا ہوں کہ عزت و آبرو کے ساتھ زندہ ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہیں گی۔“

اس کے بعد نواب حیدر علی نے اپنا نیا فرمان جاری کرتے ہوئے کہا۔

”ہندو اباؤں کے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بننے والی تمام مسلم دوشیزائیں سرنگاپٹم بھیج دی جائیں گی اور میری ریاست کے معزز افراد ان سے شادی کریں گے۔ یہ سب حیدر علی کی بیٹیاں ہوں گی اور حکومت میسور ان کی رخصتی کے سارے اخراجات برداشت کرے گی۔ اس کے علاوہ جن گھرانوں کے کمانے والے مرد فسادات کی نذر ہو گئے ہیں، انہیں بھی بنگلور یا سرنگاپٹم منتقل کر دیا جائے گا اور ان کی کفالت کی ذمہ داری بھی حکومت میسور پر عائد ہوگی۔“

عجیب فرمان تھا جسے سن کر ریاست کنانور کے زخم خوردہ مسلمانوں کے دھواں چھوٹا چہروں پر زندگی کے تازہ خون کی جھلک نمایاں ہو گئی اور ابھی بھی آنکھوں میں امیدوں کے نئے چراغ جلتے لگے۔

پھر دوسرے دن سینکڑوں مسلمان عورتیں، بوڑھے اور بچے ایک فوجی دستے کی نگرانی میں سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو گئے۔ حیدر علی نے سپہ سالار محمد علی کیدان اور شجاعت خان کے نام ایک خصوصی خط میں یہ عبارت تحریر کی تھی۔

”یہ بدحال لوگ جو تمہاری طرف آرہے ہیں، انہیں چشمِ حثارت سے نہ دیکھنا کہ یہ تمہارے نواب کے مہمان ہیں۔ اور تم میرے سرنگاپٹم پہنچنے تک اپنی مہمان نوازی کی تمام تر روائیوں کو برقرار رکھو گے۔“

اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد نواب حیدر علی خود بھی کالی کٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس پورے علاقے کی تسخیر ایک سیاسی ضرورت تھی اور والی میسور جلد از جلد اپنی ضرورت کی تکمیل چاہتا تھا۔



جب نواب حیدر علی کی فوج کالی کٹ کے قریب پہنچی تو وہاں کے راجہ، زامران نے شہر سے باہر نکل کر والی میسور کا پُر جوش استقبال کیا۔ زامران کے تمام وزیر اور رشتہ دار اس حکمت عملی سے سخت نالاں تھے۔ انہوں نے آخری وقت تک راجہ کو مشورہ دیا کہ وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائے اور خفیہ مراسلت کے ذریعے پڑوسی ہندو راجاؤں سے امداد طلب کرے۔ پھر جب سارے حلیف لشکر جمع ہو جائیں تو حیدر علی کو ایسی شکست فاش دی جائے کہ وہ دوبارہ حملہ آور ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔

”میں کالی کٹ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم ریاست کی مکمل تباہی کے منصوبے بنا

”کیسا رحم؟“ والی میسور نے ہندوؤں کی چیخوں کے جواب میں کہا۔ ”دنیا کا قانون یہی ہے کہ جسم کے بدلے جسم، جان کے بدلے جان اور آبرو کے بدلے آبرو۔ آج میں اس قدر اختیار ہوں کہ اپنا ہر فیصلہ تم پر مسلط کر دوں اور تم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو میرے فیصلے کو جھکا سنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اس کے بعد تم دنیا کی جس عدالت میں بھی جاؤ گے، وہاں کے منصف یہی کہیں گے کہ نواب حیدر علی خان بہادر نے تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔“

یہ عجیب و غریب دلیل تھی، جسے سن کر بت پرستوں کے ہجوم کی جنمیں ڈبے لگیں۔

”مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں اپنی عدالت کے قانون کا پابند ہوں۔“ مختصر سے وقفہ رُسکوت کے بعد نواب حیدر علی دوبارہ سرکش اور مقصد نازوں سے مخاطب ہوا۔ ”اور میری عدالت اسلامی قانون کی پابند ہے اور اسلام کسی گناہ گار کا بوجھ کسی بے خطا انسان کے کاندھوں پر نہیں ڈالتا۔ آج کے بعد تمہارے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو امان ہے۔ بے خوف و خطر اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور اپنے دوسرے ہم مذہبوں کو بھی بتا دو کہ اسلام ہی تمہیں زیرِ آسمان پناہ دے سکتا تھا۔“

حیدر علی کے اس اعلان کے بعد نارتھ قوم کے شریف انفس لوگوں نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ مگر ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ اکثریت کینہ پرور اور تنگ نظر تھی، اس لئے حیدر علی کی رواداری اور اعلیٰ ظرف سے متاثر نہ ہو سکی اور ماپلاؤں کے خلاف اپنے سینوں میں نفرتوں کا غبار چھپائے چپ چاپ چلی گئی۔

مقامی مسلمانوں کی نشاندہی پر والی میسور نے تمام ہندو قتلہ گروں کو قتل کر دیا۔ پھر وہ مظالم ماپلاؤں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے تمام ستم رسیدہ دوشیزاؤں کے ماں باپ کو طلب کیا اور ان سے پوچھنے لگا۔

”مجھے بتاؤ کہ تمہارے اس غم کا ازالہ کس طرح کیا جائے؟“

”نواب بہادر! یہ وہ زخم ہے، جو کبھی نہیں بھرے گا۔“ ہندوؤں کے ہاتھوں بے آبرو کی جانے والی لڑکیوں کے ماں باپ، بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ ”آپ بھی کیا کر سکتے ہیں؟ نازک شیشے تھے، گرے اور ٹوٹ گئے۔ اب انہیں کون جوڑ سکتا ہے؟“

”وہ شیشے خود نہیں ٹوٹے، انہیں توڑا گیا ہے۔“ غیرت مند ماں باپ کی حالت زار دیکھ کر والی میسور آبدیدہ ہو گیا تھا۔ ”تمہاری بیٹیاں جبر کا شکار ہوئی ہیں۔ زمانہ انہیں کچھ بھی سمجھے، مگر اللہ کے نزدیک وہ ہر الزام سے بری ہیں۔“

یہ کہہ کر نواب حیدر علی اس بوڑھی عورت سے مخاطب ہوا جس نے ریاست کنانور میں داخل ہوتے وقت والی میسور کا دامن پکڑ کر فریاد کی تھی۔

”ماں! تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری بیٹی، مردوں سے بھی بدتر ہے، اس کی زندگی پر کون گواہی دے گا؟“



نے شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ پھر خواب گاہ کے دروازے مقفل کر کے  
وزیروں کو آگ لگا دی۔ پھر جب وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تو اسے بستر پر رسیدوں سے جکڑ دیا گیا۔  
والی میسور نے راجہ کی لاش دیکھی تو چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ پھر بھی اس کے کونٹے جیسے  
ہم پر رسیدوں کے واضح نشانات موجود تھے۔ قتل کا ثبوت فراہم ہو چکا تھا۔ نتیجتاً حیدر علی نے  
امران کے ان تمام عزیزوں کو جو اس سازش میں شریک تھے، زنداں کے حوالے کر دیا اور  
رائے سلطنت کو قتل کر دیا۔

نازوں کو اپنی پہلی شکست کا بہت قلق تھا۔ جب انہیں زامران کے مرنے کی خبر ملی تو وہ یہی  
مجھے کہ نواب حیدر علی نے راجہ کو قتل کر دیا ہے۔ نازوں نے اس صورت حال سے فائدہ  
اٹھاتے ہوئے مذہبی نعرے لگائے اور ہندوؤں کی ایک بہت بڑی جمیعت لے کر کالی کٹ کی  
لرف بڑھے۔ والی میسور نازوں کی بدعہدی اور شرانگیزی سے سخت بیزار تھا۔ جب حیدر علی کو  
ان کے حملے کی خبر ملی تو وہ سفاکانہ انداز میں مسکرایا۔  
”شیروں کا شکار کھیلتے کھیلتے مجھے آکٹا ہٹ محسوس ہونے لگی ہے۔ اب یہی جی چاہتا ہے کہ  
ان لوٹریوں اور گیدڑوں کا شکار کروں۔ ان کی موجودگی سے سیاست کے جنگل کی فضا بہت  
زیادہ غبار آلود ہو گئی ہے۔“

حیدر علی نے اپنے فوجی دستوں کو اس طرح ترتیب دیا تھا کہ چاروں طرف سے نازوں کو  
گھیرے میں لے کر اس فتنہ انگیز قوم کا مکمل صفایا کر دیا جائے۔ مگر بد قسمتی سے والی میسور کا یہ  
منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ ناز راستے کے پیچ و خم سے واقف تھے اس لئے وہ حیدر علی کے  
پچھائے ہوئے جال سے دور ہی رہے اور ایک معمولی سے مقابلے کے بعد حسب روایت بھاگ  
کھڑے ہوئے۔

حیدر علی نے شدید حالت غضب میں نازوں کا تعاقب جاری رکھا۔ ناز اپنی جان بچاتے  
ہوئے یونانی کی طرف بھاگے۔ والی میسور نے انہیں اس علاقے سے بے دخل کرنے کے لئے  
یونانی پر حملہ کر دیا۔ یہاں کا راجہ، حیدر علی کے حملے کی تاب نہ لا سکا اور اس نے راہ فرار اختیار  
کی۔ نتیجتاً یونانی کے قلعے پر والی میسور کا قبضہ ہو گیا۔ حیدر علی نے یونانی پر اپنے عامل مقرر کئے  
اور تیز رفتاری کے ساتھ کوچین کی طرف بڑھا۔

راجہ کوچین بھی ایک ہوش مند فرماؤ تھا اور وقت کی رفتار کو پہچانتا تھا۔ اس لئے وہ قلعے  
سے باہر نکلا اور اس نے نواب حیدر علی کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا۔ والی میسور کی فتوحات  
میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔



اسی دوران برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ ملابار میں کثرت سے بارش ہوتی تھی۔ اس  
لئے حیدر علی نے بروقت فیصلہ کیا کہ برسات ختم ہونے تک کوچنور میں رہے۔ یہ علاقہ ملابار کے

رہے ہو۔“ زامران نے اپنے تمام اراکین سلطنت کے مشوروں کو جھٹلا دیا اور قیمتی تحائف ساز  
والی میسور کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

”میں کالی کٹ کی حکمرانی کا خواہاں نہیں، نواب بہادر کی دوستی کا طلب گار ہوں۔  
زامران نے حیدر علی کی برتری کو کھلے دل سے تسلیم کر لیا تھا۔

والی میسور نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ راجہ زامرا  
نے بے اختیار حیدر علی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

”ہماری دوستی چاہتا ہے تو پھر تیرے تاج و تخت کے لئے سلامتی ہے۔“ نواب حیدر علی۔  
راجہ زامران کو گلے لگایا اور اپنی فوج کے ساتھ قلعے میں داخل ہو گیا۔

راجہ نے حیدر علی کے پورے لشکر کی پُر تکلف دعوت کی اور شب کے ابتدائی حصے میں  
محل کو واپس چلا گیا۔ آدھی رات کے قریب یکایک محل سے شعلے اٹھنے لگے۔ والی میسور اس راز  
سور تھا۔ محافظ سپاہیوں نے حیدر علی کو جگا کر اس اچانک آتش زدگی کی خبر دی۔ نواب حیرت  
فکر کے عالم میں ان شعلوں کو دیکھنے لگا جو آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ حیدر علی نے فوراً  
اپنے ایک سپاہی کو مستعد رہنے کا حکم دے دیا اور باقی رات جاگ کر گزار دی۔

صبح ہوتے ہی والی میسور نے یہ افسوس ناک خبر سنی کہ راجہ زامران نے رات کے پچھلے  
محل کو آگ لگا دی اور خود کو بجڑکتے ہوئے شعلوں کے حوالے کر دیا۔

حیدر علی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور پھر خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا۔ ”زامران  
خودکشی کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو ہماری مجلس خاص سے بہت خوش اور مطمئن حالت میں اٹھا تھا  
پھر اس نے اپنے آپ کو آگ میں کیوں جلا ڈالا؟“  
بات اُلجھ گئی تھی۔ راجہ کی پراسرار موت کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے حیدر علی۔

زامران کے تمام وزیروں اور قریبی عزیزوں کو قلعے میں طلب کر لیا۔  
راجہ سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کا ایک ہی جواب تھا.....

”جب اس ذلت آمیز معاہدے پر راجہ کو غیرت دلائی گئی تو اس نے دیوانگی کی حالت  
میں آگ لگا دی اور خود شعلوں کی خوراک بن گیا۔“

”وہ دیوانہ کب تھا؟“ زامران کے متعلقین کا جواب سن کر نواب حیدر علی برہم ہو گیا۔  
تو بہت باہوش اور مدبر انسان تھا۔ اور تم لوگ دوستی کے معاہدے کو ذلت آمیز معاہدہ کہہ رہے

ہو؟ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟“ والی میسور کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔  
مگر وہ سب کے سب بیک زبان بھی کہتے رہے۔ ”راجہ میں اپنی قوم کا سامنا کرنے کی

ہمت نہیں تھی، اس لئے خودکشی کر کے مر گیا۔“  
حیدر علی اس جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے زامران کے خاص خدمت گاروں پر سختی

کی تو یہ راز کھلا کہ راجہ سوتے وقت شراب پینے کا عادی تھا۔ اس رات زامران کے قریبی



ڈاکٹر تھے اور راتیں بے خوابی کے عالم میں گزر رہی تھیں۔ ایک طرف اپنے زرخیز ترین علاقے کو جانے کا غم..... اور دوسری طرف شہزادے کریم شاہ کی بیماری۔ بے پناہ محبت کرنے والے باپ نے قوم کے دوسرے بیٹوں کے غم میں اپنے بیٹے کی بیماری کو بظاہر فراموش کر دیا تھا لیکن اب بھی اس کا دل سرنگاپٹم کے محل میں موجود تھا اور وہ عائناتہ طور پر کریم شاہ کو مخاطب کر کے کہا کرتا تھا۔

”بیٹے! تمہاری بیمار داری کو ضرور آتا مگر یہاں میرے دوسرے بیٹوں کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ اس لئے باپ کی اس مجبورانہ کوتاہی کو معاف کر دینا۔“

حیدر علی نے یہی الفاظ اپنے ایک خط میں بھی شہزادے کریم شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھے تھے۔ سرنگاپٹم سے اب تک غنی قاصد والی میسور کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ اطلاع دے چکے تھے کہ شہزادہ کریم شاہ کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔ حیدر علی بڑے صبر و ضبط سے پریشان کن خبریں سنتا اور آسمان کی طرف دیکھ کر بے ساختہ پکارا اٹھتا۔

”اگر میرے پیدا کرنے والے کی یہی مرضی ہے کہ میرا بیٹا مجھ سے بچھڑ جائے تو میں اس کے اس فیصلے پر راضی ہوں۔ اگر کریم شاہ کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے تو پھر میں کیا، اگر مارا جاؤں تو کبھی مسیحا کی کرے تو اس کے سفر کو کوئی نہیں روک سکتا۔“

ایک بار پھر تمام سیاسی مشیروں اور فوجی افسروں نے والی میسور کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ دن کے لئے سرنگاپٹم چلے جائیں۔ اگر خدا نخواستہ شہزادے کو کچھ ہو گیا تو ساری زندگی ایک عجیب سی نظر بنائی رہے گی۔

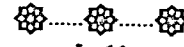
”میں یہاں کیف و نشاط کی محفلیں نہیں سجا رہا ہوں۔“ حیدر علی اپنے مشیروں پر براہم ہو گیا۔ ”میں اپنے دشمن سے حالت جنگ میں ہوں۔ محاذ کو کیسے کھلا چھوڑ دوں؟ حیدر نگر کی بنیادوں میں میرے سینکڑوں جانباڑوں کا خون شامل ہے۔ میں اس خون کو مادھوراؤ کے ہاتھوں کیے فروخت کر دوں؟“

”آپ اپنے جاں نثاروں کی قربانیوں کو فروخت کب کر رہے ہیں؟“ ایک فوجی افسر، مرزا حسین علی بیگ نے عرض کیا۔ ”آپ تو شہزادے کی عیادت کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔“ ”مجھے معلوم ہے حسین علی بیگ! کہ میرے کتنے سپاہی اپنے گھروں سے یہ کہہ کر نکلے تھے کہ وہ بہت جلد فاتحانہ انداز میں واپس آئیں گے اور اپنے پیاروں کے روشن چہرے دیکھ کر زندگی کی نئی خوشیاں حاصل کریں گے۔“

”بے شک نواب بہادر!“ مرزا حسین علی بیگ نے اعتراف کیا۔ ”کیا تجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ لوگ اپنے گھروں کو واپس نہیں پہنچے۔ مبینہ طور پر ان کے دروازے کھلے رہے۔“ نواب حیدر علی انتہائی جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔ ”ان کے بیوی بچے اور بوڑھے ماں باپ انتظار ہی کرتے رہے مگر وہ اپنے گھروں کو لوٹنے کے بجائے دوسرے

حاصل ہوں گے۔“

حیدر علی کے اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں ہندو حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔



حیدر علی ملابار کے اختانات سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے بیک وقت دو پریشان اطلاعات موصول ہوئیں۔ والی میسور کو مختلف محاذوں پر الجھنا ہوا دیکھ کر حیدر نگر (بنور) کے باشندوں نے پیشوائے پونا، مادھوراؤ سے خفیہ مراسلت کے ذریعے درخواست کی کہ ایک ریاست کو مسلمانوں کے تسلط سے نجات دلائی جائے۔ مرہٹے تو حیدر علی کو تباہ و برباد کرنے پر ہانے ڈھونڈتے ہی رہتے تھے۔ یہ موقع ہاتھ آیا تو میں ہزار مرہٹوں کا ایک لشکر بڑی رازدارانہ کے ساتھ آگے بڑھا۔ مقامی ہندو، مرہٹہ فوج کی رہنمائی کر رہے تھے۔ حیدر علی کے عاملوں کو سازش کا پتہ اس وقت چلا جب بازی ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ رات کی تاریکی کا سہارا لے کر شہر میں داخل ہوا اور جب صبح لوگوں کی آنکھ کھلی تو حیدر نگر پر مرہٹوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ والی میسور کو اپنی مملکت کے شہروں میں حیدر نگر سب سے زیادہ عزیز تھا۔ مرہٹوں کے ہر کی خبر سن کر حیدر علی سناٹے میں آ گیا۔

ابھی وہ اس صدمے کے اثرات سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ سرنگاپٹم سے آئے ہوئے فاطمہ بیگم کا خط اس کے حوالے کیا۔

”شہزادہ کریم شاہ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے تپ حرقہ میں مبتلا ہے۔“ فاطمہ بیگم نے حیدر علی کو چھوٹے بیٹے کی بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے تحریر کیا تھا۔ ”مسلل بخار نے اسے جاں بلب دیا ہے۔ طبیب خاص دواؤں میں بدلتے بدلتے عاجز آ گیا ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آپ کچھ دنوں کے لئے سرنگاپٹم تشریف لے آئیں تو شاید کریم شاہ کی طبیعت سنبھل جائے ورنہ صبح و شام کا کوئی بھروسہ نہیں۔“

حیدر علی نے فوری طور پر ٹیپو کو ایک فوجی دستے کے ساتھ سرنگاپٹم روانہ کر دیا۔ اور فاطمہ کے خط کے جواب میں لکھا۔

”صبر سے کام لو۔ تمہیں حالات کا علم نہیں۔ اگر میں سرنگاپٹم چلا آیا تو ہزاروں کروڑ مر جائیں گے۔“

پھر میر علی رضا خان کو ملابار کا منتظم اعلیٰ مقرر کر کے خود حیدر نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب حیدر علی برق رفتاری کے ساتھ ”حیدر نگر“ کے نواح میں پہنچا تو اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کے پسندیدہ شہر پر مرہٹے قابض ہو چکے ہیں۔

اس موقع پر والی میسور کے بعض فوجی افسروں نے حیدر علی کو آگے بڑھ کر حملہ کرنے مرہٹوں کو حصار میں لینے کا مشورہ دیا۔ مگر نواب نے ایسے کسی مشورے کو قبول نہیں کیا اور فوج کو لے کر حیدر نگر سے چند میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہو گیا۔ حیدر علی

نہیں کیا اور حیرت زدہ لہجے میں کہنے لگا۔

”بزرگ! آپ کون ہیں؟ اور مجھ سے کس ایفائے عہد کی بات کر رہے ہیں؟“

جب بابا عبدالرحمن شاہ نے ماضی کے ایک خاص واقعے کا ذکر کیا تو ٹیپو انہیں پہچان گیا اور بات کا اظہار کرنے لگا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جب آپ سات سال پہلے وزیراعظم تندرراج کی حالت کے باعث راجہ کرشنا کے معتب تھے اور سرنگاپٹم سے دور ایک مفرد شخص کی زندگی گزار رہے تھے، اس وقت ٹیپو محل کے باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ ایک دن بابا عبدالرحمن انہیں اس طرف آئے اور ٹیپو کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”خدا جب تجھے بادشاہ بنادے تو اس جگہ ایک شاندار مسجد تعمیر کرنا۔“

ٹیپو کی اس وقت عمر ہی کیا تھی؟ مشکل سے چھ سات برس کا ہوگا۔ اس نے بابا کی بات نہ سمجھے ہوئے بھی ان سے مسجد کی تعمیر کا وعدہ کر لیا۔ پھر عبدالرحمن شاہ کے جانے کے بعد ٹیپو نے اس واقعے کا ذکر کیا تھا۔ اور میں ایک مجذوب کی بات سن کر برہم ہو گئی تھی۔ میں نے اس ”پاگل“ کہہ کر پکارا تھا۔ کہاں ایک معتب فوجی افسر کا بیٹا اور کہاں بادشاہت کا قصہ؟ یہ تو کوئی دیوانہ ہی کہہ سکتا تھا۔ مگر سات سال بعد جب اللہ نے آپ کو والی میسور بنا دیا تو عبدالرحمن شاہ کی گفتگو بڑی معنی خیز معلوم ہوئی۔ میں نے ان سے اس عاتبانہ گستاخی کا ذکر کرتے ہوئے معافی مانگی تو کہنے لگے۔

”پاگل کو پاگل کہنا کوئی جرم نہیں ہے بیٹی! پھر کس بات پر ندامت ہے اور کس گناہ کی مافی مانگ رہی ہو؟“

آخر میرے بہت اصرار کے بعد عبدالرحمن شاہ نے مجھے معاف کر دیا۔ پھر جب ٹیپو کو اس کا وہ یاد دلا کر واپس جانے لگے تو میں نے کریم شاہ کی بیماری کا ذکر کیا۔ بابا نے ایک نظر کریم کو دیکھا اور پھر بڑے غضب ناک لہجے میں بولے۔

”یہ سرکاری طبیب، بڑی بڑی مراعات پانے والے کس بیماری کا علاج کر رہے ہیں؟ لیکن تم بھی ہے کہ شہزادے کو کیا مرض ہے؟“

اس کے بعد عبدالرحمن شاہ نے جو کچھ بتایا، وہ ہم سب کے لئے ناقابل یقین تھا۔ شاید یہ بھی یقین نہ کریں مگر واقعہ یہی ہے کہ کریم شاہ کو کوئی قدرتی بیماری لاحق نہیں تھی بلکہ آپ کا ٹیپو بیٹے پر بیگانگی کے ایک جادوگر کالی چرن نے جان لیوا مرض مسلط کیا تھا۔ اگر عبدالرحمن اس وقت تشریف نہ لاتے تو شاید یہ خط کریم شاہ کی موت کا اطلاع نامہ ہوتا۔ کالی چرن بیگانگی کے نئے سرے پر تڑپ رہا تھا۔ عبدالرحمن شاہ مجذوب کے کہنے کے مطابق کالی چرن کو راجہ کرشنا نے بیگانگی سے بطور خاص اس کام کے لئے بلایا تھا کہ وہ آپ کا، ٹیپو کا اور کریم شاہ کا سر نہاکر تینوں کو قتل کر ڈالے۔ آپ اور ٹیپو سرنگاپٹم میں موجود تھے اس لئے کالی چرن کے شر

راستے پر چلے گئے۔ کیا وہ انسان نہیں تھے؟ اور کیا میں ان سے ارفع و اعلیٰ کوئی مخلوق ہوں؟ ہم میں کیوں چلا جاؤں؟ میرے سپاہیوں میں سے کتنوں کے بیٹے بیمار ہوں گے اور کتنوں کے عزیز و اقارب قبروں میں اتارے جا چکے ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اپنے گھروں کو نہیں چلے جائے؟ میرے ساتھ اس طوفانی موسم میں کیوں مارے مارے پھر رہے ہیں؟“

”آپ میں اور عام سپاہیوں میں بڑا فرق ہے نواب بہادر!“ مرزا حسین علی بیگ نے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ امیر قافلہ ہیں اور ہم سب مسافر۔ اگر سالار کارواں غائب قرار و مضطرب رہے گا تو پھر یہ بھٹکے ہوئے مسافر کس طرح آسودہ منزل ہوں گے؟“

”نہیں۔ مجھ میں اور میرے سپاہیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“ حیدر علی کا فطری چادر جلال پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہو گیا تھا۔ ”وہ میرے قافلہ ہی نہیں جو مسافروں کے جذبات اپنی ضرورتوں کو ترجیح دے۔ اور پھر حیدر نگر کے باشندے میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟ میں نے ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا عہد کیا تھا مگر جب ان پر بدانت پڑا تو میں صرف اپنے بچے کی بیماری کی خبر سن کر سرنگاپٹم چلا گیا۔ نہیں حسین علی بیگ! مجھے ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں اس دن سے بہت ڈرتا ہوں جب مالک حقیقی کی عدالت آراستہ ہوگی اور مجھے ایک ایسے مجرم کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا جو بندگان خدا کے حقوق کا غاصب، خائن تھا۔ جو کریم شاہ کا خالق ہے، وہی اس کا مسیحا بھی ہے۔ تم مطمئن رہو۔ تمہارا میر کارواں اپنے بچے کے غم میں مضطرب نہیں ہے۔ اسے حیدر نگر کے ان بچوں کا غم ہے جو مصیبت کے اس کڑے وقت میں اپنے باپ کو پکار رہے ہیں۔ اور مجبور باپ، کھلے آسمان کے نیچے ایک جنگل میں خیمہ زن ہے۔“

حیدر علی کے اس جذبے سے سپاہی اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم تمام افسر اور فوجی، والی میسور کو بتائے بغیر ایک میدان میں جمع ہوئے۔ ننگے سروں کے ساتھ ان سب نے نماز ادا کی اور بڑے عاجزانہ لہجے میں شہزادہ کریم شاہ کی صحت یابی کے لئے گزرتا کر طویل دعا مانگی۔

جب آخری لحاظ میں والی میسور کو اپنے سپاہیوں کی اس والہانہ عقیدت و محبت کی خبر ملی وہ خود بھی سب سے پچھلی صف میں شامل ہو گیا۔

پانچویں دن سرنگاپٹم سے فاطمہ بیگم کے قاصد یہ جانفز خبر لایا کہ شہزادہ کریم کا بیمار ہونا ہے اور اب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا ہے۔ فاطمہ بیگم نے شوہر کے نام اپنے خط میں ان واقعے کی تفصیل لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا۔

”جب سرنگاپٹم کے تمام طبیب عاجز آچکے اور ہم سب لوگ شہزادے کی زندگی سے ہاتھ دھو چکے تو ایک دن سرنگاپٹم کے مجذوب، بابا عبدالرحمن شاہ، ٹیپو سلطان سے ملنے کے لئے تشریف لائے اور فرمانے لگے۔ شہزادے! ہم جا رہے ہیں۔ اپنا وعدہ ادا رکھنا۔ ٹیپو انہیں



چھوڑ دے۔“  
”آخر انسانی جانوں کا تاجر ہے، اس لئے مجھ سے بھی تجارت کی بات کرتا ہے۔“ بابا  
عبدالرحمن شاہ مسکرائے۔ ”مگر میں تجھ سے سودا کروں تو مجھے دینے کے لئے تیرے پاس کیا ہے؟“  
”راجہ کرشنا نے مجھے شہزادے کریم شاہ کا مجسمہ بنانے کے لئے ایک لاکھ روپے، سونے  
کے فنی زیورات، بہترین شراب اور ایک خوب صورت لڑکی دی ہے۔“ کالی چرن نے اعتراف  
پر کرتے ہوئے کہا۔ ”راجہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جب میں شیطان اور حیدر علی کے  
بچے بنائوں گا اور میرے ساحرانہ عمل کے اثر سے وہ دونوں باپ بیٹا ہلاک ہو جائیں گے تو  
میرے سامنے دولت کا انبار لگا دیا جائے گا۔ فی الحال میرے پاس ایک لاکھ روپے کے علاوہ وہ  
ذبح صورت لڑکی بھی موجود ہے۔ میں یہ دونوں چیزیں تمہیں دے سکتا ہوں۔ میرا کچھ اثاثہ  
بکال میں بھی ہے۔ مجھے جانے دو۔ میں وہاں پہنچتے ہی اپنا سارا سرمایہ تمہارے نام کر دوں گا۔“  
کالی چرن اپنی بدخواہی اور خوف کی وجہ سے عبدالرحمن شاہ مجذوب کو ایک دنیا پرست انسان سمجھ  
رہا تھا اس لئے اس نے ایک خدا مست کو حریصانہ پیش کش کی تھی۔

”فی الوقت جو کچھ تیرے پاس ہے، مجھے دیدے۔“ عبدالرحمن شاہ نے کچھ ایسے لہجے میں  
کہا کہ جیسے وہ واقعتاً ایک دنیا دار اور حریص انسان ہو۔ ”بعد کا حساب بعد میں دیکھا جائے گا۔“  
کالی چرن تیز قدموں سے دوسرے کمرے میں پہنچا اور سونے چاندی کے سکوں سے بھرا  
ہر ایک بڑا تھیلا لے کر آیا۔ شجاعت خان اور شیطان سلطان نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک انتہائی حسین  
لڑکی نظریں جھکائے، کانپتے قدموں سے کالی چرن کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

کالی چرن نے سنہری اور روپیلی سکوں سے لبریز وہ تھیلا عبدالرحمن شاہ مجذوب کی طرف  
بلا دیا۔

”اس فتنے کو میرے پیروں میں ڈال دے۔“ یکا یک عبدالرحمن شاہ کا لہجہ بدل گیا۔ ایک  
مذہب کا عجیب جاہ و جلال تھا۔ کالی چرن کے ساتھ شجاعت خان اور شیطان کو بھی یہی محسوس ہوا کہ  
عبدالرحمن شاہ کی آواز کی گرج سے اس مکان کے در و دیوار لرز اٹھے ہیں جو راجہ کرشنا نے کالی  
چرن کو اس کے ساحرانہ عمل کی تکمیل کے لئے فراہم کیا تھا۔ یہ ایک تہہ خانہ نما مکان تھا، جہاں  
ہزاروں لوگوں کے سوا کسی دوسرے کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ مگر عبدالرحمن شاہ مجذوب، شیطان اور  
شجاعت خان کو اس طرح وہاں لے گئے تھے جیسے وہ اس راستے کے ایک ایک بیچ دھم سے  
واقف ہوں۔

کالی چرن نے لرزتے ہاتھوں سے دولت کا وہ ذخیرہ عبدالرحمن شاہ کے پیروں میں ڈال دیا  
عبدالرحمن شاہ نے فوراً ہی سیم و زر کے اس ڈھیر پر اپنا بایاں پاؤں رکھ دیا اور دل کی طاقت  
سے غور و فہم کی۔

”اے خدا! تو بھی غنی اور تیرے صدقے میں عبدالرحمن شاہ بھی غنی۔ آج ساری دنیا کی

سے محفوظ رہے۔  
اس شتی القلب انسان نے اپنے شیطانی کام کی ابتدا کریم شاہ کے مجسمے سے کی۔ عبدالرحمن  
شاہ شیطان اور شجاعت خان کو کالی چرن کے مکان پر لے گئے تھے۔ وہاں ان دونوں نے اپنی  
آنکھوں سے کریم شاہ کا مجسمہ دیکھا تھا۔ یہ مجسمہ مٹی کا بنا ہوا تھا اور اس میں جگہ جگہ تیرہ پست  
تھے۔ کالی چرن کا ساحرانہ ہنر یہ تھا کہ پہلے وہ مطلوبہ شخص سے ملاقات کرتا تھا اور بے پناہ قوت  
حافظہ کا مالک ہونے کے باعث اس کے نقش و نگار اور قد و قامت کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا  
کرتا تھا۔ پھر اسی شخص کا مجسمہ بنا کر گیلی مٹی میں جگہ جگہ تیرہ پست کر دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد  
مجسمے کو ایک ایسی تاریک کوشری میں رکھ دیتا تھا جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پھر جیسے  
جیسے وہ مجسمہ خشک ہو جاتا تھا، مطلوبہ شخص کی بیماری بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب کالی چرن  
کی بنائی ہوئی مٹی کی صورت مکمل طور پر سوکھ جاتی ہے تو وہ مطلوبہ انسان بھی مر جاتا ہے۔ لیکن  
جادوگر کا ہلاکت خیز ہنر ہے۔ جب شجاعت خان اور شیطان عبدالرحمن شاہ کے ہمراہ کالی چرن کے  
”موت خانے“ پہنچے اور انہوں نے کریم شاہ کا مجسمہ دیکھا تو وہ بھی تقریباً خشک ہو چکا تھا۔  
شجاعت خان، کالی چرن کو گرفتار کر کے حوالہ زنداں کرنا چاہتا تھا تا کہ آپ کے واپس آنے ہی  
اسے سر عام قتل کر دیا جائے۔ مگر عبدالرحمن شاہ نے شجاعت خان کو اس عمل سے باز رکھ  
ہوئے کہا۔

”یہ سزا تو بہت آسان ہوگی کہ تلوار فضا میں بلند ہوئی اور اس سفاک انسان کا سر قلم  
گیا۔ اتنا بڑا جرم اور چند لمحوں کی اذیت؟ یہ انصاف تو نہیں ہوا۔“  
”پھر آپ حکم دیں بابا! کہ اس ستم گر کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“ آخر شجاعت خان  
نے کالی چرن کی قسمت کا فیصلہ خود عبدالرحمن شاہ پر چھوڑ دیا۔

عبدالرحمن نے کچھ سوچنے کے بعد جو فیصلہ کیا، وہ بڑا عجیب اور خوف ناک تھا۔  
”اے اللہ! اس بھاپیشہ انسان نے محض چند سکوں کی خاطر نہ جانے تیرے کتنے بے گناہ  
بندوں کی جان لی ہے۔ اب تو اپنی بے پناہ قدرت سے اسی زمین پر اس کے لئے شہر آفا  
دے۔“

یہ کہہ کر عبدالرحمن شاہ، کالی چرن سے مخاطب ہوئے۔ ”آج تجھے اتنی آزادی ہے کہ خود  
اپنے لئے سزا کا انتخاب کر لے۔“

”مجھے جانے دے بابا!“ کالی چرن نے عبدالرحمن شاہ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ”مجھے  
راجہ کرشنا نے یہ کہہ کر سرنگا پٹم بلایا تھا کہ نواب حیدر علی اور اس کا خاندان دیوتاؤں اور ہندوؤں  
کا بدترین دشمن ہے، اس لئے میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے دھرم کی خدمت سمجھ کر کیا۔ اگر مجھے  
پتہ ہوتا کہ اس شہر میں تجھے جیسے گیمانی بھی موجود ہیں تو میں ہرگز ادھر کا رخ نہ کرتا۔ مجھے بتایا  
واپس جانے دے بابا! تیرا بڑا احسان ہوگا۔ میرے پاس جو کچھ ہے، سب لے۔“

دولت تیرے اس پاگل بندے کے قدموں کے نیچے۔“

یہ کہہ کر عبدالرحمن شاہ، ٹیپو سے مخاطب ہوئے۔ ”اس کی ایک ایک پائی غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دے۔“

پھر لڑکی کی طرف مڑے اور بڑے مہربان لہجے میں بولے۔ ”بیٹی! تیرا کیا نام ہے؟“

”کامنی۔“ لڑکی سسکنے لگی۔

”اب تو آزاد ہے۔ اپنے ماں باپ کے پاس چلی جا۔“ عبدالرحمن شاہ کے لہجے میں بھی باپ جیسی ہی شفقت تھی۔

”میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔“ لڑکی کسی غم زدہ بچے کی طرح ہلک اٹھی۔

”ایکلی کہاں ہے؟ میں جو ہوں تیرا باپ، عبدالرحمن شاہ۔“ مجذوب نے آگے بڑھ کر لائی کو گلے سے لگا لیا۔ ”بیٹی! مجھے بہت دُور جانا ہے۔ اگر یہ دشوار سفر درپیش نہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ ہی رکھتا۔ مگر فکر مند نہ ہو۔ تو شہزادیوں کی طرح رہے گی۔“ پھر پلٹ کر ٹیپو سے مخاطب ہوئے۔ ”اسے اپنے محل میں عزت مندانہ مقام دینا۔ ایک آبرو باختہ یا ہندو لڑکی سمجھ کر اس کی تحقیر نہ کرنا۔ یہ عبدالرحمن شاہ کی بیٹی ہے۔“

”بابا! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“ ٹیپو سلطان نے فرط عقیدت میں گردن جھکا دی۔

اس کے بعد عبدالرحمن شاہ نے آگے بڑھ کر کالی چرن کے بنائے ہوئے کریم شاہ کے مننے کو ہتھوڑے کی ضربوں سے ریزہ ریزہ کر دیا۔ عبدالرحمن شاہ ہر ضرب کے ساتھ ایک ہی جملہ دہراتے تھے۔

”میں نے جنم خدا اس کے تمام سحر کو باطل کر دیا۔“

اس عمل سے فارغ ہو کر عبدالرحمن شاہ، کالی چرن سے مخاطب ہوئے جو قریب ہی کھڑا تھرتھرا رہا تھا۔ ”میری طرف دیکھ!“ کمرے میں مجذوب کی پُر جلال آواز گونجی۔

کالی چرن نے گھبرا کر عبدالرحمن شاہ کی آنکھوں کی طرف دیکھا، پھر دفعۃً ایک دلزدہ جی مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ”ہائے میری آنکھیں..... ہائے میری روشنی۔“

”میں نے جنم خدا ہمیشہ کے لئے تیری بینائی سلب کر لی۔“ عبدالرحمن شاہ کے جلال سے فضا پر عجیب ہیبت طاری تھی۔ ”اب جا اور بھیک کا پیالہ لے کر گلی گلی گھوم۔ بس یہی تیرے جزا کی سزا ہے۔“

کالی چرن وحشیوں کی طرح چیختا رہا۔ ”میری آنکھیں، میری روشنی۔“ مگر بابا عبدالرحمن شاہ اُس کی چیخوں سے بے نیاز ٹیپو سلطان، شجاعت خان اور ہندو لڑکی کامنی کے ساتھ باہر نکل آئے۔ شجاعت خان بھی عبدالرحمن شاہ سے واقف تھا اور انہیں سرنگاپٹم کے عام باشندوں کی طرح منجھوٹا لکھو اس انسان سمجھتا تھا۔ عبدالرحمن شاہ کبھی کسی سے گفتگو نہیں کرتے تھے مگر آج جب بولے تو اس طرح بولے کہ میسور کا نائب سپہ سالار دیکھتا ہی رہ گیا۔

کالی چرن کے مکان سے نکلنے کے بعد بابا عبدالرحمن شاہ راستے میں کچھ تلاش کرنے لگے۔ ٹیپو سلطان اور شجاعت خان خاموشی اور حیرت سے عبدالرحمن شاہ کے اس عمل کا جائزہ لے رہے تھے۔ مگر ان دونوں میں لب کشائی کی جرأت نہیں تھی۔ آخر تھوڑی سی جستجو کے بعد عبدالرحمن شاہ نے جھک کر ایک نوکیلا پتھر اٹھا لیا۔ پھر اسے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھتے رہے۔ چند قدم آگے بڑھے تو ایک بھاری پتھر نظر آیا۔ عبدالرحمن شاہ نے اسے بھی جھک کر اٹھا لیا۔ پھر نوکیلے پتھر کو جی زمین پر رکھ کر بھاری پتھر سے ضربیں لگانے لگے۔ یہاں تک کہ وہ نوکیلا پتھر زمین کی سطح کے برابر ہو گیا۔

ہر ضرب کے ساتھ عبدالرحمن شاہ کی پُر جلال صدا ابھرتی۔

”دُشمن اسلام، راجہ کرشنا کے سر کے لئے۔“

مجذوب کی صدا نے شجاعت خان اور ٹیپو سلطان پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ راجہ کرشنا کے سر کے لئے ایک نوکیلا پتھر! بڑا عجیب اور مبہم اشارہ تھا۔

اس پر اسرار عمل سے فارغ ہونے کے بعد عبدالرحمن شاہ نے کامنی کو گلے لگایا، پھر ٹیپو سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

”ہم جارہے ہیں شہزادے! جب بادشاہ ہو جاؤ تو اپنا وعدہ پورا کر دینا۔ بھول گئے تو ہمیں بھی مالک سے عداوت رہے گی اور تم بھی زندگی بھر شرمسار رہو گے۔“

”آپ کہاں جارہے ہیں بابا؟“ ٹیپو نے بعد احترام عرض کیا۔ ”کچھ دن ٹھہر جائیے۔ میں آپ کی موجودگی ہی میں اس کارِ عظیم کا آغاز کئے دیتا ہوں۔“

”بہت دُور جانا ہے۔ ٹھہرنا چاہیں بھی تو نہیں ٹھہر سکتے۔“ عبدالرحمن شاہ بڑے عجیب سے لہجے میں بول رہے تھے۔ ”اور پھر تم نے ابھی تخت بھی تو نہیں سجایا ہے۔ تاج بھی تو نہیں پہنا ہے۔ اگر تم بادشاہ بن جاتے تو ہم بھی کچھ دن کی رخصت لے لیتے۔ نہیں شہزادے! ہمیں جانا پڑا ہوگا۔“

”پھر کب واپس آئیں گے؟“ ٹیپو نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”ہمیں تو ایک پل، ایک ساعت پر اختیار نہیں۔ پھر اتنے طویل سفر اور واپسی کے بارے میں کیسے بتائیں؟“ عبدالرحمن شاہ کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جلد از جلد کسی نامعلوم مقام کی طرف چلے جانا چاہتے ہیں۔

جب ٹیپو سلطان کو یقین ہو گیا کہ عبدالرحمن شاہ کسی قیمت پر اپنا سفر ملتوی نہیں کر سکتے تو اس نے اپنی والدہ فاطمہ بیگم کے حوالے سے عرض کیا۔ ”اگر آپ ایک دن محل میں قیام فرما لیتے تو ہم آپ کے لئے بڑی سعادت ہوتی۔“

ٹیپو سلطان نے یہاں تک کہ وہ دل دلانے چلے آئے تھے۔ ورنہ کوچہ گردوں کو محل سے کیا نسبت؟ بابا عبدالرحمن شاہ بڑے والہانہ انداز میں مسکرائے۔ ان کے جسم میں طنز و تحقیر کا شائبہ نہ تھا۔

”آج کل نواب بہادر بہت پریشان ہیں۔“ آخر ٹیپو نے عبدالرحمن شاہ کی خدمت میں ایک اور دعا کی درخواست پیش کر دی۔

”نواب کو کیا ہو گیا؟ وہ تو بڑے حوصلے کا انسان ہے۔ چٹانوں کی مانند۔ فولاد و آہن کی طرح۔“ عبدالرحمن شاہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

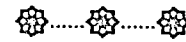
”ایک تو کریم شاہ کی بیماری، دوسرے حیدرنگر پر مرہٹوں کا قبضہ۔“ ٹیپو نے والی میسور کی آنکھیں بیان کیں۔

”وہ بڑا فقیر دوست انسان ہے۔ اللہ اس کی ساری مشکلیں آسان کرے گا۔“ عبدالرحمن شاہ نے والی میسور کو غائبانہ دعا دیتے ہوئے کہا۔ ”ناکارہ انسان تھے، اس لئے ہم تو اس کی مملکت پر بار ہی رہے۔ پھر بھی نواب سے کہنا کہ ہماری کوتاہیوں کو معاف کرے۔“ یہ کہہ کر عبدالرحمن شاہ چلے گئے۔

فاطمہ بیگم نے اپنے خط کے آخر میں تحریر کیا تھا۔

”جب ٹیپو اور شجاعت خان واپس آئے تو کریم شاہ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ آپ فرزند اس طرح شگفتہ و شاداب نظر آ رہا تھا جیسے کوئی بیماری اسے چھو کر بھی نہ گزری ہو۔ میں نے بابا عبدالرحمن شاہ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے دوبارہ ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر ٹیپو کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ سرنگاپٹم سے جا چکے ہیں۔ جس روز کالی چرن کا کیا ہوا سحر ٹوٹا، اور رات ایک اور عجیب واقعہ رونما ہوا۔ یکا یک راجہ کرشنا کے سر میں درد اٹھا اور وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگا۔ اب اس کا یہ حال ہے کہ دن بھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑے ذرا ہونے والے جانور کی طرح ڈرکارتا رہتا ہے اور رات کو اسے بے ہوشی کی دوا دے کر سلا دیا جاتا ہے۔ یقیناً یہ بھی اسی پتھر کا نشان ہے، جسے بابا عبدالرحمن شاہ جاتے جاتے راجہ کرشنا کے سر کے لئے وقف کر گئے تھے۔“

حیدر علی اپنی شریک حیات کے خط کا ابتدائی حصہ پڑھ کر بہت مسرور ہوا۔ مگر جب آخری سطریں ختم کیں تو اُداس ہو گیا۔ والی میسور، بابا عبدالرحمن شاہ سے واقف تھا مگر یہ نہیں جانتا کہ ایک بے حال مجذوب اس پر احسانات کی بارش کر جائے گا۔



مرہٹوں کی فوج نے جون کے اوائل میں حیدرنگر پر قبضہ کیا تھا۔ ہندوستان میں یہ زمانہ سخت گرمی اور لو کا ہوتا ہے۔ مرہٹے اس موسم کو تو برداشت کر گئے مگر جب برسات شروع ہوئی تو وہ کچھ پریشان سے نظر آنے لگے۔ انہوں نے جولائی اور اگست کے مہینے تو کسی نہ کسی طرح گزار دیئے لیکن جب ستمبر کے مہینے کا آغاز ہوا تو اچانک اس قدر پانی برسا کہ جیسے آسمان کے دہانے کھل گئے ہوں۔ مقامی ہندوؤں نے مرہٹہ سالار کو یقین دلایا تھا کہ حیدرنگر میں بیش اوسط درجے کی بارش ہوتی ہے۔ نہ سوکھا پڑتا ہے اور نہ سیلاب آتے ہیں۔ اسی بنیاد پر مرہٹوں

حیدرنگر میں مستقل قیام کا منصوبہ بنایا تھا۔ مگر جب یکا یک موسم بدل گیا اور بارش کی کثرت نے طرف پیچھے کی وبا پھوٹ پڑی تو مرہٹہ لشکر شدید بدحواسی کے عالم میں پونا کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب حیدر علی کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ مرہٹے واپس جانے کے لئے اپنے غمے اٹھا رہے ہیں تو والی میسور نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادلوں کے قافلے دُور دراز سے ہلکی سی آواز میں حیدرنگر پر برسا رہے تھے اور حیدر علی کی آنکھوں سے شکر گزاری کے طور پر آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔

جب آخری مرہٹہ بھی حیدرنگر کی حدود سے نکل گیا تو والی میسور کو فاطمہ بیگم کا خط یاد آیا اور خاکے پس منظر میں عبدالرحمن شاہ مجذوب کی شبیہ ابھرنے لگی۔

”عبدالرحمن شاہ! تم بھی عجیب انسان ٹھہرے۔ کیا نکلے اور کیا نظر آتے تھے۔“

حیدرنگر کا قلم و نسق بحال کرنے کے بعد والی میسور چند روز کے لئے سرنگاپٹم آیا۔ کریم شاہ کا جشن صحت منایا اور ٹیپو سلطان کو اپنے ہمراہ لے کر واپس چلا گیا۔ اس دوران جب تک مرہٹہ ٹیم میں رہا، عبدالرحمن شاہ کو ڈھونڈنا رہا۔ مگر اس مرد مجذوب کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ آخر بہت جلد کے بعد یہ راز کھلا کہ کالی چرن کے سحر کدے کو تباہ کرنے کے بعد عبدالرحمن شاہ اسی روز انتقال کر گئے تھے۔ پھر ان کے ایک نو جوان خدمت گار نے چند پڑوسیوں کی مدد سے انہیں سرنگاپٹم کے عام قبرستان میں بڑی خاموشی سے دفن کر دیا تھا۔ حیدر علی خود چل کر عبدالرحمن شاہ کی خدمت گار کے پاس پہنچا اور اس مرد مجذوب کی موت کا حال دریافت کیا۔

”مرشد حسب معمول اپنی جمبو پڑی میں تشریف لائے۔“ عبدالرحمن شاہ کے خدمت گار نے حیدر علی کو بتایا۔ ”پھر بے پرواہی کے آثار تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سبب دریافت کیا تو فرما نے لگے کہ پردہ فاش ہو گیا۔ اب جی کر کیا کروں گا؟ کاش! دنیا والے مجھے زندگی بھر بائیں بکھتے رہتے۔ مگر میں بھی بہت کم طرف تھا۔ معرفت کے سمندر سے چند قطرے پی کر نالے کی طرح اُبل پڑا۔ اللہ پاک مجھے معاف کرے۔ یہ کہہ کر چٹائی پر لیٹ گئے اور چادر اوڑھ لے۔ پھر فرما نے لگے۔ ہم جا رہے ہیں۔ اور خبردار! ہمیں مرنے کے بعد رسوا نہ کرنا۔ قبر کو زمین کی سطح تک ہموار کر دینا تاکہ آخری نشان بھی مٹ جائے اور کسی کو پتہ نہ چلے کہ گناہ گار عبدالرحمن یہاں سو رہا ہے۔“ اپنے مرشد کی رخصت کا حال سناتے ہوئے خدمت گار کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

حیدر علی نے عبدالرحمن شاہ کی قبر کے بارے میں بہت پوچھا مگر خدمت گار نے بتانے سے انکار کر دیا۔

”اگر میں تم پر جبر کروں؟“ حیدر علی نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نواب بہادر بہت با اختیار ہیں۔“ عبدالرحمن شاہ کے خدمت گار مرید الیاس ترقی نے

”عبدالحکیم خان! میرا وقت تو بہر حال گزر جائے گا مگر یاد رکھ کہ تیرے گھر سے بھی ایک دن موج خوں ضرور گزرے گی۔“

ان موج مرے ناکام و نامراد واپس چلے گئے تو حیدر علی نے نواب عبدالحکیم خان سے پھر جب مرے ایک سپہ سالار بیت جنگ کو دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ شاہ نور کی طرف انعام لینے کے لئے ایک سپہ سالار بیت جنگ کو دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ شاہ نور کی طرف روانہ کیا۔ اور پھر خود بھی ایک طاقتور فوج لے کر آگے بڑھا۔ اس جنگی مہم میں نپو سلطان بھی اپنے باپ کے ہمراہ تھا۔

اس جنگ میں حیدر علی کی حکمت عملی بڑی عجیب تھی۔ والی میسور نے پنڈاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر شاہ نور کے سپاہیوں سے نبرد آزما ہو جائیں۔ پھر جب افغانی فوج مقابل آئے تو اس طرح پیچھے ہٹیں جیسے وہ میدان جنگ سے فرار ہو رہے ہیں۔ پنڈاروں نے ایسا ہی کیا۔ نواب عبدالحکیم خان کی فوج فتح کے نشے سے سرشار پنڈاروں کے تعاقب میں بڑھی۔ پنڈاروں نے حیدر علی کے منصوبے کے مطابق وہ راستہ اختیار کیا جہاں ایک کہیں گاہ میں والی میسور کی فوج موجود تھی۔ پھر جیسے ہی افغانی سپاہی ہدف پر آئے، حیدر علی کے جاں نثار کہیں گاہ سے نکل کر شہبازوں کی طرح جھپٹے۔ تھوڑی ہی دیر میں نواب عبدالحکیم خان کا فوجی دستہ لقمہ اجل بنا گیا اور شاہ نور کے سپاہی چڑیوں کا غول ثابت ہوئے۔

نواب عبدالحکیم خان نے یہ خبر سنی تو فرار ہو کر قلعہ بند ہو گیا۔

قلعہ کا محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ آخر نواب عبدالحکیم خان نے والی میسور کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ شاہ نور کے حاکم نے حیدر علی کے نام پیغام بھیجا کہ وہ اپنی ماضی کی حرکت پر نادم ہیں اور معافی کا طلب گار بھی۔ والی میسور کا مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ اس نے ٹیک کر وڑے اور نقد اور چند مضافاتی علاقوں کے عوض عبدالحکیم خان کو معاف کر دیا۔

شاہ نور کے بعد حیدر علی کے ایک سپہ سالار، مرزا حسین علی بیگ نے بسواری ورگ فتح کر لیا۔ وہاں کے راجہ نے نواب حیدر کی خدمت میں یاقوت و مروارید اور بڑاؤ زیورات سے بھرے ہوئے بیس صندوق بطور نذر پیش کئے۔



جب حیدر علی، ملابار اور شاہ نور جیسے اہم علاقوں پر قابض ہو گیا تو پیشوائے پونا کو ایک مسلم طاقت کا انکھڑا بہت شاق گزرا۔ نتیجتاً مادھوراؤ، حیدر علی سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک لشکر ہزار لے کر میسور کی طرف بڑھا۔ مادھوراؤ ایک لاکھ سواروں، ساٹھ ہزار پیادوں اور پچاس ہزار تیراندازوں کی قیادت کر رہا تھا۔

خاکہ پنا سے روانہ ہوتے وقت پیشوا مادھوراؤ نے شیواجی کے مجسمے کے سامنے ٹم ہو کر عہد کیا کہ وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے گا، جب تک حیدر علی کے اقتدار کو خاک میں نہیں ملا۔

جواباً عرض کیا۔ الیاس ترمذی بہت بڑھا لکھا تو جوان تھا اور اسلامی فقہ پر اس کی گہری نظر تھی۔ ”آپ یقیناً میری دنیا خراب کر سکتے ہیں مگر میں اپنی آخرت برباد نہیں ہونے دوں گا۔ اور یہ سودا میرے لئے بہترین سودا ہے۔“

”آخرت کی بربادی سے تیرا کیا مطلب ہے؟“ حیدر علی کے لہجے سے آمریت بھگ رہی تھی۔

”جب مرشد کا حکم نہیں مانا تو آخرت برباد ہو گئی۔“ الیاس ترمذی نے بڑی جرأت دے باکی کے ساتھ جواب دیا۔

”بے شک! تو عبدالرحمن شاہ کالائق مرید ہے۔“ والی میسور مسکرانے لگا۔ ”مجھے تیرا امتحان مقصود تھا اور تو اپنے امتحان میں کامیاب قرار پایا۔ میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ تجھے صاف صاف کلام اور امانت دار لوگ بھی میری مملکت میں موجود ہیں۔“ اس کے بعد حیدر علی نے الیاس ترمذی کو اپنی عدالت عالیہ کا رکن بنالیا۔

سرنگاپٹم کے قیام کے دوران حیدر علی کو اس کے مصاحبوں اور مشیروں نے راجہ کرنا بارے میں بھی اطلاعات بہم پہنچائیں۔ جنہیں سن کر والی میسور نے بے ساختہ کہا۔

”میں نے معاف کر دیا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ قدرت تو اس کے ایک ایک ظلم حساب کر رہی تھی۔“



سرنگاپٹم میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد والی میسور حیدر نگر پہنچا اور کچھ دن بعد اس نے ریاست چتلد رگ پر حملہ کر دیا۔ مضافات کا علاقہ آسانی سے فتح ہو گیا مگر پانچ مہینے کے طول محاصرے کے باوجود قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ آخر حیدر علی محاصرہ اٹھا کر چتلد رگ سے ریاست شاہ نور کی طرف بڑھا۔ نواب عبدالحکیم خان، شاہ نور کا حاکم تھا۔ جب مرہٹوں نے حیدر نگر پر چڑھائی کی تھی تو نواب عبدالحکیم نے بھی ایک فوجی دستہ مرہٹوں کی مدد کے لئے روانہ کیا تھا۔ حیدر علی اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے ایک قاصد کے ذریعے شاہ نور کے حاکم کو پیغام بھیجا تھا۔ ”ایک مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ مصیبت کے وقت وہ اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر کافروں کے ساتھ تعاون کرے۔ اگر تم میری حمایت نہیں کر سکتے تو خاموش بیٹھے رہو۔“

نواب عبدالحکیم خان نے والی میسور کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا۔

”انقلاب کے تیوروں اور موسم کے اشاروں کو پہچاننا ہی سیاست ہے اور سیاست میں نہ کوئی رشتہ ہوتا ہے اور نہ کوئی عقیدہ۔ اگر تم مجھے پیشوا مادھوراؤ سے زیادہ دے سکتے ہو تو معاملات طے کر لو۔ ورنہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دو۔“

والی میسور نے نواب عبدالحکیم خان کو دوسرا پیغام بھیجا مگر یہ پیغام پہلے پیغام سے بہت مختلف تھا۔



”ہم تمہاری سعادت مندی اور وفاداری سے بہت خوش ہیں۔ عنقریب تم حیدر علی کو ایک ٹکٹ خوردہ انسان کی حیثیت سے ساری دنیا کے سامنے رسوا ہوتے ہوئے دیکھو گے۔“

پھر جب مادھوراؤ، شاہ نور کے گرد و نواح میں پہنچا تو نواب عبدالحکیم خان نے اپنا ایک بہترین فوجی دستہ اس کے حوالے کر دیا۔ چند روز کا راجہ بھی ایک بار حیدر علی سے ٹکست کھانچکا تھا۔ اس لئے وہ بھی اپنی ٹکست کا انتقام لینے کے لئے پیشوائے پونا کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔

ان دونوں حلیفوں کے تعاون نے مادھوراؤ کی فوجی طاقت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ پیشوائے پونا اپنی جنگی حکمت عملی کے مطابق سب سے پہلے ”سرا“ کے علاقے پر حملہ آور ہوا۔ یہاں کا منتظم میر علی رضا خان تھا۔ حیدر علی کے اس معتد سپہ سالار کو مادھوراؤ کی بے پناہ فوجی طاقت کا اندازہ تھا مگر اس نے مرہٹوں کی ٹڈی دل فوج سے خوف زدہ ہو کر ہتھیار نہیں ھینکے۔ وہ اپنی قلیل فوج اور دیگر محدود وسائل کو سمیٹ کر پورے طمطراق کے ساتھ میدان میں صف آرا ہوا۔ جب دونوں لشکروں میں کوئی توازن ہی نہیں تھا تو پھر مقابلہ بھی یکطرفہ ثابت ہوا۔ میر علی رضا خان نے چار دن تک بڑی مردانگی کے ساتھ مادھوراؤ کا مقابلہ کیا مگر افرادی قوت کی کمی نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ مادھوراؤ سے صلح کرنے سے پہلے میر علی رضا خان نے والی میسور کے نام ایک طویل خط لکھا اور اپنے ایک معتد خاص کو سرنگاپٹم کی طرف روانہ کر دیا۔

”نواب بہادر! میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ اپنے تمام سپاہیوں کو اس جہنم کی خوراک بنادوں جو مادھوراؤ نے بے پناہ طاقت کے ذریعے دھکایا ہے یا پھر سر جھکا کر اچھی ساعتوں کا انتظار کروں۔ آپ کے جاہ و جلال کی قسم! میسور کے جاں نثاروں پر بڑا برا وقت آچکا ہے۔ میں نے اس وقت کوٹا لے کے لئے ہتھیار رکھ دیئے ہیں اور پیشوائے پونا کی ہر شرط تسلیم کر لی۔ اگر زندہ بچا تو دوبارہ حضور والا کی ہم رکابی کا شرف حاصل کر لوں گا۔ ورنہ اپنے اس دیرینہ خدمت گار کو معاف فرما دیجئے گا۔“

اس کے بعد میر علی رضا خان نے ”سرا“ کا قلعہ مادھوراؤ کے حوالے کر دیا اور خود پیشوائے پونا کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ ایک انتہائی ذلت آمیز معاہدہ تھا لیکن میر علی رضا خان نے وقت کی نزاکت کے پیش نظر یہ رسوائی بھی گوارہ کر لی۔ اگر سالار میسور، مادھوراؤ کی یہ شرط تسلیم نہیں کرتا تو ہزاروں مسلمان سپاہی تہ تیغ کر دیئے جاتے۔ میر علی رضا خان ایک غیرت مند انسان تھا۔ اگر تھا اس کی ذات کا معاملہ ہوتا تو وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر لیتا اور پیشوائے پونا کے سامنے ایک درباری کی حیثیت سے ہرگز کھڑا نہ ہوتا۔ لیکن اس نے اپنے سپاہیوں کو بچانے کے لئے دستارِ فضیلت، مادھوراؤ کے قدموں پر رکھ دی اور اپنی انا کو فروخت کر ڈالا۔

”سرا“ پر قابض ہونے کے بعد مرہٹے ”مدگرگی“ کی طرف بڑھے اور حیدر علی کے اس قلعے کو بھی تحیر کر لیا۔ میر علی رضا خان کے قاصد کی سرنگاپٹم آمد کے کچھ دن بعد ہی والی میسور کے

یہ حیدر علی کے اقتدار کے لئے بڑا سنگین خطرہ تھا۔ پیشوائے پونا، مادھوراؤ ایک طویل عرصے سے علاقائی سیاست کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک حیدر علی ایک عام ساحلر ہے جس کی فوجی طاقت علاقے کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مادھوراؤ بھی اپنی سوچ میں تبدیلی پیدا کرتا رہا۔ اس نے کئی بار مختلف بہانوں سے میسور پر لشکر کشی کی کوشش کی۔ مگر حیدر علی نے بڑی ذہانت سے پیشوا مادھوراؤ کے اس منصوبے کو نام نہاد اور اس متعصب مرہٹے کو صرف پونا تک محدود رکھا۔

ایک بار حیدر علی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرہٹے ”حیدر نگر“ پر قابض بھی ہو گئے تھے لیکن خوفناک بارشوں اور وبائی بیماریوں نے انہیں پونا واپسی پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر بہر آنا فانا والی میسور کی فتوحات میں اضافہ ہونے لگا اور ملابار کے علاوہ شاہ نور کا علاقہ بھی حیدر علی کے زیر نگین آ گیا تو مادھوراؤ اس طرح گھبرا کر اٹھا جیسے کوئی شخص بھیاں تک خواب دیکھتے دیکھنے اچانک جاگ اٹھتا ہے۔ اب پیشوائے پونا کو اندازہ ہوا کہ حیدر علی سیاست کا آتش فشاں ہے جس کی طاقت کا لاوا زیر زمین مسلسل پک رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ پھٹ کر پورے علاقے کو زیر و زبر کر دے، اس کی موجودہ شدت کو کم کرنا ضروری ہے۔ یہی سوچ کر مادھوراؤ نے ریاست میسور کی مکمل تباہی کا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

پیشوا کے جذبات کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مادھوراؤ نے اپنی تمام عسکری طاقت اس جنگ میں جھونک دی تھی۔ پونا کی ذاتی اور باقاعدہ فوج دو لاکھ دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ قدیم ہتھیاروں کے ذخیرے کے ساتھ مادھوراؤ کے پاس ایک بڑا توپ خانہ بھی تھا۔ پونا سے روانگی کے وقت پنڈاروں کی بے قاعدہ فوج بھی اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ مختصر مادھوراؤ کی فوجی طاقت اور نواب حیدر علی کی عسکری قوت میں بظاہر کوئی توازن نہیں تھا۔ اس لئے پیشوائے پونا قبل از وقت ہی فتح کے نشے سے سرشار کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

شاہ نور کے حاکم نواب عبدالحکیم خان نے ایک بار پھر حیدر علی سے کئے ہوئے تمام عہد بیان توڑ ڈالے۔ وہ ایک دنیا دار اور انتہائی خود غرض انسان تھا۔ ملت اسلامیہ سے زیادہ اسے ذاتی منافع تھا اور اسی لئے وہ ہندوؤں سے ساز باز کر کے ایک لائق اور ذہین مسلم حکمران کو تباہ و برباد دیکھنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی نواب عبدالحکیم خان کو مادھوراؤ کی پیش قدمی کی اطلاع ملی، اس نے اپنے قاصد کے ذریعے پیشوائے پونا کو پیغام بھیجا۔

”حسب سابق میرے تمام تر وسائل آپ کے لئے حاضر ہیں۔ میں تو بس حیدر علی کو ذلیل و رسوا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

مادھوراؤ کو اور کیا چاہئے تھا۔ مسلمان، مسلمان کے خلاف تلوار کھینچ رہا تھا۔ پیشوائے پونا نے اختلاف کی اس آگ کو اور ہوادے دی۔

جاسوسوں نے مادھوراؤ کی مسلسل پیش قدمی کی خبریں دیتے ہوئے کہا۔

”پیشوائے پونا کی فوجوں کا کوئی شمار نہیں۔ انسانی سروں کا ایک سمندر ہے، جس کے سامنے کوئی دیوار کھڑی نہیں کی جاسکتی۔ اس بار مرہٹوں کے عزائم خوف ناک ہیں۔ مقامی ہندو صرف اس امید پر انہیں تمام سہولتیں فراہم کر رہے ہیں کہ پیشوا مادھوراؤ، مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دے گا۔“

جاسوسوں نے مصلحتاً مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کی بات کی۔ ورنہ ان کا درپردہ اشارہ نواب حیدر علی کی طرف تھا۔

اپنے جاسوسوں کی تکلف آمیز گفتگوں کو والی میسور برہم نظر آنے لگا۔

”تمہاری زبانوں نے جھوٹ بولنا کب سے سیکھ لیا؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مادھوراؤ میرا خاتمہ چاہتا ہے۔“

”ہمارا مشاہدہ یہی ہے نواب بہادر!“ جاسوسوں نے ایک بار پھر حقیقت بیانی سے گریز اختیار کیا۔

”تمہاری بیٹائی میں انتشار برپا ہو چکا ہے، اس لئے تمہارے سارے مشاہدات ناقابل اعتبار ہیں۔“ نواب حیدر علی کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ نواب عبدالحکیم خان پیشوائے پونا کا ساتھ دے رہا ہے؟ اور کیا وہ مسلمان نہیں ہے؟“ جاسوسوں نے عنادمت کے ساتھ سر جھکا لیا۔

”اگر مسلمان اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر لیتے تو مغلوں کی عظیم الشان سلطنت ماضی کا ایک افسانہ بن کر نہ جاتی۔“ حیدر علی کے لہجے سے غصہ بھی جھلک رہا تھا اور تاسف بھی۔ ”میں انہیں ان کا عہدِ گم گشتہ واپس دلانا چاہتا ہوں مگر یہ اہل ہند کی غلامی پر رضامند ہو چکے ہیں۔ اے خدا! مجھے صبر و استقامت دے اور ان عاقبت ناندیشوں کو ہدایت۔“

”اب کیا ہوگا نواب بہادر؟“ سیاسی مشیروں کے چہروں اور آوازوں سے شدید مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

نواب حیدر علی اپنے اراکینِ سلطنت کے اس سوال کا مفہوم سمجھ گیا تھا مگر پھر بھی اس نے اتمامِ جنت کے لئے پوچھا۔ ”آخر تم لوگ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”ہماری ناقص رائے میں یہ خوف ناک مسئلہ جنگ کے ذریعے حل نہیں ہو سکتا۔“ گنگو کرتے وقت سیاسی مشیروں کی زبان لڑکھڑاہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نواب حیدر علی تم ہستی کی باتیں سننے کا عادی نہیں تھا۔

”پھر کس طرح حل ہوگا؟“ والی میسور کے لہجے میں غیر معمولی ٹھہراؤ تھا۔

”ہمیں اس گراں وقت کو ٹالنے کے لئے مادھوراؤ سے صلح کی بات کرنی چاہئے۔“ سیاسی مشیروں نے ڈرتے ڈرتے اپنی تجویز کی وضاحت کی۔ ”جیسا کہ میر علی رضا خان نے ہوں

ہندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آپ کو بھی بچا لیا اور اپنے سپاہیوں کی جاں بخشی کی ضمانت بھی حاصل کر لی۔“

”علی رضا خان کن حالات سے دوچار تھا؟ یہ بات وہ خود جانتا ہے۔ مگر پھر بھی ہم سب کو خبر ہے کہ وہ محصور ہو چکا تھا۔ اسی لئے مجھ پر اس کا یہ معاہدہ گراں نہیں گزرا۔“ ایک بار پھر والی میسور کے لہجے سے ناگواری کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ”مجھ میں اور علی رضا خان میں بڑا فرق ہے۔ دو دو لاکھ سے زیادہ فوج کے نرغے میں گھر چکا تھا لیکن میں ابھی تک آزاد ہوں۔ پھر مجھے دلت سے پہلے پیشوائے پونا کی غلامی پر رضامند ہونے کا مشورہ کیوں دیتے ہو؟“

”نواب بہادر! صلح اور غلامی میں بڑا فرق ہے۔“ سیاسی مشیروں نے گھبرا کر کہا۔ ”معاذ اللہ! ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ مادھوراؤ کے سامنے اپنی آزادانہ حیثیت سے محروم ہو جائیں۔“

”بے شک! صلح اور غلامی میں بڑا فرق ہے مگر تم سیاست کے اس قلعے سے واقف نہیں کہ جب شکاری گھر سے نکلتا ہے تو وہ اپنے شکار کو سنبھالنے کی مہلت نہیں دیتا۔ اس وقت مادھوراؤ کی حیثیت بھی اس شکاری کی سی ہے جو میری لاش دیکھ کر مطمئن ہو گا۔ مجھے زنجیر غلامی پہنا کر آسودگی حاصل کرے گا۔ اس کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔“

”امورِ مملکت کو نواب بہادر ہم سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔“ سیاسی مشیروں نے عاجز آ کر گریں نہ کریں۔ والی میسور کی اس دلیل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”ابھی میں آزاد ہوں، اس لئے مادھوراؤ کا مقابلہ کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔“ نیم کی فوجات اور کثرتِ افواج کی خبریں سننے کے بعد بھی نواب حیدر علی کے لہجے میں وہی باورِ جلال تھا۔ ”جب تھک کر گر جاؤں تو پھر سوچوں گا کہ پیشوائے پونا سے صلح کی جاسکتی ہے یا نہیں؟“

اس کے بعد والی میسور نے اپنی تمام فوجوں کو جمع کیا اور سرنگا پنم سے جنگجو روانہ ہوا۔ پھر سالار محمد علی کیدان اور شجاعت خان بھی والی میسور کے ہمراہ جنگجو جانا چاہتے تھے مگر حیدر علی نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا۔ ”سرنگا پنم کو خانی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اگر تم لوگ بھی چلے گے تو اس علاقے کا دفاع کون کرے گا؟“

”مجھے اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا نواب بہادر! کہ میں اس معرکہ آرائی میں آپ کے دوش بند نہیں تھا۔“ محمد علی کیدان نے انتہائی افسردہ لہجے میں کہا۔

”اب تو ایسا لگتا ہے محمد علی! کہ ہم لوگ صرف جنگ کرنے ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔“ والی میسور کے ہونٹوں پر ایک شکستہ و شاداب مسکراہٹ تھی۔ ”جب اللہ کی مرضی یہی ہے تو پھر ایک موسم کے کھوجانے پر اتنا افسوس کیوں؟ خوزیری کے بے شمار موسم آئیں گے۔ اپنے دل کی تمام حسرتیں نکال لیں۔ تو میرا دماغ ہے محمد علی! اس لئے میں تجھے سرنگا پنم میں جھوڑے جا رہا

اس طرح ادا کریں گے کہ دشمن کبھی ہماری پشت نہیں دیکھے گا۔ سپاہیوں کی ہر شور آوازیں پورے قلعے میں گونج رہی تھیں۔ ”اور ہم بھی آپ کی طرح خائف نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے کاندھوں پر ہمارے سر باقی نہ رہیں اور مادھوراؤ ہماری لاشوں سے گزر کر قلعے میں داخل ہو جائے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے نواب بہادر کی امانت، پیشوائے پونا کے حوالے کر جائیں۔“

سپاہیوں کی یہ جاں نثاری ادا دیکھ کر سردار خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں ایک خوش نصیب امیر لشکر ہوں کہ جس کا ہر سپاہی امانت دار ہے، وفائے شہادت کا اعلیٰ ترین منصب عطا کرے۔“

یہ کہہ کر سردار خان نے اپنی نشیمن پر بیٹھ کر لی۔ اس کے ساتھ ہی قلعے کی فضا ہزاروں گولہ باریوں کی جھنکار سے گونج اٹھی۔ راجہ چلدرگ کے سپاہی خفیہ راستے سے قلعے میں داخل ہو رہے تھے اور سردار خان کے سپاہی انہیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ مگر کب تک؟ آخر دشمن کے چند سپاہی لڑتے لڑتے قلعے کے پچھلے دروازے تک پہنچ گئے۔ سردار خان نے صدر دروازے پر مابین زخموں کا پہرہ لگا دیا تھا مگر وہ اس ہنگامہ دار و گیر میں عقبی دروازے کی حفاظت نہ کر سکا۔ نتیجتاً راجہ چلدرگ کے سپاہیوں نے قلعے کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور آنا فانا ہزاروں سپاہی قلعے میں داخل ہو گئے۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے موت کا بازار گرم ہو گیا۔ سردار خان کے سپاہیوں نے ہزاروں مرہٹے فوجیوں کو تہ تیغ کر دیا اور خود بھی جام شہادت پی کر سو گئے۔ اس جنگ کے دوران مادھوراؤ کے نائب چیف کراٹھان کرتے رہے۔

”اگر تم لوگ ہتھیار بھینک دو تو پھر تمہارے لئے اماں ہے، سلامتی ہے۔“

”اللہ کی رحمت کے سوا کہیں کوئی امان نہیں، کہیں کوئی سلامتی نہیں۔“ مسلمان سپاہی بھی با آواز بلند جواب دیتے رہے۔ نہ ان کے حوصلے پست ہوئے اور نہ ان کے بازوؤں کی گردش میں کوئی کمی آئی۔ بہت دیر تک کاروبار قتال جاری رہا۔ پھر جب مادھوراؤ کی فوج نے قلعہ ماگڑی پر غلبہ و اختیار حاصل کیا تو ایک بھی مسلمان سپاہی زندہ حالت میں نہیں تھا۔ جگہ جگہ جلاہن فوجیں کنکن پہنے خاموش پڑے تھے۔ ان کی روضوں پر واز کر چکی تھیں اور جسم شہادت کے ٹکڑے ٹکڑے کے بعد بے حس و حرکت ہو گئے تھے۔

پیشوا مادھوراؤ کے دل میں یہ حسرت ہی رہ گئی کہ وہ کسی مسلمان سپاہی کو زندہ گرفتار کر کے اس کے سامنے اپنے غرور و کبر اور جاہ و جلال کا مظاہرہ کرتا۔ بس ایک سردار خان تھا جو دشمنوں سے چور زمین پر پڑا سسک رہا تھا، مادھوراؤ کے سپاہی اسے اٹھا کر لے گئے۔ اور جب علاقے کے بعد سردار خان اس قابل ہو گیا کہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے تو پیشوائے پونا نے اسے اپنے سامنے طلب کرتے ہوئے کہا۔

ہوں۔ اگر کبھی دارالحکومت پر برا وقت پڑا تو مجھے یقین ہے کہ تو دشمن کے مقابلے میں بہتر چالیں چل سکے گا۔ ورنہ محافظِ حقیقی تو صرف اللہ ہے، اس کے سوا کوئی نہیں۔“



نواب حیدر علی اپنی فوج لے کر سرنگاپٹم سے بنگلور آیا اور یہاں کے قلعے کو محکم کر لگا۔ اس کے ساتھ ہی والی میسور نے اپنے سواروں اور پٹھانوں کو حکم دیا کہ وہ ”ماگڑی“ جنگل میں چھپ کر مرہٹوں کی فوج پر مسلسل شب خون ماریں۔

مادھوراؤ تیز رفتاری کے ساتھ ماگڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں کے حاکم، سردار خان نے جب پیشوا کی یلغار کی خبر سنی تو وہ اپنی مختصر سی فوج کو لے کر میدان میں نکلا۔ سردار خان خیال تھا کہ یہ مرہٹوں کا کوئی عام سالشکر ہے جو قلعہ ماگڑی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے مگر جب انے میدان میں پیشوا کے سپاہیوں کو حشرات الارض کی طرح بکھرے ہوئے دیکھا تو وہ اپنے ہزار سپاہیوں کے ساتھ واپس پلٹا اور قلعہ بند ہو گیا۔

مادھوراؤ نے چار دن تک قلعے پر گولہ باری کی مگر دیواریں بہت مضبوط تھیں۔ اس نے پیشوائے پونا کو کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہیں ہو سکا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور مادھوراؤ نزدیک وقت کی بہت زیادہ قیمت تھی۔ اگر وہ ماگڑی کے قلعے کو فتح کئے بغیر آگے بڑھتا سردار خان جیسا شجاع حاکم اس کے لئے نئی مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ آخر چلدرگ کے راجہ اس پریشان کن مسئلے کو حل کر دیا۔ راجہ قلعہ ماگڑی کے پوشیدہ راستوں سے واقف تھا۔ ان ہی خفیہ راستوں سے اپنے سپاہی قلعے کی تفصیل پر چڑھادیئے۔ سردار خان نے یہ منظر دیکھا اپنے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

”ہم مسلمان ہیں اور جان کی بازی لگانا ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔“ سردار خان کے ہر سپاہیوں نے بیک زبان کہا۔ ”آپ کھیل شروع کیجئے۔ ہم آخری سانس تک آپ کے ماتے ہیں۔“

”اگر تم اپنی جانیں بچانا چاہتے ہو تو بچالو۔ مجھے کوئی تعرض نہیں ہوگا۔“ سردار خان کھلے دل کے ساتھ اپنے سپاہیوں سے کہا۔ ”اس قلعے میں ایک سرگم ایسی بھی ہے جو آسانی سے محفوظ راستے تک پہنچا دے گی۔“

”اور آپ کیا کریں گے؟“ سپاہیوں نے اپنے حاکم سے سوال کیا۔

”میں نواب بہادر سے کیا ہوا عہد پورا کروں گا۔“ سردار خان نے بلند آواز میں ”نواب بہادر نے یہ قلعہ میرے حوالے کیا تھا۔ پھر میں اپنی زندگی میں اسے مادھوراؤ کے حوالے کیسے کر دوں؟ یہ تو بڑی خیانت ہوگی اور سردار خان ایک خائن کی حیثیت سے زندہ نہیں چاہتا۔“

”فوج کی ملازمت اختیار کرتے وقت ہم نے بھی آپ سے یہی عہد کیا تھا کہ اپنے فرائض

جب سردار خان کو قتل میں لے جایا گیا تو اس نے مرنے سے پہلے با آواز بلند کہا۔  
”نواب بہادر! آپ کے اس غلام نے اپنا عہد پورا کر دیا۔ اہل میسور کو نہیں معلوم کہ سردار  
خان پر کیا گزری مگر دیکھئے والا خوب دیکھ رہا ہے۔“

ان کے بعد سردار خان نے اپنے رب کی کبریائی بیان کی، رسالت پر گواہی دی اور پھر اس  
طرح موت کو گلے لگایا جیسے کوئی بھروسہ فراق کا مارا اپنے محبوب سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

اس دوران نواب حیدر علی کے پیچھے ہوئے سپاہی اور پنڈارے، ماگڑی کے جنگل میں پہنچ  
چکے تھے اور مادھوراؤ کی فوجوں پر مسلسل شب خون مار رہے تھے۔ مگر اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ  
برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ پیشوائے پونا کی فوج کم و بیش ڈھائی لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ دو چار ہزار  
سپاہیوں کے مرجانے سے اس نڈی دل لشکر کی طاقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ نواب حیدر علی  
نے ماگڑی کے قلعے پر مادھوراؤ کے قبضے کی خبر بڑی اذیت کے ساتھ سنی۔ حالات لحظہ بہ لحظہ  
بگڑتے جا رہے تھے۔ مگر والی میسور نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ مستقل مزاجی کے  
ساتھ پیشوائے پونا سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

اپنی مختصر فوج کے باوجود ماگڑی کا حاکم سردار خان، مادھوراؤ کے لئے انتہائی سخت جان  
دربار ثابت ہوا تھا۔ اس سے نجات پاتے ہی پیشوائے پونا تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا۔  
اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بالاپور، کڑیہ، کولار، ملباگل اور گرم کئدہ پر قبضہ کر لیا۔

پیشوائے پونا کی مسلسل فتوحات نے ریاست میسور کی سالمیت پر اس قدر برا اثر ڈالا کہ تمام  
پانچا اور ہندو راجہ جو نواب حیدر کے زیر اثر تھے، سب کے سب خائف ہو گئے۔ گردش کا عجیب  
دانش تھا۔ والی میسور کے تمام حلیفوں نے اس طرح آنکھیں پھیر لی تھیں کہ جیسے ان کے اور  
نواب حیدر علی کے درمیان کبھی کوئی رشتہ ہی نہ رہا۔ بعض ہندو راجاؤں نے تو یہاں تک کہہ دیا۔  
”نواب بہادر! ڈوبتی ہوئی کشتی میں کوئی سوار نہیں ہوتا۔“

”کیا میں ڈوبتی ہوئی کشتی ہوں؟“ نواب حیدر علی نے اپنے سیاسی حلیفوں سے سوال کیا۔  
”یقیناً“ ہندو راجاؤں نے بڑے بے رحمانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”خوش گمانیوں کے ظلم  
سے ابھرنے لگ کر دیکھئے۔ اب اس علاقے کا حکمران پیشوائے پونا کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔“

والی میسور ان ہندو راجاؤں کے طرز عمل کی کیا شکایت کرتا جو مذہبی بنیادوں پر مادھوراؤ  
سے ہمدردی رکھتے تھے مگر حالات جبر میں حیدر علی کی ہم نوائی کرتے تھے۔ خود اس کے سیاسی  
شہنشاہ اور وزیروں کا یہ حال تھا کہ شدت خوف سے ان کی آنکھیں پھرائی ہوئی تھیں اور وہ  
لوگوں کی زبانوں سے حیدر علی کو صلح کے مشورے دے رہے تھے۔

لوہری ریاست کی فضا میں عجیب سا شور تھا۔ پیشوا مادھوراؤ کی پیش قدمی کی خبریں سن کر اعلیٰ  
لے کے ہندو اپنے اپنے گھروں سے نکل کر مندروں میں جمع ہو رہے تھے اور پوجا کے بہانے  
الٹاؤ کی کا اظہار کر رہے تھے۔

”سردار خان! آخر تو کس بنیاد پر ہماری طاقت کی نفی کرتا تھا؟ تو نے اپنا اور اپنے ساتھیوں  
کا حشر دیکھ لیا؟“

”کہاں ہیں میرے ساتھی؟“ سردار خان نے گھبرا کر پوچھا۔

”وہ سب کے سب لقمہ اجل بن گئے۔“ پیشوائے پونا نے بڑی رعوت کے ساتھ کہا  
”انہیں ہماری شمشیر قبر و جلال نے کھا لیا۔“

”موت تو ہر ذی روح کا مقدر ہے مادھوراؤ!“ سردار خان نے پیشوائے پونا کو اس طرح  
مخاطب کیا جیسے وہ اس کا ہم مرتبہ انسان ہو۔ ”وہ بھی چلے گئے، تھوڑی دیر بعد میں بھی چلا جاؤں  
گا اور پھر ایک دن تو بھی چلا جائے گا۔ اس دار فانی کا یہی قانون ہے۔ اپنے چند روزہ میرے  
پر زیادہ غور نہ کر۔ تو جس شاخ پر بیٹھ کر اپنی فتح کے نغمے گا رہا ہے، وہ عقرب کا ٹکڑی دی جائے  
گی اور برقی اجل تیرے نشین کو اس طرح پھونک ڈالے گی کہ اس کی ہر آنکھ تک باقی نہیں رہے  
گی۔ اور جس زمین پر تو اپنا تخت سجا کر خدائی دعوے کر رہا ہے، وہ بہت جلد تجھے تیرے جاو  
جلال سمیت نکل جائے گی اور پھر تیرا کوئی نام و نشان بتانے والا بھی نہیں ہوگا کہ تو کہاں سے آیا  
تھا اور کدھر چلا گیا۔“ سردار خان کے لہجے میں پیشوائے پونا سے زیادہ جلال تھا۔

مادھوراؤ ایک قیدی کی یہ گرمی گفتار برداشت نہ کر سکا۔ ”اگر تجھے اپنی زندگی عزیز ہے تو  
بہت اونچی آواز میں میری عظمت کے ترانے گا اور حیدر علی کی مذمت کر۔“

”معاذ اللہ! یہ کیسے ممکن ہے؟“ ماگڑی کا حاکم، سردار خان مسکرانے لگا۔ ”نمک خوار  
حالت میں نمک خوار ہی رہتا ہے۔ اور مجھے اس اعزاز پر فخر ہے کہ میں نواب حیدر علی خان بہادر  
کا نمک خوار ہوں اور اسی حال میں دنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا ہوں۔ مجھے پیچھے نہ مٹانے  
سے بڑی بھول ہوئی مادھوراؤ! میں وہ نہیں جو ہواؤں کے رخ کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ میں تو  
بس ایک کا ہو چکا۔ اب کوئی دوسرا میرے دل و دماغ پر حکومت نہیں کر سکتا۔ میں سو بار تیرا  
ذات اور تیرے اقتدار کی نفی کرتا ہوں۔“

والی شاہ نور، نواب عبدالکیم خان، راجہ چلندرگ اور دوسرے تمام مرہٹہ سردار ایک ذی  
قیدی کی اس جرأت و بے باکی پر حیران رہ گئے۔ انہوں نے آج تک ایسا کوئی جوان مرد نہیں  
دیکھا تھا جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کر سکے۔

سردار خان کے اس طرز عمل نے پیشوائے پونا کو سخت احساس کسری میں مبتلا کر دیا۔  
نتیجتاً مادھوراؤ بہیمانہ تشدد پر اتر آیا۔ سردار خان کے مجروح جسم کو کئی بار تازیانوں کا نشانہ بنایا۔  
اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ نواب حیدر علی کی شان میں گستاخانہ کلمات استعمال کرے۔  
سردار خان کے ہونٹ پتھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ چپ چاپ ازیتیں برداشت کرتا رہا۔  
ایک بار بھی اپنے آقا کے خلاف لب کشائی نہیں کی۔ یہاں تک کہ پیشوائے پونا نے زنج ہر  
سردار خان کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔



رہی تھی اور راجہ کرشنا کے خریدے ہوئے نو جوان گئے پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔  
 ”دیوتاؤں کے پجاریو! اپنے اپنے گھروں سے نکلو اور حیدر علی کی قیادت سے انکار کر دو۔  
 نہیں دھرنی مانتا بھی پکار رہی ہے اور راج مانا بھی۔ وہ ہندو نہیں ہے جو آگے بڑھ کر مادھوراؤ کا  
 انتقال نہ کرے۔ پیشوا عظیم ہے۔ پیشوا ہمارا نجات دہندہ ہے۔“

پیردنی خطرات کیا کم تھے کہ اچانک سرنگاپٹم داخلی انتشار کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس موقع پر  
 والی میسور کے تمام سیاسی مشیر اور فوجی افسر بدحواس نظر آرہے تھے۔ مایوسیوں کا ایسا اندھیرا تھا  
 کہ کسی کو راہ نجات نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر حیدر علی کے چہرے پر جذبات کا وہی آتش فشاں دھک  
 رہا تھا۔

”تہاری آنکھوں کی پتلیاں کیوں کانپ رہی ہیں؟ اور موت سے پہلے تم عالم نزع میں  
 کیوں گرفتار ہو؟“ والی میسور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”موت تو اپنے وقت ہی پر  
 آئے گی۔“

”موت سے نہیں، اپنی عورتوں کی بے آبروئی سے ڈرتے ہیں۔“ امرائے سلطنت نے  
 غصے لہجے میں کہا۔ ”معصوم بچوں اور ناتواں بوڑھوں کو پہنچائی جانے والی اذیتوں کے تصور سے  
 ڈرتے ہیں۔ مادھوراؤ بہت متم اور تنگ نظر انسان ہے۔“

”ہمارا دامن بھی فتوحات سے بھرا ہوا ہے۔ مگر ہم نے کامرانی کے نشے میں بے خود ہو کر  
 کبھی کی مفتوح عورت کی بے آبروئی نہیں کی، کسی بچے کے حلق پر چھری نہیں چلایا اور کسی بوڑھے کو  
 جسمانی تکلیف نہیں دی۔“ حیدر علی کا لہجہ جذباتی ہو گیا تھا۔ ”میں اپنے اللہ سے خشن نکلن رکھتا  
 ہوں۔ وہ تہاری حرم سراؤں کو رسوا ہونے سے بچالے گا۔“

اس کے بعد حیدر علی، سید اکرام بخاری کی خدمت میں حاضر ہوا۔

”سید عالی مقام! بظاہر مجھ پر اور میری حکومت پر بہت برا وقت آپڑا ہے۔ مگر اللہ کے سوا  
 کوئی نہیں جانتا کہ اس مصیبت کے پیچھے کون سی راحت پوشیدہ ہے۔“  
 ”والی میسور نے سچ کہا۔“ سید اکرام بخاری مسکرانے لگے۔ ”اہل ایمان کا یہی عقیدہ  
 ہونا چاہئے۔“

”عام مسلمان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔“ نواب حیدر علی نے بارعب مگر پُرسوز لہجے میں  
 کہا۔ ”اسی ہتھیار کے حصول کے لئے حاضر ہوا تھا۔ آپ اپنا کام کریں، میں اپنا کام کرتا ہوں۔  
 غلامانہ!“

یہ کہہ کر والی میسور تیز رفتاری سے بڑھا اور اپنے لشکر سے چلا۔ ابھی حیدر علی شہری حدود  
 سے باہر نکل نکلا تھا کہ اچانک اسے راستے میں سریتا دیوی نظر آئی۔ کیروا کپڑوں میں ملبوس ایک  
 فہم سورت جوگن۔ حیدر علی نے اسے دیکھ کر گھوڑا روک لیا اور نیچے اتر آیا۔  
 ”نئی! تو یہاں کہاں پھر رہی ہے؟ تجھے نہیں معلوم کہ درندے اس علاقے میں داخل

”حیدر علی کی حکومت بس چار دن کی مہمان ہے۔ دیوتاؤں کی کرپا سے ”رام راج“ آ کر  
 رہے گا۔“

نبی ذات کے ہندوان خبروں سے بہت زیادہ پریشان تھے۔ وہ اپنے گھروں میں چھپ کر  
 حیدر علی کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ”بھگوان! ہمارے اس دیوتا کو بچالے کہ بھگوان  
 سچا ہے اور ہمارے دکھوں میں کام آنے والا ہے۔“

نواب حیدر علی اپنوں اور بیگانوں، سب کے جذبات سے باخبر تھا۔ پھر بھی اسے نہ کسی  
 شکایت تھی اور نہ کسی سے کوئی اُمید۔ وہ صرف اپنے خدا کو پکار رہا تھا اور ایسے سنگین وقت میں بھی  
 دفاع کی جو تدبیریں ممکن تھیں، انہیں بروئے کار لا رہا تھا۔



والی میسور کے جاسوسوں نے خبر دی کہ مذکورہ علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد پیشوائے  
 سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ بڑی پریشان کن اطلاع تھی۔ حیدر علی خوب جانتا تھا کہ  
 سرنگاپٹم پر دشمن کے غلبے کے ساتھ اس کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ اور اگر وہ کسی طرح بچ بھی گیا تو  
 اس کی حیثیت ایک خانہ بدوش حکمران سے زیادہ نہیں ہوگی۔ سرنگاپٹم، حیدر علی کی ”حیات اور  
 موت“ کا مسئلہ تھا۔ اس لئے والی میسور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بنگلور سے دارالحکومت روانہ ہو گیا۔

سرنگاپٹم پہنچ کر حیدر علی نے دیکھا کہ یہاں کی تو فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ مقامی ہندوؤں  
 کے ہر گھر میں ہنگامہ جیشن برپا تھا۔ سری رنگ ناتھ کے مندر میں بھیجن گائے جا رہے تھے اور  
 نو جوان ہندو والہانہ رقص کر رہے تھے۔ کچھ دن پہلے راجہ کرشنا کے سر میں ایک چوڑا نکلا تھا  
 جس کی تکلیف سے وہ رات رات بھر چیخا رہتا تھا۔ مگر جب سے اس نے پیشوا مادھوراؤ کے محلے

کی خبر سنی تھی، وہ اپنی ساری تکلیف بھول کر راج محل سے نکل آیا تھا اور اس کے شب و روز سری  
 رنگ ناتھ کے مندر میں گزر رہے تھے۔ راجہ کرشنا کے ایماء پر سرنگاپٹم کے تمام ساڈھو، پنڈت،  
 جوگی اور برہمن مندر میں جمع تھے اور پیشوائے پونا کی فتح کے لئے پرارتھنا کی جا رہی تھی۔ اس  
 موقع پر راجہ کرشنا نے یہ منت بھی مانی تھی کہ اگر اس جنگ میں حیدر علی کو شکست ہوگی اور پیشوا  
 مادھوراؤ، سرنگاپٹم پر قابض ہو گیا تو وہ پتھر کے سب سے بڑے بت کو سر سے پاؤں تک سونے  
 میں ڈھال دے گا۔ اس کے علاوہ راجہ کرشنا کے اشارے پر ہزاروں ہندو نو جوان گلی کوچوں  
 میں نعرہ زنی کرتے پھر رہے تھے۔

”سرنگاپٹم ہمارا ہے اور ہمارا ہی رہے گا۔ ظالموں کے دن پورے ہو چکے۔ پیشوا آئے؟  
 اور ہمیں غاصبوں سے نجات دلانے لگے۔“

ان زہر آلود مذہبی نعروں کا یہ اثر ہوا کہ وہ ہندو بھی راجہ کرشنا کے ساتھ ہو گئے، جنہیں  
 ساری زندگی نواب حیدر علی نے نوازا تھا۔  
 تینوں رائیائیں لشکر، دیواجی مٹی اور کانٹا ہتھیوں پر بیٹھ کر ہندوؤں کے جلوے، قیادت کر

”چنانچہ“ سے اٹھ کر ”امباہی ورگ“ کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا تھا۔

جب ہزاروں مرہٹے زمین کی خوراک بن گئے تو مادھوراؤ کو اندازہ ہوا کہ نواب حیدر علی نذر ثابت نہیں ہو گا۔ اگر کسی طرح اس نے ریاست میسور پر غلبہ حاصل کر بھی لیا تو اس سٹائش میں اس کی نصف سے زیادہ فوج ہلاک و برباد ہو جائے گی۔ وہ شکست خوردہ حالت میں واپس جانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنی قوم کو کیا منہ دکھائے گا۔ اور دوسری طرف پیش قدمی بھی جاری نہیں رکھ سکتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں حیدر علی کے سپاہی شب خون مار کے اسے نئی شکلات سے دوچار کر دیں۔ الغرض پیشوائے پونا شدید اذیت میں مبتلا تھا کہ نواب حیدر علی نے بے مثال ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

والی میسور نے اپنے ایک قاصد کو سات لاکھ روپے نقد دے کر پیشوائے پونا کے پاس بھیجا۔ ”مرہٹوں نے میرے پورے ملک کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے، مگر اس کے باوجود مجھے جنگ جاری رکھنے میں کوئی عار نہیں ہے۔“ حیدر علی نے اپنے خط میں مادھوراؤ کو مخاطب کرتے ہوئے غریب کیا تھا۔ ”ہم دونوں جانتے ہیں کہ اس جنگ سے کسی فریق کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ مذکورہ رقم کو قبول کر لیں اور واپس چلے جائیں۔ ریاست کے معاشی حالات درست ہوتے ہی پچاس لاکھ کی مزید رقم ارسال کر دوں گا۔“

مادھوراؤ نے حیدر علی کی اس پیشکش کو غنیمت جانا اور سات لاکھ روپے لے کر پونا واپس چلا گیا۔



جب مادھوراؤ کی واپسی کی خبر سرنگاپٹم پہنچی تو مقامی ہندوؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔ راجہ کرشنا کو حیدر علی کی کامیابی سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کے سر کا پھوڑا پھوٹ کر بہہ نکلا اور سارا زہر دماغ میں اتر گیا۔ پھر وہ ایک ماہ تک جاں کنی کی حالت میں مبتلا رہ کر مر گیا۔

راجہ کرشنا کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ مجبوراً حیدر علی نے اسی خاندان کے ایک کم سن لڑکے کو راجہ کوئی بڑھا دیا۔ اس موقع پر والی میسور کے مشیروں نے اسے بہت سمجھایا کہ اس خاندان کو ریاست بدر کر کے ہمیشہ کے لئے سازشوں سے نجات حاصل کر لی جائے مگر حیدر علی نے کوئی شکرہ قبول نہیں کیا۔

”میں نے میسور کا نظام سنبھالتے وقت راجہ کرشنا سے وعدہ کیا تھا کہ میری زندگی تک اس کے خاندان کا یہ اعزاز برقرار رہے گا۔ وہ یقیناً بہت بے غیرت اور بے ضمیر تھا مگر میں تو حیا دار ہوں۔ اس لئے مجھے اپنے وعدے کا بہت لحاظ ہے۔“

سنے راجہ کا انتخاب کرتے وقت حیدر علی نے بڑا عجیب طریقہ اختیار کیا تھا۔ راجہ کرشنا کے خاندان کے تمام لڑکوں کو جمع کر کے ان کے آگے مختلف کھلونے ڈال دیئے گئے تھے، پھر حیدر علی نے ان بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہونے ہی والے ہیں۔“ حیدر علی، سریتا دیوی کو اس سنان علاقے میں دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ ”میں نواب بہادر کو رخصت کرنے آئی ہوں۔“ سریتا دیوی نے انتہائی مطمئن لہجے میں کہا۔ ”بس! میں رخصت ہو چکا۔“ سریتا کی نادانی پر حیدر علی بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔ ”مگر چلی جانا دان لڑکی! تجھے کیا معلوم کہ کیا طوفان آنے والا ہے۔“

”کوئی طوفان نہیں آئے گا نواب بہادر!“ سریتا نے کچھ ایسے لہجے میں کہا جیسے اس جذب کی حالت طاری ہے۔ ”کھٹنے والے نے یہی لکھا ہے کہ آپ کا دشمن ناکام واپس چلا جائے گا۔ مادھوراؤ ساری دنیا کی فوج جمع کر لے مگر وہ آپ پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا۔“

نواب حیدر علی، سریتا دیوی کی بات سن کر چونک اٹھا۔ کچھ دن پہلے بھی راجہ کرشنا کی یہی اور بھانجے کی پلاکت کے سلسلے میں سریتا نے قاتل کی نشاندہی کر کے پورے سرنگاپٹم کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اور آج ایک بار پھر وہی لڑکی، نواب حیدر علی کو ایک ایسی خبر دے رہی تھی جس کو کوئی بھی ذی ہوش انسان یقین نہیں کر سکتا تھا۔



پیشوا! مادھوراؤ نے چٹا منی کو اپنا صدر مقام بنایا اور وہیں خیمہ زن ہو گیا۔ پھر ایک بھاری توپ خانے کے ساتھ پچاس ہزار کالنگر سرنگاپٹم کی تحیر کے لئے روانہ ہو گیا۔ نواب حیدر علی، پیشوا کی جنگی حکمت عملی سے بے نیاز ایک طوفان برق و باد کی طرح ماگڑی کے جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر والی میسور وقت سے پہلے اپنی کہیں گاہ تک پہنچ گیا۔

مرہٹوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا حریف اپنے تمام شہروں کی سرحدوں کو لگا چھوڑ کر ماگڑی کے جنگل میں روپوش ہو جائے گا۔ مادھوراؤ کے جاسوسوں نے آخری اطلاع ملی دی تھی کہ حیدر علی بنگلور میں موجود ہے۔ اسی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیشوائے پونا نے ایک لشکر ہزار سرنگاپٹم کی طرف روانہ کیا تھا۔ مادھوراؤ کا خیال تھا کہ کسی مزاحمت کے بغیر اس کے سپاہی میسور کے دارالگوتم پر مکمل تسلط حاصل کر لیں گے۔

فتوحات کے اسی نشے کے زیر اثر جب مرہٹہ لشکر، ماگڑی کے جنگل کے قریب شب گزارا کے لئے خیمہ زن ہوا تو اسے یہ خیال تک نہیں رہا کہ اسی جنگل میں تھوڑے سے فاصلے پر نواب حیدر علی بھی دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اپنے شکار کی گھات میں موجود ہے۔ آدھی رات کے قریب والی میسور کے جاں بازوں نے اس قدر زبردست شب خون مارا کہ مرہٹوں کی پوری فوج کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جو کچھ بچے، وہ توپ خانہ اور دوسرا جنگی سامان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

یہ پیشوا! مادھوراؤ کی پہلی شکست تھی جس نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ دوسری طرف مرہٹہ فوج کا ایک اور دستہ بارہ کل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس پر بھی حیدر علی کے چہرہ پر کامیاب شب خون مارا۔ نتیجتاً بہت سے مرہٹہ سپاہی مارے گئے اور باقی سامان جنگ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ یہ دوسری شکست تھی جس نے مادھوراؤ کو بدحواس کر دیا تھا۔ مجبوراً پیشوائے پونا

ساری قیاس آرائیاں اپنی جگہ درست تھیں لیکن عام طور پر لوگ حیدر علی کی بے پناہ قوت وادائی سے واقف نہیں تھے۔ اس مرد جری نے دو سال کے مختصر سے عرصے میں اپنے ویران علاقوں کو دوبارہ باغ و بہار بنا دیا۔ جب میسور کی تعمیر نو کی خبریں انگریزوں تک پہنچیں تو کرنل ایچ نے بے ساختہ کہا۔  
 ”یہ ایک ناقابل یقین واقعہ ہے۔ مردہ سانپ پھر زندہ ہو گیا۔ یسوع مسیح اس کے ہلاکت کے بعد دوبارہ ہندوستانی عیسائیوں کو محفوظ رکھے۔“

نیز ہر سے ہندوستانی عیسائیوں کو محفوظ رکھے۔  
 نظام الملک والی دکن حیدر علی سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اس نے کسی بھی موقع پر والی میسور کی عزت و توقیر نہیں کی۔ وہ ہمیشہ حیدر علی کو غاصب سلطنت کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ حیدر علی نے کئی بار اپنا سفیر دکن کے دربار میں اس پیغام کے ساتھ بھیجا تھا۔

”بھلا! میں آپ کے اقتدار کا دشمن نہیں ہوں۔ میری نیت پر شک نہ کیجئے۔ میں سلطنت دکن کو سربز و شاداب اور ترقیوں کی انتہا پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے کلمہ گو بھائی ہیں اور میں اپنے بھائی کو کبھی زسوا دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ اس کے علاوہ مجھے ہندوستان کی آزادی بھی بہت زیادہ عزیز ہے۔ میں نے یہی بات پیشوائے پونا مادھورائ کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مردہ ایک انتہائی تنگ نظر اور متعصب ہندو ہے۔ بار بار میرے علاقوں پر لشکر کشی کرتا ہے۔ اس بات کو یہ نہیں معلوم کہ میری تباہی سے صرف فرنگیوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اگر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو تو اسے بات چیت کے ذریعے جلد از جلد دور کر لیجئے۔ یہی ہم سب کے لئے سلامتی کا راستہ ہے اور اسی میں اہل ہند کی نجات ہے۔“

یہ بڑی فراخ دلانہ پیشکش تھی مگر نظام دکن نے اسے بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا۔

”مبارک بیٹھ کر گفتگو کرنا تو کجا، میں اُس کم نسب کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ کہاں وہ

ایک نمک حرام سپاہی زادہ..... اور کہاں میں، نظام ابن نظام..... ابن نظام..... ابن نظام۔“

والی دکن کو اپنے نظام ہونے پر بڑا ناز تھا کیونکہ اس کا باپ بھی نظام تھا۔ اس کے برعکس

حیدر علی ایک معمولی فوجی افسر کا بیٹا تھا۔ اور ایک سپاہی سے ترقی کرتے کرتے والی میسور کے

غاصب تک پہنچا تھا۔ اُس کی حکومت نظام حیدر آباد کی سلطنت سے زیادہ مستحکم اور طاقتور تھی۔

والی دکن، حیدر علی کے اسی عروج سے حسد رکھتا تھا اور والی میسور کو غاصب، نمک حرام اور کم نسب

کہہ کر اپنے دل کا غبار ہلکا کر لیتا تھا۔ حالانکہ نسبی اعتبار سے نظام دکن خود ایک معمولی انسان تھا

اور دولت و حکومت کے نشے میں اس نے اپنے پریشان حال ماضی کو فراموش کر دیا تھا۔

نظام دکن کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ مغل فوج میں قمر الدین علی خان نامی ایک صوبے دار تھا۔

نب مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو قمر الدین علی خان نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور

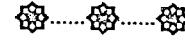
1124ء میں دکن کی تسخیر کا منصوبہ بنایا۔ مگر بہت دنوں تک یہ منصوبہ صرف اس کے دماغ ہی

میں پورٹل پاتا رہا۔ تسخیر دکن کے لئے ایک بڑی فوج اور دوسرے جنگی وسائل درکار تھے۔ آخر

”تم سب اپنی اپنی پسند کے کھلونے اٹھا لو۔“

تمام لڑکے اپنے پسندیدہ کھلونے اٹھانے لگے۔ ایک لڑکے نے تلوار اور لیون اٹھالیا۔ اُس کی یہ حرکت دیکھ کر حیدر علی بے ساختہ پکار اٹھا۔

”بے شک! تجھ میں مردانگی کے جوہر ہیں اور میرے نزدیک تو ہی راجہ بننے کے قابل ہے۔“



مادھورائ کے حملے نے ریاست کے بیشتر علاقوں کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ حیدر علی نے اسے نو تعمیر کاموں کا آغاز کیا۔ ابھی اس واقعہ کو دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ نظام دکن اور کرناٹک کے حاکم والا جاہ محمد علی نے مرہٹوں اور انگریزوں کے ساتھ مل کر میسور پر حملہ کر دیا۔

نواب حیدر علی کی ذات بیک وقت کئی حکمرانوں کے دل میں کسی کانٹے کی طرح کھک رہی تھی۔ اگر مرہٹے والی میسور کے دشمن تھے تو اس لئے حق بجانب تھے کہ ان کے اور حیدر علی کے

عقائد میں بڑا فرق تھا۔ انگریزوں کی دشمنی بھی غیر فطری نہیں تھی۔ وہ ایک جداگانہ قوم تھے اور

ایک علیحدہ مذہب رکھتے تھے۔ پھر والی میسور سے فرنگیوں کی نفرت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ برصغیر

میں حیدر علی، فرانسیسیوں کا زبردست حامی تھا اور فرانسیسی اپنے سیاسی عزائم کے باعث انگریزوں

کے بدترین دشمن تھے۔ اس لئے جو فرانسیسیوں کا دوست تھا، وہ انگریزوں کا دشمن تھا۔

فرنگیوں نے شروع میں حیدر علی کو اس لئے نظر انداز کر دیا تھا کہ اس کی کمزور سپاہیوں نے

اس علاقے میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے قابل نہیں تھی۔ مگر جب والی میسور کی فتوحات

دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا تو فرنگی بھی خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ انہیں حیدر علی کے قدموں

کی دھمک اپنے سروں پر سنائی دے رہی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدے داروں نے اس نئی سیاسی قوت کے طوفان کو روکنے کے لئے

ایک جامع منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ مگر اس منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے پیشوائے پونا مادھورائ

ریاست میسور پر چڑھ دوڑا۔ کمپنی کے عیار تاجروں نے سکون کا سانس لیا اور ایک دوسرے

مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

”تاج برطانیہ کا اقبال بلند ہو۔ پیشوائے پونا نے ہماری خواہشات کی تکمیل کر دی۔ ہم

خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ مادھورائ نے ہمارے ممکنہ دشمن حیدر علی

کو توڑ دی۔ ہم یہی تو چاہتے تھے۔ اب حیدر علی زندگی بھر سیدھا نہیں ہو سکے گا۔“

اور صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ مرہٹوں نے حیدر علی کے بہت سے علاقوں کو تباہ

تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔ انگریزوں اور مرہٹوں کے علاوہ عام لوگوں کا بھی یہی خیال تھا

نواب حیدر علی کی بقائے اقتدار تاراج ہو چکی ہے۔ اب والی میسور کی ساری زندگی روٹھ رہی ہے

گزرے گی مگر پھر بھی یہ دریدہ لباس روٹھ نہیں ہو سکے گا۔

قمر الدین علی خان نے بڑے شوق سے کھانا کھایا جیسے اُسے کوئی نعمت عظمیٰ حاصل ہوگئی ہو۔ وہ کھانے سے فارغ ہو چکا تو حضرت نظام الدین اورنگ آبادی تشریف لے آئے۔

حضرت شیخ کو کچھ قمر الدین علی خان کھڑا ہو گیا۔

”کھانا کھالیا؟..... کچھ اور چاہئے؟“ حضرت نظام الدین اورنگ آبادی نے بڑے

لفظانہ لہجے میں قمر الدین علی خان سے پوچھا۔

”بس حضور! بہت سیر ہو کر کھایا۔ اب کسی چیز کی حاجت نہیں رہی۔“ قمر الدین علی خان نے

رض کیا۔

پھر حضرت نظام الدین اورنگ آبادی نے قمر الدین علی خان کو خلوت میں طلب کر کے اس

کی حاضری کا مقصد دریافت کیا۔

قمر الدین علی خان نے دست بستہ عرض کیا۔

”حضور! تغیر دکن کا سودا سر میں سلایا ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ نہ ٹیل و علم ہے، نہ لشکر و سپاہ،

نہی حضرت شیخ کا سفارش نامہ ہی اپنا اثاثہ ہے۔ اور اسی حوالے سے دعاؤں کا طالب ہوں۔“

”قمر الدین علی خان! تیرے لئے میرے مرشد کا سفارش نامہ ہی کافی ہے۔“ حضرت نظام

الدین اورنگ آبادی نے انتہائی پرجوش لہجے میں فرمایا۔ ”خدا تجھے نصرت عطا کرے۔“ یہ کہہ کر

حضرت شیخ نے اپنی دستار سے ایک ٹکڑا پھاڑا اور اسے قمر الدین علی خان کے سر پر باندھ دیا۔

”قدرت حق سے میں بھی نظام اور تو بھی نظام۔ جا، قسمت آزمائی کر۔“

قمر الدین علی خان حضرت نظام اورنگ آبادی کی بارگاہ سے اٹھا اور اپنی مختصر سی فوج کے

ساتھ دکن پر حملہ آور ہوا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں قمر الدین علی خان نے پورے دکن کو فتح کر لیا

اور نظام الملک آصف جاہ اول کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ نظام الملک اول کی سلطنت

دو سو تیرہ سال سے ترخیابی اور کوکن سے مدراس تک پھیلی ہوئی تھی۔ نظام کی بڑھتی ہوئی طاقت

دیکھ کر انگریزوں نے اس سے تعلقات استوار کرنا شروع کر دیئے تھے۔ پھر جب فرانسیسیوں

نے مدراس پر قبضہ کرنا چاہا تو انگریزوں نے نظام الملک اول سے امداد طلب کی۔

نظام الملک اول کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا مظفر جنگ تخت نشین ہوا مگر دکن کے فتنہ

گروں نے جلد ہی اسے قتل کر دیا۔ 1751ء میں اس کا دوسرا بیٹا صلابت تخت نشین ہوا۔ صلابت

جنگ کے دور حکومت میں فرانسیسی بہت زیادہ عروج حاصل کر چکے تھے۔ اسی کے زمانے میں

انٹول نے شورش برپا کی اور سلطنت دکن کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ 1761ء میں

غلامت جنگ کے دُزیروں نے اسے قید کر لیا اور نظام الملک اول کے چوتھے بیٹے نظام علی خان

کو دکن کے تخت پر بٹھا دیا۔ خوش قسمتی سے اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے

میران میں مرہٹوں کا قلع قمع کر دیا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نظام علی خان

نے کمزور ہوئے علاقے دوبارہ اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔

ایک دن قمر الدین علی خان کے ایک دوست نے اسے مشورہ دیا کہ وہ حضرت شیخ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی کامیابی کے لئے دعا کی درخواست کرے۔ حضرت شیخ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ تھے اور ایک جہاں ان کی دعاؤں سے فیض یاب ہوتا تھا۔ قمر الدین علی خان صوفیاء کے ادب و احترام سے واقف تھا، اس لئے خاکساری کے لباس میں بڑے انکسار کے ساتھ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بجا کر اپنا مدعا بیان کیا۔ حضرت کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے، پھر بہت آمیز لہجے میں فرمایا۔

”ہم نے دکن کا علاقہ نظام الدین کے سپرد کر دیا ہے۔ تم ان سے جا کر ملو۔ وہی تمہاری درخواست پر کوئی فیصلہ کریں گے۔“

قمر الدین علی خان کو خیال گزرا کہ شاید حضرت شیخ اس بہانے سے ٹالنا چاہتے تھے اس لئے انتہائی رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”شیخ! یہ تو آپ کی کرم نوازی ہے کہ مجھے اپنی بارگاہ جلال میں حاضری کی سعادت بخشی۔ ورنہ میں اس قابل کہاں تھا؟ بہت گناہ گار و خطا کار ہوں، اس لئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں حضرت

نظام الدین مجھے اپنی بزم معرفت سے ناکام و نامراد ہی واپس نہ لوٹا دیں۔“

”پھر کیا چاہتا ہے؟“ حضرت شیخ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی نے قمر الدین علی خان سے پوچھا۔

”حضور کا سفارش نامہ چاہتا ہوں۔“ مغلیہ سلطنت کے صوبے دار نے گدرا گروں کے لہجے میں عرض کیا۔

حضرت شیخ مسکرائے۔ اور پھر اپنے مرید خاص، حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کے نام ایک ٹھیکری پر یہ عبارت تحریر کر دی۔

”کتا آ رہا ہے۔ ہڈی ڈال دو۔“

قمر الدین علی خان کسی حد تک بزرگان دین کے اشارات و کنایات کو سمجھتا تھا۔ اس لئے ان نے حضرت شیخ کی بخشی ہوئی ٹھیکری کو تین بار بوسہ دیا اور پھر اسے اپنی دستار میں رکھ کر دکن کے شہر اورنگ آباد پہنچا جہاں حضرت نظام الدین قیام فرماتے تھے۔

دن کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادی اپنے بچے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ قمر الدین علی خان نے ایک خدمت گار کے ذریعے

ٹھیکری حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچا دی۔ حضرت نظام الدین نے پیر و مرشد کا نام مانا

کھانا چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ٹھیکری کو چوما اور آنکھوں کو لگایا۔ پھر اپنے آگے سے سات روٹیاں اٹھائیں اور ان پر ایک ہڈی رکھ کر خدمت گار سے فرمایا۔

”مہمان کو کھانا کھلاؤ۔ ہم ابھی آتے ہیں۔“



نظام علی خان ایک انتہائی خود غرض اور مغرور حکمران تھا۔ اس نے نواب حیدر علی کی فرمائش کو دلانہ پیش کش کو حقارت سے ٹھکرایا اور ہر بار والی میسور کے نسب نامے پر طنز کیا۔ حالانکہ نظام علی خان خود بھی ایک صوبیدار کا بیٹا تھا مگر وہ خود کو ہمیشہ نظام ابن نظام..... ابن نظام..... ابن نظام..... کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ جیسے کئی پشتوں سے دکن کی حکومت اس کے خاندان کی جاگیر رہی ہو۔ دکن کے بیشتر باشندے اس راز سے باخبر تھے کہ قمر الدین علی خان کی حکومت حضرت شیخ عظیم الدین جہاں آبادی اور حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کی دعاؤں کا صدقہ تھی لیکن نظام علی خان نے غرور اقتدار میں اپنے باپ دادا کے ماضی کو فراموش کر دیا تھا۔

اگر نظام علی خان صرف حیدر علی کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک جاری رکھتا تو اسے ذاتی نفرت و حسد کا معاملہ کہہ کر نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ مگر اس بے ضمیر انسان نے والی میسور سے انتقام لینے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کے مفادات کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ اور نواب حیدر علی کے خیر پیغامات انتہائی رنگ آمیزی کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدیداروں کو منتقل کر دیئے۔ نظام علی خان نے کرنل اسمتھ کے نام ایک خط تحریر کرتے ہوئے کہا۔

”میں کمپنی بہادر کو بروقت مطلع کر رہا ہوں کہ ہندوستان میں انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن حیدر علی کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ اس فتنے کی سرکوبی میں کسی تاخیر کا مظاہرہ نہ کر دوں۔ سرزمین ہند پر شاہ انگلستان کے نمائندوں کا وجود تک باقی نہیں رہے گا۔“

نظام علی خان حقیقتاً انگریزوں کا دوست بھی نہیں تھا۔ وہ سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایک خوف ناک کھیل کھیل رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو خط تحریر کرنے کے بعد اس نے اپنے رازدار امراء سے کہا تھا۔

”میں فرنگیوں اور حیدر علی دونوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے صرف اپنے اقتدار کی سلامتی درکار ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ دونوں بھیڑیے آپس میں الجھ پڑیں۔ پھر وہ ہلاک ہو جائیں یا زخموں سے چور ہو کر اس قدر کمزور ہو جائیں کہ دوبارہ اٹھنے کی ہمت نہ کر سکیں۔“

”تو پھر حضور کو چاہئے کہ وقت کا انتظار کریں اور دورہ کر تماشہ دیکھیں۔“ ایک ہوش مند وزیر نے نظام علی خان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے بہر حال انگریزوں کا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ میری بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔“ نظام علی خان نے اپنے وزیر کے مشورے کے جواب میں کہا۔ ”دوسرے یہ کہ میں جلد از جلد اس صورت حال کا خاتمہ چاہتا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ تمہارا انگریزی فوج، حیدر علی کو مکمل طور پر شکست نہ دے سکے۔“ والی دکن نے اپنی خود غرضی اور نفس پرستی پر دلائل کا پردہ ڈال دیا تھا۔

نظام علی خان کی اس سازش کی خبر حمیدہ خاتون کو بھی پہنچ گئی۔ حمیدہ خاتون نظام الملک اہل کے بڑے بیٹے مظفر جنگ کی بیٹی تھی، جس کے باپ کو اقتدار سنبھالنے کے کچھ دن بعد ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ حمیدہ خاتون خاندانی اعتبار سے بھی شہزادی تھی اور شہزادیوں جیسا حسن بھی رکھتی تھی۔

نظام علی خان ایک انتہائی خود غرض اور مغرور حکمران تھا۔ اس نے نواب حیدر علی کی فرمائش کو دلانہ پیش کش کو حقارت سے ٹھکرایا اور ہر بار والی میسور کے نسب نامے پر طنز کیا۔ حالانکہ نظام علی خان خود بھی ایک صوبیدار کا بیٹا تھا مگر وہ خود کو ہمیشہ نظام ابن نظام..... ابن نظام..... ابن نظام..... کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ جیسے کئی پشتوں سے دکن کی حکومت اس کے خاندان کی جاگیر رہی ہو۔ دکن کے بیشتر باشندے اس راز سے باخبر تھے کہ قمر الدین علی خان کی حکومت حضرت شیخ عظیم الدین جہاں آبادی اور حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کی دعاؤں کا صدقہ تھی لیکن نظام علی خان نے غرور اقتدار میں اپنے باپ دادا کے ماضی کو فراموش کر دیا تھا۔

اگر نظام علی خان صرف حیدر علی کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک جاری رکھتا تو اسے ذاتی نفرت و حسد کا معاملہ کہہ کر نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ مگر اس بے ضمیر انسان نے والی میسور سے انتقام لینے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کے مفادات کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ اور نواب حیدر علی کے خیر پیغامات انتہائی رنگ آمیزی کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدیداروں کو منتقل کر دیئے۔ نظام علی خان نے کرنل اسمتھ کے نام ایک خط تحریر کرتے ہوئے کہا۔

”میں کمپنی بہادر کو بروقت مطلع کر رہا ہوں کہ ہندوستان میں انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن حیدر علی کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ اس فتنے کی سرکوبی میں کسی تاخیر کا مظاہرہ نہ کر دوں۔ سرزمین ہند پر شاہ انگلستان کے نمائندوں کا وجود تک باقی نہیں رہے گا۔“

نظام علی خان حقیقتاً انگریزوں کا دوست بھی نہیں تھا۔ وہ سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایک خوف ناک کھیل کھیل رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو خط تحریر کرنے کے بعد اس نے اپنے رازدار امراء سے کہا تھا۔

”میں فرنگیوں اور حیدر علی دونوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے صرف اپنے اقتدار کی سلامتی درکار ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ دونوں بھیڑیے آپس میں الجھ پڑیں۔ پھر وہ ہلاک ہو جائیں یا زخموں سے چور ہو کر اس قدر کمزور ہو جائیں کہ دوبارہ اٹھنے کی ہمت نہ کر سکیں۔“

”تو پھر حضور کو چاہئے کہ وقت کا انتظار کریں اور دورہ کر تماشہ دیکھیں۔“ ایک ہوش مند وزیر نے نظام علی خان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

اس خواہش کا اظہار نہ کر سکا۔ مگر جب مظفر جنگ قتل ہو گیا اور پھر کچھ دن بعد نظام علی خان قتل نہیں ہوا اور اس نے بھتیجی کے ساتھ کینیزوں جیسے سلوک کا مظاہرہ کیا تو قائم خان کو فضا اپنے دل میں سازگار نظر آنے لگی۔ پھر اسی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قائم خان نے نظام علی خان کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

والی دکن، قائم خان کے عیاشیانہ کردار سے بخوبی واقف تھا مگر اس نے یہ سوچ کر اس رشتے کو منظور کر لیا کہ قائم خان، دکن کا ایک با اثر شخص تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ ہر حال میں حمیدہ خاتون جیسی ذہین لڑکی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نتیجتاً نظام علی خان جیسے شاطر اور خوش فہم انسان نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اپنی حقیقی بھتیجی حمیدہ خاتون کو قائم خان کے ہوس کدے کی زینت بنانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ کہاں وہ انیس بیس سالہ سیم تن دوشیزہ اور کہاں وہ بیچن سالہ قائم خان، جس کے مکروہ چہرے پر ہوس پرستی اور عیاری کے سوا کوئی دوسرا رنگ ہی نظر نہیں آتا تھا۔ پھر جب نظام علی خان نے حمیدہ خاتون کی ماں سے اس رشتے کی بات کی تو وہ مظلوم عورت سنائے میں آ گئی۔ مظفر جنگ کی بیوہ رافعہ خاتون سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے شوہر کا چھوٹا بھائی اس سطح تک پستی میں اتر جائے گا اور اپنے خاندان کے ناموس کو سیاست کے مقتل میں لے جا کر ذبح کر ڈالے گا۔

پھر جب یہ خبر حمیدہ خاتون تک پہنچی تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئی اور اس نے زندگی میں پہلی بار نظام علی خان کے روبرو گستاخانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”محترم چچا! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا شرم ناک سلوک روا رکھیں گے۔ بابا جان کی موت کے بعد مجھے اپنی بیٹی کا اعتبار تو آ گیا تھا مگر پھر بھی یہ گمان باقی تھا کہ جس لڑکی کا حقیقی چچا زندہ ہو، وہ یتیم کس طرح ہو سکتی ہے؟“ حمیدہ خاتون کا سرخ دہنہ چہرہ غصے کی شدت سے دھکتے ہوئے انگارے کی مانند ہو گیا تھا۔ ”مگر آج میں مکمل طور پر یتیم ہو گئی اور آپ سے میرا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ میں نے کبھی اپنی خاندانی عظمت پر غور نہیں کیا لیکن آج آپ پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ سن لیجئے کہ میرے نزدیک قائم خان ایک ادنیٰ درجے کا غلام ہے۔ وہ بابا کی زندگی میں ان کے تلوے چائنا تھا۔ پھر اس کم نسب کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ اپنی آقا زادی کو ہوس ناک نظروں سے دیکھ سکے۔ یقیناً آپ کی حوصلہ افزائی نے اسے اُمید دلائی ہوگی ورنہ کل تک تو وہ میرے در کا کتا تھا۔“

حمیدہ خاتون کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر نظام علی خان بھی غضب ناک ہو گیا تھا۔ ”میرا حکم ہے۔“

”آج کے بعد سے میں آپ کے حکم کی تاب نہیں رہی۔“ حمیدہ خاتون کے لہجے میں وقار بھی تھا اور بغاوت کی گہری جھلک بھی۔

”میں حرف انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔“ نظام علی خان نے آخری حربہ استعمال کرنے

کہا۔ ”مجھے میرے اختیار اور قدرت کا خوب اندازہ ہے۔“

”مگر آپ کو میری غیرت و شجاعت کا اندازہ نہیں۔“ حمیدہ خاتون کے ہونٹوں سے آگ برپا رہی تھی اور آنکھوں میں نفرت و غضب کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ ”آپ کی پوری فوج مل کر بھی میرے زندہ جسم پر قابو نہیں پاسکتی۔ ممکن ہے کہ آپ کا دست جبر مجھے قائم خان کی خلوت تک پہنچا دے۔ مگر اس وقت کہ جب میری سانسوں کا شمار ختم ہو جائے۔“

اس دن کے بعد سے حمیدہ خاتون کو اپنے چچا سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ پھر جب اس نے ناکہ نظام علی خان میسور پر حملہ کرنے کے لئے انگریزوں سے ساز باز کر رہا ہے تو حمیدہ خاتون کی نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس جانباز دوشیزہ نے اپنے باپ کے ایک معتمد خدمت گار کو نواب حیدر علی کے نام ایک خفیہ پیغام دے کر سرنگاچم روانہ کر دیا۔

”آپ پر اللہ کی سلامتی ہو کہ اب آپ ہی پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے عزت و ہمنی اور اقتدار کے نگہبان ہیں۔ میرا حریص و خود غرض چچا، نظام علی خان فرنگیوں کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ میری فراہم کردہ اس اطلاع کو کسی سیاسی چال سے تعبیر نہ کیجئے گا کہ میں اُمتِ مسلمہ کے محافظ کی حیثیت سے آپ کو اپنے والد مظفر جنگ مرحوم سے بھی ظلم و برکت بھی ہوں۔ اللہ آپ کو دشمنوں کی فتنہ گری سے محفوظ رکھے اور ہر معرکہ حیات میں ہر لمحہ عطا کرے۔ جب کبھی آپ کو سیاست کی کشاکش سے نجات مل جائے تو اپنی اس بیٹی کو فریاد کر لیجئے گا، جس پر زمین دکن تنگ ہو چکی ہے اور جو اپنے ہی وطن میں ایک غریب الوطن کا زندگی گزار رہی ہے۔“

عجب کھٹ تھا۔ حیدر علی کی آنکھیں گرم غبار سے بھر گئیں اور پھر یہ غبار پانی کے قطرہوں کی شکل میں والی میسور کے چہرے پر نمودار ہو گیا۔

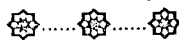
”مجھے حمیدہ خاتون کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“ خط پڑھنے کے بعد والی میسور، مظفر جنگ کے خدمت گار سے مخاطب ہوا۔

خدمت گار نے اس مظلوم دوشیزہ کی داستان الم سناتے ہوئے کہا۔

”میری آقا زادی ارض دکن میں دفن ہونا بھی پسند نہیں کرتیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ ایک آزاد مملکت میں آخری سانس لیں اور پھر اپنے خالق سے جا ملیں۔ بی بی کے نزدیک آپ مملکت کے سوا ہندوستان میں کوئی دوسری آزاد مملکت نہیں ہے۔“

نواب حیدر علی، حمیدہ خاتون کے خیالات اور کردار سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ ”میری بیٹی کو بہت بہت دعا کہنا۔“ والی میسور نے مظفر جنگ کے خدمت گار کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

”اور اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ اس کا باپ ایک دن اس تک ضرور پہنچے گا۔“



حمیدہ خاتون کے قاصد کے جاتے ہی نواب حیدر علی نے اپنے تمام فوجی افسروں کا یہ

حیات کا یقین دلایا تو وہ کھل کر اپنے سینے میں چھپا ہوا زہر اُگلنے لگا۔

”میں اسی کام کے لئے سرنگ پیٹم آیا تھا۔ لیکن یہاں میرا کوئی ہم نوا نہیں تھا۔ اس لئے چپ چاپ اپنے خیالات کی آگ میں جلتا رہا۔ آج مجھے راج گھرانے کا تعاون حاصل ہوا ہے تو ماری دنیا تماشا دیکھے گی۔ میں ریاست میسور میں ایسی آگ لگا دوں گا کہ پھر اسے کوئی نہیں بجھا سکے گا۔ بس آپ اپنے خزانے کا منہ کھول دیجئے۔ دولت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے انسانوں کا مذہب اور ضمیر خریدنا جاسکتا ہے۔“

پھر جب رانیوں نے بے دریغ دولت خرچ کرنے کا یقین دلادیا تو کرشن راؤ نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”میں رفتہ رفتہ اپنے مقصد کے لوگ حکومت میں شامل کروں گا۔ وہ جگہ جگہ سازش کی چکاریاں بوئیں گے۔ پھر چنگاریوں کی فصل پک کر شعلہ بن جائے گی اور وہ شعلہ ریاست میسور کو جلا کر خاکستر بنا دے گا۔“

حیدر علی کی حکومت میں کسی رشوت خور افسر کا گزارا نہیں تھا اس لئے کرشن راؤ مملات شاہی کا داروغہ ہوتے ہوئے بھی ایک عام سی زندگی گزار رہا تھا۔ رانیوں نے اُس کی اسی کمزوری سے ناکدہ اٹھایا اور حقیقتاً اپنے خزانے کا منہ کھول دیا۔ اب کرشن راؤ ایک راجہ جیسی زندگی گزار رہا تھا۔ بہترین شراب، لذیذ غذائیں اور خدمت کے لئے خوب صورت باندیاں۔ کرشن راؤ آن کی آن ایک داروغہ سے راجہ اندر بن گیا تھا اور راج محل کے ایک آراستہ کمرے میں بیٹھ کر اپنے آئنے نعت نواب حیدر علی کی تباہی کے منصوبے بنایا کرتا تھا۔



خفیہ اجلاس طلب کر لیا پھر جب والی میسور نے مظفر جنگ کی بیٹی کا خط پڑھ کر سنایا تو حاضرین حیرت زدہ رہ گئے اور حمیدہ خاتون کے جذبات کی تعریف کرنے لگے۔

”بے شک! وہ دختر اسلام ہے جو زمین اور نسل سے زیادہ مذہبی رشتے کو اہمیت دیتی ہے۔“ نواب حیدر علی نے اپنے فوجی افسروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطنت میسور پر حمیدہ خاتون کا احسان ہے کہ اس جاں فروش لڑکی نے اپنی زندگی کو نئے خطرے میں ڈال ہمیں دشمنوں کی ایک بڑی سازش سے آگاہ کیا۔“

”نواب بہادر نے بجا فرمایا۔“ سپہ سالار محمد علی کمیدان نے با آواز بلند کہا۔ ”ہم سب اپنی بے شکریہ گزار ہیں کہ اس نے وقت سے پہلے ہمیں ایک خوفناک سیلاب کی آمد سے خبر کیا۔ اب ہم طوفان کو روکنے کے لئے مضبوط پتے تعمیر کر سکتے ہیں۔“

پھر کئی دن کی طویل گفتگو کے بعد حیدر علی نے اپنا جنگی منصوبہ ترتیب دے دیا۔ اسی دوران آہنی پنجرے میں کھنڈے راؤ کا انتقال ہو گیا۔ جب والی میسور کو یہ خبر دی گئی وہ چند لمحوں کے لئے اُداس ہو گیا۔ پھر بڑے اثر انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

”مسلمان کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ دشمن کی موت پر جشن منائے۔ اب مجھے کھنڈے سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ نواب حیدر علی کا طوطا تھا اس لئے اس کی اترتی بھی بڑی شان اُٹھنی چاہئے۔“

پھر ایسا ہی ہوا۔ کھنڈے راؤ کی چتا کو بڑی دھوم دھام سے آگ لگائی گئی۔ کھنڈے کے مرنے پر رانی کانتا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ مگر دوسری رانیاں لکشم ما اور دیواجی مٹی، زیادہ پریشان نظر آ رہی تھیں۔ انہیں کھنڈے راؤ کی موت کا کوئی غم نہیں تھا کہ وہ سیاست بساط کا ایک پٹا ہوا مہرہ تھا اور ان کے کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔ رانی لکشم ما اور دیواجی مٹی اس اُداس رہا کرتی تھیں کہ راجہ کرشنا کے مرنے کے بعد ان کا نام نہاد اقتدار بھی ختم ہو گیا تھا۔ لئے ان دونوں کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو ایک طرف نواب حیدر علی کے حلقہ اعتبار شامل ہو۔ اور دوسری طرف میسور کو ہندو ریاست بنانے میں معاون ثابت ہو۔

آخر ایک دن رانی لکشم ما اور دیواجی مٹی کی یہ مراد بھی بر آئی۔ کرشن راؤ مملات شاہی داروغہ تھا اور حیدر علی اس پر بہت زیادہ اعتبار کرتا تھا۔ کرشن راؤ طبعاً ایک اوباش انسان تھا حیدر علی کے خوف سے کھل کر رنگ لیاں نہیں مناسکتا تھا۔ رانی لکشم ما اور دیواجی مٹی اگر فطری کمزوری سے واقف ہو چکی تھیں۔ اس لئے ان دونوں نے ایک دن کرشن راؤ کو پوجا شرکت کرنے کے بہانے سے راج محل بلایا اور اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ پھر یہ پوجا ہندو دن ہونے لگی اور رانی کانتا نے کرشن راؤ کو اپنا اسیر بنالیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نئیوں رانیاں سامنے بے نقاب ہو گیا۔ کرشن راؤ انتہائی متعصب ہندو تھا۔ مگر اکیلا ہونے کی وجہ سے کسی سامنے اپنے مفید خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جب میسور کی

پلا۔ کولار وہی جگہ ہے جہاں نواب حیدر علی پیدا ہوا تھا۔ کولار پر قبضہ ہوتے ہی والدہ جاہ محمد علی نے بڑے جذباتی انداز میں یہ نعرہ لگایا تھا۔  
”میں نے کولار کو اپنے قدموں سے روند ڈالا۔ اب حیدر علی بھی میرے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا۔“

والا جاہ محمد علی نے جشن فتح اس طرح منایا کہ کئی دن تک شراب پانی کی طرح بہتی رہی اور ذہن ہندو رقصائیں اس کے نتیجے میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہیں۔



ٹیپو سلطان نے جاتے ہی منگلور کا محاصرہ کر لیا۔ مگر فوج کی کمی کے باعث کوئی مؤثر کارروائی نہ کر سکا۔ انگریزی فوج سے چند سرحدی جھڑپیں ہوئیں، جن میں ٹیپو سلطان غالب رہا۔ فرنگی کمانڈر مائیکل رابرٹ نے یہ منظر دیکھا تو اپنے سپاہیوں کو پیغام بھیجا کہ وہ پسپا ہوتے ہوئے شہر میں داخل ہو جائیں۔ ٹیپو سلطان محض ایک پندرہ سالہ لڑکا ہے۔ وہ جذبات سے غلبہ ہو کر فتح کے نشے میں ان کا تعاقب کرتا ہوا خود بھی شہر کے اندر چلا آئے گا اور مختلف کین گاہوں میں چھپے ہوئے انگریز فوجی اسے اپنے نرغے میں لے کر گرفتار کر لیں گے۔

کمانڈر مائیکل رابرٹ کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ میسور کے ولی عہد سلطنت کو پرغال بنا کر نواب حیدر علی سے کہیں کا ہر مطالبہ تسلیم کرا لے گا۔ انگریز سپاہی اس حکمت عملی کے تحت پسپا ہوتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ٹیپو سلطان کے سپاہی انسانی فطرت کے مطابق شکست خوردہ دشمن کا تعاقب کرنا چاہتے تھے مگر ولی عہد سلطنت نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا۔

”میں نہیں جانتا کہ شہر کے اندر کی فضا کیسی ہے اور دشمن کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اس لئے کھلے میدان میں مقابلہ کرو۔ جو کچھ ہے، سامنے آ جائے گا۔“

سپاہیوں کی اکثریت نے دل ہی دل میں ٹیپو سلطان کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے ولی عہد سلطنت کے اس عمل کو ناجذبہ کاری کا نتیجہ قرار دیا۔

چند روز بعد نواب حیدر علی بھی منگلور پہنچ گیا۔ والی میسور کو اس علاقے سے زیادہ ٹیپو سلطان کی فکر تھی۔ اس نے بڑی جرأت کے ساتھ اپنے نوآموز تیراک کو آگ اور خون کے سمندر میں اتار دیا تھا کہ یہ آزمائش ٹیپو کی سپاہیانہ زندگی کے لئے ضروری تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ ایک مشق باپ کا فرض بھی تھا کہ وہ اپنے کم عمر اور ناجذبہ کاری بیٹے کی نگرانی بھی کرے۔ اسی اسی کی شدت سے مجبور ہو کر نواب حیدر علی برق رفتاری کے ساتھ منگلور پہنچا تھا۔

جنگ کی صورت حال سے باخبر ہونے کے بعد حیدر علی نے ٹیپو سلطان سے پوچھا۔  
”جب دشمن پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا تو پھر تم نے اس کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟“ یہ سوال کرتے وقت حیدر علی کا لہجہ تند و تیز تھا۔ جیسے وہ ٹیپو کے اس فیصلے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا ہو۔  
”میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کھلے میدان میں اس کا مقابلہ کیا جائے۔ میرے نزدیک

آخر وہ گھڑی آپہنچی، جس کی خبر نواب حیدر علی کو بہت پہلے مل چکی تھی۔ میسور پر حملے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور والی دکن کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا جس کی رو سے نظام علی خان نے اپنا شمالی علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد والی دکن اپنی کثیر فوج لے کر انگریزوں کے ساتھ میسور پر حملہ آور ہوا۔ انگریزی فوج میں زیادہ تر نواب ارکات والا جاہ محمد علی کے سپاہی شامل تھے اور ان کی قیادت کرنل اسمتھ کر رہا تھا۔ اتحادی فوجیں پورے زور و شور کے ساتھ بالا گھاٹ کے علاقے کی طرف بڑھیں۔

نواب حیدر علی نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک دستے کی قیادت ٹیپو سلطان کر رہا تھا۔ اس وقت ٹیپو کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ دوسرے دستے پر محمد علی کیدان تیسرے پر بخشی بیبت جنگ اور چوتھے پر میر علی رضا خان کو مامور کیا گیا۔ باقی فوج والی میسور کے ماتحت تھی۔

حیدر علی مدافعتانہ جنگ لڑ رہا تھا۔ اس نے اتحادی فوجوں کی رسد روکنے کے لئے مختلف علاقوں کو لوٹ لیا اور دشمن کے لشکروں پر شب خون مارنا شروع کر دیے۔ کرنل اسمتھ ایک دن سپہ سالار تھا۔ حملہ کرنے سے پہلے وہ حیدر علی کی جنگی حکمت عملی کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ نتیجاً اس نے ایک عجیب چال چلی اور نواب حیدر علی کی توجہ بٹانے کے لئے بمبئی کے علاقے سے ایک فوج منگلور کے ساحل پر اتار دی اور اسے حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر حیدر نگر (بدنور) پر قبضہ کر لے۔ جب نواب کو اس کی خبر ملی تو اس نے ٹیپو سلطان کو حیدر نگر کی طرف بھیج دیا۔ مغل شیراز مرزا اسد بیگ بھی اسی فوجی دستے کے ہمراہ تھا اور میان جنگ میں سائے کی طرح ٹیپو سلطان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ پھر کچھ دن بعد مشرقی محاذ کو میر علی رضا خان اور محمد علی کیدان کے ہر کر کے خود نواب بھی حیدر نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔

والی میسور اور ٹیپو کے چلے جانے کے بعد اتحادی فوجوں کو پیش قدمی کا موقع مل گیا اور انہوں نے مختصر عرصے میں دائم باڑی، لنگن گڑھ، چک دیو، دھرم پوری، کولار اور ہوسکونڈ کر لیا۔ ان فتوحات سے نواب ارکات والا جاہ محمد علی بہت مسرور تھا۔ اس نے منبوجہ علاقوں کے انتظام کے لئے ”گنتی“ کے حاکم مراری کو اپنے پاس بلا لیا اور ”کولار“ کو اپنا صدر مقرر



بعد ہرم پوری فتح ہو گیا۔  
اس کے بعد نواب حیدر علی، ہوسکوٹہ کی طرف بڑھا۔ جب کرنل اسمتھ کو یہ خبر ملی تو وہ  
بیکوٹہ کے دفاع کے لئے کولار کی سرحدوں سے باہر نکلا۔ مگر شیو سلطان اور محمد علی کیدان نے  
بیکوٹہ ہی میں روک لیا۔ آخر ایک خونریز جنگ کے بعد ہوسکوٹہ بھی فتح ہو گیا۔

راستے ہی میں روک لیا۔ آخر ایک خونریز جنگ کے بعد ہوسکوٹہ بھی فتح ہو گیا۔  
اس فتح کی خبر سنتے ہی نو عمر شیو نے لپکتے عجیب چال چلی۔ ہوسکوٹہ کے دفاع کے لئے تازہ  
انگریزی فوج منگور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شیو نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ کسی قسم کی  
راست نہ کریں اور ایک کمین گاہ میں روپوش ہو جائیں۔ پھر جیسے ہی انگریزی فوج اس کمین گاہ  
پر پہنچی، شیو کے سپاہی اس پر کسی آفت ناگہانی کی طرح نازل ہو گئے۔ بے خبری کے عالم میں  
پاکستان جملہ ناٹاشہ بدھما کہ فرنگی پسپا ہو گئے اور کرنل اسمتھ کولار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ حیدر  
علی اس وقت نری پور میں مقیم تھا۔ اسی دوران انگریزی فوج کے لئے مدراس سے سامانِ رسد آ  
افنا۔ حیدر علی کے سپاہیوں نے ہر پنہلی کے قریب اسے بھی لوٹ لیا۔

شب خون اور لوٹ مار کا سلسلہ اس قدر راز ہوا کہ اتحادی فوجیں زندگی سے بیزار نظر آنے  
لگیں۔ اچانک مرہٹہ سردار شامار او اپنی دس ہزار فوج لے کر کسی نامعلوم مقام کی طرف چلا گیا۔  
ان کے جاتے ہی دکن کے سپاہیوں پر دہشت چھا گئی اور ان کی اکثریت میدانِ جنگ سے فرار  
دے گا کہانہ تلاش کرنے لگی۔ کرنل اسمتھ بار بار نظام علی خان کو تسلیاں دے رہا تھا کہ مختصر  
ب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر تیسرے دن خبر آئی کہ مرہٹہ سردار شامار او، حیدر علی سے معاہدہ کر  
نے کو تیار ہیں۔ اس خبر نے نظام علی خان کے ہوش اڑا دیئے۔ وہ بار بار اپنے امیروں  
سے ناظم ہو کر چیخ رہا تھا۔

”اس لیرے سے صلح کی بات کرو۔ اب اسی میں ہماری نجات ہے۔“  
آخر نظام کا دیوان رکن الدولہ ایک صلح نامہ تیار کر کے نواب حیدر علی کی خدمت میں حاضر  
ہوا۔

والی میسور نے صلح نامہ شیو سلطان کی طرف بڑھا دیا۔ جب ولی عہد سلطنت صلح نامے کا  
ادھ بڑھ چکا تو حیدر علی نے شیو کے ہاتھ سے کاغذ لے کر رکن الدولہ کے سامنے پھینک دیا۔

”نظام سے کہو کہ پہلے مظفر جنگ کی بیوہ رافعہ خاتون اور اس کی بیٹی حمیدہ خاتون کو  
مناقتہ سرنگاپٹم پہنچانے کے انتظامات کرے۔ پھر اس کے بعد کسی صلح نامے پر گفتگو ہو سکتی  
ہے۔ اور وہی میدانِ جنگ ہوگا، وہی شہسوار ہوں گے، وہی تیر و تفتنگ ہوں گے، وہی شمشیریں  
بلوں کی اور وہی انسانی سر ہوں گے۔“

جب نظام علی خان والی دکن نے صلح کے لئے نواب حیدر علی کی بنیادی شرط سنی تو وہ غصے  
سے پاگل ہو گیا اور ہندیائی انداز میں چیخنے لگا۔

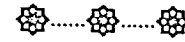
”اُس کم نسب کو رافعہ خاتون اور حمیدہ خاتون کے نام کس طرح معلوم ہوئے؟ کیا ہماری

انجان راستے پر آگے بڑھنا دانش مندی نہیں۔“ شیو نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ مگر اس کے  
ایک ایک لفظ سے اپنی ذات پر اعتماد کا اظہار ہو رہا تھا۔  
بیٹے کا جواب سن کر حیدر علی مسکرانے لگا۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم پہلے امتحان میں کامیاب ثابت ہوئے۔ تمہارا فیصلہ درست تھا۔“  
اگرچہ حیدر علی، شیو کی مدد کو آپہنچا تھا لیکن اس کے پاس بھی اتنی فوج نہیں تھی کہ وہ منگور  
میں داخل ہو کر قلعہ کا محاصرہ کر سکے۔ مجبوراً والی میسور نے کچھ دن تک منگور کے نواح میں قیام  
کیا اور اس دوران آٹھ ہزار سپاہی ملازم رکھے۔ یہ سپاہی فوجی جنگ سے واقف نہیں تھے مگر  
فطرتاً جرات مند اور بہادر تھے۔ چند روز تک انہیں بندوق چلانے کی مشق کرائی گئی، پھر آٹھ  
ہزار سپاہیوں کو ہندوؤں اور مختلف رنگوں کے جھنڈے دے کر منگور کی طرف بڑھا دیا گیا۔ حیدر  
علی نے اس نمائشی فوج کو چار دستوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ہر دستہ دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔  
یہ چاروں دستے مختلف سمتوں سے منگور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے جھنڈوں اور دیگر  
نشانیوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ مختلف فوجیں ہیں جو شہر کے محاصرے کے لئے پیش قدمی کر  
رہی ہیں۔

کمانڈر مائیکل رابرٹ نے یہ منظر دیکھا تو بدحواس ہو گیا اور قلعہ چھوڑ کر واپسی کی تیاریاں  
کرنے لگا۔ جب شیو کو اس صورت حال کی خبر ہوئی تو وہ اپنے فوجی دستے کے ساتھ شہر میں داخل  
ہو گیا اور پوری طاقت کے ساتھ قلعے پر حملہ کر دیا۔ مائیکل رابرٹ اپنی فوج کو لے کر قلعے کے  
عقبی دروازے سے باہر نکلا اور انتہائی سراسیمگی کے عالم میں جہاز پر سوار ہو کر سمیٹ فرار ہو گیا۔  
انگریز سپاہی اپنا سارا ساز و سامان قلعے میں چھوڑ گئے تھے جس پر شیو سلطان نے قبضہ کر لیا۔  
”فرزند! تمہیں پہلی فتح مبارک ہو!“ حیدر علی نے شیو کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”بابا محترم! یہ سب اللہ کا کرم ہے اور آپ کی تربیت کا فیض ہے۔“ شیو نے بھدا افسار کہا۔  
حیدر علی نے بہت غور سے شیو کی طرف دیکھا۔ ولی عہد سلطنت کے چہرے پر غور کا  
شائبہ تک نہ تھا۔



منگور کی مہم سے فارغ ہو کر نواب حیدر علی، شیو سلطان کے ساتھ مشرقی حجاز کی طرف  
پلٹا۔ اس وقت انگریزی فوج نری پور میں مقیم تھی اور اس کے قریب ہی مراری راؤ خیمہ زن تھا۔  
نواب حیدر علی نے اچانک اس پر شب خون مارا اور بہت سامان و اسباب لوٹ کر سات گزہ کی  
طرف روانہ ہو گیا۔ اسی اثناء میں انگریزی فوج کے ایک دستے نے مدراس سے نکل کر جنوب  
میں ڈنڈیلگ اور دھاراپور پر قبضہ کر لیا۔ اس خبر کے ملتے ہی نواب حیدر علی نے شیو سلطان کو کرنل  
اسمیتھ کے مقابل چھوڑا اور خود ہرم پوری کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں انگریزی فوج کے  
لئے چار ہزار بیلوں پر سامانِ رسد جا رہا تھا۔ حیدر علی نے اسے لوٹ لیا اور پھر ایک مختصر جنگ

رہتی تھی ہے، میں ان دونوں کو نظام علی خان کی قید سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ اگر وہاں کی کوٹھ کے لئے میری یہ شرط منظور نہیں تو وہ کچھ دن انتظار کرے۔ وقت خود فیصلہ کر دے گا۔“ دیوان رکن الدولہ واپس چلا گیا اور اس نے والی دکن کو ایک ایک بات سے آگاہ کر دیا۔

”رافعہ خاتون اور حمیدہ خاتون نے خود نواب حیدر علی کو مدد کے لئے پکارا ہے۔“

مجدور نظام علی خان نے گھٹنے ٹیک دیئے، پھر ایک برق رفتار قاصداً اس حکم کے ساتھ حیدر آباد پہنچا کہ رافعہ خاتون اور حمیدہ خاتون کو بحفاظت سرنگا پٹم پہنچا دیا جائے۔ رافعہ خاتون نے نظام علی خان کا یہ حکم سنا تو دنگ رہ گئی۔

”کیا اب وہ ستم گر ہمیں غیروں کے ہاتھ بیچ رہا ہے؟“ رافعہ خاتون کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔

”نہیں مادر گرامی!“ حمیدہ خاتون جوش جذبات میں ماں سے لپٹ گئی تھی۔ ”میں نے کچھ دن پہلے والی میسور کی خدمت میں درخواست پیش کی تھی کہ وہ ہمیں رسوائی کے اس زنداں سے نجات دلائیں۔ شاید میری درخواست منظور ہو گئی ہے اور نواب حیدر علی ہماری مدد کو آ رہے ہیں۔“

رافعہ خاتون، بیٹی کی زبانی حقیقت حال سے واقف ہوئی تو اس نے جین کا سانس لیا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

”خدا نواب حیدر علی خان کو جزائے خیر دے۔ ان کے بارے میں جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔“

سرنگا پٹم روانہ ہونے سے پہلے رافعہ خاتون اور حمیدہ خاتون، مظفر جنگ کی قبر پر حاضر ہوئیں۔ عجیب ویرانی کا عالم تھا۔ پورا مقبرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور جگہ جگہ کڑیوں نے چالے تان دیئے تھے۔ نہ کوئی گھراں تھا، نہ کوئی چاروب کش اور نہ سر شام کوئی چراغ جلائے والا۔

نواب مظفر جنگ کا مقبرہ، ملکہ ہند نور جہاں کے مزار کی تصویر نظر آ رہا تھا۔

برمزار ماغریباں، نے چرائے، نے گلے

نے پر پروانہ سوز، نے صدائے بلبل!

(ہم غریبوں کے مزار پر نہ کوئی چراغ روشن کرتا ہے اور نہ کوئی پھول چڑھاتا ہے۔ نہ ہاں کوئی پروانہ آ کر اپنے پر جلاتا ہے اور نہ کسی بلبل کی صدا سنائی دیتی ہے۔)

رافعہ خاتون شوہر کی قبر کی یہ حالت دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی اور پھر بہت دیر تک مظفر جنگ کے پہلے جان قدموں سے لپٹی روٹی رہی۔ حمیدہ خاتون کی بھی یہی کیفیت تھی۔ بہت دیر تک ان کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری رہا، پھر کچھ حالت سنبھلی تو ماں اور بیٹی نے مظفر جنگ کی قبر کو منان کیا، پھول چڑھائے اور چراغ جلا دیا۔

رخصت ہوتے وقت حمیدہ خاتون نے بڑے عجب سے لہجے میں باپ کی قبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”بلبل! اب میں اس وقت تک اس زمین پر قدم نہیں رکھوں گی، جب تک آپ کی قبر نظام

صفوں میں بھی اس کے جاسوس موجود ہیں؟ آخر وہ ہماری عزت تک بھادوچ اور بھیجی کا مطلب گار کیوں ہے؟“ نظام علی خان اپنے دیوان رکن الدولہ پر برس پڑا۔ ”یہ غلیظ مطالبہ سننے کے بعد تو نے اس کے منہ پر تھوک کیوں نہیں دیا؟“

”حضور! ہوش کی باتیں کریں۔“ دیوان رکن الدولہ نے والی دکن کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”شکست ہمارے دروازے تک آپہنچی ہے۔ ایسی سنگین فضا میں ہماری زبان سے ادا ہونے والا ایک بھی حرف گرم نواب حیدر علی کے غصے کی آگ بھڑکا سکتا ہے۔ اور پھر یہ آگ کہاں تک پھیلے گی، اس کا کسی کو اندازہ نہیں۔“

”کیا میں اپنے ناموس کو حیدر علی کے حوالے کر دوں؟“ ایک تو اپنے منصوبے کی ناکامی کا صدمہ، دوسرے والی میسور کا عجیب مطالبہ، نظام علی خان رکن الدولہ کے سمجھانے کے باوجود اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ ”خون کے دریا بہہ جائیں گے اور ارض دکن تہہ و بالا ہو جائے گی اگر میں اس تم ذات کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کروں گا۔“

رکن الدولہ خوب جانتا تھا کہ نظام دکن ریا کاری سے کام لیتے ہوئے جھوٹے غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ خود اسی نے اپنے دیوان کو صلح کا پیغام لے کر نواب حیدر علی کے پاس بھیجا تھا۔

”آپ صبر و ضبط سے کام لیں۔ میں ایک بار پھر والی میسور سے اس موضوع پر گفتگو کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ بھی افہام و تفہیم سے کام لیں گے۔ اور یہ مسئلہ بحسن و خوبی حل ہو جائے گا۔“

پھر دیوان رکن الدولہ دوبارہ نواب حیدر علی کی خدمت میں حاضر ہوا۔

”حضور! نظام کو آپ کی یہ شرط منظور نہیں۔“ رکن الدولہ نے انتہائی شاطرانہ انداز میں والی دکن کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک عام آدمی بھی اپنی آبرو کو کسی غیر شخص کے حوالے نہیں کر سکتا۔ پھر وہ تو شہنشاہ کا درجہ رکھتے ہیں۔“

”میں نے تیرے شہنشاہ سے صلح کی درخواست کب کی تھی؟“ حیدر علی کا غصہ بھوک اٹھا۔

”میں نے تو ایک غم زدہ بیوہ اور اس کی غیرت مند بیٹی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر قدرت نے میری مدد کی تو میں ان دونوں کی مدد کو ضرور پہنچوں گا۔“ یہ کہہ کر نواب حیدر علی نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ ”مجھے کسی کے ناموس سے کھیلنے کا شوق نہیں ہے۔ یہ کھیل نظام ہی کو مبارک ہو کہ وہ میدان جنگ میں بھی رقاصوں کا ایک طائفہ لے کر آیا ہے۔“ والی میسور کے جاسوسوں نے اسے خبر دی تھی کہ اتحادی فوجوں کو اپنی فتح کا یقین ہے اور اسی یقین کے پیش نظر نظام دکن کے نیچے رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں اور انگریز فوجی افسر بدستی کے عالم میں خوب صورت رقاصوں کے فن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ نواب حیدر علی نے رکن الدولہ کو مخاطب کرتے ہوئے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”میرے نزدیک رافعہ خاتون بہن کی اور حمیدہ خاتون بیٹی کی

علی خان کی قید سے آزاد نہیں ہو جاتی۔“

اس کے بعد رافعہ خاتون اور حمیدہ خاتون اپنے زیورات اور قیمتی لباس لے کر ایک خانگی دستے کے ساتھ سرنگاپٹم روانہ ہو گئیں۔

پھر جب حیدر علی کے ذمے دار افسروں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ دونوں ماں بیٹی سرنگاپٹم پہنچ چکی ہیں تو اس نے دیوان رکن الدولہ کا مرتب کردہ صلح نامہ ٹیپو سلطان کی طرف بڑھا دیا۔

ولی عہد سلطنت نے با آواز بلند صلح نامہ پڑھا جس کی تفصیلات مندرجہ ذیل تھیں۔  
نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی کے بڑے بھائی نواب محفوظ خان کی بیٹی ٹیپو سلطان سے بیاہ دی جائے۔

میر انوار الدین کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے محفوظ خان نواب ارکاٹ قرار پائیں۔  
اور پھر وہ اپنا حق ٹیپو سلطان کو تفویض کر دیں۔

نواب حیدر علی خان بہادر اور نظام علی خان والی دکن ہمیشہ ایک دوسرے کے حلیف رہیں گے۔

صلح نامے کی آخری شق یہ تھی کہ حیدر علی اور نظام علی خان مل کر والا جاہ کو معزول کرنے کی کوشش کریں گے۔

صلح نامے پر نواب حیدر علی اور نظام الملک کے دستخط ثبت ہوئے جن پر دکن کے بالائے حلقوں میں بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نظام علی خان ایک مکمل شکست اور شدید جانی و مالی نقصان سے محفوظ رہا تھا۔

اس کے بعد نواب حیدر علی نے اپنے وکیل سیتا جی پنڈت کے ذریعے مدراس کے گورنر ایک طویل مراسلہ بھیجا جس میں نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی کی تمام سازشوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا تھا کہ اس کی چالبازیوں کے سبب یہ خوزیر جنگ ہوئی ہے اور پورے علاقے کا امن و سکون غارت ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے والا جاہ محمد علی کی سرپرستی سے دست کش ہو جائیں اور اس میدان میں تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ سرنگاپٹم کی فوجیں اس منافق و ریاکار سے اپنے تمام بچے حسابات بے باق کر سکیں۔

مدراس کے فرنگی تو جانتے ہی تھے کہ یہ آگ خود ان کی لگائی ہوئی ہے، اس لئے وہ نواب والا جاہ محمد علی کی حمایت سے کس طرح دستبردار ہو سکتے تھے؟ دونوں اعلیٰ درجے کے منافق تھے اور منافقت کی اسی قدر مشترک نے دونوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا تھا۔ جب مدراس کے گورنر کو والا جاہ محمد علی کا اقتدار خطرے میں نظر آیا تو اس نے مسائل کو حل کرنے کے بجائے ایک نئی چال چلی۔ گورنر کا خیال تھا کہ نواب حیدر علی کا سارا جاہ و جلال کاغذ کی حد تک محدود ہے۔ ورنہ وہ اندر سے ٹوٹ چکا ہے اور اپنی اسی کمزوری کو چھپانے کے لئے صلح کی پیشکش کر رہا ہے۔

گورنر مدراس نے یہی سوچ کر ایک نیا معاہدہ تیار کر لیا اور حیدر علی کے وکیل، سیتا جی پنڈت کے حوالے کر دیا۔

والی میسور نے اس معاہدے کی تفصیلات سنیں تو غضب ناک ہو گیا۔  
”کیا فرنگی یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان شرم ناک شرائط پر ان سے صلح کر لوں گا؟ ہرگز نہیں۔ اس نے تو کہیں بہتر ہے کہ میں اپنی آزادی اور بقاء کی جنگ لڑتے لڑتے مارا جاؤں۔“  
یہ کہہ کر نواب حیدر علی نے گورنر مدراس کے ترمیم دیئے ہوئے معاہدے کو چاک کر ڈالا اور مسودات کے کئی ٹکڑے کر کے سیتا جی پنڈت کے ہاتھ میں دے دیئے۔

”یہی فرنگیوں کی پیشکش کا جواب ہے۔“

سیتا جی پنڈت دوبارہ مدراس پہنچا اور پھٹا ہوا مسودہ گورنر مدراس کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔

”نواب بہادر کی طرف سے آپ کی پیشکش کا جواب۔“  
اپنی تحریر کا یہ حشر دیکھ کر گورنر مدراس مشتعل ہو گیا اور کچھ دیر تک ہڈیاں بکتا رہا۔ پھر بڑے نفیر آمیز لہجے میں سیتا جی پنڈت کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”اس نے میری مصالحتانہ پیشکش کو ٹھکرا کر اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ مگر میں پھر بھی اسے ایک اور موقع دیتا ہوں۔ حیدر علی کو لازم ہے کہ وہ مجھ سے اپنی اس سنگین گستاخی کی معافی طلب کرے اور مسودے کے ساتھ ساتھ وہ اس تحریر کو بھی پڑھے جو ہندوستان کے در و دیوار پر لکھ دی گئی ہے۔“

سیتا جی پنڈت نے گورنر مدراس کے الفاظ سن و عن حیدر علی کے گوش گزار کر دیئے جنہیں ن کر والی میسور نے ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ کہا۔

”اللہ ہی جانتا ہے کہ ہندوستان کے در و دیوار پر کیا لکھ دیا گیا ہے۔ میں ان عارضی و فانی تحریروں کو کیا پڑھوں کہ یہ تو صبح و شام بدلتی رہتی ہیں۔“



انگریزوں کی اس چال کے بعد نواب حیدر علی کو اندازہ ہوا کہ بڑی ہوشیاری سے اس کے گرد نال چھایا جا رہا ہے۔ والی میسور نے نظام علی خان کے عہد و بیان کی آزمائش کرنے کے لئے والی دکن کو ایک خط تحریر کر لیا اور مرزا اسد بیگ کے حوالے کر دیا۔ مغل شہزادے اسد بیگ کو حیدر علی اپنے بیٹے ہی کی طرح چاہتا تھا۔ اگرچہ اسد بیگ، عمر کے اعتبار سے بیس بائیس سالہ نوجوان تھا لیکن بے پناہ ذہین اور مدبر تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سلطنت میسور کا جال ٹار تھا۔ اسد بیگ کی ان ہی صفات سے متاثر ہو کر نواب نے اسے حیدر آباد کی سفارتی مہم پر بھیجا تھا۔ والی میسور نے اپنے خفیہ مکتوب میں والی دکن کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”نظام علی خان! اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ایفائے عہد کے مفہوم کو سمجھیں اور معاہدے پر عمل درآمد سے عمل کریں۔ گورنر مدراس نے میری تجویز کو مسترد کر دیا ہے اور وہ بدستور والا

الدولہ نے والی دکن کو سجدہ کر کے خوشامد کی کبھی نہ ختم ہونے والی کتاب میں ایک اور باب کا اضافہ کر دیا۔



نواب حیدر علی نے بڑے تحمل کے ساتھ نظام علی خان کا جواب سنا۔ حاضرین مجلس کا خیال تھا کہ والی دکن کا یہ منافیانہ جواب، حیدر علی کو برہم کر دے گا مگر اس وقت تمام لوگ حیرت زدہ تھے، جب حیدر علی مسکرائے لگا۔

”اب کون کس پر اعتبار کرے؟ لوگ اپنی خاندانی شرافت کی قسمیں کھاتے نہیں تھکتے۔ مگر بے عمل کادقت آتا ہے تو اس طرح منہ پھیر لیتے ہیں کہ انہیں اپنے الفاظ تک یاد نہیں رہتے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اس دور میں نجیب الطرفین لوگوں کی کیا روش ہے؟“ نواب حیدر علی اپنے امراء سے مخاطب تھا۔

”نواب بہادر کو یاد ہوگا کہ میں نے اس معاہدے سے اختلاف کیا تھا۔“ سپہ سالار محمد علی کیدان پرجوش لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے پر شدید ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔

”محمد علی! کیا تو ہم پر طعنہ زنی کر رہا ہے؟“ یکایک والی میسور کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی۔ ”کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تیرا نواب کم نظر ہے اور فریب کار نظام نے ایک ”چور چال“ سے حیدر علی خان بہادر کو مات دے دی؟“

”نہیں نواب بہادر!“ محمد علی کیدان کے لہجے میں بھی سپاہیانہ جلال تھا۔ ”محمد علی اپنے ہرار کے کسی عمل پر طعنہ زنی نہیں کرتا، چاہے وہ عمل کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ میں نے برسر عام آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور محمد علی کا یہ مزاج نہیں کہ وہ کسی آزمائش کے وقت میں اپنی بیعت کو توڑ ڈالے۔“

”پھر تو کیا کہنا چاہتا ہے؟“ نواب حیدر علی نے اپنے سپہ سالار سے پوچھا۔

”میں نواب ارکاٹ اور والی دکن کو ایسا سبق سکھانا چاہتا ہوں جسے تاریخ ہند صدیوں تک یاد رکھے۔“ محمد علی کیدان کا لہجہ کچھ اور پرجوش ہو گیا تھا۔ ”نظام نے اس کاغذ کے پُرزے کئے ہیں جو بڑا قیمتی تھا۔ انسانی جان سے بھی زیادہ قیمتی۔ اس کا گناہ ناقابل معافی ہے۔ ہمیں اجازت دیجئے کہ اس کے اقتدار کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔“

”نمبر گھر محمد علی!... میر کر۔“ نواب حیدر علی اپنے سالار کا جلتا ہوا چہرہ دیکھ کر مسکرائے لگا۔ ”کہاں تک میر کروں، نواب بہادر! مجھے آپ سے بڑی شکایت ہے۔“ اچانک محمد علی کیدان کے چہرے پر اذیت و کرب کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ ”دشمنوں سے طویل جنگ ہوئی مگر میرے دل کے ارمان ابھی تک نہیں نکلے۔ آپ نے مجھے اس عاز پر بھیجا جہاں انسانی خون کی بہت گت تھی۔ میری مشیر کی پیاس تو کیا بجتی، اس کے ہونٹ بھی تر نہیں ہو سکے۔“

”اسی لئے تو تجھ سے بار بار میر کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔“ نواب حیدر علی کی مسکراہٹ

جاہ محمد علی کی مدد کر رہا ہے۔ معاہدے کی رو سے ہم دونوں کے درمیان طے پایا تھا کہ نواب ارکاٹ کو اس کے عہدے سے معزول کرنے کی کوشش کریں گے۔ لہذا بلا تاخیر والا جاہ محمد علی کے خلاف اپنی فوجی طاقت استعمال کیجئے۔ میں آپ کے اشارے کا منتظر ہوں۔ میرے سپاہیوں کے پاؤں رکابوں میں ہیں اور ہاتھ گھوڑوں کی لگاموں پر ہیں۔“

نظام علی خان، والی دکن نے حیدر علی کے خط کے جواب میں لکھا۔

”مجھے اس معاہدے کا ایک ایک حرف یاد ہے اور میں عہد و پیمان کے مفہوم کو بھی بخوبی سمجھتا ہوں۔ مگر کیا کروں کہ بد قسمتی سے وقت کی رفتار میرے حق میں نہیں ہے۔ میں بیک وقت دو محاذوں پر جنگ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ارکاٹ پر لشکر کشی سے معذور ہوں۔ ویسے میرا دل آپ کے ساتھ دھڑکتا ہے اور میری تمام تر ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ والا جاہ محمد علی پر یلغار کیجئے۔ وقت سازگار ہوتے ہی میں بھی آپ سے آملوں گا۔“

جب مرزا اسد بیگ، والی دکن کا خط لے کر حیدر آباد سے روانہ ہو گیا تو نظام علی خان نے اپنے دیوان رکن الدولہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”میں نے اسی دن کے لئے حیدر علی سے معاہدہ کیا تھا کہ اسے آفات و مصائب کے گرداب میں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اور وہ وقت سر پر آ گیا ہے۔ عنقریب تم دیکھو گے کہ حوادث کی بے رحم موجیں والی میسور کو نکل جائیں گی۔ پھر اس جاہل کو اعزازہ ہوگا کہ اہل دانش کشی دور کی سوچتے ہیں۔“ حیدر علی چونکہ پڑھا لکھا نہیں تھا، اس لئے نظام علی خان اکثر اسے جاہل کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

”میں کسی قدر جانتا ہوں، حضور کے ہوش و خرد کی گہرائیوں کو۔“ دیوان رکن الدولہ بھی اپنے زمانے کا عبداللہ بن ابی (منافق اعظم) تھا۔ نظام دکن کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا اور اس عہد شکنی کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دینے لگا۔

”میں نے حیدر علی سے وہ معاہدہ برے وقت کو ٹالنے کے لئے کیا تھا۔“ نظام علی خان کے ہونٹوں پر بڑی عیارانہ مسکراہٹ قہقہے کر رہی تھی۔ ”خدا کا شکر ہے کہ میرا برا وقت گزر گیا۔ اب تو میں بہت دور سے تماشاً دیکھوں گا۔ ایک شکار کے لئے دو بھیڑیے آپس میں لڑیں گے۔ پھر ان دونوں میں سے یقیناً کوئی ایک ہلاک ہو جائے گا۔ اور دوسرا جو بچے گا، وہ اس قابل نہیں ہوگا کہ شکار پر قابو پا سکے۔ انجام کار.....“ نظام علی خان نے جان بوجھ کر اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

”پھر آپ اس شکار کو لے آئیں گے۔“ دیوان رکن الدولہ نے نظام دکن کا جملہ مکمل کر دیا۔ ”اور پھر کسی میں اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ آپ کے راستے کی رکاوٹ بن سکے۔“

”تو بہت ذہین ہے رکن الدولہ!“ نظام علی خان نے ہتھیار لگایا۔

”حضور کے جوتوں کی خاک کا صدقہ ہے کہ یہ غلام بھی اکسیر ہو گیا ہے۔“



کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ ”وہ دن دور نہیں جب تو بھی مطمئن ہو جائے گا اور تیری شمشیر کی پیاں بھی بچھ جائے گی۔“ نواب حیدر علی جانتا تھا کہ اس کا سالار اپنے قول میں بہت سچا ہے۔  
ابھی یہ فوجی اجلاس جاری تھا کہ نواب حیدر علی کے جاسوسوں نے ایک پریشان کن خبر دی۔ ان کی اطلاع کے مطابق انگریزی فوج کا ایک تازہ دم دستہ بنگلور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ گورنر مدراس نے نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی کے سلسلے میں والی میسور کے طویل مراسلے کو مسترد کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی کرنل اوڈ کی قیادت میں بہترین سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج بنگلور پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کر دی تھی۔

بازی اُلٹ چکی تھی اور نواب حیدر علی کو پوری شدت کے ساتھ کسی نئی سازش کا احساس ہو رہا تھا۔ والی میسور نے لحوں میں فیصلہ کیا اور چند گھنٹوں میں اپنی جنگی حکمت عملی ترتیب دی۔ کچھ دن پہلے بنگلور کے محاذ پر انگریز کمانڈر مائیکل رابرٹ کو شکست دینے کے بعد ٹیپو سلطان کے حوصلے بھی بلند ہو گئے تھے۔ اور بیٹے پر نواب حیدر علی کا اعتماد بھی بڑھ گیا تھا۔ اس لئے والی میسور نے ولی عہد سلطنت کو مدراس کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ میر علی رضا خان تجاوار پر اور غازی خان چوڑ پر بڑے جارحانہ انداز میں بڑھے۔ ان سرداروں کو حکم تھا کہ تمام علاقے لوٹ کر انہیں ویران کر دیا جائے۔ نواب حیدر علی ایک تعمیری انسان تھا۔ اسے خوش حالی اور سرسبز و شاداب بستیوں کو اُجاڑتے وقت شدید اذیت پہنچتی تھی۔ مگر کیا کرتا کہ اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اتحادی فوجوں کے لئے سامانِ رسد کی ترسیل کو روکنے کا یہی ایک طریقہ تھا اور اپنی اسی مجبوری کے تحت نواب حیدر علی نے یہ آمرانہ حکم جاری کیا تھا۔

اس کے بعد والی میسور نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی کی طرف متوجہ ہوا جو کولار میں آرام سے بیٹھا سازشوں کے نئے جال بن رہا تھا۔ نواب حیدر علی اس ارادے سے آگے بڑھا کہ پائیں گھاٹ پر اتر کر نواب ارکاٹ کے علاقوں پر قبضہ کر لے۔ والی میسور کے عزائم بڑے خطرناک تھے۔ وہ طوفانِ برق و باد کی طرح پائیں گھاٹ پہنچا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی فوجوں نے کشن گری، تریاتور، وانم باڑی، آمیور، سات گڑھ، کیرٹین، دھونی گڑھ اور ترچنالی پر قبضہ کر لیا۔ اور تمام علاقوں کو لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا گیا۔

حیدر علی کی پیش قدمی کی خبریں سن کر نواب والا جاہ محمد علی اور کرنل اسمتھ کی آنکھیں کھلیں۔ ورنہ اب تک وہ دونوں خوب صورت عورتوں اور شراب سے دل بہلا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کرنل اوڈ کا تازہ دم لشکر آسانی کے ساتھ بنگلور پر قبضہ کر لے گا اور حیدر علی کے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ مگر آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ شخص ایک خواب پریشان تھا۔  
کرنل اوڈ اپنی فوج لے کر بنگلور کے راستے سے ”سموز“ کی طرف بڑھا کہ کسی طرح بنگلور پر قبضہ ہو جائے۔ حیدر علی کو خبر ہوئی تو اس نے پائیں گھاٹ سے نکل کر کرنل اوڈ کا راستہ روکا۔



ادھر کرنل اوڈ اور میجر جیرالڈ باقی ماندہ فوج کو لے کر بنگلور کے علاقے سے فرار ہو رہے

فرنگی کرنل کے خیال میں وہ فتح کے نزدیک تر پہنچ گیا تھا، اس لئے مسلسل پیش قدمی کرتا رہا۔ پھر ایک مقام پر اسے اندازہ ہوا کہ حیدر علی کے سپاہیوں کی پسپائی کا انداز مصنوعی اور نمائشی ہے۔ مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ کرنل اوڈ محفوظ جگہ پہنچنے کے لئے تیزی سے واپس پلٹا لیکن اس کے ذہن ترین حریف نے اسے کوئی موقع نہیں دیا۔ کرنل اوڈ حیرت و بے چارگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اور حیدر علی کے جانناز فوجی دستے اس کے گرد گھیرائیں کرتے جا رہے تھے۔ اب فرنگی کرنل پر یہ راز کھلا کہ حیدر علی کے ہراول دستے کی پسپائی کا سبب کیا تھا۔ کرنل اوڈ کا لشکر چاروں طرف سے محصور ہو چکا تھا اور اسے اپنی مکمل تباہی صاف نظر آرہی تھی۔

اسے کرنل اوڈ کی خوش قسمتی ہی تصور کیا جائے کہ میجر جیرالڈ کو بروقت خبر پہنچ گئی۔ میجر جیرالڈ اس وقت وینکٹ گری میں متعین تھا۔ وہ فوراً ایک فوجی دستہ لے کر کرنل اوڈ کی مدد کو پہنچا اور اس نے عقب سے داخل ہو کر فرنگی فوج کو مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچا لیا۔ کرنل اوڈ نواب حیدر علی کا قائم کردہ حصار توڑ کر فرار ہو گیا۔ لیکن اس کشاکش میں فرنگیوں کا شدید جانی و مالی نقصان ہوا۔ کرنل اوڈ کے ہزاروں سپاہی لقمہ اجل بن گئے اور نواب حیدر علی نے تمام بھاری توپوں کے ساتھ دیگر جنگی سامان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس مادی مفاد سے قطع نظر والی میسور کو اس جنگ سے سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا تھا کہ اس نے فرنگیوں کو شکست دے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جارحانہ عزائم پر خاک ڈال دی تھی۔ اور فرنگیوں کے دو مسلمان حلیفوں نواب والا جاہ محمد علی اور نظام علی خان کے منصوبوں کو بھی شدید نقصان پہنچایا تھا۔

کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ دوبارہ کرنل اسمتھ پر برس پڑا۔  
 ”میری نظروں کے سامنے سے دُور ہو جا۔ اب میں ایک دن کے لئے بھی مدراس میں  
 تہذیب و مروت نہ رکھتا ہوں۔“  
 کرنل اسمتھ اسی دن لکھتے چلا گیا اور گورنر مدراس والا جاہ محمد علی کے ساتھ آئندہ جنگ کے  
 لئے منصوبہ بندی کرنے لگا۔



ٹیپو سلطان تیز رفتاری کے ساتھ مدراس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستے میں جس قدر  
 بنیادیں آئیں، انہیں لوٹ لیا جاتا مگر مقامی باشندوں کی جانبیں بخش دی جاتیں۔ یہاں تک کہ  
 ٹیپو مدراس کے نواح میں پہنچ گیا اور اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ پھر یکایک پورا شہر گولوں کی  
 آواز سے گونجنے لگا۔ ٹیپو سلطان شہر میں داخل ہو کر قلعہ سینٹ جارج پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا اور  
 اسی خیال سے اس نے شہری علاقے پر گولہ باری کا حکم دیا تھا۔  
 اس وقت گورنر مدراس اور نواب والا جاہ محمد علی ایک ساحلی تفریح گاہ میں بیٹھے گفتگو کر رہے  
 تھے کہ اچانک دھماکوں کی آوازیں سن کر گورنر گھبرا گیا اور اس نے اپنے خدمت گار کو طلب کر  
 لے پوچھا۔ ”کیا بارود کے گودام میں آگ لگ گئی ہے؟“  
 خدمت گار نے لاعلمی کا اظہار کیا۔  
 ”پھر یہ کیسی آوازیں ہیں؟“ گورنر نے خدمت گار کو حکم دیا۔ وہ بہت زیادہ فکر مند نظر آ  
 رہا تھا۔

خدمت گار، ساحلی تفریح گاہ سے نکل کر قلعے کی طرف چلا گیا تو گورنر نے شراب کا جام  
 لہرایا اور ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔  
 ”سرکار بہادر! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“ نواب والا جاہ محمد علی نے انتہائی خوشامدانہ  
 لہجے میں کہا۔ ”سپاہیوں کی زندگی میں تو دھماکے ہوتے ہی رہتے ہیں۔“  
 ”نہیں نواب!“ گورنر مدراس اپنی نشست سے اٹھ کر ٹھٹھنے لگا تھا۔ ”یسوع مسیح ہماری  
 وفات کریں، میں کسی بری خبر کا شہسپر ہوں۔“

اور پھر کچھ دیر بعد ہی گورنر مدراس نے وہ بری خبر سن لی۔ خدمت گار کا گھوڑا تفریح گاہ کے  
 زینب آ کر رک گیا اور وہ دو یا تین گولوں کی طرح بھاگتا ہوا گورنر کے نزدیک پہنچا۔  
 ”سرکار! دشمن شہر کے دروازے پر آ پہنچا ہے۔“ فرنگی خدمت گار کی آواز گھٹی گھٹی تھی۔  
 ”کون دشمن؟“ گورنر مدراس نے گھبرا کر پوچھا۔  
 ”حیدر علی کا بیٹا ٹیپو سلطان۔“ شدت خوف سے خدمت گار کی پٹلیاں کانپ رہی تھیں۔  
 اسی خدمت گار کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اتفاق سے ایک گولہ اس جگہ آ کر گرا جہاں  
 گورنر مدراس اور نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی بیٹھے ہوئے تھے۔ فرنگی حاکم پر اس قدر دہشت

تھے۔ اور ادھر ٹیپو سلطان برق رفتاری کے ساتھ مدراس کی طرف بڑھ رہا تھا۔  
 جب کرنل اسمتھ اور والا جاہ محمد علی کو کرنل اوڈ کی شکست کی خبر ملی تو وہ دونوں بدحواس ہو کر  
 مدراس کی جانب فرار ہو گئے۔ گورنر مدراس نے کرنل اسمتھ کو دیکھا تو انتہائی غضب ناک لہجے  
 میں بولا۔  
 ”کیا تجھے کمپنی نے اسی دن کے لئے اتنی مراعات بخشی تھیں کہ تُو میدان جنگ میں فرنگیوں  
 کے ناموس کو فروخت کر کے فرار ہو جائے؟“

”اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔“ کرنل اسمتھ غائبانہ طور پر نواب حیدر علی کو خراج  
 عقیدت پیش کر رہا تھا۔ ”وہ بظاہر ہماری طرح گوشت پوست کا انسان ہے مگر اس کے اعصاب  
 سنگ و آہن سے بنائے گئے ہیں۔ حادثات و خطرات سے اُلجھتا اس کے لئے دوزخ کا کام  
 سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ موت کو ایک دلچسپ مشغلہ سمجھتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ  
 پڑھا لکھا نہیں ہے، ایک جاہل شخص ہے۔ مگر اس کا دماغ سند یافتہ دانشمندوں سے زیادہ بہتر  
 انداز میں سوچتا ہے۔“

”بس خاموش ہو جاؤ، بزدل نامرد!“ گورنر مدراس جوش غضب میں کھڑا ہو گیا اور اس نے  
 کرنل اسمتھ کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ مارا۔ ”دشمن کی تعریف کر کے اپنی ناپاکی پر پردہ  
 ڈال رہا ہے۔ کرنل اوڈ تجھے بتائے گا کہ جنگ کیسے لڑی جاتی ہے؟“  
 ”آپ کا وہ مرد شجاع بھی شکست کھا کر مدراس پہنچے ہی والا ہے۔“ کرنل اسمتھ نے ایک  
 زوردار قہقہہ لگایا۔

”کیا بکتا ہے؟“ گورنر مدراس کی آواز کسی درندے کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔  
 ”شکست بھی بڑی عجیب چیز ہے گورنر!“ شدت کرب سے کرنل اسمتھ کا سرخ و سفید چہرہ  
 دھواں ہو گیا تھا۔ ”جنگ کیا ہمارا کہ اپنا اعتبار ہی کھو بیٹھا۔ خیر! میں تو جھوٹ ہی بولوں گا مگر پھر  
 بھی نواب سے پوچھ کر دیکھو کہ جنگور کے محاذ پر کرنل اوڈ کا کیا حشر ہوا ہے۔“  
 کرنل اسمتھ کی زبانی یہ انکشاف سن کر گورنر مدراس کا سارا غصہ کا فور ہو گیا اور اس کے  
 چہرے پر دہشت سی برسنے لگی۔

”نواب! یہ کرنل کیا کہہ رہا ہے؟“ گورنر نے والی ارکاٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔  
 ”کرنل بہادر سچ کہتے ہیں۔“ نواب ارکاٹ نے سر جھکا لیا۔ اگرچہ والا جاہ محمد علی اپنے  
 منصب کے اعتبار سے ایک ریاست کا حکمران تھا لیکن انگریزوں کا کاسہ لیس ہونے کی وجہ سے  
 معمولی عہدہ رکھنے والے فرنگیوں کو بھی بڑے ادب و احترام کے ساتھ پکارا کرتا تھا۔ ”بدلتی  
 سے کرنل اوڈ بھی شکست کھا چکے ہیں۔ عنقریب یہ خبر حضور تک بھی پہنچ جائے گی۔“  
 ”پھر؟“ گورنر مدراس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”میں کیا کروں؟ تم لوگوں نے مجھے شاہ انگلستان  
 کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

ذہل کر اس طرح واپس پلٹا کہ جیسے نواب حیدر علی نے اسے کوئی خاص پیغام دے کر ٹیپو سلطان کے پاس بھیجا ہے۔

”گورنر مدراس اپنی چال میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جب ٹیپو نے باپ کے سامنے تمام صورت حال بیان کی تو حیدر علی برہم ہو گیا۔

”مگر تمہیں اپنے باپ کے انتقال کی خبر بھی ملتی تو اس سے کیا فرق پڑتا؟“ والی میسور کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔ ”ایک سپاہی کا فرض یہ ہے کہ پہلے وہ معرکہ سر کرے، پھر اپنے باپ کی تجھز و تکفین کی طرف متوجہ ہو۔“

”مجھے سے غلطی ہو گئی یا با محترم!“ ٹیپو اس کو تاہی پر اتنا پشیمان ہوا کہ رونے لگا۔

”تم نے باپ کی نہیں، والی سلطنت کے حکم کی نافرمانی کی ہے۔“ ٹیپو کے آنسو دیکھ کر بھی حیدر علی کے غصے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ”تمہیں حکم یہ تھا کہ دشمن کے علاقے کی ہر نشانی کو بہادر درود۔ تم قلعہ سینٹ جارج پر اس وقت تک گولہ باری کرتے رہتے جب تک اس کی ساری بلندیاں تمہارے قدم نہیں چوم لیتیں۔“

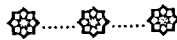
ٹیپو نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں باپ سے معافی مانگی مگر حیدر علی نے اس کی کسی درخواست کو لائق التفات نہیں سمجھا۔ سپہ سالار محمد علی کمیدان اور دوسرے فوجی افسروں نے بھی ٹیپو کی سفارش کی مگر حیدر علی نے انہیں بھی ڈانٹ دیا۔

والی میسور نے ٹیپو سلطان کو اس کی جذباتی غلطی پر بڑی عجیب سزا دی تھی کہ وہ بیٹے سے بات نہیں کرنا تھا۔ یہ ذہنی و قلبی اذیت ولی عہد سلطنت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

آخر کی ماہ بعد حیدر علی کو یہ اطلاع ملی کہ ٹیپو کی گولہ باری سے نواب والا جاہ محمد علی اور گورنر مدراس پر دہشت طاری ہو گئی تھی اور وہ اپنی جائیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ یہ خبر اتنی دلچسپ تھی کہ حیدر علی بلند آواز سے ہنس پڑا اور اس نے اسی وقت ٹیپو کو بلا کر گھر سے دربار میں گلے لگالیا۔

”فرزند! میں نے تمہاری غلطی کو معاف کر دیا۔ تم فاتح قرار پائے اور تم نے قلعہ سینٹ جارج کو فتح کر لیا۔ میں اس وقت بھی اپنی چشم تصور سے اس بے خمیر نواب ارکاٹ کو بھاگتے دیکھ رہا ہوں۔ بس میرے اطمینان کے لئے یہی ایک منظر کافی ہے۔ شاہباش میرے بیٹے! تم مجھے مایوس نہیں کیا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نواب حیدر علی نے اپنے گھر سے بیٹے کو بار بار تار کر ولی عہد سلطنت کو پہنایا۔

ٹیپو سلطان اطاعت و شکرگزاری کے طور پر گھٹنوں کے بل باپ کے سامنے جھک گیا۔



اس کے بعد حیدر علی نے اپنے ایک معتمد سالار فضل اللہ خان بیٹ جگ کو نئی فوج بھرتی کرنے کی غرض سے سرنگاپم روانہ کیا۔

طاری ہوئی کہ وہ ساحل کی طرف بھاگا اور اس نے جہاز میں پہنچ کر چناہ لی۔ اس پریشانی کے عالم میں گورنر مدراس کی ٹوپی اور تلواریں میز پر رہ گئی، جہاں وہ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ گورنر کا فرنگی خدمت گار بار بار اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر چیخ رہا تھا۔ ”خداوند!..... خداوند!“

شہر اور قلعے کے کینوں پر کیا گزری، کسی کو پتہ نہیں تھا۔ نواب والا جاہ محمد علی، گورنر مدراس سے محبت کے تمام دعوے فراموش کر کے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس نے محل میں پہنچ کر سانس لی۔ ٹیپو سلطان سینٹ جارج کے قلعے پر قبضہ کر کے اس علاقے میں انگریزوں کی ریٹھ دوایاں ختم کرنا چاہتا تھا۔ مگر گورنر مدراس کی ایک شاطرانہ چال نے ٹیپو کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

ایک گھڑ سوار گردوغبار میں اٹا ہوا، ٹیپو کے لشکر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”مجھے ولی عہد سلطنت کے پاس لے چلو۔“

”تو کون ہے؟“ ٹیپو کے فوجی افسر نے اس شہسوار کو روکتے ہوئے کہا۔

”میں نواب بہادر کا قاصد ہوں۔“ شہسوار نے غمزہ لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے شہزادے کے پاس لے چلو۔ میں والی میسور کا ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔ نواب بہادر پر عجیب وقت آچرا ہے۔ خدا کے لئے میرے قیمتی لمحات ضائع نہ کرو۔“

فوجی افسر بھی قاصد کی حالت زار دیکھ کر گھبرا گیا اور اسے فوری طور پر ٹیپو کے پاس لے گیا۔ ”نواب بہادر، ترناٹے کے محاذ پر محصور ہو گئے ہیں۔“ قاصد نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ”ان کی مدد کو جلد بھیجئے۔ ورنہ میسور کی تاریخ بدل جائے گی۔“

بڑی ہوش ربا خبر تھی۔ نو عمر ٹیپو گھبرا گیا۔ ”کیا تیرے پاس نواب بہادر کا کوئی تحریری نام ہے؟“ ولی عہد میسور نے قاصد سے پوچھا۔

”ایسے اہم اور خفیہ پیغامات قلم بند نہیں کئے جاتے شہزادے!“ قاصد بہت زیادہ مضرب نظر آ رہا تھا۔ ”میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ نواب بہادر کی زندگی خطرے میں ہے۔“

اب اطمینان کے لئے کیا باقی رہ گیا تھا۔ ٹیپو سلطان نے ایک لمحہ ضائع کے بغیر اپنی فوجوں کو کوچ کا حکم دے دیا۔

ترناٹے پہنچ کر ٹیپو کو معلوم ہوا کہ نواب حیدر علی بخیر و عافیت ہیں اور اس محاذ پر دشمن سے کوئی معرکہ آرائی نہیں ہوئی ہے۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ گورنر مدراس نے نواب والا جاہ محمد علی کے مشورے سے ایک ایسے مسلمان کا انتخاب کیا تھا جو حیدر علی کے علاقے کی زبان روانی سے بول سکتا تھا۔ پھر اس شخص میسور کے سپاہیوں کا لباس پہنا کر خفیہ راستوں سے بہت دور پہنچا دیا۔ پھر وہ اپنے چہرے



حیدر علی کے مشیروں اور فوجی افسروں نے اسے بہت سمجھایا۔

”نواب بہادر! آپ اس طرح مدراس تشریف نہ لے جائیں۔ آپ کا دشمن اتنا اعلیٰ ظرف نہیں کہ وہ آپ کی جرأت و بے باکی کی داد دے سکے۔ نفاق اس کا مذہب ہے اور فریب کاری اس کی سیاست۔ اگر خدا خواستہ.....“ فوجی مشیر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ انہوں نے تصدق اپنی بات اچھری چھوڑ دی تھی۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ گورنر مدراس مجھے قتل کرا دے گا؟“ نواب حیدر علی اپنے فوجی افسروں کا ٹھہران کر سکرانے لگا۔

”موت و زیت تو خدا کے اختیار میں ہے مگر ہم آپ کے اس فیصلے سے متفق نہیں۔“ سپہ سالار محمد علی کیدان نے صاف صاف کہا۔ وہ انتہائی بے باک اور کسی حد تک منہ پھٹ انسان بدل میں جو بات آتی تھی، کسی تکلف کے بغیر کہہ دیا کرتا تھا۔

”میں یقین رکھتا ہوں کہ تیرے اس مشورے میں تیرا خلوص شامل ہے۔“ نواب حیدر علی نے بالکل غریب لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں اپنی عقل کو کیا کروں کہ وہ مجھے مدراس جانے کے لئے مسلسل مشورے دے رہی ہے۔ اور پھر میں نے فرنگی گورنر سے وعدہ بھی تو کر لیا ہے۔ اب یہ الفاظ کس طرح واپس لوں؟“

”طبیعت کی نامازی کا بہانہ کر دیجئے۔“ محمد علی کیدان چاہتا تھا کہ والی میسور کسی طرح مدراس سے باز آ جائے۔ ”گورنر کے سفیر کو اپنے دربار میں دوبارہ طلب کر لیجئے یا پھر مجھے اس میں مدد دیجئے۔ اگر میں اس سفارتی مہم میں ضائع ہی ہو گیا تو میری موت کا ریاست میسور انتظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور خاتم بدین آپ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تو اس علاقے کے لوگ بے گناہ مسلمان، دشمنوں کی تلواروں کا رزق بن جائیں گے اور میں اس وقت سے بہت باہول نواب بہادر!“

”خدا میرے رفیقوں اور ہمدردوں کو سلامت رکھے۔“ شدت جذبات سے نواب حیدر علی ابکھیں، بالکل غمی نظر آنے لگی تھی۔ ”تم جیسے جاں نثاری تو مجھے بیک وقت چار دشمنوں سے لڑنا پڑے گا۔“ نواب حیدر علی نے کہا۔ ”والی میسور کا اشارہ مرہٹوں، انگریزوں، نواب ارکاٹ، شام کوکن کی طرف تھا۔“ مگر ٹو اپنے خدا پر بھروسہ کر محمد علی! کہ ابھی وہ وقت نہیں آئے گا۔ یہ سب باتوں سے الفاظ کیا ادا ہوئے، گویا تیر کمان سے نکل چکا ہے اور اب اس تیر کو واپس لے کر آنا ناممکن ہے۔ اگر میں نے کوئی عذر تراشا تو انگریز اور ان کے حلیف کہیں گے کہ نواب حیدر فوجی افسروں کی کثرت سے ڈر گیا۔ اس لئے میرا وہاں جانا ہی بہتر ہے۔“

نائب افسر اور مشیر کیا کرتے؟ سب نے حیدر علی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ مگر ان کے ناقص اندیشوں سے بھرے ہوئے تھے۔

پھر جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو والی میسور نے ہیبت جنگ کو انگریزوں سے انتقام لینے کے لئے درہ گجلی پٹی پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ علاقہ اس وقت انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ ہیبت جنگ کے پیچھے خود نواب حیدر علی بھی ایک لشکر جرار اور بڑا توپ خانہ لے کر روانہ ہوا۔ پھر اس نے ضلع کوئنبٹور میں داخل ہو کر کرور پر قبضہ کر لیا۔ یہ والا جاہ محمد علی کا علاقہ تھا۔ اس کے بعد والی میسور ”ایروڈ“ کی طرف بڑھا۔ راستے میں کیپٹن نکسن نے مزاحمت کی۔ حیدر علی کے سینے میں پہلے ہی آتش انتقام بھڑک رہی تھی۔ اس نے نکسن کی فوج پر اتنے غضب ناک انداز میں حملہ کیا کہ فرنگی سپاہی یا تو مارے گئے یا زخمی ہو گئے۔ نکسن کے فرار ہوتے ہی ایروڈ پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا۔

واغما بازی کا نگراں ایک انگریز کمانڈر تھا۔ اس نے گزشتہ سال حیدر علی سے عہد کیا تھا کہ آئندہ اس کے خلاف جنگ نہیں کرے گا۔ مگر جب انگریز کمانڈر نے بد عہدی کی تو حیدر علی نے اس کی پوری فوج کو محاصرے میں لے کر گرفتار کر لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے والی میسور کا دیری پورم کے سپاہیوں کو بھی زنجیریں پہنا دیں اور تمام جنگی قیدیوں کو سرنگا پٹم روانہ کر دیا۔ ان مہمات سے فارغ ہوتے ہی دونوں گھاناؤں کے جنوب میں ان اضلاع کو بھی فتح کر لیا جن پر کچھ دن پہلے انگریز قابض ہو گئے تھے۔ پھر والی میسور، مدراس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے انگریزوں میں ہراسم کی پھیل گئی۔ آخر گورنر مدراس نے حیدر علی سے صلح کی درخواست کی اور اس مقصد کے لئے اپنے سفیر کیپٹن بروک کو والی میسور کی خدمت میں روانہ کیا۔

نواب حیدر علی نے صلح پر رضامندی ظاہر کی مگر کیپٹن بروک سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”میں اس دغا باز کو کسی قسم کی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔“ والی میسور کا اشارہ نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی کی طرف تھا۔

انگریز سفیر کیپٹن بروک نے صلح کی گفتگو کو آگے بڑھانا چاہا تو حیدر علی نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ ”میں خود مدراس آ رہا ہوں۔ وہاں آ کر ان شرائط کو سنوں گا جو گورنر کی ٹول چٹل کرنا چاہتی ہے۔“

والی میسور کے اس جواب پر کیپٹن بروک دم بخود رہ گیا۔ پھر جب یہ خبر عام ہوئی کہ حیدر علی، مدراس آ رہا ہے تو والا جاہ محمد علی بھاگ کر گورنر کے پاس پہنچا اور سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”تاج برطانیہ کا اقبال بلند ہو۔ شکار خود جال کی طرف آ رہا ہے۔ حیدر علی کو قتل کرا دیجئے۔“ پھر ہندوستان میں فرنگی اقتدار کے لئے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔“

گورنر مدراس بڑے متنی خیر انداز میں مسکرایا اور پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی مراکی کی طرف اشارہ کیا۔ نواب والا جاہ محمد علی اپنی نشست سے اٹھا اور آہستہ آہستہ ساغر شراب لہنے کرنے لگا۔



اپنی بات مکمل کرنے کے بعد گورنر مدراس نے کرنل اسمتھ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس سے اپنے خیال کی تائید طلب کر رہا ہو۔

کرنل اسمتھ کچھ دیر تک گورنر مدراس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بہت آہستہ سے بولا۔

”جناب! آپ ایک بار پہلے بھی مجھ سے ناراض ہو چکے ہیں۔ اس لئے مجھے اظہارِ رائے سے معاف ہی رکھا جائے۔“

”وہ اور بات تھی۔ اسے بھول جاؤ اسمتھ!“ گورنر مدراس شرمساز نظر آنے لگا۔ ”اس وقت میں اگر بڑی فوج کی شکست کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا تھا۔“ گورنر کا لہجہ انتہائی معذرت خواہانہ تھا۔

”میں جو بھی کہتا ہوں، تاج برطانیہ اور کمپنی کی محبت میں کہتا ہوں۔“ کرنل اسمتھ جذباتی ہو گیا تھا۔ ”اس وقت بھی جو کچھ کہوں گا، اپنے تجربات کی روشنی میں کہوں گا۔ حیدر علی کے بارے میں آپ کی یہ رائے درست ہے کہ وہ لومڑی کی چالیں چلتا ہے مگر آپ نے اسے بڑی طرح حملہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب اس نے وعدہ کیا ہے تو ضرور آئے گا۔“

کرنل اسمتھ کی اس صاف گوئی پر گورنر مدراس نے بہت برا سامنا بنایا اور ابھی وہ کچھ کہتا ہی تھا کہ اس کا خدمت گار خاص، جان رائٹ گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

”سراوہ آہنچا۔“ شدتِ خوف سے جان رائٹ کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر رشت برس رہی تھی۔

”کون؟“ گورنر مدراس اپنے خدمت گار کی چیخ سن کر اچھل پڑا تھا۔

”وہ..... وہ..... نواب..... حیدر علی۔“ جان رائٹ کی زبان لڑکھڑاہی تھی اور وہ رنگ رنگ کر رہا تھا۔

”کہاں ہے حیدر علی؟“ گورنر مدراس کی آواز بھی کانپ رہی تھی اور وہ شدید بدحواسی کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”وہ کوہ سینٹ تھامس تک پہنچ گیا ہے۔“ جان رائٹ نے اپنے آقا کو بتایا۔

حیدر علی کی آمد کے بارے میں سن کر نواب ارکاٹ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”عزت مآب! اسے معلوم نہ ہو کہ میں یہاں موجود ہوں۔“ والا جاہ محمد علی کی آواز میں ہلکی بات پر ہنسنے سے اندازے درست ثابت ہوئے اور شکار، جال تک آہنچا۔ اب

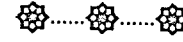
اصل نواب ارکاٹ کی بدعہدی اور کمینگی کی وجہ سے حیدر علی اس سے سخت نالاں تھا۔ اگر

مقلد اس کے ہاتھ آجاتا تو والا میسور سے ہمیشہ کے لئے زنداں کے حوالے کر دیتا یا پھر

نہ اس کے جالے کا زین کر ڈالتا۔ اسی لئے والا جاہ محمد علی، گورنر مدراس کو بھڑکا کر حیدر علی کا کام

نہ ادا دیتا چاہتا تھا۔

روانگی سے پہلے والا جاہ محمد علی، مدراس میں موجود تھا اور اس پر اضطراب طاری تھا۔ والا ارکاٹ بار بار گورنر مدراس سے کہہ رہا تھا۔



”عزت مآب! آپ نے حیدر علی کو قتل کرنے کے لئے کیا انتظامات کئے ہیں؟ آج صبح صبح پر خدا کا یہ بے مثال کرم ہے کہ فرنگیوں کا سب سے بڑا دشمن خود بخود موت کے غار کی طرف بھاگ رہا ہے۔“

”نواب! تو بہت احمق ہے۔“ گورنر مدراس اس وقت شراب کے نشے میں تھا مگر بھڑک کر اس کے ہم رکاب تھے۔ اس نے شرارتا آہستہ سے والا ارکاٹ کے سینے پر اپنا ہید مارا ہوئے کہا۔

”کیا تجھے یقین ہے کہ حیدر علی، مدراس آکر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے گرد جال بچھندے کس لئے گا؟“

”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ حیدر علی، مدراس ضرور آئے گا۔“ والا جاہ محمد علی نے بڑبڑاتا ہوا کہا۔

”وہ اپنی دھن کا پکا اور وعدے کا سچا ہے۔ اس کی اسی بے خوفی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجئے۔“

”تو پھر اس کا مطلب یہ ہے نواب! کہ تو حیدر علی کو نہیں جانتا۔“ گورنر مدراس کی مسکراہٹ کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ نواب ارکاٹ کا مذاق اڑا رہا ہو۔ ”میں نے اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ لومڑیوں کی طرح چالیں چلتا ہے۔ اپنی اسی عادت کے مطابق وہ میرے ساتھ ایک گہری چال چل رہا ہے۔ مگر اسے کیا پتہ کہ فرنگی اور ہندی دماغ میں کیا فرق ہے؟“

”آخر عزت مآب کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں کہ فرنگی دماغ کا ہندی دماغ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔“ یہ کہتے کہتے گورنر مدراس کی گردن میں کئی نمایاں ہو گئی تھی۔ ”اور وہی فرنگی دماغ مجھ سے یہ کہتا ہے کہ حیدر علی اور اس کی ہمت نہیں کرے گا۔ وہ مجھ سے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ ہم ہندوستان لوگ ہیں۔ ہندوستانیوں کی طرح معمولی باتوں پر بھڑکتے نہیں۔“

گورنر مدراس نے حیدر علی کے آنے کی خبر سن کر کرنل اسمتھ کو بھی مشورے کے لئے اپنے پاس بلا لیا تھا اور سابقہ تلخ گفتاری کے سلسلے میں اس سے معذرت

اسمیتھ بھی اس وقت شریک گفتگو تھا۔

امان کرا دیا جس کے نتیجے میں ہزاروں مدراسی باشندے اس شخص کے دیدار کے لئے باہر آئے۔ پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

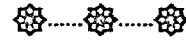
پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

پھر انہوں نے گھر میں آکر اپنے بھائی کے ساتھ رہنے لگے۔

”نہیں جناب!“ نواب ارکات کی تجویز سن کر کرنل اسمتھ درمیان میں بول پڑا۔ ”میں اس کی رائے ہرگز نہیں دوں گا۔ حیدر علی ایسا شکار نہیں ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے چال کی طرف چلا آئے۔ اگر اسے کچھ ہوگا تو اس کے جاں نثار پورے مدراس کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیں گے اور ایک انگریز بھی زندہ نہیں بچے گا۔“

گورنر مدراس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور نواب حیدر علی کے استقبال کے لئے قلعے سے نکل کھڑا ہوا۔ والی میسور کی فوجیں کوہ سینٹ تھامس کے قریب خیمرزن تھیں اور یہ مقام مدراس سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔



مدراس میں مقیم تمام انگریزوں پر لرزہ طاری تھا اور انہیں اپنا خوف ناک انجام بہت قریب نظر آ رہا تھا۔ عام شہریوں پر دہشت طاری ہونے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے مگر سب سے زیادہ مضحکہ خیز صورت حال یہ تھی کہ نواب حیدر علی، کونسل کے جن ممبروں سے مذاکرات کرنے ان کے دروازے تک آ پہنچا تھا، وہ اپنے اپنے گھروں اور باغیچوں میں بچرموں اور چوروں کی طرح چھپے ہوئے تھے۔ صرف گورنر مدراس کے حواس باقی تھے کہ وہ سیاست و مصلحت سے کام لیتے ہوئے قلعے سے باہر آیا اور پھر اس نے کوہ سینٹ تھامس پہنچ کر نواب حیدر علی کا پھونچا استقبال کیا۔

”کیا مدراس میں چند معززین شہر کے سوا کوئی اور نہیں رہا؟“ نواب حیدر علی اپنے ترجمان کے ذریعے بالواسطہ گورنر مدراس سے مخاطب ہوا۔ والی میسور کے استقبال کے لئے گورنر مدراس کے ساتھ آنے والوں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ نواب حیدر علی نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”وہ نواب کے جاہ و جلال سے ڈرتے ہیں۔“ اگرچہ گورنر مدراس کے دل میں بڑا کھٹ تھا لیکن پھر بھی وہ عاجزانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ”انہیں اپنی جانوں کا خطرہ ہے۔“

”ہم کوئی بلائے بے درماں نہیں کہ ہمارا نام سن کر ہی لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔“ بظاہر نواب حیدر علی کا لہجہ نرم تھا مگر اس کے چہرے سے فطری جلال نمایاں تھا۔ ”اس وقت ہم سینڈ اسن کا لباس پہن کر آئے ہیں، پھر یہ خوف و ہراس کیوں؟“

”آپ کا جبروت شامی انہیں ان کے گھروں سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔“ گورنر مدراس کا لہجہ کچھ اور خوشامدانہ ہو گیا تھا۔ ”وہ نواب کی زبان سے ایک ایسا اعلان سنتا چاہتے ہیں، جس میں ان کی جانوں کے تحفظ کی ضمانت ہو۔“

”گورنر! اپنی رعایا کے دلوں سے ہمارا خوف دُور کرو۔“ نواب حیدر علی، مدراس کے منتظم اعلیٰ سے مخاطب ہوا۔ ”ہم انہیں امان دیتے ہیں۔ جب تمہارے شہر کے باشندے ہمارے دروازے پر ہوں گے تو وہ ہمیں بہت زیادہ مہربان پائیں گے۔“

والی میسور کی اس یقین دہانی کے بعد گورنر میسور نے اپنے سپاہیوں کو بھیج کر کوچہ کوچہ

نواب عبدالکیم خان، والی شاہ نور اور نظام دکن پر ان سفید قام بتوں کے ناز وادا کا ہنر آزمایا تھا اور وہ سب کے سب اصنام فرنگی کا جلوہ بے حجاب دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔

گورنر مدراس کو یقین تھا کہ اگر نواب حیدر علی بیابان فرنگ کے سامنے مجبور ریز نہ ہو سکا تو کم سے کم اپنی توبہ ضرور توڑ دے گا۔ شاہ انگلستان نے کمپنی کے تمام عہدیداروں کو ان کی ہدایات کے ساتھ ہندوستان بھیجا تھا کہ پہلے مقامی حکمرانوں میں پھوٹ ڈالو، پھر انہیں کیف و نشاط کا عادی بناؤ۔ یہاں تک کہ وہ شراب کے نشے میں اندھے ہو جائیں۔ اس کے بعد ان پر اس طرح حکومت کرو کہ بظاہر وہ تاج و تخت کے مالک نظر آئیں مگر در پردہ سلطنت فرنگ کے زرخیز غلام ہوں۔ شاہ انگلستان کی ہدایات، ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں کے لئے مخصوص تھیں کہ یہ شاہین آسانی سے زیر دام نہیں آتے۔ انگریزوں کا یہ تجربہ بنگال میں صد فیصد کامیاب ہو چکا تھا اور انہوں نے غدار میر جعفر کے ذریعے نواب سراج الدولہ جیسے مرد شجاع کو موت کی نیند ملا دیا تھا۔ پھر جب حیدر علی کی ابھرتی ہوئی طاقت کی خبریں انگلستان پہنچیں تو گورنر مدراس اور کمپنی کے دوسرے عہدیداروں کو شاہ فرنگ کا ایک مبہم سا پیغام موصول ہوا۔

”حیدر علی کو بھی نواب ارکاٹ اور نظام دکن کی صف میں کھڑا کر دو۔“

گورنر مدراس نے اپنے آقا کے اس مختصر سے جملے کا مفہوم اس کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ سمجھ لیا تھا اور پھر اس نے نواب حیدر علی جیسے مرد آہن کی توبہ شکنی کے لئے منتخب فرنگی لڑکیوں کو ساقی بنا کر بھیجا۔

والی میسور اس وقت کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو چونک اٹھا۔ اور پھر ایک ایسا منظر دیکھا جو نواب کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ حسین و جمیل لڑکیاں جو باریک کپڑوں میں ملبوس تھیں، ایک طشت زرنکار اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں جن میں بلوریں ساغر و صراحی بچے ہوئے تھے۔

”تم کون ہو اور یہ کیا چیز لے کر آئی ہو؟“ حیدر علی گھبرا کر اپنے بستر پر سیدھا ہو گیا۔

”ہم آپ کی کنیزیں ہیں اور یہ پرنگال کی بہترین شراب ہے۔“ فرنگی لڑکیوں کو زور زبان اس قدر سکھا دی گئی تھی کہ انہوں نے نواب حیدر علی کی بات سمجھ لی تھی اور والی میسور پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دیا تھا۔

نواب حیدر علی نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو برداشت کیا۔

”میں تم سے تمہارے اس عمل کی کیا شکایت کروں کہ تم تو گورنر کی بساط کے بہت ہی ناتواں مہرے ہو۔ خدا تمہیں اس شرمناک کاروبار سے نجات دے۔ تم میرے کمرے سے فوراً نکل جاؤ اور گورنر کو بھیجو کہ اس نے مجھے بڑی اذیت پہنچائی ہے۔“

جب انگریز لڑکیاں انتہائی بدحواسی کے عالم میں گورنر مدراس کے پاس پہنچیں اور پورا واقعہ سنایا تو پھر چند لمحوں کے لئے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ مگر عیار زمانہ تھا، اس لئے فوراً

نواب حیدر علی کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

”کیا تمہیں اب تک یہ پتہ نہیں چلا کہ میں مسلمان ہوں اور یہ تمام چیزیں میرے مذہب میں حرام ہیں؟“ گورنر مدراس سے گفتگو کرتے وقت نواب حیدر علی کا لہجہ تند و تیز ہو گیا تھا۔

گورنر کے ساتھ اس کا خدمت گار خاص، جان رائٹ بھی تھا۔ یہ شخص بڑا ذہین تھا اور ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں سے واقف تھا۔ مدراس پہنچنے کے بعد جان رائٹ ہی نواب حیدر علی اور گورنر کے مابین ترجمان کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

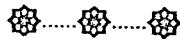
جب جان رائٹ نے والی میسور کی گفتگو کا مفہوم انگریزی زبان میں ادا کیا تو گورنر مدراس مکرانے لگا اور بڑے عیارانہ لہجے میں بولا۔

”اس کا مذہب سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو شاہوں کی روایت ہے۔ اور ہندوستان میں مثل سلطنت کے زوال کے بعد میں آپ ہی کو شاہ سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ تو ایک حقیر سی تواریخ ہے۔ شاید آپ جیسے شاہ کے شایان شان نہیں تھی اس لئے بہت ہی معذرت خواہ ہوں۔“

گورنر مدراس نے والی میسور پر بڑا خوف ناک وار کیا تھا مگر نواب حیدر علی ایک چٹان کے مانند تھا جس پر فرنگی تاجر کے لفظوں کا نشتر بے اثر ثابت ہوا۔

”میں اپنے آپ کو خوب سمجھتا ہوں۔“ نواب حیدر علی کے لہجے میں وہی تلخی تھی۔ ”آپ کوئل کے اراکین کو جمع کر کے صلح نامے کی شرائط تیار کیجئے۔ خاطر و مدارات کے اور موسم بھی آئیں گے۔“ ایک والی میسور کا انداز گفتگو بدل گیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر حقیر آمیز مسکراہٹ ابھرائی تھی۔

گورنر مدراس بھی اپنے خدمت گار خاص، جان رائٹ کے ساتھ مسکراتا ہوا نکل گیا مگر اس کے رنگ آلود سینے میں نفرت و انتقام کی نئی آگ بھڑک رہی تھی۔



ادھر مدراس میں نواب حیدر علی اور انگریزوں کے درمیان دوستی کے معاہدے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ادھر سرنگاپٹم میں ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔

نجیب الدولہ ریاست میسور کا مالدار ترین شخص تھا۔ اس نے حالت جنگ میں کئی مواقع پر نواب حیدر علی کو اسلحے کی خرید کے لئے ایک بڑی رقم بطور نذر پیش کی تھی، اس لئے والی میسور بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اگرچہ نجیب الدولہ ایک اوباش انسان تھا اور حیدر علی کے کانوں تک بھی اس کی ہوس پرستی کے افسانے پہنچے تھے لیکن والی میسور ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیتا تھا۔ اگر کسی نے شکایت بھی کی تو حیدر علی نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔

”نجیب الدولہ میری حکومت میں شامل نہیں ہے۔ پھر بھی اگر وہ رقص و سرود اور شراب کا ربا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ سرنگاپٹم میں بہت سے ہندو رئیس ان بے ہودہ کاموں میں

خبر پڑا جاسکتا تھا۔ اپنے اسی نظریے کی بنیاد پر اس نے نجیب الدولہ کو مشورہ دیا کہ وہ سریتا دیوی کے سامنے اپنی دولت کا مظاہرہ کرے۔ یتیم خانے کے ٹکڑوں پر پلنے والی لڑکی بہت جلد زور چاہری طلب کا شکار ہو جائے گی اور پھر ایک دن خود ہی اس کے قدموں پر سر رکھ دے گی۔ نجیب الدولہ نے یتیم خانے کے منتظم اعلیٰ میر شوکت علی کو بھاری رشوت دے کر اپنے ساتھ لایا۔ اس طرح نجیب الدولہ آزادی کے ساتھ یتیم خانے میں جانے لگا۔ وہ جب بھی جاتا، قرب بچوں پر دولت کی بارش کر دیتا اور یتیم خانے کے منتظمین کو انعام و اکرام سے نوازتا۔ سریتا دیوی، نجیب الدولہ کے اس فیاضانہ کردار سے بہت متاثر تھی۔

ایک دن امیر نجیب الدولہ، سریتا دیوی سے ملا اور ایک قیمتی ہار پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بری خوش نصیبی ہوگی کہ تم اس ہار کے ساتھ مجھے بھی قبول کر لو۔“

سریتا دیوی غضب ناک ہو گئی اور اس نے ہیروں کا جڑاؤ ہار، نجیب الدولہ کے منہ پر دے دیا۔

”بڈا بوڑھے! یہاں سے اسی وقت نکل جا۔ اپنی بیٹیوں پر بری نظر رکھتا ہے۔“

نجیب الدولہ، سریتا دیوی کو خوف ناک انتقام کی دھمکیاں دیتا ہوا یتیم خانے سے نکل کر چلا گیا۔ اس ہوس پرست امیر کے جاتے ہی سریتا دیوی یتیم خانے کے منتظم اعلیٰ میر شوکت علی کے پاس پہنچی اور انتہائی غصے کی حالت میں بولی۔

”اس بدعاش کی شکایت نواب بہادر سے کرو کہ وہ اپنی دولت کے ذریعے یتیم خانے کو ہر گاہ بنادینا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے بھی بڑی شرم ناک گفتگو کی ہے، جسے میں اپنی زبان پر لانے سے قاصر ہوں۔“

”میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ یتیم خانے کے منتظم اعلیٰ میر شوکت علی نے اس قدر بے نیازی کے ساتھ کہا جیسے یہ کوئی معمولی واقعہ ہو۔

”پھر میں خود نواب بہادر سے عرض کروں گی۔“ میر شوکت علی کا جواب سن کر سریتا دیوی کچھ اور مشتعل ہو گئی تھی۔

”لڑکی! تو ابھی اس واقعہ کو ہمیشہ کے لئے فراموش کر دے گی۔“ یکایک میر شوکت علی کے تیر بدل گئے تھے اور وہ بہت زیادہ غصے میں نظر آ رہا تھا۔ ”اگر تو نے زبان کھولی تو پورے سرنگاٹم میں رُسا ہو جائے گی۔ میں نواب بہادر سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ یہی مفلس و یتیم لڑکی، امیر نجیب الدولہ کو بار بار پیغام دے کر یہاں بلاتی تھی اور جب انہوں نے اس کو اپنی ٹانگیٹانے سے انکار کر دیا تو یہ امیر جیسے معزز شخص پر بہتان تراشتے لگی۔“

میر شوکت علی کی عیاری دیکھ کر سریتا دیوی کو سکتہ سا ہو گیا اور پھر وہ اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی۔

یتیم خانے کا نائب منتظم علی احمد، میر شوکت اور سریتا کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا

بتلا ہیں۔ نجیب الدولہ کو بھی ایک ہندو سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہوں۔ ویسے ریاست میسور پر اس کے کئی احسانات ہیں اور میں صرف اس بات پر احسان فراموشی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا کہ نجیب الدولہ شراب پیتا ہے یا بازاری عورتوں سے دل بہلاتا ہے۔ اللہ اسے ہدایت دے۔ ہاں! اگر وہ میری سلطنت کا ادنیٰ ترین رکن بھی ہوتا تو میں اسے سخت ترین سزا دیتا۔“

اسی احسان شناسی کے جذبے سے مجبور ہو کر نواب حیدر علی نے نجیب الدولہ کو ”امیر“ کے لقب سے بھی نوازا تھا۔ پھر جب نجیب الدولہ نے سریتا دیوی کے لئے اپنے رشتے کا پیغام دیا تھا تو والی میسور غضب ناک ہو گیا تھا مگر اُس کا یہ غصہ عارضی تھا۔ پھر کچھ دن گزرنے کے بعد نواب حیدر علی نے اس واقعہ کو فراموش کر دیا۔ لیکن نجیب الدولہ نے والی میسور کے اس طرز عمل کو معاف نہیں کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ سریتا دیوی کو بھی نہیں بھولا تھا۔ سریتا کا بے پناہ حُسن اُس کے شعلے ہوس کو ہوا دیتا ہی رہتا تھا مگر نواب حیدر علی کی موجودگی کے باعث وہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتا تھا۔

دراصل امیر نجیب الدولہ کے کئی چہرے تھے۔ اس نے نواب حیدر علی کی مالی مدد اس لئے کی تھی کہ والی میسور کو اس پر اعتبار آ جائے ورنہ دلی طور پر وہ نواب ارکاٹ اور نظام دکن کا بھڑکا۔ یہاں تک کہ میسور کے سابق حکمران، راجہ کرشنا سے بھی اس کے خصوصی تعلقات تھے اور اسی وجہ سے وہ ریاست کا مالدار ترین شخص بن گیا تھا۔ نواب حیدر علی کے تینوں دشمن خفیہ طور پر نجیب الدولہ کی مالی معاونت کر رہے تھے اور اس کے صلے میں یہ ضمیر فروش امیر، ریاست کے بعض اہم راز نواب ارکاٹ، نظام دکن اور راجہ کرشنا کو منتقل کر دیا کرتا تھا۔

مادھورائے حملے کے وقت نجیب الدولہ بہت خوش تھا کہ حیدر علی کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اور پھر وہ آسانی سے سریتا دیوی کو حاصل کر سکے گا۔ مگر جب مادھورائے کام ہو گیا تو نجیب الدولہ کے ارادوں پر بھی اوس پڑ گئی۔ پھر جب اتحادی فوجوں نے مل کر میسور پر حملہ کیا اور حیدر علی کا انجام قریب تر نظر آنے لگا تو نجیب الدولہ کا وہی غلیظ جذبہ دوبارہ پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوا۔ مگر جب حیدر علی اتحادی فوجوں پر غالب آ گیا تو نجیب الدولہ غصے سے پاگل ہو گیا اور اس نے اپنے عشرت کدے کے درو دیوار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کم بخت کس قدر سخت جان ہے کہ موت بھی اس پر قابو نہیں پاسکتی۔ بار بار بیچ جاتا ہے۔“

نجیب الدولہ کے میسور کی تینوں رانیوں سے بھی مراسم تھے اور وہ اکثر نصف شب کے اندھیرے میں راج محل جایا کرتا تھا۔ داروغہ حملات کرشن راؤ بھی رانیوں کا آلہ کار بن گیا تھا۔

اس لئے دونوں منافق مل کر نواب حیدر علی کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔

پھر جب حیدر علی اپنی جنگی مصروفیات کے سلسلے میں سرنگاٹم سے چلا گیا تو نجیب الدولہ نے سریتا دیوی کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا۔ اس ساز باز میں کرشن راؤ بھی اس کا شریک تھا۔ کرشن راؤ ایک حریص انسان تھا، اس لئے اس کے خیال میں ہر شخص کو دولت



تھا۔ وہ بھی امیر نجیب الدولہ اور میر شوکت علی کے اس منصوبے کا رازدار تھا۔ یتیم خانے کے منتظم اعلیٰ نے اپنی زبان بند رکھنے کے لئے علی احمد کو بھی ایک بڑی رقم دی تھی۔

”علی احمد! اس فاحشہ کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دے۔“ میر شوکت علی قہر آلود لہجے میں اپنے نائب سے مخاطب ہوا۔ ”دنیا کو بے وقوف بنانے کے لئے جو گمنام بنی پھرتی ہے مگر کوئی اس کے اندر جھانک کر دیکھے۔ ایسی بے حیا لڑکی میری نظروں سے آج تک نہیں گزری۔ اس کے ناپاک وجود سے یتیم خانے کو پاک کر دے۔ ورنہ صاف و شفاف فضا مسموم ہو کر رہ جائے گی۔“

”اسے اصلاح کا ایک موقع اور دے دیجئے۔“ علی احمد نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ بہت جلد اپنے آپ کو سدھار لے گی۔“

میر شوکت علی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور علی احمد اسی رات تنہائی میں ٹیپو سلطان سے ملا۔ ”حضور! یہ ہے وہ رقم جو میر شوکت علی نے مجھے رشوت کے طور پر دی تھی۔“ علی احمد نے دو چھوٹی سی گٹھری، ولی عہد سلطنت کے سامنے کھول دی، جس میں روپیلی سکے بھرے ہوئے تھے۔ دراصل یتیم خانے کا نائب علی احمد، ٹیپو سلطان کا جاسوس تھا جسے اسی مقصد کے لئے رکھا گیا تھا کہ وہ غیر محسوس انداز میں سریتا دیوی کی نگرانی کرے۔ علی احمد بڑی ہوشیاری سے میر شوکت علی کا آئے کار بنارہا اور جب امیر نجیب الدولہ کا منصوبہ مکمل طور پر بے نقاب ہو گیا تو اس نے ٹیپو سلطان کے سامنے افشائے راز کر دیا۔

پندرہ سالہ ٹیپو، امیر نجیب الدولہ کی اس درندگی کو برداشت نہ کر سکا اور غصے سے بے قابو ہو گیا۔ وہ اسی وقت نجیب الدولہ کو گرفتار کر کے سخت ترین سزا دینا چاہتا تھا مگر تجربہ کار شجاعت خان نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔

”شہزادے! وہ ایک با اثر انسان ہے۔ اور جہاں تک میرے علم میں ہے، اس کے نواب بہادر پر کچھ احسانات بھی ہیں۔ اس لئے نجیب الدولہ پر اس طرح ہاتھ ڈالنا کئی سال کا پکار دے گا۔“

”پھر کیا میں خاموشی سے سرتا کے بہتے ہوئے آنسو دیکھتا رہوں؟“ ٹیپو، شجاعت خان کو اپنا بزرگ سمجھتا تھا اور ہمیشہ اس کے سامنے پست لہجے میں بات کرتا تھا۔ مگر آج خلاف معمول اس کی آواز بہت زیادہ بلند تھی۔ ”ایک تنہا لڑکی اپنوں اور غیروں کے ستم کب تک برداشت کرے گی؟ بس آج اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہئے کہ ریاست میسور میں سرتا رہے گی یا امیر نجیب الدولہ جیسے بھیڑیے۔“

”شہزادے!“ شجاعت خان نے بڑی محبت سے ٹیپو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں نے اپنی زندگی صرف دو بچوں کے لئے وقف کر دی ہے۔ پہلے تم اور بعد میں سرتا۔ میں نے اسے اپنی بیٹی بنایا ہے۔ اور ایک غیرت مند باپ کے لئے اس سے بڑی کاپی ہو سکتی ہے کہ کوئی ہوس پرست سرمایہ دار اس کی بیٹی کی بولی لگائے۔ میرے دل کی طرف

”میر شوکت علی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور علی احمد اسی رات تنہائی میں ٹیپو سلطان سے ملا۔“

”حضور! یہ ہے وہ رقم جو میر شوکت علی نے مجھے رشوت کے طور پر دی تھی۔“ علی احمد نے دو چھوٹی سی گٹھری، ولی عہد سلطنت کے سامنے کھول دی، جس میں روپیلی سکے بھرے ہوئے تھے۔ دراصل یتیم خانے کا نائب علی احمد، ٹیپو سلطان کا جاسوس تھا جسے اسی مقصد کے لئے رکھا گیا تھا کہ وہ غیر محسوس انداز میں سریتا دیوی کی نگرانی کرے۔ علی احمد بڑی ہوشیاری سے میر شوکت علی کا آئے کار بنارہا اور جب امیر نجیب الدولہ کا منصوبہ مکمل طور پر بے نقاب ہو گیا تو اس نے ٹیپو سلطان کے سامنے افشائے راز کر دیا۔

پندرہ سالہ ٹیپو، امیر نجیب الدولہ کی اس درندگی کو برداشت نہ کر سکا اور غصے سے بے قابو ہو گیا۔ وہ اسی وقت نجیب الدولہ کو گرفتار کر کے سخت ترین سزا دینا چاہتا تھا مگر تجربہ کار شجاعت خان نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔

”شہزادے! وہ ایک با اثر انسان ہے۔ اور جہاں تک میرے علم میں ہے، اس کے نواب بہادر پر کچھ احسانات بھی ہیں۔ اس لئے نجیب الدولہ پر اس طرح ہاتھ ڈالنا کئی سال کا پکار دے گا۔“

”پھر کیا میں خاموشی سے سرتا کے بہتے ہوئے آنسو دیکھتا رہوں؟“ ٹیپو، شجاعت خان کو اپنا بزرگ سمجھتا تھا اور ہمیشہ اس کے سامنے پست لہجے میں بات کرتا تھا۔ مگر آج خلاف معمول اس کی آواز بہت زیادہ بلند تھی۔ ”ایک تنہا لڑکی اپنوں اور غیروں کے ستم کب تک برداشت کرے گی؟ بس آج اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہئے کہ ریاست میسور میں سرتا رہے گی یا امیر نجیب الدولہ جیسے بھیڑیے۔“

سلطنت کا جواب سن کر شجاعت خان مکرانے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کے دل پر عہد شکنی کے گہرے سائے اُبھر آئے اور وہ بے تابانہ کمرے میں ٹپکنے لگا۔ آخری صبح کے قریب شجاعت خان کے چہرے کا تناؤ کم ہوا اور وہ پرسکون نظر آنے لگا۔ پھر اس نے نیپو کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی اور اپنے ایک ہندو خدمت گار، بھگوان داس کو لب کر کے کہا۔

”مجھے دو گرتے اور دھوتیاں فوراً فراہم کر دے۔“

”سرکار! اس کا کیا کریں گے؟“ بھگوان داس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”فردوس پڑ گئی ہے۔“ شجاعت خان نے سخت لہجے میں کہا۔

بھگوان داس بھاگتا ہوا اپنے مکان کی طرف چلا گیا اور نیپو سلطان، حیرت سے شجاعت خان کا منہ دیکھنے لگا۔

ای دوران شجاعت خان نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اس جاسوس کو بھی محل میں طلب کر لیا جس نے سری رنگ تاتھ مندر کے پجاری کو امیر نجیب الدولہ کی حویلی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

بھگوان داس مطلوبہ چیزیں لے کر حاضر ہو چکا تھا۔

”ارے! میں تلک کا سامان تو بھول ہی گیا۔ وہ بھی فوراً لے آ۔“ شجاعت خان نے اپنے رات گار کو دوسرا حکم دیا۔

بھگوان داس حیرت میں ڈوبا ہوا چلا گیا۔ جب وہ دوبارہ واپس آیا تو اتنی دیر میں شجاعت خان کا جاسوس بھی حاضر ہو چکا تھا۔

”اب تو ہم دونوں کو یہ لباس پہنا دے۔“ شجاعت خان نے بھگوان داس سے کہا۔

ہندو خدمت گار نے شجاعت خان اور سرکاری جاسوس کو دھوتی اور گرتہ پہنایا پھر دونوں کو لٹاتے پر تک لگا دیا۔

نیپو سلطان بھی شدید حیرت کے عالم میں شجاعت خان کا نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ آخر میں جب پہلا رات نے سرخ دستار اپنے سر پر باندھی اور نیلے رنگ کی پگڑی جاسوس کے حوالے کر دی۔

”بھگوان داس! میرے اس بہروپ کا راز تیرے سینے کے اندر ہی رہے۔“ شجاعت خان نے اپنے خدمت گار کو تنبیہ کی۔

”سرکار! اگر بد عہدی کروں تو زبان کاٹ دیجئے گا۔“ بھگوان داس نے رخصتی سلام کیا اور دونوں واپس چلا گیا۔

”شہزادے! میں کیسا لگ رہا ہوں؟“ بھگوان داس کے جانے کے بعد شجاعت خان نے گرتے ہوئے ولی عہد سلطنت سے پوچھا۔

نظر آ رہا تھا۔

”یہ گیدڑ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور بکھرے ہوئے ہیں۔“ شجاعت خان لفظوں کو چابکداری سے بکھیر رہا تھا۔ ”ایک شیر انہیں کہاں تک مارے گا؟ یہ بھاگ کر چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں چھپ جائیں گے۔“

”آپ نجیب الدولہ کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟“ نیپو کا گرم خون اسے جلد بازی پر اکسار رہا تھا۔ ”کیا اس کا جرم ثابت کرنے کے لئے سرتیلا کی گواہی کافی نہیں ہے؟“

”صبر سے کام لو شہزادے!“ شجاعت خان کے لہجے میں فہمائش کا رنگ شامل تھا۔ ”وہ بے

نواب بہادر سے معافی مانگ لے گا۔ پورا سرنگا پٹم جانتا ہے کہ وہ ایک ادبش انسان ہے۔ اگر

آوارہ فطری کا بہانہ کر کے سرکار کے پاؤں پکڑ لے گا اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ قانون گرفت سے نکل جائے گا۔“

نجیب الدولہ کا یہ جرم کسی سنگین نوعیت کا نہیں۔ مجھے تو اس کے جرم سے کسی اور ہی جرم کی یاد آ رہی ہے۔ سکون سے دیکھتے رہو کہ یہ گیدڑ کس کس لباس میں کہاں

کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ تمہیں بھی آئندہ زندگی میں ایسے بے شمار گیدڑوں سے واسطہ پڑے گا۔

اسی دن رات کے ابتدائی حصے میں ایک جاسوس نے خبر دی کہ امیر نجیب الدولہ بھی سری

رنگ تاتھ کے مندر میں داخل ہوا تھا اور کوئی دو گھنٹے بعد وہاں سے نکل کر اپنی حویلی پہنچا تھا۔

یہ اطلاع سن کر شجاعت خان کی نبض کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور چہرے کا رنگ زیادہ سرخ

گیا تھا۔ ”مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔“ شجاعت خان بے چینی کے ساتھ کمرے میں ٹپکنے لگا۔

اور اپنے دونوں ہاتھوں کو مل رہا تھا۔ ”جب سری رنگ تاتھ کے مندر کا پجاری نجیب الدولہ کی

حویلی تک آ سکتا ہے تو پھر نجیب الدولہ کے لئے بھی مندر جانا ضروری تھا۔“

نیپو سلطان حیرت سے اس شخص کا اضطراب دیکھ رہا تھا جو اس کا اتالیق بھی تھا اور باپ کی

طرح اس سے محبت کرتا رہا۔

نصف شب کے قریب ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ آج کی رات نجیب الدولہ راج

کرشنا کے محل کی طرف نہیں گیا۔

شجاعت خان کے لئے یہ ایک غیر معمولی خبر تھی۔ وہ رات بھر اپنے کمرے میں ٹپکتا رہا

ریاست میسور کے نائب سپہ سالار کی پیشانی ٹھکنوں سے بھری ہوئی تھی اور وہ گہری سوچ میں ڈوبا

ہوا تھا۔

نیپو بھی شجاعت خان کے ساتھ جاگ رہا تھا۔

”تم سو جاؤ شہزادے!“ شجاعت خان نے کئی بار ولی عہد سلطنت سے کہا تھا۔ ”تمہارا

خادم، یہ دربان جاگ تو رہا ہے۔“

”خادم نہیں، میرا شفیق بزرگ۔“ نیپو نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔ ”جب میرا بزرگ

اذیت میں مبتلا ہے تو میں کیسے سو جاؤں؟“

میں بڑی گرج تھی۔ مندر کا سیوک سنبل گیا۔ ”مہاراج اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ رات بھر کی پوجا نہیں تھا دیا ہے۔ اس وقت وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔“

”تم صرف ان کے کمرے تک ہماری راہنمائی کر دو۔ ہم خود مہاراج سے ملاقات کر لیں۔“ شجاعت خان نے ارادہ اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر لی تھی۔

”کیسے پجاری ہو کہ مہاراج کی آرام گاہ سے بھی واقف نہیں؟“ سیوک نے چونک کر شجاعت خان اور سرکاری جاسوس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک بھی تھی اور ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بھی۔

ایک معمولی دھرم سیوک، شجاعت خان جیسے ہوشیار کھلاڑی سے کس طرح جیت سکتا تھا۔ ”ہم راجستھان سے آئے ہیں، اس لئے یہاں کے منتظمین سے واقف نہیں۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ پجاری جی کے لئے کچھ تحائف لے کر آئے ہیں۔ وہ ان کی نذر کر کے کل ہی واپس لوٹ جانا چاہتے ہیں۔“

تحائف کا ذکر کرسن مندر کے سیوک نے حریصانہ نظروں سے شجاعت خان کی طرف دیکھا اور یہ کہتا ہوا پجاری کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

”آپ ٹھہریں، میں اسی وقت مہاراج کو خبر کرتا ہوں۔“

شجاعت خان زیر لب مسکرایا اور اپنے جاسوس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس دھرم سیوک کی قیمت چاندی کے چند سکوں سے زیادہ نہیں تھی۔ تم نے دیکھا کہ وہ کس طرح کھل گیا اور دولت کے سامنے خم ہو گیا۔“

سرکاری جاسوس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ”آپ کا اندازہ درست تھا۔“

”میں اندر جانے کے بعد تم سے گفتگو نہیں کروں گا۔“ شجاعت خان نے اپنے جاسوس کو آخری ہدایت دی۔ ”تقدیق کے لئے صرف تمہاری طرف دیکھوں گا۔ اگر وہ پجاری مطلوبہ شخص ہو تو تم جواب میں اپنی آنکھیں بند کر لو گے۔“

جیسے ہی شجاعت خان کی بات مکمل ہوئی، دھرم سیوک دوڑتا ہوا آیا اور ہرجوش لہجے میں کہنے لگا۔ ”مہاراج آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ جھکے ہوئے ہیں لیکن ان کی حالت ہے کہ وہ اپنے عقیدت مندوں کو شدید بیماری کی حالت میں بھی مایوس نہیں کرتے۔“

”واقعی، پجاری بہت عظیم ہیں۔“ شجاعت خان طنزاً مسکرایا مگر وہ دولت کا لالچی دھرم سیوک اس کے انداز گفتگو کی تنقید کو سمجھنے سے قاصر رہا۔

شجاعت خان نے اپنے گرتے کی جیب سے چاندی کے کچھ سکے نکال کر دھرم سیوک کے ہاتھ پر رکھے اور پجاری کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

مندرجہ بالا پجاری بڑے متکبرانہ انداز میں گاؤ تکیے کے سہارے فرش پر دراز تھا اور اس کی

”بہت شاندار!“ ٹیپو سلطان بھی اپنے اتالیق کا نیا رنگ دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ”ہائل راجپوتوں کی طرح۔“

”میرے ہندو ہونے پر کوئی شک تو نہیں کرے گا؟“ شجاعت خان کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

”ہرگز نہیں۔“ ٹیپو نے کہا۔ ”مگر اس تیاری کا مقصد؟“

”میں سری رنگ ناتھ کے مندر جا رہا ہوں۔“ شجاعت خان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”خدا کے لئے آپ میرے پیچھے کسی اضطراب کا مظاہرہ نہ کیجئے گا۔“

اس کے بعد شجاعت خان نے اپنے پچاس سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سادہ لباس میں مندر کے قریب رہیں۔

پھر وہ اپنے جاسوس کے ہمراہ قلعے سے باہر نکلا اور سرنگا پٹم کے سب سے بڑے بت کدے کی طرف پیدل ہی روانہ ہو گیا۔



شجاعت خان اپنے جاسوس کے ہمراہ اس طرح عقیدت کے ساتھ سر جھکا کر سری رنگ ناتھ کے مندر میں داخل ہوا جیسے وہ مذہباً ہندو ہو اور برسوں سے بتوں کو پوجتا آرہا ہو۔ سرکاری جاسوس نے اس کے طرز عمل پر کئی بار حیرت کا اظہار کیا تھا اور شجاعت خان نے ہر مرتبہ سرگوشیوں میں ڈانٹ دیا تھا۔

”تیرے جھجکتے ہوئے قدم اور چہرے پر پھیلی ہوئی حیرت دیکھ کر پجاریوں کو شک ہو جائے گا اور پھر ہماری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اس لئے اپنے حواس پر قابو رکھو اور ہندوؤں کی طرف دیکھ کر وہ کس طرح مندر میں داخل ہو رہے ہیں۔“

شجاعت خان کی آخری تنبیہ کے بعد سرکاری جاسوس سنبل گیا تھا مگر پھر بھی اس کے انداز و رفتار میں شجاعت خان جیسی بے ساختگی نہیں آئی تھی۔ ریاست میسور کا نائب سپہ سالار اپنے گرد و پیش سے بے خبر اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے وہ بھگوان کے درشن کا پیاسا ہوا اور اسے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ ہو۔ پوجا کے لئے آنے والے پجاری مرد اور عورتیں رک رک کر شجاعت خان کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اس سے زیادہ دلچسپی پجاری مندر میں کوئی دوسرا موجود نہیں تھا چھ فٹ کا قد، تھیکے نقوش، سرخ رنگ اور بڑی بڑی مونچھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مثالی راجپوت، دیوتاؤں کے قدموں میں سر جھکا کر آتا ہو۔ شجاعت خان بھی کبھی کبھی دزیدہ نظروں سے پجاریوں کے اس انداز نظر کو دیکھ لیتا تھا اور پہلے سے زیادہ محتاط ہو جاتا تھا۔

مندرجہ بالا حاطے میں پہنچ کر شجاعت خان نے ایک خدمت گار سے پوچھا جو چند پیدوں کی لالچ میں پوجا کے لئے آنے والوں کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ ”بڑے۔۔۔ ساری کہاں ہیں؟“ آواز

”یہ کیا ہو رہا ہے میرے حکم کے بغیر؟“ پجاری گھبرا گیا تھا۔  
 ”اتنی اتنی اہم ہے مہاراج!“ شجاعت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر ایک لفظ  
 ناکرے سے باہر چلا گیا تو سرنگاپٹم میں زلزلہ آ جائے گا۔“  
 پجاری ابھی شجاعت خان کی بات کا مفہوم سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ تلک دھاری برہمن اٹھ  
 اڑا۔ ”اگر اتنی ہی ضرورت اور اہم بات ہے تو میں کمرہ خالی کئے دیتا ہوں مہاراج!“  
 ”آپ بھی بیٹھ جائیے۔“ شجاعت خان نے اجنبی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میری گفتگو میں آپ کا  
 ہر ہونٹا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ چلے گئے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔“  
 ”نہیں۔“ تلک دھاری برہمن نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ ”میں کچھ دیر جھگوان کی پوجا  
 لیں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس عرصے میں آپ لوگ فارغ ہو جائیں گے۔“  
 شجاعت خان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ تلک دھاری برہمن اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکا۔ ”پوجا  
 بت گزر چکا ہے، اس لئے چپ چاپ بیٹھ جاؤ اور میری بات بہت غور سے سنو۔“  
 ”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ پجاری نے چیختے ہوئے کہا۔  
 ”اپنی آواز بجھ کر رکھ پجاری!“ یکا یک شجاعت خان غضب ناک نظر آنے لگا۔ ”مجھے پہچان  
 برے کیا ہری لباس پر نہ جا۔ میں راجستھان کا راجپوت نہیں، ریاست میسور کا نائب سپر  
 راجشاعت خان ہوں۔“  
 پجاری کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور تلک دھاری برہمن کے جسم پر لرزہ طاری  
 ہوا۔  
 ”آپ حلیہ بدل کر یہاں کس لئے آئے ہیں؟“ پجاری کی آواز کانپ رہی تھی۔  
 شجاعت خان نے تلک دھاری برہمن کو جھٹکا دیا۔ وہ منہ کے بل گرتے گرتے پچا۔ ”اپنے  
 بالوں کے جواب چاہتا ہوں۔ اگر تُو نے سچ بولا تو تیری زندگی کی ضمانت دیتا ہوں۔“  
 تلک خان کے ہونٹوں سے نفرت و غضب کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔ ”اور اگر جھوٹ بولا تو  
 اس وقت تیرے دیوتاؤں کی بھیئت چڑھا دوں گا۔ سارا سرنگاپٹم یہ منظر دیکھے گا کہ ایک  
 لاکھ خون سے دیوتاؤں کو کس طرح غسل دیا جاتا ہے۔“  
 موت کے خوف سے پجاری کی پٹلیاں کاپٹنے لگیں اور اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ شجاعت  
 خان کے قدموں کی طرف بڑھائے۔  
 ”اس کی ضرورت نہیں۔“ شجاعت خان نے پجاری کو ڈانٹا۔ ”اپنے ہاتھوں کو جنبش نہ دے  
 ناں کول!“  
 ”جھگوان کی سوگند! میں سچ ہی بولوں گا۔“ پجاری کی آواز اس طرح گھٹی گھٹی تھی جیسے فرشتہ  
 کا آواز اس کا گلا دبا رہا ہو۔  
 ”تو پھر بتا کہ کل امیر نجیب الدولہ کے یہاں کیوں گیا تھا؟“ شجاعت خان نے پجاری

دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ پجاری کے قریب ہی ایک اور تلک دھاری شخص بیٹھا ہوا تھا جو  
 اپنے خدوخال سے برہمن نظر آتا تھا۔ شجاعت خان نے پجاری پر نگاہ کی اور پھر فوراً ہی پلٹ کر  
 اپنے جاسوس کی طرف دیکھا۔ جاسوس نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں جس کا واضح مطلب تھا  
 کہ یہ وہی شخص ہے جو کل امیر نجیب الدولہ کی حویلی میں داخل ہوا تھا۔  
 ”تُو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟“ شجاعت خان کو خاموش پا کر پجاری تیز آواز میں  
 بولا۔ اس کے لہجے میں انتہائی غرور جھلک رہا تھا۔  
 شجاعت خان چند قدم آگے بڑھا اور آہستہ سے بولا۔ ”سورج جیسی راجپوت ہوں۔  
 سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے مہاراج کے درشن کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“  
 ”بیٹھ جا اور جلدی سے اپنا مقصد بیان کر۔“ پجاری کے لہجے میں بڑی رعوت تھی۔ ”جو کہ  
 لایا ہے، دیوتاؤں کے جرنوں میں چڑھا دے۔ ہمیں دھن دولت سے کوئی سروکار نہیں۔“  
 ”میں تھوڑی دیر کے لئے تنہائی چاہتا ہوں۔“ شجاعت خان آگے بڑھ کر بڑے ادب سے  
 پجاری کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”مجھے مہاراج سے بہت ضروری کام ہے۔ اور اس کے لئے مکمل تنہائی  
 درکار ہوگی۔ بس آپ اور میں..... تیسرا کوئی نہیں۔“  
 ”کیسی تنہائی؟“ پجاری نے پاؤں سیٹھے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے لہجے سے ناگواری کا  
 اظہار ہو رہا تھا۔ ”جو کچھ کہنا ہے، ان کے سامنے کہہ۔“ پجاری نے تلک دھاری شخص کی طرف  
 اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ میرے مہمان خاص ہیں اور  
 تیری ہی طرح بہت دُور سے آئے ہیں۔“  
 پجاری کی بات سن کر شجاعت خان کو اس اجنبی پر شک سا ہونے لگا۔ وہ شخص خود بھی کچھ  
 گھبرایا ہوا تھا۔ ”مجھ سے زیادہ سفر تو کسی نے بھی طے نہیں کیا ہوگا۔ کیا یہ بھی راجستھان سے  
 آئے ہیں؟ شکل سے تو اسی علاقے کے لگتے ہیں۔“ شجاعت خان نے بڑی ہوشیاری سے ایک  
 اور چال چلی تھی۔  
 پجاری، شجاعت خان کی چال کو نہیں سمجھ سکا اور بے اختیار بول اٹھا۔  
 ”یہ ارکاٹ سے آئے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ میرے معزز و محترم مہمان ہیں۔ اگر  
 تجھے اتنی ہی جلدی ہے تو کچھ دن سرنگاپٹم میں ٹھہر جا۔ جب میں ان کی تواضع سے ناراض  
 جاؤں گا تو پھر تیری بات سنوں گا۔“ پجاری کے غرور اور بے نیازی کا وہی عالم تھا۔  
 ارکاٹ کے ذکر پر شجاعت خان بری طرح چونک اٹھا تھا مگر اس نے اپنے چہرے سے کسی  
 تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔  
 ”تو پھر مجھے ان کے سامنے ہی سب کچھ کہہ دینا چاہئے۔“ شجاعت خان نے پلٹ کر اپنے  
 جاسوس کی طرف دیکھا۔ ”دروازہ بند کر دو۔“  
 جاسوس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پجاری کی نشست گاہ کی کنڈی لگا دی۔



پھر نواب ارکاٹ کے جاسوس کو لے کر پجاری کے کمرے سے نکل گیا۔ مندر سے باہر آنے کے بعد شجاعت خان نے والا جاہ محمد علی کے منبر کو اپنے چار سپاہیوں کے حوالے کرتے ہوئے حکم دیا۔ ”اے بحفاظت محل میں پہنچا دو اور سخت نگرانی کرو۔ میں بہت جلد نجیب الدولہ کو لے کر آتا ہوں۔“

”حضور جاں بخشی کا وعدہ فرما چکے ہیں۔“ نواب ارکاٹ کے جاسوس نے روتے ہوئے کہا۔ ”اے اپنی موت بہت قریب نظر آرہی تھی۔“

”ہمارا وعدہ، وعدہ ہے اور ہماری جانوں کے ساتھ ساتھ ہے۔ تیرے نواب کا وعدہ نہیں کرنا ان کی قسمیں کھا کر بھی منکر جاتا ہے۔ یقین کر کہ تجھے ریاست میسور کی حدود میں موت نہیں آئے گی۔ اب آگے تیری قسمت۔“

نواب ارکاٹ کا جاسوس لرزتے قدموں کے ساتھ محل کی طرف چلا گیا اور شجاعت خان نے سادہ لباس سپاہیوں کے ساتھ مندر کے دروازے پر کھڑے ہو کر امیر نجیب الدولہ کا انتظار کرنے لگا۔

آز پویل انتظار کے بعد نجیب الدولہ مندر پہنچا۔ وہ بھی انتہائی شاطر اور ہوشیار انسان تھا۔ شجاعت خان کی طرح ہندو نہ لباس میں آیا تھا۔ میسور کا ایک سپاہی بھی اسے نہ پہچان سکا۔ شجاعت خان بھی دھوکا کھا گیا تھا مگر جب نجیب الدولہ اس کے قریب سے گھبرایا ہوا گزرا تو اسے شک ہو گیا۔ اسی شک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شجاعت خان نے اسے بلند آواز سے پکارا۔

”امیر نجیب الدولہ! آپ یہاں کیسے؟“

اٹھائیس سال کا نجیب الدولہ انتہائی بدحواسی کے عالم میں پلٹا۔ اس کے قریب ہی شجاعت خان ایک ہندو کے لباس میں کھڑا تھا۔ نجیب الدولہ اسے پہچان گیا مگر فوراً ہی بات بدل کر بولا۔

”میرا نام نجیب الدولہ نہیں ہے۔“

”مگر شکل تو اسی جیسی ہے۔“ شجاعت خان مسکرایا۔ ”میسور کے رئیس اعظم! چپ چاپ میرے ساتھ محل چلے چلو۔ تمہارے چاروں طرف میسور کے جانناز سپاہیوں کا حصار ہے۔ اگر ان حصار کو توڑنے کی کوشش کی تو جان سے جاؤ گے۔“



شیو سلطان نے تمام واقعات سنے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر شدت نفرت و غضب سے اس کا چہرہ بخٹنے لگا۔

”مگر تم! اب نجیب الدولہ کے قتل کرنے میں کیا عذر مانع ہے؟“ شیو احتراماً اپنے اتالیق شجاعت خان کو پوچھا کہہ کر پکارتا تھا۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حیدر علی، شجاعت خان کو اپنا چاہتا تھا اور اسی رشتے کے سبب حراسرا کی خواتین شجاعت خان سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔

”نہیں شہزادے! اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں۔“ شجاعت خان نے بزرگانہ لہجے میں شیو کو

سے پہلا سوال کیا۔

”میں ایک نزدِ حق (غریب) پجاری ہوں اور وہ میرے ان داتا ہیں۔“ پجاری کھلا جھوٹ بول رہا تھا۔ ”میں اکثر امیر کے یہاں جاتا ہوں اور وہ میری پھیلی ہوئی جھولی کو بھر دیتے ہیں۔“

شجاعت خان، پجاری کا جواب سن کر مسکرایا۔ پھر اس نے اپنے پیرہن کے نیچے سے خمر آبدار نکالا اور اسے پجاری کی گردن پر رکھ دیا۔

”اتنا بڑا جھوٹ؟ اپنی زبان کو سچ بولنے پر مجبور کر پجاری! ورنہ میں تیری شرک و کدوں گا۔“

موت کو اس قدر نزدیک پا کر سری رنگ تاتھ مندر کے پجاری نے وہ خوف ناک راز انکس دیا جو بہت دنوں سے اس کے سینے کی گہرائیوں میں پروش پارہا تھا۔

”میں امیر نجیب الدولہ کے پاس ایک ضروری کام سے گیا تھا۔“ پجاری کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں اپنے جرم کا اعتراف کر رہا تھا۔

”پجاری! ہوش کی باتیں کر۔ تجھے یہ افشائے راز بہت مہنگا پڑے گا۔“ پجاری کی گفتگو درمیان ہی وہ تلک دھاری برہمن چیخنے لگا۔ ”تیرے ہونٹوں کی جنبش تیری موت کا سبب بن سکتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اجنبی شخص کمرے سے باہر جانے لگا تو شجاعت خان اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا خمر اس کے حلق پر رکھ دیا۔ تلک دھاری برہمن پر بھی نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ دیکھنے ہی دیکھتے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

پجاری نے شجاعت خان کو بتا دیا کہ یہ شخص برہمن نہیں، نواب ارکاٹ کا مسلمان جاسوس ہے جو والا جاہ محمد علی کا ایک خاص پیغام لے کر امیر نجیب الدولہ کے پاس آیا تھا۔ حقائق مندر کے طور پر مجھے نجیب الدولہ کے پاس بھیجا گیا۔ اور اس نے ایک ہندو کا لباس پہن لیا تاکہ دیکھنے والوں کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔

شجاعت خان نے نواب ارکاٹ کے جاسوس سے باز پرس کی تو اس نے جاں بخشی کا وعدہ لے کر صاف صاف بتا دیا۔

”میں نواب والا جاہ محمد علی کا ایک خفیہ پیغام لے کر امیر نجیب الدولہ کے پاس آیا تھا۔ دراصل نجیب الدولہ نواب ارکاٹ اور نظام دکن کا جاسوس ہے۔ وہ آئے دن ان دونوں کی ریاست کی اہم خبریں بھیجتا رہتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ نواب ارکاٹ کے خط کا جواب لے کر آتا ہی ہوگا۔“

شجاعت خان فوراً اپنے جاسوس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اپنے سپاہیوں سے کہہ دو کہ مجھے ہی امیر نجیب الدولہ نظر آئے، اسے گرفتار کر لیا جائے۔“

یہ کہہ کر شجاعت خان اٹھا اور سری رنگ تاتھ مندر کے پجاری کو سخت الفاظ میں تہیہ کرتے ہوئے بولا۔ ”جو کچھ ہوا، اسے خواب سمجھ کر بھول جا۔ زبان بند رکھے گا تو اماں پا جائے گا۔“

کر جائیں۔“

شجاعت خان کی گفتگو سن کر ٹیپو سلطان بھی اُداس نظر آنے لگا تھا۔  
 ”نہیں شہزادے! تمہیں اتنا غم زدہ نہیں ہونا چاہئے۔“ فرطِ محبت میں شجاعت خان، ولی  
 سلطنت کے رخساروں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ”میں یہ سارے واقعات اس لئے دہراتا ہوں  
 کہ تم اپنے ذہن کو ہر صورتِ حال کے لئے آمادہ کر سکو۔ جب تک تمہارے بزرگ زندہ ہیں،  
 نہیں مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں۔“



نجیب الدولہ کے مکان پر سپاہیوں کا سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا اور خود امیر کو محل کے  
 ایک محفوظ ترین تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ نجیب الدولہ نے کئی بار شجاعت خان کو پیشکش  
 کی تھی۔

”مجھے مرنے سے بچالے شجاعت خان!“ یہ کہتے کہتے امیر رونے لگا۔ ”میرے پاس جو  
 کچھ ہے، وہ سب تیرا ہے۔ یہ سیم وزر کے انبار، یہ عالی شان حویلی، میں ایک ایک چیز تیرے  
 نام کر دوں گا۔ بس مجھے دو کپڑوں میں یہاں سے چلا جانے دے۔“

”نجیب الدولہ! تیری پیش کردہ رشوت بہت کم ہے اور میری قیمت بہت زیادہ۔“ شجاعت  
 خان بڑے عجب انداز میں مسکرایا۔ ”پہلے ساری دنیا کے خزانے جمع کر لے، پھر میرے طرف کو  
 آؤ۔ اس کے بعد تجھے اندازہ ہو گا کہ میں کون ہوں۔“

نجیب الدولہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا، اس لئے موت کو یاد کر کے دن رات رویا کرتا  
 تھا۔ کبھی بھی اس پر ہدیان کا دورہ پڑتا اور زندان کی دیواروں سے سر ٹکرا کر چیختے لگتا۔

”حرام کارو! تمہاری رفاقت نے مجھے اس جہنم تک پہنچا دیا۔ تم کہاں ہو؟ اور میری مدد کو  
 کیوں نہیں آتے؟“ امیر نجیب الدولہ غائبانہ طور پر نواب ارکاٹ اور نظام دکن کو گالیاں دیا کرتا  
 تھا۔ ان دونوں حاکموں نے نجیب الدولہ کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ جاسوسی کے دوران پکڑا گیا تو  
 نواب ارکاٹ اور نظام دکن، حیدر علی پر سفارتی دباؤ ڈال کر اس کی جان بچالیں گے۔ بالقرض  
 اگر حیدر علی نے اس دباؤ کو قبول نہیں کیا تو وہ دونوں مل کر میسور پر حملہ کر دیں گے اور اسے حیدر  
 علی کی گرفت سے چھڑا لیں گے۔ امیر نجیب الدولہ کو تہہ خانے کی تاریکیوں میں والا جاہ محمد علی پور  
 نظام علی خان کے عہدِ ویمان یاد آ رہے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ شدید حالتِ اضطراب میں اپنے  
 دونوں آقاؤں کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ مگر نواب ارکاٹ اور نظام دکن کس طرح اس کی مدد کو  
 آتے؟ وہ تو خود انگریزوں کے پیروں پر سر رکھے نواب حیدر علی کی تباہی و بربادی کی بھیک مانگ  
 رہے تھے۔



اسی دوران ٹیپو سلطان نے یتیم خانے کے نائبِ منتظم علی احمد کے ذریعے سریتا دیوی کو محل

سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”محرم ہاتھ آ گیا ہے، اس کی قسمت کا فیصلہ خود نواب بہادر کریں گے۔“  
 ”نواب بہادر اسے معاف تو نہیں کر دیں گے؟“ ٹیپو فکر مند نظر آ رہا تھا۔

”شہزادے! تم نجیب الدولہ کے بارے میں اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“ شجاعت  
 خان نے ولی عہدِ سلطنت سے پوچھا۔

”میں اُسے خاک و خون میں نہایا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، اس کے سوا میری کوئی خواہش  
 نہیں۔“ ٹیپو کا چہرہ بھی جل رہا تھا اور لہجہ بھی۔ ”اس نے سریتا کو بہت آزار پہنچایا ہے اور اس  
 معصوم لڑکی کی بڑی تحقیر کی ہے۔“

شجاعت خان نے بڑی عجیب نظروں سے ٹیپو سلطان کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچے  
 ہوئے بولا۔ ”شاید وہ سریتا کے جرم میں تو معاف کر دیا جائے گا مگر اس کا دوسرا جرم بہت عظیم  
 ہے۔ نجیب الدولہ اس جرم کی پاداش میں زندہ نہیں بچے گا۔“

”وہ کس طرح؟“ ٹیپو ساری تفصیلات جاننے کے لئے بے قرار نظر آ رہا تھا۔

شجاعت خان نے وہ طویل خط ولی عہدِ سلطنت کے سامنے رکھ دیا جو امیر نجیب الدولہ نے  
 نواب ارکاٹ کے خط کے جواب میں تحریر کیا تھا۔

”حضور والا! آپ کا غضب نامہ موصول ہوا۔ بے شک! میں اپنا وعدہ وفانہ کر سکا۔ مگر  
 پر بے پروائی اور کاہلی کا الزام سراسر غلط ہے۔ حیدر علی کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ  
 رہے ہیں۔ میں نواب میسور کے خاص خدمت گاروں کو خریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے  
 لئے لاکھوں کی رقم درکار ہوگی۔ آپ جلد از جلد مجھے مطلوبہ رقم فراہم کر دیجئے۔ پھر جس روز حیدر  
 علی کے خدام میرے ہاتھوں اپنے ضمیر فروخت کر دیں گے، اسی دن والی میسور کا کام تمام ہو  
 جائے گا۔“

یہ وہ خط تھا جو تلاش کے وقت نجیب الدولہ کی جیب سے برآمد ہوا تھا اور اسی خط کو نواب  
 ارکاٹ تک پہنچانے کے لئے نجیب الدولہ، سری رنگ ناتھ کے مندر پہنچا تھا۔ مگر شجاعت خان  
 نے بروقت اقدام کر کے اس کا سارا منصوبہ الٹ دیا تھا۔

نجیب الدولہ کا خط پڑھ کر ٹیپو سلطان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”معاذ اللہ! مسلمانوں  
 کے ہمیں میں ایسے ایسے غدار بھی موجود ہیں۔“

”شہزادے! ایسا لگتا ہے کہ جیسے دنیا بھر کے غدار ہمارے ہی حصے میں آئے ہیں۔“  
 شجاعت خان کے لہجے میں بڑی غلش تھی۔ ”نواب بہادر نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کچھ  
 کرنے کے لئے بڑے ڈکھ برداشت کئے ہیں۔ مگر جب تک اس زمین پر نواب ارکاٹ، نظام  
 دکن اور نجیب الدولہ جیسے بے ضمیر انسان موجود ہیں، اس وقت تک ہم سب کے دل و دماغ  
 سلگتے ہی رہیں گے اور ہمارے سینوں سے دھواں اُٹھتا ہی رہے گا۔ خدا نہ کرے کہ یہ دھواں کسی  
 دن پورے ہندوستان پر چھا جائے اور مسلمانوں کی تقدیریں اس کا کثف دھوئیں کا ایک حصہ بنیں۔“

”میرے معاف کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“ ٹیپو کی حالت غضب میں کوئی کی نہیں آئی تھی۔  
 ”میں نے اسے معاف نہیں کیا۔ تو اس کے منہ پر تھوک دے سریتا! کہ شاید اس طرح میری  
 بیانیہ کچھ ازالہ ہو جائے۔“

ٹیپو دیوی حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے اپنے حوالے سے ٹیپو کی یہ کیفیت پہلے کبھی نہیں  
 سہی۔ ”جانے دیں کنورا!“ سریتا نے ایک بار پھر ٹانے کی کوشش کی۔

”یہ میرا حکم ہے سریتا!“ ٹیپو کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔ ”سید صاحب نے بارہا میرے  
 اے حضرت عمر کا یہ قول دہرایا ہے کہ ظالم پر رحم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مظلوم کے ساتھ  
 لٹائی کی جائے۔“

سریتا سنبھل گئی۔ ”کنورا میں آپ کے حکم پر جان دینے کا حوصلہ رکھتی ہوں مگر یہ عمل آپ  
 کے انسان کے شایان شان نہیں ہے۔“ سریتا بڑی ذہانت سے ٹیپو کے غصے کی آگ کو سرد کرنے  
 کی کوشش کر رہی تھی۔

ٹیپو نے غور سے سریتا کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی عجیب لڑکی تھی۔  
 ”پھر میرے مقدمے کا فیصلہ کیسے ہوگا؟“ ولی عہد سلطنت کی ظاہری حالت میں کسی قدر  
 ڈال آ گیا تھا۔

”میں نے اپنا معاملہ اس پر چھوڑ دیا ہے کہ جس کی آنکھ سے حقیر ترین ذرہ بھی پوشیدہ نہیں  
 ہے۔“ لاکھ سریتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”میں اسی کے دربار میں فریادی ہوں اور  
 اسے شکایت کرتی ہوں۔“

”اس کا حکم ہے کہ برائیوں کے خلاف جنگ کرو۔“ ٹیپو، سریتا کے اس طرز عمل پر ہنچلایا  
 داتا۔

”جنگ ہی تو کر رہی ہوں۔ مگر تمہیں میرے ہتھیار نظر نہیں آتے۔“ سریتا نے آنسوؤں کو  
 پٹے ہوئے کہا۔

”بہر حال، میں اس بدکار کو اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔“ ٹیپو سلطان ایک بار پھر مشتعل  
 غرا رہا تھا۔

”میں کنورا آپ اسے میرے حوالے سے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں نے اسے معاف کر  
 لیا۔ اب سریتا کے لہجے میں بے انتہا استقامت تھی۔ ”خدا کے لئے مجھے اس اندھیرے سے  
 بے بس چلے۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”جب ٹیپو، سریتا کو لے کر تہہ خانے سے نکل آیا تو سریتا نے ولی عہد سلطنت سے پوچھا۔  
 ”کنورا! آپ کو ان باتوں کی خبر کیسے ہوئی؟“ سریتا کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار  
 نمایاں تھے۔

”مجھے تیرے ہر گزرنے والے لمحے کی خبر ہوتی ہے۔“ ٹیپو نے پرجوش لہجے میں کہا۔

میں طلب کر لیا۔ سریتا دیوانہ وار دوڑی ہوئی چلی آئی۔ اسے اس کے محبوب نے بلایا تھا۔ سریتا  
 ولی عہد سلطنت کے سامنے آئی تو جوش جذبات اور شرم و حیا سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔  
 ”تم کیسی ہو سریتا؟“ ٹیپو سلطان اکثر خواتین سے نظریں جھکا کر بات کرتا تھا۔ اور  
 جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ سریتا اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے تو وہ اور بھی زیادہ محتاط  
 ہو گیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں کنورا!“ سریتا فطرتاً بڑی جرأت مند اور بے باک لڑکی تھی مگر محبوب کی  
 قربت نے اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش پیدا کر دی تھی۔ ”اور آپ کیسے ہیں؟“ سریتا نے کہا،  
 بعد ٹیپو کو دیکھا تھا، اس لئے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھے ہی چلی جا رہی تھی۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔“ ٹیپو کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ ”بس نواب بہادر کی طرف  
 سے فکر لگی رہتی ہے۔ تنہا اتنی بڑی مہم پر گئے ہیں اور دشمن کے گھر میں داخل ہو گئے ہیں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں کنورا!“ یہ کہتے ہوئے سریتا دیوی، ٹیپو سلطان کے قریب ہی بیٹھ  
 گئی۔ ”وہ بختم خدا خیر و عافیت سے واپس آئیں گے اور ان کے سر پر نئی فتح کا تاج جگمگا رہا ہو  
 گا۔“

”تمہیں یتیم خانے کے منتظمین سے کوئی شکایت تو نہیں؟“ ٹیپو اپنے اصل مقصد پر لوٹ آیا۔  
 ”کوئی شکایت نہیں۔“ سریتا کے لہجے میں طنز کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ”سب لوگ بہت محنت  
 اور ادب سے پیش آتے ہیں۔“

”اب تم بھی جھوٹ بولنے لگی ہو؟“ ٹیپو نے نظریں اٹھا کر سریتا کی طرف دیکھا جس کے  
 چہرے پر مسرت و آسودگی موجزن تھی۔

”نہیں کنورا! مجھے جھوٹ سے کوئی نسبت نہیں۔“ سریتا کے لہجے میں وہی ٹھہراؤ تھا۔  
 ”میرے ساتھ آؤ۔ پھر تم اپنی آنکھوں سے اپنے جھوٹ کو دیکھ سکو گی۔“ ٹیپو شدید غصے کی

حالت میں اٹھ کھڑا ہوا۔  
 سریتا سہم سی گئی۔ اس نے پہلی بار ولی عہد سلطنت کو اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔

پھر ٹیپو سلطان، سریتا کو لے کر اس تہہ خانے میں پہنچا جہاں امیر نجیب الدولہ قید تھا۔  
 ”اسے پہچانتی ہو؟“ ٹیپو انتہائی تلخ لہجے میں سریتا دیوی سے مخاطب ہوا۔

سریتا کیا جواب دیتی؟ نجیب الدولہ کو اس حالت میں دیکھ کر اسے سکتے سا ہو گیا تھا۔ ”  
 سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سرنگاپٹم کے ایک طاقتور امیر کو اس طرح حوالہ زنداں کیا جاسکتا ہے؟“

”یہ وہی ہوں کار جاگیر دار ہے جو اپنی دولت کے ڈھیر سے تجھے خریدنا چاہتا تھا۔“ شیریں  
 گفتار ٹیپو کی زبان سے اس وقت آگ برس رہی تھی۔ ”اور تو اسے نہیں پہچانتی؟“

”پہچانتی ہوں کنورا! مگر میں اسے معاف بھی کر چکی ہوں۔“ سریتا نے سہجے ہوئے لہجے  
 میں کہا۔

”گورنر مدراس کو معلوم تھا کہ حیدر علی پڑھنا لکھنا نہیں جانتا اس لئے وہ والی  
بھڑک کر دوں گا۔“

حیدر علی نے فوراً میر علی رضا خان کی طرف دیکھا۔ میر علی رضا خان، فاطمہ بیگم کا حقیقی بھائی  
حیدر علی کا حقیقی ماموں تھا۔ میر علی رضا خان نے گورنر مدراس سے کاغذ، قلم اور دوات طلب  
کئے۔ پھر حیدر علی بولتا رہا اور میر علی رضا خان لکھتا رہا۔

”آئندہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے۔ دونوں فریق مقبوضہ علاقے اور  
بقی بقایا واپس کر دیں گے۔ کرور کا علاقہ جو والا جاہ محمد علی کی ملکیت تھا، آئندہ نواب حیدر علی  
کی ملکیت قرار پائے گا۔“

معاہدے کی آخری شرط یہ تھی کہ والا جاہ محمد علی، نواب حیدر علی کو چھ لاکھ روپے سالانہ ”نعل  
بندی“ کے طور پر ادا کرے گا۔

گورنر مدراس نے شرائط نامہ پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں  
سکتا تھا کہ ایک ”ان پڑھ“ حکمران اتنا بڑا مدبر ثابت ہو گا۔ حیدر علی نے بڑی ہوشیاری سے  
انگریزوں کو نواب ارکٹ اور نظام دکن سے الگ کر دیا تھا۔

”نواب بہادر! یہ شرائط بہت سخت ہیں۔“ گورنر نے شکست لہجے میں کہا۔  
”تو پھر میں واپس جا رہا ہوں۔“ نواب حیدر علی ناگواری کے عالم میں اپنی نشست پر کھڑا  
ہو گیا۔ ”مگر یاد رکھنا کہ بہت جلد دوبارہ مدراس آؤں گا۔ پھر میں اپنی تلوار کی نوک اور بارود کی  
سیاہی سے دوسرا معاہدہ تحریر کروں گا۔“

آخر گورنر مدراس نے والی میسور کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس نے دستخط کرنے کے  
لئے قلم اٹھا تو حیدر علی نے اسے یہ کہہ کر روک دیا۔

”میں کبھی کو فریق تسلیم نہیں کرتا، اس لئے یہ معاہدہ میرے اور شاہ انگلستان کے درمیان  
تحریر کیا جائے۔“

نواب حیدر علی کے حکم پر معاہدے کی عبارت تبدیل کی گئی اور گورنر مدراس نے شاہ انگلستان  
کی طرف سے دستخط کئے۔ اس کے بعد حیدر علی نے دستاویز پر دو آڑی لکیریں کھینچ کر اپنے دستخط  
ثبت کر دیئے۔

گورنر مدراس ہنس پڑا۔

حیدر علی اس کی ہنسی کا مفہوم سمجھتا تھا۔ ”کاغذ کی لکیروں کو کیا دیکھتا ہے؟ میری پیشانی کی  
لکیروں کو دیکھ، جنہیں قدرت نے اپنے ہاتھ سے کھینچا ہے۔“ حیدر علی کی پُر جلال آواز سن کر  
دربار پر سناٹا چھا گیا اور گورنر مدراس نے احساسِ مذمت سے سر جھکا لیا۔

اس وقت کرنل اسمتھ کی پچیس سالہ حسین و جمیل بیٹی ماریا اسمتھ بھی موجود تھی اور نواب  
حیدر علی کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھ رہی تھی۔ جب والی میسور نے ہر طرح اپنی برتری ثابت

”میرے جاسوس تجھے کبھی تباہ نہیں چھوڑتے۔“

”آخر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟“ ایک بار پھر سرتا کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔

”اس لئے کہ تو نے میری خاطر اپنی زندگی برباد کر ڈالی ہے۔“ یہ کہتے کہتے بچہ کی نظریں  
جھک گئیں۔

”زندگی برباد کہاں ہوئی ہے؟ اور زیادہ سنو رہی ہے۔“ سرتا کے ایک ایک آنسو میں  
کا سمندر موجزن نظر آ رہا تھا۔

”تیری یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“ بچہ کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

”ابھی میری ریاضت نامکمل ہے کنور! جب مکمل ہو جائے گی تو پھر میری ہر بات تمہاری  
سمجھ میں آنے لگے گی۔“ یہ کہہ کر سرتا حرم سرا میں چلی گئی۔ پھر کچھ دیر بچہ کی دادی مجیدہ بیگم اور  
والدہ فاطمہ بیگم سے گفتگو کرتی رہی، اس کے بعد محل سے نکل کر یتیم خانے کی طرف چلی گئی۔

جب بچہ نے شجاعت خان سے اس واقعے کا ذکر کیا تو وہ بھی بے قرار ہو گیا۔

”میں کیا کہوں شہزادے؟ میری تو زبان ہی کٹ گئی ہے۔“ شدت کرب سے شجاعت خان  
کا چہرہ دھواں دینے لگا تھا۔ ”اس لڑکی نے میرے سینے پر بڑا بھاری بوجھ ڈال دیا ہے اس کی  
تہائی مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتی۔“ یہ کہتے کہتے شجاعت خان کی آنکھوں کے سامنے اس کا  
اذیت ناک ماضی ابھر آیا۔ پھر ماضی کے اسی غبار سے زینت جہاں کا چہرہ ابھرنے لگا۔  
”شجاعت خان! مجھے بچالو۔“ ہر طرف ایک شور مچا رہا تھا۔ جیسے پوری کائنات ماتم کدہ بن گئی ہو۔

شجاعت خان اپنی محبوبہ زینت جہاں کو بوڑھے زمیندار امر او خان سے نہیں بچا سکا تھا۔ پھر گزشتہ  
ماہ وہ سال نے جنگور کے ایک مفلس کسان کو ریاست میسور کا نائب سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اس  
دوران شجاعت خان جنگی مہمات کے سلسلے میں کئی بار جنگور جا چکا تھا مگر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں  
دیکھا کہ زینت جہاں کس حال میں ہے؟ آج بچہ نے سرتا کا ذکر چھیڑا تو اس کے زخم ایک بار  
پھر خون دینے لگے اور وہ دلی عہدِ سلطنت کے سامنے سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور معصوم بچہ یہ راز  
نہیں سمجھ سکا کہ سرنگ پٹم میں صرف دو ہی سوختہ جاں ہیں جو ایک کے ہو گئے تو پھر دوسرے کی  
طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

امیر نجیب الدولہ کی تقدیر کا فیصلہ نواب حیدر علی کی آمد تک ملتوی کر دیا گیا تھا اور حیدر علی  
بڑی عجیب شان کے ساتھ گورنر مدراس کے دربار میں بیٹھا انگریزوں کے پیش کردہ معاہدے کی  
شرائط سن رہا تھا۔



انگریز کئی ایسی شرائط پیش کر چکے تھے جو نواب حیدر علی کے لئے قابلِ قبول نہیں تھیں۔  
آخر گورنر مدراس نے شدید بے چارگی کے عالم میں کہا۔

”نواب بہادر! آپ خود ہی شرائط تحریر فرمادیں۔ میں کسی جیل و جت کے بغیر معاہدے؟“



بیٹے ہیں۔ والی میسور ایک ممبر کی ناک جو ہاتھی کی سوڈ کے مشابہہ ہے، پکڑ کر کھینچ رہا ہے اور اس میں سے اشرفیاں گر رہی ہیں۔ تصویر کے کونے میں کرنل اسمتھ صلح نامہ لئے کھڑا ہے اور دوسرے ہاتھ سے تلوار توڑ کر زمین پر رکھ رہا ہے۔

اس منظر کو مدراس کے ایک ماہر سنگ تراش نے بڑی خوب صورتی سے پتھر پر منتقل کیا تھا۔ حیدر علی نے سنگ تراش کو بڑے انعام و اکرام سے نوازا اور پھر یہ کتبہ قلعہ سینٹ جارج کے دروازے پر آویزاں کر دیا گیا۔

انگریزوں کی یہ دوسری شکست تھی۔ نواب حیدر علی نے دشمن کے گھر میں بیٹھ کر اپنے جلال و جبروت کا عجیب مظاہرہ کیا تھا۔

اس کتبے کو دیکھ کر کرنل اسمتھ اپنی بیٹی ماریا پر برس پڑا تھا۔ ”تو حیدر علی کی محبت میں گرفتار ہے اور اس نے تیرے باپ کی رسوائی کے منظر کو تاریخ کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔“

ماریہ خاموش بیٹھی رہی اور کرنل اسمتھ بیٹی پر غصہ اتارتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر بستر پر گر گیا۔

قلعے پر کتبہ آویزاں کرنے کے بعد حیدر علی مدراس سے رخصت ہونے والا تھا۔ اسی دن آدھی رات کے قریب حیدر علی کے ایک محافظ نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

”ایک انگریز عورت، نواب بہادر سے ملنا چاہتی ہے۔“

والی میسور نے اس خبر کو بڑے تعجب سے سنا اور پھر اشارے سے کہا کہ آنے والی خاتون کو اندر بھیج دیا جائے۔

فرنگی عورت حیدر علی کے خلوت کدے میں داخل ہوئی تو والی میسور حیرت زدہ رہ گیا۔ ماریہ اسمتھ بڑی شکستہ حالت میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”دختر فرنگ! تم اس وقت؟“ نواب حیدر علی نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے نواب! بڑی مشکل سے تم تک پہنچی ہوں۔“ ماریہ اسمتھ اس طرح بول رہی تھی، جیسے اسے بہت غلت ہو۔ ”میرے باپ اور میری قوم کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں تم جیسے مرد شجاع کی تعریف کر سکوں۔ اور میرے نزدیک ان لوگوں کا یہ رویہ کچھ تعجب خیز بھی نہیں کہ میں اپنی قوم کو خوب پہچانتی ہوں۔“

”آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو ماریا؟“ نواب حیدر علی کی حیرت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

”میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ میری قوم پر زیادہ اعتبار نہ کرنا کہ اس کے قول و فعل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ ماریہ اسمتھ نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ”تم کل مدراس سے چلے جاؤ گے۔ میں آخری بار تمہیں دیکھنے کے لئے آئی تھی۔“ یہ کہہ کر ماریہ اسی انداز میں نواب حیدر علی کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئی، جس کا مظاہرہ اس نے مدراس کے دربار میں کیا تھا۔

والی میسور سمجھتا تھا کہ دختر فرنگ کیا چاہتی ہے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

کر دی تو ماریہ اسمتھ بے قرار ہو کر اپنی نشست سے اٹھی اور حیدر علی کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل جھک گئی، پھر دختر فرنگ نے انتہائی والہانہ انداز میں والی میسور کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ حیدر علی، انگریزوں کی اس رسم سے واقف تھا اس لئے ایک انگریز خاتون کی اس ادب سے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ پرسکون انداز میں خاموش بیٹھا رہا۔

انگریزوں کے دربار پر سکوت مرگ طاری تھا۔ کرنل اسمتھ کا چہرہ منحنی ہو کر رہ گیا تھا اور گورنر مدراس کی صورت پر خاک اڑ رہی تھی۔

پھر بھرے دربار میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے بعد ماریہ اسمتھ کھڑی ہو گئی اور اس نے انتہائی سرشار لہجے میں نواب حیدر علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہندوستان کے مرد شجاع کو دختر فرنگ کا سلام۔ میری آنکھوں نے تجھ جیسا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ نہ ارض یورپ میں، نہ دیار ہند میں۔ تو زلزلے کی طرح آیا اور طوفان برق و باد کی طرح چھا گیا۔ کون ہے جو اس طرح دشمن کے گھر بیٹھ کر اپنی بات کو منوائے گا؟ نہیں، کوئی نہیں۔ تیرے سوا کوئی نہیں۔ کاش! میں زندگی کے سفر میں تیری کنیز ہوتی اور اس اعزاز پر آفری سانس تک فخر کرتی۔ یسوع تجھے ہر بلا سے محفوظ رکھیں اور تیرے دامن میں اس قدر نجات ہوں کہ تو ہندوستان کا ایک ایک گوشہ اپنے قدموں سے روند ڈالے۔“

جب حیدر علی کے ترجمان نے اسے ماریہ اسمتھ کے جذبات سے آگاہ کیا تو نواب حیدر علی بھی اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا۔

”دختر فرنگ کے لئے والی میسور کی بے شمار دعائیں کہ وہ ایک عظیم خاتون ہیں اور یورپ کا سرمایہ افتخار ہیں۔ میں انہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“ یہ کہہ کر حیدر علی نے اپنا قیمتی ہار اتارا اور ماریہ اسمتھ کے گلے میں ڈال دیا۔ ”حیدر علی کی طرف سے ایک حقیر تحفہ۔“

ماریہ اسمتھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ایک بار پھر والی میسور کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

گورنر کے دربار میں موجود تمام انگریز بچے بچھے نظر آرہے تھے۔ ایک تو حیدر علی کی شرافت و ذلت آمیز معاہدہ اور دوسرے ماریہ اسمتھ کی جنونی محبت کا مظاہرہ۔

گورنر مدراس نے تنہائی میں کرنل اسمتھ کو بہت ڈانٹا۔ ”آج تیری بیٹی نے پوری انگریز قوم کو زسوا کر دیا۔“

”اس میں رسوائی کی کیا بات ہے؟“ کرنل اسمتھ نے بیٹی کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

”ماریہ بہادروں کو پسند کرتی ہے اور بلاشبہ حیدر علی ایک مرد شجاع ہے۔“

گورنر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

اور اس وقت انگریزوں کے بیچ و تاب میں مزید اضافہ ہو گیا، جب حیدر علی کے حکم پر پھر کا ایک کتبہ تیار کیا گیا۔ اس کتبے میں گورنر مدراس اور کونسل کے اراکین، حیدر علی کے سامنے دروازہ

ماریا اسمتھ نے نواب حیدر علی کے ہاتھ کو طویل بوسہ دیا، پھر ایک دم کھڑی ہو گئی۔  
”میں جانتی ہوں کہ تمہاری زندگی بہت ہنگامہ خیز ہے۔ مگر جب بھی تمہیں فرصت اور سکون  
کا کوئی لمحہ میسر آئے تو اس لڑکی کو ضرور یاد کرنا جو مذہب اور قوم کے اختلاف کے باوجود تمہیں  
پرستش کی حد تک چاہتی ہے۔“

یہ کہہ کر ماریا اسمتھ مڑی اور تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔  
نواب حیدر علی کچھ دیر تک اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس سے گزر کر دختر فرنگ  
تھی۔ پھر والی میسور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ ماریا اسمتھ کی جرأت و بے باکی سے بہت  
زیادہ متاثر ہوا تھا مگر اسے دختر فرنگ کی اپنی قوم پر بے اعتباری کی ادا پسند نہیں آتی تھی۔ نواب  
حیدر علی، ماریا کی اس حرکت کو شدید جذباتی رد عمل سے تعبیر کر رہا تھا۔



پھر جب انگریزوں سے معاہدہ کرنے کے بعد حیدر علی سرنگاپٹم پہنچا تو اس کا شاندار  
استقبال کیا گیا۔ والی میسور کے جلوس پر کسی عالی مرتبت شہنشاہ کے جلوس کا گمان ہوتا تھا۔ نپو  
سلطان اور شجاعت خان نے سرنگاپٹم کی حدود سے نکل کر نواب حیدر علی کا استقبال کیا۔ والی  
میسور کی بحفاظت واپسی کی خوشی میں مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم نے غریبوں اور محتاجوں میں  
ہزاروں روپے، اناج اور کپڑے تقسیم کئے۔

کل پہنچتے ہی نواب حیدر علی سب سے پہلے نواب مظفر جنگ مرحوم کی بیوہ، رافدہ خاتون اور  
بیٹی حمیدہ خاتون سے ملا۔ رافدہ خاتون نے پردے کی آڑ سے نواب حیدر علی کا شکریہ ادا کیا۔  
”برادر معظم! میں آپ کی اس عنایت کو تاحیات فراموش نہ کر سکوں گی کہ آپ نے مجھے  
اذیت و کرب کی زنجیروں اور رسوائی کے زنداں سے نجات دلائی۔“  
”یہ ایک بھائی کی اپنی بہن کے لئے انتہائی حقیر کوشش تھی۔“ نواب حیدر علی نے روایتی  
انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر حمیدہ خاتون پردے سے باہر آئی اور حیدر علی کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔  
والی میسور اس لڑکی کو دیکھ کر خود بھی آبدیدہ ہو گیا جو ذاتی غموں کو بھول کر اپنے سینے میں  
ملت اسلامیہ کا درد رکھتی تھی۔ ”بیٹی! میں تیرا باپ تو نہیں، مگر تجھے دیکھ کر حسرت کرتا ہوں، کاش  
تو میری بیٹی ہوتی۔ مجھے تجھ پر فخر ہے۔“

”میں آپ ہی کی بیٹی ہوں اور آپ میرے روحانی باپ ہیں۔“ حمیدہ خاتون نے اظہار  
آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ”آپ جیسا ہندوستان میں کوئی دوسرا نہیں۔ خدا آپ کے بازوؤں کو اتنی  
طاقت دے کہ ہندوستان کے کھڑے ہوئے مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیں۔ آپ کے  
خواب، میرے باپ کے خوابوں سے عظیم تر ہیں۔ والد محترم صرف ارض دکن کے استحکام کے  
بارے میں سوچتے تھے، مگر آپ ایک مسلمان کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ آپ پر اللہ کی

ملانی ہو۔“



جشن فتح کے ہنگامے ختم ہوتے ہی نپو سلطان اور شجاعت خان نے نواب حیدر علی کی خفیہ  
دعوت میں امیر نجیب الدولہ کا مقدمہ پیش کر دیا۔

”خدا کی پناہ!“ نواب حیدر علی نے امیر نجیب الدولہ کا وہ خط سننے کے بعد کہا جو اس منافع  
نے والی ارکان والا جاہ محمد علی کے نام تحریر کیا تھا اور جسے شجاعت خان نے بروقت اقدام کر کے  
مائل کیا تھا۔ ”میری سلطنت میں ایسے غدار بھی موجود ہیں۔“  
”شجاعت خان! تجھے خدا خوش رکھے کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔“

نواب حیدر علی پہلے ہی مجسم قہر بنا ہوا تھا۔ پھر جب شجاعت خان نے سریتا دیوی کے  
دالے سے امیر نجیب الدولہ کے ہوس پرستانہ عمل کا ذکر کیا تو آتش غضب سے والی میسور کے  
دل دماغ بھی جل اٹھے۔

”بہا محترم!“ نپو سلطان نے عرض کیا۔ ”آپ کے قانون میں اس شخص کی سزا کیا ہے؟“  
”ایک غدار کی سزا موت کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟“ نواب حیدر علی کی زبان میں ایسی  
تحریر تھی، جیسے اس نے اپنے خلوت کدے میں بیٹھے بیٹھے امیر نجیب الدولہ کی شرک پر تنویر  
کھانی ہو۔

”تو پھر میں اپنے ہاتھ سے نجیب الدولہ کو قتل کروں گا یا محترم!“ نپو سلطان بہت زیادہ  
بنیانی نظر آ رہا تھا۔

نواب حیدر علی نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ ”مجرموں کو قتل کرنا جلاادوں کا کام ہے  
نہ نہ!“ والی میسور کی نظریں نپو سلطان کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ ولی عہد سلطنت کی دلی  
کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ”تم ایک سپاہی ہو اور تمہاری شمشیر کا ہدف ان دشمنوں کا سر ہوتا  
ہے جو تم سے میدان جنگ میں برسر پیکار ہوتے ہیں۔ ویسے نجیب الدولہ کا قتل تمہارے شایان  
مقام بھی نہیں۔“ نواب حیدر علی واقعے کی بنیاد تک پہنچ گیا تھا۔ اسی لئے نپو کو بڑے منطقی انداز  
میں بھاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”نواب بہادر! اس نے سریتا کو بڑے آزار پہنچائے ہیں۔“ نپو کی شدت جذبات میں کوئی  
کیا دانی نہیں ہوتی تھی۔ ”میں نے سریتا سے وعدہ کیا ہے کہ میں نجیب الدولہ کو اپنی تلوار سے قتل  
کر دوں گا۔“

”تمہارا وعدہ وفا ہو جائے گا فرزند!“ نواب حیدر علی، ولی عہد سلطنت کے جذبات کی  
لڑائی کچھ رہا تھا۔ اس لئے اُس نے نامحانہ انداز اختیار کیا تھا۔ ”وہ تمہاری فولادی تلوار سے  
نہ نہ تمہارے علم کی تلوار سے قتل ہو گا۔“

نپو، باپ کا مفہوم سمجھ چکا تھا، اس لئے خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے چہرے سے افسردگی

لے کر سرنگاپٹم آیا تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ امیر نجیب الدولہ، نواب ارکاٹ اور نظام لہ کا جاسوس ہے۔

جب نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو وہ ہندیانی انداز میں چیخ اٹھا۔

”یہ کیا ظلم ہے کہ جو شخص اپنے مالی وسائل سے ریاست میسور کی مدد کر رہا ہے، آج اسی کو زہر ثابت کیا جا رہا ہے۔“ امیر نجیب الدولہ نے دوسرے امراء دربار کی طرف انصاف طلب لہروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جس نے والی میسور کے ایک اشارے پر اپنی دولت، پانی کی رح بہادی، وہ نواب ارکاٹ یا نظام دکن کی مخبری کیا کرے گا؟“ امیر نجیب الدولہ کی حالت مازدبجے ہوئے انسان جیسی تھی جو غرقاب ہونے سے پہلے اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اچانک کوئی سہارا اس کے ہاتھ آجائے گا اور وہ بے رحم پانی کی خوراک بنے گا۔ غلط فہمی رہے گا۔ اس نے نواب حیدر علی کو رقم دینے کی بات بھی یہی سوچ کر کہی تھی کہ شاید رائے دربار کو اس کی خدمات کا احساس ہو جائے اور پھر وہ والی میسور سے اس کی جاں بخشی لے لے سفارش کر سکیں۔ مگر نجیب الدولہ کا یہ حربہ بھی بے اثر ثابت ہوا۔

نواب حیدر علی نے بڑی خاموشی سے نجیب الدولہ کی پارسائی کا دعویٰ سنا اور پھر میرمنشی کو بک کر کے کہا۔

”ہمیں یاد ہے کہ ہم نے ضرورت کے اوقات میں نجیب الدولہ سے کچھ رقم بطور قرض لی۔ اس کا شمار اسی وقت کرو۔“

میرمنشی نے حساب کر کے بتایا کہ نجیب الدولہ کی پچاس ہزار کی رقم ریاست کی طرف جب الاداہے۔

”وہ ساری رقم سرکاری خزانے سے نکال کر نجیب الدولہ کو ادا کر دی جائے۔“ نواب حیدر علی نے دوسرا حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی پچاس ہزار کے تقرری سکے سر دربار نجیب الدولہ کے قدموں میں ڈھیر کر دیے گئے۔

”اب تو ہماری طرف تیرا کوئی قرض باقی نہیں ہے؟“ نواب حیدر علی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

”نواب بہادر! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ میں احسان جتاؤں۔“ نجیب الدولہ کی آواز نپ رہی تھی۔

”اب ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔“ یکایک حیدر علی کے لہجے میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ ”ہم نے آڑے وقت میں تیرے اس مالی تعاون کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اور یہی تمہاری ریاست کی طرف سے تجھے کئی تجارتی مراعات دی گئی تھیں۔ اور ہم نے تیرے کردار کی تاریکیوں سے چشم پوشی کی تھی۔ خیر! یہ ماضی کا قصہ تھا۔ مگر آج ہم نے تیرا جو حال دیکھا

نمایاں تھی۔

نواب حیدر علی نے بیٹے کے ذہن کو صاف کرنے کے لئے نئے انداز سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر تم اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرو گے تو اہل سرنگاپٹم کیا سوچیں گے؟ ایک عام آدمی بھی یہی سوچے گا کہ حیدر علی کی کوئی ذاتی دشمنی ہوگی، اسی لئے بیٹے کے ہاتھ سے قتل کر کے جذبہ انتقام کی تسکین چاہتا ہے۔“

شیو سلطان کو صورت حال کی نزاکتوں کا ابلاغ ہو گیا تھا۔ تاہم اس نے باپ سے آخری درخواست کرتے ہوئے کہا۔

”مگر میں اتنا ضرور چاہتا ہوں بابا محترم! کہ آئندہ سرتیا کو اس قسم کی کوئی اذیت نہ پہنچے۔ یہاں کے شریں پسند لوگوں نے اس تہا لڑکی کو ایک تماشا بنا ڈالا ہے۔“

”میں کیا کروں فرزند؟“ نواب حیدر علی نے انتہائی تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے خود بھی اس لڑکی کی طرف سے اُبھن رہتی ہے۔ بارہا سمجھایا کہ شادی کر لے مگر وہ اس پر آمادہ ہی نہیں ہوتی۔“ یہ کہہ کر نواب حیدر علی، شجاعت خان سے مخاطب ہوا۔ ”تو اسے کیوں نہیں سمجھاتا؟ تیری تو منہ بولی بیٹی ہے وہ۔“

”کیا کہوں سرکار؟“ شجاعت خان کے چہرے پر ایک عجیب سارنگ ابھر آیا۔ ”یہ لڑکی بس ایک ہی بات سمجھتی ہیں۔ پھر دوسرا کوئی خیال ہی ان کے ذہن میں نہیں آتا۔“

نواب حیدر علی نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی ورنہ وہ خوب جانتا تھا کہ سرتیا دیوی، شادی سے کس لئے گریزاں ہے۔



پھر نواب حیدر علی نے امیر نجیب الدولہ کو سر عدالت طلب کر لیا۔

شجاعت خان نے کھڑے ہو کر اس کی فرد جرم سنائی۔ نجیب الدولہ بہت چیخا کہ اس کے خلاف سازش کی جا رہی ہے۔ ورنہ وہ نواب حیدر علی کا دل و جان سے وفادار ہے۔ جب والی میسور نے اس سے یہ سوال کیا کہ نواب ارکاٹ کے نام مذکورہ خط کس نے تحریر کیا ہے تو

صاف مکر گیا۔

”یہ خط خود شجاعت خان نے تحریر کیا ہے تاکہ وہ مجھے حضور کی نظروں سے گرا کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔“

نجیب الدولہ مسلسل جھوٹ بول رہا تھا۔

”شجاعت خان کا اس میں کیا فائدہ ہے کہ تو میری نظروں سے گر جائے؟“ نواب حیدر علی نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ ”تیری تحریر کو میرمنشی خوب پہچانتا ہے۔ مگر میں آج تک اس کے اندازہ نہیں کر سکا کہ تو اتنا بڑا جھوٹا ہے۔“

پھر گواہ کے طور پر اس ملک دھاری برہمن کو پیش کیا گیا جو خفیہ طور پر والا جاہ علی کا بیٹا

کے لئے ایک لخت بن کر رہ گئی تھی۔ نہ وہ کسی مرد سے شادی کر سکتی تھی اور نہ شادی کے بغیر پہاڑ جیسی زندگی گزار سکتی تھی۔ رانی لکشم ما اور رانی دیواجی منی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ بظاہر پارسیائی کی زندگی گزار رہی تھیں، مگر ان کی غلو تیں ہمیشہ نوجوان خوب صورت خدمت گاروں سے آراستہ رہتی تھیں۔ کائنات ان دونوں رانیوں کے مقابلے میں زیادہ جوان اور دلکش تھی، اس لئے اس کے جذباتی فتنے بھی شدید تھے۔ وہ کرشن راؤ کو دل سے چاہتی تھی مگر کرشن راؤ بھی کھنڈے راؤ کی طرح رانی کائنات سے کھیل رہا تھا۔ پھر جب اس کھیل سے اس کا جی بھر گیا تو وہ راج محل کی نوخیز باہریوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

رانی کائنات نے کرشن راؤ کے حوالے سے بھی وہی خواب دیکھا تھا کہ ایک دن حیدر علی برباد ہو جائے گا اور میسور کی عتبات حکومت، کرشن راؤ کے ہاتھوں میں آ جائے گی۔ پھر وہ اس سے شادی کر کے دونوں رانیوں کو راستے سے ہٹا دے گی۔ مگر جب رانی کائنات نے کرشن راؤ کے بلے ہوئے تیر دیکھے تو ایک دن اس نے داروغہ محلات سے صاف صاف کہہ دیا۔

”کرشن! تم اپنے عہد کے پابند نہیں رہے ہو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم راج محل کی کیرنوں سے رسم و رواج رکھو۔“

”رانی! ہم سیاست گر لوگ ہیں۔“ کرشن راؤ نے انتہائی سرد لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہمارا کوئی قدم مصلحت کے خلاف نہیں اٹھتا۔ راج محل کی خوب صورت کینریں میرے شبستان ہوں کی زینت نہیں، یہ سب کی سب حیدر علی کے جنگجو سپہ سالاروں کی خوراک ہیں۔ وہ خوراک، نے استعمال کرنے کے بعد بڑے سے بڑا مرد و شجاع، میدان جنگ میں رقص نعل دیکھنے کے بجائے خود ہی پازیب کی جھنکار پر رقص کرنے لگتا ہے۔“

رانی کائنات جانتی تھی کہ کرشن راؤ کھلا جھوٹ بول رہا ہے مگر پھر بھی وہ فریب کھانے پر مجبور تھی۔

رانی لکشم ما اور رانی دیواجی منی بھی انگریزوں کی شکست اور حیدر علی کی نئی فتوحات کی خبریں سن کر جو اس نظر آ رہی تھیں۔

”کرشن راؤ! نجیب الدولہ تو مر چکا۔ کیا اب بھی تیرے ترش میں کوئی تیر باقی ہے؟“

دو دن رانیوں نے اس شخص سے پوچھا جو ایک طرف حیدر علی کا داروغہ محلات تھا اور دوسری طرف ہندو ریاست کے قیام کے لئے زیر زمین سازشیں کر رہا تھا۔

”ایک نہیں، ہزاروں تیر ہیں مہارانی!“ کرشن راؤ بہت زیادہ پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ ”میرا زہن کبھی خالی نہیں رہتا۔“

”ہمراہی تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟“ رانی دیواجی منی نے تلخ لہجے میں کہا۔

”میں شراب و شباب کے تمام حربے آزما چکا، مگر حیدر علی اور اس کے ساتھی کیف و نشاط ساز نہیں ہیں۔ کوئی سیم تو، راقصہ اور کوئی شراب کی چھلکتی ہوئی صراحی انہیں قتل نہیں کر سکے گی۔“

ہے، خدا وہ کسی کو نہ دکھائے۔ اب کون کس پر اعتبار کرے گا، نجیب الدولہ؟“

یہ کہہ کر نواب حیدر علی نے اپنے غدار امیر کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

”اگر ہمیں انسانی قدروں کا پاس نہ ہوتا تو تیری لاش کو بھی تیرے آقا کے پاس بھیج دیتے۔“

اس کے بعد حیدر علی، نواب ارکاٹ کے اس جاسوس سے مخاطب ہوا جو ایک ہندو برہمن کا روپ دھار کر سرنگاپٹم میں داخل ہوا تھا۔

”محمد علی سے کہہ دینا کہ خراج کی طے شدہ رقم وقت پر ادا کر دیا کرے۔“ والی میسور نے ایک ہی جملے میں نواب ارکاٹ کی حقیقت بیان کر دی تھی۔



امیر نجیب الدولہ کے قتل نے پورے سرنگاپٹم میں دہشت پھیلا دی تھی۔ میسور کی تین رانیاں اور کرشن راؤ پھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”نواب نے ہمارے ایک با اثر مہرے کو کتنی آسانی سے پیٹ دیا؟“ آخر بہت دیر بعد رانی لکشم مایولی۔ خوف کی شدت سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”یہ مہرے کی غلطی تھی مہارانی!“ کرشن راؤ نے بڑے عیارانہ انداز میں رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر نجیب الدولہ، سریتا کے عشق میں مبتلا نہ ہوتا تو یہ بازی کبھی مات نہ ہوتی۔ آخر اُسے لڑکیوں کی کیا کمی تھی؟“

”یہ مرنے والا جانے۔“ رانی دیواجی منی نے ایک لمبی سانس لی۔ جیسے اس کے دل سے بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔ ”ہمیں آگے کی سوچنا چاہئے۔ بھگوان کا شکر ادا کرو کہ نجیب الدولہ کی زبان پر ہمارا نام نہیں آیا۔ مگر یاد رکھو کہ یہ مہلت بہت عارضی ہے۔ آئندہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیا ہوگا؟“ رانی کائنات جو بہت دیر سے خاموش بیٹھی تھی، حسرت زدہ لہجے میں بولی۔ ”تم اس کے لئے جس قدر بد دعائیں کرتے ہیں، وہ اتنا ہی سر بلند ہوتا جاتا ہے۔ اکیلا مدد اس چاہا

تھا۔ دنیا کہتی تھی کہ حیدر علی زندہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ مگر وہ واپس آ گیا اور اس شان سے کہ اس نے فرنگیوں کو بھی اپنے قدموں پر جھکا دیا۔“

”کائنات! تو بہت مایوسی کی باتیں کرنے لگی ہے۔“ رانی لکشم مانے اُسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا کروں؟“ رانی کائنات کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ ایک نا آسودہ عورت تھی۔ آقا جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ حیدر علی کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کا تاج پارسیائی نے بڑی فطرت سے ٹھکرا دیا۔ پھر کھنڈے راؤ اس کی جذباتی زندگی میں داخل ہوا۔ کھنڈے راؤ جیسے ہوس پرست اور عیار انسان نے اسے چند روز کے لئے اپنی سیاست کا آلہ کار بنایا، پھر منہ حار میں چھوڑ کر دوسری خوب صورت اور کم سن لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب کرشن راؤ اس کی زندگی میں داخل ہوا تو اس نے بھی کچھ دن بعد ہی آنکھیں پھیرنا شروع کر دیں۔ رانی کائنات کی بیوی



”حیدر علی کی حکومت میں ہندو منصب دار بھی اہم کردار ادا کریں گے۔ مگر اس طرح مسلمانوں کا اقتدار ختم نہیں ہوگا۔“ گیانی وجے آئندہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے راج محل میں حیدر علی کی ہلاکت کے لئے جس ہتھیار کی ضرورت ہے، وہ خود اس کے ہاتھ خانے میں موجود ہے۔“

”کیا مطلب؟“ رانی لکشمی مانے چونک کر کہا۔ وہ گیانی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ ”میں حیدر علی کے ان مسلمان سرداروں کو تلاش کرنا ہوگا جو بظاہر نواب کے وفادار نظر آتے ہیں۔ مگر خود ان کے اپنے سینوں میں حصول اقتدار کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔“ گیانی وجے آئندہ نے اپنے منصوبے کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں وہ لوگ درکار ہیں جو مسلمان ہیں مگر درپردہ اپنے ہی مذہب کے دشمن ہیں۔“

”اے بے لوگ کہاں ملیں گے؟“ رانی دیواجی منی بدستور حیرت زدہ نظر آ رہی تھی۔ ”ہمیں انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ مگر یہ ایک دشوار اور دیر طلب کام ہے۔“ گیانی نے رائیوں کی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو بتاتا رہوں گا کہ ہمارا مطلوبہ شخص کون ہے۔“

”تو پھر تمہیں سری رنگ ناتھ کے مندر کے بڑے پجاری کے منصب تک پہنچا دیا جائے گا۔“ رانی آسانی سے اپنی تلاش جاری رکھ سکی۔ ”رانی لکشمی مانے بھوکے گیانی کو دولت اور مذہبی فائدہ کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ گیانی وجے آئندہ نے گھبرا کر کہا۔ ”اس کا ذکر بھی کسی سے نہ کیجئے گا۔ مندر کے پجاری حیدر علی کی نظروں میں آچکے ہیں۔ اگر میں بڑے پجاری کے منصب تک پہنچا تو اب کے جاسوس میری بھی نگرانی کرنے لگیں گے اور پھر مجھے اپنا کام جاری رکھنے کے سلسلے میں بہت دشواریاں پیش آئیں گی۔ اگر مناسب سمجھیں تو اس سیوک کو راج محل کے کسی گوشے میں پھانسی دیں۔“

رائیوں نے فوراً ہی گیانی وجے آئندہ کی درخواست قبول کر لی اور اسے اپنے محل میں ایک چھائی آرامتہ کمرہ دے دیا جہاں ایک خوب صورت کینر دن رات اُس کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اور دو روٹیوں کو ترسنے والا برہمن، لذیذ غذاؤں کے ساتھ دن رات شراب کے نشے میں غرق رہتا تھا۔

گیانی وجے آئندہ ایک اعلیٰ درجے کا نجوی اور دست شناس بھی تھا۔ اس نے تینوں رائیوں کے ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ طویل جدوجہد کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گی۔ گیانی کی آمد اور پُر امید باتوں سے راج محل کی ویران فضا کیف و نشاط کے فہمقہوں اور مازوں کی سرگشیاں میں تبدیل ہو گئی تھی۔



کچھ دن بعد سرنگاپٹم کے ایک مالدار بیٹے، آشی نے کرشن راؤ کے نام اپنا خط دے کر

کرشن راؤ نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا تھا۔ ”اور تو اور، وہ نو عمر لڑکا شیو بھی ان خرافات سے کوسوں دُور ہے۔ سربتا جیسی تو بہ شکن خُسن رکھنے والی لڑکی بھی اسے متاثر نہ کر سکی۔ جگوان علی جانیں کہ یہ دونوں باپ بیٹے کون ہیں اور کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں؟“

”تیری زبان سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں کرشن راؤ!“ رانی لکشمی مانے ناگوار لہجے میں کہا۔ ”پھر وہ ہندو ریاست کس طرح قائم ہوگی، جس کے خواب دیکھتے دیکھتے ہماری آنکھیں پھرانے لگی ہیں؟“

”وہ خواب ضرور اپنی تعبیر پائے گا مہارانی!“ کرشن راؤ کے چہرے پر تعصب کا گہرا رنگ نمایاں ہو گیا تھا۔ ”برہما کی قسم! میں دیوتاؤں کی اس دھرتی کو مسلمان حکمرانوں کے دجود سے خالی کر کے چھوڑ دوں گا۔“

”مگر کیسے؟“ رانی دیواجی منی جھنجھلا کر بولی۔

”میں اپنے اعتبار کے آدی ریاست کے اہم عہدوں تک پہنچاؤں گا۔“ کرشن راؤ نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر وہی عہدیدار نواب کو گمراہ کریں گے اور پھر موقع ملے ہی ریاست کے غدار بن کر دشمنوں سے جا ملیں گے۔“

”مگر تیرا یہ منصوبہ اس قدر دیر طلب ہے کہ انتظار کرتے کرتے ہم تو شیشاں میں جا سوئیں گے۔“ رانی لکشمی مانے کا لہجہ بہت اُداس تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک مایوسی کی ایک شکستہ تصویر نظر آ رہی تھی۔

”مہارانی! حیدر علی کو شکست دینے کی ایک اور تدبیر بھی ہے۔“ کرشن راؤ نے کچھ سوچے ہوئے کہا۔ ”سرنگاپٹم میں ایک غریب برہمن گیانی، وجے آئندہ رہتا ہے۔ مسلمانوں کی تاراجی اُس کی گہری نظر ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر اس کے منصوبے پر عمل کیا جائے تو میسور کے علاقے سے مسلمانوں کے اقتدار کا نام و نشان مٹ سکتا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ رانی دیواجی منی نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔

”سرنگاپٹم کے ایک گاؤں میں افلاس اور گمناہی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔“ کرشن راؤ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر مہارانی نے مالی طور پر اس کی سرپرستی کی تو وہ ہمارے لئے بہت زیادہ سودمند ثابت ہوگا۔ بساط سیاست کا بڑا ذہین شاطر ہے۔ اکثر ہماری ہوتی بازاں بھی جیت لیتا ہے۔“

”اُسے فوراً ہمارے حضور میں پیش کرو۔“ رانی دیواجی منی بے قرار ہو کر بولی۔ ”ہم اس کے ایک اشارے پر اپنی ساری دولت لٹا دیں گے۔ مگر وہ ہمیں مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کی خوشخبری سنائے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“

پھر جب گیانی وجے آئندہ کو رائیوں کے سامنے پیش کیا گیا تو یہ تینوں عیار عورتیں اس کی باتیں سن کر حیران رہ گئیں۔

رہائوں کی لعنت ہو۔“  
اس قول و قسم کے بعد داروغہ محلات، کرشن راؤ نے اس ہندو نوجوان کو سرکاری ملازمین میں شامل کر لیا۔

اس نوجوان کا نام پورنیا تھا۔ پورنیا 1746ء میں ضلع ترچنا پللی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ کا نام کرشنا چاری تھا اور ماں کا نام لکشمی ام۔ جب پورنیا گیارہ سال کا ہوا تو اس کے باپ کرشنا چاری کا انتقال ہو گیا۔ غریب لوگ تھے، اس لئے پورنیا کی ماں دوسروں کے گھروں میں کام کر کے گزار اوقات کرتی تھی۔ پورنیا کا ایک بڑا بھائی بھی تھا، جس کا نام ونکٹ راؤ تھا۔ 1760ء میں یہ خاندان ترچنا پللی سے ترک سکونت کر کے سی سنگل میں مقیم ہو گیا۔

یہاں پورنیا نے ایک مالدار بننے رنگیا کی ملازمت اختیار کر لی۔ پورنیا بہت ذہین تھا۔ رنگیا کی ملازمت کے دوران وہ خالی اوقات میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ رنگیا نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی اور چند سالوں کے اندر پورنیا کو حساب کتاب میں طاق کر دیا۔ رنگیا کے تعلقات سرنگاپٹم کے بننے آشی سے تھے، جو محلات شاہی سے تجارتی تعلق رکھتا تھا۔ آخر پورنیا نے آشی کی ملازمت اختیار کر لی۔ آشی اور کرشن راؤ کے درمیان خصوصی مراسم تھے۔ آخر ایک دن پورنیا، کرشن راؤ تک پہنچ گیا اور کرشن راؤ نے اسے ایک خاص مقصد کے تحت ملازم رکھ لیا۔



جب تمام سیاسی ہنگاموں سے فارغ ہو کر نواب حیدر علی، سید اکرام بخاری کی خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو کے دوران انگریزوں سے صلح کرنے کا ذکر آیا تو سید صاحب خاموش نہ رہے۔

”نواب! تم اپنی سیاسی ضرورتوں کو خود بہتر سمجھتے ہو مگر مجھے انگریزوں پر اعتبار نہیں ہے۔“  
نواب حیدر علی نے سید صاحب کا تبصرہ سنا مگر اعتراضاً خاموش رہا۔ وہ سید اکرام بخاری کو ایک باکردار عالم سمجھتا تھا لیکن ذاتی طور پر اسے یہ پسند نہیں تھا کہ ایک گوشہ نشین اور دنیا کے حالات سے بے خبر بزرگ اسے سیاسی امور میں بھی مشورے دیتا رہے۔

”میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں یا کسی بھی مسلمان کو فرنگیوں سے کوئی فیض نہیں پہنچے گا۔“ والی میسور کو خاموش پا کر سید صاحب نے دوبارہ اپنے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔ ”سوائے اس مسلمان کے جو اپنے مذہب سے برگشتہ ہو جائے، انگریزوں کی اہل ایمان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔“

”آپ یہ دعویٰ کس طرح کر سکتے ہیں؟“ آخر نواب حیدر علی نے لب کشائی کی۔  
”میری حیثیت ہی کیا، جو کوئی دعویٰ کر سکوں۔“ سید صاحب نے اپنے روایتی انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر ایک گوشہ نشین فقیر، حکمرانوں کی مصلحت کو سمجھ بھی کیا سکتا ہے؟“ سید صاحب نے درپردہ حیدر علی کی ذہنی کنکاش کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا۔

ایک بیس بائیس سالہ ہندو نوجوان کو بھیجا۔ آشی نے بس چند سطریں تحریر کی تھیں۔  
”مہاراج! ایک کمال کی چیز بھیج رہا ہوں۔ اس کی کم عمری پر نہ جانا، بڑا ہوشیار لڑکا ہے۔  
توجہ کی تو بہت کام آئے گا۔“

کرشن راؤ نے خط پڑھنے کے بعد سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے تنکھے نفوش اور سانوس رنگ والا نوجوان کھڑا تھا۔  
”کیا کام کر سکتا ہے؟“

”مہاراج جو حکم دیں گے۔“ ہندو نوجوان نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔  
”نواب حیدر علی کو قتل کر سکتا ہے؟“ کرشن راؤ نے تند و تیز لہجے میں پوچھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دہلا پٹلا اور کم عمر نوجوان اس قدر خوف ناک سوال سن کر لرز جائے گا۔ مگر اس وقت کرشن راؤ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب ہندو نوجوان مسکرانے لگا۔

”اگر مہاراج ہتھیار فراہم کر دیں تو میں ہندوستان کے بڑے سے بڑے شخص کا قتل کر سکتا ہوں۔“

ہندو نوجوان کا جواب سن کر کرشن راؤ اُچھل پڑا۔ ”شباباش! مجھے ایک ایسے ہی کارندے کی ضرورت تھی۔“

یہ کہہ کر کرشن راؤ اٹھا اور ہندو لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر گئیانی دے آنند کے پاس پہنچا۔ گئیانی بہت دیر تک لڑکے کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا، پھر اس نے ہندو نوجوان کا ہاتھ دیکھا اور پھر جھٹکے کے ساتھ چھوڑ دیا۔

”یہ لڑکا آگے چل کر بہت کچھ کرے گا۔ اسے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔“  
”گئیانی! تم نے اس لڑکے کے ہاتھ میں کیا دیکھا؟“ کرشن راؤ نے دے آنند سے پوچھا۔  
”کامیابی کی لکیر۔“ گئیانی مسکرایا۔ ”اور اس لڑکے کے ہاتھ میں وہ لکیر موجود ہے۔  
ہمارے سامنے مستقبل کا ایک بہت بڑا آدمی کھڑا ہے۔“

اس کے بعد گئیانی اور کرشن راؤ اس لڑکے کو لے کر میسور کی رانیوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رانیوں نے گئیانی کا دعویٰ سنا اور پھر ہندو نوجوان سے مخاطب ہو کر بولیں۔  
”میسور ایک ہندو ریاست تھی، جس پر مسلمانوں نے عاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ تجھے یہاں رام راج واپس لانا ہوگا۔“

ہندو نوجوان، رانیوں کے قدموں پر جھک گیا۔ ”ایسا ہی ہوگا اور اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“  
ایک نوعمر لڑکے نے بڑے عجیب انداز سے عہد کیا تھا۔  
پھر تینوں رانیاں، گئیانی دے آنند اور کرشن راؤ اس لڑکے کو لے کر سری رنگ ہاتھ کے مندر میں پہنچے۔ پھر اسے بڑے بت کے چٹوں میں جھکا کر یہ عہد لیا گیا۔  
”اگر میں عہد سے پھر جاؤں تو اپنے باپ کی اولاد نہیں ہوں۔ اور مجھ پر ہمیشہ کے لئے

ان کہہ دیا۔ ”اگر دونوں ہم عمر ہوتے، تب بھی یہ رشتہ ممکن نہیں تھا۔ اہل دنیا کیا کہیں گے کہ بے ایک مظلوم لڑکی کو گھر میں پناہ دی، پھر اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔ واللہ! مجھ سے بڑی سوانی برداشت نہیں ہوگی۔“

فاطمہ بیگم تو صورت حال کے اس پہلو پر غور کرنے کے بعد خاموش ہو گئیں مگر سرنگاپٹم کے برزادوں کے رشتے برابر آتے رہے۔ حیدر علی نے رافضہ خاتون سے بات کی تو ماں نے فیصلہ بنا کر رضامندی پر چھوڑ دیا۔ پھر ایک دن حمیدہ خاتون نے خود ہی حیدر علی سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا۔

”نواب بہادر! ان امیر زادوں کو روکے کہ وہ میری ذات کو تماشہ نہ بنائیں۔ میں یہاں بادی کرنے کے لئے نہیں آئی ہوں۔“

حیدر علی، حمیدہ خاتون کی اس جرأت و بے باکی سے بہت خوش ہوا اور پھر جو بھی رشتہ آیا، الی میسور نے اسی وقت واپس کر دیا۔

سرنگاپٹم کے امیر زادوں کے علاوہ مرزا اسد بیگ بھی حمیدہ خاتون کی زلف گیرہ گیر کا اسیر دچکا تھا۔ سرکاری تقریبات میں کئی بار دونوں کا آسنا سامنا ہوا، نگاہیں ملیں اور شرم سے جھک گئیں۔ پھر حمیدہ خاتون نے شہسواری کے مقابلوں میں مرزا اسد بیگ کے فن کا مظاہرہ دیکھا۔ غل شہزادے کا ظاہری حسن، جرأت و مردانگی اور سب سے بڑھ کر اس کی تہذیب و شائستگی۔ آخر حمیدہ خاتون کے دل میں بھی مرزا اسد بیگ کے لئے کچھ نرم گوشے پیدا ہونے لگے۔ پھر نب اسے محل کی باخبر کنیزوں سے یہ معلوم ہوا کہ اسد بیگ خاندانی طور پر مغل شہزادہ ہے اور اس نے صرف اس لئے ریاست میسور کی ملازمت اختیار کی ہے کہ وہ نواب حیدر علی کو ہندوستان کا نجات دہندہ سمجھتا ہے۔ حیدر علی کے بارے میں خود حمیدہ خاتون کا بھی یہی تاثر تھا۔ آخر خیالات کی اسی ہم آہنگی نے ذہنی طور پر نواب مظفر جنگ کی بیٹی کو مرزا اسد بیگ کے قریب کر دیا۔

اسد علی کی ماہ تک عشق کی اس غلش کو برداشت کرتا رہا۔ مگر جب یہی غلش سینے میں آگ بن کر بھڑکنے لگی تو مغل شہزادے کے دل و دماغ جل اُٹھے۔ اور پھر اُس نے ایک دن غلوت میں ٹیپو سلطان کے قدموں میں تلوار رکھ دی۔

”دلی عہد بہادر! مجھے اجازت دیجئے کہ اب میں شمشیر زنی کے قابل نہیں رہا۔“

ٹیپو بہت دیر تک حیرت زدہ بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے دلجوئی کے انداز میں اسد بیگ سے اس خطرناک حرکت کا سبب پوچھا۔

”بے شک! تم یہاں سے چلے جاؤ مگر اس انقلاب کی وجہ ضرور بتاؤ۔“

آخر مرزا اسد بیگ نے لڑکھرائی زبان سے سب کچھ بتا دیا۔ اپنی داستان عشق سناتے سناتے اسد بیگ پسینے میں نہا گیا تھا۔

”تم اس کے بغیر زندہ تو رہ سکتا ہوں مگر اپنے فرائض منصبی ادا نہیں کر سکتا۔“

والی میسور حیرت زدہ رہ گیا کہ سید صاحب پر اُس کے دل کی بات کس طرح منکشف ہوئی۔ ”یہ میں نہیں، اللہ کی وہ کتاب کہہ رہی ہے جس کے ایک ایک حرف پر اکرام بخاری! طرح ایمان رکھتا ہے کہ زیر یازیر پر بھی شک کرے تو کافر ہو جائے۔“ ایک سید صاحب لہجے سے جلال روحانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ”میرے خدا کا فرمان ہے کہ یہود و نصارا تمہارے دوست ہو ہی نہیں سکتے۔“

آیت قرآنی سن کر نواب حیدر علی کا رنگ فق ہو گیا۔

”سید محترم! میں انگریزوں سے صلح کرنے کے لئے مجبور تھا۔ مرہٹے، نواب ارکاٹ، نظام دکن..... آخر ایک وقت میں کس کس سے لڑوں؟ بس یہی تدبیر کچھ میں آئی کہ معاہدے ذریعے ایک طاقتور اور عیار حریف کو خاموش بیٹھنے پر مجبور کر دوں۔ میرا خیال ہے کہ اس صلح بعد باقی دونوں حریف بھی سر پڑ جائیں گے کہ وہ فرنگیوں کے اشارے پر ہی رقص کرتے ہیں۔“

”میں تمہارے معاہدے پر ککتہ چینی نہیں کر رہا ہوں مگر فرنگیوں کی طرف سے احتیاط نہیں ہے۔“ سید صاحب کے لہجے سے طنز جھلک رہا تھا۔ ”پھر“ جب یہ اپنے پیغمبر کے نہیں ہوئے پھر تم سے کس طرح عہد وفا نبھائیں گے؟ خدا تمہیں اس قوم کے شر سے محفوظ رکھے، جن چہرے روشن اور دل سیاہ ہیں۔“

نواب حیدر علی، سید صاحب کی خانقاہ سے اٹھ کر محل پہنچا مگر راستے بھرا سے کرل اسمتھ بیٹی ماریا یاد آتی رہی، جس نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا۔ ”نواب! میری قوم زیادہ قانا اعتبار نہیں ہے۔“ اور اب سید اکرام بخاری بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔

نواب حیدر علی کا ذہن کئی دن تک ایک ہی بات میں الجھا رہا۔ پھر وہ سب کچھ بھول نئے انداز سے فوجی تیاریاں کرنے لگا۔



سابق والی دکن نواب مظفر جنگ مرحوم کی بیٹی حمیدہ خاتون کے بے پناہ حسن نے کیا! زادوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ کئی بار جاگیرداروں کے بیٹے اس حسین و جمیل ”دو شہزادہ“ شادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ خود ٹیپو سلطان کی والدہ، فاطمہ بیگم اُس سے اس قدر متاثر ہو تھیں کہ ایک دن شوہر کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر بیٹھیں۔

”نواب بہادر! ٹیپو کے لئے حمیدہ خاتون بہترین شریک حیات ثابت ہو سکتی ہے۔“

حیدر علی نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا۔

”ابھی ٹیپو کی عمر ہی کیا ہے؟“ والی میسور خوب صورتی کے ساتھ فاطمہ بیگم کو ٹالنا چاہتے تھے۔

”مگنی کی رسم تو ادا کی جاسکتی ہے۔“ فاطمہ بیگم شوہر کی اشاراتی گفتگو کو سمجھنے سے قاصر رہیں۔

”پہلے تو یہ کہ حمیدہ خاتون، ٹیپو سلطان سے کئی سال بڑی ہے۔“ آخر حیدر علی نے صاف

خان کے گھر کی راکھ کافی نہیں تھی؟“ یہ کہتے کہتے سالار میسور کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا اور آنکھوں میں گرم غبار بھر گیا تھا۔

مرزا اسد بیگ بہت ذہین اور فاضل نوجوان تھا۔ شجاعت خان کی خود کلامی پر چونک اٹھا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اسد بیگ اپنا غم بھول کر شجاعت خان کے چہرے کو دیکھنے لگا، جس پر اذیت و کرب کی گہری نہیں جم کر رہ گئی تھیں۔

”کچھ نہیں میرے جذباتی بیٹے!“ شجاعت خان کھڑا ہو گیا۔ ”صبر کر اور تلواریں اٹھالے۔ عشق تجھے نئے انداز سے لڑنا سکھا دے گا۔ میں تیرے سکون دل کے لئے دعا تلاش کروں گا۔“ شجاعت خان کی باتوں نے اسے بڑا حوصلہ دیا تھا۔ اسد بیگ سنبھل گیا۔

پھر دوسرے دن ہی شجاعت خان نے محل کی ایک ثقہ، معتمد اور عمر رسیدہ کنیر سعدیہ کو طلب کر کے سارا واقعہ سنا دیا۔

”حمیدہ خاتون کا عندیہ معلوم کر۔ شاید اس کی توجہ سے ایک جاں بہ لب انسان بچ جائے۔ اور پھر اسے یہ بھی بتا دے کہ خاندانی اعتبار سے اسد بیگ، نظام دکن سے بھی بڑا ہے۔“ کنیر سعدیہ مسکرانے لگی۔ ”سرکار! حمیدہ بی بی تو خود مجھ سے اسد بیگ کے بارے میں پوچھتی رہتی ہیں اور میں انہیں مثل شہزادے کے حوالے سے سب کچھ بتا چکی ہوں۔“

”خدا یا! تیرا شکر ہے۔“ شجاعت خان نے ایک طویل سانس لی اور ہنسنے لگا۔ ”تو پھر دونوں کو ملا دے تاکہ وہ اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ اگر بھٹکے بھٹکے مر گئے تو ان کے خون کا عذاب تیری گردن پر ہو گا۔“



کنیر سعدیہ کے تعاون سے رات کے اندھیرے میں اسد بیگ اور حمیدہ خاتون کی ملاقات ہوئی۔

”میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ آپ میری رفاقت کو قبول کر لیں۔“ اسد بیگ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”میں حریم ناز کا ادنیٰ غلام ہوں۔ بس آپ مجھے اس غلامی کی سند عطا کر دیں۔“ حمیدہ خاتون بہت دیر تک خاموش کھڑی رہی، پھر بمشکل چند الفاظ ہی زبان سے ادا کر لی۔

”غلام نہیں، میرے حریم دل کے تاجدار! آپ کے سوا کوئی نہیں۔“ پھر وہ مباحرام دوشیزہ واپس چلی گئی اور اسد بیگ کو یوں محسوس ہوا جیسے تیز دھوپ میں چلتے چلتے اچانک ابر آگیا ہو اور پھر اس ابر سے ہلکی ہلکی پھوار گرنے لگی ہو۔



سرنگاپٹم کی فضا پر سکون تھی کہ پیشوائے پونا کے ایک خط نے نواب حیدر علی کے جسم میں آگ لگا دی۔ مادھوراؤ نے والی میسور سے ان پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا، جو ابھی تک ادا

”پھر کیا کرو گے؟“ ٹیپو بھی دوست کا حال سن کر اُداس ہو گیا تھا۔

”کسی صحرا کی جانب نکل جاؤں گا۔“ اسد بیگ کے لہجے سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔ ”بزدل نہیں کہ تلوار ہاتھ سے رکھ رہا ہوں مگر دل و دماغ کو کیا کروں کہ پورا وجود و شہت کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔“

”تم اُس سے شادی کر لو۔“ ٹیپو نے بڑی معصومیت سے کہا۔

”میں اس کے قابل ہی نہیں ولی عہد بہادر!“ اسد بیگ کی آواز دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”جب وہ بڑے بڑے امراء کے رشتے ٹھکرا چکی ہے تو پھر میری کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟“ ”پھر میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ ٹیپو بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

”ہاں! نواب بہادر سے درخواست کر سکتا ہوں۔“

”خدا کے لئے نہیں۔“ اسد بیگ گھبرا گیا۔ ”میں نواب بہادر کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتا۔“

ٹیپو بری طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اسد بیگ جیسے جاں نثار دوست کو کھانا نہیں چاہتا تھا۔ آخر اُسے گہری تاریکی میں روشنی کی ایک لکیر نظر آئی۔



دوسرے دن شجاعت خان فوجی چھاؤنی پہنچا اور اس نے مرزا اسد بیگ کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔

”مجھے شہزادے نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ٹیپو اپنے دوست سے محروم ہونا نہیں چاہتا اور تم ایک لڑکی کے لئے سب کچھ برباد کر دینا چاہتے ہو۔“

”برباد نہیں، اس کی یادوں سے ہمیشہ دل کو آباد رکھنا چاہتا ہوں۔“ اسد بیگ نے بڑھکاتے ہوئے کہا۔

”اور اگر وہ تمہیں قبول نہ کرے؟“ شجاعت خان کا لہجہ بہت نرم تھا۔ ”تو پھر زندگی راہیگاں جائے گی۔“ اسد بیگ کو حمیدہ خاتون کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”کیا اسی مقصد کے لئے دہلی چھوڑا تھا؟“ شجاعت خان نے اسد بیگ کو اس کا عہد یاد دلایا۔

”عہد شکن نہیں ہوں۔“ اسد بیگ نے سر اٹھایا اور شجاعت خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ فیصلہ بھی سکون دل کی خاطر کیا تھا، تاج و تخت کی آرزو نہیں تھی۔ یہ فیصلہ بھی دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کر رہا ہوں۔ سنبھل گیا تو واپس آ جاؤں گا۔ پھر میرے ہاتھ ہوں گے، شمشیر ہوگی اور دشمنوں کے سر ہوں گے۔“

شجاعت خان کو اپنے قبیلے کا دوسرا آدمی نظر آیا تھا۔ پہلے سر تادیوی اور اب مرزا اسد بیگ۔ ”اے آتش شوق! اور کتنے کاشانے جلانے کی؟ کیا تیرے غرور کی تسکین کے لئے شجاعت



نہیں کئے گئے تھے۔

”حیدر علی! تو بد معاملہ بھی ہے اور جھوٹا بھی۔ اگر تو نے فوری طور پر پچاس لاکھ کی رقم میرے سودا خانہ میں کی تو میں ریاست میسور کی اینٹ سے اینٹ بچا دوں گا۔“

مادھوراؤ نے جان بوجھ کر اپنے خط میں اس قدر تحقیر آمیز الفاظ استعمال کئے تھے۔ دراصل وہ میسور پر حملہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ مادھوراؤ، صوبہ سرا پر قبضہ کر کے ایک بار پھر جنوبی ہندوستان میں مرہٹہ اقتدار کو شہنشاہیت کے درجے تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ حیدر علی نے بے مثال ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جلد از جلد رقم کی ادائیگی کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن مادھوراؤ کی نیت درست نہیں تھی۔ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر میسور کی طرف بڑھا۔

حیدر علی نے معاہدہ مدراس کے مطابق انگریزوں سے مدد مانگی مگر گورنر نے صاف انکار کر دیا۔

نواب حیدر علی اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ مدراس 29 مارچ 1766ء کو ہوا تھا۔ چار سال تک حیدر علی اپنی تباہ شدہ مملکت کی تعمیر نو کرتا رہا اور اس کے دشمن زیر زمین نئی سازشوں کے خاکے تیار کرتے رہے۔

اگرچہ نظام علی خان سے بھی حیدر علی کا معاہدہ ہو چکا تھا مگر یہ ساری کی ساری کاغذی کارروائیاں تھیں۔ والی دکن کا نہ دماغ بدلا تھا اور نہ دل۔ نظام علی خان کے دماغ میں وہی نئے حکومت تھی کہ میسور کو تباہ کر کے حیدر علی کے پورے علاقے کو دکن میں شامل کر لیا جائے۔ آخر نظام علی خان دوبارہ خفیہ طور پر انگریزوں سے جا ملا۔ کبھی کبھی نظام علی خان کے دل میں انسانی جذبات بھی ابھرتے تھے اور وہ حیدر علی سے کہے ہوئے عہد کا پاس رکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا وزیر اعظم رکن الدولہ اور مشیر خاص میر عالم اسے ہمیشہ والی میسور کے خلاف اکساتے رہتے تھے۔ یہ دونوں اپنے ناموں کے اعتبار سے مظاہر مسلمان تھے مگر درپردہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے بدترین دشمن تھے۔ آخر نظام علی خان کے دل و دماغ پر سیاہی چھا گئی اور اس نے ایک خفیہ نشست میں نواب حیدر علی سے کہے ہوئے معاہدے کو چاک کر ڈالا اور قسم کھائی کہ وہ والی میسور کی مکمل تباہی تک جین سے نہیں بیٹھے گا۔

آخر نظام دکن کا مشیر خاص میر عالم سفیر ہو کر مدراس میں انگریزوں کے آستانے پر حاضر ہوا۔ گورنر مدراس اسی دن کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر میر عالم نے ایک نئے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کے مطابق والا چاہ محمد علی ہمیشہ کے لئے ارکاٹ کا نواب بن گیا تھا۔ اور نظام دکن، کرناٹک کے علاقے سے قانوناً دستبردار ہو گیا تھا۔

نواب حیدر علی کو ان خفیہ سرگرمیوں کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ ایک طرف نظام دکن نے معاہدے کی دستاویز کو پارہ پارہ کر دیا تھا تو دوسری جانب انگریز بھی صلح نامہ مدراس کی دھیان اڑا چکے تھے مگر یہ سب کچھ اس قدر رازداری کے ساتھ ہوا تھا کہ والی میسور کو اپنے حلیف کی نیت پر شبہ

بن نہ ہو سکا۔

پھر 1770ء میں پیشوائے پونا ایک لشکر کثیر لے کر میسور پر حملہ آور ہوا۔ مادھوراؤ کے ساتھ اس کا وزیر ناقترونیس اور سپہ سالار ترک راؤ بھی تھا، جس کی زیر قیادت ایک لاکھ سوار، سات ہزار پیادے اور پچاس ہزار ہندو تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑا توپ خانہ بھی ساتھ تھا اور ہزاروں کی بے قاعدہ فوج بھی مرہٹہ لشکر کے ہمراہ تھی۔ مزید یہ کہ شاہ نور کا نواب عبدالکلیم خان درجندہ گکاراجہ بھی پیشوا مادھوراؤ کے ساتھ فوجی تعاون کر رہا تھا۔

حیدر علی کے جاسوسوں نے خبر دیتے ہوئے کہا۔

”نواب بہادر اسرزمین میسور نے حملہ آوروں کی اتنی بڑی تعداد پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ایسا لگتا ہے کہ سارا ہندوستان ہی آپ کے خلاف اُٹ آیا ہے۔“

حیدر علی حسبِ عادت مسکرایا، پھر اس نے اپنے برق رفتار قاصدوں کو گورنر مدراس کے نام ایک خط دے کر روانہ کیا جس میں فرنگی حاکم سے معاہدے کے مطابق فوجی مدد کی درخواست کی گئی تھی۔

گورنر مدراس کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اس نے روایتی حیلہ سازی اور مکاری سے کام لیتے ہوئے جواباً چند الفاظ تحریر کر دیئے۔

”میں انتہائی معذرت خواہ ہوں کہ تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ حکومت مدراس خود اپنے نین مسائل سے دوچار ہے۔ اگر میں نے تمہاری مدد کے لئے لشکر روانہ کیا تو فراہمی اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور میں کسی طرح بھی یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ مجھے معاہدے کی ایک ایک شق یاد ہے۔ مگر کیا کروں کہ صورت حال میرے قابو میں نہیں۔ اس لئے میری طرف سے دلی معذرت قبول کی جائے۔ یسوع مسیح تمہاری حفاظت کریں اور اس جنگ میں تمہیں دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو۔ میری دعائیں قدم بہ قدم تمہارے ساتھ ہیں۔“

نواب حیدر علی نے پورا غصہ بنا۔ ایک ایک لفظ ریا کاری اور منافقت کی روشنائی سے تحریر کیا گیا تھا۔ نواب حیدر علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے، جیسے بارودی سرنگیں پھٹ رہی ہوں۔ والی میسور کو سید اکرام بخاری اور ماریا آسمتھ کے الفاظ یاد آئے۔ فرنگی انتہائی ناقابلِ اعتبار ٹھہرے تھے۔ مگر اب اس منافقانہ عمل اور شاطرانہ چال کا کوئی تدارک نہیں ہو سکتا تھا۔ وقت حیدر علی کی گرفت سے نکل کر بہت دور جا چکا تھا۔

گورنر مدراس کا خط، ٹیپو سلطان نے پڑھ کر سنایا تھا۔ جب اس نے باپ کو ذہنی سرکش کا شکار دیکھا تو ہرجوش لہجے میں بولا۔ ”بابا محترم! اگر ساری دنیا بھی میسور پر حملہ آور ہو جائے تو ہم جنگ کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ غازی نہ بن سکے تو شہید ہو جائیں گے کہ مسلمان کے نزدیک زندگی کی یہی اعلیٰ ترین منزل ہے۔“

حیدر علی نے بیٹے کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کا رنگ مزید گہرا ہو گیا۔

”ہاں فرزند! ایسا ہی ہو گا۔ ہم اپنی جاگیر کو سونے کی پشتری میں سجا کر تو پیش نہیں کریں گے۔ بہت خون بہے گا، بے شمار جانیں جائیں گی، پھر کہیں جا کر ریاست میسور کی قسمت کا فیصلہ ہو گا۔“

اس کے بعد نواب حیدر علی اپنی تمام ترقوی طاقت سمیٹ کر دشمن کی یلغار روکنے کے لئے آگے بڑھا۔ دونوں لشکر مقابل ہوئے۔ پانچ چھ دن تک دونوں طرف سے صف بندیاں ہوتی رہیں۔ پھر جنگ چھڑ گئی۔ مرہٹہ سالار ترک راؤ نے اپنے توپ خانے کو گولہ باری کا حکم دیا۔ توپوں نے اس قدر آگ اٹھائی کہ زمین پر زلزلے کا گمان ہونے لگا۔ اور نواب حیدر علی کا لشکر شکست کھا گیا۔

دشمنوں کے خیال میں والی میسور کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ مگر حیدر علی نے ابھی تک اپنی شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ اس نے میدان جنگ سے ہٹ کر ایک کمین گاہ میں اس لئے پناہ لی تھی کہ رات کے اندھیرے میں مرہٹوں کی فوج پر شب خون مارا جاسکے۔ مگر بد قسمتی سے گہری تاریکی کے سبب جنگل سے نکلتے نکلتے صبح ہو گئی اور مرہٹوں نے دوبارہ حیدر علی کے لشکر پر حملہ کر دیا۔

مرہٹوں کا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ حیدر علی کے نصف سے زیادہ سپاہی القہرہ راجہ بن گئے اور جو باقی بچے، وہ فرار ہو گئے۔ عجیب بے جا رگی کا عالم تھا۔ نواب حیدر علی ایک درخت کے نیچے تنہا کھڑا اپنے خدا سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہا تھا کہ اسی وقت سامنے سے چند طنبورچی گزرے۔ نواب نے انہیں طنبور بجانے کا حکم دیا۔ طنبورچیوں نے اس انداز سے طنبور بجایا کہ پورا جنگل اس کی آواز سے گونجنے لگا۔ جب مرہٹوں نے یہ آواز سنی تو سمجھے کہ حیدر علی کی مدد کے لئے تازہ دم فوج آ پہنچی ہے۔ مادھوراؤ نے فوری طور پر جنگ روک دی اور پیچھے ہٹ گیا۔

اسی دوران شام کے قریب ہیبت جنگ تازہ دم لشکر لے کر نواب سے آ ملا۔ مگر حیدر علی نے بھی مناسب خیال کیا کہ وہ پیچھے ہٹ جائے۔ آگے بڑھ کر مادھوراؤ سے برسرِ پیکار ہونے میں مزید افرادی قوت کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اسی لئے حیدر علی بنگلہ کی طرف پلٹا اور

مشققانہ لہجہ میں بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”فرزندِ جنگ اسی کا نام ہے۔ کبھی شکست کبھی فتح، کبھی یلغار کبھی واپسی۔ دینوں کا ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔ ایسے موقع پر جذبات سے زیادہ عقل سے کام لےنا چاہئے۔ ہمارے ہر سپاہی کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ ہم اپنے ایک جاں نثار کو بھی بے مقصد موت

حکمران نہیں کر سکتے۔“  
حیدر علی، ٹیپو سلطان کی ذہنی تربیت کر رہا تھا۔ کبھی وہ اسے اپنے ساتھ رکھتا اور کبھی کسی محاذ پر جھوڑ دیتا تھا۔

بگور بیچ کر نواب حیدر علی نے صلح کے لئے مادھوراؤ کے پاس اپنا وکیل بھیجا۔ جواب میں بیٹا نے پونا نے ایک کروڑ روپے کی رقم کا مطالبہ کیا۔ شاید حیدر علی اس مطالبے کو تسلیم کر لیتا مگر مادھوراؤ نے بعض ایسی سخت شرائط بھی پیش کی تھیں جنہیں قبول کرنے کے بعد والی میسور، بیٹا نے پونا کا خراج گزار بن کر رہ جاتا۔ نتیجتاً حیدر علی نے انکار کر دیا اور پیشوائے پونا کے ہمد سے صاف صاف کہہ دیا۔

”صلح اور غلامی میں بڑا فرق ہے۔ میں نے صلح کی پیش کش کی تھی، غلامی کی درخواست نہیں بھیجی تھی۔ اب ہر حالت میں جنگ جاری رہے گی۔ یہاں تک کہ ماحو راؤ، پوتا کی شرف لوٹ جائے یا حیدر علی میدان جنگ میں قتل ہو جائے۔“

اے تاحمد کی زبانی حیدر علی کا جواب سن کر مادھوراؤ نے بڑا خوف ناک تہقیر لگایا۔ ”یقیناً میں بڑا واپس جاؤں گا۔ مگر حیدر علی کی لاش کو اس کی سرزمین میں دفن کرنے کے بعد۔“

ضلع کے مذاکرات میں ناکامی کے بعد پیشوا مادھوراؤ کی فوج دریائے تنگ بھدرا کے دائیں سے نکل کر سرنگاپٹن کی طرف بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام شمالی اور مشرقی علاقے فتح کر لئے۔ پھر مرہٹوں کا یہ بڑی دل لشکر نجگل کے مقام پر آ کر رک گیا۔ نجگل، بنگلور سے تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حیدر علی نے واپسی کے وقت تمام علاقوں کو لوٹ کر ویران کر دیا تھا، اس لئے پیشوا کی فوج کو روسد حاصل کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ دوسری طرف ایک پہاڑی کی اوٹ سے حیدر علی کی فوج نے ہر رات شب خون مارنا شروع کر دیا تھا۔ اور تیسری طرف قلعہ نجگل کے بائیں ایسی بے جگر سے مدافعت کر رہے تھے کہ مادھوراؤ کثرتِ افواج کے باوجود فتح حاصل نہ کر سکا تھا۔

ابھی نقل و غارت کا یہ ہنگامہ جاری تھا کہ برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ پیشوائے پونا شدید موسم کی ان سختیوں کو بھی برداشت کر لیتا مگر اچانک اسے ایک سخت بیماری نے آگھیرا۔ طبیعوں نے علاج شروع کیا مگر مرض روز بہ روز بڑھتا گیا۔ مجبوراً مادیوراء پونا کی طرف لوٹ گیا مگر جلتے جاتے اپنے وزیراعظم نانائو قرونیس اور سپہ سالار ترک راؤ سے کہتا گیا۔

”میں ان دو باتوں کے سوا کسی تیسری پر رضامند نہیں ہوں گا۔ حیدر علی کی موت یا اس کی طرف سے پروانہ غلامی۔“

جیڑا کی واپسی کی خبر سن کر حیدر علی نے کسی قدر سکون کا سانس لیا۔ مگر والی میسور کا یہ سکون بہت عارضی تھا۔ مادھو راؤ کے جاتے ہی سپہ سالار ترک راؤ نے پوری فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور لشکروں کی تنظیم نو کرنے کے لئے پیچھے ہٹا۔ ترک راؤ نے اس حکمت عملی کے

پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ آگے راستہ بند ہے اور دشمن پہلے سے وہاں موجود ہے۔ یہ سب سبھی، موتی تالاب کے بند پر آٹھ توپیں رکھے ہوئے گولے برسا رہے تھے۔ اب آگے بڑھنے کی کوئی صورت تھی اور نہ پیچھے جانے کی۔ گویا نواب حیدر علی اور اس کے سپاہی ہالہ بڑخ میں تھے۔ تمام فوجی افسروں کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے کہ اب کیا ہوگا؟ سپاہیوں کی آنکھوں میں فکر و پریشانی کی لرزتی ہوئی پرچھائیاں اس سوال کا جواب دے رہی تھیں کہ والی میسور اور اس کے جاں نثار اپنے انجام کو پہنچ چکے۔ بس چند ساعتوں کا وقفہ ہے، اس کے بعد میسور کے نگہبان اپنے خون میں نہا جائیں گے اور پھر چاروں طرف لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔

نواب حیدر علی، مرد میدان بھی تھا اور مرد بحران بھی اُس نے اس قدر سنگین لمحات میں بھی وہاں نہیں کھوئے اور اپنی خداداد جرأت و مردانگی سے کام لے کر ایک منتخب فوجی دستے کے ساتھ موتی تالاب کے بند پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید اور اچانک تھا کہ مرہٹے اپنی توپیں اور گرماں جنگ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ یہاں حیدر علی نے مختصر سا قیام کر کے اپنی منتشر فوج کو جمع کیا۔ ایک دن اور ایک رات سے کسی سپاہی نے کچھ نہیں کھایا تھا، اس لئے پہلے شکم کی آگ بجائی گئی۔ میسور کے تمام فوجی تھکن سے پُور تھے۔ بعض افسروں نے رات بھر کے قیام کا ثور دیا مگر حیدر علی نے ان کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور انتہائی تھکن کے باوجود آگے ہی بڑھا۔

ابھی حیدر علی اور اس کے سپاہیوں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ مرہٹوں کی بڑی توپیں آگے بڑھ کر ترک راؤ کے توپچیوں نے پوری شدت کے ساتھ گولے برسائے شروع کر دیئے۔ اب گولہ ٹیپو سلطان کے قریب آ کر پھٹا۔ کچھ دیر کے لئے حیدر علی کی ساعت مفلوج ہو کر رہ گئی۔

”فرزند اتم کہاں ہو؟“

ٹیپو کے چاروں طرف کثیف دھواں اور گرد و غبار پھیلا ہوا تھا اور ولی عہد سلطنت نظر نہیں آتا۔ والی میسور کے ساتھ دیگر فوجی افسر بھی چیخ اُٹھے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ٹیپو سلطان اور باگھوڑا گولے کی زد میں آ گئے ہیں۔ بعض افسر یہی سمجھ رہے تھے کہ ولی عہد سلطنت کا کام ہو گیا۔ اسی خوف کے زیر اثر فضا میں بہت سی چیخیں گونج رہی تھیں۔

”نہراے! آپ کہاں ہیں؟“

گولے کے دھماکے سے ٹیپو کا گھوڑا اُلٹ گیا تھا اور ولی عہد سلطنت چند گز کے فاصلے پر جا اُٹھا۔ پھر اسے سمجھنے اور اُٹھنے میں کچھ دیر لگی۔ مرہٹہ توپیں مسلسل گولے اُگل رہی تھیں۔ اُن کی آوازیں اس قدر تیز تھیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ نواب حیدر علی مسلسل اُٹھتا۔

ساتھ ساتھ فرقہ پرستی کی بنیاد پر ایک اور خوف ناک چال چلی۔ اس نے رتن گری، میرن، وکر، گری اور کالستری کے راجاؤں کے علاوہ گتی کے حاکم مرادی راؤ کو بھی طلب کر لیا اور ان کے مذہبی جذبات کو اُبھارنے کے لئے صاف صاف کہہ دیا۔

”تم بھی ہندو ہو اور میں بھی ہندو۔ میرا دیرینہ خواب یہی ہے کہ میں علاقے میں مکمل طور پر ہندو راج قائم کروں۔ میرے خواب کو تمہارے وسائل اور سپاہیوں کے خون کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سرزمین مسلمانوں کے وجود کے پاک ہو جائے۔ اگر سیاسی مصلحت کے باعث ہمیں کسی مسلمان حاکم کو برداشت کرنا پڑے تو وہ بھی ہمارا غلام بن کر رہے۔“

تمام ہندو راجاؤں نے دیوتاؤں کی قسمیں کھائیں اور اپنے سارے جنگی وسائل مرہٹہ سالار ترک راؤ کو پیش کر دیئے۔ نئے انتظامات کے ساتھ ترک راؤ، سرنگاپٹم کی طرف بڑھا۔ اب اس کے سپاہیوں کی تعداد دولاکھ سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ نئے حملے کے وقت مرہٹہ سالار کے تیور نہایت خطرناک تھے۔ راستے میں جن قلعوں پر حیدر علی کی فوجیں قابض تھیں، وہ طاقت کے اس سیلاب کو روکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ترک راؤ جلد سے گزرتا تھا، وہاں کی تمام کھیتیاں پامال کر دی جاتی تھیں۔ انتہا یہ ہے کہ دیہاتیوں کے جھوپڑوں کو بھی آگ لگا دی گئی تھی۔ اس طرح مرہٹہ فوج کا یہ طوفان اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرتا ہوا سرنگاپٹم کے قریب پہنچ گیا۔

نواب حیدر علی، سرنگاپٹم کے دفاع کے لئے تھوڑی سی فوج چھوڑ کر ”چن ٹین“ کے راتے سے ماگڑی کے جنگل میں آیا کہ جب مرہٹے، دارالحکومت کا محاصرہ کر لیں تو پیچھے سے ان پر حملہ کیا جائے۔ جنگی نقطہ نظر سے یہ ایک بہترین چال تھی مگر ترک راؤ بھی نواب کی اس حرکت سے غافل نہیں تھا۔ نتیجتاً مرہٹہ سالار، سرنگاپٹم چھوڑ کر نواب حیدر علی کے تعاقب میں میرن کد پٹنا اور اس نے آتے ہی پہاڑی کا محاصرہ کر لیا۔ چند روز معمولی لڑائیوں میں گزرے۔ اس دوران نواب حیدر علی کی فوج شب خون بھی مارتی رہی۔ آخر تک آ کر ترک راؤ نے پہاڑی کا محاصرہ اس قدر تک کر دیا کہ نواب کی فوج کو رسد ملنا بند ہو گئی۔

مجبوراً ایک اندھیری رات میں حیدر علی، سرنگاپٹم واپس جانے کے خیال سے اپنا توپ خانہ لے کر نکلا۔ بارش کی وجہ سے راستے بہت زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ اس لئے نواب کی فوج نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ رات ہو گئی۔ اس پر مزید خرابی یہ ہوئی کہ اتفاق سے ایک توپ جل گئی جس کی آواز سن کر ترک راؤ چونک اٹھا اور اسے حیدر علی کے فرار ہونے کی خبر مل گئی۔ ترک راؤ نے فوراً ہی اپنی ایک زبردست فوج حیدر علی کے تعاقب میں روانہ کی اور حکم دیا کہ والی میسور کو اس کی محفوظ پناہ گاہ تک نہ پہنچنے دیا جائے۔

مرہٹہ سپاہی عقب سے گولے بھی برسا رہے تھے اور گولیاں بھی۔ مگر حیدر علی اپنے انجام سے بے پروا ہو کر آگے ہی بڑھتا رہا۔ پھر جب والی میسور شدید کشاکش کے بعد موتی تالاب سے

”فرزند! تم کہاں ہو؟“ یہ کہتا ہوا والی میسور اس طرف بڑھا، جہاں اس کا محبوب بیٹا ایک خوفناک حادثے کی زد میں تھا۔

آخر ٹیپو سنبھل گیا اور اس نے باپ کی دردناک صدا کے جواب میں پوری طاقت سے چیخے ہوئے کہا۔

”بابا محترم! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اپنا سفر جاری رکھیں۔“

نواب حیدر علی گھوڑے سے اتر آیا تھا اور تیز قدموں کے ساتھ اس طرف بڑھ رہا تھا، جہاں سے ٹیپو کی آوازیں آرہی تھیں۔ گردوغبار چھٹا تو حیدر علی نے بیٹے کی صورت دیکھی جو گردوغبار سے الٹی ہوئی تھی۔

”جان پدر! تم ٹھیک تو ہو؟“ حیدر علی کے درواز اور طاقتور بازوؤں نے ٹیپو کو اس طرح لپٹا آغوش میں لے لیا جیسے ولی عہد سلطنت کوئی معصوم بچہ ہو۔

”ہاں نواب بہادر! جب تک میں خدا کے کرم اور آپ کی دعاؤں کے زیر سایہ ہوں، ان وقت تک دشمن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

نواب حیدر علی کچھ دیر تک ٹیپو سلطان کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر جب اُسے یقین آ گیا کہ گولہ کے اثرات سے ولی عہد سلطنت کا جسم محفوظ ہے تو وہ بے اختیار آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”اے خدا! تیرا حقیر بندہ حیدر علی اپنی حقیقت کو خوب پہچانتا ہے۔ اسے جو کچھ ملے، تیرے آستانہ کرم سے ملا۔ اگر تیری مشیت میں طے ہو چکا ہے کہ وہ ساری نعمتوں سے محروم ہو جائے تو پھر اس حال میں اسے زندہ نہ رکھنا کہ دشمن اس کے جسم پر قابو پا جائیں۔ میں تجھے آبرو مند نہ موت کا سوال کرتا ہوں۔ ایسی موت کہ آخری سانس تک تلوار میرے ہاتھ سے نہ چھوٹے اور میرے بدن پر زخموں کی اس قدر لالہ کاری ہو کہ میرا دشمن ان جراثیم کا نشانہ کر سکے۔“

عجیب دعا تھی، جسے سن کر ٹیپو سلطان اور دوسرے فوجی افسروں کی آنکھیں بھی میگی گئیں۔ سرنگاپٹم کی طرف سفر جاری تھا کہ اچانک نئی افاد آ پڑی۔ مرہٹے بڑی توپوں سے گولہ باری کر رہے تھے۔ یکایک ایک گولہ اس اونٹ پر پڑا جس پر بان لدے ہوئے تھے۔ ناگہاں آگ بھڑک اٹھی اور پھر اس آگ نے دوسرے اونٹوں پر لدے ہوئے بانوں کو بھی لپٹ میں لے لیا۔ یہ بڑا خوفناک حادثہ تھا، جس کے سبب حیدر علی کی فوج میں شدید انتشار پھیل گیا۔ پھر اس سے بھی بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ جلتے ہوئے بان اڑنے لگے اور ان بانوں کی وجہ سے بارود کی گاڑیوں میں آگ لگ گئی۔ گولے پھٹنے شروع ہوئے اور فساد مچا دیا۔ سر لرز اٹھی۔ قیامت صغریٰ کا سا منظر تھا۔ میسور کے سپاہی آنکھیں بند کر کے اس طرح بجائے گئے کہ اب ان کے سامنے نہ کوئی منزل تھی اور نہ مقصد سفر۔ ہر طرف چیخیں ہی چیخیں تھیں۔ افاد ناگہانی میں حیدر علی کے سینکڑوں سپاہی جل کر ہلاک ہو گئے۔

بارود کے جلنے اور گولوں کے پھٹنے سے اس قدر دھواں پھیل گیا کہ سپاہیوں کو ایک دوسرے کے چہرے تک نظر نہیں آرہے تھے۔ مرہٹہ فوج نے اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ فوجی اور تاریکی کی آڑ لے کر حیدر علی کے لشکر کے قلب میں آ گئے جس کے باعث مزید انتشار پھیل گیا۔ لالہ میاں جو رشتے میں حیدر علی کے بھائی شہباز کے داماد تھے، شہید ہو گئے۔ ان کی اسی یورش میں حیدر علی کا برادر نسبتی سالار میر علی رضا خان اور دوسرے نامور فوجی ارہٹوں کی ہوکڑ زمین پر گر پڑے اور پھر حملہ آوروں نے انہیں گرفتار کر لیا۔

برادرزئی ہو کر زمین پر گر پڑے اور پھر حملہ آوروں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ٹیپو سلطان اور حیدر علی دونوں لشکر سے بچھڑ گئے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کون کہاں ہے۔ میسور ایک جاننا سالار ملین خان بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا مگر اس کے گرد سپاہیوں کی تعداد بت کم تھی۔ اس لئے مرہٹے بہت جلد اس پر غالب آ گئے۔ ملین خان زخموں سے پور ہو کر زمین پر گر پڑا تھا۔ مرہٹہ سپاہیوں نے اسی حالت میں اسے گرفتار کر لیا اور اپنے خیمے میں لے گئے۔

ملین خان اپنے قد و قامت اور شکل و صورت کے اعتبار سے نواب حیدر علی سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی ترک راؤ نے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“

ملین خان بہت ذہین انسان تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ مرہٹے سالار کے ذہن میں کس قسم کے بیٹے سر اٹھارہ ہیں۔ ملین خان نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا لیا۔

ملین خان کی اس حرکت پر ترک راؤ کا تجسس کچھ اور بڑھا۔ ”تیری خاموشی اور ندامت بتا رہا ہے کہ تو نواب حیدر علی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

اب ملین خان کو یقین ہو چلا تھا کہ ترک راؤ، شبہ میں مبتلا ہے اور اسے حیدر علی سمجھ رہا ہے۔ ملین خان ایک معتمد اور جاں نثار سپاہی تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنگین خطرے میں ڈال کر والی میسور کو بچا لیا۔

”ہاں ترک راؤ! میں وہی بد نصیب ہوں جس نے تیرے ہاتھوں شکست کھائی اور اقتدار سے محروم ہو گیا۔“ یہ کہہ کر ملین خان نے سر جھکا لیا۔

ملین خان کا جواب بڑا معنی خیز تھا۔ ترک راؤ کا شبہ یقین میں بدل گیا اور اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ والی میسور کی زنجیریں کھول دی جائیں اور انہیں ادب و احترام کے ساتھ ان کے خیمے میں بطور مہمان رکھا جائے۔

حیدر علی (ملین خان) کی گرفتاری پر سالار ترک راؤ نے ایک ہنگامہ خیز جشن منایا۔ جی کے شراب پی۔ قریب کے دیہاتوں سے پکڑی ہوئی نوخیز وحسین لڑکیوں سے دل بہلایا اور ہر جگہ اس کی ہوس کا شمار ٹوٹا تو اس نے اپنے ایک تیز رفتار قاصد کو خط دے کر پونا روانہ کر دیا۔ ترک راؤ نے اپنے خط میں نواب حیدر علی کی شکست اور گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ”مگر ہمیشہ کا اقبال بلند ہو کہ اس غلام نے آپ کے ایک خواب کی تعبیر حاصل کر لی۔“

نہایت اندہ حالت میں گرفتار ہو چکا ہے اور میرے قریب کے خیمے میں ایک قیدی کی حیثیت



نے مجھے اپنے مکان میں جگہ دے سکتے ہو؟“  
صاحب مکان بہت غور سے دلی عہد سلطنت کے چہرے اور فوجی لباس کو دیکھتا رہا۔ پھر صاحب مکان میں عجیب سی چمک جاگ اٹھی اور وہ کچھ کہے بغیر اُلٹے پاؤں اپنے گھر کے اندر

پہنچا۔ ٹیپو کو خیال گزرا کہ مالک مکان نے اسے پہچان لیا ہے اور وہ اپنے گھر کے دروازے سے نکل کر محلے داروں کو اس کے بارے میں خبر کرنے گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ٹیپو سلطان اپنی جانے کے لئے مڑا مگر دوسرے ہی لمحے ایک نسوانی آواز ابھری۔

”کنورا! بھگوان کے لئے رک جائیے۔ جیون بھر کی پراستنا آج پوری ہوئی ہے۔“  
ٹیپو نے مڑ کر دیکھا، ایک خوب صورت ہندو عورت تیزی کے ساتھ دروازے سے نکلی اور بے غبار اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ”اتنے سے بعد تو میرے بھاگ جاگے ہیں۔ میں اپنے بھائی کو اس طرح نہیں جانے دوں گی۔“

”اہستہ بول! مرہٹے میرے تعاقب میں ہیں۔“ ٹیپو نے عورت کی پُر شور آواز سن کر گہرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ گھر کے اندر آجائیے۔“ مرد نے ٹیپو کے قدموں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”پھر کوئی غروہائی نہیں رہے گا۔“

ٹیپو تیزی سے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ دونوں میاں بیوی اس طرح خدمت میں لگے رہے تھے جیسے وہ اس کے زرخیز غلام ہوں۔

کھانا کھانے کے بعد ٹیپو سلطان نے ان سے پوچھا۔ ”تم کون ہو اور تم نے مجھے کس طرح پہچانا؟“

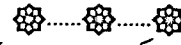
دلی عہد سلطنت ایک چارپائی پر دراز تھا اور عورت و مرد زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیپو نے اس امر پر حیرت کیا کہ وہ دونوں بھی پلنگ پر بیٹھے جائیں مگر گھر کے مالک یہی کہتے رہے۔ ”آخر دیوتا درجنوں میں کوئی فرق تو ہونا چاہئے۔“

پھر اس خوب صورت ہندو عورت نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ ٹیپو کو بتایا۔

”میں ویسی دیوداسی ہوں جس کی زندگی دھرم کے ٹھیکیداروں نے اجیرن کر دی تھی پھر نواب بہادر کی طرح آکاش سے اترے اور مجھے راجہ کرشنا اور کھنڈے راؤ کے خونی قبائل سے نجات دی۔ یہ میرے شوہر ہیں۔“ ہندو عورت نے مرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”نواب بہادر نے مجھے بیٹی کی طرح رخصت کیا تھا۔ راج کنور! اس وقت آپ چھوٹے تھے کہ میں آپ کو کس طرح بھول سکتی ہوں؟ میرے شوہر مجھے یہی اطلاع دینے آئے تھے کہ دیوتا، پٹان کے دربار پر کھڑے ہیں۔“

ٹیپو سلطان ایک ہندو مرد و عورت کے اس جذبہ احسان شناسی سے بہت متاثر ہوا۔ دلی عہد

سے سانس لے رہا تھا۔ دوسرے خواب کی تعبیر عنقریب پیش کروں گا۔ میرے بہادر سپاہی! فوجی کے ساتھ سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بس چند روز کی بات ہے، حیدر علی دارالحکومت بھی آپ کے قدموں تلے ہوگا۔“



جب حیدر علی نے دیکھا کہ بازی مکمل طور پر اُلٹ چکی ہے اور دھوئیں کی کثرت سے باعث فوج نظر آ رہی ہے اور نہ کوئی سناٹا، تو وہ اکیلا ہی سرنگاپٹم کی طرف چل پڑا۔ حیدر علی کی زندگی کا یہ بدترین وقت تھا۔ شکست کے آثار مکمل طور پر نمایاں ہو چکے تھے۔ مزید قیامت یہ کہ تمام سناٹا بچھڑ گئے تھے اور محبوب بیٹے کا بھی دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ راستے ہر مشربہ کرب کے عالم میں دعائیں مانگتا رہا۔

”اے بے پناہ کرم والے! وقت کی رفتار تیرے ہی تابع ہے۔ میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔ اب اگر تو ہی چاہے گا تو یہ گراں وقت ٹلے گا۔ میری فوج کی حفاظت کر! میرے سرداروں کی آبرورکھ اور میرے بیٹے کو دشمنوں کے قتل و شتر سے بچا۔ زمین بھی تیری، اقتدار بھی تیرا۔ تیرے سوا کوئی کار ساز نہیں۔“ یہ دعا مانگتا ہوا حیدر علی، حضرت شاہ قادر ولی کے حرا کے احاطے میں داخل ہوا۔

حضرت شاہ قادر ولی کی درگاہ، سرنگاپٹم کے نواح میں واقع ہے اور صدیوں سے اہل ایمان کا مرکز دل و نگاہ ہے۔ قادر ولی اپنے دور میں ایک نامور بزرگ گزرے ہیں۔ یہاں بچکر حیدر علی نے دور کث نماز ادا کی اور پھر دعا مانگتے وقت والی میسور پر گہری رقت طاری ہوئی۔



ٹیپو سلطان بھی اپنے لشکر سے بچھڑ گیا تھا۔ بس دو سپاہی اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔ مرہٹہ فوجی، دلی عہد سلطنت کے تعاقب میں تھے۔ آخر ٹیپو جان بچانے کے لئے دیہات کے ایک باغ میں داخل ہو گیا۔

”شہزادے! آپ کسی مکان میں پناہ لے لیجئے۔ ہم اسی مقام پر آپ کے گھوڑے کی حفاظت کر رہے ہیں۔ دشمنوں کے تعاقب کا خطرہ ختم ہوتے ہی ہم آپ سے آملیں گے اور اگر خدمت عالی میں حاضر نہ ہو سکیں تو سمجھ لیجئے گا کہ یا تو ہمارے جسم، دشمن کی تلواروں کا نشانہ بن گئے ہیں یا زنجیروں میں جکڑے گئے۔“

ٹیپو گھوڑے سے اتر کر کچے مکانوں کی طرف بڑھا، جن کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جب دلی عہد سلطنت نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی اور صاحب مکان باہر آئے اسے اندازہ ہوا کہ یہ پورا گاؤں ہندو آبادی پر مشتمل ہے۔ ٹیپو جھجک کر رہ گیا۔ ہندو ہی اس کے تعاقب میں تھے اور وہ بھاگتے بھاگتے ایک ہندو ہی کے دروازے تک آ پہنچا تھا۔ ”میرے بھائی! میں ایک مسافر ہوں جو اپنے قافلے سے بچھڑ گیا ہے۔ کیا تم ایک رات

نہا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دارالحکومت کے مسلمانوں میں صفِ ماتم بچھ گئی اور ہندوؤں نے اپنے گردوں میں چراغاں شروع کر دیا۔

راج گھرانے میں جشن کا سا سماں تھا۔ تینوں رائیاں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہی تھیں اور گیانی و جے آئندہ کرشن راؤ کے سامنے بیٹھا ایک کاغذ پر زائچہ کھینچ رہا تھا۔ پھر ستاروں کی رفتار کا مطالعہ کرنے کے بعد پُر جوش لہجے میں چینا۔

”یہ وقت نواب خاندان کے لئے بہت منحوس ہے۔ اقتدار بھی گیا اور جان و مال بھی۔ ہو سکا ہے کہ پورا گھرانہ ہی برباد ہو جائے۔“

”خبریں تو یہی ہیں مہاراج!“ لکشمی ماکے قہقہہ رکنے میں نہیں آتے تھے۔ ”حیدر علی اور ٹیپو کے ساتھ تمام سردارانِ سلطنت بھی مارے جا چکے ہیں۔ اب راج دھانی کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں۔ ہمارے جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ مرہٹوں نے سرنگاپٹم سے پندرہ میل کے فاصلے پر غنہ زن ہیں۔ بس چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ ایک دو دن کی بات ہے۔ پھر بھی آپ ایک بار دربار ستاروں کی چالوں کا جائزہ لے لیں۔ کہیں کوئی بچاؤ کا گھر تو نہیں ہے؟“

”نہیں مہاراج!“ و جے آئندہ مختلف خانوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ ”موت اور صرف موت..... جانا ہی اور صرف جانا ہی۔“

گیانی کی بات سن کر کرشن راؤ نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ ”جے وُرگا، جے کالی۔“

تینوں رائیوں نے بھی ہنستے ہوئے چہروں کے ساتھ اسی نعرے کا ورد کیا۔

”ہم تو سمجھے تھے کہ اس کھیل میں برسوں لگیں گے۔ مگر یہ تو ایک دن کا تماشا نکلا۔“ کرشن راؤ نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ پھر شراب کا ایک جام لبریز کر کے گیانی و جے آئندہ کو دیا، دوسرا خود یا اور تیرا اپنے نائب پورنیا کی طرف بڑھایا نو جوان پورنیا، جسے حیدر علی کی ملازمت کرتے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کمرے کے ایک گوشے میں خاموش کھڑا تھا۔

”نہیں مالک! میں آپ کے سامنے یہ جرأت کس طرح کر سکتا ہوں؟“ پورنیا نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

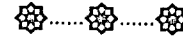
”آج کوئی مالک نہیں، کوئی نوکر نہیں۔“ کرشن راؤ، حیدر علی کی موت اور افواجِ میسور کی شکست کی خبر سن کر آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ ”پی لے کہ آج ہماری زندگی کا یادگار دن ہے۔“

رائیوں نے بھی پورنیا کو اشارہ کر دیا۔ وہ تینوں عیار غورتیں اس ذہین نو جوان سے غیر معمولی کام لینا چاہتی تھیں، اسی لئے شراب کی رشوت پیش کر رہی تھیں۔ آخر پورنیا نے شرمائے ہوئے انداز میں شراب کا پیالہ لے لیا اور گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگا۔

”مہاراج! ہماری فتح تو یقینی ہو چکی، مگر میرا انعام کیا ہوگا؟“ شراب کا نشہ کرشن راؤ کے سر پہ کھول رہا تھا۔

”تو جو چاہے گا۔“ رائی دیواجی منی نے ہنستے ہوئے کہا۔

سلطنت نے دو دن تک دیو داسی کے گھر میں قیام کیا۔ اس دوران اس کا شوہر، ٹیپو کے دونوں سپاہیوں کو بھی کھانا پہنچاتا رہا پھر جب فضا صاف ہو گئی اور مرہٹوں کے تعاقب کا خطرہ ٹل گیا تو ٹیپو سلطان اپنے دونوں سپاہیوں کے ہمراہ سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو گیا۔



ولی عہد سلطنت تین روز سے غائب تھا اور نواب حیدر علی کے اضطراب میں لچک رہا تھا۔ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ والی میسور نے دو دن تو بڑے ضبط و تحمل سے گزارے۔ مگر جب تیسرا دن بھی ڈھلتے ڈھلتے شام تک پہنچ گیا تو نواب حیدر علی نے بڑے جانگداز لہجے میں دعا کی۔

”اے اللہ! اگر میرے گناہوں کے سبب میری دعائیں حدِ قبولیت سے لوٹائی جا رہی ہیں تو پھر اپنے اس محبوب بندے کے طفیل مجھے معاف کر دے۔“

انہی یہ دعا ختم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ ٹیپو سلطان بھی رات کے اندھیرے میں حضرت شاہ قادر ولی کی درگاہ تک پہنچ گیا۔ ولی عہد سلطنت کو اپنے سامنے پا کر نواب حیدر علی کو کچھ دیر کے لئے سکتہ سا ہو گیا۔ ٹیپو سلطان اس وقت ہندوانہ لباس پہنے ہوئے تھا اور یہ لباس رخصت ہوتے وقت دیو داسی کے شوہر نے دیا تھا کہ اگر مرہٹہ سپاہیوں سے آمناسا منا ہو جائے تو وہ ٹیپو کو ہندو سپاہی سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔

حیدر علی بہت دیر تک ٹیپو کو سینے سے لگائے روتا رہا، پھر رات کے اندھیرے ہی میں سرنگاپٹم کی طرف بڑھا۔



راج محل میں ایک کہرام برپا تھا۔ ریاست کے جاسوس، شجاعت خان کو ایک ایک لے کر خبریں پہنچا رہے تھے کہ ترک راؤ کی فوجیں سرنگاپٹم سے صرف پندرہ میل دور ہیں۔ اور نواب بہادر کا کہیں کوئی پتہ نہیں۔ جاسوسوں نے ڈرتے ڈرتے یہ بھی کہا۔

”خاکم بدہن، لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نواب بہادر اور ولی عہد سلطنت اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ میر علی رضا خان، سلیم خان، بیت جنگ اور محمد علی کمیدان بھی مارے گئے۔“

”خاموش ہو جاؤ، نامرادو!“ شدتِ کرب سے شجاعت خان چیخ اٹھا۔ ”خدا کی قسم! وہ نابکار ترک راؤ، نواب بہادر اور شہزادے پر کبھی قابو نہیں پا سکتا۔“ جوشِ جذبات میں شجاعت خان نے ان خبروں کو جھٹلایا تھا مگر اندر سے وہ خود بھی بہت خوف زدہ تھا۔ تمام رابطے ٹوٹ گئے تھے اور کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔

سرنگاپٹم کی طرف مرہٹوں کی پیش قدمی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور پیش آیا ہے ورنہ حیدر علی، دارالحکومت کے دفاع سے اس قدر غافل نہیں ہوتا۔ حالات بہت زیادہ خراب تھے مگر شجاعت خان نے حسنِ تدبیر سے کئی دن تک ان افواہوں پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ آخر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، پہرے کمزور ہوتے گئے اور پورا سرنگاپٹم افواہوں کی زد میں آ

”میری آرزوؤں کی فہرست بہت مختصر ہے مہارانی!“ کرشن راؤ نے لہراتے ہوئے کہا۔  
”ایک ریاست میسور کی وزارت عظمیٰ اور دوسرے نظام دکن کی بیٹی حمیدہ خاتون۔ میں نے اس کی بس ایک ہی جھلک دیکھی ہے اور روز و شب کا چین گنوا دیا ہے۔“  
حمیدہ خاتون کا ذکر سن کر رانی کا منہ کا چہرہ جل اٹھا مگر وہ دونوں رانیوں کی موجودگی میں اپنے غصے کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ آج اسے یقین آ گیا تھا کہ کرشن راؤ ایک بے وفا شخص ہے۔ اس لئے وہ بھی نظروں کا زایہ بدل کر پورنیا کی طرف دیکھنے لگی، جو نو جوان تھا اور کرشن راؤ سے زیادہ خوبصورت بھی۔

”وہ ایک مسلمان لڑکی ہے۔“ رانی دیا جی منی نے کرشن راؤ کی خواہش پر اعتراض کیا۔  
”مہارانی خوب جانتی ہیں کہ حیدر علی کے دور حکومت میں ہزاروں عورتیں اور مرد مسلمان ہو چکے ہیں۔“ یکا یک کرشن راؤ کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا اور اس کے سانولے چہرے پر گہری سیاہی چھا گئی تھی۔ ”میں حمیدہ خاتون کو ہندوؤں کے اپنی قوم کے پاپوں کا پرانچت کروں گا۔“  
”اپنا یہ شوق بھی پورا کر لینا۔“ رانی لکشمی مانے تھکے لگاتے ہوئے کہا اور پھر وہ سب کے سب مل کر ”راج راج“ کے خواب دیکھنے لگے۔



دوسری طرف نواب حیدر علی کے محل میں درو دیوار پر ماتمی فضا چھائی ہوئی تھی اور تمام کینز اور خدمت گار اپنی جینوں کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فاطمہ بیگم خاموش تھیں مگر ان کے چہرے پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ رافعہ خاتون اور حمیدہ خاتون تصویر دردی کھڑی تھیں لیکن مجیدہ بیگم کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال تھا۔ حیدر علی اور ٹیپو کی موت کی خبریں ان کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں مگر ان کے بائے استقامت میں ہلکی سی بھی لرزش نہیں آئی تھی۔ پھر جب انہوں نے حرم سرا کی خواتین کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھی تو شجاعت خان کو زبان خانے میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ حیدر علی اور ٹیپو اس دنیا میں نہیں رہے؟“  
”یہ افواہ ہے مادر گرامی! اس کے سوا کچھ نہیں۔“ شجاعت خان نے پریقین لہجے میں کہا۔  
”پھر وہ کہاں ہیں؟“ مجیدہ بیگم نے دوسرا سوال کیا۔  
”کسی محاذ جنگ پر ہوں گے۔“ اب کی بار جواب دیتے وقت شجاعت خان کی زبان میں

کسی قدر کلفت پیدا ہو گئی تھی۔  
”اور مرہٹوں کی فوج سرنگاپٹم سے کتنی دور ہے؟“ مجیدہ بیگم سوال پر سوال کے جاری تھیں۔  
”دشمن کی فوجیں پندرہ میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہیں۔“ انتہائی کوشش کے باوجود شجاعت خان کا لہجہ بھجا بھجا سا تھا۔  
”یقیناً کوئی بات ہوئی ہے ورنہ حیدر علی، دارالحکومت اور حرم سرا کے دفاع سے اس قدر

بانی نہیں رہتا۔“ مجیدہ بیگم ایک زمانہ آشنا خاتون تھیں اور انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار باطنی انتظامات دیکھے تھے، اس لئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھیں۔ ”تمام سرحدی باطنی قلعے کی نگرانی پر مامور کر دے اور اس کے ساتھ ہی قلعے میں بارودی سرنگیں بچھا دے۔“  
”میں سمجھا نہیں مادر گرامی!“ شجاعت خان نے چونک کر کہا۔ ”بارودی سرنگوں کا قلعہ سے کیا تعلق ہے؟“  
”اگر حیدر علی واپس نہیں آیا اور دشمن قلعے پر قابض ہو گیا تو کیا تو مجھے اور حرم سرا کی خواتین کو اس کے حوالے کر دے گا؟“ مجیدہ بیگم کا لہجہ کسی قدر تلخ تھا۔ ”اس سے پہلے کہ دشمن،

حیدر علی کے ناموس کو بری نظر سے دیکھے، تجھ پر لازم ہے کہ پورے قلعے کو بارود سے اڑا دے۔“  
”یہاں ہم اس حالت میں نامحرموں کے سامنے نہیں جائیں گے کہ ہمارے سروں سے آچل کھینچ لے جائیں۔“  
مجیدہ بیگم کی گفتگو سن کر شجاعت خان جیسا مرد آہن بھی بچوں کی طرح رونے لگا۔ ”اس رات ہے مادر گرامی! صبح ہوتے ہی آپ کے حکم کی تعمیل کر دوں گا۔“

پھر رات کے اندر ہی ہی میں مجیدہ بیگم، سرکاری رتھ پر بیٹھ کر سید اکرام بخاری کے مکان پہنچیں۔ سید صاحب ان کی بے وقت آمد پر پریشان سے نظر آنے لگے تھے۔  
”سرنگاپٹم میں ہر طرف اسی خبر کی بازگشت سناؤ دے رہی ہے کہ خدا خواستہ حیدر علی اور ٹیپو ال دنیا میں نہیں رہے۔“ قلعے کے اندر آتشیں لہجے میں بولنے والی عورت، سید صاحب کی خانقاہ نما آواز کرنے لگی تھی۔

ایک لمحے کے لئے سید صاحب کو بھی سکتہ سا ہو گیا تھا۔ پھر سنبھل کر انتہائی پر جلال لہجے میں بولے۔ ”کیا کوئی معتبر سپاہی میدان جنگ سے یہ خبر لے کر آیا ہے؟“  
”نہیں۔“ مجیدہ بیگم کی آواز بہت شکستہ تھی۔ ”دارالحکومت کے ہندو میرے بیٹے کی موت اور شکست کا جشن منا رہے ہیں۔“

”جب تمہیں میرے مرنے کی خبر ملے تو پھر سوچنا کہ شاید ان دونوں پر بھی کوئی قیامت نازل ہوگی۔“ سید صاحب کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ ”اور ابھی تو میں زندہ ہوں۔“  
مجیدہ بیگم نے حیرت سے سید صاحب کی طرف دیکھا۔ اگرچہ ایک مرد قلعہ کی گفتگو بہت عجیب تھی، لیکن پھر بھی مجیدہ بیگم کا دل ٹھہر گیا تھا۔

آخر رات کے تین بجے کے قریب حرم سرا کی ماتمی فضا، مسرت آمیز جینوں میں بدل گئی۔  
گروہ غلام اور ٹیپو سلطان اس طرح محل پہنچے کہ ان کے پاؤں آبلوں سے بھر گئے تھے اور چہرے نورانی ہو گئے تھے۔ پھر جب حرم سرا کی خواتین کے آنسوؤں کا سیلاب رک گیا تو حیدر علی نے محل کی ایک ایک کینز اور خدمت گار کو طلب کرتے ہوئے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔  
”یہ کی کو پتہ نہ چلے کہ میں اور ٹیپو، محل میں موجود ہیں۔ اگر کوئی میری موت کا ذکر کرے تو

لازمت قبول کر لے۔“  
محمد علی کیدان کے دماغ میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے جیسے اس کا سر پیشوائے پونا کی زبوں کی زد میں ہو۔ آخر اس نے بڑی مشکل سے اپنی وحشتِ دل پر قابو پایا۔

”اگر واقعتاً تو نے نواب بہادر کو زنجیر پہنا دی ہے تو پھر میں تیری ملازمت قبول کر لوں گا۔“ محمد علی کیدان، ترک راؤ کے تمام اندازوں سے زیادہ شاطر اور ذہین تھا۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہیں تھا کہ نواب حیدر علی اس قدر ذلت آمیز طریقے سے ترک راؤ کا شکار ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی طرح یہ حادثہ رونما ہو بھی گیا ہے تو وہ اپنی ذہانت سے حالات کا رخ موڑ دے گا اور ایک نہ ایک دن ترک راؤ کی قید سے رہائی حاصل کر لے گا۔ محمد علی کیدان نے چند لمحوں میں ایک منصوبہ بنایا اور اپنی مشروط رضامندی ظاہر کر دی۔

”اگر تیری یہی شرط ہے تو پھر تو بہت جلد اپنے آقا سے ملاقات کرے گا۔“ مرہٹہ سالار زک راؤ نے نہایت آسودہ لہجے میں کہا۔ اسے محمد علی کیدان جیسے مردِ شجاع کو اپنے سامنے بے زنجیر دیکھ کر ناقابلِ بیان خوشی ہو رہی تھی۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی ترک راؤ، محمد علی کیدان کو لے کر یاسین خان کے خیمے میں پہنچا۔ وہ اپنی بے خبری کے باعث نواب حیدر علی سمجھ رہا تھا۔

”نواب! تمہارا ایک اور جانثار تم سے ملے آیا ہے۔“ ترک راؤ نے یاسین خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

یاسین خان نے گھبرا کر محمد علی کیدان کی طرف دیکھا اور سالارِ میسور پر نظر پڑتے ہی اس کا ہوش ہو گیا۔ یاسین خان کو اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں محمد علی کیدان جو شطراب میں اس راز کو فاش نہ کر دے جس پر ایک وفادارِ سلطنت نے بڑی ہوشیاری سے پردہ ال رکھا تھا۔

یاسین خان کو اپنے سامنے پا کر ایک لمحے کے لئے محمد علی کیدان بھی ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اس کے جی میں آئی تھی کہ ترک راؤ سے چیخ چیخ کر کہے۔

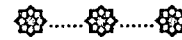
”اقت! اتو جیسے نواب حیدر علی سمجھ رہا ہے، وہ اس کا ایک ادنیٰ جانثار ہے۔“  
محمد علی کیدان غضب کا معاملہ فہم تھا۔ اس نے دوسرے ہی لمحے صورتِ حال کو سمجھ لیا۔ پھر تنہا کے ساتھ یاسین خان کے قریب پہنچا اور کسی خدمت گار کی طرح گھٹنیوں کے بیچ جھک کر منگو انداز میں آہ و زاری کرنے لگا۔

”نواب بہادر! کاش یہ منظر دیکھنے سے پہلے زمین پھٹ گئی ہوتی اور میں اس میں سا گیا ہوتا۔“

یاسین خان نے سکون کی سانس لی۔ محمد علی کیدان نے بڑی ذہانت سے ایک قیامت خیز نکتہ کھل دیا تھا۔ پھر اس ملاقات کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے یاسین خان نے بھی

تم اپنی طرف سے خاموشی اختیار کرنا۔“  
کنیزوں اور خدمت گاروں نے گردنیں جھکا دیں۔

”اور اگر یہ خبر محل سے باہر گئی تو پھر سمجھ لو کہ تم میں سے کسی کی خیر نہیں۔“  
ایک تو حیدر علی کا فطری جاہ و جلال، دوسرے اس کا قہرناک لہجہ، کنیزوں اور خدمت گاروں کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا اور انہیں ہر طرف موتِ رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔  
پھر اسی لہجے میں یہی حکم محل کے پہرے دار سپاہیوں کو دیا گیا۔ اس کے بعد نواب حیدر علی، نیپو سلطان کو لے کر ایک مخصوص تہہ خانے میں چلا گیا۔



نواب حیدر علی اور نیپو سلطان محل کے ایک انتہائی خفیہ تہہ خانے میں موجود تھے۔ سرنگا پٹم کے مسلمان سمجھ رہے تھے کہ والی میسور اپنی بقاء کی آخری جنگ لڑ رہا ہے۔ اور دارالحکومت کے ہندوؤں میں یہ افواہ عام ہو چکی تھی کہ حیدر علی اور نیپو سلطان مارے جا چکے ہیں اور غریب پوری ریاست پر مرہٹہ سالار، ترک راؤ کا قبضہ ہونے والا ہے۔

اس قدر مخدوش اور سنگین فضا میں جب محمد علی کیدان نے دیکھا کہ نواب حیدر علی کا کہیں پتہ نہیں ہے تو وہ اپنے سپاہیوں کو لے کر ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور اتنی مہارت سے لڑا کہ شام تک مرہٹہ فوج کو آگے بڑھنے سے روک رکھا۔ مگر ترک راؤ کی عسکری طاقت کے سیلاب نے محمد علی کیدان کی اٹھائی ہوئی دفاعی دیوار کو ڈھادیا اور مرہٹے پہاڑی پر بھی قابض ہو گئے۔

محمد علی کیدان کو گرفتار کر کے ترک راؤ کے سامنے لایا گیا۔ مرہٹہ سالار بہت ذہین شخص تھا۔ اس نے ایک مردِ جانناز کو قتل کرنے کے بجائے سیاست سے کام لیا۔

”میں تیری شجاعت و مردانگی کا قائل ہوں محمد علی!“ ترک راؤ نے ایک مسلمان سالار کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تجھے ضائع کرنا نہیں چاہتا۔“

محمد علی کیدان نے سوالیہ نظروں سے ترک راؤ کی طرف دیکھا۔  
”تیرا نواب حیدر علی بازی ہار چکا اور اب ہماری قید میں غلامانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔“

ترک راؤ نے انتہائی احساسِ غرور کے ساتھ کہا۔ ”ریاست میسور کی قسمت کا فیصلہ بھی چند روز میں ہو جائے گا۔ پھر تو کس کے لئے جنگ لڑ رہا ہے؟“

نواب حیدر علی کی گرفتاری کی خبر سن کر شدتِ درد سے محمد علی کیدان کا چہرہ دھواں ہو گیا اور وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تو میرے پیروں کے نیچے زمین بھی موجود ہے اور سر پر آسمان بھی قائم ہے۔“

”سب کچھ ممکن ہے محمد علی!“ ترک راؤ نے ایک زوردار ہتھیار لگایا۔ ”تجھے دراصل پیشوائے بے پناہ طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ خیر! یہ سب ماضی کا قصہ ہے اور تو اپنے حال کو سنبھالنے کی

کوشش کر۔ میں چاہتا ہوں کہ تجھ جیسے بہادر کے ہاتھ سے تلوار نہ چھوٹے۔ تو مادھو راؤ کی



نہیں ہے۔ ایک رات یہاں ٹھہر جانے دو۔ کہیں اندھیرے میں حیدر علی کے سپاہی حملہ نہ کر لیں اور ہم اپنی جانوں سے بھی چلے جائیں۔“  
ایک تو محمد علی کیدان کی گریہ و زاری، دوسرے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی شکستہ حالی، رہن سپاہیوں کو سالار میسور کی افسانہ طرازی پر یقین آ گیا اور انہوں نے یہ کہہ کر ان بھجوروں کو تاجر کے لئے قیام کی اجازت دے دی۔

”ایک طرف پڑ جاؤ مگر صبح ہوتے ہی یہاں سے چلے جانا۔ ہمارے اور حیدر علی کے میان جنگ چھڑی ہوئی ہے۔“

محمد علی کیدان نے مرہٹہ سپاہیوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر قریب ہی جکی بن پر دراز ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے ایک ایک سپاہی کو ستر گونیوں میں حکم دیا کہ ہر شخص رات راجا گنا رہے۔ تمام سپاہی یہ سوچ کر پریشان تھے کہ ان کا سالار محفوظ راستے سے سرنگا پٹم آنے کے بجائے دشمن کے منہ میں کیوں آ پڑا ہے؟ مگر محمد علی کیدان کے دل کا راز کسی پر نہیں لگا تھا۔ آخر جب آدھی رات کے قریب سرد ہوا کے جھونکوں نے مرہٹہ سپاہیوں کو سلا دیا تو علی کیدان اٹھا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔

”بے پاؤں بلی کی طرح چلتے ہوئے مرہٹوں کے سروں پر پہنچ جاؤ اور ان ہی کے ہتھیار میں کران پر حملہ دو۔“

بڑا عجیب حکم تھا۔ مگر سپاہی اپنے سالار کا حکم ماننے کے لئے مجبور تھا۔ تمام مرہٹے بے خبر ہوئے تھے اور جنگ کی کھلی فضا میں ان کے خراٹے اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ ان کے سالار کے سپاہیوں اور مردہ انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ محمد علی کیدان اور اس کے انہوں نے مرہٹوں کی گہری نیند سے خوب فائدہ اٹھایا۔

پھر جب تک مرہٹے سنبھلتے اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے، اس وقت تک محمد علی اور اس کے ساتھی اپنا مقصد حاصل کر چکے تھے۔ رات کی تاریکی اور نیند کا خمار، غرض یہی دونوں لڑکے مرہٹوں کی ہلاکت کا سبب بن گئے۔ محمد علی کیدان اور اس کے سپاہیوں نے صبح ہونے سے پہلے تمام مرہٹوں کو قتل کر ڈالا اور ان کا سارا جنگی ساز و سامان چھین کر سرنگا پٹم پہنچ گیا۔



محمد علی کیدان کے پہنچنے ہی سرنگا پٹم میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ تینوں رانیاں بہت زیادہ نشان نظر آ رہی تھیں، کرشن اور گیانی وجے آئند انہیں بار بار تسلیاں دے رہے تھے۔

”محمد علی کے سرنگا پٹم آنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ میدان جنگ سے بھاگا ہوا سپاہی ہے، جسے سرنگا پٹم میں چند روز سے زیادہ امان نہیں مل سکتی۔ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان دونوں سے جا چکے ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو قلعے میں ان کی آمد کا جشن ضرور منایا جاتا۔ کیوں نہ ہو؟“ کرشن راؤ نے اپنے نائب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تیری اطلاعات کیا ہیں؟“

زبردست ناک رچایا۔

”صبر کر محمد علی! صبر کر۔“ یاسین خان نے حاکمانہ انداز میں اپنا ہاتھ محمد علی کیدان کے سر پر رکھ دیا۔ گردش ایام کی ایک ادا یہ بھی ہے، جس کا ہم دونوں شکار ہیں۔“  
محمد علی کیدان بہت دیر تک مصنوعی آنسو بہاتا رہا۔ پھر وہ بہت تیزی سے اٹھا اور ترک راؤ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”مجھے یہاں سے دور لے چل کہ یہ منظر دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں خون ہو جائیں گی۔“  
محمد علی کیدان کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر سپہ سالار ترک راؤ بھی بہت زیادہ عجیبہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سالار میسور کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور یاسین خان کے خیمے سے باہر نکل آیا۔  
”تم نے ٹھیک ہی کہا تھا ترک راؤ! کچھ بھی نہیں بچا۔“ محمد علی کیدان کے سینے میں مروٹوں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ مگر ہونٹوں پر شکست و نامرادی کا مرثیہ تھا۔ ”سب کچھ جل کر خاک ہو گیا۔ اب میں کس امید پر چیوں گا کہ یہ سروبال دوش ہے۔“ محمد علی کیدان بڑی عیاری سے ترک راؤ کے گرد جال بچھا رہا تھا۔

مرہٹہ سالار اُسے بہت دیر تک تسلیاں دیتا رہا۔ آخر محمد علی کیدان نے ملازمت کی پیشکش قبول کر لی۔ ”مگر میرے بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟“ سالار میسور نے ترک راؤ سے پوچھا۔  
ترک راؤ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا، پھر کہنے لگا۔ ”تم اپنے کسی معتبر آدمی کو بھیج کر انہیں یہیں بلا لو۔“

”قیامت کی اس فضا میں کون کس پر اعتبار کرے گا؟“ محمد علی کیدان نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

”تو پھر تم خود چلے جاؤ۔“ آخر ترک راؤ، علی محمد کیدان کے فریب میں آ گیا۔ اور پھر دوسرے دن سالار میسور اپنے سپاہیوں کے ہمراہ بیوی بچوں کو لانے کے لئے ترک راؤ کے خیمے سے باہر نکلا۔ ترک راؤ نے اپنی دانست میں بڑی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے محمد علی کیدان اور اس کے سپاہیوں سے ہتھیار رکھوا لئے تھے۔ مرہٹہ سالار کے خیال میں یہ نئے سپاہی اس شیر کی مانند تھے، جس کے دانت توڑ دیئے گئے ہوں اور خونی پنجے کاٹ دیئے گئے ہوں۔  
ترک راؤ، میسور کے ان شیروں کو گیدڑوں سے بھی زیادہ بے ضرر سمجھ رہا تھا۔

محمد علی کیدان اور اس کے ساتھی مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ پھر جب رات آگئی تو سالار میسور اس مقام پر ٹھہرا، جہاں مرہٹہ سپاہیوں کا ہر اوّل دستہ اپنی فوج کی حفاظت کے لئے خیمہ زن تھا۔ مرہٹوں نے مسلمان سپاہیوں کو دیکھا تو اپنی تلواریں کھینچ لیں۔ محمد علی کیدان نے ان سے فریادی لہجے میں کہا۔

”ہم بنگلور کے بھاری ہیں۔ اپنے مویشی فروخت کرنے سرنگا پٹم جا رہے تھے کہ حیدر علی نے ہمارا تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ بس جسم پر یہ کپڑے باقی بچے ہیں۔ وودن سے کچھ کھایا بچا

پورنیا نے محل کی ایک ہندو کنیر آرتی کو اپنی جھوٹی محبت کا اسیر بنا لیا تھا۔ اور پھر محصور آرتی، محبت کے اسی نشے میں پورنیا کے لئے ایک جاسوسہ کی خدمت انجام دے رہی تھی۔ آرتی ہی نے پورنیا کو بتایا تھا کہ محل کی فضا بہت سوگوار ہے۔ ہر شخص اس طرح خاموش نظر آتا ہے، جیسے وہ کسی گہرے صدمے سے دوچار ہے۔ پورنیا نے آرتی کے الفاظ رائیوں کے سامنے دہرا دیئے۔

”مگر ترک راؤ، سرنگا پنم پر حملہ کیوں نہیں کرتا؟“ رانی لکشم مانے پورنیا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”آخر وہ اپنا لشکر لئے ہوئے خاموش کیوں پڑا ہے؟ اسے کس بات کا انتظار ہے؟“

رانی لکشم ما ایک ذہین عورت تھی۔ اس کے سوال نے گیانی وجے آئند کو بھی چونک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”مہارانی کا یہ نکتہ یقیناً قابل غور ہے۔“ گیانی نے بڑے عجیب انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

”قابل غور نہیں!“ رانی لکشم مانے غصے میں گیانی کو جھڑک دیا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ حیدر علی مرچکا۔“

”مہارانی کی بے یقینی کی وجہ؟“ وجے آئند نے سہجے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اگر حیدر علی مرچکا ہوتا تو اس کے خاندان والوں نے اپنے گریبان پھاڑ لئے ہوتے اور پورا محل شور و ماتم سے گونج رہا ہوتا۔“ رانی لکشم ما انتہائی غضب ناک نظر آ رہی تھی۔ ”قلعے کے ٹکینوں کا یہ سکوت، یہ سناٹا بے سبب نہیں ہے۔ میں حیدر علی کو خوب جانتی ہوں، وہ بڑا مادی گریہ ہے۔ اس نے کئی بار موت کو بھی دھوکا دیا ہے۔“ غصے کی زیادتی کے باعث رانی ہڈیاں کتنے لگی تھی۔ ”اس نے اس بار بھی ترک راؤ کو دھوکا دے دیا ہوگا۔ میرے نصیب ہی ایسے ہیں۔ میں ابھاگن، میسور کی آزادی کا خواب دیکھتے دیکھتے شمشان کی راکھ بن جاؤں گی۔“ مایوسیوں نے چاروں طرف سے رانی لکشم ما کو گھیر لیا تھا۔ ”کرشن راؤ! تو خود ترک راؤ کے پاس جا اور اسے میری طرف سے سرنگا پنم پر حملہ کرنے کی دعوت دے۔“

کرشن راؤ فطرتاً بزدل تھا۔ اس لئے رانی کا حکم سن کر بدحواس نظر آنے لگا۔ مگر گیانی وجے آئند کی مداخلت نے جلد ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

”نہیں مہارانی! ابھی فضا اتنی صاف نہیں ہے کہ آپ کا جاسوس تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر ترک راؤ سے ملاقات کر سکے۔“ گیانی وجے آئند نے رانی لکشم ما کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جہاں برسوں انتظار کی تکلیف برداشت کی ہے، وہاں چند روز کی خلش اور سہمی۔ حیدر علی کی زندگی کا سورج یقیناً ڈوب چکا ہے مگر ابھی اس کے کچھ جاں نثار باقی ہیں۔ بہت جلد یہ بھی میدان چھوڑ دیں گے۔ پھر آپ کے خواب کی حسین تعبیر لے کر نئی صبح طلوع ہوگی اور رام راج

کی رشتی سرزمین میسور کے گوشے گوشے میں پھیل جائے گی۔“  
ظاہر گیانی وجے آئند اور کرشن راؤ انتہائی پرجوش لہجے میں باتیں کر رہے تھے مگر وہ خود بھی بڑے بہت زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ سرنگا پنم پر مہم ہونے کے حلقے میں جس قدر تاخیر ہوتی جا رہی تھی، اسی قدر ان کے دل بھی ڈوبتے جا رہے تھے۔

میسور کی رائیوں اور ان کے حامیوں نے نواب حیدر علی اور نیپوسلطان کو مردہ تصور کر لیا تھا مگر یہ دونوں باپ بیٹے انتہائی رازداری کے ساتھ محل کے تہہ خانے میں بیٹھ کر ترک راؤ سے جگہ جگہ رکھنے کے لئے نئی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ محمد علی کیدان اور شجاعت خان، سرنگا پنم کے گرد و نواح میں گھوم کر نئی فوج بھرتی کر رہے تھے۔ نواب حیدر علی نے اپنے خزانے کے نہ کھول دیئے تھے۔ نتیجتاً پندرہ دن کے مختصر عرصے میں والی میسور کے پاس بارہ ہزار ہار اور بیس ہزار پیادے جمع ہو گئے۔ نواب حیدر علی کھلے میدان میں ترک راؤ کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔



مرہٹہ سالار بڑی بے چینی سے محمد علی کیدان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر جب ایک ماہ بعد ترک راؤ کو خبر ملی کہ محمد علی کیدان اس کے سینکڑوں سپاہیوں کو قتل کر کے سرنگا پنم پہنچ گیا ہے تو اسے اپنی غلطی کا شمت سے احساس ہوا۔ ترک راؤ بہت برہم تھا۔ محمد علی کیدان کے فرار ہونے کا غصہ اس نے میر علی رضا خان اور دوسرے مسلمان سرداروں پر اتارا اور انہیں فوراً ہی سخت فحاشی پھرے میں پیشوائے پونا، مادھو راؤ کے پاس روانہ کر دیا۔

مجرورہ ٹیمن خان کے خیمے میں آیا۔

”نواب! میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ تم اپنی حرم سرا اور شہزادوں کو یہیں بلا لو۔ پھر پونا پہنچ کر جو پیشوا کا حکم ہوگا، اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ اب میں زیادہ دن انتظار نہیں کر سکتا۔ تمہیں صرف ایک ہفتے کی مہلت دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ترک راؤ کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

ٹیمن خان بھی غضب کا چالاک تھا۔ اس نے ترک راؤ کی تلخ اور ناگوار گفتگو سن کر اس طرح سر جھکا لیا جیسے وہ واقعاً نواب حیدر علی ہے۔ ٹیمن خان نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ ٹیمن چاہتا تھا کہ اس کی کسی حرکت سے ترک راؤ کو شک ہو جائے اور پھر سارا بنا بنایا جائے۔ ٹیمن خان کی چال یہ تھی کہ ترک راؤ اسے اس وقت تک حیدر علی سمجھتا رہے، جب تک والی میسور اپنی منتشر طاقت کو سمیٹ کر دوبارہ جنگ کے لئے تیار نہ ہو جائے۔ اس نے ٹیمن خان اکثر اوقات خاموش رہ کر اپنی شخصیت کو پردے میں چھپائے رکھتا تھا۔ آج بھی ترک راؤ نے اسے تسبیہ کی تو وہ حسب سابق اپنے ہونٹوں پر مہر خاموشی لگائے۔ ٹیمن خان کی گفتگو سن رہا۔

نچ جس سے حیدر علی کی فوج کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ مجبوراً والی میسور نے کھلے میدان میں ذک راؤ سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب محمد علی کیدان کو حیدر علی کے ارادے کا علم ہوا تو اس نے اجازت چاہی کہ پہلے اسے قسمت آزمائی کا موقع دیا جائے۔

نواب حیدر علی کی طرف سے اجازت ملنے ہی محمد علی کیدان منتخب سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر قلعے سے باہر نکلا۔ اس کے تمام سپاہی مرہٹوں کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ محمد علی کیدان گھنے جنگل سے نکل کر پہاڑی پر آیا اور مرہٹہ سپاہیوں کو اطلاع دی کہ ترک راؤ نے تازہ دم فوج بھیجی ہے اس لئے وہ لوگ کچھ دن آرام کریں اور نئے سپاہیوں کو لڑنے کا موقع دیں۔ مرہٹوں نے اپنے ہم قوم سپاہیوں کو دیکھ کر مہرچہ خالی کر دیا اور ٹھکن دور کرنے کے لئے پتھروں پر لیٹ گئے۔ محمد علی کیدان نے بڑی آسانی سے بے خبر مرہٹوں کو موت کی نیند سلا کر کمری گندہ کی پہاڑی پر بندھ کر لیا۔ مگر دشمن کی مڈی دل فوج کا مقابلہ آسان نہیں تھا۔ مجبوراً رات ہی رات میں محمد علی کیدان نے مرہٹوں سے چھینی ہوئی چھوٹی توپیں سرنگاپٹم روانہ کر دیں، بڑی توپوں کو ناکارہ بنا دیا اور پہاڑی مورچہ توڑ کر خود بھی صبح ہوتے ہوئے دارالحکومت پہنچ گیا۔

نواب حیدر علی نے بڑے والہانہ انداز میں محمد علی کیدان کا استقبال کیا۔

ترک راؤ پہلے ہی محمد علی کیدان کی طرف سے جلا بھنا بیٹھا تھا۔ جب اسے کمری گندہ کی ٹھٹ کی خبر ملی تو مرہٹہ سالار نے پنڈاری سواروں کو حکم دیا کہ وہ سرنگاپٹم کے تمام نواحی علاقوں کو لٹ کر اس طرح ویران کر دیں کہ حیدر علی تک کسی قسم کی رسد نہ پہنچ سکے۔

افانقا دودن بعد ہی ہندوؤں کا ایک خاص تہوار آگیا، جس میں دو دریاؤں کے سنگم پر غسل کرنے کو بڑی سعادت سمجھا جاتا تھا۔ نتیجتاً ترک راؤ اپنی تمام فوج لے کر دریائے کاویری کے اوپے پہنچنے کے لئے پہنچا۔ اب اسے ریاست میسور کی خوش نصیبی ہی سمجھا جائے کہ نواب حیدر علی نے اپنی جنگی ضرورت کے تحت پہلے ہی سے یہاں ایک کمین گاہ تیار کر رکھی تھی۔

ترک راؤ کے غسل کی خبر سن کر نواب حیدر علی ایک خصوصی دستے کے ساتھ اس کمین گاہ تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف ٹیپو سلطان رات ہی سے اپنی فوج لے کر ایک خشک نالے میں بیٹھ گیا۔ گویا یہ ایک طویل و عریض اور قدرتی خندق تھی جس کا علم ترک راؤ کو نہیں ہو سکا تھا۔ نواب حیدر علی نے محمد علی کیدان اور پنڈاروں کے سربراہ غازی خان کو حکم دیا تھا کہ ترک راؤ کو پنڈاروں کی بہت کثرت تھی اور وہ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہر حاکم کے پاس ان کی ایک بڑی تعداد فوج ہوتی تھی۔ پنڈارے اپنی لوٹ مار کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے اس لئے جب کبھی جنگ ہوتی تو روپیہ دے کر ان کی خدمات حاصل کر لی جاتی تھیں۔ اس بار نواب حیدر علی نے بھی پنڈاروں کو منہ مانگی رقم دی تھی اور ان سے عہد لیا تھا کہ وہ ترک راؤ کے قتل پر عمل کر کے وقت اپنی روایتی مہارت سے کام لیں۔

”نواب! یہ میری طرف سے آخری مہلت ہے، اس کے بعد میں کوئی عذر نہیں منوں گا۔“ یہ کہہ کر ترک راؤ، ٹیپو خان کے خیمے سے نکل گیا۔

مرہٹہ سالار کے جاتے ہی ٹیپو خان نے دل ہی دل میں ترک راؤ کو کئی غلیظ گالیاں سنائیں۔ ”حرام کار! تو نواب بہادر کے حرم کو قیدی بنا کر بیٹھوا کے دربار میں پیش کرے گا؟ تیری یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ جائے گی اور تو والی میسور کی گرد کو بھی نہیں پاسکے گا۔“

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور ترک راؤ کی دی ہوئی مہلت میں ایک دن باقی تھا کہ ٹیپو خان کا راز فاش ہو گیا۔ واقعہ یوں تھا کہ پورنیا کی محبت میں گرفتار ہندو نوکرانی آرتی مسلسل اس ٹوہ میں لگی ہوئی تھی کہ نواب حیدر علی کے بارے میں کوئی خبر ملے اور وہ اس خبر کو پورنیا تک پہنچا کر اپنے عاشق کی نظروں میں سرخرو ہو جائے۔ اتفاق سے ایک دن نواب حیدر علی کی کنیز خاص شمشہ اسے مل گئی۔ شمشہ، آرتی کی شناسا تھی۔ شمشہ اس وقت والی میسور کے لئے کھانے کر جا رہی تھی۔ آرتی نے جب اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے تو شمشہ روادری میں یہ بات کہہ گئی کہ وہ نواب بہادر اور شہزادے کے لئے کھانے لے کر جا رہی ہے۔ آرتی کو گہرے مرادل گیا۔ شمشہ کے جاتے ہی وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی راج محل پہنچی اور پورنیا کو بتا دیا کہ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان قلعے میں کسی خفیہ مقام پر موجود ہیں۔

آرتی کی اس اطلاع سے میسور کی رانیوں میں صفِ ماتم بچھ گئی اور ایک بار پھر ان کی اُمیدوں کے چراغ بجھ گئے۔ رانی لکشم مانے فوراً کرشن راؤ کو سری رنگ تاتھ کے مندر بھیجا اور پھر ایک ہندو بچاری یہ خبر لے کر ترک راؤ کی اس فوج تک پہنچا جو دارالحکومت سے چند میل کے فاصلے پر خیمہ زن تھی۔ پھر یہ خبر سپہ سالار ترک راؤ تک پہنچ گئی کہ نواب حیدر علی قلعے میں موجود ہے۔

ترک راؤ غصے سے کانپتا ہوا ٹیپو خان کے خیمے میں داخل ہوا اور گرج کر بولا۔ ”بہروپے! مجھے بتا کہ تو کون ہے؟“ ٹیپو خان، ترک راؤ کے لہجے سے سمجھ چکا تھا کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے، اس لئے بڑے تحقیر آمیز انداز میں مسکرانے لگا۔

”ترک راؤ! تجھے بہت دیر میں خبر ہوئی کہ میں کون ہوں؟“ ”پہلے میں تیرے نواب کو زنجیر پہنا دوں، پھر تجھے بڑی دردناک سزا دوں گا۔“ یہ کہہ کر ترک راؤ، ٹیپو خان کے خیمے سے نکل گیا۔

مرہٹہ سالار عالم وحشت میں اپنے سر کے بال نوج رہا تھا۔ ”انسوس! میں نے کیا نتیجہ وقت ضائع کر دیا۔ اور ڈیڑھ ماہ تک ایک بہروپے کو نواب حیدر علی سمجھتا رہا۔“ پھر وہ شدید حالتِ غضب میں اپنا پورا لشکر سمیٹ کر سرنگاپٹم کی طرف بڑھا اور دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا۔ مرہٹوں نے کوہ گری گندہ پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں سے قلعے پر گولہ باری کر رہے

لے گا اس تک باقی نہیں چھوڑی تھی۔

ترک راؤ کے فرار ہوتے ہی نواب حیدر علی نے نیپو سلطان اور محمد علی کیدان کو پائیں گھاٹ کی طرف روانہ کر دیا۔ نیپو سلطان، رائے کوٹہ میں خیمہ زن ہوا اور محمد علی کیدان نے کشن گری میں قیام کیا۔ اچانک محمد علی کیدان کو خبر ملی کہ ترک راؤ کا خزانہ کنک دری کے راستے سے جا رہا ہے، محمد علی، رات کے وقت کشن دری سے نکل کر کوہ ماٹ کے دامن میں چھپ گیا۔ جب راتوں کا خزانہ میدان سے گزر کر درہ کوہ میں داخل ہوا تو محمد علی نے ان پر حملہ کر دیا۔ مرہٹے نے اچانک حملے سے گھبرا کر بھاگ نکلے۔ پندرہ بیس کے قریب محافظ سپاہی قتل کر دیئے گئے اور باقی خزانہ محمد علی کیدان کے ہاتھ آ گیا جسے لے کر وہ کشن گری پہنچ گیا۔

جب اس واقعہ کی خبر ترک راؤ تک پہنچی تو اس نے اپنا خیمہ چور گھاٹ سے اٹھا کر قصبہ بال گری میں قائم کیا۔ دوسرے دن محمد علی نے نیپو سلطان کو اطلاع دی کہ مرہٹہ فوج، ادتال لڑی سے دھرم پوری پر حملہ کرنے والی ہے۔ نیپو سلطان اپنی فوج لے کر برق رفتاری کے ساتھ دم پوری کی طرف بڑھا۔ وہاں پہنچ کر دلی عہد سلطنت نے دیکھا کہ مرہٹے دھرم پوری کے ران میں لوٹ مار مچائے ہوئے ہیں اور لوٹ کا سامان گھوڑوں پر لا رہے ہیں۔ نیپو سلطان ہمت علی کی تھی کہ دھرم پوری روانہ ہونے سے پہلے اس نے مرہٹوں کا لباس پہن لیا تھا اور بے پایوں کو بھی ایسے ہی لباس پہنا دیئے تھے۔ اسی لباس سے نیپو نے فائدہ اٹھایا اور اپنے لڑکے ساتھ دھرم پور میں شریک ہو گیا۔ مرہٹے، نیپو کی فوج کو بھی اپنی ہی فوج کا ایک حصہ ٹھہرا رہے تھے۔ پھر جب مرہٹے سارا سامان لا کر آگے بڑھے تو نیپو نے عقب سے ان پر ایک بار حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے میں کچھ مرہٹے قتل ہو گئے اور باقی سپاہی سارا ساز و سامان ڈاکر فرار ہو گئے۔ اس لوٹ مار میں چار ہزار گھوڑے، سینکڑوں بیل اور بیس ہاتھی نیپو سلطان کے ہاتھ لگے۔

ترک راؤ ان بے درپے حملوں سے تنگ آ گیا تھا۔ وہ جدھر بھی جاتا، نیپو سلطان اس کا نقب کرتا۔ نیپو اور محمد علی کیدان مل کر مسلسل ترک راؤ کی فوج پر شب خون مار رہے تھے۔ کڑھ سالار چاہتا تھا کہ حیدر علی اس سے کھلے میدان میں مقابلہ کرے مگر والی میسور اس بات سے باخبر تھا کہ اس طرح مرہٹوں سے جنگ کرنا نہایت خطرناک ہے۔ آخر حیدر علی نے صلح سے کام لیتے ہوئے ترک راؤ سے صلح کی درخواست کی مگر مرہٹہ سالار نے یہ کہہ کر اسے نفی کر دیا کہ اگر حیدر علی مکمل طور پر پونا کی اطاعت قبول کر لے تو اس سے صلح ہوا کرتی ہے۔ والی میسور کو ترک راؤ کی یہ ذلت آمیز شرائط قبول نہیں تھیں۔ مجبوراً اس نے ہتھیاروں سے مشورہ کیا۔

حیدر علی کے کئی نامور سالار تو پہلے ہی پیشوا مامو راؤ کی قید میں تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے وہ مامو راؤ کی قوت کے سبب جنگ سے اُکٹائے ہوئے تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ کسی

ترک راؤ اس صورت حال سے بے خبر کاویری کے سنگم پر پہنچا اور بلند آواز سے فنگنا اشلوک پڑھتا ہوا دریا میں اتر گیا۔ ترک راؤ کی فوج اس کے پیچھے کھڑی پہرہ دے رہی تھی کہ اچانک محمد علی کیدان نے اس پر حملہ کر دیا۔ مرہٹوں کی دوسری بڑی فوج حفظہ المقدم کے طور پر کچھ اور پیچھے تھی تاکہ ضرورت کے وقت وہ اگلے دستے کی مدد کو پہنچ سکے۔ جب فصائیں ہر طرف بند دھوکوں کی آوازیں گونجنے لگیں تو ترک راؤ کی فوج کا یہ پچھلا دستہ اگلے دستے کی مدد کے لئے آگے بڑھا۔ مگر غازی خان کی پندارہ فوج نے اسے راستے ہی میں روک لیا۔ اس وقت غازی خان کے ہمراہ صرف سو سوار تھے۔ مرہٹوں کا غصہ بھڑک اٹھا اور انہوں نے پنداروں پر حملہ کر دیا۔ پندارے کچھ دیر تک تو بڑی پامردی کے ساتھ لڑے اور پھر یکا یک میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مرہٹے سمجھے کہ واقعتاً پنداروں کو شکست ہو گئی ہے اس لئے وہ دشمن کا مکمل خاتمہ کرنے کی غرض سے پنداروں کے تعاقب میں آگے بڑھے۔ پندارے مرہٹوں کے ساتھ بڑا خوفناک کھیل کھیل رہے تھے۔ وہ مسلسل بھاگتے رہے اور اس جنگی چال سے بے خبر مرہٹے آنکھیں بند کر کے ان کا تعاقب کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میدان جنگ سے مفرور پندارے اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے مرہٹے اس کمین گاہ تک پہنچ گئے جہاں نیپو سلطان اپنا لشکر لے دشمن کی گھات میں بیٹھا تھا۔ پھر جیسے ہی مرہٹہ فوج نیپو سلطان کی زد پر آئی، دلی عہد سلطنت نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر اس قدر زبردست حملہ کیا کہ مرہٹوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

پھر جب محمد علی کیدان نے یہ اندازہ کر لیا کہ مرہٹہ سپاہیوں کی بڑی تعداد اپنے پہرہ سالار سے دور ہو گئی ہے تو اس نے ترک راؤ کے خاص محافظ دستے پر بھرپور حملہ کر دیا۔ عین اسی وقت دوسری طرف سے نواب حیدر علی اپنی کمین گاہ سے باہر نکلا۔ یہ منظر دیکھ کر مرہٹوں کی صفوں میں انتشار پھیل گیا اور پھر وہ شدید بدحواسی کے عالم میں فرار ہونے لگے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواب حیدر علی کے سپاہیوں نے مرہٹہ فوج پر گولے برسانا شروع کر دیئے۔ جس سے دشمن کے نشان اور نقاروں کے ہاتھی مارے گئے۔

ترک راؤ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جیتی ہوئی بازی اس طرح اُلٹ جائے گی۔ وہ اپنا غسل نامکمل چھوڑ کر دریا سے نکل آیا اور اس طرح گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہو گیا کہ اس کی بھینا ہوئی دھوتی سے پانی ٹپک رہا تھا۔ تمام مرہٹہ فوج منتشر ہو چکی تھی اور نیپو سلطان کے سپاہی دشمن کے خیمے لوٹ رہے تھے۔ ترک راؤ اندھا دھند بھاگ رہا تھا یہاں تک کہ اس نے سرنگا ٹم سے تیس میل دور واقع موتی تالاب پر جا کر دم لیا۔ بے سرو سامانی کے باوجود اس جنگ میں حیدر علی کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ہزاروں مرہٹے مارے جا چکے تھے اور سات ہزار کو قیدی بنالیا گیا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ترک راؤ میں اب اتنا حوصلہ باقی نہیں رہا تھا کہ دوبارہ سرنگا ٹم پر یلغار کر سکے۔ مجبوراً وہ اپنی فوج کو لے کر پائیں گھاٹ اور بالا گھاٹ کی طرف چلا گیا۔ ترک راؤ کچھ اس طرح حیدر علی کے علاقوں کو ویران کر رہا تھا کہ اس نے مویشیوں کے



نوجوانی میں محمد علی کو زندہ گرفتار کرے گا یا اس کا سر کاٹ کر لائے گا، وہ پیشوائے پونا کی طرف بڑھتا تھا۔ ایک گراں بارانعام کا مستحق قرار پائے گا۔“

ایک نوجوان کا مقابلہ ایک کھلے میدان میں ہوا اور محمد علی کا پلہ بھاری رہا۔ ہزاروں مرہٹے دیکھنے والے تھے۔ دوسرے دن ترک راؤ خود ایک بھاری توپ خانہ لے کر پہنچا۔ اس کی آنکھوں کے اندر یہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ محمد علی کمیدان نے تمام مقتول مرہٹوں کی لاشیں جمع کر کے ایک بڑے تارکے میں ڈال دیں اور اسی کی آڑ سے اس کے سپاہی دشمن پر گولیاں برسار رہے تھے۔ اپنے سپاہیوں کو ان سے بتائی ہوئی دیوار دیکھ کر ترک راؤ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ شام تک معمولی کی ہوئی رہی۔ اس دوران ترک راؤ مناسب مقامات پر اپنی توپیں نصب کرتا رہا۔ رات نے ہی محمد علی کمیدان اپنی فوج لے کر حیدرنگر سے نکل گیا۔ جاتے جاتے اپنے زخمی سپاہیوں کو کہہ گیا کہ وہ استارہ پہنچ کر ان کے لئے ڈولیاں بھیج دے گا۔ جب صبح ہوئی تو میدان خالی ترک راؤ نے شدید عالم غضب میں مسلمان زخمی سپاہیوں سے پوچھا کہ محمد علی کمیدان کہاں ہے؟ سپاہیوں نے بتایا کہ وہ استارہ کی طرف گیا ہے۔ ترک راؤ غصے سے پاگل ہو گیا۔ محمد علی کو پھر اسے چکر دے گیا تھا۔ ترک راؤ دن بھر اپنے توپ خانے کو جمع کرتا رہا، پھر رات کو محمد علی کے تعاقب میں بڑھا۔ استارہ پہنچ کر ترک راؤ کو معلوم ہوا کہ وہ ایک مرتبہ پھر محمد علیان کے قریب کا شکار ہو گیا ہے۔ یہاں میسور کے کسی سپاہی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

محمد علی کمیدان نے بڑی ہوشیاری سے مرہٹوں کی فوج کو کئی حصوں میں بانٹ دیا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ مرہٹہ فوج کا بڑا حصہ رائے پٹن ندی کے کنارے خیمہ زن ہے اس لئے تیارہ کا کہاں نہ کر کے سیدھا ماگڑی کے جنگل پہنچا جہاں شہزادہ ٹیپو سلطان پہلے سے موجود تھا۔ رائے پٹن کے ساتھ مل کر مرہٹہ فوج پر کئی شب خون مارے جن کے نتیجے میں بہت سا سامان کے ہاتھ آیا۔ چند روز بعد نواب حیدر علی بھی اپنی فوج لے کر ان دونوں سے آ ملا۔

رائے پٹن کے قریب میسور نے ماگڑی کے جنگل پہنچتے ہی ایک نئی چال چلی۔ ترک راؤ کی فوج سے چھینے والے بیلوں کے علاوہ حیدر علی نے اطراف سے دس ہزار تیل جمع کئے اور پھر ان کے سینگوں پر رائیٹ کر اسے تیل سے بھگو دیا پھر آدھی رات کے قریب حیدر علی کی فوج نے مرہٹہ لشکر کا زور کیا اور بیلوں کے سینگوں میں آگ لگا کر انہیں دشمن کے خیموں کی طرف ہانک دیا گیا۔ آگ کی گرمی سے پریشان ہو کر چاروں طرف دوڑنے لگے۔ نیند کے غمار سے بوجھل مرہٹے اس وقت حال کو سمجھنے بھی نہیں پائے تھے کہ آگ کی تپش سے بے حال جانور دشمن کے لشکر میں گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مرہٹوں کے خیموں نے بھی آگ پکڑ لی۔ عجیب وحشت مالا مال مرہٹوں کے بیلوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں نے بھی اپنی رسیاں تڑوا لیں اور جدھر انہیں لگے۔ اس کشاکش میں سینکڑوں مرہٹے سپاہی خوف زدہ جانوروں کے پیروں میں

طرح جنگ بند ہو جائے اور وہ اپنے بیوی بچوں سے جا ملیں۔ انہیں جنگلوں، میدانوں اور دریاؤں میں بھٹکتے بھٹکتے کئی ماہ گزر گئے تھے۔ دھوپ کی شدت اور موسم کی سختیوں نے ان کے چہرے تک مسخ کر ڈالے تھے۔ جب حیدر علی نے ان سے جنگ جاری رکھنے یا بند کرنے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے گردنیں جھکا لیں۔ ان کے جھکے ہوئے سر بتا رہے تھے کہ وہ شمشیر و سناں کے کھیل سے بیزار ہو چکے ہیں۔

محمد علی کمیدان کا ایک ہی جواب تھا۔ ”ایک بار ترک راؤ کے سپاہیوں سے ہتھیاروں کے بغیر بھی لڑ چکا ہوں۔“ محمد علی نے اپنی گرفتاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر دوبارہ بھی تلوار چھین گئی تو خالی ہاتھوں سے لڑوں گا اور اس وقت تک لڑتا رہوں گا، جب تک ترک راؤ میرا سر کاٹ کر اپنے قلعے کے دروازے پر نہیں سجا دے گا۔“

محمد علی کمیدان کے لہجے میں ایسی آگ تھی، جسے محسوس کر کے نواب حیدر علی کی آنکھیں بھی گرم غبار سے بھر گئیں اور پھر حاضرین نے دیکھا کہ والی میسور کی آنکھوں کا یہ گرم غبار پانی بن کر اس کے رخساروں پر بہنے لگا۔

”اور فرزند! تم کیا کہتے ہو؟“ حیدر علی اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ٹیپو سے مخاطب ہوا۔ ”تمام سپاہیوں کے مقابلے میں میری جان پر نواب بہادر کے زیادہ حقوق ہیں۔“ ٹیپو نے عجیب جواب دیا تھا۔

”بیٹے! کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ حقوق ادا کرتے وقت تمہیں یہ خیال آئے کہ باپ نے اپنی ضدوں کے بت کدے میں تمہارے دلکش شباب کو بھینٹ چڑھا دیا۔“ حیدر علی بڑے سنگین وقت میں اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے کا امتحان لے رہا تھا۔

”میری ایک ایک سانس آپ کی امانت ہے۔“ یہ کہتے کہتے ٹیپو کی آنکھیں بھی جھلک اٹھی تھیں۔ ”آپ خود ملاحظہ کریں گے کہ اس امانت کو لوٹاتے وقت میرے چہرے پر کبھی سرشاری ہوگی۔“

”خدا نہ کرے فرزند!..... خدا نہ کرے کہ باپ کے ہوتے ہوئے تیرے جسم پر ہلکی سی خراش بھی آئے۔“ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر حیدر علی نے آنکھیں بند کر لیں اور اسی عالم میں اپنے نائب سپہ سالار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”شجاعت خان! ٹیپو کو لے جا۔ اس کی نظر اُتار اور سوکرے اسی وقت قربان کر دے۔“ نواب حیدر علی کو کھلے میدان میں کھینچ کر لانے کے لئے ترک راؤ، حیدر علی کی طرف بڑھا۔ والی میسور نے محمد علی کمیدان کو چھ ہزار ہندو جی، بارہ ہزار سوار اور ایک زبردست توپ خانہ دے کر مرہٹوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ محمد علی، کورگ کے جنگلوں سے گزر کر حیدرنگری طرف بڑھا مگر کھنے جنگلات کے سبب اسے توپ خانہ واپس کرنا پڑا۔ جب ترک راؤ کو محمد علی کے آنے کی خبر ملی تو اس نے اس شاطر سپہ سالار کی سرکوبی کے لئے ایک بھاری لشکر بھیجا اور

جب سرپتا جیسی توبہ شکن حسن رکھنے والی لڑکی اس کے دل میں کوئی حشر نہ اٹھا سکی تو پھر کرشن راؤ کی سچی ہوئی کنیزوں کی کیا حیثیت تھی۔ حیدر علی کی سخت نگہداشت اور سید اکرام بناری کی تربیت نے اسے عہد شباب کے تمام ہنگاموں پر قابو پانا سکھا دیا تھا۔ دولت و اقتدار کی لذت اور قدم قدم پر دی جانے والی دعوت گناہ کے باوجود ٹیپو نے انتہائی پارسائی کی زندگی بسر کی تھی۔ جسم تو کچا اس نے اپنی آنکھ کو بھی گناہ سے آلودہ نہیں ہونے دیا تھا۔ بظاہر وہ میسور کا ولی عہد سلطنت اور ایک جانناز سپاہی تھا مگر در پردہ اس کی زندگی کسی ولی سے کم نہیں تھی۔ ٹیپو کو بس ایک ہی شوق تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں شیر کا شکار کرتا تھا۔ کئی مواقع پر وہ شدید زخمی بھی ہوا تھا لیکن اس نے حیدر علی کی سخت ہدایت کے باوجود اپنی یہ تفریح ترک نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ ٹیپو نے اپنا عجائب خانہ بھی قائم کیا تھا، جس میں مختلف نسلوں کے شیر بھی موجود تھے۔ دور دراز شیروں کو دیکھنے جاتا اور کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے شیروں کو ان کی غذا فراہم کرتا۔

نواب حیدر علی اپنے پارسا بیٹے کو مزید آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے پورے زور و شور کے ساتھ اس لڑکی کی تلاش ہونے لگی جو ٹیپو سلطان کی شریک حیات بن سکے۔ نواب حیدر علی نے اس موقع پر بھی دور اندیشی سے کام لیا اور سیاسی اختلاف کو دوستی کے رشتے میں بدلنے کی غرض سے نظام علی، والی دکن کی بیٹی کے لئے ٹیپو سلطان کا پیغام بھیجا۔ نظام دکن نے اس پیغام کو بڑی حیرت سے دیکھا مگر اس کے وزیر اعظم رکن الدولہ اور مصاحب خاص برعالم نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

”حضور! وہ کم ذات اس قابل نہیں کہ آپ کے خاندانِ عالیہ سے اتنا نازک رشتہ قائم کر سکے۔“

نظام دکن مسکرانے لگا۔ ”تم نہیں جانتے کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا ہوں اور میری آنکھیں مستقبل کے پردے میں کس منظر کو تلاش کر رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر نظام علی نے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے چند قریبی افراد کو بھی سرنگا پٹم روانہ کر دیا۔ ان لوگوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ قریب رہ کر ٹیپو سلطان کی عادات و اطوار کا مشاہدہ کرے۔ اس غیر سرکاری وفد میں حیدر آباد کے چند نامور مصور بھی شامل تھے۔ مختلف زاویوں سے ٹیپو سلطان کی تصویریں بنانے کی ذمہ داری ان ہی مصوروں کو سونپی گئی تھی۔

نظام دکن نے حیدر علی کے نام مختصر خط لکھا۔ ”میں اس رشتے پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تم اپنے بیٹے ٹیپو کی ایک تصویر ارسال کرو۔ میں ولی عہد سلطنت کی شخصیت کا غائبانہ جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اگر اتفاق سے ٹیپو کی کوئی تصویر موجود نہ ہو تو میرے مصوروں سے کام لو۔“

نظام دکن کے اس اقدام کو سرنگا پٹم میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ حمیدہ خاتون نے اس رشتے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

آکر کچل گئے۔

جب یہ جنگی ٹانگ اپنے عروج کو پہنچ گیا تو حیدر علی کے سپاہیوں نے جنگل کی آڑ سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ مرہٹوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ توپیں لے جانے کے لئے بار برداری کے جانور نہیں تھے اس لئے مرہٹے اپنا سب سے زیادہ طاقتور اسلحہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ فرار ہونے والوں میں ترک راؤ بھی تھا۔ صبح جب اس نے دس میل کے فاصلے پر قیام کیا تو اس کے پاس چند ہزار سپاہیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

نواب حیدر علی کی جنگی چالوں نے دو لاکھ سے زیادہ سپاہیوں پر مشتمل لشکر کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔

ترک راؤ نے فوری طور پر ایک برق رفتار قاصد بھیج کر پونا سے مدد طلب کی۔ اسی دوران پیشوا مادھو راؤ کا انتقال ہو گیا اور تخت نشینی کے لئے نارائن راؤ اور گوبالا میں کشاکش شروع ہو گئی۔ نواب حیدر علی نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور چھتیس لاکھ روپے کی ادائیگی کا وعدہ کر کے ترک راؤ سے صلح کر لی۔ ترک راؤ بھی پونا کے بگڑتے ہوئے سیاسی حالات اور اپنی عسکری قوت کی کمزوری کے باعث اس صلح کے لئے مجبور تھا۔ تیسرے میسور کا خواب دیکھنے والا اپنے ہزاروں سپاہیوں کو زمین کی خوراک بنانے کے بعد ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔

یہ جنگ 1770ء میں شروع ہوئی تھی اور 1774ء میں اس کا خاتمہ ہوا۔ اس پانچ سال کے طویل عرصے میں نواب حیدر علی کئی بار ڈوبا اور کئی بار ابھرا یہاں تک کہ اس کی موت کی خبریں بھی عام ہو گئی تھیں۔ پھر جب ترک راؤ پونا واپس جا رہا تھا تو بیک وقت نواب ارکات، نظام دکن اور میسور کی رانیوں کے گھروں سے حسرت و ارمان کا دھواں اٹھ رہا تھا۔

آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنے کے بعد حیدر علی نے میسور کی تعمیر نو کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بیگمات کی خواہش پر ٹیپو سلطان کی شادی کے فریضے سے بھی سبکدوش ہونا چاہا۔ اب ولی عہد سلطنت بائیس سال کا ہو چکا تھا۔ حیدر علی کے مقرر کردہ جاسوس، ٹیپو کے ایک ایک لمحے کی خبر رکھتے تھے۔ تمام جاسوسوں کی ایک ہی اطلاع تھی کہ ولی عہد سلطنت کو رخصت و سرور و شراب نوشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حیدر علی سے مایوس ہو کر میسور کی رانیوں نے ٹیپو سلطان کو گمراہ کرنا چاہا تھا مگر ولی عہد سلطنت نے ان تو بہ شکن فتنوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ کرشن راؤ نے کئی خوب صورت ہندو کنیریں محض اس لئے حرم سرا میں داخل کی تھیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح ٹیپو کو اپنے حسن کا اسیر بنالیں مگر کرشن راؤ اپنے اس منصوبے میں برتاؤ کی طرح ناکام رہا تھا۔ پھر ان ہندو کنیزوں نے کرشن راؤ اور رانیوں کے سامنے قسم کھا کر کہا تھا۔

”راج کنور تو ہمارے دیوتاؤں سے بھی زیادہ شرمیلا اور پاکباز ہے۔ رعایا کی ایک ایک عورت کو قابلِ احترام سمجھتا ہے۔“

”وہ میری چچا زاد بہن ہے اور میں اپنی بد مزاج و مغرور بہن کو خوب جانتی ہوں۔ شہزادے ٹیپو سے اس کا کوئی جوڑ نہیں۔“

نواب حیدر علی اور بیگمات نے حمیدہ خاتون کی اس مخالفت کو ذاتی دشمنی کا رد عمل سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

یہ رشتہ تقریباً طے ہو گیا تھا مگر ٹیپو سلطان کے ایک جملے نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔

”شہزادے! حضور نظام نے آپ کی ایک تصویر طلب کی ہے۔“ حیدر آباد کے دفتر میں شامل ایک بزرگ نے ٹیپو سے کہا۔

ٹیپو کے ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ ”نظام دکن سے کہنا کہ مردوں کی بہترین تصویر ان کی جواں مردی ہے۔“

حیدر علی نے بڑی حیرت سے اپنے بیٹے کا جملہ سنا اور مسکرانے لگا۔

دکن کے مصوروں نے بہت خوشامد کی۔ ”شہزادے! کچھ دیر کرسی پر بیٹھے رہیں۔ ہم اپنا کام مکمل کر لیں گے۔“

مگر ٹیپو نے تصویر دینے اور تصاویر بنوانے سے انکار کر دیا۔ حیدر علی نے اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ اسے ٹیپو کی یہ مردانہ ادا اور خود اعتمادی بہت پسند آئی تھی۔

آخر حیدر آباد کا وفد ناکام و نامراد چلا گیا۔ جب نظام علی خان نے یہ واقعہ سنا تو کچھ دیر کے لئے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں نفرت و قہر کی پرچھائیاں اترنے لگیں۔

”ہم نے اس بد نسب کو اپنے حوالے سے شرف یاب کرنا چاہا تھا مگر وہ اپنی اصلیت پر اتر آیا۔ میں دیکھوں گا کہ اس کی جواں مردی کب تک قائم رہتی ہے۔“



ٹیپو کے جواب کو نظام علی خان والی دکن نے اپنی توہین سمجھا اور اس طرح دو مسلم مملکتوں کے درمیان اختلافات ختم کرنے کا جو منصوبہ نواب حیدر علی نے بنایا تھا، وہ ناکام ہو گیا۔ مجبوراً

والی میسور نے امام صاحب بخشی ناطہ کی لڑکی تاجدار بیگم کے لئے ٹیپو سلطان کا پیغام بھیجا۔ قوم ناطہ کا تعلق عرب سے تھا۔ یہ لوگ تلاش معاش میں ہندوستان آئے۔ سلاطین ہند

نے عرب سے نسبت خاص کے باعث ان لوگوں کا بے حد احترام کیا اور اپنی مملکت کے تمام مذہبی عہدے ان کے سپرد کر دیئے۔ پھر یہی لوگ قاضی اور محتسب بنے۔ یہاں تک کہ اہل بالیا

ہند پر ناطہ کی مذہبی سیادت قائم ہو گئی۔ پھر اسی احساس غرور نے ناطہ کو ہندوستانی مسلمانوں سے الگ تھلک کر دیا۔ وہ بڑے سے بڑے خاندان میں بھی رشتہ قائم کرنے کو اپنی حقیر سمجھتے

تھے۔ چنانچہ جب ٹیپو سلطان کی شادی کے سلسلے میں نواب حیدر علی نے گفتگو کا آغاز کیا تو امام صاحب بخشی ناطہ سنائے میں آ گئے۔ انہیں حیدر علی کے جاہ و جلال کا بھی اندازہ تھا اور وہ والی

میسور کی اس عادت سے بھی واقف تھے کہ جب حیدر علی کسی بات کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے کسی

روح بھی باز نہیں رکھا جاسکتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام صاحب بخشی ناطہ اس رشتے سے انکار نہ کر سکے۔ انکار کی صورت میں انہیں اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کہیں وہ ریاست میں حیدر علی کی بی بی مرعات سے محروم نہ ہو جائیں۔ اسی مصلحت اور مجبوری نے امام صاحب کی زبان پر مہر

باندی اور وہ بادل ناخواستہ اس رشتے کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

مگر مجیدہ بیگم، فاطمہ بیگم اور خاندان کی دوسری خواتین کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔ ان سب کی خواہش تھی کہ ٹیپو سلطان لالہ میاں شہید کی بیٹی رقیہ بانو کو اپنی زوجیت میں قبول کر لے۔ جب

والی عہد سلطنت سے اس کی رائے معلوم کی گئی تو ٹیپو نے صاف صاف کہہ دیا۔

”میں اپنے جذبے کی تمام تر سچائیوں اور توانائیوں کے ساتھ آپ کے حکم کا پابند ہوں۔“

نواب حیدر علی شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک طرف وہ امام صاحب بخشی ناطہ کی لڑکی، تاجدار بیگم کے لئے رشتے کی بات کر چکا تھا اور دوسری طرف حرم سرا کی خواتین کو یہ رشتہ پسند

نہیں آیا تھا۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد والی میسور نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ ٹیپو کی پرورش انہالی مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اور امام صاحب ناطہ بھی ایک مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے

تھے۔ حیدر علی کا خیال تھا کہ تاجدار بیگم، ٹیپو سلطان کے لئے ایک مثالی بیوی ثابت ہوگی۔ مگر جب حرم سرا کی تمام خواتین نے اس رشتے کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور ٹیپو کی شریک حیات

کے لئے رقیہ بانو کا انتخاب کیا تو والی میسور کچھ دنوں تک اُجھن کا شکار رہا۔ پھر اُس نے اپنی اور خاتون کی پسند کو برقرار رکھنے کے لئے بڑا عجیب فیصلہ کیا۔ ایک ہی وقت میں ٹیپو سلطان کے

ادعا کا ہوئے۔ ایک امام صاحب بخشی ناطہ کی لڑکی تاجدار بیگم سے اور دوسرا لالہ میاں شہید کی بیٹی رقیہ بانو سے۔

ان شادیوں کا جشن ایک ماہ تک منایا گیا۔ پھر جیسے ہی یہ جشن نشاط ختم ہوا، سرنگاپٹم پر غم و بال کے گہرے بادل چھا گئے۔ سید اکرام بخاری اچانک بیمار ہوئے اور چند روز علیل رہ کر دنیا

سے رخصت ہو گئے۔

سید صاحب کو حافظ رحمت خان روہیلہ کی شکست اور موت کا بڑا قلق تھا۔ پھر یہی ناقابل برداشت صدمہ انہیں قبر تک لے گیا۔ نواب اودھ شجاع الدولہ اور انگریزوں نے مل کر جانناز

روہیلوں کو شکست دی اور حافظ رحمت خان کا سر کاٹ کر دربار اودھ میں پیش کر دیا گیا۔ نواب شجاع الدولہ نے روہیلہ سردار کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ بڑا تحقیر آمیز سلوک کیا۔ رحمت خان،

مظاہر قرآن ہونے کے ساتھ ایک باکر دار مسلمان بھی تھے۔

شجاع الدولہ، انگریزوں کی مدد سے روہیلوں کو شکست دے کر بہت خوش تھا۔ مگر درپردہ

ان سے بھی فرنگیوں کی غلامی قبول کر لی تھی۔ انگریزوں کا دائرہ اثر روز بہ روز بڑھتا جا رہا تھا اور

سلطان ایک دوسرے کا خون بہانے میں مصروف تھے۔ ہندوستان کی تقدیر کے اُفق پر غلامی

کے سیاہ بادل بہت تیزی سے چھاتے جا رہے تھے۔ مگر اہل ہند کو اس کا ادراک نہیں تھا۔

سلطان کی آنکھیں اشک برسا رہی تھیں۔ ولی عہد سلطنت سمجھ چکا تھا کہ اس کے استاد گرامی کا بخت رخصت آچکا ہے۔ اس لئے وہ شدید اذیت میں مبتلا تھا۔

”نواب بہادر! دیکھئے میرے استاد محترم کو کیا ہو گیا ہے؟“ ٹیپو کی آواز لرز رہی تھی۔  
نواب حیدر علی اور شجاعت خان کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں۔ والی میسور نے طیب خاص کی طرف دیکھا جو خود بھی بہت اُداس نظر آ رہا تھا۔

”سید صاحب کی نبض ڈوبتی جا رہی ہے نواب بہادر!“ طیب خاص نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”بس چند لمحوں کی بات ہے، طاہر روح اُڑنے کے لئے بے قرار ہے اور نفس جاں ٹوٹنے ہی والا ہے۔“

نواب حیدر علی بھی بیگی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ سید صاحب بے ہوش تھے اور چہرے پر چٹائی ہوئی مردنی میں دم بہ دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خلفاء کے در و دیوار پر قبرستان کا سانسناٹا جاری تھا۔ سید صاحب کے پیروں کے نزدیک ان کے چند شاگرد تصویر یاس بنے بیٹھے تھے۔ ہونٹوں پر نہ سرد آہ تھی اور نہ شور و فغاں۔ مگر آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو بتا رہے تھے کہ عنقریب ان کا سب سے قیمتی سرمایہ چھن جانے والا ہے۔ سید صاحب کا ہاتھ طیب خاص کے ہاتھ میں تھا اور میسور کے حکیم حاذق کی انگلی سید صاحب کی سانوں کا شمار کر رہی تھی۔

کچھ دیر اسی عالم میں گزر گئی، پھر یکایک سید صاحب کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ طیب خاص نے تیز سرگوشی میں والی میسور کو پکارا۔

”نواب بہادر! سید صاحب کچھ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

حیدر علی، سید صاحب پر جھک گیا۔ ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ پھر آواز صاف ہو گئی اور سب کچھ سنائی دینے لگا۔

”اے بد نصیب ہندوستان! تُو نے اپنے محافظوں کو قتل کر ڈالا اور دشمنوں کو سینے سے لگا لیا۔“ سید صاحب بے ہوش تھے مگر بڑے کرب ناک لہجے میں بول رہے تھے۔ ”تیرے ماتھے پر آزادی کا تاج سجائے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے..... اور جو چند باقی ہیں، وہ بھی باہر گلاب ہیں۔ اب تجھے غلامی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اے بد نصیب ہندوستان!..... اے بے تیرہ بخت وطن!..... اے بد نصیب ہندوستان!.....“

ایک بار پھر سید صاحب کے لب ساکت ہو گئے۔ حیدر علی سمجھا، روح جسم سے پرواز کر گئی۔ والی میسور کے ہونٹوں سے آہ سرد نکلی۔ مگر طیب خاص نے نواب کو بتایا کہ ابھی نبض چل رہی ہے۔

پھر آخری بار سید صاحب کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اپنے اسی پر جلال لہجے میں کلمہ شہادت پڑھا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

”جو کچھ ہے، اپنے اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والا ہے۔“ نواب حیدر علی نے رقت آمیز

انگریزوں نے بڑی ذہانت سے ایک شاطرانہ چال چلی تھی اور شجاع الدولہ کا حلیف بن کر ہندوستان کے ایک اور طاقتور ستون کو مسمار کر دیا گیا تھا۔ پہلا مضبوط ستون ارض بنگال میں نواب سراج الدولہ کا تھا، جسے فرنگیوں کے تعاون سے میر جعفر نے ڈھایا۔ اور اب شاہی ہند میں نواب شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خان روہیلہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ انگریزوں کی سیاست کا ایک ہی انداز تھا کہ وہ مسلمان کو مسلمان سے اور ہندو کو ہندو سے لڑاتے تھے۔ جیتنے والا سمجھتا تھا کہ فرنگی اُس کے دوست ہیں اور ان ہی کے تعاون سے اس کے اقتدار کو بقاء حاصل ہوگی۔ مگر نفس پرستی اور خود غرضی کے اس طوفان میں ہندوستان کے نوابوں اور راجاؤں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ انگریز کسی کے دوست نہیں۔ وہ صرف سیاست کے غلام ہیں۔

پھر جب حافظ رحمت خان روہیلہ کی شہادت کی خبر سرنگاپٹم پہنچی تو سید اکرام بخاری کے سینے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور وہ اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر درد نے اس قدر شدت اختیار کی کہ سید صاحب کو اپنے بستر پر دراز ہونا پڑا۔ اُن کا بستر ہی کیا تھا، فرش خاک پر کبھی ہوئی ایک پرانی چٹائی تھی۔ حیدر علی کو سید صاحب کی بیماری کی خبر ملی تو وہ ٹیپو سلطان اور شجاعت خان کے ہمراہ ان کی عیادت کو حاضر ہوا۔ ریاست کا بہترین طیب بھی والی میسور کے ساتھ تھا۔

”سید صاحب! کیسی طبیعت ہے؟“ نواب حیدر علی کا لہجہ بہت اُداس تھا۔  
”ہم فقیروں کی طبیعت ہی کیا؟ ہر موسم میں خوش رہتے ہیں۔“ سید صاحب کے الفاظ میں وہی زندگی اور توانائی تھی مگر چہرے پر موت کی زردی صاف نظر آ رہی تھی اور لہجہ اتنا شکستہ تھا کہ بمشکل چند الفاظ ہی ان کی زبان سے ادا ہو سکے تھے۔

نواب حیدر علی نے طیب خاص کو اشارہ کیا۔ طیب خاص ادب سے جھکا اور اس نے سید صاحب کی نبض دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”کیوں اپنا وقت برباد کرتے ہو میاں؟“ سید صاحب رک رک کر بول رہے تھے۔ ”مجھے جینے کی خواہش بھی نہیں اور میرا وقت بھی پورا ہو چکا ہے۔ ریاست کے دوسرے بیماروں کی خبر لو، ان کی طرف دیکھو۔ وہ مجھ سے زیادہ تمہاری توجہ کے مستحق ہیں۔“ یہ کہتے کہتے سید صاحب بے ہوش ہو گئے۔

پھر اسی بے ہوشی کی حالت میں ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے۔  
”اے خدا! میرے دوسرے شیر کو بھی گیدڑوں کے غول نے قتل کر دیا۔ میں کب تک اپنی آنکھوں سے یہ جاگنداز منظر دیکھوں گا؟ تُو جانتا ہے کہ تیرا یہ گناہ گار و عاجز بندہ، اکرام بخاری بہت کمزور و ناتواں ہے۔ وہ کب تک یہ صدمے برداشت کرے گا؟ بس اب اس جان بے قرار پر اپنا کرم فرما۔ اگر تیری مشیت میں یہی طے ہو چکا ہے کہ میرا آخری شیر بھی قتل ہو جائے تو پھر مجھے اس دنیا سے اٹھالے۔“

نواب حیدر علی اور شجاعت خان دم بخود بیٹھے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اور ٹیپو



لجے میں کہا۔

ٹیپو سلطان نے بے قابو ہو کر ایک دلدوز چیخ ماری اور سید صاحب کے سینے پر سر رکھ دیا  
”ہائے میرا استاد!“

حیدر علی اور شجاعت خان جو خود بھی شدت غم سے بے حال نظر آ رہے تھے، ٹپو کو تسلیا  
دینے لگے۔ ”تمہارے استاد کہاں گئے ہیں بیٹے! وہ تو میسور کی فضاؤں میں پھولوں کی خوشبو  
طرح بے ہوئے ہیں۔ سرنگاپٹم کے بام و در میں روشنی کی مانند ہیں، کبھی نہ ختم ہونے والی ایوار  
کی خوشبو اور کبھی نہ فنا ہونے والی کردار و عمل کی روشنی۔“

پھر اس شان سے سید صاحب کا جنازہ اٹھا کہ سرنگاپٹم کا ایک ایک کلین اپنے گھر سے نکلا  
آیا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ میسور کی تینوں متعصب اور عیار رائیاں بھی محل سے نکل کر سید صاحب  
خانقاہ پہنچ گئی تھیں اور بڑے پرسوز لجے میں نواب حیدر علی اور ٹپو سلطان سے سید صاحب  
انتقال پر تعزیت کر رہی تھیں۔ حالانکہ ان کے سینوں میں خوشی کا ایک سمندر موجزن تھا اور وہ  
ہی دل میں کہہ رہی تھیں۔

”یہی بوڑھا جادوگر ہر بار سرنگاپٹم کو بچا لیتا تھا۔ مگر اب دیکھیں گے کہ حیدر علی اور ٹپو  
بچانے کون آئے گا۔“

میسور کی رائیاں دل سے سید صاحب کے اعلیٰ کردار کی قائل تھیں مگر مذہبی تعصب اور دل  
دامغ کی کثافت کے سبب انہیں بوڑھا جادوگر کہتی تھیں۔

جنازہ اٹھنے سے پہلے سریتا دیوی بھی خانقاہ پہنچ گئی تھی اور اس کی جاگداز چھین سن  
لوگوں کے دل خون ہوئے جا رہے تھے۔ نواب حیدر علی اور شجاعت خان نے اسے بہت تسلیا  
دیں، بار بار صبر کی تلقین کی مگر سریتا یہی کہتی رہی۔

”وہ کیا صبر کرے، جس کی دنیا ہی لٹ گئی۔ نواب بہادر! میرا سب کچھ چھین گیا۔ آؤ  
سہارا بھی۔ آج دنیا میں کون ہے مجھ جیسا تہا؟“

سریتا دیوی کی گریہ و زاری نے والی میسور کو بھی رُلا دیا تھا۔ حیدر علی اس نیم جاں لڑکی  
سینے سے لگائے سمجھا رہا تھا۔

”صبر کر میری بیٹی! تیرے شوہر ماتم سے سید صاحب کی روح کو بڑی اذیت پہنچ رہی ہوگی۔  
نواب حیدر علی کی یہ تدبیر کا گرا ثابت ہوئی اور سریتا دیوی کی جینیں تھم گئیں۔ مگر دیکھنے والوں

کو اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ضبط غم سے اُس کی روح پھٹلی جا رہی ہے۔  
نواب حیدر علی نے دریائے کادیری کے نزدیک جنگل کے ایک سنان گوشے میں سید

صاحب کی تدفین کا انتظام کیا تھا۔ سید صاحب نے ایک موقع پر باتوں باتوں میں وصیت  
کرتے ہوئے کہا تھا۔

”فرزند! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو مجھے دنیا کی بھیڑ سے الگ تنگ کو

دیرانے میں لے جا کر دفن کر دینا۔ مگر میری قبر کو کسی شہنشاہ کا مقبرہ نہ بنانا۔ بس ایک مفلس کی سی  
قبر، جس کی مٹی کو بارش دھو ڈالے اور گردشِ روز و شب جس کا نشان مٹا دے۔“

حیدر علی، سید صاحب کی یادگار کے طور پر ایک شاندار عمارت تعمیر کرانا چاہتا تھا مگر جب ٹپو  
سلطان نے سید صاحب کی وصیت بیان کی تو والی میسور خاموش ہو گیا۔ تاہم اس نے کچی قبر  
کے گرد ایک پختہ چار دیواری اور چھت تعمیر کرا دی۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری طور پر ایک محافظ  
بھی مقرر کرنا چاہا جو قبر کی دیکھ بھال کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت بھی کر سکے۔

”نواب بہادر! یہ خدمت میں خود انجام دوں گی۔“ سریتا دیوی نے نواب حیدر علی سے  
اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ”سارا شہر جانتا ہے کہ وہ میرے روحانی باپ تھے اور ایک باپ پر  
بٹی سے زیادہ کسی کا حق نہیں ہوتا۔“

نواب حیدر علی، سریتا کی اس خواہش پر حیرت زدہ رہ گیا۔ ”کیا تو اس جنگل میں اکیلی  
رہے گی؟ تجھے معلوم ہے کہ وہاں کبھی کبھی جنگلی درندے بھی آ جاتے ہیں؟“

”جب بچانے والے نے مجھے انسان نما درندوں سے بچالیا تو پھر جنگلی درندے میرا کیا  
کڑا لیں گے؟“ سریتا دیوی کا لہجہ بڑا تلخ تھا جسے یاد کر کے نواب حیدر علی کو کئی لرزہ خیز کہانیاں یاد  
آ گئیں۔ وہ اس ضدی لڑکی کو سمجھانے سے قاصر تھا۔ پھر بھی حیدر علی نے ایک ایسے آدمی کا  
انتظام کر دیا تھا، جو دونوں وقت سریتا کو اس جنگل میں کھانا پہنچا دیا کرتا تھا۔

سید صاحب کی تدفین کے کچھ دن بعد نواب حیدر علی نے سید صاحب کے شاگردوں کو  
طلب کر کے پوچھا۔

”سید صاحب بے ہوشی کی حالت میں کس قسم کی باتیں کر رہے تھے؟ شیروں کے قتل سے  
ان کی کیا مراد تھی؟“ والی میسور کا خیال تھا کہ سید صاحب مرنے سے پہلے اپنے حواس کھو چکے  
تھے اور ان کی زبان سے ادا ہونے والی باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔

سید صاحب کے شاگردوں نے نواب حیدر علی کو بتایا۔

”استاد گرامی کو حافظ رحمت خان روہیلہ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ وہ حافظ صاحب کو اپنا  
نیر کہہ کر پکارتے تھے۔ پھر جب حافظ صاحب کی موت کی خبر سرنگاپٹم پہنچی تو سید صاحب یہ  
علم برداشت نہ کر سکے۔“

”اور آخری شیر سے ان کی کیا مراد تھی؟“ نواب حیدر علی بہت الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔  
”اُس کے بارے میں ہم ناکارہ طالب علم کچھ نہیں جانتے۔“ سید صاحب کے شاگردوں

نے اپنی بے خبری کا اعتراف کر لیا۔ ”استاد گرامی کبھی کبھی اشاروں میں گفتگو کرتے تھے مگر  
ان اشاروں کا سمجھنا آسان نہیں۔ یہ بھی سید صاحب کا کوئی مخصوص اشارہ تھا، جس کا مقبوم وہ  
فوجتھے تھے یا پھر اللہ بہتر جانتا ہے۔“

”اور شجاعت خان! تیرا کیا خیال ہے؟“ نواب حیدر علی نے اپنے نائب سپہ سالار سے

پوچھا۔ ”تو بھی تو ان کی صحبت میں رہا ہے۔ سید صاحب کا آخری شیر کون ہے؟“

سید صاحب کے آخری کلمات سن کر شجاعت خان کا ذہن بھی منتشر ہو گیا تھا۔ جب وہ بچپن میں ٹیپو کو لے کر خانقاہ جایا کرتا تھا تو سید صاحب اکثر ٹیپو کو اپنا شیر کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ”ایک فوجی آدمی، سید صاحب جیسے عارف کی باتوں کو کیا سمجھے گا؟“ شجاعت خان بڑی ذہانت سے اپنا دامن بچا گیا اور اس نے والی میسور سے اس راز کو چھپا لیا کہ سید صاحب ٹیپو کو اپنا سب سے بڑا شیر کہتے تھے۔

بہت دنوں تک حیدر علی کی سماعت میں سید صاحب کے آخری الفاظ گونجتے رہے۔ پھر وہ سیاست کے ہنگاموں میں یہ بھول گیا کہ بد نصیب ہندوستان سے سید صاحب کی کیا مراد تھی اور ان کا آخری شیر کون ہے..... مگر شجاعت خان نے ایک لمحے کے لئے بھی اس واقعے کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا آخری شیر بھی.....؟ پھر جب وہ سوچتے سوچتے تھک جاتا تو سید صاحب کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے چلا جاتا۔



ٹیپو سلطان کی ازدواجی زندگی انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ امام صاحب بخشی ناطک کی بیٹی تاجدار بیگم بھی اپنے بزرگوں کی غلط تربیت کے باعث انتہائی غرور میں مبتلا تھی اور وہ شوہر کے ساتھ ساتھ ٹیپو کے خاندان کو بھی اپنے آپ سے کم تر سمجھتی تھی۔ سسرال والوں کے ساتھ تاجدار بیگم کا رویہ حاکمانہ تھا۔

شروع میں ٹیپو سلطان نے بیوی کے اس طرز عمل پر کوئی توجہ نہیں دی مگر جب خاندان کی محترم عورتوں نے تاجدار بیگم کے تحقیر آمیز سلوک کی شکایت کی تو ولی عہد سلطنت کو اپنی بے خبری کا احساس ہوا۔ پھر ایک دن اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہیں کبھی میری طرف سے کوئی آزار پہنچا ہے؟“ ٹیپو سلطان نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ولی عہد سلطنت کا طرز گفتار اس قدر شیریں تھا کہ سننے والوں کے دل موہ لیا کرتا تھا۔ طاقت و اقتدار کے باوجود پوری زندگی میں اس کی زبان سے ایک بھی جھش کلمہ ادا نہیں ہوا۔ ٹیپو سلطان اپنے ملازموں سے بھی اسی طرح گفتگو کرتا تھا، جیسے وہ اسی کے خاندان کے معزز افراد ہوں۔ بیوی سے بات کرتے وقت ٹیپو کے لہجے سے شدید محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ ٹیپو نے آج تک ہر خاص و عام سے محبت کی تھی۔ اور پھر تاجدار بیگم تو اس کی ذات کا ایک بڑا حوالہ تھی۔

”نہیں۔“ تاجدار بیگم نے شوہر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ پر کئی بل پڑ گئے تھے۔ ”مگر یہ مستقل آزار کیا ہے کہ میری شادی مجھ سے کم تر خاندان میں ہوئی ہے؟“ بیوی کے اس طرز کلام نے ٹیپو سلطان کو چونک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”کیا تم مجھے اپنے سے کم تر سمجھتی ہو تاجدار بیگم؟“ ٹیپو کے لہجے سے غلش دل نمایاں تھی۔

تاجدار بیگم نے براہ راست تو اپنے شوہر کو کمتر نہیں کہا مگر درپردہ اس کا یہی مفہوم تھا۔ ”بڑے والد محترم اس شادی پر آمادہ نہیں تھے۔“

”پھر یہ شادی کیوں ہوئی؟“ ٹیپو سلطان نے اپنی شریک حیات سے سوال کیا۔ ”تمہارے باپ بزرگ کو انکار کر دینا چاہئے تھا۔ آخر ان پر کوئی جبر تو نہیں تھا۔“

”ان کے سر پر طاقت کی تلوار لٹک رہی تھی۔“ تاجدار بیگم نے اونچی آواز میں کہا۔ ”انکار یہ کرتے کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔“

”نواب بہادر کسی پر جبر نہیں کرتے۔“ یہ کھلی الزام تراشی تھی۔ ٹیپو سلطان نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ نازک ترین تعلقات کو مزید تلخیوں سے بچانا چاہتا تھا۔ ”اور یہ رشتے جبر سے طے ہوتے بھی نہیں۔“

”بہر حال، یہ رشتہ جبر سے ہوا ہے۔“ تاجدار بیگم نے تمام مصلحتوں، نزاکتوں اور لہجہ و اہرام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

”خیر! وہ دور جبر تو گزر گیا۔“ ٹیپو نے بڑی ذہانت سے بات کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ آپ کا عہد اختیار ہے، اسے خوشگوار بنانے کی کوشش کیجئے۔“ ٹیپو اپنی بے پناہ ہای مہرویات کی بنا پر تمام ذہنی الجھنوں سے نجات چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے شدید باؤنٹوار فضا میں بھی مصالحت آمیز روش اختیار کی تھی۔

”تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی تمام تر ذمے داری آپ پر اور آپ کے اہالیان خاندان پر عائد ہوتی ہے۔“ تاجدار بیگم کے غرور کا وہی عالم تھا۔ ”میری خاندانی برتری کا کھلے عام اعتراف کیا جائے ورنہ اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں۔“ تاجدار بیگم نے واضح الفاظ میں نواب حیدر علی کی تاریخ ساز جدوجہد اور ٹیپو سلطان کی اعلیٰ صفات کی نفی کر دی تھی۔

”بے شک! آپ کا خاندان عظمت و بلندی کا حامل ہے۔ مگر یہ روایت اسی وقت تک بے زار رہ سکتی ہے جب تک خاندان کے نمائندے اپنے کردار کی گواہی پیش کرتے رہیں۔“ ٹیپو سلطان بڑے عمل کے ساتھ اپنی شریک حیات کو سمجھا رہا تھا۔ ”اعلانِ تقار خددا کو کبھی ناپسند ہے اور اہل دنیا بھی اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔“

”مجھے اہل دنیا کی ذرا بھی پروا نہیں۔“ تاجدار بیگم اپنے خیالات کے حصار سے نکلنے پر آمادہ نہیں تھی۔ ”خدا نے مجھے بڑا پیدا کیا ہے اور میں آخری سانس تک بڑی ہی رہوں گی۔“

”کوئی انسان اپنے ہم جنسوں کی تحقیر کرنے کے بعد بڑا نہیں رہ سکتا۔“ بیوی کی متکبرانہ بات سن کر ٹیپو کے دل و دماغ مکدر ہو گئے تھے مگر پھر بھی وہ اتمامِ حجت اور اصلاحِ حال کے لئے تاجدار بیگم سے گفتگو کر رہا تھا۔ ”ممکن ہے کہ وہ مروت میں زبان سے کچھ نہ کہیں مگر ان کے دل نفرتوں کے غبار سے بھر جاتے ہیں۔“

”غلاموں کی نفرتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔“ تاجدار بیگم کی زبان درازیاں کچھ اور بڑھ

ایک عاجز بندہ ہوں اور رسول عربی (ﷺ) کا ادنیٰ ترین امتی۔ اس کے سوا نہ مجھ میں کچھ ہے اور نہ تم میں۔ اگر تم نے میری بات سمجھنے کی کوشش کی تو فلاح پا جاؤ گی۔“

ٹیپو سلطان نے تاجدار بیگم کو راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مغرور و سرکش عورت اپنے بزرگوں کی عظمتوں کے ترانے گاتی رہی۔ اور اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکی کہ ریاست میسور میں اس کے بزرگوں کو اعلیٰ مناصب بھی نواب حیدر علی ہی نے عطا کئے ہیں۔ اگر کبھی اتفاق سے تاجدار بیگم کے ذہن میں اصلاح کی لہر اٹھتی بھی تو اس کا باپ امام صاحب بخشی ہائے نور اپنی خاندانی عظمت اور قومی برتری کا راگ چھیڑ دیتا۔ اور تاجدار بیگم پرانے راستے پر لوٹ جاتی۔

اس کے برعکس ٹیپو سلطان کی دوسری بیوی رقیہ بانو ایک نہایت ذہین اور وفا شعار خاتون تھی۔ وہ شوہر کو ہر قسم کی ذہنی اُلجھن سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔

”اگر تاجدار بیگم اس بات سے خوش ہوتی ہیں کہ آپ اپنا زیادہ وقت ان کے پاس گزاریں تو میری طرف سے اجازت ہے۔ آپ کبھی میرے ہونٹوں پر حرف شکایت نہیں دیکھیں گے۔“

رقیہ بانو بڑی فراخ دلی کے ساتھ شوہر کو مشورہ دیتی۔ ”ہم عورتوں کا کیا ہے کہ ہمیں ناز و ادا کی بے حد نمائش کے سوا کچھ آگاہی نہیں۔ آپ ان فردعات میں اُلجھ کر محل کے آراستہ کمروں کی طرف نہ دیکھیں کہ آپ ریاست کی سرحدوں کے نگراں ہیں، رعایا کے حقوق کے محافظ ہیں اور آپ کے کاندھوں پر بے حساب ذمہ داریوں کا بار گرا ہے۔ اگر آپ فاتح ہیں تو ہم کینیریں بھی سرخو ہیں۔ ورنہ پھر کیا باقی ہے، کچھ بھی نہیں۔“

ٹیپو سلطان اپنی جائز شریک حیات کی باتیں سن کر مسکرانے لگتا۔ ”نہیں بانو! میں تمہارے حقوق کی دوسری عورت کے دامن میں نہیں ڈال سکتا۔ ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ تاجدار بیگم اپنی فرض ناشاسی اور گستاخیوں کے باوجود مجھے بے مہر نہیں پائیں گی۔“



اسی دوران ایک دن نواب حیدر علی کو اپنی پیٹھ میں ہلکی ہلکی تکلیف محسوس ہوئی۔ کچھ دن تک توالی میسور نے اس طرف دھیان نہیں دیا، مگر جب یہ مسلسل سوزش تیز درد میں تبدیل ہو گئی تو اس نے طبیب خاص کو بلا کر اپنی شکایت بیان کی۔ طبیب خاص نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ ایک معمولی سا پھوڑا ہے، جس کے اندر مواد پک رہا ہے اور درد کی شدت اسی مواد کے سبب ہے۔

کئی ماہ تک مختلف دوائیں استعمال کی گئیں مگر جب درد میں کوئی کمی نہیں ہوئی تو طبیب خاص کے مشورے پر ریاست کے ماہر جراح نے پھوڑے میں شکاف ڈال کر سارا مواد باہر نکال دیا۔ درد فوری طور پر رفع ہو گیا لیکن مرہم لگانے کے باوجود زخم ہرا رہا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ زخم کی اوپری سطح خشک ہونے لگتی مگر جیسے ہی حیدر علی گھوڑے کی سواری کرتا، زخم کا مٹہ دوبارہ

گئی تھیں۔

”مجھے افسوس ہے کہ امام صاحب کی تربیت نے تمہیں ہلاک کر ڈالا۔“ یہ کہتا ہوا ٹیپو سلطان کھڑا ہوا۔ اس کا اشارہ اپنے خسر کی طرف تھا۔

تاجدار بیگم مغرور ہونے کے ساتھ ایک تنگ دل عورت بھی تھی۔ اس نے شوہر کی بات کا غلط مفہوم لیا اور ناراض ہو کر خسر کے گھر چلی گئی۔

جب حیدر علی کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ٹیپو سے باز پرس کی۔ ولی عہد سلطنت نے اپنے اور تاجدار بیگم کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو باپ کے سامنے دہرا دی۔ حیدر علی اپنی بہو کی بدکلامیوں اور گستاخیوں کو نظر انداز کر کے امام صاحب بخشی تاملے کے گھر چلا گیا اور تاجدار بیگم کو واپس لے آیا۔

امام صاحب نے بیٹی کو سمجھانے کے بجائے اُس کی آتش غرور اور شوق خود نمائی کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ تاجدار بیگم واپس آئی تو اس نے شوہر سے نیا مطالبہ کر دیا۔

”رقیہ بانو کو طلاق دے دی جائے۔ میں اپنی ذات میں کسی کی شرکت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ براہ راست میری توہین ہے۔“

”رقیہ بانو میری عزیز بھی ہے تاجدار بیگم!“ پہلی بار ٹیپو سلطان کے لہجے میں تلخی شامل ہو گئی تھی مگر اس قدر بھی نہیں کہ اس کی زبان بے لگام ہو جاتی اور ذہن بگڑ کر رہ جاتا۔ ”بالفرض وہ ایک کینیر ہوتی، تب بھی میں اسے طلاق نہیں دیتا۔“

”تو پھر مجھے آزاد کر دیا جائے۔“ تاجدار بیگم نے خشمگین لہجے میں کہا۔

”آپ سے زیادہ آزاد کون ہو گا؟“ ٹیپو سلطان طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا۔ ”جس عورت کے دل سے شوہر کا احترام رخصت ہو جائے اور جسے اپنی زبان پر قابو نہ رہے، اس سے زیادہ آزاد کون ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں تاجدار بیگم! مگر جہاں تک طلاق کا تعلق ہے تو مجھ سے اس

گالی کی توقع نہ رکھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زبان ہمیشہ پاک رکھی ہے۔“

”طلاق گالی نہیں ہے۔“ تاجدار بیگم بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے شوہر سے جرح کر رہی تھی۔ ”یہ میرا حق ہے۔“

”آپ کے حقوق کیا ہیں، میں انہیں خوب پہچانتا ہوں۔“ ٹیپو کی آواز کسی قدر بلند ہو گئی تھی مگر اس میں آمرانہ غصے کی آمیزش نہیں تھی۔ ”شاید آپ کو اپنی خاندانی عظمتوں کا لحاظ نہ ہو، مگر مجھے اپنی خاندانی نجابت کا بہت زیادہ احساس ہے۔ غور سے سنو تاجدار بیگم! میں ٹیپو سلطان

ہوں، نواب حیدر علی کا بیٹا۔ میرا تعلق بھی سرزمین عرب سے ہے اور میں بھی ایک معزز قبیلے کا فرد ہوں۔ میرے بزرگوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ سب آسمانی بخشش و عطا ہے۔ خدا سے

چاہے سرفراز کرے اور جسے چاہے ذلیل و رسوا کر دے۔ میں نہ اپنے نسب نامے پر فخر کرتا ہوں اور نہ دولت و اقتدار پر۔ ہاں اگر میرے سینے پر کوئی تمغہ غرور آویزاں ہے تو بس یہ کہ میں اللہ کا

انگریزی فوجیں اس کے علاقے سے گزر کر بندرگاہ ماہی پر قابض ہو گئیں۔

انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لئے نواب حیدر علی نے اسی ہزار فوج کے ساتھ کرناٹک پر حملہ کر دیا۔ والا جاہ محمد علی، ارکاٹ میں کسی قیدی کی طرح محصور ہو کر رہ گیا۔ انگریزوں نے ارکاٹ کو بچانے کے لئے مدراس سے جنرل سربکٹر منرو اور گنٹور کے علاقے سے کرنل نیلی کو روانہ کیا۔ شیپو سلطان نے اپنی حکمت عملی سے ان دونوں فرنگی لشکروں کو آپس میں لپٹا نہیں دیا۔ نتیجتاً انگریزوں کو شکست فاش ہوئی اور کرنل نیلی کو اس کی باقی ماندہ فوج کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔

اسی جنگ کے دوران نواب حیدر علی کی پشت پر ایک اور پھوڑا نمودار ہوا۔ درد نے شدت اختیار کی تو پھر طبیب خاص کو طلب کیا گیا۔ پھر وہی نسخہ استعمال کیا گیا۔ ماہر جراح نے ایک اور ٹاف دے کر لاوے کی طرح کھولتا ہوا مواد باہر نکال دیا۔ حیدر علی کو کچھ سکون ہوا تو اپنی فوج لے کر آگے بڑھا اور نواب والا جاہ محمد علی کے دارالحکومت ارکاٹ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ والا جاہ شکست کھا کر اس طرح فرار ہوا جیسے جنگل میں کوئی گیدڑ کسی شیر کو دیکھ کر فرار ہوتا ہے۔ اس کی پوری فوج نے اپنے ہتھیار نواب حیدر علی کے قدموں میں رکھ دیئے اور تمام روادوں نے والی میسور کی اطاعت قبول کر لی۔ والا جاہ محمد علی بمشکل دس پندرہ سپاہیوں کے ساتھ ارکاٹ سے فرار ہو کر مدراس پہنچا اور اس نے انگریز گورنر کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

”آقا! میری فریاد شاہ انگلستان تک پہنچا دیجئے۔ حیدر علی، ارکاٹ کی بے گناہ رعایا پر ایسے ظالم و جارحانہ ہے کہ اس کی مثال کسی وحشی قوم میں بھی نہیں ملے گی۔“

نواب ارکاٹ نے کھلا جھوٹ بولا تھا۔ گورنر مدراس نے حیدر علی کے ظلم و ستم کی اسی داستان کو مزید رنگ آمیزی کے ساتھ اپنے خطوط کے ذریعے انگلستان کے دربار تک پہنچا دیا۔ والا جاہ محمد علی کے جاسوسوں میں سے سید حمید کمیدان، راجہ بیربر اور میر صادق علی نے نواب حیدر علی کی ملازمت اختیار کر لی۔

میر صادق علی ان سب میں بڑا عیار اور شاطر تھا۔ موسم بدلتے ہی اس نے حیدر علی کے انہل کو بوسہ دیا اور سر دربار علی الاعلان کہا۔

”کرناٹک کی رعایا کے لئے نواب بہادر، فرشتہ رحمت بن کر آئے ہیں۔ اب اس علاقے کو ایک خوش حال ہو جائیں گے اور ان کے گھروں پر عزت و آبرو اور عدل و انصاف کی حکمرانی ہوگی۔“

یہ جذباتی تقریر کرنے کے بعد میر صادق علی نے بڑے ریاکارانہ لہجے میں اپنی روداد الم

”اے میرے شاہ! والا جاہ کی غلامی نے تو مجھ سے میری ساری صلاحیتیں چھین لیں۔ تمام انگریزوں کی اطاعت کرتا رہا۔ اب ہندوستان کا سب سے بڑا جو انرد، ارکاٹ کی زمین پر

کھل جاتا۔ طبیب مشورہ دیتے کہ حضور! آرام فرمائیں۔ مگر حیدر علی براہم ہو جاتا۔

”اب آرام تو قبر ہی میں ملے گا۔ میرے یہ کرم فرما، یہ غم گسار، یہ دوست جو آئے دن میسور پر حملے کرتے رہتے ہیں، کیا میں ان سے آرام کی بھیک مانگوں گا؟“

طبیب خاموشی اختیار کر لیتے مگر ساتھ ہی ساتھ دہی زبان سے یہ بھی کہہ دیتے۔ ”اگر حضور اسی طرح بے آرام رہے تو یہ زخم خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

”کتنا خطرناک؟“ نواب حیدر علی طبیبوں کی جھکی ہوئی گردنیں اور پریشان چہرے دیکھ کر مسکرانے لگتا۔ ”زیادہ سے زیادہ میری جان لے لے گا اور کیا کرے گا؟ مگر یاد رکھو کہ میں ہر پراڈیاں نہیں رگڑوں گا۔ میں نے اپنے خدا سے ایسی موت کی آرزو نہیں کی ہے۔ بے شک وہ قادر مطلق ہے مگر اپنے بندوں کی دعائیں بھی سنتا ہے۔ تم اطمینان رکھو کہ میں اس طرح دنیا سے نہیں جاؤں گا۔ ابھی لاتعداد محاذ ہیں، بے شمار دشمن ہیں۔ بہت سے قرض ہیں سب کے سب چکا کر جاؤں گا۔ کسی موج طوفان کی مانند، آندھی کے کسی تیز جھونکے کی طرح۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حیدر علی دشمنوں سے جنگ کرتا رہا اور اس کے زخم کی آگ بجھتی رہی۔



مادھوراؤ کی موت کے بعد مرہٹے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ رگھو پا کی حمایت کر رہا تھا اور دوسرا پیشوا نارائن کے شیر خوار بیٹے کی۔ آخر پونا کی جاٹینی کے مسئلے نے یہاں تک طول کھینچا کہ انگریز، رگھو پا کی حمایت میں مرہٹوں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ وزیر اعظم نانافرنولیس نے فوری طور پر نواب حیدر علی سے مدد مانگی۔

”نواب! میں تم سے آزادی کے نام پر مدد کی درخواست کرتا ہوں۔ اگر تم نے تاخیر سے کام لیا تو فرنگی پورے ملک کو غلام بنا لیں گے۔“

حیدر علی نے بڑی حیرت سے نانافرنولیس کا خط سنا۔ پھر فوری طور پر جواب تحریر کیا۔

”مجھے پیشوا مادھوراؤ اور ترک راؤ کا وحشیانہ سلوک اچھی طرح یاد ہے۔ مگر میں پھر تیری مدد کو ضرور آؤں گا۔ آخر ہندوستان کی آزادی اور بھلا کا مسئلہ ہے۔“

اسی طرح نظام علی خان والی دکن نے بھی فوجی مدد کی ایک درخواست، حیدر علی کی خدمت میں روانہ کی تھی۔ انگریزوں نے نظام علی خان کے علاقے گنٹور پر جابرانہ قبضہ کر لیا تھا اور دکن میں ان کا اثر روز بہ روز بڑھتا جا رہا تھا۔ نواب حیدر علی نے نظام کی درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے نزدیک والی دکن صرف اپنی غرض کا بندہ تھا۔ اس لئے حیدر علی خاموشی کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتا رہا۔

ان ہی دنوں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں پانڈے پجری فتح کر لیا اور پھر بندرگاہ ماہی پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ بندرگاہ ملابار میں واقع ہے اور ملابار کا پورا علاقہ حیدر علی کے زیر اقتدار تھا۔ والی میسور کے منع کرنے کے باوجود



حیدر علی کی بیٹی میں ایک اور شکاف ڈال دیا۔  
 ”نواب بہادر! ہم نہیں جانتے کہ یہ کس قسم کی بیماری ہے جو بہترین علاج کے باوجود روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ خدا کے لئے آرام کیجئے کہ ہمارے نزدیک مکمل آرام ہی اس مرض کی دوا ہے۔“

”مجھے تمہاری تجویز سے مکمل اتفاق ہے۔“ حیدر علی نے پہلی بار اپنے طبیبوں کے سامنے نرم اختیار کیا تھا۔ ”تمہیں کیا معلوم کہ میں کس تکلیف میں مبتلا ہوں اور میرے اعصاب پر کیسی نازی ہے۔ میں خود بھی آرام کرنا چاہتا ہوں مگر یاد رکھو کہ میں جس دن بستر پر لیٹا، دشمن نے سینے پر چڑھ دوڑیں گے۔ اگر انگریزوں کو میری تھکن اور بیماری کا حال معلوم ہو جائے تو وہی جنگ بغیر لڑے ہی جیت لیں گے۔ میں تو اپنے بیوی بچوں کو بھی نہیں بتا سکتا کہ مجھے کیا عذاب ناک بیماری لاحق ہے۔ تمام سپہ سالار میرے اس مرض سے بے خبر ہیں۔ بس اے سواہ راز کسی کو معلوم نہیں۔ اس راز کو اس وقت تک راز ہی رہنے دینا جب تک میں اپنا کام نہ پہنچ جاؤں۔ اگر یہ راز میرے خیمے سے باہر گیا تو ایک طرف تم اپنے نواب کی ت میں خیانت کرو گے اور دوسری طرف میسور پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔“

تمام طبیب اور جراح روتے ہوئے، نواب حیدر علی کے خیمے سے باہر جانے لگے۔  
 ”ناہارو! اپنے آنسو تو خشک کر لو۔“ نواب حیدر علی نے محبت آمیز لہجے میں طبیبوں اور نول کو ڈانٹا۔ ”اگر کسی نے تمہیں روتے ہوئے دیکھ لیا تو اپنے آنسوؤں کا کیا جواز پیش کرے گا؟“

”اللہ ہماری سانسیں بھی نواب بہادر کی عمر میں شامل کر دے۔“ طبیبوں اور جراحوں نے اپنے آنسو خشک کئے اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ نواب حیدر علی کے خیمے سے نکل کر چلے گئے۔



ارکاٹ کے جشن شہانہ سے فارغ ہو کر نواب حیدر علی نے میر معین الدین خان کو چتور، راجہ رضا خان کو مضافات ارکاٹ اور شہزادہ ٹیپو سلطان کو جنوبی قلعوں کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ میر معین الدین، چتور فتح کر کے چندرگیری کی طرف بڑھا۔

شہزادہ ٹیپو سلطان ماہی منڈل اور کیلاش گڑھ کے قلعوں کو فتح کرتا ہوا سات گڑھ کی طرف چلا۔ یہاں کا قلعہ نہایت مضبوط تھا اور اس کی حفاظت کے لئے ایک زبردست فوج متعین کی گئی تھی۔ مگر ٹیپو سلطان کی بلند اقبالی دیکھ کر کسی لڑائی کے بغیر دشمن نے سات گڑھ کا قلعہ، ٹیپو سلطان کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے ٹیپو سلطان آملور کی طرف بڑھا، جہاں والا جاہ محمد علی اور آملور کے لشکر مقیم تھے۔ چندرہ دن کے محاصرے کے بعد ٹیپو نے آملور بھی فتح کر لیا۔

آملور کے بعد ٹیپو سلطان کوہ راوت اور نیلور پر قبضہ کر کے تپاک گڑھ پر حملہ آور ہوا۔

جلوہ گر ہوا ہے تو اسے نذر کرنے کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کاش! میں کرناٹک کے بجائے میسور کا ادنیٰ ملازم ہوتا اور پھر زندگی بھر اپنے اس اعزاز پر فخر کرتا۔“  
 حیدر علی، میر صادق کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔

”صادق علی! ہم تجھے جیسے مرد بہادر کو ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ اپنے سیاہ ماضی کو فراموش کر دے۔ ہمارے سایہ کرم میں تیرا مستقبل بہت روشن و تابناک ہوگا۔“

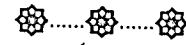
”میں نے شہنشاہ کے اس انداز کرم کے سوا ہر چیز کو بھلا دیا۔“ میر صادق علی پورے زور و شور سے نواب حیدر علی کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ ”میں نے اپنی ذات کو بھی فراموش کر دیا۔ اب مجھے نواب حیدر علی بہادر کے الطاف و کرم کے سوا کچھ یاد نہیں۔“

میر صادق علی، حیدر آباد کے میر عالم کا بھائی تھا مگر حیدر علی کو آخر تک یہ راز معلوم نہیں ہو سکا اور اس نے میر صادق کو افسر محاصل کا اہم ترین عہدہ سونپ دیا۔

ارکاٹ پر مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد نواب حیدر علی نے ایک جشن شہانہ منایا۔ پھر وہ ٹیپو کو لے کر حضرت ٹیپو مستان کے مزار پر حاضر ہوا۔

”فرزند! تمہارے نام کو ان ہی بزرگ کے نام نامی سے نسبت ہے۔“

ولی عہد سلطنت خود بھی حضرت ٹیپو مستان کے مزار مبارک پر حاضری دینے کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ مگر یہ علاقہ والا جاہ محمد علی کے زیر اقتدار تھا، اس لئے ٹیپو کی خواہش بھی اس کے سینے میں ایک مستقل غلش بن کر رہ گئی تھی۔ آج جب حیرت انگیز طور پر وقت نے کروٹ لی تو ٹیپو کی یہ مراد بھی بر آئی۔ ولی عہد سلطنت، حضرت ٹیپو مستان کے مزار مبارک پر ایک دن اور ایک رات حاضر رہا۔ اس دوران اس نے پورا قرآن شریف ختم کیا اور اس کا ثواب حضرت ٹیپو مستان کی روح کو پہنچایا۔ کئی دن تک لنگر جاری رہا اور ہزاروں بھوکوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ٹیپو نے خود اپنے ہاتھ سے ضرورت مندوں میں لباس تقسیم کئے اور محتاجوں کو نقد رقم دی۔ نواب حیدر علی نے درگاہ کے متولی کو ایک سواشریاں اور زربفت کا شامیانہ پیش کیا۔ شامیانے کی لکڑیوں؟ سونے کی پتریاں چڑھائی گئی تھیں۔



ابھی نواب حیدر علی، ارکاٹ میں مقیم تھا کہ انگریزوں نے اس سے صلح کی درخواست کی۔ صلح نامے کی دستاویز لے کر انگریزوں کا سفیر پادری شوازر، حیدر علی کے دربار میں حاضر ہوا۔ پادری شوازر فرنگیوں کا جاسوس تھا جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے نواب حیدر علی کی فوجی طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ حیدر علی کا انگریزوں سے اعتبار اٹھ چکا تھا، اس لئے پادری شوازر کو ناکام و نامراد واپس لوٹا دیا گیا۔

ابھی ارکاٹ میں جشن شہانہ جاری تھا کہ نواب حیدر علی کی پشت پر ایک اور پھوڑا نمودار ہوا۔ والی میسور کو شدید درد سے نجات دینے کے لئے طبیبوں اور جراحوں نے وہی پرانا نسخہ آزمایا۔

مہادیوی لالی، نواب حیدر علی کی ملازمت میں تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کو یہاں کے حالات سے باخبر کر دیا۔ نتیجتاً حکومت فرانس نے اپنے مقبوضات بچانے اور حیدر علی کی مدد کرنے کے خیال سے جنگی جہازوں کا ایک بیڑا روانہ کر دیا۔ فرانسیسی فوج نے محمود بندر پر اتر کر چارم اور برما کوئل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے جواب میں انگریزوں نے ایک زبردست فوج کڈلور پرانہ دی۔ یہ فوج جنرل اسٹیوارٹ کے ماتحت تھی۔

نواب حیدر علی بھی اپنی فوجوں کے ساتھ کڈلور کی طرف بڑھا۔ اس وقت سمندر میں فرانسیسی جہاز والی میسور کی مدد کے لئے موجود تھے۔ یہاں ایک خونریز جنگ ہوئی، جس میں انگریزوں کو نکتہ فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس فتح کے بعد نواب حیدر علی نے اپنی فوجوں کو دائی وائش اور ہائپرچی پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور خود آرنی کی طرف بڑھا۔ اگرچہ حیدر علی کا مرض پوری شدت اختیار کر چکا تھا لیکن اس نے اپنی قوت ارادی سے آرنی کا قلعہ بھی فتح کر لیا۔ پھر یکایک اُس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بستر پر گر پڑا۔

دراصل نواب حیدر علی کو سرطان کا مرض تھا۔ اس خوفناک بیماری کے انکشاف کے باوجود وہ دس سال تک اپنی پیٹھ میں سینکڑوں ناسور لئے دشمنوں سے جنگ کرتا رہا۔ آخری وقت میں جب طبیوں نے حیدر علی کے لباس کو اس کے جسم سے علیحدہ کیا تو پوری پیٹھ ناسوروں سے چھلنی نظر آ رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر شجاعت خان اور دوسرے سپہ سالار رو پڑے۔ تمام مشیروں نے انگلیاں آنکھوں کے ساتھ عرض کیا۔

”نواب مہادرا! آپ نے تو اس مملکت کی فلاح و بہبود کے لئے خود کو ہلاک کر ڈالا۔ خدا کے واسطے تمام جنگی مہمات سے کنارہ کش ہو کر آرام فرمائیے اور شہزادے کو طلب کر کے حکومت کا انتظام ان کے سپرد کر دیجئے۔“

ٹیپو سلطان اس وقت ملابار میں نائروں کی بغاوت کو کچلنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

آخر 5 دسمبر 1782ء کو نواب حیدر علی نے ٹیپو سلطان کے نام خط تحریر کرایا جس میں ولی عہد سلطنت کو ارکاٹ پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔

4 دسمبر کو نواب حیدر علی نے اپنی فوج کو ایک ماہ کی تنخواہ بطور انعام دینے کا حکم جاری کیا۔

نام کے قریب نواب نے شجاعت خان سے پوچھا کہ آج کیا تاریخ ہے؟

”محرم کی چاند رات ہے۔“ شجاعت خان مسلسل رورہا تھا۔

”تیری بچوں کی سی حرکتیں ابھی تک نہیں گئیں۔“ حیدر علی نے بڑی محبت سے شجاعت خان کے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر بعد غسل کے انتظامات کا حکم دیا۔ پھر غسل کر کے نماز ادا کیا۔ رات بھر کھڑے بیٹھ اور درود شریف کا ورد کرتا رہا۔ پھر صبح کی نماز ادا کی۔ کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ نواب حیدر علی بہت جلد ان سے بچھڑنے والا ہے۔

معمولی سانشہ کیا، پھر چند سرداروں کو طلب کر کے دس ہزار فوج شمالی ارکاٹ پر اور پانچ

جہاں انگریز سپاہ متعین تھی۔ چند دن کی لڑائی کے بعد یہ قلعہ بھی فتح ہو گیا اور قلعہ داروں کو امان دے دی گئی۔ مگر قلعے والوں نے ٹیپو سلطان کے خیموں میں آکر غدار کی۔ اس جرم پر وہ سب کے سب قتل کر دیئے گئے اور انگریز قیدیوں کو سرنگا پٹم بھیج دیا گیا۔

والی میسور کی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ چند ساحلی مقامات کو چھوڑ کر ٹانک کا پورا علاقہ، حیدر علی فوج کے تصرف میں تھا۔ جب وارن ہیستنگز کو یہ خبر ملی کہ مدراس کا پورا علاقہ انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو اس نے جنرل سرائز کوٹ کو بحری راستے سے مدراس بھیجا۔ جنرل سرائز کوٹ نے اپنی عسکری صلاحیتوں کے باعث بنگال میں بہت نام پیدا کیا تھا۔

جنرل سرائز کوٹ، کوہ مور سے نکل کر وائش وائش پہنچا جہاں کپتان فلنٹ محصور تھا۔ انگریزوں کی اس نئی فوج کے آتے ہی حیدر علی فوج، محاصرہ اٹھا کر محمود بندر چلی گئی۔ جنرل کوٹ نے وائش وائش پر قبضہ کر کے محمود بندر پر چڑھائی کر دی۔

اس خبر کے سنتے ہی نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان بھی محمود بندر پہنچ گئے۔ یہاں انگریز فوج اور حیدر علی کے لشکر کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی۔ جب جنرل سرائز کوٹ کو یہ معلوم ہوا کہ نواب حیدر علی بھی میدان جنگ میں موجود ہے تو اس نے انگریزی جہازوں کو اسی مقام پر گولہ باری کرنے کا حکم دیا۔ مجبوراً نواب حیدر علی کو پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ والی میسور کے پیچھے ہٹے ہی انگریز فوجوں نے آگے بڑھ کر حصار قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ کے دوران نواب حیدر علی کے برادر نسبتی میر علی رضا خان پر ایک گولہ آکر گرا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ حیدر علی نے اسی وقت میر علی رضا خان کی لاش کرم کڈھ روانہ کر دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزی جہازوں نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔ حیدر علی کی فوجیں انگریزوں کی اس کارروائی کا جواب دینے سے قاصر تھیں اسی لئے ان کا بہت جانی نقصان ہوا۔ مجبوراً نواب حیدر علی اپنی فوجوں کو موت کے منہ سے نکال کر تنڈی وانم چلا گیا اور محمود بندر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ نواب حیدر علی نے اس نکتہ کا ازالہ کرنا چاہا مگر وقت اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ مدراس پہنچ کر جنرل سرائز کوٹ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ جنرل اسٹیوارٹ کو سپہ سالار بنادیا گیا۔

اسی دوران انگلستان سے نیا گورنر لارڈ میکارتھی، مدراس آگیا۔ کیونکہ یورپ میں انگریزوں اور ڈچوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی، اس لئے لارڈ میکارتھی نے مدراس آتے ہی انگریزی فوج کو ڈچوں کے علاقے ناگ پٹنم پر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا۔ کرنل بریٹ وائٹ کی قیادت میں ایک زبردست فوج روانہ کر دی گئی، جس نے ناگ پٹنم پر قبضہ کر کے تلپری پر چڑھائی کر دی۔ مگر ٹیپو سلطان کی فوجوں نے دریائے کاویری کے قریب اسے گھیر لیا۔ چند دن کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ فرنگیوں کا تقریباً پورا لشکر تباہ ہو گیا تھا۔ باقی ماندہ فوج کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔ گرفتار ہونے والوں میں اس وقت فرانس کے دو سپہ سالار مہادیوی آل اور

”نواب بہادر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔“ شجاعت خان سرگوشین میں حیدر علی کے مسلح محافظوں سے مخاطب تھا۔ ”نہ تمہارے ہونٹ کانپیں اور نہ آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپکے۔ اگر کوئی اندر جانے کی اجازت مانگے تو اس سے کہہ دینا کہ نواب بہادر آرام فرما رہے ہیں۔ میں ذرا سالار محمد علی کیدان کے خیمے تک جا رہا ہوں۔“

نواب حیدر علی کے انتقال کی خبر سن کر محمد علی کیدان سکتے میں آ گیا۔ پھر شدید کرب ناک بچے میں جیتے ہوئے بولا۔

”نواب بہادر اس طرح دبے پاؤں چلے گئے کہ ان کے جاں نثاروں کو خبر تک نہ ہو گی۔ رخصت کا یہ کون سا انداز ہے؟“ ابھی اعصاب رکھنے والا محمد علی کسی موی شیخ کی طرح ہل رہا تھا۔

”آہستہ بولیں۔“ شجاعت خان کا انداز گفتگو سرگوشیاں تھا۔ ”آپ کے کانٹھوں پر اس رن بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر دشمنوں کو نواب بہادر کے انتقال کی خبر ہو گئی تو ریاست میں بڑا انتشار پھیل جائے گا۔“

”ہجرت ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟“ محمد علی کیدان نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

”آپ لشکر کی واپسی کا حکم جاری کریں۔“ شجاعت خان نے تجویز پیش کی۔ ”میں ایک ہزار رفاہی قاصد کو شہر ادرے کے پاس ملایا بھیجتا ہوں۔ نواب بہادر کے انتقال کی خبر اس وقت تک پھیلے ہوئی رہے گی، جب تک ولی عہد سلطنت سرنگاپٹم نہیں پہنچ جاتے۔“

پھر ایسا ہی کیا گیا۔ شجاعت خان نے حیدر علی کے نام سے شیو سلطان کو خط تحریر کیا کہ وہ بالکل محتاط بن کر رہے۔ شجاعت خان نے حیدر علی کے نام سے شیو سلطان کو خط تحریر کیا کہ وہ سرنگاپٹم کی طرف کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ چند رازداروں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ نواب حیدر علی دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ پورے لشکر میں مشہور کیا گیا کہ نواب حیدر علی کی طبیعت زیادہ ناساز ہے، اس لئے وہ علاج اور آرام کی غرض سے دارال حکومت تشریف لے جا رہے ہیں۔ والی میسور کا جنازہ ایک رتھ میں تھا جس کے گرد سپہ سالار محمد علی کیدان، شجاعت خان اور حیدر علی کے مخصوص محافظ دتے کے سپاہی جمع تھے۔ رتھ بڑی تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ پھر جب حیدر علی کا جنازہ سرنگاپٹم پہنچا تو دارال حکومت میں کھرام برپا ہو گیا۔ ہزاروں سالان اور ہندو چیتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ حیدر علی کی والدہ حمیدہ بیگم، بیٹے کی اٹل کے سر پر بیٹھی تھیں اور بار بار والی میسور کو مخاطب کر کے کہتی تھیں۔

”تو بہت فرمانبردار تھا۔ سرزمین ہند نے ایسے بیٹے بہت کم پیدا کئے ہوں گے۔ تو اپنے باپ کی طرح فرض شناس تھا۔ ریشمی بستر کے بجائے محاذ جنگ پر کام آیا۔ بے شک! تو بڑا باہر تھا حیدر علی! کسی دشمن کی تلوار تو تیری گردن تک نہ پہنچ سکی مگر بے پروائی کے سحر سے تو خود لاش مارک آہستہ آہستہ کاٹا رہا۔ تیری جان پر بھی تیرا حق تھا لیکن تو نے وہ حق ادا نہیں کیا۔“

ہزار فوج نواب ارکاٹ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی۔ پھر شجاعت خان سے کہا۔

”تو بھی رات بھر کا جاگا ہوا ہے، اس لئے آرام کر۔ میں بھی کچھ دیر آرام کروں گا۔“

شجاعت خان کمرے سے نکل کر جانے لگا تو روک کر کہا۔ ”اہل وفا کا یہاں بہت قلعہ ہے کوئی بھی صورت ہو، شیو کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ میرے بغیر وہ بالکل اکیلا رہ جائے گا۔“

شجاعت خان روتا ہوا کمرے سے نکل گیا مگر دروازے پر کھڑا رہا۔

کچھ دیر تک اندر سے درد شریف پڑھنے کی آوازیں آتی رہیں، پھر یکایک خاموشی چو گئی۔ شجاعت خان گھبرا کر اندر داخل ہوا۔ والی میسور خاموش تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اس طرح بندھے ہوئے تھے جیسے وہ بستر پر لیٹے لیٹے نماز ادا کر رہا ہے۔

شجاعت خان کچھ دیر تک حیدر علی کے قریب کھڑا رہا۔ مگر جب والی میسور کے جسم اور ہونٹوں کو کوئی جنبش نہیں ہوئی تو شجاعت خان نے آواز دی۔

”نواب بہادر!“

جواب میں کوئی آواز نہیں ابھری۔ ساٹھ سال تک خونی موسموں سے لڑتے لڑتے گوشت پوست کی یہ چٹان ریزہ ریزہ ہو چکی تھی اور نواب حیدر علی خان بہادر اس طرح دنیا سے چلاؤ کہ سارے دوست، غمگسار اور تیاردار دیکھتے ہی رہ گئے۔

شجاعت خان نے حیدر علی کو چھو کر دیکھا۔ جسم سرد ہو چکا تھا۔ پھر اس نے والی میسور آہستہ سے جھنجھوڑا۔ شجاعت خان کا خیال تھا کہ کہیں بیماری کی شدت سے نواب بے ہوش نہ گیا ہو۔ میسور کے نائب سپہ سالار نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ پھر جب والی میسور کے جسم کو جنبش نہ ہوئی تو شجاعت خان کے منہ سے دہلی دہلی چیخ نکلی اور اس نے شدید عالم اضطراب میں حیدر علی کے سینے پر سر رکھ دیا۔

”میرا باپ..... میرا سردار..... میرا آقا.....“ پچاس سالہ شجاعت خان کسی بچے کی طرح سک رہا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ جینجیں مار کر اپنے سینے کی آگ کو آنسوؤں کی بارش بجھا دے۔ مگر شجاعت خان ایسا نہ کر سکا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت ریاست میسور نازک ترین صورت حال سے دوچار ہے۔ انگریز پائیس گھاٹ اور حیدر نگر پر قابض ہو چکے تھے۔ اس علاوہ جگہ جگہ بناوٹیں پھوٹ پڑی تھیں۔ ایسی سنگین فضا میں نواب حیدر علی کی موت کی خبر ما ہونے سے دشمنوں اور ریاست کے غداروں کو کئی زندگی مل جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ شجاعت خان حیدر علی کے سینے پر سر رکھے بہت دیر تک سسکتا رہا۔ پھر جب کسی حد تک اس کے دل کا غم دھل گیا تو وہ نواب کے خیمے سے باہر آیا۔ مسلح محافظوں نے اسے دیکھ کر احتراماً سر جھکا لیا۔

”میرے قریب آؤ!“ شجاعت خان کی تیز سرگوشی ابھری۔

مسلم سپاہیوں نے چونک کر شجاعت خان کی سرخ آنکھوں اور بچھے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پھر وہ جھجکتے ہوئے نائب سپہ سالار کے قریب آ گئے۔

مہلی کیدان اور شجاعت خان اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔ انتہائی کوشش کے باوجود کریم نے اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔  
بھائی کی یہ حالت دیکھ کر ٹیپو بھی گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

”کیا بات ہے برادر عزیز! تم رو کیوں رہے ہو؟“ ٹیپو نے چھوٹے بھائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پریشان لہجے میں پوچھا۔

کریم شاہ جواب دینے کے بجائے ٹیپو سے لپٹ کر رونے لگا۔

محمد علی کیدان اور شجاعت خان بھی منہ پھیر کر رونے لگے۔

”م لوگ بولنے کیوں نہیں؟“ ٹیپو جھنجھلا گیا۔ ”کیا حادثہ پیش آ گیا ہے کہ تمہاری زبانیں خاموش ہیں اور آنکھیں اشک برسا رہی ہیں؟“

”برادر معظم! نواب بہادر..... اس دنیا میں..... نہیں رہے۔“ ٹیپو کے کئی بار استغفار کرنے پر شہزادہ کریم نے اس طرح رک رک کر کہا جیسے اس کی آواز حلق میں گھٹی جا رہی ہو۔

یہ جانگذا خبر سن کر کچھ دیر کے لئے ٹیپو سلطان کو سکتے سا ہو گیا۔ شدت غم سے ولی عہد سلطنت کا گرد آلود چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ پھر بڑے کرب ناک لہجے میں شجاعت خان اور محمد علی کیدان سے مخاطب ہوا۔ ”بابا محترم چلے گئے؟..... مجھے تو خط میں یہ لکھا تھا کہ میں اپنے چہرے کی ایک بجک سے ان کی آنکھوں کو روشن کروں۔ مگر پھر خود ہی مجھ سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر لی۔ اب یہ چہرہ کسے دکھاؤں؟“ ٹیپو کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی۔ حیدر علی نے بیٹے کو اپنی باری سے قطعاً بے خبر رکھا تھا، اس لئے والی میسور کی موت کی خبر ٹیپو کے دل و دماغ کو زیر و زور کر گئی تھی۔ شجاعت خان نے فوراً ہی آگے بڑھ کر ولی عہد سلطنت کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔

”شہزادے! نواب بہادر کو آپ سے بڑی اُمیدیں تھیں۔“ شجاعت خان اسے بڑے عجب انداز سے تسلیاں دے رہا تھا۔ ”نواب بہادر آخری لمحات میں مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ میرا بہادر بیٹا ٹیپو، باپ کی جدائی کے صدمے کو بھی برداشت کر لے گا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے آنسو میری اٹھائی ہوئی دیواروں کو ڈھا دیں گے۔“

”ہو سکتا ہے کہ میرے کمزور ہاتھ، نواب بہادر کی اٹھائی ہوئی دیواروں کو پچالیس مگر میں خود کئی دیوار کے سائے میں بیٹھوں گا؟“ ٹیپو کی آنکھیں شفق رنگ ہو گئی تھیں اور آواز میں گہرا لرغائ تھا۔ ”میری دیوار تو اس طرح گر گئی کہ اب اسے کوئی تعمیر نہیں کر سکتا۔“

”یہی اللہ کی مرضی ہے شہزادے! اور یہی رسم زمانہ ہے۔“ شجاعت خان زوئیے بدل بدل کر ٹیپو کو سمجھا رہا تھا۔

پھر ولی عہد سلطنت محل جانے کے بجائے سیدھا حیدر علی کی قبر پر پہنچا۔ جس نے بڑے شہسازوں کے رخ موڑ دیئے تھے، آج وہی موت کے نادیہ ہاتھوں سے شکست کھا کر مٹی

اماں کی بات ہنسی میں ٹالنے والے! اب دیکھ کہ زندگی بھر کے لئے آنسو ہی ہمارا مقدر ہیں۔“ مجیدہ بیگم کے ہونٹوں سے شور ماتم بلند نہیں ہوا مگر ان کی آنکھوں سے اشکوں کا ایک سیلاب جاری تھا، جو حیدر علی کی پیشانی اور چہرے کو بھگوتا رہا۔

پھر جب غم زدہ ماں کی حالت کچھ سنبھلی تو وہ نیم جاں بہو کی طرف متوجہ ہوئیں۔ شوہر کی موت کی خبر سن کر فاطمہ بیگم کو سکتے ہو گیا تھا۔ ملکہ میسور کی یہ حالت بہت دیر تک جاری رہی۔ خدشہ تھا کہ کہیں وہ اپنا ذہنی توازن نہ کھو بیٹھیں۔ حرم سرا کی دوسری خواتین نے انہیں والی میسور کی زندگی کی بہت سی باتیں یاد دلائیں۔ آخر فاطمہ بیگم کی اس خوف ناک حالت میں تبدیلی آئی۔ پھر وہ ”نواب بہادر!“ کہہ کر شوہر کی لاش سے لپٹ گئیں۔

پھر اسی روز آہوں، سسکیوں اور چیخوں کے شور میں نواب حیدر علی کو گنبد میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ٹیپو سلطان کے سرنگا پٹم پہنچنے میں ابھی دیر تھی، اس لئے شہزادہ کریم شاہ کو امور سلطنت کا نگران مقرر کر دیا گیا۔

”میں برادر معظم کی موجودگی میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ باپ کی موت کے صدمے سے شہزادہ کریم شاہ غڈ حال نظر آ رہا تھا۔

”یہ عارضی انتظام ہے شہزادے!“ محمد علی کیدان نے کریم شاہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ملک کو کسی سربراہ یا منتظم کے بغیر ایک لمحے کے لئے بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔“



ٹیپو سلطان نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ طویل فاصلہ طے کیا مگر پھر بھی ملابار سے سرنگا پٹم پہنچنے میں پانچ چھ دن صرف ہو گئے۔

ولی عہد سلطنت کا خیال تھا کہ نواب بہادر نے کوئی نیا محاذ جنگ کھول دیا ہے، اس لئے فوری طور پر اسے طلب کیا گیا ہے۔ مگر جب وہ سرنگا پٹم کے نواح میں داخل ہوا تو اسے فضاؤں میں عجیب سی ویرانی محسوس ہوئی۔ دیہاتی باشندے خاموش اور اُداس نظر آ رہے تھے۔ ٹیپو نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔ محمد علی کیدان اور شجاعت خان نے سرنگا پٹم سے کئی میل کے فاصلے تک اپنے جاسوس مقرر کر دیئے تھے اور انہیں تاکید کر دی گئی تھی کہ جیسے ہی ٹیپو سلطان کی آمد کے آثار نظر آئیں، بلا تاخیر اطلاع دی جائے۔ پھر جیسے ہی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں ابھریں اور سپاہیوں کا ہجوم دارالحکومت کی طرف بڑھتا دکھائی دیا، جاسوس شہسوار علی کی طرف دوڑ پڑے۔

دوسرے ہی لمحے محمد علی کیدان، شجاعت خان، شہزادہ کریم شاہ اور کچھ سپاہی محل سے نکل کر اس شاہراہ کی طرف روانہ ہو گئے، جدھر سے گزر کر ٹیپو سلطان دارالحکومت پہنچنے والا تھا۔ دونوں بھائیوں کا آمناسا منشا شہر پناہ کے دروازے پر ہوا۔ ٹیپو کو دیکھتے ہی شہزادہ کریم شاہ،



علمِ سلطانی کے مطابق انہیں اندر آنے سے روک رہے ہیں۔  
سریتا کا نام سن کر ٹیپو چونک اٹھا۔ وہ نواب حیدر علی کے انتقال پر ٹیپو سے تعزیت کرنے آئی تھی اور پھر چند روز قبل میں گزار کر سید صاحب کی قبر کی نگرانی کے لئے واپس چلی گئی تھی۔ ”اب وہ کیوں آئی ہے؟“ سلطان کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر اس نے محافطوں کو اشارہ کر دیا کہ سریتا کو دربار میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے۔

سریتا دیوی بڑے بے نیازانہ انداز میں داخل ہوئی اور حاضرینِ دربار کی طویل قطاروں کے نزدیک سے گزرتی ہوئی تختِ سلطانی تک پہنچ گئی۔ اکثر امراء اور درباری، سریتا دیوی سے بخوبی واقف تھے مگر میر صادق علی اس خوب صورت دوشیزہ سے نا آشنا تھا۔ سرنگاپٹم آنے کے بعد اس نے پہلی بار سریتا کو دیکھا تھا۔ میر صادق علی فطرتاً ادباً تھا، اس لئے سریتا کے حسن نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا۔ وہ چلیں چپکائے بغیر اس لڑکی کو دیکھتا رہا جو اپنے لباس کے اعتبار سے جو گن نظر آ رہی تھی۔

”تم یہاں کیوں آئیں سریتا؟“ ٹیپو سلطان نے محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”اگر کوئی ضروری کام تھا تو مجھ تک پیغام پہنچا دیا ہوتا۔ میں خود چلا آتا۔“

میر صادق علی نے چونک کر اپنے فرمانروا کی طرف دیکھا۔ وہ ٹیپو اور سریتا کے رشتے سے بے خبر تھا اس لئے یہی سمجھا کہ فرمانروائے میسور اس خوبصورت جوگن پر بہت زیادہ مہربان ہے۔ میر صادق کی غلیظ ذہنیت اسے یہی باور کرا رہی تھی کہ فرمانروائے میسور اور سریتا کا دینی تعلق ہے جو ایک حکمران اور ایک خوب صورت کینز کے درمیان ہوتا ہے۔

”تمہیں کھور! آج کے دن میرا آنا بہت ضروری تھا۔“ سریتا دیوی نے باوقار لہجے میں کہا۔ ”معاف کرنا، اب تم کنور سے سمرات ہو گئے ہو۔“ سریتا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بچپن سے ٹیپو کو کنور ہی کہتی آئی تھی، اس لئے اس کی زبان یہی ایک لفظ ادا کرنے کی عادی تھی۔ پھر اسے خیال آیا تو وہ لہجہ بدل کر بولی۔ ”سمرات! تمہیں یہ سنگھاس مبارک ہو۔“

”میں تمہاری مبارکباد کے لئے بہت مشکور ہوں سریتا!“ ٹیپو کے لہجے میں وہی اپنائیت تھی، جس کا احساس کر کے میر صادق علی کے ذہن میں مسلسل ناپاک خیالات ابھر رہے تھے۔

”مجھے ریاست کے دستور کے مطابق سمرات کو کنور بھی پیش کرنی تھی، اس لئے دربار تک آئی ہوں۔“ سریتا نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری مبارکباد ہی میرے لئے سب سے قیمتی نذر ہے۔“ ٹیپو سلطان نے اس لڑکی کا دل رکھنے کے لئے کہا جسے ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں تھی۔

”اب میں اتنی غریب بھی نہیں ہوں سمرات!“ سریتا دیوی مسکرانے لگی۔ ”بظاہر میں مردہین (غریب) ہوں اور میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں مگر اس وقت مجھے جو کچھ میسر ہے، اس کی قیمت سلطان کا سارا خزانہ بھی نہیں۔“

کے ڈھیر کے نیچے بے حس و حرکت پڑا تھا۔  
ٹیپو نے باپ کے پیروں کی سمت کھڑے ہو کر والی میسور کو فوجی انداز میں سلامی دی۔ پھر آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل جھک کر قبر پر سر رکھ دیا۔  
”بابا! خدا آپ پر اپنی رحمتیں نازل کرے اور انہیں صبر دے جو آپ کے فراق میں غم جان نظر آ رہے ہیں۔“



اگرچہ ٹیپو سلطان نے حکم جاری کر دیا تھا کہ کوئی شخص بھی نواب حیدر علی کی قبر کے نزدیک گریہ و زاری نہ کرے لیکن پھر بھی والی میسور کے مرقد پر ماتم کرنے والوں کا ایک میلہ سا راکھ رہتا تھا۔ رونے والوں میں زیادہ تر بیوہ اور لاوارث عورتیں تھیں یا مجبور و مفلس بوڑھے۔ یہ وہ لوگ تھے، جن کے خفیہ طور پر حیدر علی نے وظیفہ مقرر کر رکھے تھے اور جنہیں ہر مہینے ایک مخصوص رقم گھر بیٹھے مل جاتی تھی۔ اب وہی نادار اور بے سہارا لوگ اپنی بد قسمتی کا ماتم کر رہے تھے۔  
”ہم کہاں جائیں کہ ہماری خبر گیری کرنے والا دنیا سے چلا گیا۔“

ٹیپو سلطان کو خبر ہوئی تو وہ خود باپ کی قبر پر آیا اور ماتم گساروں سے ان کا حال پوچھا۔ اس کے بعد میسور کے نئے فرمانروا نے ان غم زدہ انسانوں کے نام باقاعدہ ضرورت مندوں کے دفتر میں درج کرائے اور ہر شخص سے پوچھ پوچھ کر وہی وظیفہ جاری کر دیا جو اسے نواب حیدر علی کی زندگی میں ملتا تھا۔

شہزادہ کریم شاہ نے اسی دن حکومت کے سارے اختیارات بڑے بھائی کو منتقل کر دیئے تھے، جس روز ٹیپو سلطان نے سرنگاپٹم کی زمین پر قدم رکھا تھا۔ حیدر علی کے انتقال کے تیس روز بعد ٹیپو سلطان نے تاج پہنا اور اس کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔

تخت نشینی کی رسم کے بعد امراء نے سلطنت نے ٹیپو سلطان کی خدمت میں قیمتی نذریں پیش کیں۔ اسی تقریب کے دوران سریتا بھی راج محل پہنچی اور جب وہ دربارِ عام میں داخل ہونے لگی تو پہریداروں نے اسے روک دیا۔

”میں فرمانروائے میسور کو مبارکباد دینے آئی ہوں۔ تم مجھے روکنے والے کون ہو؟“ سریتا دیوی نے بلند آواز میں کہا۔

”کوئی عورت دربار میں داخل نہیں ہو سکتی۔ یہی سلطان کا حکم ہے۔“ پہریداروں نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔

”سلطان کو خبر کرو کہ سریتا نذر پیش کرنے آئی ہے۔“  
پہریداروں نے اسے پھر بھی اندر جانے نہیں دیا اور تکرار یہاں تک بڑھی کہ دربار میں بھی ان آوازوں کا شور مچنے لگا۔ ٹیپو سلطان نے دربار کے اندر موجود محافطوں سے کہا کہ وہ اس شور کا سبب معلوم کریں۔ محافطوں نے واپس آ کر بتایا کہ سریتا دیوی اندر آنا چاہتی ہیں اور پہریدار

حرائے زندگی میں تازہ دم رہیں گے۔ جب ماحول کی کثافت آپ کے دل و دماغ کو پرانگندہ کر دے گی تو اس چادر کی مہک سے آپ گھگھتے و شاداب ہو جائیں گے۔ اس میں سید صاحب کے جسم کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ شہزادگی اور طالب علمی کا زمانہ کچھ اور تھا۔ اب آپ خود مختار ہنگامہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب مسند انصاف پر بیٹھ کر انسانی تقدیروں کے فیصلے کریں گے تو یہ ہمارے آپ کو احساس دلانے کی کہ آپ کون ہیں اور کس محترم ہستی سے آپ کو نسبت ہے۔“

سریتا کی گفتگو سن کر ٹیپو سلطان سر دربار روئے لگا۔ پھر اس نے سریتا کے ہاتھ سے معمولی مٹی کی کپڑے کی چادر لے کر اپنے شانوں پر ڈال لی۔

”مجھ میری خلعت فاخرہ ہے اور یہی میری متائے زرنگار ہے۔ دنیا کا کوئی لباس اس بار سے زیادہ قیمتی نہیں کہ اس کپڑے نے ایک عالم کے جسم کو کس کیا ہے اور ایک ولی کے بدن کو بچوا ہے۔ میرے میا، میرے رہنما اور میرے استاد کی نشانی۔“

میر صادق علی اور دوسرے امراء سلطنت کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ ان کے خیال میں لڑکی کے بے وقت آمد نے جشن تاجپوشی کی ساری رعنائیاں چھین لی تھیں۔ وہ تیس سالہ ٹیپو کو اپنے مٹی پرستانہ مزاج کے ششے میں اُتارنے کی کوشش کر رہے تھے اور سریتا دیوی، فرمانروائے میسور کو کچھ کراس مکتب کی فضاؤں میں واپس لے گئی تھی، جہاں ٹیپو شکستہ چٹائیوں کے فرش پر بیٹھ کر ہر اکرام بخاری سے درس لیا کرتا تھا۔ میر صادق علی اور دوسرے وزراء کو سلطان کی یہ اداسی دیکھ کر اُلٹی کئی کہ وہ اس طرح علی الاعلان ان کی پیش کردہ نذروں پر ایک معمولی چادر کو ترجیح دے گا۔

نذرین چادر دیوی کی وجہ سے دنیا پرست امیروں اور وزیروں کی طبیعت مکدر ہو گئی تھیں۔

پھر جب سریتا دیوی اسی شان بے نیازی کے ساتھ واپس جانے لگی تو میر صادق علی نے اُٹھ کر جانب جھک کر نائب میر غلام علی لنگڑے سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”اس لڑکی کے بارے میں تحقیق کرو کہ یہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔“

میر غلام علی لنگڑے نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک معنی



زیرکراہٹ ابھر آئی۔

جشن تاجپوشی کے دن ہی ٹیپو سلطان نے ریاست میسور کا نام بدل کر ”سلطنتِ خداداد“ لکھ دیا تھا۔ بعض امراء نے تبدیلی نام کا سبب پوچھا تو ٹیپو نے برجستہ جواب دیا۔

”صرف اہالیانِ میسور ہی نہیں، تمام ہندوستان بھی یہ بات جانتا ہے کہ میں نواب حیدر علی کو بنیاد پرورد ہوں۔ مگر میرا باپ سلطان ابن سلطان نہیں تھا۔ میرا خاندان جفاکشوں اور سپاہیوں کو بے گناہ قتل کرتا تھا۔ یہ میرے اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اپنے ایک عاجز بندے کے سر پر تاج زرنگار بٹایا اور مجھے کو یہ قیمتی تخت عطا فرمایا۔ نہ میرا کوئی ملازم ہے اور نہ خدمت گار۔ تم سب میرے

سریتا کے اس انکشاف پر ٹیپو سلطان کے ساتھ حاضرین دربار بھی چونک اُٹھے۔ میر صادق علی حیرت زدہ تھا کہ ایک معمولی سی لڑکی آخر سلطان کی بارگاہ میں اتنی بے تکلف کیوں ہے؟

ٹیپو سلطان سر سے پاؤں تک ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ پھر فرمانروائے میسور اور دربار کے سکوت کو سریتا دیوی کی بلند آواز نے توڑ دیا۔ اس نے بغل میں دبا ہوا سفید رنگ کا کپڑا نکالا اور سلطان ٹیپو کی طرف بڑھا دیا۔ ”سمرات! یہ آپ کی نذر ہے۔“

ٹیپو اور سریتا کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا اس لئے ایک خدمت گار آگے بڑھتا کہ وہ سریتا کے ہاتھ سے کپڑا لے کر سلطان کے حضور میں پیش کر سکے۔

”نہیں!“ سریتا دیوی نے ہاتھ کے اشارے سے سلطان کے خدمت گار کو روک دیا۔

”سمرات! یہ وہ نذر نہیں ہے کہ جسے آپ کے سوا کوئی دوسرا شخص چھو بھی سکے۔“

ایک بار پھر دربار پر گہرا سناٹا چھا گیا۔

ٹیپو سلطان اپنی مسند زرنگار سے اٹھا اور تخت کے کنارے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اب اس کے اور سریتا دیوی کے درمیان برائے نام فاصلہ تھا۔ ٹیپو نے ہاتھ بڑھایا تو سریتا بے اختیار بول اُٹھی۔

”سمرات! اگر آپ اس نذر کے احترام میں تخت سے نیچے اُتر آئیں تو بہتر ہے۔ ورنہ آپ صاحب اختیار ہیں۔“

میر صادق علی کے دماغ میں خیالات کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کو ایک حکمران کے دربار میں اتنا بے باک نہیں دیکھا تھا۔

ٹیپو سلطان پر شدید حیرت کا غلبہ تھا مگر اس کے باوجود وہ تخت سے نیچے اُتر آیا۔

”یہ میرے روحانی باپ کی چادر ہے جسے وہ استعمال کیا کرتے تھے۔“ سریتا دیوی نے سفید کپڑا فرمانروائے میسور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک موقع پر سید صاحب سے یہ چادر مانگ لی تھی کہ آخر ان کی کوئی نشانی تو میرے پاس رہے۔“

ٹیپو سنائے میں آ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سریتا اسے ایسی عجیب و غریب نذر پیش کرے گی۔ میر صادق علی بھی حیرانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ یہ سید صاحب کون تھے اور اس چادر میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ اسے سلطان کے سارے خزانے سے قیمتی سمجھا جا رہا ہے۔

”پھر تم مجھے اپنے روحانی باپ کی نشانی کیوں دے رہی ہو؟“ ٹیپو کا بڑا ہوا ہاتھ رک گیا۔

”میں نے سوچا تھا کہ اس چادر کو اپنا کفن بناؤں گی۔“ یکایک سریتا کا لہجہ انتہائی برسر ہو گیا تھا۔ ”مگر پھر خیال آیا کہ آپ کو مجھ سے زیادہ اس چادر کی ضرورت ہے۔ وہ آپ کے بھی

استاد گرامی تھے۔

ٹیپو بھی اداس نظر آنے لگا۔ ”تم نے سچ کہا سریتا۔“

”سمرات! آپ کے سر پر مسال کی کڑی دھوپ ہے۔“ سریتا فرمانروائے میسور کو عجیب انداز سے نصیحت کر رہی تھی۔ ”یہ چادر سورج کی تیش کو تو زور نہیں کر سکتی مگر اسے اوڑھ کر آپ

ہوگا۔ میری زبان پس پردہ بھی اس کے خلاف کوئی لفظ نہیں کہے گی۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو میرا خدا الہ وقت مجھ سے میری زبان چھین لے۔ میرے کان کبھی اس کے خلاف ایک حرف بھی نہیں سن سکیں گے اور اگر کبھی ایسا ہو تو میرا خدا مجھے میری سماعت سے محروم کر دے۔ میرے ہاتھ ہڈی اس کی برتری اور بھلائی کے لئے کوشاں رہیں گے اور اگر کبھی میں اپنے عہد سے روگردانی کروں تو میرا خدا میرے ہاتھوں کو مفلوج بنا دے یا پھر انہیں اپنی شمشیر غیبی سے قطع کر دے۔ اور میں یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ اپنے آقا کے خلاف دیکھوں گا، اسے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سلطان کے حضور بیان کر دوں گا۔ اگر خدا خواستہ مجھ سے اس عہد نامے کی خلاف ورزی ہو جائے یا میری اطاعت میں فرق آجائے تو میں خدائے برتر و توانا کو جس کا ایک نام ”منتقم“ بھی ہے، حاضر و ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے غضب میں پکڑے اور تباہ کر ڈالے۔“

جیسے ہی میرا صادق علی کا حلفیہ بیان ختم ہوا، ٹیپو سلطان شدت جذبات سے مضطرب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ٹیپو نے اپنی ولی عہدی کے دور میں نواب حیدر علی کے روبرو بہت سے دزیریوں اور ہدیدا روں کو حلف اٹھاتے دیکھا تھا مگر میرا صادق علی کا انداز سب سے جداگانہ تھا۔

”مرحبا، میرا صادق علی!..... آفرین، سلطنتِ خداداد کے وزیرِ اعظم!“ جوشِ مسرت سے ٹیپو کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”مجھے اس اہم ترین منصب کے لئے ایک ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو ہر وقت اپنے خدا کو حاضر و ناظر سمجھتا رہے۔“ یہ کہہ کر ٹیپو سلطان نے اپنا قیمتی ہار، میرا صادق علی کو پہنا دیا۔

شجاعت خان کو ذاتی طور پر میرا صادق علی پسند نہیں تھا، اس لئے وہ اپنی نشست پر بیٹھا پلو بدلتا رہا۔ ٹیپو کی طرف سے میرا صادق کی اس قدر انفرادی کا یہ انداز شجاعت خان کو پسند نہیں آیا تھا۔

پیرسالار محمد علی کیدان ان سب سے زیادہ اذیت میں مبتلا تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ نواب حیدر علی کا چند روزہ ملازم اچانک ترقی کر کے وزارتِ عظمیٰ کے اہم ترین منصب تک پہنچ جائے۔ محمد علی کیدان بظاہر خاموش تھا مگر اس کی آنکھوں سے ناپسندیدگی کے گہرے لہجے نمایاں تھے اور کشادہ پیشانی ٹکٹوں سے بھری ہوئی تھی۔

میرا صادق کا نائب میر غلام علی لنگڑا بڑی ہوشیاری کے ساتھ حاضرین دربار کے تاثرات کا بازو لے رہا تھا۔ شجاعت خان کی ناگواری اس کی عیار نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ اور ہر اُن کی فریب کار نگاہیں مستقل کیدان کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔

”یہی سلطنتِ خداداد کا سب سے خطرناک آدمی ہے،“ میر غلام علی لنگڑا سوچ رہا تھا۔ ”اسے بہت جلد راستے سے ہٹانا ہوگا۔“

میرا صادق علی کے بعد نقیب نے پورنیا کا نام پکارا اور پھر کرشن راؤ کے تربیت یافتہ اس عیار خدا کو سلطنتِ خداداد کا وزیرِ مالیات بنا دیا جو وزارتِ عظمیٰ کے بعد دوسرا اہم ترین عہدہ تھا۔

دنیا کے ہر قانون پر برتری حاصل ہو۔ میں اپنے عوام کی خوش حالی اور آبرو و مندانہ زندگی کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہوں گا۔ میری مملکت میں نہ کوئی رات کو بھوکا سوئے گا اور نہ ہی کسی کا پیرہن آبرو چاک ہوگا۔ سلطنتِ خداداد میں کوئی کتنا ہی عالی نسب اور ذی وقار کیوں نہ ہو۔۔۔ اور کوئی کتنا ہی کمتر اور مفلس و نادار کیوں نہ ہو، میری عدالت میں دونوں برابر ٹھہریں گے۔ مجرم ہر حال میں مجرم ہے اور بے گناہ ہر حال میں بے گناہ ہے۔ کوئی مجرم اس لئے معاف نہیں کیا جائے گا کہ وہ با اثر ہے اور کوئی بے گناہ اس لئے سزا کا مستحق نہیں ٹھہرے گا کہ وہ کروڑ و ناواں ہے اور اس کا سفارش کرنے والا کوئی نہیں۔ غریب میرے دوست ہیں اور میں ان کا دوست ہوں۔ ہر فریادی کو اجازت ہے کہ وہ بلا تکلف محل میں چلا آئے۔ اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اگر محل کے محافظوں یا اراکینِ سلطنت نے میرے اور مظلوموں کے درمیان فاصلوں کی دیوار کھڑی کی تو پھر وہ اپنے عہدہ و منصب پر برقرار نہیں رہیں گے اور اس مملکت کی زمین ان پر تنگ ہو جائے گی۔“

ٹیپو سلطان نے مختصر الفاظ میں اپنی سلطنت کا دستور بیان کر دیا تھا جسے سن کر اکثر امراء کے چہرے بچھ گئے تھے۔

میرا صادق علی نے بہت غور سے ٹیپو سلطان کی تقریر سنی تھی اور اس کے چہرے پر کی رنگ آ کر گزر گئے تھے۔

اسی روز مملکت کے تمام ناظموں، قلعہ داروں اور فوجی سرداروں کے نام احکامات جاری کئے گئے کہ جو جہاں ہے، وہ اپنا فرض منصبی نہایت خوبی اور اطمینان سے ادا کرتا رہے۔

اس کے ساتھ ہی میرا صادق علی کو وزیرِ اعظم اور پورنیا کو وزیرِ مالیات مقرر کیا گیا۔ میرا صادق، دکن کے ایک وزیر اور نظام علی خان کے مصاحب خاص میر عالم کا رشتے کا بھائی تھا مگر ٹیپو سلطان کو اس بات کی خبر نہیں تھی۔ اراکات پر قبضہ ہونے کے بعد میرا صادق، نواب حیدر علی کی ملازمت میں آگیا اور خود کو علی الاعلان والی میسرور کا غلام کہا کرتا تھا۔ حیدر علی اس کے ریاکارانہ اور خوشامدہ عمل سے دھوکا کھا گیا اور اسے مسلسل ترقی دیتا رہا۔ میرا صادق جانتا تھا کہ ٹیپو سلطان ایک مذہبی نوجوان ہے، اس لئے وہ ٹیپو کے سامنے بات بات پر قرآن کی قسم کھاتا تھا۔ اور اُس کے اسی انداز نے ٹیپو کو یہاں تک متاثر کیا کہ وہ میرا صادق علی کو سلطنتِ خداداد کا وزیرِ اعظم بنانے پر مجبور ہو گیا۔

میرا صادق نے اپنی شخصیت کو مزید نمایاں کرنے کے لئے عجیب انداز میں حلف اٹھا تھا۔ ”میں میرا صادق علی، سلطنتِ خداداد کا ملازم و نمک خوار، اپنے پروردگار اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کلام اللہ کو حاضر و ناظر اور شاہد سمجھ کر اور خدا کی قسم کھاتے ہوئے صدقِ دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میں نہایت وفاداری کے ساتھ اپنے آقا سلطان کی اطاعت کروں گا اور دنیا کی ہر چیز پر حکم سلطانی کو مقدم سمجھوں گا۔ میرا دل کبھی سلطان کی اطاعت کی طرف سے منحرف نہیں

عانی علی ایک بد دیانت اور ہوس پرست انسان ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بھی کھیت کے خواب دیکھے ہیں آپ میرا صادق کی طرف توجہ دیجئے۔ وہ ہمارے لئے بڑا کام کا آئی ہے۔“

”میرا صادق مذہباً مسلمان ہے۔ وہ ہمارے کیا کام آ سکتا ہے؟“ رانی دیواجی منی نے

بال کیا۔

ایک بد دیانت اور حریص انسان کا مذہب ہی کیا؟“ پورنیا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ درغلا یا جا سکتا ہے۔“ اس کے بعد پورنیا نے ہور کی رائیوں کے سامنے ایک بہت پیچیدہ منصوبہ پیش کیا۔ ”چھ سات ایسی خوب صورت لڑکیاں کا انتخاب کیا جائے جن کے خدو خال پارا سرمدوں کو بھی توجہ توڑ دینے پر مجبور کریں۔ یہ لڑکیاں ہندو دھرم کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔ انہیں بظاہر مسلمان بنا دیا جائے گا مگر وہ اندر سے ہندو ہی رہیں گی۔ یہ لڑکیاں مسلمان امیروں کی داشتہ بن کر رہیں یا یہاں۔ ان کا بس ایک ہی کام ہو گا کہ وہ اپنی ذہانت سے سلطنتِ خداداد کے اہم عہدیداروں کا خیال کا حال جان لیں کہ وہ لوگ حقیقی منتوں میں سلطان کے وفادار ہیں یا انہیں زیادہ بہت دے کر کوئی بھی شخص خرید سکتا ہے۔ جب ہم اراکین سلطنت کے مزاجوں سے واقف ہو جائیں گے تو پھر سوچیں گے کہ کہاں اور کس طرح آگ لگائی جا سکتی ہے۔“

کرشن راؤ اپنے نائب پورنیا کا منصوبہ سن کر اچھل پڑا اور رائیوں نے بھی وزیر خزانہ کو نرمی نظروں سے دیکھا۔

”سلطان نے وزارت خزانہ دے کر اپنی شہ رگ میرے حوالے کر دی ہے۔“ پورنیا نے ہنسنے سے کہے کہ۔ ”دولت انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں سیم و زر کی چمک سے حکومت کے بڑے بڑے اراکین کی آنکھیں خیرہ کر دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک سلطنتِ خداداد دوبالہ بھی ہو جائے مگر یہ منصوبہ آہستہ آہستہ تکمیل کے مراحل طے کرے گا۔ باقی کام آپ کی منتخب لڑکیاں کریں گی۔ وہ مسلمان امیروں کے ایمانوں کو جانچیں گی اور ان کی

رائی لکشمی، پوجا کے بہانے سے سرنگاپٹم اور قرب و جوار کے دوسرے علاقوں کے علاقوں میں گئی اور اس نے سات ایسی دیوداسیوں کا انتخاب کیا جو انتہائی حسین بھی تھیں اور

شجاعت خان کو میرا صادق علی اور پورنیا کے انتخاب پر سخت اعتراض تھا۔ ایک دن موقع ملے تو اس نے ٹیپو سلطان سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

پورنیا نے بھی میرا صادق علی کی نقل کرتے ہوئے دیوی دیوتاؤں کی قسمیں کھا کر ٹیپو سلطان کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ پھر وہ ہندوانہ رسم کے مطابق ٹیپو کے قدم چھونے کے لئے آگے بڑھا مگر سلطنتِ خداداد کے فرمانروا نے اسے سختی کے ساتھ ٹوک دیا۔

”میں آج سے احترام کے اس مظاہرے کو حرام قرار دیتا ہوں۔“ ٹیپو کے لہجے میں بڑا جلال تھا۔ ”نہ تم غلام ہو اور نہ میں غلامِ سبانی۔ اتنا مت جھکو کہ انسانیت کے درجے سے گر جاؤ۔“ نیا حکم سلطانی جاری ہوا اور ایک بار پھر دنیا پرستوں کے چہرے اتر گئے۔



نواب حیدر علی کے انتقال پر رائیاں بہت خوش تھیں مگر جب ٹیپو سلطان نے ریاست میسور کا نام بدل کر ”سلطنتِ خداداد“ رکھ دیا تو وہ کرشن راؤ اور پورنیا کے سامنے اپنے نفرت و غضب کا مظاہرہ کرنے لگیں۔

”اب ہماری منزل زیادہ قریب آگئی ہے۔“ کرشن راؤ نے شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے لکشمی کا مونہا طلب کیا۔

”میں تیری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔“ رانی لکشمی کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ ”اس لڑکے نے ہماری جاگیر کا نام تک بدل ڈالا۔ اب ہم سلطنتِ خداداد میں رہتے ہیں۔ پھر یہاں رام راؤ کیسے آئے گا؟“

”ٹیپو کے مذہبی خیالات بہت جلد اس کے امیروں کو اس سے بدظن کر دیں گے۔“ کرشن راؤ، رانی لکشمی کا کو اپنی منطق سمجھا رہا تھا۔ ”وہ اپنے باپ کی طرح سخت مزاج نہیں ہے اور کوئی حکومت سختی کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ حیدر علی بہت تجربہ کار تھا۔ لوگ اس کے خوف سے سبے ہوئے رہتے تھے۔ جب تک ٹیپو امورِ مملکت کا تجربہ حاصل کرے گا، اس وقت تک سلطنتِ خداداد کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں گی۔“ یہ کہہ کر کرشن راؤ نے ایک انتہائی کمزورہ قہقہہ لگایا۔ ”اس زمانے میں کون خدائی احکام پر عمل کرتا ہے؟ ٹیپو لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلانے لگا اور ہم اس کے خاص کارندوں کے لئے گناہوں کی شاہراہ کھول دیں گے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ منزل ہوس کے مسافر کس طرف جائیں گے؟“

”تو یہی ایک بات برسوں سے کہہ رہا ہے۔“ رانی لکشمی، کرشن راؤ کی چب زبانی سے تنگ آگئی تھی۔

”مہارانی! یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ ویسے کرشن راؤ جی درست کہتے ہیں۔“ اس بار پورنیا نے لکشمی کے سوال کا جواب دیا تھا۔ ”حیدر علی بہت زیادہ ہوشیار اور جہاندیدہ انسان تھا۔ وہ اپنے کسی کارندے پر ہزاروں آزمائشوں کے بعد بڑی مشکل سے اعتبار کرتا تھا۔ اس کے برعکس ٹیپو ایک کھلے دل کا نوجوان ہے اور اپنی نوعمری کی وجہ سے ہر شخص پر بہت جلد اعتبار کر لیا ہے۔ اس کی اسی کمزوری نے میرا صادق علی کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب تک پہنچایا ہے۔“



ہاں کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ نواب بہادر اتنی بجلت میں چلے جائیں گے۔ نہ کوئی وصیت، نہ پھر ان کا جانشین کیا کرے؟ ہر چہرے پر وفاداری کا غاڑہ ملا ہوا ہے اور ہر زبان پر افسوس کے زلزلے ہیں۔ کسے قبول کروں اور کسے جھٹلا دوں؟ کون دوست ہے اور کون دشمن؟“

نواب کے نپو کی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔

شیاعت خان بھی اپنے آقا کے ذکر پر رونے لگا۔

”مگر دنیا میں یہی تو ہوتا ہے کہ ایک حکومت کا سربراہ بوڑھا ہو کر اپنی موجودگی میں اپنے ادارت کو اقتدار منتقل کرتا ہے۔ سیاست کے اسرار و رموز سمجھاتا ہے۔ بساط کے مہروں کا رٹا ہے کہ کون کتنا باصلاحیت ہے اور کون کتنا ناکارہ ہے۔ اب مشیت الہی کی فرشتہ نے نواب بہادر کو اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کی دولت مجھے کرتے۔ اس اعتبار سے تو میں ایک مفلس حکمراں ہوں۔ میں نے زلزلے کی سی حالت میں رہنا ہے؟ کوئی لشکر کی محاذ پر پڑا ہے، کوئی فوج دارالحکومت سے دور کسی دوسرے چہرے پر زور ہے۔ میں خود تاروں کی بغاوت کو کچلے بغیر سرنگا پیٹ چلا آیا تھا۔ اب میں جانتا کہ وہاں کیا صورت حال ہے؟ مجھے بتائیے کہ میں ان ہنگامی حالات میں اور کیا کرتا؟ دربار میں سرسختی، انہیں اپنی ذہنی استعداد کے مطابق بساط حکومت پر سجایا ہے۔ اگر کوئی ملکہ ہے تو اس کا نعم البدل پیش کرو۔ خدا کی قسم! میں اپنی انا کا اسیر نہیں۔ جو خدا کے بندوں پر خدمت کرے گا، وہی میرا رفیق سفر ہوگا۔“

نپو کی گفتگوں کو شیاعت خان بے قرار ہو گیا۔ ”شہزادے! خدا تمہاری نظر کو اور وسعت دے گا۔ میں نے اپنا مشاہدہ بیان کیا مگر تمہارا دماغ مجھ سے زیادہ بہتر انداز میں سوچتا ہے۔ پھر یہ خدمت گار جہاں مناسب سمجھے گا، اپنی رائے کا اظہار ضرور کرے گا کہ میرے لئے نواب کا آخری حکم یہی تھا۔“

ابھی نپو سلطان اور شیاعت خان کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ ایک کثیر نے سریتا کی آمد پر نواب سلطان اور شیاعت خان دونوں چونک اٹھے۔

مگر جب سریتا کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے پر ہوا میاں اڑ رہی تھیں۔ کئی میل مسافت نے اس کے چہرے کو گرد آلود بنا دیا تھا۔

”خبر تو ہے؟“ نپو نے سریتا کی حالت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سہرا! آج اذان فجر کے قریب میں نے ایک لرزہ خیز خواب دیکھا ہے۔“ سریتا دیوی لپٹا پڑی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”محل کی دیواریں گر گئی ہیں اور کچھ لوگ اس آپ کے تخت کو لئے جا رہے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں ایک ایک پایہ ہے۔“ یہ کہتے ہی سریتا کی آنکھوں سے آنسو پھٹکنے لگے۔ ”ہر طرف خون کی نہریں بہہ رہی ہیں اور بے شمار نالوں میں ڈوبتے ہوئے جیج رہے ہیں۔ ہر طرف عورتوں اور بچوں کی لاشیں بکھری پڑی

”شہزادے! تمہیں میرا صادق کو اتنا بڑا عہدہ دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔ اس نے ارکاٹ کی شکست کے بعد نواب بہادر کی ملازمت اختیار کی تھی۔ والا جاہ محمد علی تمہارے مرحوم والد کا بدترین دشمن ہے۔ اب پتہ نہیں کہ میرا صادق کس ارادے سے یہاں آیا ہے۔“

”آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ کتنا دیندار شخص ہے۔ بات بات میں خدا اور رسول کا نام لیتا ہے۔“ نپو سلطان اپنے وزیر اعظم کی بھرپور وکالت کر رہا تھا۔

”بار بار قسم کھانا ہی تو اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے۔“ شیاعت خان نے کسی جھگڑے کے بغیر کہا۔ ”میرا صادق کی اسی حرکت نے تو مجھے شے میں مبتلا کیا ہے۔“

”ثبوت کے بغیر کسی مسلمان سے بدگمانی نہیں کرتے۔“ نپو سلطان نے مذہب کی بنیاد پر ایک مضبوط دلیل پیش کی جسے سن کر شیاعت خان کو اپنی گفتگو کا زاویہ بدلتا پڑا۔

”پھر آپ اسے آزمائش کی مختلف بھٹیوں میں ڈالتے رہیں۔“ شیاعت خان، نپو سلطان کو مشورہ دے رہا تھا۔ ”اگر وہ سونا ہے تو کندن بن کر نکل آئے گا ورنہ آگ اس کی ذات پر چپے ہوئے سارے رنگ اتار دے گی۔ حسن ظن اچھی چیز ہے شہزادے! مگر اس قدر بھی نہیں کہ ایک شخص، دوسرے شخص پر اندھا اعتبار کر لے اور پھر نئی نئی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے۔“

”آپ کوئی اور بات کریں محترم چچا!“ نپو سلطان نے بڑی شائستگی سے کہا۔ ”راہل وہ اس موضوع پر گفتگو سے گریز چاہتا تھا۔“

”اور یہ ہندو پورنیا، جو شراب کا رسیا ہے۔“ شیاعت خان نے سلطنتِ خدا داد کے وزیر خزانہ پر شدید تنقید چینی کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا اسے ملکی دولت کا نگہبان بنایا جا سکتا ہے؟“

”اس کا مذہب اسے شراب پینے کی اجازت دیتا ہے۔“ نپو سلطان نے پورنیا کی بارہوٹی کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر میں کون ہوتا ہوں اسے روکنے والا؟ اس طرح تو سرنگام

میں قدم قدم پر پوجا جاتی ہے۔ پھر کیا میں مندروں میں تالے ڈال دوں اور ہندوؤں کو بتوں کی پوجا سے روک دوں؟“ نپو ایک عالم و فاضل نوجوان تھا، اس لئے شیاعت خان کے ایک ایک سوال کی منطقی توجیہ پیش کر رہا تھا۔ ”ہندو مذہب کی بخشی ہوئی آزادی کے باوجود پورنیا کلمے

عام شراب نہیں پی سکتا۔ اور جہاں تک اس کی حساب دانی کا تعلق ہے تو پوری مملکت میں اس جیسا ریاضی داں کوئی دوسرا موجود نہیں۔ اگر کوئی مسلمان ہے تو اس کی نشاندہی کرو، میں اسی

وقت پورنیا کا عہدہ گھٹا دوں گا۔“

شیاعت خان لا جواب نظر آنے لگا۔

”میرے محترم چچا!“ یکا یک نپو سلطان کے لہجے سے اذیت جھٹکنے لگی تھی۔ ”میں آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے آج تک صرف جنگیں ہی لڑی ہیں اور وہ بھی نواب بہادر کی ہر کاری میں۔ مجھے امورِ مملکت میں کوئی تجربہ نہیں۔ نواب بہادر ہی جانتے تھے کہ یہاں کون

بہت سے بہت حسد رکھتے تھے۔ بالآخر ان کے دل کی ساری کدورت زبان پر آ گئی۔  
 ”ابس مولانا محترم! بس۔“ یکا یک ٹیپو سلطان کے تیور بگڑ گئے۔ ”اس زحمت کا بہت بہت  
 ٹیپو اب آپ تشریف لے جائیے۔“

مولانا احمد علی کچھ دیر تک تو سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہے، پھر تھکے تھکے قدموں سے  
 ابلیس چلے گئے۔ یہ ٹیپو کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے اپنے استاد گرامی کی شان میں گستاخی  
 کرنے والے کو بڑے حوصلے کے ساتھ برداشت کیا اور مولانا احمد علی کے احترام میں کوئی کمی  
 نہیں آنے دی۔

سریتا بھی اداس ہو گئی تھی مولانا کے جاتے ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”سرا! میرا علم تو زیادہ نہیں اور پھر میں ایک عورت ہوئی، اس لئے نامعتبر ہوں پھر بھی  
 برا خیال کہتا ہے کہ آپ کے گرد فتنہ گر، منافق اور غدار جمع ہو گئے ہیں۔ خدا کرے، ایک عورت  
 کے خواب کی تعبیر الٹی ہو۔“



تخت نشینی کی رسم کے فوراً بعد ہی ٹیپو سلطان دوبارہ محاذ جنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے اس  
 نے دو ہزار فرانسیسی سپاہیوں کا ایک دستہ انگریزوں سے معرکہ آرائی کے لئے روانہ کیا۔ اس  
 دن انگریزی فوج، جنرل اسٹیوارٹ اور جنرل لانگ کے تحت واڈی واش میں خیمہ زن تھی۔  
 فرانسیسی دستے کو روانہ کرنے کے بعد سلطان خود بھی شجاعت خان اور محمد علی کمیدان کو لے کر  
 ”ملور“ کے راستے سے واڈی واش کی طرف بڑھا اور پانچ میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہو گیا۔  
 دوسرے دن حیران کن طور پر انگریزی فوج نے اپنے خیمے اکھاڑ ڈالے اور تیز رفتاری کے  
 ساتھ مدراس کی طرف چلی گئی۔ سلطان بھی اپنی فوج کو لے کر ”ترو ترو“ کی طرف بڑھا۔  
 اسی دوران ایک برق رفتار قاصد سرنگاپٹم سے ”ترو ترو“ پہنچا اور اس نے فاطمہ بیگم کا ایک  
 قیمتی پیام سلطان کے حوالے کیا۔

سلطان ٹیپو کی والدہ نے مختصر لکھا تھا کہ رسالدار شامیا اور قلعہ دار تھارمل کر دارالحکومت پر  
 فتنہ کرنا چاہتے ہیں اور حرم سرانے سلطان کی آبرو خطرے میں ہے۔

فاطمہ بیگم کا خط پڑھ کر ٹیپو سلطان سنائے میں آ گیا۔ دشمنوں نے عجیب چال چلی تھی کہ وہ  
 لڑاکا خواتین اور بچوں کو یرغمال بنا کر دارالحکومت پر قبضہ کر لیتا چاہتے تھے۔ ٹیپو عجیب ذہنی  
 نگاہ میں مبتلا تھا۔ وہ سرنگاپٹم کو بچانے کے لئے واپس لوٹتا تو دوسرے اہم علاقوں پر دشمن  
 مسلط ہو جاتے۔ اور پھر سلطنت خدا داد لحظہ بہ لحظہ کمزور ہوتی چلی جاتی۔ مجبوراً اس نے محمد علی  
 کمیدان اور شجاعت خان کو خلوت میں طلب کر کے فاطمہ بیگم کا خط سنایا۔

دونوں جانبازوں کے چہرے غصے کی آگ میں جل اٹھے۔  
 ”شہزادے! مجھے جانے دیجئے۔“ شجاعت خان مضطرب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں اس نمک

ہیں اور سیاہ رنگ بھیڑیے ان کے جسموں کو نوچ رہے ہیں۔“

اس قدر بھیانک خواب تھا کہ جسے سن کر ٹیپو سلطان اور شجاعت خان بھی فکر مند نظر آنے  
 لگے۔

”یہ تیرے منتشر خیالات تو نہیں سریتا؟“ ٹیپو نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”تو نے اپنے  
 باپ اور دادی کی خون میں ڈوبی ہوئی لاشیں بھی دیکھی ہیں۔ پھر یہی تکلیف دہ مناظر تیرے  
 ذہن کے کسی گوشے پر نقش ہو گئے ہوں۔“ ٹیپو، سریتا کے خواب کی علی تو جیسہ پیش کر رہا تھا۔  
 ”نہیں سرا! اس حادثے کو تو زمانہ گزر گئے۔“ سریتا کے چہرے پر اب بھی خوف و  
 دہشت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ ”خدا آپ کو اور اہل شہر کو اپنی امان میں رکھے۔ میرا یہ  
 خواب بے سبب نہیں ہے سرا! کاش میں ان لوگوں کے چہرے دیکھ سکتی جو آپ کے تخت کے  
 پائے اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔“

پھر جب ٹیپو سلطان نے سریتا کی موجودگی میں ایک درباری عالم، مولانا احمد علی سے اس  
 خواب کی تعبیر پوچھی تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”سلطان معظم کو ذرا بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کہ عورت کے خواب کی تعبیر ہمیشہ  
 الٹی ہوتی ہے۔ خواب میں نظر آنے والی خون کی نہریں دودھ اور شہد کی نہروں میں تبدیل ہو  
 جائیں گی۔ تخت کے ٹکڑوں سے مراد ہے کہ سلطان کے اقتدار میں بے پناہ وسعت ہوگی اور  
 رعایا کے لئے غذا کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ لوگ پیٹ بھر کر کھائیں گے اور اجناس خوردنی اتنی  
 ارزاں ہوں گی کہ راستوں میں بکھری پڑی ہوں گی۔“

سریتا نے حیرت زدہ نظروں سے مولانا احمد علی کی طرف دیکھا۔ ”محترم بزرگ! شاید آپ  
 کو معلوم نہیں کہ میں سید اکرام بخاری کے مزار کی مجاور ہوں۔ دن رات ان کی روح کو ایصال  
 ثواب کرتی ہوں۔ میری آنکھ اس حالت میں لگی تھی کہ میرے ہونٹوں پر آیات قرآنی تھیں پھر  
 عورت کے خواب کی تعبیر کس طرح الٹی ہو سکتی ہے؟“

”صاحبزادی! کیا تم تعبیر کا علم جانتی ہو؟“ مولانا احمد علی نے ناگوار لہجے میں پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ سریتا دیوی نے ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر قیاس تو کیا جاسکتا

ہے۔“  
 ”علم میں قیاس نہیں ہوتا۔“ مولانا احمد علی نے سریتا کو جھڑک دیا۔ ”اسی قیاس آرائی نے  
 مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔ اور پھر تمہارا یہ ہندوستان لباس اور ساری دنیا میں بے پردہ گھومنا، کیا بھی  
 تمہارا اسلام ہے۔ یہ بات تو ایک جاہل شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایک ایسی عورت کے خوابوں میں  
 کتنی سچائی ہو سکتی ہے؟ پھر مزارات کیا اور ان کی مجاوری کیا؟ ایک عورت کا مجاور ہونا ہی گناہ  
 عظیم ہے۔“ مولانا احمد علی پورے جوش و خروش کے ساتھ بول رہے تھے۔ ”پھر سید اکرام بخاری  
 کہاں کے ولی یا قطب تھے؟ ہر شخص یہاں سید بنا پھرتا ہے۔“ مولانا احمد علی، سید صاحب کی

حرام قلعہ دار تو لا رام کو دیکھوں گا، جس نے اہل وفا کی پشت میں خنجر اتارنے کی کوشش کی ہے۔

ٹیپو سلطان نے شجاعت خان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ معاملہ بہت نازک تھا۔ شجاعت خان کی شدید جذباتی کیفیت کی وجہ سے بازی الٹ بھی سکتی تھی۔

”مجھے خود جانا ہو گا۔“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ٹیپو سلطان کی آواز ابھری۔ ”محمد علی! محاذ جنگ پر تم اس وقت تک میری نیا بت کرو جب تک میں سرنگا پٹم سے واپس نہ آ جاؤں۔“

”میں تو سلطان کے حکم کا پابند ہوں۔“ محمد علی کیدان کے لہجے میں وہی غلغلی اور چالاک تھی جس کے لئے وہ پوری ریاست میں مشہور تھا۔ ”میرے لئے تمام محاذ اور سارے موسم یکساں ہیں۔ مجھے لڑنا ہے، اس لئے ہر حال میں لڑوں گا۔ پھر بھی میری گزارش ہے کہ آپ اتنے معمولی سے کام کے لئے سرنگا پٹم تشریف نہ لے جائیں۔ اس بدکار، تو لا رام کو میرے حوالے کر دیجئے۔ ایک غلام کی سرزنش کے لئے اس قدر طویل سفر طے کرنا آپ کے شایان شان ہے بھی نہیں۔“

”تم اسے ایک معمولی کام سمجھتے ہو؟“ ٹیپو نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”سلطان کا اقبال بلند ہو۔“ محمد علی کیدان بھی کسی قدر جذباتی ہو گیا تھا۔ ”نواب بہادر کے ناموس کو بریغمال بننے نہیں دوں گا۔“

ٹیپو سلطان ہی نہیں، تمام مرہٹے بھی جانتے تھے کہ محمد علی، میدان جنگ میں کیسے کیسے حربے استعمال کرتا ہے اور اس کی بعض جنگی چالوں نے تو دشمن کو سرپٹے پر مجبور کر دیا تھا۔ خود ٹیپو بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ محمد علی کو سرنگا پٹم روانہ کر دے مگر معاملے کی نزاکت اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔

آخر میسور کا یہ ذہین ترین سالار، شامیا اور تو لا رام کی سازش کو ناکام بنانے کے لئے دارالحکومت روانہ ہوا۔

شامیا سلاً ایک متعصب ہندو تھا مگر اپنے چہرے پر نواب خاندان کی وفاداری کا نقاب ڈالے رہتا تھا۔ حیدر علی نے اسے ہندوؤں کی ایک مختصر سی فوج کا کمانڈر بنادیا تھا مگر آج تک یہ فوج کسی معرکے میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ حیدر علی کے مرتے ہی شامیا، میسور کی رانیوں کا آلہ کار بن گیا تھا اور پھر اس نے قلعہ دار، تو لا رام سے مل کر ایک خوفناک سازش کا منصوبہ ترتیب دیا۔ منصوبہ کچھ اس طرح تھا کہ جب ٹیپو سلطان کسی جنگ کے سلسلے میں سرنگا پٹم سے بہت دور چلا جائے اور لڑائی طول پکڑے تو لا حرم سرا کی خواتین کو بریغمال بنا کر قلعے پر قبضہ کر لیا جائے۔

پھر اس قبضے کو استحکام دینے کے لئے ہندو راجاؤں سے فوجی امداد حاصل کی جائے۔

شامیا کی یہ فتنہ گری اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ جب قلعہ دار تو لا رام نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہندو راجہ ان کی مدد کو نہ آئے اور ٹیپو سلطان نے قلعے پر حملہ کر دیا

”پھر کیا ہو گا؟“

تو لا رام کے اس سوال کے جواب میں شامیا کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

”اگر کوئی ہندو راجہ ہماری مدد کو نہ پہنچا، تب بھی ہمیں بامراد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم سلطان کے اہالیان خاندان کو اس طرح بریغمال بنالیں گے کہ ان کی زندگی ہمارے رحم و کرم پر ہوگی۔ بے شک! سلطان کی کثیر فوج دوبارہ قلعے پر قبضہ کر سکتی ہے مگر ٹیپو کو کوئی عورت، کوئی بچہ اور کوئی بوڑھا زندہ نہیں ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ سلطان اتنی لاشوں سے گزر کر قلعے کے اندر داخل نہیں ہو گا۔ بالفرض اگر چلا بھی آیا تو بھی ہماری فتح یہ ہوگی کہ ہم ٹیپو کے خاندان کا نام و نشان مٹا دیں گے اور خود بھی مٹ جائیں گے۔ اس کے بعد دیوتاؤں سے کیا ہوا عہد پورا ہو جائے گا۔“

دراصل واقعہ یہ تھا کہ شامیا نے رانیوں کے کہنے پر سری رنگ ناتھ کے مندر میں بڑے بت کے قدموں پر سر رکھ کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ سرنگا پٹم کو مسلمانوں کے غلبے سے نجات دلانے گا اور اسی عہد کی تکمیل کے لئے شامیا نے یہ خوفناک منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ قلعہ دار، تو لا رام بھی مذہبی جذبات کے زیر اثر شامیا کی باتوں میں آ گیا۔ پھر دونوں کے درمیان ساز باز ہونے لگی۔

تو لا رام اکثر شامیا کے گھر پر رات گئے تک شراب پیتا اور منصوبے کے ایک ایک پہلو پر غور کرتا۔ شامیا کی ایک نوکرانی کانسی نے اتفاق سے ان دونوں کی باتیں سن لیں اور پھر وہ خفیہ طور پر ان کے محل پہنچی اور اس نے سلطان کی والدہ، فاطمہ بیگم کو اس سازش سے باخبر کر دیا۔

فاطمہ بیگم نے کسی تاخیر کے بغیر ایک برقی رفتار قاصد کو سلطان کے پاس روانہ کیا اور ٹیپو نے شامیا کی سازش کو ناکام بنانے کے لئے اس شخص کو سرنگا پٹم بھیجا جو مرد شجاع بھی تھا اور انتہائی مہذب بھی۔

محمد علی کیدان کسی امیر وزیر کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس لئے میسور کے اکثر بڑے لوگ اس سے ناراض رہتے تھے۔ پھر جیسے ہی محمد علی کیدان اپنی فوج لے کر دارالحکومت کی طرف روانہ ہوا، بعض فوجی افسروں نے ٹیپو کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔

”محمد علی کیدان خود سر بھی ہے اور اقتدار کا بھوکا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ نواب بہادر نے اسے ایک بار اس کے عہدے سے معزول کر دیا تھا۔ وہ بہت دنوں سے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ آج سلطان نے بڑی آسانی سے محمد علی کیدان کو یہ موقع فراہم کر دیا۔ اب دارالحکومت اس کے رحم و کرم پر ہے۔“ ٹیپو کے فوجی افسر، محمد علی کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ ”وہ چاہے تو نظام علی خان والی دکن اور مرہٹوں سے مل کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر سکتا ہے۔ اب اسے روکنے والا کوئی نہیں۔“

ٹیپو سلطان کے چاروں طرف محمد علی کے خلاف کی جانے والی باتوں کا اس قدر شور تھا کہ سلطنت خدا داد کا نوعمر حکمران کچھ دیر کے لئے گھبرا سا گیا تھا۔ محمد علی کیدان، ٹیپو کی عسکری طاقت

محمد علی کیدان تیز رفتاری کے ساتھ سرنگاچم کی طرف بڑھا۔ پھر دارالحکومت کے قریب پہنچ کر اس نے مشہور کر دیا کہ وہ کورگ کے راستے حیدر نگر جا رہا ہے۔ شامیا نے محمد علی کی غیر متوقع آمد کی خبر کو بڑی حیرت کے ساتھ سنا تھا۔ مگر جب اسے معلوم ہوا کہ محمد علی، حیدر نگر کے محاذ پر جا رہا ہے تو وہ مطمئن ہو گیا۔

محمد علی نے اپنی تمام فوج کو قلعے کے اطراف میں خفیہ مقامات پر متعین کر دیا۔ پھر اس نے قلعہ دار، تولارام کے نام خط لکھا۔

”کل مجھے حیدر نگر کے مشکل ترین محاذ پر روانہ ہونا ہے۔ اس لئے ایک رات مجھے اپنے بہن بچوں کے ساتھ گزارنے کی اجازت دی جائے۔ میدان جنگ کی طرف جانے والے سپاہیوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ گھر لوٹ کر آئے گا یا اپنے ہی خون میں نہا کر رزق خاک ہو جائے گا۔“

محمد علی کیدان کا خط بہت پر اثر تھا۔ قلعہ دار، تولارام سالار میسور کی نیت پر ذرہ برابر بھی شک نہ کر سکا اور اس نے خوشی کے ساتھ محمد علی کو قلعے میں ایک رات گزارنے کی اجازت دے دی۔

محمد علی کیدان نے قلعے میں داخل ہونے سے پہلے اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں جیسے ہی بگل کی آواز سنائی دے، بلا تاخیر کمندیں لگا کر قلعے کی فصیل پر چڑھ جانا۔ اس کے بعد میرے دوسرے حکم کا انتظار کرنا۔“

سپاہیوں کو خفیہ ہدایات دینے کے بعد محمد علی کیدان اپنے پچاس منتخب سپاہیوں کے ساتھ قلعے کے دروازے پر پہنچا اور تولارام کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ تولارام نے فوراً اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ قلعے کا اندرونی دروازہ کھول دیں۔ پھر جیسے ہی دروازہ کھلا، محمد علی کے سپاہیوں نے قلعے کے محافظوں کو تہہ تیغ کر ڈالا اور خود سالار میسور نے پوری طاقت کے ساتھ فوجی بگل بجانا شروع کر دیا۔ بگل کی آواز سننے ہی محمد علی کے سپاہی اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور آنا فانا کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھ گئے۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ قلعہ دار، تولارام کو سکتہ ہو گیا۔ پھر اُسے اس وقت ہوش آیا، جب محمد علی کیدان کے سپاہی اُسے بیڑیاں پہنا رہے تھے۔

قلعے پر قابض ہونے کے بعد محمد علی کے سپاہیوں نے شامیا کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ شامیا کے بعض محافظوں نے مزاحمت کی تو ان کے کانڈھوں سے سروں کا بوجھ کم کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سازش کا سرغنہ بھاری زنجیریں پہنے قلعے کی طرف جا رہا تھا۔

دوسرے دن فاطمہ بیگم کے حکم پر قلعہ دار، تولارام اور اس سازش کے دوسرے مجرموں کو سر میدان توپ سے اڑا دیا گیا۔ فاطمہ بیگم، شامیا کو بھی دیگر غداروں کی طرح سزا دینا چاہتی تھی مگر محمد علی کے کہنے پر اُسے حوالہ زنداں کر دیا گیا۔

”سلطان معظم کی واپسی تک اس کی زندگی بہت ضروری ہے۔ اگر اسے موت کے گھاٹ

کا سب سے مضبوط ستون تھا۔ اور آج اسی ستون کے بارے میں اس کے فوجی افسر بیک زبان کہہ رہے تھے کہ وہ سب سے زیادہ کمزور اور ناقابل اعتبار ہے۔

”میں نہیں سمجھتا کہ محمد علی آزمائش کے وقت نامعتبر ثابت ہوگا۔“ آخر ٹیپو سلطان نے سخت لہجے میں اپنے فوجی افسروں کو جھلاتے ہوئے کہا ”میں نہیں سمجھتا کہ یوئے اقتدار نے اس کے دماغ کو پریشان کر دیا ہو اور وہ بغاوت کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔“

”سلطان! ابھی آپ کو اپنی بساط کے مہروں کا تجربہ نہیں۔“ فوجی افسر مسلسل ٹیپو کو درغلا رہے تھے۔ ”ابھی وقت ہے سلطان معظم! محمد علی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ اُسے واپس بلا لیجئے۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ اسے اپنی زندگی کے سب سے اہم محاذ پر اتنی آزادی کے ساتھ روانہ کر دیں۔“

ٹیپو سلطان اپنے فوجی افسروں کی گفتگو میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے محمد علی کیدان کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے خدا کے بھروسے پر محمد علی کو روانہ کیا ہے۔ ایک فرمانروا کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے جاننازوں پر شک کرے۔ میں محمد علی کے سامنے کیا تاویل پیش کروں گا کہ اسے کیوں واپس بلایا گیا ہے؟“

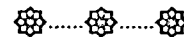
”آپ کو تاویل پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ فوجی افسر ہر حال میں محمد علی کی تحقیر پر کمر بستہ تھے۔ ”سلطان معظم خود مختار ہیں اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔“

”ایسی گمراہ کن بات مت کہو۔“ ٹیپو کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار تھا۔ ”میں اپنے اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں اور اس انسان کے سامنے بھی جو حق پر ہو۔ میں کسی ثبوت کے بغیر اپنے کسی خدمت گار سے بھی بدگمانی نہیں کر سکتا۔ محمد علی کیدان تو میرا دست راست ہے، سلطنتِ خداداد کی بنیادوں میں اس کی جاں نثاریاں بھی شامل ہیں۔“

محمد علی کے مخالفین کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ شجاعت خان درمیان میں بول اٹھا۔

”محمد علی اس وقت مرہٹوں سے ساز باز کر کے اعلیٰ ترین عہدہ اور سیم وزر کے انبار حاصل کر سکتا تھا، جب ریاست میسور چند دنوں کی مہمان نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی اس مرد جانناز نے اپنے آپ کو بے شمار خطرات میں ڈال کر وفا کی آبرورکھی۔ اگر ہمارے ذہنوں میں غبار بھر جائے اور دل تنگ ہو جائیں تو یہ الگ بات ہے۔ ورنہ سرزمین میسور ہمیشہ محمد علی کیدان کی احسان مند رہے گی۔“

ٹیپو سلطان نے ستائشی نظروں سے شجاعت خان کی طرف دیکھا، پھر جب اس نے اپنے فوجی افسروں کے تاثرات کا جائزہ لیا تو ان کے چہرے بچھے ہوئے تھے اور آنکھوں سے شجاعت خان کے لئے سخت ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔





اُتار دیا گیا تو سازش کے پس پردہ کرداروں کا سراغ کیسے ملے گا؟“

اس کے بعد مرزا اسد بیگ کو قلعہ داری کا منصب دے کر سید محمد خاں کو سرنگا پٹم کا گورنر بنا دیا گیا۔

شامیا اپنے انجام سے باخبر ہو چکا تھا، اس لئے رات کے اندھیرے میں اُس نے شررگ کاٹ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ شامیا کی موت پر میسور کی رانیوں اور کرشن راؤ نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ شامیا کے زندہ رہنے کی صورت میں انہیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ تشدد کے خوف سے اپنی زبان نہ کھول دے۔ مگر شامیا ایک انتہا پسند ہندو تھا۔ اس نے سری رنگ ناتھ کے مندر میں دیوتاؤں سے جو عہد کیا تھا، اسے اس طرح پورا کیا کہ ناکامی سے دوچار ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔ محمد علی کمیدان اُس کی لاش دیکھ کر افسوس کرنے لگا۔

”شامیا ہم سے چال چل گیا۔ ورنہ کچھ اور مجرم بھی بے نقاب ہوتے۔ خیر! خیر! کم جہاں پاک۔“

نداروں کو ٹھکانے لگانے کے بعد محمد علی کمیدان، چتند رگ کی طرف بڑھا جہاں ٹیپو سلطان اپنی فوجوں کے ساتھ خیمہ زن تھا۔



محمد علی کے جاتے ہی رانی لکشم ما اور رانی دیواجی منی نے وزیر خزانہ پورنیا کو راج محل میں طلب کر لیا۔ رانی لکشم ما نے ساتوں ہندو لڑکیوں کی تربیت مکمل کر دی تھی اور اب وہ چاہتی تھی کہ پورنیا اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچائے۔ لڑکیوں کو دیکھ کر پورنیا حیرت زدہ ہو گیا۔

”مہارانی! یہ تو آکاش سے اُتری ہوئی اپسرائیں معلوم ہوتی ہیں۔“

”اگر آکاش سے اپسرائیں نہیں آئیں گی تو پھر یہ مسلمان سردار اپنی توبہ کس طرح توڑیں گے؟“ رانی لکشم ما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پورنیا کچھ دیر تک ان لڑکیوں سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ رانی لکشم ما کی تربیت نے لڑکیوں کو اس قدر مشاق بنادیا تھا کہ وزیر خزانہ حیران رہ گیا۔

”تم اپنا لباس، تہن اور مذہب بدل کر ہندو دھرم کی اہم ترین خدمت انجام دینے کے لئے بظاہر ”نرک“ میں جا رہی ہو مگر دیوتا تمہاری قربانیوں سے خوش ہو کر عنقریب تمہیں ”سورگ“ بخشیں گے۔“ پورنیا نے ان سات لڑکیوں میں سے دو لڑکیوں کا انتخاب کیا جو نسبتاً زیادہ خوب صورت تھیں اور پھر انہیں اپنے منصوبے کی تفصیلات سمجھانے لگا۔

”تمہارا کام یہ ہے کہ تم میری صادق علی اور اس کے نائب میر غلام علی لنگڑے کے دل و دماغ پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ان دونوں کو اپنی محبت کا یقین دلاؤ۔ یہاں تک کہ وہ تم پر اعتبار کرنے لگیں۔ پھر بہت ہوشیاری سے انہیں حکومت کے خواب دکھاؤ تاکہ وہ سلطان کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو سکیں۔

ان کی اتنی تعریف کرو کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور خیالوں کی دنیا میں خود کو خدا سمجھنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی فطرتوں کا بھی اندازہ کرو کہ وہ سلطان پرست ہیں یا انہیں زیادہ قیمت دے کر خریدنا جاسکتا ہے۔“

”اس کے ساتھ ساتھ ان کی فطرتوں کا بھی اندازہ کرو کہ وہ سلطان پرست ہیں یا انہیں زیادہ قیمت دے کر خریدنا جاسکتا ہے۔“

دونوں لڑکیوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنے سروں کو جنبش دی ان لڑکیوں میں سے ایک کا نام شاملی تھا اور دوسری کا روپ متی۔

”اور آخری بات غور سے سن لو!“ پورنیا نے شاملی اور روپ متی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ دونوں تمہیں اپنی داشتہ بنانا چاہیں تو اس پر ہرگز آمادگی ظاہر نہ کرنا۔ تم دونوں ان کی بیویاں بن کر رہو گی۔ اگر تمہارے انکار کی صورت میں وہ تم پر جبر کریں گے تو میں تم دونوں کی حفاظت کے لئے ہر وقت موجود رہوں گا۔“

اس کے بعد پورنیا شاملی اور روپ متی کو لے کر اپنے مکان پر چلا گیا۔

پورنیا پہلے ہی میر صادق علی کو بخشے میں اُتار چکا تھا۔ نواب ارکاٹ والا جاہ محمد علی خود بھی ایک ادبش اور بلا نوش حکمران تھا۔ اس لئے میر صادق علی کو بھی ناشائستہ کام کی آزادی حاصل تھی۔ وہ کھلے عام شراب پیتا اور رقص کی محفلیں سجاتا تھا۔ اگر والا جاہ محمد علی سے کوئی میر صادق کی شکایت کرتا تو نواب ارکاٹ اُسے جھڑک دیتا۔

”امراء کی یہی شان ہوتی ہے۔ آخر ایک صاحبِ اقتدار اور مفلس میں کوئی تو فرق ہوتا ہے۔“

یہی وجہ تھی کہ جب ارکاٹ پر نواب حیدر علی کا قبضہ ہو گیا تھا اور والا جاہ محمد علی گرفتار ہو کر انگریزوں کی پناہ میں مدراس پہنچ گیا تھا تو اس نے والی میسور کی ملازمت قبول کرنے کے بعد اپنے ایک معتبر آدمی کے ذریعے والا جاہ محمد علی کو یہ زبانی پیغام بھیجا تھا۔

”مجھے آپ کی عنایات خسروانہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔ میں ایک دن ضرور واپس آؤں گا مگر اس طرح کہ میسور تباہ و برباد ہو جائے گا۔“

نواب حیدر علی کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد میر صادق کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میسور میں کھلے عام کیف و نشاط کی زندگی بسر نہیں کر سکے گا اس لئے وہ تہہ خانے میں چھپ کر شراب پاتا کرتا تھا۔ پھر بھی اسے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں کوئی اس کی شکایت نہ کر دے اور وہ حیدر علی کے عتاب کا شکار نہ ہو جائے۔ حیدر علی کی موت پر میر صادق نے چین کی سانس لی تھی مگر اس معاملے میں ٹیپو اپنے باپ سے بھی زیادہ سخت گیر ثابت ہوا تھا۔ میر صادق اکثر اپنے نائب، غلام علی لنگڑے سے کہا کرتا تھا۔

”میں ارکاٹ کی جنت سے نکل کر کس دوزخ میں آ گیا ہوں؟“

میر صادق علی کی اسی کمزوری سے پورنیا نے فائدہ اٹھایا۔ پورنیا کو ہندو ہونے کی حیثیت سے یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر شراب پی سکتا تھا۔ پورنیا نے میر صادق کو دیر اعظم نامزد ہونے پر مبارکباد دی اور اسی سلسلے میں اس کی پُر تکلف دعوت بھی کر

دی۔ کھانے کے بعد شراب کا دور چلا تو میر صادق نے پورنیا سے کہا۔  
 ”تیرا گھر تو جنت ہے اور میں کئی سال بعد دوزخ کی فضا سے نکل کر اپنی گم شدہ جنت میں آیا ہوں۔“  
 ”یہ تو حضور کی بندہ نوازی ہے کہ غریب کدے کو جنت سے تفسیہ دے رہے ہیں۔“ پورنیا فطرتاً بڑا جب زبان تھا۔ طویل ملازمت کے دوران اس نے فارسی زبان بھی سیکھ لی تھی اور وہ موقع کی مناسبت سے بڑی فریب کارانہ گفتگو کرتا تھا۔ ”جب آپ نے مجھ حقیر اور کمتر کو سرفراز کر ہی دیا ہے تو پھر میر کار روزانہ اس جنت میں تشریف لے آیا کریں۔ خادم اسے اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھے گا۔“

میر صادق کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ روزانہ رات ہوتے ہی پورنیا کے یہاں چلا جاتا اور جی بھر کے شراب پیتا۔ پھر کوئی خوب صورت رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتی۔ اور جب میر صادق کے اعصاب بوجھل ہو جاتے تو وہ پچھلے پہر اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر محل واپس چلا آتا۔ میر غلام علی لنگڑا بھی اس کا شریک محفل ہوا کرتا تھا۔

آج بھی جب میر صادق علی حسب معمول پورنیا کے گھر پہنچ کر شراب پینے لگا تو وزیر خزانہ نے شامی اور روپ متی کو یہ کہہ کر پیش کیا۔

”سرکار! یہ دونوں ہندو لڑکیاں، سلطان کے اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہونا چاہتی ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو میں انہیں مولانا احمد علی کی خدمت میں بھیج دوں تاکہ یہ ان کی نگرانی میں اسلام قبول کر لیں۔ پھر انہیں یتیم خانے میں داخل کر دیا جائے۔“  
 شامی کا بے پناہ حسن دیکھ کر میر صادق کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ ”یتیم خانے کیوں؟ کیا ان کا اپنا گھر نہیں ہے؟“

”ان بد نصیبوں کے ماں باپ مر چکے ہیں اور یہ دور کے رشتے داروں کے ٹکڑوں پر بل رہی ہیں۔“ پورنیا بڑی عیاری سے میر صادق کے گرد جال بچھا رہا تھا۔ ”اسلام قبول کرنے کے بعد ہندو معاشرہ انہیں کس طرح قبول کرے گا؟..... ایسے بے گھروں کے لئے بس یتیم خانہ ہی ایک محفوظ جائے پناہ ہے۔“

”نہیں۔“ میر صادق نے بڑبڑ جوش لہجے میں کہا۔ ”اگر یہ خوب صورت لڑکی وہاں گئی تو درندوں کی خوراک بن جائے گی۔“ پھر شامی سے مخاطب ہوا۔ ”میں تجھے آبرو منداناہ پناہ دوں گا۔“  
 شامی آگے بڑھ کر میر صادق کے قدموں میں جھک گئی۔

”اور اگر حضور اجازت دیں تو اس لڑکی کو میں اپنی پناہ میں لے لوں۔“ غلام علی لنگڑے نے بڑے خوشامداندہ انداز میں کہا۔

میر غلام علی بڑا چلتا پڑھ تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اپنے آقا، میر صادق کو بھی فروخت کر دیتا۔ میر صادق اور میر غلام علی میں ایک بات مشترک تھی کہ دونوں کا تعلق مشہور قندہ گرجس

یہاں تک کہ جب بھی دونوں ریاستوں میں اتحاد و اتفاق کے مذاکرات ہوئے، میر عالم نے انہیں ناکام بنا دیا۔ دوسری طرف میر صادق نے والا جاہ محمد علی کی ملازمت اختیار کی اور نواب ارکات کو والی میسور کے خلاف اکساتا رہا۔ اب ٹیپو سلطان کے حلقہ اطاعت میں شامل ہو کر سلطنتِ خداداد کی تباہی کے منصوبے بنا رہا تھا۔ میر غلام علی لنگڑا اُس کا دست راست تھا اور دونوں مل کر ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔

پھر جب غلام علی لنگڑے نے روپ متی کی خواہش ظاہر کی تو پورنیا نے بے حد بُر جوش لہجے میں کہا۔ ”اُس بے سہارا لڑکی کو آپ کے مکان سے بہتر پناہ گاہ اور کہاں مل سکتی ہے؟“

آخر پورنیا اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو اس کی دو جاسوس عورتیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ میر صادق اور میر غلام علی کی خلوتوں میں شامل ہو گئیں۔

میر صادق اور میر غلام علی نے شامی اور روپ متی کو اپنے عقیدے کے مطابق مسلمان کیا اور اسی دوران سلطنتِ خداداد کے دو اہم عہدیداروں نے ان خوب صورت لڑکیوں سے شادی کر لی جو ہندو دھرم کی سیوا کرنے کے لئے نام نہاد مسلمانوں کے بستروں کی زینت بن گئیں۔  
 شبِ عروسی میں میر صادق نے اپنی بیوی، شامی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

”اب تمہارا ایک ہی کام ہے کہ تم ملکہ فاطمہ بیگم کی قربت اور اعتماد حاصل کرو۔ حرم سرا کے معاملات پر گہری نظر رکھو اور کھلی آنکھوں سے دیکھو کہ وہاں کون کیا کر رہا ہے؟“

”میری زندگی کا مقصد تو صرف آپ کی خدمت کرنا ہے۔“ شامی نے اپنا رٹا ہوا سبق دہرا دیا۔ ”جب آپ نے ایک معمولی کینز کو یہ اعزاز بخشا ہے تو پھر میری بھی یہی خواہش ہے کہ آپ ال ریاست میں انتہائی عروج حاصل کریں۔“

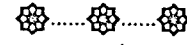
میر صادق نے حیرت سے شامی کی طرف دیکھا۔ ”عروج تو مجھے حاصل ہے۔“  
 ”اس سے بھی زیادہ عروج۔“ شامی نے بڑے ناز و ادا کے ساتھ کہا۔ ”وزیر اعظم نہیں، ریاست کا آزاد حکمران۔“

”کیا تو ابھی سے ملکہ بننے کے خواب دیکھ رہی ہے؟“ میر صادق نے ہنستے ہوئے کہا۔  
 ”میرے لئے تو ساری زندگی آپ کی کنیز بنے رہنے کا اعزاز کافی ہے۔“ شامی کی آنکھیں

بھی مخمور تھیں اور لہجہ بھی سرشار تھا۔ ”آپ ملکہ کے لئے کسی بھی عورت کا انتخاب کر لیں۔ میرا آنکھیں تو نواب کے سر پر تاج زر نگار دیکھنا چاہتی ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔“

شامی نے ایک ہی رات میں میر صادق کو اپنے خسن اور والہانہ محبت کا اسیر بنا لیا تھا۔ یہ صادق بڑا عیار انسان تھا مگر ایک عورت کی توجہ شکن جوانی نے اُسے بہک جانے پر مجبور کر دیا۔ ”میر کر شامی! اگر میں اس ریاست کا حکمران ہوا تو پھر ملکہ کا تاج تیرے سر پر ہی بجا جائے گا۔“

شامی نے ایک ہوش ربا انگڑائی لی۔ اس نے میر صادق کے دل میں شوقِ حکمرانی کا بیج دیا تھا۔



جب محمد علی کیدان شامیا اور تولا رام کی سازش کا خاتمہ کر کے اپنی فوج کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مخالفین کے چہرے اتر گئے۔

ٹیپو نے اپنے خیمے سے نکل کر اس جانباز کا استقبال کیا جو ہر آڑے وقت میں ریاستِ میسور کے کام آتا تھا۔ ٹیپو نے محمد علی کیدان کی فرض شناسی کے صلے میں اسے اپنے ہاتھ خلعتِ فاخرہ پہنائی۔

اس دوران ٹیپو کو خبر ملی کہ نواب حیدر علی کالے پالک لڑکا، ایاز خان باغی ہو گیا ہے اور نے کوڑیاں بندر اور حیدرنگر کو بمبئی کی انگریزی فوج کے حوالے کر دیا ہے۔ ایاز خان ایک ہزار کا لڑکا تھا۔ جب حیدر علی نے 1773ء میں ملابار پر حملہ کیا اور راجہ قتل ہو گیا تو والی میسور اس کے سات سالہ لڑکے کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ حیدر علی نے ہندو لڑکے کا نام ایاز خان اور اپنے بیٹے کی طرح پرورش کی۔ پھر جب ایاز خان جوان ہوا تو اسے ملابار کا حاکم بنا دیا حیدر علی کے مرتے ہی ایاز خان اپنے مذہب کی طرف لوٹ گیا اور اُس نے کوڑیاں بندر اور جانگر جیسے اہم علاقوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

جب ٹیپو سلطان کو ایاز خان کے باغی ہونے کی خبر ملی تو وہ اُداس نظر آنے لگا۔ ”آخر! خان کے پاس کس چیز کی کمی تھی؟ خدا نے اُسے ایمان کی دولت بخشی اور وہ بت پرستی کی طرف لوٹ گیا۔“

”شہزادے! یہ دنیا ہے اور تمہارے والد محترم کو بھی دنیا والوں نے بہت ستایا تھا شجاعتِ خان نے تو عمرِ حکمران کے سامنے اپنی زندگی کے تلخ حقائق بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”خدا ہی جانتا ہے کہ ہماری صفوں میں اور کتنے غدار ہیں؟“ ٹیپو سلطان نے غم زدہ میں کہا۔

”غداروں کو اپنا کام کرنے دیجئے اور اہلِ وفا اپنا کام کرتے رہیں گے۔“ محمد علی کیدان اسی طرح ہر عزمِ نظر آ رہا تھا۔ ”حیدرنگر کی فکر کیجئے۔ ایاز خان کو بھی دیکھ لیں گے۔“

پھر دوسرے دن ہی ٹیپو سلطان، محمد علی کیدان کے ساتھ حیدرنگر کی طرف بڑھا۔ اٹھارہ دن ہی بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ بالآخر انگریزی فوج نے شکست کھا کر حیدرنگر کا قلعہ، ٹیپو سلطان کے حوالے کر دیا۔

پھر نواب بدلتراں خان ناٹھ کو حیدرنگر کا گورنر مقرر کر کے ٹیپو سلطان، کوڑیاں بندر کی طرف بڑھا۔ راستے میں ٹیپو کی مڈ بھیڑ اس انگریزی فوج سے ہو گئی، جو کرنل کیمبل کی قیادت میں حیدرنگر کی طرف جا رہی تھی۔ صبح سے دوپہر تک دونوں لشکروں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ انجام کار انگریزی فوج کے بیشتر سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگتے ہوئے مارے گئے اور باقی گرفتار کر لئے گئے۔ قید ہونے والوں میں کرنل کیمبل بھی شامل تھا۔

اس موقع پر محمد علی کیدان نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطان! قید ہو جانے والے لڑکوں کو بے درغیل قتل کر دیا جائے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ ٹیپو نے چونک کر پوچھا۔

”شہور کر دیا جائے کہ سارے فرنگی، میدانِ جنگ میں کام آ گئے۔“ محمد علی کیدان نے انگریزوں کے قتل کا جواز فراہم کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ اس قدر بے رحمانہ سلوک کیا جائے۔“ ٹیپو نے اپنے سپہ سالار کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”میں مذہبی احکام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“ محمد علی کیدان نے اعتراف کر لیا۔

”مگر سیاسی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ تمام فرنگیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ان سفید فاموں نے نواب بہادر کو کبھی بڑے فریب دیئے ہیں۔ بار بار معاہدے کئے ہیں اور بار بار ان معاہدوں کو چاک کر دیا ہے۔ یہ آپ کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں گے۔ مصیبت کے وقت ہمارے پر سر رکھ دیں گے۔ پھر مصیبت سے رہائی ملنے ہی درندوں کی طرح سر اٹھائیں گے۔ یہ بے حیاء انسانی قبیلہ ناقابلِ اصلاح ہے۔ شہنشاہِ جاگیر کے جوتوں کو بوسہ دینے والے تاجرین کر ائے تھے اور آج ہندوستان پر اس طرح اپنا حق جتا رہے ہیں کہ جیسے یہ پورا ملک ہی ان کی سرزمین ہے۔ نواب بہادر سے بھی بڑی فاش غلطی ہوئی تھی کہ انہوں نے مدراس میں داخل ہو کر بھی قلعہ سینٹ جارج کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجا کی اور عیار فرنگیوں سے صلح کر لی۔ پھر جب میسور پر برا وقت پڑا تو صلح نامہ مدراس کا کیا حشر ہوا۔“

محمد علی کیدان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا اور آج وہ سارا زہر نکال دینا چاہتا تھا مگر ٹیپو سلطان نے اسے سخت لہجے میں ٹوک دیا۔ ”تم اپنی حدود میں رہو محمد علی! تمہیں نواب بہادر کے فیصلوں پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

ایک لمحے کے لئے محمد علی کیدان کا چہرہ بھگ کر رہ گیا۔ پھر وہ فوراً ہی سنبھل کر بولا۔

”میں جس بات کو درست سمجھتا ہوں، اسے برملا کہنے کی ہمت بھی رکھتا ہوں۔ نواب بہادر

برطانوی کڑاٹتے ہوئے کہا جو اس وقت مدراس میں غریب الوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔  
 ”میری لوقت نیپو سے صلح کر کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو روک دیا جائے۔“ انگریزوں کی  
 بن میں رہتے رہتے والا جاہ محمد علی بھی فرنگی سیاست کی چالیں سیکھ گیا تھا۔ ”نیپو کے مزاج کو  
 سمجھ میں کچھ دیر لگے گی۔“

گورنر مدراس نے بھی اسی میں عافیت سمجھی اور انگریزوں کا ایک وند صلح کی پیش کش لے کر  
 نیپو سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطنتِ خداداد کے فرمانروا کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اس نے  
 باقاعلی بیان احساسِ مسرت کے ساتھ اپنے سامنے صف بستہ فرنگیوں کو دیکھا جن کے چہرے  
 بھی سوالی تھے اور ہاتھ بھی۔ پھر طویل مذاکرات کے بعد صلح نامہ منگور مرتب ہوا۔ جس کی رو  
 سے ان تمام علاقوں پر نیپو سلطان کا حق تسلیم کر لیا گیا جو اس جنگ سے پہلے سلطنتِ خداداد میں  
 شامل تھے۔

معاہدے پر دستخط ہوتے ہی شجاعت خان نے سب سے پہلے نیپو سلطان کو مبارکباد دیتے  
 ہوئے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ باپ نے جو کچھ کھوایا تھا، اسے بیٹے نے بہت جلد حاصل کر لیا۔“  
 پھر ایک فاتح کی حیثیت سے 1784ء کے آخر میں نیپو سلطان سرنگاپٹم پہنچا۔



ابھی دارالحکومت میں جشنِ فتح جاری تھا کہ نیپو سلطان کے جاسوسوں نے اسے خبر دیتے  
 ہوئے کہا۔ ”غدار قاسم خان سرنگاپٹم میں موجود ہے اور محمد علی کیدان نے اسے پناہ دے دی  
 ہے۔“

”کیا محمد علی جیسا فرض شناس انسان یہ حرکت بھی کر سکتا ہے؟“ نیپو کو اپنے جاسوسوں کی  
 لڑاکم کردہ اطلاع پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یہ حقیقت ہے سلطانِ محترم!“ ایک جاسوس نے عرض کیا۔

نیپو کچھ دیر تک خاموش بیٹھا قاسم خان کی نمک حرامی کے بارے میں سوچتا رہا۔  
 ایاز خان اور قاسم خان نے ایک ہی وقت میں غداری کی تھی۔ ایاز خان نے کوڑیال بندر کا  
 علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا اور قاسم خان نے جنگ کے بغیر حیدر نگر جیسا مضبوط قلعہ،  
 سفید نام دشمنوں کے سپرد کر دیا تھا۔ پھر جب نیپو نے دوبارہ حیدر نگر پر قبضہ کر لیا تو قاسم خان  
 آزاد ہو گیا۔ اب اچانک خبر ملی تھی کہ وہ غدار فرار ہو کر محمد علی کیدان کی پناہ میں آ گیا ہے۔

نیپو نے فوراً ہی محمد علی کو سر دربار طلب کر لیا۔ پھر جیسے ہی سالارِ میسور، دربار میں داخل ہوا،  
 اپنے سپاہیوں کو اشارہ کر دیا کہ وہ محمد علی کے مکان کا محاصرہ کر لیں اور پھر قاسم خان کو  
 گرفتار کر کے دربار میں پیش کر دیں۔

”محمد علی! کیا یہ سچ ہے کہ قاسم خان تمہاری پناہ میں آ گیا ہے؟“ نیپو نے پُر جلال لہجے  
 میں پوچھا۔

بھی میری اسی بے باکی سے خفا رہتے تھے۔ ممکن ہے کہ آپ بھی ناراض ہو جائیں مگر میں اپنی  
 روش نہیں بدلوں گا۔ نواب بہادر نے گرفت میں آئے ہوئے درندے کو چھوڑ کر سخت غلطی کی  
 تھی۔ آج وہی درندہ پھر حاکم ہے۔ اگر اس کی سفاکیوں کا اندازہ نہیں کیا گیا تو آنے والا زمانہ  
 زیادہ ہولناک ہوگا۔“ یہ کہہ کر محمد علی کیدان، نیپو کے خیمے سے چلا گیا۔

تیسرے دن سلطان کی فوجیں کوڑیال بندر پہنچ گئیں۔ اُس روز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی  
 مگر نیپو نے اتنی طاقت سے قلعہ پر حملہ کیا کہ چند ہی گھنٹوں میں انگریزوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔  
 جب جنرل میتھیوز کو گرفتار کر کے نیپو کے سامنے لایا گیا تو اس نے جوشِ غضب میں اپنی تلوار بے  
 نیام کی اور فرنگی سپہ سالار کے سینے پر رکھ دی۔ سلطان کے تمام ہتھیاروں پر ”اسد اللہ الغالب“  
 کندہ تھا۔

”بھئی! اب میں تیرے ساتھ کیا سلوک کروں؟“ نیپو اپنے چہرے اور جسم کی ساخت سے نرم  
 و نازک نظر آتا تھا مگر جب مقابل سے بات کرتا تو اس کی آواز میں شیروں جیسی گرج ہوتی۔  
 جنرل میتھیوز بھی نیپو کی آواز سن کر لرز اٹھا تھا۔

”میں سلطان سے رحم و کرم کی امید رکھتا ہوں۔“ جنرل میتھیوز نے اپنے دوسرے ہم  
 قوموں کی طرح اسی روایتی خوشامد اور عیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”مسلمان تو اس دنیا کے لئے رحمت بن کر ہی آیا ہے۔ مگر تم اپنی عیاریاں کب چھوڑ  
 گے؟“ نیپو کے لہجے سے شدید نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”بار بار عہد کرتے ہو اور توڑ دیتے ہو۔  
 آخر تمہاری پوری قوم کی زندگی میں غیرت نام کا کوئی باب بھی ہے؟“

جنرل میتھیوز نے سر جھکا لیا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں شاہِ انگلستان اور کینی بہادر کے  
 حکم کے باوجود آئندہ سلطان کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاؤں گا۔ بس پہلی اور آخری بار میری جان  
 بخش دی جائے۔“

سلطان نے اپنی شمشیر، نیام میں کر لی۔ پھر کوڑیال بندر کا انتظام کر کے کڈلور کی طرف  
 روانہ ہوا۔ کڈلور کیسبل، جنرل میتھیوز اور سینکڑوں انگریز قیدی بھی اس کے ہمراہ تھے۔

کڈلور کے معر کے میں نیپو کے ساتھ فرانسیسی سپاہی بھی شامل تھے۔ انگریزوں کے جنگی  
 جہازوں نے اپنی فوج کی حفاظت کے لئے کڈلور پر خوفناک گولہ باری کی مگر نیپو سلطان آگے ہی  
 بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں فریقوں میں دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ انگریز میدان  
 نہیں ہوتے، اس لئے جب ان کے ساتھیوں کے خون سے زمین سرخ ہونے لگی تو وہ بھاگ  
 کھڑے ہوئے اور نیپو کی فوج نے کڈلور پر قبضہ کر لیا۔

جب جنرل میتھیوز کے گرفتار ہونے اور کرناٹک کا پورا علاقہ ہاتھ سے نکل جانے کی خبر  
 مدراس پہنچیں تو انگریز گورنر بدحواس ہو گیا۔

”تُو نے تو کہا تھا کہ نیپو، حیدر علی کا صحیح جانشین ثابت نہیں ہو سکے گا۔“ گورنر نے والا



قاسم خان رحم کی بھیک مانگتا رہا، مگر نیپو نے اس کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ سپاہی قاسم خان کو کھینچتے ہوئے مقتل کی طرف لے گئے اور نیپو نے محمد علی کیدان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ تم اس بات کا لحاظ رکھو گے کہ تم سے سوال کرنے والا حکومت کا کوئی عین مجرم ہے یا ضرورت مند۔“

محمد علی کیدان نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی کے ساتھ دوبارہ سے نکل کر چلا گیا۔ دوسرے دن صبح قاسم خان کو قتل کیا جانا تھا مگر محمد علی نے مزاحمت کی اور سپاہیوں کو حکم ملانی پر عمل کرنے سے روک دیا۔

جب نیپو سلطان کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو اس نے محمد علی کیدان کو سر دربار طلب کر کے سخت لہجے میں فہمائش کی۔

”حکومت کا جاہ و جلال، نظم و نسق اور قانون کی بالائری قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ غداروں کو دردناک سزا دی جائے۔ اگر آج ایک قاسم خان کو چھوڑ دیا گیا تو کل دوسرا قاسم خان کسی دوسرے محمد علی کی پناہ میں چلا جائے گا۔ پھر قانون کی کیا حیثیت باقی رہے گی؟ اور جرائم کا یہ سلسلہ کہاں جا کر ٹھہرے گا؟“

محمد علی کیدان نے سلطان کی باتوں کو بڑی بے پروائی سے سنا اور درباری رسم کے خلاف سلام کے بغیر چلا گیا۔ سلطان کو بے ادبی اور سرکشی کے مظاہرے پر سخت غصہ آیا مگر وہ محمد علی کیدان کی سابق جاں نثاریوں کا خیال کر کے خاموش ہو گیا۔

اسی دن رات کو وزیراعظم میر صادق، محمد علی کیدان سے ملا۔

”میں بھی ریاست کا ایک ملازم ہوں، اس لئے سلطان کے فیصلے پر رائے زنی کا حق نہیں رکھتا۔ مگر پھر بھی آپ جیسے جاں نثار سلطنت کے ساتھ یہ سلوک کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔“ میر صادق بڑی عیاری کے ساتھ دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے رہا تھا۔

”تجھے اس سے کیا غرض ہے؟“ محمد علی کیدان نے میر صادق کو ڈانٹ دیا۔ ”یہ میرا اور سلطان کا معاملہ ہے۔“

میر صادق فوراً ہی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا مگر جاتے جاتے بھی ایک زہر یلا تیر چھوڑ گیا۔

”یہ آپ کا اور سلطان کا ذاتی معاملہ سہی مگر پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ اس ریاست نے آپ جیسے جانناز اور وفا پرست کی قدر نہیں کی۔“

محمد علی کیدان نے چونک کر میر صادق کی طرف دیکھا مگر وہ کمرے سے نکل کر جا چکا تھا۔ ”دوسرے دن حکم سلطانی کے مطابق سپاہی، قاسم خان کو سزائے موت دینے کے لئے مقتل لے گئے۔“ بین اسی وقت محمد علی کیدان بھی ہاتھی پر سوار ہو کر مقتل میں داخل ہوا اور قاسم خان کو باہیوں سے چمڑا کر اپنے ہاتھی پر سوار کر لیا۔ پھر یہ اعلان بھی کر دیا کہ جسے ساتھ دینا ہو، وہ

محمد علی کیدان نے نیپو کے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کر لیا اور سر اٹھا کر اس طرح کہا کہ جیسے یہ کوئی عام سا واقعہ ہو۔ ”سلطان نے جو کچھ سنا ہے، وہ حرف بہ حرف درست ہے۔“

”تجھ پر تو ایک حکومت کے ایک غدار کو پناہ دینا کیسا فعل ہے؟“ نیپو کی آواز سے ہلکا ہلکا غصہ جھلکنے لگا تھا۔

”بہت برا۔“ محمد علی نے بے نیازانہ جواب دیا۔

”پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟“ نیپو کی جھجلاہٹ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”قاسم خان نے شدید بیماری کے عالم میں مجھ سے سوال کیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ محمد علی کسی سواری کو مایوس نہیں کرتا۔ کوئی بھوکا روٹی کا سوال کرے تو اپنے سامنے رکھی ہوئی ساری غذا اٹھا کر اسے دے دوں اور خود بھوکا رہ جاؤں۔ اگر کوئی ننگا مجھ سے کپڑے مانگے تو میں اپنا قیمتی پیرہن اتار کر اس کے حوالے کر دوں اور خود بے لباس پھرتا رہوں۔ سارا میسر جانتا ہے کہ میرے جینے کی یہی ادا ہے۔“

نیپو ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ محمد علی کے بیان میں جھوٹ کا شائبہ نکل نہیں ہے۔ ”مگر ایک غدار اور ایک بھوکے کے سوال میں بڑا فرق ہے۔“ لمبائی سکوت کے بعد نیپو سلطان دوبارہ مخاطب ہوا۔

”ہاں جو ہوتا تھا، سو ہو چکا۔“ محمد علی کیدان نے اپنی مخصوص بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے نزدیک قاسم خان بھی ایک بھوکا شخص تھا۔ اسے زندگی کی بھوک تھی، میں نے پناہ دے کر اس کی بھوک مٹا دی۔“

نیپو سلطان اور دوسرے حاضرین دربار کو محمد علی کیدان کا یہ جواب بہت گراں گزرا تھا۔

اسی دوران سپاہی قاسم خان کو لئے ہوئے دربار میں داخل ہوئے۔

”قاسم خان! تو نے ایسا کیوں کیا؟“ نیپو اپنی سلطنت کے ایک غدار کو سامنے پا کر غضب ناک ہو گیا۔

”میں بہت مجبور تھا سلطان معظم!“ قاسم خان نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”فرنگی تعداد میں زیادہ تھے اور میری فوج کمزور تھی۔“ نمک حرام قاسم خان اپنے جرم پر مجبوری کا پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تو جھوٹ بولتا ہے۔“ نیپو کی آواز سے پورا دربار گونج اٹھا۔ ”نہ تیرے جسم سے خون کا کوئی قطرہ بہا اور نہ تو نے اپنے کسی سپاہی کو شمشیر بے نیام کرنے کا حکم دیا۔ پھر یہ کیسی مجبوری تھی؟“

قاسم خان نے مزید عذر پیش کیا مگر نیپو نے اسے جھڑک دیا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تو انگریزوں کی غلامی پر رضامند ہو چکا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے ان کی بلاذمت کر رہا تھا۔ اگر تجھے اپنا عہد و نفاذ تھا تو فرار ہو کر سرنگا پٹم کیوں نہیں آیا؟ میرے سامنے اپنی مجبوریاں کیوں بیان نہیں کیں؟“

”کچھ بھی نہیں کہا اور سب کچھ کہہ دیا۔“ شجاعت خان کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔

”کیا اسے اپنے اس فعل پر ندامت ہے؟“ ٹیپو نے پوچھا۔

”اب ندامت یا شکایت، کون بتائے؟ محمد علی تو چلا گیا۔“ شجاعت خان کا لہجہ بہت ادا تھا۔

”کہاں چلا گیا؟“ ٹیپو نے حیران ہوتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”زندگی کی سلاخیں توڑ کر فرار ہو گیا یا کسی دوسرے غدار نے قید خانے کا دروازہ کھول دیا؟“ یکا یک ٹیپو غضب ناک نظر آنے لگا تھا۔

”اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے جسم کے زخموں کی سلاخیں کاٹ دیں اور قید خانے سے آزاد ہو گیا۔“ شجاعت خان کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

”محمد علی نے خودکشی کر لی؟“ شدت حیرت و اضطراب سے ٹیپو سلطان بھی چیخ اٹھا۔ ”جو سر سے پاؤں تک فولاد بنا ہوا تھا، وہ موم کے پتلے میں کس طرح ڈھل گیا؟ جس سے خود موت بھی کتراتی تھی، اس نے اپنے اوپر حرام موت کیسے مسلط کر لی؟“

”خدا ہی جانتا ہے۔“ شجاعت خان بار بار کفِ افسوس مل رہا تھا۔

پھر جب ٹیپو سلطان نے محمد علی کیدان کی لاش دیکھی تو اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

سالار میسور کے ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا، چہرے پر اذیت و کرب کے سائے نمایاں تھے اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

ٹیپو سلطان بہت دیر تک یہ عبرت ناک منظر دیکھتا رہا، پھر اس کی نگاہ ایک کانڈ پر مرکوز ہو گئی، جو محمد علی کیدان کی لاش کے قریب ہی پڑا تھا۔ ٹیپو نے خود ہی جھک کر وہ کانڈ اٹھالیا۔ محمد علی نے مرنے سے پہلے چند سطریں تحریر کی تھیں۔

”میں نے اپنے شب و روز کے سارے جذبات ریاست کے استحکام کی نذر کر دیئے مگر جب میرے ٹوٹنے کا وقت آیا تو کسی نے مجھے سنبھالا نہیں دیا۔ اے زمانے! تو بہت خود غرض اور بے وفا ہے۔ اس لئے میں تجھ سے بہت دُور جا رہا ہوں۔“

محمد علی کا خط پڑھ کر ٹیپو سلطان رونے لگا۔ ”کاش! ایسا نہ ہوتا۔ میں تجھے سو بار سنبھالا دیتا مگر تو نے مجھ سے کچھ کہا تو ہوتا۔“

پھر محمد علی کی لاش کو شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ ٹیپو اس کے قبر میں اتارے جانے تک جنازے کے ساتھ ساتھ تھا۔ سلطنتِ خداداد کے فرمانروا نے اپنے سپہ سالار کی میت کو کانڈا بھی دیا۔

پھر ٹیپو سلطان، محمد علی کی بیوہ سے تعزیت کے لئے اس کے مکان پر پہنچا۔ سالار میسور کے مکان پر کسی غریب کی چھوٹی کنگمان ہوتا تھا۔ ریاست کے دوسرے عہدیداروں کے مکانات میں و آسائش کی چیزوں سے بھرے ہوئے تھے مگر ایک سالار میسور تھا کہ جس کے اٹالے میں

میرے پیچھے پیچھے چلا آئے۔ یہ اعلان سن کر دو تین سو سپاہی محمد علی کے ہمراہ ہو گئے۔ اب ان ہائیوں کا درجن سرنگا پٹم کے نواحی علاقے کی طرف تھا۔

جیسے ہی ٹیپو سلطان کو یہ خبر ملی، اس نے سید حمید اور غازی خان کو حکم دیا کہ وہ محمد علی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیں۔ ابھی یہ لوگ تین چار کوس ہی گئے تھے کہ سلطانی لشکر نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

پھر جب قاسم خان، سلطان کے سامنے آیا تو اسی وقت اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ دوسرے باقی بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور محمد علی کیدان کو نظر بند کر دیا گیا۔

سلطان کو اس واقعے سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔ وہ اذیت و کرب کے باعث رات بھر نہیں سو سکا۔ نصف شب کے قریب ٹیپو نے شجاعت خان کو طلب کر کے کہا۔

”میں نے بڑی مشکل سے محمد علی کی سرکشی اور نافرمانی کو برداشت کیا ہے۔“

”بے شک! اس جرم کے مقابلے میں اس کی جاں نثاریوں اور قربانیوں کی فہرست بہت طویل ہے۔“ شجاعت خان نے محمد علی کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

”خدا کی قسم! وہ مجھے بہت عزیز ہے۔“ ٹیپو نے اثر انگیز لہجے میں کہا۔ ”نواب بہادر اسے اپنا داماد اور دایاں بازو کہا کرتے تھے۔ پوری ریاست میں اس جیسا ذہن اور بہادر سپاہی کوئی دوسرا موجود نہیں۔ میں اسے کسی بھی حال میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ محمد علی کو سمجھاؤ کہ وہ اپنی اس غلطی پر توبہ کی میں مجھ سے معذرت کر لے۔ میرا دل اس کی طرف سے صاف ہو جائے گا۔ میں اس کے ایک اشارے پر قاسم خان جیسے کئی مجرموں کو معاف کرنے کے لئے تیار ہوں مگر مجھ سے سرعام قانون کی یہ توہین برداشت نہیں ہوتی۔“

شجاعت خان نے سلطان سے وعدہ کر لیا کہ وہ محمد علی کو اس کی غلطی کا احساس دلانے گا۔ اور پھر محمد علی اپنے اس جرم پر سلطان سے معافی بھی مانگ لے گا۔ اس وقت رات کا پچھلا پہرہ تھا اور ابھی سورج طلوع ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ شجاعت خان بڑی بے چینی سے رات گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

پھر جیسے ہی سورج طلوع ہوا اور شجاعت خان، قید خانے پہنچا تو ایک روح فرسا خبر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

محمد علی کیدان مر چکا تھا۔ اور اس نے میرے کی کئی کھا کر خودکشی کر لی تھی۔

شجاعت خان، محمد علی کیدان کی لاش دیکھ کر چیخ اٹھا۔

”کیا موت کو کھیل سمجھنے والا، اس طرح کی موت بھی مر سکتا ہے؟ اے خدا! ہمارے حال پر رحم کر۔“ یہ کہتا ہوا شجاعت خان قید خانے سے باہر نکلا اور پھر بھاگتا ہوا ٹیپو سلطان کے پاس پہنچا۔

شجاعت خان کی یہ حالت دیکھ کر ٹیپو گھبرا سا گیا۔ ”کیا کہا محمد علی نے؟“

راہ تھا۔ ”ہمیں سب سے زیادہ خطرہ نواب حیدر علی اور محمد علی کیدان سے تھا۔ مگر ہمارے پیغمبر کی وادائے سے یہ دونوں بہت جلد لقمہ اجل بن گئے۔“ غلام علی لنگڑے کا اشارہ حسن بن صباح کی طرف تھا۔

”ہمارے پیغمبر کی کیا شان ہے۔“ حسن بن صباح کے نام پر میر صادق کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ بہت زیادہ پرجوش نظر آنے لگا تھا۔ ”قلعہ الموت سے ابھرنے والی روشنی ہر مقام پر ہماری دیکھری کرے گی۔ عنقریب ریاست میسور بھی راکھ کا ایک ڈھیر بن جائے گی۔ ہمارے پیڑ کاوندوں نے مسلمانوں کی کتنی بڑی حکومت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ طویل و عریض ہندوستان کی قسمت کا مالک مغل شہنشاہ آج کتنا بے اثر ہے کہ دہلی کے قلعے میں بیٹھ کر کسی کھڑکی کی طرح ناچ رہا ہے۔ مشاعرے ہیں، مرغوں اور ٹیروں کی لڑائیاں ہیں یا خوب صورت عورتوں کے رقص ہیں۔ جاں نثاروں کے سینے، جذبہ وفا سے خالی ہو چکے ہیں اور ان کی نشیروں کو زنگ لگ چکا ہے۔ نظام علی خان، انگریزوں کے قدموں پر سر رکھ کر سو گیا، والا جاہ محمد علی در در بھٹکتا پھر رہا ہے۔ اگر کبھی وہ اراکٹ کی طرف واپس آیا بھی تو اس کی گردن میں انگریزوں کا طوق غلامی ہو گا۔ بس ایک ٹیپو رہ گیا ہے۔“

شامی بہت غور سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

”ٹیپو اپنے باپ پر گیا ہے اور بہت سخت جان ہے۔ اس لئے وہ انگریزوں کی غلامی قبول نہیں کرے گا۔“ میر غلام علی لنگڑے نے سلطنتِ خدا داد کے فرمانروا پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔

”غلامی نہیں تو پھر موت قبول کرے گا۔“ میر صادق نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ہندوستان میں کسی اسلامی ریاست کا وجود باقی نہ رہے۔“



پھر شامی نے ساری باتیں ریاست کے وزیر مالیات، پورنیا کو منتقل کر دیں۔ ”مجھے تو یہ لوگ مسلمان ہی نہیں معلوم ہوتے۔ اپنی ہی قوم کی بربادی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔“

”تیرا اندازہ غلط نہیں تھا پورنیا! رانی لکشم مانے ایک پرجوش فہمہ لگایا۔“ اب کیا ہمارا رام راج کا خواب پورا ہو جائے گا؟“

”ہمیں انتظار کرنا ہو گا مہارانی!“ پورنیا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پورنیا بہت گہرا انسان تھا۔ وہ ہمیشہ غیر جذباتی لہجے میں بات کرتا تھا اور اس کے دل پر عقل غالب رہا کرتی تھی۔

”کتنا انتظار؟“ رانی لکشم مانے جھنجھلا کر کہا۔ ”کیا اس وقت یہ خواب پورا ہو گا، جب شمشان میں ہماری چٹائیں جل رہی ہوں گی؟“

”اتنی مضبوط حکومت کی بنیادیں تباہ ہونے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔“ پورنیا کی آواز

چند ہوسیدہ کپڑوں اور ایک ٹوپی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ محمد علی کے مکان کی یہ حالت دیکھ کر ایک بار پھر ٹیپو سلطان آبدیدہ ہو گیا۔

”وہ سپاہی کے لباس میں ایک مرد قتلدر تھا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔“

ٹیپو نے بڑے پُر اثر لہجے میں محمد علی کی بیوہ سے تعزیت کی، پھر عدت کے بعد اس غم زدہ عورت کو اپنے محل میں لے آیا اور بہت سی مراعات بخشے کے ساتھ یہ حکم بھی جاری کر دیا کہ ہر طرح اس کی دلجوئی کی جائے تاکہ وہ جلد از جلد اپنے شوہر کی موت کا غم فراموش کر دے۔



وزیر اعظم میر صادق اور اس کا نائب میر غلام لنگڑا، محمد علی کیدان کی موت پر بہت خوش تھے۔ وہ دونوں سالہ میسور کی لاش ہی پر جشنِ نشاط منانا چاہتے تھے مگر مجبور تھے۔ اس لئے ایک تہہ خانے میں اپنے جذبات کا غبار نکالنے لگے۔

”یہ ہماری خوش بختی ہے غلام! کہ جب سے ریاست کی ملازمت میں آئے ہیں، میسور کی تباہی کا عمل تیز تر ہو گیا ہے۔“ میر صادق نے اپنے نائب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”پہلے حیدر علی مرا جو ہمارے عزائم کے راستے کی سب سے مضبوط چٹان تھا۔ پھر محمد علی نے خود ہی اپنی شررگ کاٹ لی۔ یہ دوسری رکاوٹ تھی۔ اب کون باقی رہ گیا؟“

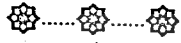
”کوئی بھی نہیں سرکار!“ میر غلام علی لنگڑے نے شراب کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

میر صادق کی بیوی شامی اس خفیہ تہہ خانے میں ضرورت کی چیزیں فراہم کر رہی تھی۔ میر صادق نے اسے مطمئن کرنے کے لئے سرنگاپٹم کے ایک عام سے مولوی سے نکاح پڑھوا لیا تھا ورنہ حقیقتاً شامی کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہیں تھی۔ اور خود شامی کو بھی اس کی پروا نہیں تھی کہ میر صادق اسے اپنی بیوی سمجھتا ہے یا داشتہ۔ وہ تو وزیر خزانہ پورنیا اور میسور کی رانیوں کے انیاء پر اپنے جسم کی قربانی دے کر ہندو دھرم کی خدمت کر رہی تھی۔ پورنیا نے تو شامی سے یہاں تک اقرار لے لیا تھا کہ اگر میر صادق، ٹیپو سلطان کا وفادار ثابت ہوتا ہے تو پھر کسی موقع پر اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا جائے۔ پورنیا سے یہی عہد و پیمان روپ متی نے بھی کئے تھے اور وہ میر غلام علی لنگڑے کو اس کے حقیقی خدوخال میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر غلام اس قدر خفیہ اور عیاں تھا کہ روپ متی اس کے مزاج کو سمجھنے سے عاجز رہی تھی۔

یہی حال شامی کا بھی تھا۔ میر صادق اس سے بہت قریب تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے دل کی بات شامی سے نہیں کہی تھی۔ آج اتفاق سے دونوں زیادہ بہک گئے تھے، اس لئے دل کی باتیں بے ساختہ ان کی زبانوں پر آ رہی تھیں۔ شامی کسی بہانے سے وہاں آئی اور کچھ دیر ٹھہر کر میر صادق اور غلام علی لنگڑے کی باتیں سننے کی کوشش کرتی۔

”اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے سرکار!“ میر غلام علی لنگڑا جھوم جھوم کر کہہ

راندہ کر دیا گیا۔  
کورگ کے باشندوں میں صدیوں سے ایک بڑی شرم ناک رسم جاری تھی۔ یہاں چار حقیقی بھائی یا چار دوست مل کر ایک عورت کو اپنی بیوی بنا لیتے تھے اور پھر جو اولاد پیدا ہوتی تھی، وہ ان چاروں کے درنٹے کی مستحق قرار پاتی تھی۔  
جب ٹیپو کو اس حیا سوز رسم کا علم ہوا تو اس نے ان سب کو جمع کر کے ایک طویل تقریر کی اور مذہب اسلام کے احکامات بیان کئے۔ ٹیپو کا ذاتی کردار، قیدیوں کے ساتھ شریفانہ سلوک اور پھر اسلام کی حقانیت، غرض ان تمام چیزوں نے مل کر کورگ کے باشندوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ ٹیپو نے نو مسلم مردوں کو فوج میں شامل کر لیا اور اس فوجی دستے کو ”جماعت احمدی“ کا نام دے دیا۔ ان فوجیوں کی وردی کا رنگ شیر کی کھال سے مشابہ تھا۔



خانہ جنگیوں اور بغاوتوں سے ذرا نجات ملی تو ٹیپو سلطان اپنے برادر نسبتی برہان الدین کی شادی کی طرف متوجہ ہوا۔ آخر نواب بدرالزماں ناطک کی لڑکی کا انتخاب ہوا۔ بدرالزماں اس وقت حیدرنگر کا حاکم تھا۔ جب وہ سرنگاپٹم آیا تو ٹیپو سلطان نے اس کا بڑا دلہانا استقبال کیا اور قیمتی تحائف پیش کئے۔

”میری خواہش ہے کہ آپ برہان الدین کو اپنی فرزندگی میں قبول فرمائیں۔“ ٹیپو کے لہجے میں حکم کے بجائے درخواست کا رنگ شامل تھا۔

بدرالزماں خان ناطک خاندانی غرور میں مبتلا تھا، اس لئے مصلحتاً خاموش بیٹھا رہا۔ سادہ دل ٹیپو نے اس کی خاموشی کو اقرار سمجھا اور شادی کی تیاریوں کا حکم دے دیا۔ بدرالزماں خان ناطک واپس حیدرنگر چلا گیا اور سرنگاپٹم میں بڑے زور و شور سے برہان الدین کی شادی کے انتظامات ہونے لگے۔

پھر جب حیدرنگر پہنچ کر بدرالزماں ناطک نے اپنے خاندان اور قبیلے کے سامنے ٹیپو سلطان کی تجویز پیش کی تو وہ سب کے سب برہم ہو گئے۔  
”کیا انہیں تاجدار بیگم کا حشر متادم نہیں؟“

ٹیپو کی ایک بیوی، تاجدار بیگم جو امام صاحب بخشی ناطک کی بیٹی تھی، کچھ دن پہلے انتقال کر چکی تھی۔ وہ دس سال زندہ رہی مگر اس نے ایک دن بھی ٹیپو کا احترام نہیں کیا۔ تاجدار بیگم احساس برتری میں مبتلا تھی اور یہی احساس اُسے دیمک کی طرح چاٹتا رہا۔ آخر دق کے موذی مرض میں مبتلا ہوئی اور خون تھوک تھوک کر مر گئی۔

بدرالزماں ناطک کی قوم نے تاجدار بیگم کے جارحانہ سلوک پر نظر نہیں کیا بلکہ ٹیپو کو اس کی موت کا ذمہ دار قرار دیا۔

جذبات سے خالی تھی۔ ”ابھی تو ایک ہی ستون گرا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ریاست میں اور بھی چار ستون موجود ہیں۔ جب جاں نثاروں پر غدار غالب آ جائیں گے تو آپ کے خوابوں کی تکمیل ہو جائے گی۔“

”پورنیا! میں تجھے ہندو ریاست کا وزیراعظم بناؤں گی۔“ رانی دیواجی منی نے پورنیا کوئی پیشکش کی۔

”میں کسی عہدے کا طلب گار نہیں ہوں مہارانی!“ پورنیا بہت عیار تھا۔ ”مجھے تو ہر حال میں اپنے ہم مذہبیوں کی بالادستی منظور ہے۔“

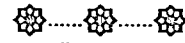
”اگر تو کہے تو ہندو راج کے لئے انگریزوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔“ رانی لکشم مانے ایک اور تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ٹیپو کی سلطنت مضبوط بنیادوں پر استوار نہیں ہوئی ہے۔ یہی موقع ہے کہ ریاست پر ایک بھرپور ضرب لگائی جائے۔“

پورنیا حیرت سے رانی لکشم ما کی طرف دیکھنے لگا۔

”بھائی میں مرہٹے ہماری دعوت پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ مگر وہ حیدر علی کا زمانہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے میسور کو بچا لیا۔“ رانی لکشم مانے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اب موسم بدل چکا ہے۔ ٹیپو کو زیادہ مہلت نہیں دینی چاہئے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کو بھی شریک کار بنالینا چاہئے۔“

”مہارانی اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہیں۔“ پورنیا بڑی ہوشیاری سے گفتگو کر رہا تھا۔ ”میں اپنا کام انجام دے رہا ہوں۔ آپ دوسرے محاذ پر جنگ جاری رکھیں۔“

آخر رانی لکشم ما اور رانی دیواجی منی نے ایک انتہائی شاطر شخص، تزل راؤ کا انتخاب کر کے اسے مدراس روانہ کر دیا۔



ٹیپو ان تمام سازشوں سے بے خبر ریاست کی تعمیر نو میں مصروف تھا کہ اچانک کورگ کے باشندوں نے بغاوت کر دی۔

نواب حیدر علی کے زمانے میں بھی یہاں کئی بار بغاوت ہو چکی تھی مگر والی میسور نے اپنی ذہانت سے ہر مرتبہ اس فتنے کو دبا دیا تھا۔ حیدر علی کے مرتے ہی کورگ کے باشندوں نے پھر سر اٹھایا۔ ٹیپو سلطان فوری طور پر بارہ ہزار پیادے، دس ہزار سوار اور بائیس توپیں لے کر کورگ پہنچا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد باغی پسپا ہو گئے مگر انہوں نے گئے جنگلوں میں پناہ ڈھونڈ لی۔ پھر موقع ملتے ہی وہ جنگلوں سے برآمد ہوتے اور سلطانی لشکر کو نقصان پہنچا کر جنگلوں میں ردپوں ہو جاتے۔ آخر ٹیپو نے پورے جنگل کو کاٹنے کا حکم جاری کر دیا۔ ٹیپو تقریباً آٹھ ماہ تک کورگ میں مقیم رہا۔ یہاں تک کہ سارے جنگلات کاٹ دیئے گئے اور باغیوں کی محفوظ پناہ گاہیں برباد کر دی گئیں۔ ہزاروں باغی مارے گئے اور آٹھ ہزار عورتوں اور مردوں کو گرفتار کر کے سرنگاپٹم



”اس کے سوا ہم آپ کی کسی بات کو تسلیم نہیں کریں گے۔“ ناٹھ اور سادات کے لوگ یک زبان کہہ رہے تھے۔ ”آج سے ہم پر ٹیپو کی اطاعت حرام ہے۔ وہ ہم جیسے شرفاء کو ذلیل کرتا ہے۔ خدا اُسے رسوا کرے۔“

ایک بوڑھا شخص جو قوم ناٹھ سے تعلق رکھتا تھا، اس موقع پر خاموش نہ رہ سکا۔ ”بندگانِ خدا تم اس شخص کی غیبت کر رہے ہو جو ہر حال میں بے گناہ ہے۔ خطا تمہاری، موردِ الزام اسے ٹھہراتے ہو۔ جرم تمہاری بیٹی کا، سزا کا مستحق اسے قرار دیتے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ خدا سے ڈرو۔ اگر تمہیں اپنی اعلیٰ نسب پر اتنا ہی ناز تھا تو کھلے لفظوں میں اس رشتے سے انکار کر دیا ہوتا۔“

بوڑھے کی کھری کھری باتوں سے خائف ہو کر ناٹھ اور سادات نے اسے قتل کر دیا۔ ”کہیں یہ خوشامدی نمک خوار، سلطان کو ہمارے ارادوں سے باخبر نہ کر دے۔“ ٹیپو سلطان تیز رفتاری کے ساتھ سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہا تھا اور اسے خبر تک نہیں تھی کہ اس کے پیچھے کیسی کیسی سازشیں ہو رہی ہیں۔



جب مرہٹوں کو معلوم ہوا کہ انگریزوں اور ٹیپو سلطان کے درمیان صلح ہو گئی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی ”معادہء سالبی“ کو ختم کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے تو وہ بدحواس ہو گئے۔ یہ معادہ 1768ء میں ہوا تھا، جس کی رو سے انگریز، نظام الملک، مرہٹے، نوابین اودھ و اراکٹ اور راجگان ناگور و ٹراونکور ایک دوسرے کے حلیف قرار پائے تھے۔ اس معادے کے فتح ہونے کے خیال سے مرہٹوں میں بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ نئے پیشوائے پونا، باجی راؤ نے ٹیپو سلطان سے اس رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کر دیا جو تادان جنگ کے سلسلے میں حیدر علی پر قرض تھی۔ ٹیپو نے پیشوا باجی راؤ کے خط کے جواب میں صاف صاف لکھ دیا۔

”والد محترم نے چند توپوں اور بندوقوں کے سوا اور کوئی ترکہ نہیں چھوڑا ہے۔ اگر کہیں تو یہ ساری چیزیں آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں۔“

پیشوا باجی راؤ کو ٹیپو کا یہ جواب پسند نہیں آیا۔ اس نے فوری طور پر نظام علی خان سے ایک خفیہ معادہ کر لیا تاکہ ٹیپو سلطان سے وہ علاقے دوبارہ حاصل کر لئے جائیں جن پر حیدر علی کی زندگی میں انہوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

ایک بار پھر اتحادی فوجوں نے سلطنتِ خداداد پر یلغار کر دی۔ حیدر بخشی جو قلعہ دھاڑ داڑ کا نگر تھا، اس نے مرہٹوں اور نظام حیدر آباد سے بڑی رشوت لے کر اس قلعے کے علاوہ کنجن گڑھ، نولکنڈہ، نرکنڈہ اور بھدر راندی کے اس پار کا تمام علاقہ دشمنوں کے حوالے کر دیا۔

جب سلطان کو یہ خبر پہنچی تو وہ ایک لشکرِ جرار لے کر دار الحکومت سے نکلا۔ پھر بنگلور کے راستے سے ادھونی کی طرف بڑھا۔ اس وقت ادھونی کا حاکم نظام علی خان کا داماد نواب مہابت

”تمہاری بیٹی کا بھی یہی حشر ہو گا۔“ ٹیپو ہماری اعلیٰ نسب کو داغ دار کرنا چاہتا ہے۔“ اہالیانِ خاندان بڑے غضب ناک لہجوں میں بول رہے تھے۔

خود بدرالزماں ناٹھ کی بیوی اور بیٹی نے بھی اس شادی کی مخالف کی مگر بدرالزماں انکار نہ کر سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انکار کی صورت میں ٹیپو سلطان اسے حیدرنگر کی گورنری سے علیحدہ کر دے گا۔ بدرالزماں ایک طرف خاندانی غرور میں مبتلا تھا اور دوسری طرف اقتدار سے بھی چٹا رہتا چاہتا تھا۔ فطرت کی اسی دورنگی نے اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ برہان الدین کی بہارات، سرنگاپٹم سے حیدرنگر پہنچ گئی۔

شادی سے ایک دن پہلے دلہن نے کنوئیں میں کود کر خودکشی کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جشِ کیف و نشاط، ہنگامہء ماتم میں تبدیل ہو گیا۔

ٹیپو سلطان تین دن تک حیدرنگر میں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے بدرالزماں ناٹھ کو بار بار تسلیاں دیں اور ایک باپ کے غم میں مسلسل شریک رہا۔ پھر سرنگاپٹم روانہ ہونے سے ایک روز پہلے ٹیپو نے بدرالزماں ناٹھ کو خلوت میں طلب کر کے کہا۔

”میں تمہاری بیٹی کو تو واپس نہیں لاسکتا مگر مجھے اتنا ضرور بتا دو کہ یہ المناک واقعہ کیوں پیش آیا؟“

”میری بیٹی کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔“ بدرالزماں ناٹھ نے سوگوار لہجے میں کہا۔

”غذابی طور پر بھی ایک بالغ لڑکی کو اپنی رائے کے اظہار کی پوری آزادی ہے۔“ ٹیپو اپنے غصے کا مظاہرہ کرتا چاہتا تھا مگر صورت حال کی نزاکت نے اسے نرم لہجہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ”پھر تم نے مجھ سے اس بات کو پوشیدہ کیوں رکھا؟“

”میں ڈرتا تھا کہ کہیں میرا انکار مزاج سلطانی پر گراں نہ گزرے۔“ آخر بدرالزماں کے دل کی بات اس کی زبان پر آ گئی۔ ”میں نے حکم سلطانی کی تعمیل میں اپنی بیٹی کو گنوا دیا۔“

”معاذ اللہ! کیا میں کوئی جابر حکمران ہوں کہ تمہارے انکار کو اپنی اتنا کا مسئلہ بنالیتا اور پھر تمہاری بربادی کے درپے ہو جاتا۔“ ٹیپو سلطان کا لہجہ تلخ بھی تھا اور اداس بھی۔

”بدرالزماں! تم نے بڑی غیر ذمہ داری سے کام لیا۔ کاش! تم ایک مبہم سا اشارہ بھی کر دیتے تو میں تمہاری بات سمجھ لیتا۔ افسوس! تمہاری نادانی نے زندگی بھر کے لئے مجھ پر ایک ایسا یادِ گراں ڈال دیا کہ جس کی خلش سے میری روح ہمیشہ مضطرب رہے گی۔“

پھر جب ٹیپو سلطان اپنے برادرِ نسبتی کے ساتھ حیدرنگر سے رخصت ہوا تو ناٹھ اور سادات کے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کے سینوں میں اس کے خلاف نفرت و انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ نواب بدرالزماں ناٹھ اپنے خاندان اور قوم کے لوگوں کو سمجھا رہا تھا۔

”میں نے تو صرف ایک بیٹی گنوائی ہے۔ مگر اس کے بدلے میں پتہ نہیں ٹیپو کو کیا کیا گناہ پڑے گا۔“

”دشمن تو آپ کو ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دے گا۔ پھر آپ اسے اتنی رعایت کیوں دے رہے ہیں؟“

”میں نہیں چاہتا کہ اس جنگ سے معزز خواتین متاثر ہوں۔“ ٹیپو نے موسیولالی کی دلیل کا باز لے لیں۔

”یہ موقع دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا سلطان!“ فرانسسی سپہ سالار بہت زیادہ پرجوش نظر آ رہا تھا۔ ”خواتین کو تو بعد میں بھی بحفاظت روانہ کیا جاسکتا ہے۔“

موسیولالی، قلعے پر حملہ کرنے کے لئے اصرار کرتا رہا مگر ٹیپو نے اپنا فیصلہ واپس نہیں لیا اور اعلان کر دیا کہ نظام الملک کی بیٹی اور قلعے میں مقیم دوسری خواتین کسی محفوظ مقام پر چلی جائیں۔ تیسرے دن نظام علی خان کی بیٹی اور تمام عورتیں قلعے سے باہر آئیں۔ ٹیپو نے انہیں خود اپنی نگرانی میں ان الفاظ کے ساتھ رخصت کیا۔

”جب تم نظام علی خان کے پاس پہنچو تو اسے بتانا کہ ایک فاتح نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اگر میں دوسرے حکمرانوں کی طرح ہوتا تو تم سب کویرغمال بنالیتا یا تہ تیغ کر ڈالتا یا پھر اپنے تصرف میں لے آتا۔ مگر مجھے تم ایسی ہی عزیز ہو، جیسی میری اپنی خواتین۔“

جب عورتوں کا یہ قافلہ رانچور کی طرف چلا گیا تو ٹیپو نے قلعہ کا محاصرہ تنگ کر دیا۔ پھر اٹھارہ دن کی مسلسل جنگ کے بعد ٹیپو کی فوج نے ادھونی کے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا جو اپنی ساخت کے اعتبار سے انتہائی مضبوط تھا اور ناقابلِ تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔

نظام علی خان کا داماد نواب مہابت جنگ سمجھتا تھا کہ شکست کے بعد ٹیپو اس سے نہایت تحقیر آمیز سلوک کرے گا۔ مگر ٹیپو خلاف توقع بہت عزت و احترام سے پیش آیا۔ نواب مہابت جنگ کو ادھونی سے اس طرح رخصت کیا جیسے وہ قلعہ سے نکل کر کسی سفر پر جا رہا ہو۔

”نظام سے بس اتنا کہہ دینا کہ اس کے لئے میرے دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ کاش! ہماری یہ طاقت، اسلام دشمنوں کے خلاف استعمال ہوتی۔“

قلعہ ادھونی کی تسخیر سے فارغ ہو کر ٹیپو، مرہٹوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے سب سے پہلے کنچن گڑھ پر حملہ کیا۔ یہاں کی رانی فرار ہو گئی اور اس کے بیٹے نے گرفتار ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

کنچن گڑھ کے بعد افواجِ سلطانی ساٹنڈوز کی طرف بڑھیں۔ یہاں کے حاکم نے کسی تاخیر کے بغیر سرِ اطاعت ختم کر لیا اور سلطان کی خدمت میں قیمتی نذریں پیش کر کے اپنی جان بچائی۔ ساٹنڈوز سے نجات حاصل کر کے سلطان ”کمبلی“ کی طرف بڑھا۔ یہاں ایک گھمسان کی جنگ ہوئی اور کمبلی کے علاقے پر ٹیپو کا قبضہ ہو گیا۔ فتح کے نشے میں سلطان کے بعض سپاہی بہک گئے اور انہوں نے چند خوبصورت عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا ڈالا۔ عزت دار عورتیں یہ رسوائی برداشت نہ کر سکیں اور دریا میں ڈوب کر مر گئیں۔ جب سلطان کو اس واقعہ کی خبر ملی تو اذیت و

جنگ تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے دیوان اسد علی خان کو سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔

”مجھے تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔“ ٹیپو نے مہابت جنگ کے قاصد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”نظام علی خان نے مرہٹوں کے ساتھ مل کر سلطنتِ خداداد کی تباہی پر کمر باندھی ہے، اس لئے میں اسے سبق سکھانا چاہتا ہوں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیسا مسلمان ہے جو کافروں پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنے ہم عقیدہ لوگوں کی بربادی کے منصوبے بناتا ہے۔“

اس کے بعد سلطان نے اپنے ایک معتمد، محمد غیاث کو یہ پیغام دے کر نظام کے دربار میں بھیجا۔

”میں ٹیپو سلطان، مسلمانوں کی سلطنت کو تقویت دینا اور مذہبِ اسلام پر اپنا جان و مال نثار کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ اس کارِ عظیم میں میرا ہاتھ بٹائیے۔ والد محترم نے بارہا مرہٹوں کو ہندوستان کی سالمیت کا واسطہ دے کر سمجھانا چاہا مگر وہ فطرتاً حریص اور اسلام دشمن ہیں۔ آپ بھی ان کے عہد و پیمان پر اعتبار نہ کیجئے۔ انہیں جب بھی موقع ملے گا، وہ میرے اور آپ کے خلاف حملہ آور ہوں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم دونوں مل کر اسلام کے ان بدترین دشمنوں کا قلع قمع کر دیں۔ اس کے بعد آپ کو جو علاقے پسند ہوں، اپنی تحویل میں لے لیجئے۔ میں اسلامی سلطنت کے فروغ کے سوا کچھ اور نہیں چاہتا۔ ابھی وقت ہے، سنبھل جائیے۔ ورنہ قدرت بار بار مہلت نہیں دیتی۔“

ٹیپو سلطان کا خط اس قدر اثر انگیز تھا کہ نظام علی خان جیسا خود غرض انسان بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ جب وزیروں نے دیکھا کہ نظام ڈگمگا رہا ہے تو وہ ایک بار پھر سازشوں کے تمام تر ہتھیاروں کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر حملہ آور ہوئے۔

”حضور! ایک نائب کا بچہ آپ کا معاون ثابت ہوگا؟ معاذ اللہ!“ میر صادق کا بھائی، میر عالم بڑے خوف ناک لہجے میں بول رہا تھا۔ ”بھئی! یہ آپ کی بلند اقبالی کی تحقیر ہے۔ وہ چاروں طرف سے گھیر گیا ہے، اس لئے مذہب کا سہارا لے کر سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر آپ نے اسے سنبھلنے کی مہلت دے دی تو وہ اس طرح مقابل کھڑا ہو گا جیسے کوئی درندہ اپنے شکار کے سامنے۔ حیدر علی بھی بڑا حلیہ گر تھا۔ بیٹا بھی اسی کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ ٹیپو کی برفریب باتوں میں نہ آئیے۔“

نظام کے دل و دماغ میں روشنی کی جو کرن پھوٹی تھی، میر عالم کی گمراہ کن تقریر نے اسے بجھا دیا اور ٹیپو کا سفیر محمد غیاث، ناکام و نامراد واپس آ گیا۔

مجبوراً ٹیپو نے پورے زور و شور سے ادھونی پر حملہ کر دیا۔ مگر جب سلطان کو معلوم ہوا کہ قلعے میں نظام علی خان کی بیٹی اور دوسری خواتین موجود ہیں تو اس نے اپنی فوج کو قلعے پر قبضہ کرنے سے روک دیا۔ بعض فوجی افسر، سلطان کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ فرانسسی سپہ سالار موسیولالی نے بڑے بے باکانہ لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

لکر کے ساتھ دریا کے کنارے خیمہ زن ہونا پڑا۔ ٹیپو نے کئی دن تک دریا کے اتر جانے کا انتظار کیا۔ مگر جب طغیانی میں کوئی کمی نہیں آئی تو ایک روز سلطان نے نماز فجر ادا کی اور ایک گھنٹے تک قرآن کریم کی تلاوت کرتا رہا۔ یہی اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ میدان جنگ میں کبھی کوئی نماز ترک نہیں کی۔ اگر لڑائی کی شدت کے سبب موقع نہ مل سکا تو پھر اس نے قضا نماز ادا کی اور رات کے وقت خیمے کی روشنی میں قرآن شریف کی تلاوت کرتا رہا۔ کتاب الہی کا ایک چھوٹا نسخہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

تلاوت کے بعد ٹیپو نے دریا کی طرف دیکھا۔ طغیانی کا وہی عالم تھا۔ سرکش موجوں نے دریا کے کنارے کھڑے ہوئے تدار درختوں کو اکھاڑ پھینکا تھا اور اب وہ انہیں حقیر تنکوں کی طرح بہائے لئے جا رہی تھیں۔

موسم کا یہ حال دیکھ کر بعض فوجی افراد نے کہا۔

”حضور! دریا کے طور بہت خراب نظر آرہے ہیں۔ یہ طغیانی تو بہت طویل ہوگی۔ آخر ہم کب تک انتظار کریں گے؟“ مبہم اشاروں میں ٹیپو کے فوجی افراد کا یہی مشورہ تھا کہ قلعہ دھاڑواڑ کی مہم کو فی الوقت ملتوی کر دیا جائے۔

اپنے فوجی مشیروں کی بات سن کر ٹیپو مسکرانے لگا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ دریا بھی دشمن کے ہراول دسے کا کام دے رہا ہے اور ہمارا راستہ روکے کھڑا ہے۔“

”تو پھر کچھ دن کے لئے اپنی یہ مہم ملتوی فرما دیجئے۔“ آخر ایک فوجی افسر نے دل کی بات کہہ دی۔

”اس طرح کیسے چلے جائیں؟“ سلطان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

”دشمن ہماری واپسی کو فرار سے تعبیر کرے گا۔“

”پھر؟“ تمام فوجی افراد کے چہرے ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئے تھے۔

سلطان کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر بڑے عجیب انداز میں اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

”دریا کے وسط میں اکیس گولے مارے جائیں۔ پھر قدرت کی طرف سے جو کچھ ظاہر ہو گا، اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔“

تمام سپاہی اور افسران، ٹیپو کا یہ حکم سن کر حیرت زدہ تھے۔ آخر توپ کے اکیس گولے پانی میں داغ دیئے گئے۔ خدا کی شان کہ گولے پھٹتے ہی پانی کم ہونے لگا اور یہاں تک پایاب ہو گیا کہ سلطان کے تمام سوار اور پیدل سپاہی آسانی کے ساتھ دریا پار کر گئے۔

دریا پار کرتے ہی سلطان نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا اور پھر یہ لشکر مختلف سمتوں سے دشمن کی طرف بڑھے۔ شدید برسات کے موسم کی وجہ سے مرہٹے خواب غفلت میں مئے ہوئے تھے۔ ان کے دہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس قدر نامسازگار موسم کے باوجود ٹیپو دھاڑواڑ میں داخل ہو جائے گا۔ مرہٹوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب وہ چاروں طرف سے محصور ہو

کرب کی شدت سے اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

”کیا میرے سپاہی بھی اتنی گری ہوئی حرکت کر سکتے ہیں؟“ تکلیف اور غصے کی زیادتی سے ٹیپو کی آواز لرز رہی تھی۔

”سلطان معظم! جنگ کے دوران ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔“ بعض فوجی افسروں نے سلطان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم بھی مجرموں کی پشت پناہی کر رہے ہو۔“ یکایک سلطان کا لہجہ غضب ناک ہو گیا تھا۔

”یہ معمولی واقعہ نہیں، میری تاریخ اقتدار کا سیاہ ترین ورق ہے۔“

پھر دوسرے دن ٹیپو نے کمپنی کے تمام باشندوں کو ایک میدان میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی ان سپاہیوں کو بھی زنجیریں پہنا دیں جو اس سنگین جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ مرنے والی عورتوں میں کچھ شادی شدہ عورتیں تھیں اور کچھ کنواری لڑکیاں۔ ٹیپو نے ان کے شوہروں، باپ اور بھائیوں کے ہاتھوں میں تلواریں دیتے ہوئے کہا۔

”تمہارے مجرم حاضر ہیں۔ ان سے اپنی عزت و ناموس کے قتل کا بدلہ لے لو۔ خون کے بدلے خون۔ یہی اسلامی انصاف ہے۔“ ٹیپو کی ہر جلال آواز گونجی تو حاضرین پر موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔

حکم سلطانی سن کر محکوم لوگ کانپنے لگے۔ ”حضور! ہم نے انہیں معاف کر دیا۔“ مقتول عورتوں کے وارثوں کی آوازیں لرز رہی تھیں۔ ”آپ نے ہمارا حال پوچھ لیا، بس یہی ہمارے لئے کافی ہے۔ کس کا گھر جلا اور کس کی عزت لٹی، کوئی فاتح یہ نہیں پوچھتا۔ آپ فاتح نہیں، دیوتا ہیں کہ ہمارے غم میں شریک ہوئے۔“

عجیب بے چارگی کا عالم تھا کہ جسے دیکھ کر سلطان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

”بے شک! تم نے مجرموں کو معاف کر دیا۔ مگر میرے قانون کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔“ ٹیپو کی بارعب آواز دوبارہ گونجی۔

تھوڑی دیر بعد ہی مجرم سپاہیوں کی لاشیں زمین پر تر پنے لگیں۔ ہزاروں ہندوؤں کا مٹھا پتھر کے جھٹموں کی طرح ساکت کھڑا ہوا تھا۔

جب سپاہیوں کی لاشیں سرد ہو گئیں تو سلطان ان کے قریب آیا اور انتہائی خست زدہ لہجے میں کہنے لگا۔

”افسوس! تمہاری قسمت میں شہادت نہیں، یہ حرام موت لکھی تھی۔“

اس کے بعد سلطان نے مرنے والی عورتوں کے وارثوں میں کثیر رقم تقسیم کی تاکہ کسی حد تک ان کے غم کا ازالہ ہو سکے۔

پھر جب اس مہم سے فارغ ہو کر سلطان قلعہ دھاڑواڑ پر قبضہ کرنے کی غرض سے آئے بڑھا تو تخت بارشوں کی وجہ سے دریا تک بھدرا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ مجبوراً سلطان کو اپنے

ان مسلسل فتوحات سے سلطان کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ اس نے مرہٹوں اور نظام دکن کی سازشوں سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنے کے لئے تسخیر پونا و حیدر آباد کا منصوبہ بنالیا اور پھر اس منصوبے پر عمل کرنے کے لئے اپنے سپہ سالاروں کو یلغار کا حکم بھی دے دیا۔ برہان الدین نے آگے بڑھ کر بنکا پور اور مصری کوٹہ پر قبضہ کر لیا اور سید حمید اور سید غفار نے سندھ کی طرف حملہ کر دیا۔ خود سلطان نے آگے بڑھ کر ہری پنڈت کو شکست دی۔ راجہ ہوکر جو پوری مرہٹہ فوج کی قیادت کر رہا تھا، اپنی حرم سرا کو چھوڑ کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔

جب یہ خبریں بیک وقت پونا اور حیدر آباد پہنچیں تو مرہٹوں کی طرف سے صلح کی پیشکش کی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک طاقتور دشمن نے گھٹنے ٹیک کر سلطان سے صلح کی درخواست کی تھی ورنہ اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ حیدر علی کو مرہٹوں سے صلح کی درخواست کے ساتھ تاوان جنگ بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔

نظام اور مرہٹوں سے جنگ کا یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ حیدر علی نے وراثت میں جو کچھ چھوڑا تھا، لائق فرزند نے اس میں مزید اضافہ کیا۔

ٹیپو سلطان 1887ء میں دار الحکومت پہنچا۔ سلطان کی تین سالہ غیر حاضری میں میر صادق علی نے رعایا پر اتنی سختیاں کیں کہ عوام، حکومت سے بیزار ہو گئے اور سلطان کو برا بھلا کہنے لگے۔ میر صادق یہی چاہتا تھا کہ ایک طرف اراکین سلطنت، ٹیپو سے غداری پر آمادہ ہو جائیں اور دوسری طرف رعایا اپنے فرمانروا سے بد دل ہو جائے۔ اس کے علاوہ میر صادق نے خزانے میں بھی دست برد کی تھی۔ پورنیا اس راز سے واقف تھا مگر وہ جان بوجھ کر چشم پوشی سے کام لے رہا تھا۔ ایک تو قومی دولت کا زیاں اور دوسرے سیاسی انتشار۔ آخر پورنیا اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور ٹیپو سلطان نے میر صادق کو عدالت میں طلب کر لیا۔

”کیا میں نے تجھے ان معصوم لوگوں پر جابر حاکم بنایا تھا؟“ ٹیپو نے انتہائی تلخ لہجے میں میر صادق سے پوچھا۔

”خدا کی قسم! میں نے اپنے نفس کی خاطر کچھ نہیں کیا۔“ میر صادق نے حسب عادت روایتی خوشامد اور مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی نرم دلی نے انہیں سرکش بنا دیا ہے۔ میری سختیاں اس لئے ہیں کہ یہ اطاعت و فرمانبرداری کا سبق سیکھیں۔“

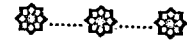
میر صادق نے بہت تاویلات پیش کیں۔ ٹیپو نے اُس کی معذرت قبول بھی کر لی تھی مگر خزانے میں کی جانے والی دست برد اُسے بے گناہ ثابت نہ کر سکی۔

آخر میر صادق کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ مہدی علی خان ناٹھ کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ کچھ دن بعد مہدی علی خان ناٹھ کو حیدر نگر کے گورنر بدراڑ ماں ناٹھ کا ایک خفیہ خط موصول ہوا جس میں چند اشارے تحریر تھے۔

”برادر! میں اپنی بیٹی کی موت کو اب تک نہیں بھولا ہوں۔ ہم قبیلہ ہونے کی حیثیت سے

کچھ تھے۔ ایک مختصر سی خوریز جنگ کے بعد مرہٹہ سردار اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ٹیپو کے فوجی افسروں نے ایک بار پھر اسے مشورہ دیا کہ عورتوں اور بچوں کو یہ غلام بنا کر مرہٹوں پر دباؤ ڈالا جائے مگر سلطان نے جنگی قیدیوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا سلوک کیا اور انہیں عزت و احترام کے ساتھ انعام و اکرام دے کر پونا روانہ کر دیا۔ جب یہ عورتیں پونا روانہ ہو رہی تھیں تو ٹیپو نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”جب تم اپنے گھروں میں پہنچ جاؤ تو پیشوا سے کہنا کہ تُو اس شخص کے خلاف جنگ کرتا ہے جو تیری عورتوں اور بچوں پر اس قدر مہربان ہے۔“



کھوئے ہوئے علاقے حاصل کرنے کے بعد ٹیپو کو معلوم ہوا کہ مرہٹوں اور نظام کی فوجیں، شاہ نور کے گرد و نواح میں جمع ہو رہی ہیں اور اس مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ کا انتظار ہو رہا ہے۔ سلطان نے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ مینہ پر میر معین الدین اور فرانسس دستے کو مقرر کیا۔ میر معین الدین، نواب حیدر علی کی ملازمت میں آنے سے پہلے کر ناٹھ کی انگریزی فوج میں ایک معمولی عہدے پر مامور تھا۔ نواب حیدر علی کے زمانے میں غداری کر کے مرہٹوں سے مل گیا تھا اور گرم کنڈہ کی جاگیر اپنے نام لکھوا لی تھی کہ گرم کنڈہ ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا۔ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے یہ قلعہ میسور اور پائیں گھاٹ کی کنبی سمجھا جاتا تھا۔ اس قلعے پر جو بھی قابض ہوتا، وہ آسانی کے ساتھ میسور اور کرناٹک پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔ مرہٹوں کے چلے جانے کے بعد حیدر علی نے اسے معاف کر کے سابقہ عہدے پر بحال کر دیا تھا۔ ٹیپو سلطان اس کے ماضی سے بے خبر تھا اس لئے ایک پوشیدہ غدار کو نہ پہچان سکا۔ سلطان نے میر معین الدین کی وفاداری کے بلند بانگ دعوؤں سے متاثر ہو کر اسے سپہ سالار بنا دیا۔ میر معین الدین بظاہر سلطان کا جاں نثار تھا مگر گرم کنڈہ کی جاگیر کی ہوس اب بھی اسے بے چین رکھتی تھی۔

ٹیپو نے میسرہ پر اپنے برادر سبقتی برہان الدین کو متعین کیا اور قلب میں خود مقیم رہا۔ اس نے رات بھر پیش قدمی جاری رکھی اور صبح ہوتے ہی برہان الدین کے لشکر نے مرہٹہ فوج پر حملہ کر دیا جس کی قیادت ہری پنڈت اور راستیا کر رہے تھے۔ تین ای وقت سلطان نے قلب حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ نظام اور مرہٹوں کی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ سید حمید، شیخ اور فرانسس سپہ سالار موسیٰ دلالی نے تعاقب کر کے مرہٹوں کا توپ خانہ چھین لیا۔ بالآخر سلطان خدا داد کے خلاف نظام کی یہ سازش بھی بری طرح ناکام ہو گئی۔

اس فتح کے بعد سلطان نے سید حمید اور سید غفار کو شاہ نور کی طرف بھیجا۔ یہاں کا نواب عبدالکیم خان باغی ہو کر نظام اور مرہٹوں سے مل چکا تھا۔ سلطانی افواج کی خبر ملنے پر نواب اپنے بیٹے عبدالنہیر خان کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ سید حمید اور سید غفار نے خون کا ایک بہاؤ بغیر شاہ نور پر قبضہ کر لیا سارا مال غنیمت جمع کر کے سلطان کی خدمت میں بھیج دیا۔



مازگیاں آئند پال اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور بلند آواز میں بولا۔

”سراٹ اس ریاست کے ایک ایک گوشہ زمین کے مالک ہیں۔ انہیں کسی سے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔“ گیانی آئند پال بڑا فتنہ گر تھا۔ ایک طرف وہ بھرے مجمع میں ملتان کی وفاداری کا اعلان کر رہا تھا اور دوسری طرف ٹیپو کو ایک ایسے اقدام پر اکسارہا تھا جس سے ہندوؤں میں اضطراب پیدا ہو جائے اور درپردہ ایک نئی بغاوت پرورش پانے لگے۔

ٹیپو نے گیانی آئند پال کو سختی سے ڈانٹ دیا۔

”اے شخص! میں نہیں جانتا کہ تُو کون ہے۔ مگر تیرے طرز گفتگو سے اتنا ضرور سمجھ گیا ہوں کہ تُو ریاست کا بھی دشمن ہے اور ہندو مذہب کا بھی۔ تُو اسی وقت میری نظروں سے دُور ہو جا۔ تیری باتوں سے بڑے فتنے کی بو آتی ہے۔“

ٹیپو کا اشارہ پاتے ہی سپاہیوں نے آئند پال کو میدان سے باہر نکال دیا۔ اس فریب کار گیانی کے جاتے ہی ٹیپو سلطان، ہندوؤں کے ہجوم سے مخاطب ہوا۔

”وہ تو تمہاری عبادت گاہ کی زمین ہے اگر یہاں کسی مفلس کی جھونپڑی بھی ہوتی تو میں اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔“

قلعے کے میدان میں موجود ہندوؤں پر حیرت و سکوت کا عالم تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ یہ زمین تم مجھے عنایت کر دو۔“ سلطان کے لہجے سے التجا کا رنگ جھلک رہا تھا۔ ”یہاں کا مندر بھی ویران پڑا رہتا ہے اور مسافر خانہ بھی۔ میں اس کے بدلے میں ایک عالی شان مندر اور مسافر خانہ تعمیر کرا دوں گا۔“

درپردہ رانیوں نے برہمنوں اور پجاریوں کو بہت ورغلا یا مگر وہ سب لوگ سلطان کی اس پیشکش سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

”ہم سلطان کے عدل و انصاف سے راضی ہیں۔“ میدان میں سینکڑوں ہندوؤں کی ہڈوں آوازیں گونج رہی تھیں۔

ٹیپو کے دل و دماغ سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اُس نے دوسرے دن ہی سرنگاپٹم کے برہمنوں اور پجاریوں کو اس مندر کے مقام پر طلب کیا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری عبادت گاہ ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ہی ہاتھوں سے اسے منہدم کر کے زمین کو ہموار کرا دو۔“

برہمنوں اور پجاریوں نے اپنی مگرانی میں مندر اور مسافر خانے کو مسمار کرا دیا۔ اس کے بعد سلطان نے مغرب کی جانب سڑک کے دائیں طرف تین فرلانگ کے فاصلے پر ایک قطعہ زمین منہدم اور مسافر خانے کے لئے وقف کر دیا۔ پھر جیسے ہی مسجد کی بنیاد رکھی گئی، مندر کی تعمیر کا بھی آغاز ہو گیا۔ یہ مندر اپنی تعمیر کے اعتبار سے نہایت دلکش تھا۔ سلطان نے ہندو قوم کی دلجوئی کا فرض سے اس مندر کے لئے ایک بیش قیمت جاگیر بھی وقف کر دی تھی۔

وہ تمہاری بھی بیٹی تھی۔ تمہیں وزارت عظمیٰ کا منصب مبارک ہو۔“

جواب میں مہدی علی خان ناکھ نے بھی چند اشارے تحریر کر دیئے تھے۔

”مجھے اپنے عہد و پیمان بھی یاد ہیں اور تمہاری بیٹی کی موت بھی۔ وقت بڑی عجیب چیز ہے۔ وہ غمگین تمہارے زخموں پر مرہم رکھ دے گا۔“

سلطنت خداداد میں ایک اور غدار سر اُبھار رہا تھا۔

اور سلطان مسجد اعلیٰ کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ یہ وہی مسجد تھی، جس کا وعدہ ٹیپو نے بابا عبدالرحمن شاہ مجذوب سے کیا تھا۔ جب ٹیپو سات سال کا بچہ تھا، اس وقت بابا عبدالرحمن شاہ نے اس سے کہا تھا کہ جب وہ ریاست کا حاکم ہو جائے تو اس جگہ ایک شاندار مسجد تعمیر کرا دے۔ ٹیپو سیاسی پلٹاؤ میں مجذوب سے کیا ہوا وعدہ بھول گیا تھا۔ مگر جب وہ جنگی مہمات سے فارغ ہو کر سرنگاپٹم پہنچا تو بابا عبدالرحمن شاہ اس کے خواب میں آئے اور فرمانے لگے۔

”خدا نے تو تجھ پر اپنی نعمتیں نازل کر دیں مگر تُو نے اب تک اس کا گھر تعمیر نہیں کیا۔“

خواب سے بیدار ہوتے ہی ٹیپو نے اپنے برسوں پرانے وعدے کی تکمیل کا آغاز کرنا چاہا مگر اس راستے میں سب سے بڑی مشکل یہ درپیش تھی کہ بابا عبدالرحمن نے مسجد کے لئے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا، وہاں ایک چھوٹا سا مندر اور ہندوؤں کا مسافر خانہ تھا۔

ٹیپو کو کئی دن تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ بابا عبدالرحمن شاہ روزانہ اس کے خواب میں آتے اور اسے ایقاعے عہد کی تلقین کرتے۔ ٹیپو اپنے عہد سے گریزاں نہیں تھا مگر عبدالرحمن شاہ نے مسجد کی تعمیر کے لئے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا، وہ مقامی ہندوؤں کی ملکیت تھی۔ ٹیپو اس دشواری پر بھی قابو پا سکتا تھا۔ ہندوؤں کو منہ مانگی قیمت ادا کر کے وہ مخصوص زمین حاصل کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس مقام پر مندر کی موجودگی نے مسئلے کو الجھا دیا تھا۔ آخر ٹیپو نے اپنے معتمد خاص سید غفار سے مشورہ طلب کرتے ہوئے کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مسئلے کو کس طرح حل کروں؟ ایک طرف میرا وعدہ ہے، دوسری طرف یہ مجبوری۔“

”آپ اس سلسلے میں سرنگاپٹم کے ہندوؤں سے گفتگو کیجئے۔“ سید غفار نے اپنے فرمانروا کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی بات مان لیں۔“

آخر ٹیپو سلطان نے سید غفار کے مشورے سے دارالحکومت کے تمام برہمنوں، پجاریوں اور عام ہندوؤں کو قلعے کے وسیع و عریض میدان میں جمع کر کے کہا۔

”اگر تم لوگوں کی اجازت ہو تو میں مسافر خانے اور مندر کی جگہ ایک مسجد تعمیر کر دوں۔ یہ میری دلی خواہش ہے مگر اس خواہش کی تکمیل تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔“ ٹیپو کے لہجے سے درخواست کا رنگ نمایاں تھا۔

ہندو قوم کے تمام نمائندے خاموش تھے۔ اچانک رانیوں کا معتمد اور رام راج کا منصوبہ

ہمام علماء اور مشائخ مہبوت کھڑے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک نواب زادہ، عیش و آسائش کے ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اس قدر متقی ہو سکتا ہے۔

ٹیپو سلطان نے اس قدر ہوسوز لہجے میں قرأت کی کہ اکثر نمازیوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ نماز ادا کرنے کے بعد ٹیپو نے ضرورت مندوں اور محتاجوں میں نقد رقم کے علاوہ کپڑے بھی تقسیم کئے۔



بعض علماء کو مسجد اعلیٰ کے رنگ پر اعتراض تھا۔ دہلی زبانوں کے ساتھ انہوں نے اپنا یہ اعتراض ٹیپو پر ظاہر بھی کر دیا تھا۔

”سلطان معظم! اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسجد فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مگر اس کا رنگ روایت کے مطابق نہیں۔ سفید یا سبز ہونا چاہئے تھا۔“

”کیا رنگ کے بارے میں کوئی شرعی قانون موجود ہے؟“ ٹیپو نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ علماء سے سوال کیا۔

”کوئی قانون تو نہیں مگر پھر بھی خانہ خدا کا یہ رنگ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔“ علماء کے لہجے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

مسجد اعلیٰ کا رنگ اس قدر غیر روایتی تھا کہ ہر دیکھنے والا چونک اٹھتا تھا۔ بھورے رنگ کی زمین پر سیاہ دھاریاں نمایاں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے مسجد کی دیواروں پر شیر کی کھال بچھا دی گئی ہو۔

”یہ میرا پسندیدہ رنگ ہے۔“ ٹیپو نے علماء کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے نزدیک اس رنگ سے جلال و جبروت کا اظہار ہوتا ہے۔“

ایک مسجد اعلیٰ ہی نہیں، ٹیپو کی ذات سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا یہی رنگ تھا۔ اس کی نشست گاہ، دربار اور خواب گاہ کا رنگ بھی شیر کی کھال جیسا تھا۔ ٹیپو کو شیروں سے غیر معمولی رغبت تھی۔ اس نے محل کے ایک گوشے میں طویل و عریض پنجرے بنوائے تھے جن میں مختلف نسلوں کے شیر رہا کرتے تھے۔ ٹیپو کا معمول تھا کہ وہ نماز فجر ادا کرنے کے بعد ایک گھنٹے تک قرآن کریم کی تلاوت کرتا، پھر شیروں کو دیکھنے کے لئے جاتا۔ انہیں اپنے ہاتھ سے غذا دیتا، بعد میں خود ناشتہ کرتا۔ امراء اس غیر معمولی شوق کا سبب پوچھتے تو سلطنتِ خدا داد کا فرمانروا بڑے بڑبلا لہجے میں جواب دیا۔

”تم اس جانور کا رعب و دبدبہ نہیں دیکھتے کہ یہ پنجرے میں قید ہے مگر پھر بھی بڑے سے بڑا بہادر انسان بھی اس کے قریب جاتے ہوئے گھبراتا ہے۔ مجھے شیر کی یہی ادا پسند ہے کہ جب وہ جنگل میں نمودار ہوتا ہے تو سارے جانور اس کے راستے سے ہٹ کر اپنے اپنے غاروں میں روپوش ہو جاتے ہیں۔“

پھر جب سلطانی محل کے قریب خانہ خدا تعمیر ہو گیا تو ٹیپو نے اس کا نام ”مسجد اعلیٰ“ رکھا۔ (یہ مسجد آج بھی فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہے۔) مسجد کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ پہلی نماز کی امامت کون کرے؟ اس وقت مسجد کے صحن میں دارالحکومت کے بڑے بڑے مشائخ اور علماء موجود تھے۔

”آپ جیسے بزرگوں کی موجودگی میں امامت کا کیا مسئلہ ہے؟“ ٹیپو سلطان نے علماء کے رویہ و انتہائی مؤدب لہجے میں کہا۔

بعض علماء کے چہروں سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ امامت کرنے کے لئے بے چین ہیں مگر عین موقع پر سرنگٹپٹم کے ایک ممتاز عالم، شاہ نصیر الدین نے ایک عجیب مسئلہ کھڑا کر دیا۔

”میرے خیال میں پہلی نماز کی امامت وہ شخص کرے جو صاحبِ ترتیب ہو۔“ شاہ نصیر الدین نے مسجد میں موجود تمام علماء اور مشائخ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطان معظم نے یہ مسجد اس مرد بزرگ کی خواہش پر تعمیر کرائی ہے جو اہل دنیا کو بظاہر مجذوب اور بے پروا نظر آتے تھے۔ مگر دارالحکومت کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بابا عبدالرحمن شاہ نماز کی کس قدر پابندی کرتے تھے۔“

شاہ نصیر الدین کی تجویز سن کر تمام علماء اور مشائخ کے چہرے اتر گئے۔ اگرچہ وہ سب کے سب علمِ حدیث و فقہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ”صاحبِ ترتیب“ نہیں تھا۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح میں صاحبِ ترتیب اس شخص کو کہتے ہیں، جس کی کبھی کوئی نماز نقصانہ نہ ہوئی ہو۔

”پھر بسم اللہ کیجئے۔“ ٹیپو ایک ایک عالم اور ایک ایک شیخ سے یہی بات دہراتا مگر ہر شخص معذرت کر لیتا۔

”سلطان محترم! میں صاحبِ ترتیب نہیں ہوں۔“

”پھر نماز کی امامت کون کرے گا؟“ ٹیپو نے علماء اور مشائخ سے سوال کیا۔ ”نماز کا وقت گزرا جا رہا ہے۔“

علماء اور مشائخ کے چہروں پر ندامت کا عکس نمایاں تھا اور ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔

”تو پھر آئیے! نماز تو قضا نہیں کی جاسکتی۔“ یہ کہہ کر ٹیپو سلطان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو کیا آپ امامت فرمائیں گے؟“ شاہ نصیر الدین اور دوسرے علماء کی زبان سے یک وقت ایک ہی جیسے الفاظ ادا ہوئے۔

”میں تو نہیں چاہتا کہ یہ راز فاش ہو مگر جب اللہ کی بھی مرضی ہو تو پھر ایک عاجز بندہ ایسا کر سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر ٹیپو سلطان امام کے مصلے کی طرف بڑھا۔

”میری زبان خالق کائنات کا شکر کس طرح ادا کرے کہ اس نے اپنے ایک کمزور ناتواں بندے کو صاحبِ ترتیب بنایا۔“

زندگی بسر کر رہی تھی کہ ایک دن ایک اور ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا۔ میر قمر الدین، ٹیپو کے سوتیلے ماںوں میر علی رضا خان کا لڑکا تھا۔ میر علی رضا خان نے گرم کنڈہ کی ایک کتیر سے شادی کر لی تھی اور اس کے بطن سے میر قمر الدین پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں ایک جاہل اور پست خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اس لئے میر قمر الدین کے خون میں بھی وہی خاندانی اثرات شامل ہو گئے تھے۔ اس کا باپ میر علی رضا خان ایک اعلیٰ ظرف اور وفادار سپاہی تھا۔ اس کے برعکس اس کا بیٹا میر قمر الدین ایک حاسد، سازشی اور نمک حرام نوجوان تھا۔ ٹیپو نے حیدر علی کی موت کے بعد صرف خاندانی قربت کے خیال سے اُسے ترقی دے کر سپہ سالار بنا دیا تھا۔

جب سلطان، ادھونی کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، اس وقت ارکاٹ کے مفتی سراج الدین محمود خان کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک لائق احترام شخصیت تھے۔ اسی کے پیش نظر مفتی صاحب کا جنازہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ سرنگاپٹم روانہ کر دیا گیا۔ جنازے کے ساتھ امراء اور فوج کی موجودگی سے کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ ٹیپو کا انتقال ہو گیا ہے اور سلطان کی موت کو پردہ راز میں رکھا جا رہا ہے۔ بعض بدخواہوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سلطنتِ خداداد کے گوشے گوشے میں یہ انواہ پھیل گئی کہ سلطان مر چکا ہے۔

ٹیپو ان انواہوں سے بے خبر ادھونی میں مصروف جنگ رہا اور انواہیں جنگ کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ مختصر مدت میں پورا ہندوستان ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مکلرسن عارضی طور پر گورنر جنرل مقرر ہوا تھا۔ مکلرسن نے فوراً اپنا سفیر، میسور کے دارالحکومت کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ ٹیپو سلطان کے جانشین کو مبارکباد دے سکے۔ جب میر قمر الدین کو ٹیپو کے انتقال کی خبر ہوئی تو اس نے فوج کے ایک حصے کو بڑے انعام و اکرام کی لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے سرنگاپٹم کی طرف بڑھا۔

ادھونی کی مہم سے فارغ ہو کر جب ٹیپو دارالسلطنت کی طرف پلٹا تو اس پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ اس کی رعایا اسے مُردہ سمجھ رہی ہے۔ غرض سلطان نے بڑی مشکل سے اس بغاوت کو فرو کیا اور میر قمر الدین کو دو سال کے لئے نظر بند کر دیا۔

پھر ایک دن میر قمر الدین کی ماں، سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے بیٹے کے لئے معافی طلب کرنے لگی۔ ٹیپو نے ایک بار پھر اعلیٰ ظرفی سے کام لیا اور میر قمر الدین کو معاف کر دیا۔

قمر الدین ایک عیار انسان تھا۔ اس نے سلطان کے حضور جب زبانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”مجھے حضور کی موت کی خبر نے بدحواس کر دیا تھا۔ اس وقت دوسرے لوگ بھی تخت پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مجھے بھی میرے نفس نے گمراہ کر دیا ورنہ میں اپنے

یہ کہہ کر ٹیپو سلطان اپنا تاریخ ساز جملہ دہراتا۔ ”گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ خدا مجھے بھی ایسی ہی زندگی عطا کرے۔“

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب ٹیپو سلطان کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال تھی۔ ایک دن وہ فرانسیسی فوجی افسر کے ساتھ شکار کھیل رہا تھا کہ اچانک قریب کی جھاڑیوں سے ایک شیر نمودار ہو کر ان دونوں کی طرف بڑھا۔ فرانسیسی افسر نے ایک لمبہ ضائع کئے بغیر شیر پر بندوق تان لی۔ مگر ٹیپو نے فوراً ہی اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔

”شہزادے! یہ کیا غضب کرتے ہیں؟“ شدتِ خوف سے فرانسیسی افسر چیخ اٹھا۔

ٹیپو نے بندوق زمین پر پھینک کر اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔ ”مرد اس طرح شکار کرتے ہیں۔“ فرانسیسی افسر، موت کے خوف سے تھر تھرا کانپ رہا تھا اور شیر ان پر حملہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ پھر جیسے ہی شیر نے جست لگائی، ٹیپو نے پیتر ابدل کر جنگی درندے پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ شیر کی دھاڑ سے پورا جنگل گونج اٹھا۔ ٹیپو کی شمشیر نے اس کے دونوں اگلے پاؤں قطع کر دیئے تھے اور شیر چند گز کے فاصلے پر اونداھا پڑا تھا۔ ایک بار پھر ٹیپو کی تلوار فضا میں لہرائی اور شیر کا سر اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔

فرانسیسی افسر نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حیدر علی سے کہا۔ ”نواب بہادر! شہزادے کو سمجھائیے کہ جوانی کا اس قدر جوش، بہت خطرناک ہوتا ہے۔“

حیدر علی نے ٹیپو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”فرزند! اگر تمہارا وار خطا کر جاتا تو جنگل کا شیر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور میں زندگی بھر اپنے شیر کا ماتم کرتا رہتا۔“

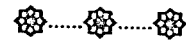
”بابا محترم!“ ٹیپو نے سر جھکائے ہوئے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ جواب دیا۔ ”ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے۔ نہ ایک لمحہ پہلے، نہ ایک لمحہ بعد۔“

”مگر جان بوجھ کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنا کہاں کی دانش مندی ہے؟“ حیدر علی کے لہجے میں ہلکا سا غصہ شامل تھا۔

ٹیپو خاموش ہو گیا۔ وہ کبھی باپ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔

پھر اسی روز نواب حیدر علی نے ٹیپو کے وزن کی چاندی صدقے کے طور پر غریبوں میں تقسیم کر دی تھی۔

یہ اسی فطری شجاعت کا نتیجہ تھا کہ ٹیپو نے باپ کے کھوئے ہوئے تمام علاقے دوبارہ حاصل کر لئے تھے اور انگریزوں کو اتنی بار شکست دی تھی کہ عیار فرنگی اس کے آگے گھٹنے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ صرف انگریز ہی نہیں، طاقتور مرہٹے بھی اس سے صلح کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔



ٹیپو اپنی طاقت میں بھی مسلسل اضافہ کر رہا تھا اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بھی اس نے نئی نئی اصلاحات نافذ کی تھیں۔ سلطنتِ خداداد کے بام و در پر سکون تھے اور رعایا آسودہ حال

”ہاں بیٹے! اب میری بھی خواہش ہے کہ ٹیپو کا پورا گھرانہ برباد ہو جائے۔ شہزادی صفیہ در بدر بھیک مانگتی پھرے۔“ وہ کم ظرف عورت دامن پھیلا کر اس شخص کو کوسنے دے رہی تھی جس نے نہ صرف اس کے بیٹے کی جان بخش دی تھی بلکہ ایک باغی کو اس کے سابقہ منصب پر بھی بحال کر دیا تھا۔

سلطان کی صفوں میں ایک اور غدار پیدا ہو گیا تھا جو بظاہر سلطنتِ خدا داد کا سپہ سالار تھا مگر درپردہ حکومت کی بنیادیں کھود ڈالنے کی قسمیں کھا رہا تھا۔



ٹیپو سلطنت کے استحکام کے لئے نئے نئے منصوبے بنا رہا تھا۔ نئے ہتھیار خریدے جا رہے تھے۔ نئی فوج بھرتی کی جا رہی تھی اور بحری طاقت میں اضافہ کیا جا رہا تھا۔ ان تمام منصوبوں کے پیچھے فرانسیسی سپہ سالار موسیولائی کے مشورے بھی شامل تھے۔ موسیولائی اکثر تنہائی میں سلطان سے کہا کرتا تھا۔

”ان فرنگیوں پر کبھی اعتبار نہ کیجئے گا۔ ریاکاری ان کی سیاست ہے اور عیاری ان کا مذہب۔“

اگرچہ ٹیپو کو ابھی تک انگریزوں کی فریب کاری کا ذاتی تجربہ نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ موسیولائی کی باتیں بہت غور سے سنا کرتا تھا۔

اسی دوران ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔

میر قاسم علی عرصہ دراز سے سلطان کی ملازمت میں تھا اور ٹیپو اس پر بہت زیادہ اعتبار کرتا تھا۔ میر صادق کی طرح میر قاسم بھی بات بات پر خدا اور رسول کی قسمیں کھایا کرتا تھا اور اکثر سلطان کے ساتھ مسجدِ اعلیٰ میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ میر قاسم کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت زیادہ عبادت گزار انسان ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان اس سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ حالانکہ میر قاسم بھی میر صادق اور میر غلام علی لنگڑے کی طرح حسن بن صباح کے پیروکاروں میں سے تھا اور اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے جسم پر ایک پرہیزگار مسلمان کی قبا سجا رکھی تھی۔ میر قاسم کا وطن ریاست حیدرآباد کی سرحد پر واقع تھا۔

ایک دن میر قاسم، سلطان سے اجازت لے کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے جاتے ہی میر صادق اور پورنیا نے سلطان سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

”میر قاسم خفیہ طور پر بہت سا سرکاری سامان لے گیا ہے۔“

”پھر تم نے اسے روکا کیوں نہیں؟“ ٹیپو نے پورنیا اور میر صادق سے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”حضور! ہم اس باز پرس کے مجاز نہیں تھے۔ کیونکہ میر قاسم خود بھی ایک اعلیٰ منصب دار ہے۔ یہ اطلاع بھی اس لئے دی کہ ہماری خاموشی آئینِ وفاداری میں جرم بن کر رہ جاتی۔“

باپ ہی کی طرح اس سلطنت کا جاں نثار ہوں۔“

سلطان نے اس کی معذرت بھی قبول کر لی اور اسے اس کے سابقہ عہدے پر بھی بحال کر دیا۔

میر قمر الدین اقتدار کا بھوکا تھا۔ اپنے عہدے پر بحال ہوتے ہی اس نے ایک نئے انداز سے منصوبہ سازی شروع کر دی۔ ایک دن قمر الدین کی ماں، سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی۔

”سلطان محترم! ساری دنیا جانتی ہے کہ قمر الدین آپ ہی کے معزز خاندان کا ایک فرد ہے۔“

ٹیپو خاموش بیٹھا اُس کی گفتگو سن رہا۔

”اب میری خواہش ہے کہ آپ اس رشتے کو مزید اعتبار بخش دیں۔“ میر قمر الدین کی ماں نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ”شہزادی صفیہ اور قمر الدین کا رشتہ انتہائی مناسب رہے گا۔“

صفیہ، ٹیپو کی چھوٹی بہن تھی۔ قمر الدین سے اس کے رشتے کی بات سن کر ٹیپو کا خون کھول گیا مگر اس نے میزبانی کے آداب کو مجروح نہیں ہونے دیا۔

”میں خاندانی برتری پر یقین نہیں رکھتا مگر یہ حقیقت ہے کہ قمر الدین سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔“ سلطان نے بڑے شائستہ لہجے میں اپنے دل کی بات کہتے ہوئے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا لیکن قمر الدین کی ماں اپنی جہالت کے سبب سلطان کے اس اشارے کو نہ سمجھ سکی اور مسلسل اصرار کرتی رہی۔

آخر ٹیپو کو صاف صاف انکار کرنا پڑا۔ ”میں ذاتی طور پر اس رشتے کو پسند نہیں کرتا۔“

میر قمر الدین کی ماں نے تنک نظر اور جاہل عورتوں کی طرح روتا شروع کر دیا۔ ”اگر آج اس کے والد زندہ ہوتے تو کیا اس رشتے سے انکار ممکن تھا؟“

انتہائی قوت برداشت کے باوجود ٹیپو کے چہرے پر غصے کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ ”خدا میرے ماموں میر علی رضا خان کی مغفرت کرے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو آج صورتِ حال کچھ اور ہوتی۔“

”سلطان! آپ نے ایک بیوہ کا دل توڑا ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھئے گا۔“ میر قمر الدین کی ماں، ٹیپو کو ایک کھلی بدعادے کر چلی گئی۔

پھر جب اس نے اپنے بیٹے کو سلطان کے انکار سے مطلع کیا تو میر قمر الدین کی فطری خباثت عود کر آئی۔ دراصل وہ اس رشتے کی آڑ میں سلطان کے زیادہ قریب ہونا چاہتا تھا اور پھر اس قربت سے فائدہ اٹھا کر ٹیپو کی پشت میں خنجر اتارنا چاہتا تھا۔ مگر جب سلطان نے انکار کر دیا تو میر قمر الدین اپنی ماں کے سامنے بے نقاب ہو گیا۔

”میں ٹیپو سے اپنی توہین کا اس طرح بدلہ لوں گا کہ ریتی دنیا تک میرے انتقام کی داستان دہرائی جائے گی۔“



شیو نے فوراً ہی اس حکم کے ساتھ اپنے برق رفتار سپاہیوں کو روانہ کر دیا کہ میر قاسم علی کو پکڑ کر حاضر خدمت کیا جائے۔

پھر جبر میر قاسم کو گرفتار کر کے لایا گیا اور اس کی تلاشی لی گئی تو ایک چیز بھی برآمد نہ ہو سکی۔ میر قاسم کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا اور وہ لرزے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”سلطانِ معظم! یہ ہے میری وفاداریوں کا صلہ؟“

”نہیں میر قاسم! یہ محض ایک غلط فہمی کی بنیاد پر ہوا۔ بہر حال ہم تم سے معذرت خواہ ہیں۔“ شیو نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر میر قاسم اپنے وطن چلا گیا مگر اس کے دل میں سلطان کے خلاف گرہ پڑ گئی تھی۔ میر صادق اور پورنا اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے اور انہوں نے سلطنتِ خداداد میں ایک نیا غدار پیدا کر دیا تھا۔

کچھ دن بعد میر قاسم، دار الحکومت واپس آیا تو سلطان نے اس کی تالیفِ قلب کے لئے اسے سرنگاپٹم کا قلعہ دار بنادیا مگر میر قاسم کا دل سلطان کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ وہ شیو سے اپنی توہین کا انتقام لینے کے لئے بے چین تھا اور کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔



سلطنتِ خداداد کی زمین میں سازشیں سرطان کے مرض کی طرح پھیلتی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف انگریز بھی شیو سلطان سے کئے ہوئے معاہدے کی دھجیاں اڑا دینا چاہتے تھے مگر اتفاق سے کوئی بہانہ ان کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

اسی دوران عالمی سیاست میں ایک بڑا انتخاب رونما ہوا۔ امریکہ کی تمام ریاستیں انگلستان کی سیاسی قید سے آزاد ہو چکی تھیں اور اب برطانیہ کو اس کے نعم البدل کی تلاش تھی۔ امریکہ کی علیحدگی میں لارڈ کارنوالس کی بدانتظامیوں کا بڑا دخل تھا۔ انگلستان کے وزیرِ اعظم مشرپٹ نے لارڈ کارنوالس کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا۔ یہ شاطر زمانہ انسان جب برطانیہ سے رخصت ہوا تو اس نے وزیرِ اعظم پٹ سے بہت پُر جوش لہجے میں کہا۔

”میں بدنامی کے تمام داغوں کو دھو کر ہندوستان کی گردن میں آپ کی غلامی کا طوق ڈال دوں گا۔“

لارڈ کارنوالس نے ہندوستان آتے ہی گورنر مدراس، مسٹر ہالینڈ کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور اس کی جگہ اپنے پسندیدہ شخص جنرل میڈوز کو اس عہدے پر فائز کر دیا۔ جنرل میڈوز کئی بار شیو سلطان سے شکست کھا چکا تھا مگر لارڈ کارنوالس کا ہم نوا تھا، اس لئے اس کے عہدہ و منصب میں اضافہ کر دیا گیا۔ اب وہ دونوں مل کر شیو سلطان کے خلاف جنگ کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔

لارڈ کارنوالس نے اپنی شاطرانہ چالوں سے بہت جلد سلطان کے دشمنوں کو ایک محاذ پر جمع کر لیا۔ نظام علی خان والی دکن تو پہلے ہی سلطنتِ خداداد کی مکمل تباہی کا خواہاں تھا، اس لئے فوراً

رضامند ہو گیا۔ لیکن مرہٹے کسی معقول جواز کے بغیر سلطان سے جنگ کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ آخر لارڈ کارنوالس نے اپنے ترکش کانسپری تیر پھینکا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظام اور مرہٹے اس تیر سے زخمی ہو گئے۔ پھر تینوں طاقتوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پا گیا۔ معاہدے میں بس ایک ہی شق رکھی گئی تھی، جو نظام دکن اور مرہٹوں کے لئے بڑی تحریص آمیز تھی۔

”شیو سلطان سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لی جائے۔ پھر اس کی مملکت کو برابر سے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔“

اس معاہدے کے بعد لارڈ کارنوالس نے ان راجاؤں سے ملاقاتیں کیں جن کی جاگیروں پر شیو نے قبضہ کر لیا تھا۔ انہیں بھی یقین دلایا گیا کہ فتح کے بعد ان کی ریاستیں واپس کر دی جائیں گی۔ اس فریب میں آ کر تمام راجاؤں نے اپنے باقی ماندہ وسائل بھی انگریزوں کے حوالے کر دیئے۔

لارڈ کارنوالس نے پوری ریاست میں سازشوں کا جال پھیلا دیا تھا۔ سینکڑوں پالیگار، تاجروں کے بھیس بدل کر سرنگاپٹم میں داخل ہو گئے اور انہوں نے کثیر رقم دے کر سلطان کے کئی بے ضمیر امیروں اور وزیروں کو خرید لیا۔

”تم کہاں دیانت داری کے اس دوزخ میں پڑے ہوئے ہو۔“ پالیگار تاجروں نے سلطان کے امراء کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”سلطنتِ خداداد کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ تمہارا سلطان اکیلا کس کس سے لڑے گا؟ سارا ہندوستان ہی اس کا مخالف ہے۔ پھر کس امید پر یہ بے کیف زندگی بسر کر رہے ہو؟ اگر تم نے وقت کی رفتار کو نہیں پہچانا تو غریب اتحادی فوجیں ریاست میں داخل ہو جائیں گی اور تم بے دریغ قتل کر دیئے جاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ بہت جلد اس جہنم سے نکل جاؤ اور اس جنت کی طرف دیکھو جہاں شراب کی نہریں بہہ رہی ہیں اور سفید فام حوریں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“

لارڈ کارنوالس سینکڑوں حسین انگریز لڑکیاں لے کر ہندوستان آیا تھا جو ہندو راجاؤں اور مسلمان سرداروں کو گمراہ کرنے کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔

سلطنتِ خداداد میں رقص و سرود کی محفلوں پر بھی پابندی عائد تھی اور شراب بھی حرام پر قرار دے دی گئی تھی۔ سلطان اس معاملے میں بہت سخت تھا۔ انگریزوں سے ایک جنگ کے موقع پر سینکڑوں خوب صورت عورتیں بھی گرفتار ہوئی تھیں۔ جب ان عورتوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ عقیدتاً مسلمان ہیں اور فرنگیوں کا دل بہلاتی ہیں۔ سلطان نے کسی تامل کے بغیر ان تمام عورتوں کو قتل کر دیا۔

”یہ سب کی سب اسلام کے نام پر ایک بدنام داغ ہیں، سو انہیں مٹا دیا گیا۔“ سلطان کی اسی مذہبی روش نے غریب رعایا کو آبرو منداندہ زندگی بخشی تھی۔ مگر اکثر امراء اور جاگیردار شیو سے بدظن رہا کرتے تھے کہ ان کے لئے ریاست میں کسی قسم کا سامانِ عیش موجود

نہیں تھا۔

جب پالیگرتا جروں نے سلطان کے بعض امراء اور منصب داروں سے بہتی ہوئی شراب کی تہوں، سفید نام حوروں اور سیم وزر کے انبار کا ذکر کیا تو وہ اس شریف انفس حکمران سے خدائی پر آمادہ ہو گئے جس کا وجود لاکھوں انسانوں کے لئے باعثِ رحمت تھا۔

ان خدایوں میں ایک شخص سید امام بھی تھا جو پالیگرتا جروں کے ذریعے سلطان کی ایک ایک نقل و حرکت سے انگریزوں کو مطلع کرتا تھا۔ آخر کچھ دن بعد یہ سازش بے نقاب ہو گئی اور تمام نمک حراموں کو قتل کر دیا گیا مگر سید امام فرار ہو کر انگریزوں سے جاملے۔



سلطان انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کے اتحاد سے بے خبر تھا اور پھر اسی بے خبری کے عالم میں سلطنتِ خداداد پر حملہ کر دیا گیا۔ شیو نے فوری طور پر اپنا سفیر مدراس روانہ کیا اور انگریزوں کو معاہدہ مشکور یاد دلایا۔ مگر لارڈ کارنوالس نے نئی چال چلی اور سلطان کے سفیر سے صاف صاف کہہ دیا۔

”معاہدہ خود سلطان کی طرف سے توڑا گیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ ”معاہدہ سالہی“ کے مطابق راجہ ٹراونکور ہمارا حلیف ہے اور سلطان، ٹراونکور پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے حلیف کو بچانے کی غرض سے ریاست میسور پر حملہ کر دیں۔ اب ہم سلطان کو ایک انتہائی ناقابلِ اعتبار انسان سمجھتے ہیں۔“

شیو کے سفیر نے مختلف دلائل کے ساتھ وضاحت کی کہ ٹراونکور پر حملے کی اطلاع سراسر غلط ہے۔ مگر لارڈ کارنوالس نے نہایت تحقیر آمیز انداز میں سلطانی سفیر کو جھٹلایا۔

ابھی شیو کا سفیر سرنگاپٹم پہنچا بھی نہیں تھا کہ نظام علی خان اپنے چالیس ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل لے کر حیدر آباد سے نکلا اور ”آنکیل“ میں خیمہ زن ہوا۔ اس کے ساتھ ہی لارڈ کارنوالس اپنی فوج لے کر موگی گھاٹ اور دینک گری کو عبور کر کے کولار اور ہوسکوٹہ میں فوجی چوکیاں قائم کرتا ہوا سیدھا کرشنا راج پور پہنچا۔ یہ جگہ بنگلور سے صرف تین کوس کے فاصلے پر واقع تھی۔

سلطان، سرنگاپٹم سے نکل کر تنگی کے نواح میں مقیم ہوا اور سید حمید کو بنگلور کے دفاع کے لئے روانہ کیا۔ اسی دوران انگریزی فوج کے ایک دستے نے کرنل فلائڈ کی ماتحتی میں سلطان پر حملہ کر دیا۔ مگر جب شیو کی توپوں نے آگ اُگلی تو فرنگی لشکر راکھ کا ڈیرہ ہو گیا اور کرنل فلائڈ زخمی ہو کر اپنے چار سو سپاہیوں کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔

بنگلور کے محاذ پر بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ جنرل میڈوز اور کرنل مورس انگریزی فوج کی قیادت کر رہے تھے۔ اس جنگ میں دونوں طرف کے ہزاروں سپاہی کام آئے۔ اس وقت خداداد کرنل راؤ، بنگلور میں معتمدِ سلطانی کے عہدے پر فائز تھا۔ وہی نمک حرام، انگریزوں کو ایک ایک

لے کی خبر پہنچا رہا تھا۔ انگریزی فوج حصار قلعہ توڑنے میں مصروف تھی مگر اسے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کرنل راؤ نے جنرل میڈوز کو ایک خفیہ راستے کا پتہ بتا دیا۔ نتیجتاً انگریز لشکر، قلعے میں داخل ہو گیا۔ سید حمید ہتھیار ڈالنے کے بجائے اس قدر جان بازی سے لڑا کہ اپنے خون کا ایک قطرہ بہا دیا۔ جنرل میڈوز نے سید حمید کی لاش کو شہر اہوں پر کھینچا۔ مگر وہ مردِ شہید اپنا عہد پورا کر کے خالقِ حقیقی سے جاملے تھا۔ اب کوئی اس کے جسم کے ٹکڑے کرے یا لاش کو سر بازار کھینچے، وہ ان تمام دنیاوی رسوں سے بے نیاز تھا۔ جنرل میڈوز کے حکم پر قلعے کے تمام کمین گرفتار کر لئے گئے۔ شہر کو قزاقوں کے انداز میں لوٹا گیا۔ سلطان کے وفاداروں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ بوڑھوں کو سر راہ ٹھوکریں ماری گئیں اور بچوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔

جنرل میڈوز کی فوج میں شامل بعض ہندو سپاہیوں نے مسلمان بچوں کے قتل پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ان معصوموں نے کیا بگاڑا ہے؟ یہ ہمارے لئے بالکل بے ضرر ہیں۔“ ”ہرگز نہیں۔“ جنرل میڈوز کسی درندے کی طرح دھاڑا۔ ”ہم بہت آگے کی سوچتے ہیں۔ اگر یہ بچے جوان ہو گئے تو کل ہمارے مقابل کھڑے ہوں گے۔“

فرنگیوں نے بنگلور کے مسلمانوں کے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک کیا۔ بعض ہندو جو سلطان کے عدل و انصاف اور بلند کرداری کے قائل تھے، انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

شادی شدہ عورتوں کی سر عام بے حرمتی کی گئی اور مسلمان دوشیزاؤں کو گرفتار کر کے جنرل میڈوز کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے ان لڑکیوں کو ہندو ادب و اشوں اور انگریز افسروں میں اس طرح تقسیم کر دیا جیسے ڈاکو لوٹ مار کا مال آپس میں بانٹتے ہیں۔ جنرل میڈوز نے ایک حسین و جمیل سید زادی کو اپنے لئے منتخب کر لیا۔

پھر جب میڈوز کے حکم پر ہندوستانی سپاہی، سید زادی کو انگریز جنرل کے کمرے میں لے جانے کے لئے آگے بڑھے تو اس غیرت مند دوشیزہ نے چیخ کر کہا۔

”بے حیا فرنگی! کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے سلطان نے گرفتار ہو جانے والی انگریز عورتوں سے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی طرح سلوک کیا تھا؟“

جنرل میڈوز اُردو زبان سے ناواقف تھا، اس لئے ان انگریزوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا جو کسی حد تک مقامی زبان جانتے تھے۔ ان افسروں نے انگریزی میں سید زادی کا مفہوم بیان کر دیا۔

جنرل میڈوز شراب کے نشے میں پور تھا۔ سید زادی کی گفتگوں کو قہقہے لگانے لگا۔

ہندو سپاہی چند قدم اور آگے بڑھے۔ سید زادی نے تحکم آمیز لہجے میں انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”شہر جاؤ کرائے کے غلامو! کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے جسم پر قابو پالو گے؟ ابھی تو آسمان و زمین اپنی جگہ قائم ہیں۔ جب یہ دونوں اپنے محور سے سرک جائیں تو ممکن ہے کہ تم اپنے ارادوں

اب سلطان کا رخ ناگزی کی طرف تھا۔

لارڈ کارنوالس نے بنگلور کے قلعے کی حفاظت کے لئے تین ہزار ہندو اور چھ سو انگریز سپاہی ہاور کئے اور خود دیون بلی کی طرف بڑھا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں ٹیپو پیدا ہوا تھا۔ دیون بلی کا قلعہ دار بھی اس سازش میں شریک تھا۔ نتیجتاً کسی جنگ کے بغیر ہی یہ قلعہ لارڈ کارنوالس کے ہاتھ آ گیا۔ اس کے بعد انگریزی فوج نے چک بالا پور پر بھی قبضہ کر لیا۔

ٹیپو سلطان انگریزی لشکر کے مقابلے کے لئے بالا پور کی طرف بڑھا فرنگیوں کی شہ پر یہاں کے لوگ بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ جب ٹیپو کا ہراول دستہ شہر کے وسط سے گزرا تو مقامی باشندوں نے کتوں کی طرح بھونکنا شروع کر دیا۔ ان کی اس حرکت پر سلطان کے سپاہیوں کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے پلٹ کر بالا پور کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ تمام باغی گرفتار کر لئے اور انہیں دردناک سزائیں دی گئیں۔

بالا پور سے نکل کر سلطانی فوجیں چھاتی اور لمبا گل پینچیں اور پھر وینکٹ گری کی طرف بڑھیں۔ ٹیپو رات بھر جاگ کر جنگ کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ پھر صبح جب انگریزوں پر حملے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، عین اسی وقت سرنگاپٹم سے آنے والا ایک قاصد، سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

”کیوں، خیریت تو ہے؟“ ٹیپو نے پریشان لہجے میں قاصد سے پوچھا۔

قاصد نے لرزتے ہاتھوں سے ایک خط سلطان کی طرف بڑھا دیا۔

”کشن راؤ نے دارالحکومت کے گوشے گوشے میں فتنہ و بغاوت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

مغربی بمبئی سے ایک انگریزی فوج سرنگاپٹم پر حملہ کرنے والی ہے۔“

یہ سلطان کی والدہ، فاطمہ بیگم کا خط تھا۔

فاطمہ بیگم کا خط پڑھ کر ٹیپو حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے سے کئی حجابات اٹھ گئے۔

”شکست بنگلور میں بھی اس غدار کی سازش کا فرما تھی؟“ سلطان انتہائی کرب ناک لہجے میں اپنے سپہ سالار، سید غفار سے مخاطب ہوا۔

”بیگم صاحبہ کا خط تو اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔“ سید غفار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”غدار تو غدار ہی رہے گا۔ جس بازار میں جائے گا، اپنا ضمیر ہی بیچے گا۔ اس کے سوا اس کے اس بیچنے کے لئے دوسری کوئی چیز ہی نہیں ہے۔“

”سید! یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ ٹیپو کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ ”کیا میں عدل و انصاف سے کام نہیں لے رہا ہوں؟ کیا میری رعایا بے سکون ہے اور کیا میں کسی کی عزت نفس کا انظار نہیں رکھتا؟“

”آپ کی حکمرانی تو اس سرزمین کے لئے سب سے بڑی سعادت تھی مگر جب انسانی

میں کامیاب ہو جاؤ۔“

ہندو سپاہی ایک دو شیرہ کی بے کسی پر مسکراتے ہوئے مزید چند قدم آگے بڑھے۔ اچانک سید زادی کے ہاتھ کو جنبش ہوئی۔ پھر جب اس کا ہاتھ چادر سے باہر آیا تو دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ سید زادی کے ہاتھ میں ایک چمک دار خنجر موجود تھا۔ اس نے بڑی سرعت سے خنجر کو اپنی شہرگ پر کھینچ دیا۔ سیم تن دو شیرہ کی گردن سے خون کا نوارہ اُبل پڑا۔

”الوداع میرے محبوب سلطان! خدا تجھے ان غداروں سے محفوظ رکھے۔“ یہ کہتے کہتے سید زادی زمین پر گر پڑی۔ چند ہچکیاں لیں اور دنیا سے رخصت ہو گئی۔

”بڑی نادان لڑکی تھی۔“ جنرل میڈوز ہنستا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد غدار کشن راؤ، جنرل میڈوز کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خبیث مسکراہٹ رقصال تھی۔

”ابھی تیرا کام مکمل نہیں ہوا ہے کشن راؤ!“ جنرل میڈوز نے بڑے فریب کا رانہ انداز میں کشن راؤ کی پیٹھ پیچھتاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی بہت سے محاذ باقی ہیں۔“

”ہر محاذ پر یہی ہو گا سرکار!“ کشن راؤ نے غلامانہ انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

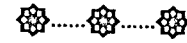
”پھر جلدی کر۔ سلطان کی صفوں میں شامل ہو جا۔ ہمیں ایک ایک لمحے کی خبر بھیج اور

غداروں کی نئی فصل تیار کر۔“ جنرل میڈوز کا ایک سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”سرکار کو اپنا وعدہ یاد ہے؟“ کشن راؤ بدستور مسکرا رہا تھا۔

”رام راج! رام راج! رام راج!“ جنرل میڈوز نے ایک ہی لفظ کو تین بار دہرایا۔ ”مگر

ٹیپو کی موت کے بعد۔“



سلطان اس وقت ”نگلی“ کے نواح میں خیمہ زن تھا۔ جب کشن راؤ، ٹیپو کے رد پر پہنچا تو

اس کا گریبان چاک تھا، چہرے پر خاک ملی ہوئی تھی اور وہ بنگلور کی تباہی کا نوحہ پڑھ رہا تھا۔

”حضور! آپ کا یہ غلام کچھ نہیں کر سکا۔“ کشن راؤ نے زور زور سے سینہ پٹیا اور ٹیپو کے

پیروں پر سر رکھ دیا۔

”تیرا اس میں کیا قصور ہے؟“ بنگلور کی شکست اور رعایا کی بربادی کا حال سن کر ٹیپو کا چہرہ

دھواں ہو رہا تھا۔ ”یہ ماتم کا وقت نہیں۔ جو کھو گیا، سو کھو گیا۔ جو بچ گیا ہے، اس کی حفاظت کر۔“

کشن راؤ کی گریہ و زاری نے ٹیپو کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سلطان اسے اپنا

بہترین معتمد اور وفادار سمجھ رہا تھا۔ اسی خیال سے کشن راؤ کو دفاعی انتظامات کے لئے سرنگاپٹم

ردانہ کر دیا گیا۔

سید غفار، بنگلور پر حملہ کرنے کے لئے بے قرار تھے مگر سلطان نے اجازت نہیں دی۔

”جب وقت گزر چکا تو اپنی فوجی طاقت کو منتشر کرنا مناسب نہیں۔“

فاطمہ بیگم بول اٹھیں۔

”وہ بے حیا تو یہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی اپنے حسن سے فائدہ اٹھائے اور بڑے فوجی افراد کی خلوتوں میں داخل ہو کر ریاست کے اہم راز حاصل کرے۔ مگر اس عفت مآب عورت نے نہ جانے کن کن بہانوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ پھر جب ایک رات اس غدار نے اپنا یہ ناپاک ارادہ ظاہر کیا کہ وہ عنقریب سلطنتِ خداداد کو فرنگیوں کے ہاتھوں فروخت کر ڈالے گا تو یہ شریف زادی اپنی جان پر کھیل کر میری ایک معتد کثیر بختاؤر کے ذریعے مجھ تک پہنچی۔“

”اب میں واپس نہیں جانا چاہتی۔“ یہ کہتے کہتے کشن راؤ کی بیوی رونے لگی۔ ”نہ اپنے مائدان والوں میں اور نہ اپنے دیوتاؤں کے پاس۔ میں نے سب کو دیکھ لیا اور سب کو سمجھ لیا۔“

”مطمئن رہو بی بی! خدا نے تمہیں ہدایت دی ہے اس لئے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکو گی۔ اب تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“ سید غفار اس عورت کے کردار سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے جس نے ایک بڑی سازش کو بے نقاب کر کے ریاست پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔

”کشن راؤ اس وقت کہاں ہے؟“ سید غفار نے کوشلیا سے پوچھا۔ کوشلیا، کشن راؤ کی بیوی کا نام تھا۔

”وہ شراب کے نشے میں بدست اپنی خواب گاہ میں سو رہا ہو گا۔“ کوشلیا کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز تھا۔

”مادرِ ملکہ! پھر مجھے میرا کام جاری رکھنے کی اجازت دیجئے۔“ یہ کہتے ہوئے سید غفار کمرے ہو گئے۔

”تمہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔“ فاطمہ بیگم نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ وہ سید غفار کی خاندانی عظمت اور بلند کرداری سے بخوبی واقف تھیں۔

سید غفار، فاطمہ بیگم کے کمرے سے نکلے اور چند ساتھیوں کے ہمراہ قلعہ کے اس گوشے میں پہنچے جہاں کشن راؤ کی رہائش گاہ تھی۔ کشن راؤ کے ملازمین نے سید غفار اور چند سپاہیوں کو آتے دیکھا تو وحشت زدہ انداز میں بھاگتے ہوئے اپنے آقا کے کمرے تک پہنچے اور خواب گاہ کے دروازے پر زور زور سے دستک دینے لگے۔

کشن راؤ کا نشہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر گالیاں بکتا ہوا باہر آیا۔ ”کس گستاخ نے میری نیند میں خلل ڈالا ہے۔“

”مالک! سید غفار اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس طرف آرہے۔“ کشن راؤ کے ملازمین نے اٹھ جڑتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں تو قلعہ کی پوری فضا ہی بدلی ہوئی نظر آرہی ہے۔“

”کیا جانتے ہو؟ سید غفار تو سرنگاپٹم سے بہت دور محاذِ جنگ پر گیا ہوا ہے۔“ کشن راؤ نے جھنجھٹے ہوئے کہا۔ ”اور اگر وہ آ بھی رہا ہے تو کس کی اجازت سے؟ میں دارالحکومت کا ناظم اعلیٰ

نقدیروں پر نامرادی و محرومی کے سیاہ بادل چھا جائیں تو پھر سورج کی روشنی بھی کچھ نہیں کر سکتی۔“

سید غفار نے مبہم اشارے میں سلطان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھا نہیں سکا! ٹیپو اپنے سپہ سالار کی بات سن کر چونک اٹھا تھا۔“

”پہلے دارالحکومت کی فکر کیجئے۔“ سید غفار نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”اس مسئلے پر تو آئندہ بھی غور کیا جاسکتا ہے۔“

ایک بار پہلے بھی شامیا اور تولا رام نے حرم سرا کی خواتین کو بریغال بنا کر سرنگاپٹم پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی مگر محمد علی کیدان نے بڑی ذہانت سے دشمن کی چالوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ آج پھر بغاوت کی خبریں ملی تھیں لیکن اس مرتبہ صورت حال زیادہ سنگین تھی۔ ٹیپو کو اس موقع پر محمد علی کیدان بہت یاد آیا۔ مگر وہ مردِ جانناز سیاست اور دیاداری کے ہنگاموں سے بہت دور جا چکا تھا۔

آخر بہت غور و فکر کے بعد ٹیپو نے سید غفار کو سرنگاپٹم روانہ کر دیا۔ سید غفار اپنے لشکر کو لے کر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے۔ ان کے خیال میں ایک دن کی تاخیر بھی انتہائی ہنگامہ خیز اور تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ اسی لئے سید غفار نے دشوار گزار مگر مختصر راستے کا انتخاب کیا۔ وہ ماگڑی کے جنگل سے ہوتے ہوئے آدھی رات کے وقت دارالحکومت کے قریب پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی پوری فوج کو دریا کے کنارے چھوڑا اور پانچ سو سواروں کے ساتھ اس وقت قلعہ کے دروازے پر پہنچے، جب فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ قلعہ دار مرزا اسد بیگ نے سید غفار کو دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ تمام سپاہی اپنے سالار کے اشارے پر قلعہ کے مختلف حصوں کی نگرانی کرنے لگے اور سید غفار، مادرِ ملکہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

فاطمہ بیگم کئی راتوں سے جاگ رہی تھیں۔ سید غفار مہدی کو دیکھ کر مادرِ ملکہ نے سکون کی سانس لی اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی کشن راؤ کی بیوی کو تنہائی میں طلب کر لیا۔ سید غفار نے دیکھا کہ وہ ایک حسین و جمیل اور حیا دار عورت تھی۔

”یہ کشن راؤ کی بیوی ہے، جس نے حق نمک ادا کرنے کے لئے اپنے شوہر کی سازش کو قتل از وقت ظاہر کر دیا ہے۔“ فاطمہ بیگم نے اس عورت کی طرف اشارہ کیا جو ہندو ہوتے ہوئے بھی ٹیپو سلطان کی وفاداری کا دم بھر رہی تھی۔

”کیا تمہارے شوہر کو اس بات کا علم ہے کہ تم اس وقت مادرِ ملکہ کی خدمت میں موجود ہو؟“ سید غفار نے کشن راؤ کی بیوی سے سوال کرتے ہوئے کہا۔

”میں اسی حرام کار کے اشارے پر یہاں تک پہنچی ہوں۔“ کشن راؤ کی بیوی کے ہونٹوں سے نفرتوں کا زہر ٹپک رہا تھا۔ ”وہ چاہتا ہے کہ میں راج محل میں ہونے والے ایک ایک دانے سے باخبر کرتی رہوں۔“

سید غفار، کشن راؤ کی بیوی سے مزید سوالات کر کے مطمئن ہونا چاہتے تھے مگر درمیان میں



میں جمع ہو گئے۔  
کشن راؤ کو کسی پاگل کتے کی طرح کھینچ کر میدان میں لایا گیا۔ وہ سید غفار سے گدا گروں کی مانند اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مگر جب کشن راؤ کو یقین ہو گیا کہ اب سید غفار اسے کسی قیمت پر بھی معاف نہیں کرے گا تو وہ ہڈیانی انداز میں چیخنے لگا۔  
”میرا زندہ رہنا ہی ارباب اقتدار کے حق میں بہتر ہے۔ اگر میں ہلاک کر دیا گیا تو پھر پوری ریاست کو موت کا بھیا تک عفریت نکل جائے گا۔“

سید غفار، کشن راؤ کی ان باتوں سے متاثر ہونے والے نہیں تھے۔ انہوں نے سرکاری نقیبوں کو اشارہ کیا۔

نقیبوں نے چیخ چیخ کر مجمع عام کے سامنے کشن راؤ کی فرد جرم بیان کی۔  
پھر توانا باز ور کھنے والے دراز قامت جلاذ اپنی چمکتی ہوئی تلواروں کے ساتھ کشن راؤ کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے۔

”سید! مجھے قتل کرنے سے کیا ہو گا؟“ کشن راؤ انتہائی نفرت آمیز لہجے میں سالار میسور سے مخاطب ہوا۔ ”میں یقیناً قتل ہو جاؤں گا مگر میں نے جو آگ لگائی ہے، وہ کبھی نہیں بجھے گی۔ سلطان سے کہہ دینا کہ وہ بھی اپنی قبر کی جگہ کھود لے۔ عفریب موت کے فرشتے اس تک پہنچنے والے ہیں۔“

کشن راؤ کی گفتگو سن کر سید غفار کچھ دیر کے لئے حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر بہت ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔

”تیری لگائی ہوئی آگ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر خدا چاہے گا تو ہم اس آگ کو بھی بجھا ڈالیں گے۔ ہم نے آگ کے دریا نہیں، بڑے بڑے سمندر دیکھے ہیں اور آج تک ان سے گزرتے آرہے ہیں۔ تیری سازش کی چنگاریوں سے کیا ہو گا؟ اور اگر آگ میں جل جانا ہی ہمارا مقدر ہے تو یاد رکھ کہ ہم تجھ جیسے نمک حراموں سے زندگی کی بھیک نہیں مانگیں گے۔“

یہ کہہ کر سید غفار نے جلاذ کو اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے کشن راؤ کا سر الگ ہو گیا اور جسم سے خون کا فوارہ اُٹنے لگا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر کمزور دل انسانوں کے منہ سے کھٹی کھٹی چیخیں نکلتی گئیں اور پورے مجمع پر اس قدر دہشت چھا گئی کہ ہر شخص موت کو اپنے آپ سے قریب تک ٹھوس کرنے لگا۔

جب کشن راؤ کا گناہ گار جسم تڑپتے تڑپتے ساکت ہو گیا تو سید غفار نے اس کے عزیزوں کو حکم دیا کہ وہ کشن راؤ کا کتا ہوا سر اٹھا کر لے جائیں اور آخری رسوم ادا کر دیں۔ کشن راؤ کے عزیزوں نے رو رو کر التجا کی کہ انہیں کشن راؤ کا جسم لے جانے کی اجازت دے دی جائے مگر سید غفار نے سختی سے انکار کر دیا۔

”اس غدار کی لاش چتا اور شمشان کے لئے نہیں، لوگوں کی عبرت کے لئے ہے۔“

ہوں۔ میرے حکم کے بغیر تو یہاں پتہ بھی نہیں مل سکتا۔“  
”مالک! ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ باقی آپ جانیں۔“ ملازمین انجانے خوف سے قہر قر ل کانپ رہے تھے۔

”میرے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔“ کشن راؤ اس طرح چیخ رہا تھا جیسے وہ خود سلطنتِ خدا داد کا مطلق العنان حکمران ہو۔ ”سید غفار اور اس کے سپاہیوں کو قلعے سے نکال باہر کرو۔“

ابھی کشن راؤ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ سید غفار ایک راہداری کی آڑ سے نمودار ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی کشن راؤ تیزی سے پلٹا اور اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔  
تھوڑی دیر بعد سید غفار کے حکم پر کمرے کا دروازہ توڑ دیا گیا۔ سپاہی اندر داخل ہوئے تو کشن راؤ بندوق لئے کھڑا تھا مگر اس کے پورے جسم پر کچکی طاری تھی۔

”کوئی میرے قریب نہ آئے۔ میں ایک ایک کو ہلاک کر ڈالوں گا۔“ کشن راؤ، سپاہیوں کو آگے بڑھتا دیکھ کر ہڈیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی مگر شدتِ خوف کے باعث وہ گولی چلانے سے قاصر تھا۔

”نمک حراموں اور غداروں میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کسی ہتھیار کا بوجھ برداشت کر سکیں۔“ یہ کہتے ہوئے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر کشن راؤ کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔ پھر اسے اس قدر زد و کوب کیا کہ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔



سرنگاپٹم کا وسیع و عریض میدان بھرا ہوا تھا جہاں ایک غدار سلطنت کو موت کی سزا دی جانے والی تھی۔ سید غفار، کشن راؤ کو حوالہ زنداں کر دینے کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جنگی مہمات سے فارغ ہو کر خود سلطان اس کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ مگر فاطمہ بیگم نے اس تجویز کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں کہ نیپو کو کب فرصت ہوگی اور کب وہ اس نمک حرام کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔ پوری ریاست میں قدم قدم پر سازشوں کے جال پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر یہ غدار چند روز بھی زندہ رہا تو کون جانے کہ کیسے کیسے گل کھلا ڈالے۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ فوری طور پر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور سزا اتنی عبرت ناک ہو کہ جو غدار اپنی اپنی پناہ گاہوں میں چھپے ہوئے ہیں، وہ بھی اس کی موت دیکھ کر جرائم سے باز آجائیں۔“

آخر سید غفار نے دار الحکومت کے گلی کوچوں میں اعلان کر دیا کہ جو شخص بھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی طاقت رکھتا ہے وہ بلاناخیر میدان میں پہنچ جائے۔ اگر سرنگاپٹم کا کوئی باشندہ کسی معقول عذر کے بغیر میدان میں حاضر نہیں ہوا تو اسے بھی کشن راؤ کا شریکِ جرم تصور کیا جائے گا۔ اعلان اس قدر شدید اور سخت تھا کہ دار الحکومت کے بوڑھے، عورتیں اور بچے تک بھی میدان

”خدا کا شکر ہے کہ اس نے درالحکومت کو بچا لیا۔ کشن راؤ جیسے انسانوں نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ مگر زندگی کے اسی صحرا میں اور اسی پر شور آج بھی آپ کی وقاؤں کا چراغ بھی تو جل رہا ہے۔ بس خدا آپ جیسے چراغوں کو بجھنے سے بچالے۔“

سلطان کی یہ محبت دیکھ کر سید غفار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔



اس دوران نظام علی خان کی فوجوں نے ریاست کے اطراف میں مختلف قلعوں پر حملے کئے اور غیر متوقع کامیابیاں حاصل کیں۔ چونکہ اتحادیوں کی سازش مکمل تھی، اس لئے سلطان کے قلعہ داروں نے کسی بھی محاذ پر مقابلہ نہیں کیا اور جنگ کے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔

دوسری طرف مرہٹوں نے دھاڑواڑ پر قبضہ کر لیا۔ ہری پنڈت نے ہری پن پر قابض ہو کر سرا پر حملہ کر دیا پھر یہ علاقہ بھی ایک گہری سازش کے تحت دشمنوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے بعد ہری پنڈت اور مرہٹہ سردار پرشورام، چٹلدرگ کی طرف بڑھے۔ یہاں پہنچ کر دونوں نے دولت خان کو پیغام بھیجا کہ اگر یہ قلعہ مرہٹوں کے حوالے کر دیا جائے تو اسے چار لاکھ روپے کی جاگیر دے دی جائے گی مگر دولت خان نے دشمنوں کے اس پیغام کا جواب دینے کے بجائے رات کے وقت مرہٹہ لشکر پر شب خون مارا اور حیدرنگر چلا گیا۔

مرہٹہ فوج، سرا سے نکل کر انگریزی فوج سے جا ملی۔ یہاں سرنگا پنم پر حملے کے منصوبے بنائے جانے لگے مگر میر قمر الدین کی فوج دشمنوں کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ اتحادیوں کے لشکر پر شب خون مارتی اور سامانِ رسد لوٹ لیتی۔ یہاں تک کہ میر قمر الدین کا جو سپاہی کسی انگریز کی ناک یا کان کاٹ کر لاتا اسے ایک طلائی ہن (سونے کا سکہ) بطور انعام دیا جاتا۔ اناج سے لدے ہوئے تیل کا انعام پانچ ہن اور گھوڑے کا دس ہن مقرر کئے گئے تھے۔ اس سے انگریز سپاہیوں میں شدید بدحواسی پھیل گئی اور جب فرنگی لشکر کری گئے پہنچا تو اس کا سارا سامانِ رسد ختم ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے اس امید پر کہ ملابار سے رسد آ جائے گی، آگے بڑھ کر سرنگا پنم کا محاصرہ کر لیا۔ ٹیپو سلطان پہلے ہی سید غفار کو لے کر دارالحکومت پہنچ چکا تھا۔

انگریز ملابار سے آنے والی جس رسد کا انتظار کر رہے تھے، سلطان کی فوج نے اسے لوٹ لیا۔ پھر یہ نوبت آئی کہ اجناس خوردنی کی قیمتیں بڑھ کر آسمان کو چھونے لگیں۔ فرنگی کچھ دن تک اس صورت حال کو بمشکل برداشت کرتے رہے۔ آخر وہ گھڑی بھی آئی جب انگریزوں نے توپ گاڑیوں کو کھینچنے والے تیل بھی کاٹ کر کھالے۔ فرنگیوں کو ملابار سے آنے والی رسد کا اب بھی انتظار تھا۔ پھر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ سلطان کے سپاہی سارا سامانِ لوٹ چکے ہیں تو لارڈ کارنوالس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے اپنی بھاری توپیں زمین میں دفن کر دیں اور لکڑی کے وزنی سامان کو آگ لگا دی۔ لارڈ کارنوالس، سرنگا پنم کا محاصرہ اٹھا کر واپس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

پھر سید غفار کے حکم پر کشن راؤ کی سریریدہ لاش کو سرنگا پنم کے خاص بازار میں چوراہے پر ڈال دیا گیا۔

دارالحکومت کے در و دیوار پر عجیب سا خوف طاری تھا۔

پورنیا اور میسور کی رانیاں بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کہیں کشن راؤ نے مرنے سے پہلے دوسرے خاندانوں کے نام ظاہر نہ کر دیئے ہوں۔ مگر جب پورنیا اور تپوں رانیوں سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوئی تو ان سب نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ رانی لکشم ماور رانی دیواجی مٹی نے فوری طور پر اپنے ایک جاسوس کو انگریزوں کے نام یہ خفیہ پیغام دے کر بمبئی کی طرف روانہ کر دیا۔

”فی الحال سرنگا پنم پر فوج کشی کے منصوبے کو ملتوی کر کے ہمارے نئے اشارے کا انتظار کیا جائے۔ کشن راؤ قتل کر دیا گیا ہے اور صورت حال بہت زیادہ بگڑ گئی ہے۔ اس صورت میں کسی کامیابی کی امید نہیں۔“

کشن راؤ کی لاش کئی دن تک بازار کے چوراہے پر پڑی رہی۔ پھر جب اس سے ناقابلِ برداشت نقصان اٹھنے لگا تو شہریوں کی ایک جماعت نے سید غفار سے درخواست کی کہ لاش کو اس مقام سے ہٹا لیا جائے۔ سید غفار کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی کشن راؤ کے عزیزوں کو طلب کر کے حکم دیا۔

”اب تم اس غلاظت کو یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ اور جس طرح چاہو ٹھکانے لگا دو۔“

کشن راؤ کی لاش اس قدر گل سڑ چکی تھی کہ اس کے عزیز قریب جانے کی بھی ہمت نہ کر سکے۔ مجبوراً سرنگا پنم کے بھتیگوں کو ایک بڑی رقم دے کر اس کام کے لئے آمادہ کیا گیا۔ پھر بھتیگوں نے ہی کشن راؤ کی بوسیدہ اور بدبو دار لاش کو اٹھا کر اترتی پر منتقل کیا۔ اس کے بعد وہی اچھوت لوگ کشن راؤ کی اترتی کو شمشان بھومی لے گئے۔ پھر کشن راؤ کے ایک عزیز نے بادل ناخواستہ اپنے منہ پر کپڑا باندھ کر اترتی کو آگ لگائی۔ شعلے بلند ہوئے اور ریاست میسور کی وزارتِ عظمیٰ کا خواب دیکھنے والا کشن راؤ جل کر راکھ ہو گیا۔

پھر جب سلطنتِ خداداد کا ایک بڑا غدار اپنے انجام کو پہنچ گیا تو سید غفار، ٹیپو سلطان سے جا ملے اور کشن راؤ کی زبان سے ادا ہونے والے آخری الفاظ کو دہراتے ہوئے بولے۔

”اس نمک حرام نے بڑے پریقین لہجے میں کہا تھا کہ اس کی لگائی ہوئی آگ کبھی نہیں بجے سکے گی۔ اگر کشن راؤ کے لفظوں میں صداقت تھی تو پھر ہماری صفوں میں ابھی کچھ اور غدار بھی موجود ہیں۔ اور اگر وہ جھوٹ بول رہا تھا تو اس کا یہ جھوٹ بھی ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہو گا۔ کشن راؤ سے پہلے بھی ہم کئی غداروں کے چہرے دیکھ چکے ہیں۔“

ٹیپو سلطان محاذِ جنگ پر اُلجھا ہوا تھا اس لئے وہ اپنے سپہ سالار سے اس موضوع پر زیادہ گفتگو نہ کر سکا۔ تاہم اس نے اتنا ضرور کہا۔

شیر الملک سنگل پالیہ کی طرف چلے گئے۔

اس کے ایک ہفتے بعد نظام کی فوج خان بلی کے قریب انگریز لشکر سے آکر مل گئی۔ اس وقت برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ لارڈ کارنوالس کو نیپو کے خلاف منصوبہ بندی کرنے کے لئے طویل فرصت مل گئی۔ اس نے دریا کے کنارے اپنا خیمہ لگا لیا تھا اور بیچ و تاب کھاتی ہوئی موجوں کا نظارہ کرتا رہتا تھا۔ نظام دکن بھی روزانہ اس کے خیمے میں آتا اور شراب نوشی کا دور شروع ہو جاتا۔ لارڈ کارنوالس کی عادت تھی کہ وہ کبھی محفلوں میں اتنی شراب نہیں پیتا تھا کہ پی کر بہک جائے۔ نظام کے سامنے بھی وہ ہوش میں رہتا۔ والی دکن بدست ہو کر کسی برساتی نالے کی طرح اٹل پڑتا اور نیپو سلطان کو گالیاں بکتے لگتا۔ لارڈ کارنوالس مسکراتے ہوئے نظام کو اور شہہ دے دیتا۔ پھر جب نظام جوش میں آکر چیخنے لگتا تو لارڈ کارنوالس اپنے محافظ سپاہیوں کو حکم دیتا۔

”نظام کے اعصابی سچ کا علاج کیا جائے۔“

یہ کارنوالس کا مخصوص اشارہ تھا جس کا مفہوم انگریز سپاہی خوب سمجھتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد خوبصورت انگریز لڑکیاں نیم برہنہ لباسوں میں بھجان انگیز رقص شروع کر دیتیں اور نظام کا اعصابی تازہ آہستہ آہستہ کم ہو جاتا۔ لارڈ کارنوالس کو فرنگی لڑکیوں کے مقابلے میں والی دکن کی ارباب نشاط سے زیادہ دلچسپی تھی۔ نظام کی ہوس پرستی کا یہ حال تھا کہ محاذ جنگ پر بھی ایک خیمے میں سینکڑوں رقص عورتیں موجود ہوتی تھیں۔ وہ لارڈ کارنوالس کو خوش کرنے کے لئے روز ایک منتخب رقامہ اس کے خیمے میں بھیجتا تھا اس طرح مرہٹہ سردار پرشورام بھی دیہات کی خوبصورت لڑکیوں کو ان کے گھروں سے اٹھوا لیتا اور لارڈ کارنوالس کے ہوس کدے کی بھینٹ چڑھا دیتا۔ رات کے پچھلے پہر محفل کیف و نشاط ختم ہو جاتی۔ نظام علی خان اور پرشورام لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے اپنے خیموں میں چلے جاتے تو لارڈ کارنوالس قہقہہ لگاتے ہوئے جنرل میڈوز سے مخاطب ہوتا۔

”میڈوز! تُو دیکھ رہا ہے نا کہ جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے؟ ہندوستانیوں کی زمین، ہندوستانیوں کی افرادی قوت اور ہندوستانیوں کے کئے ہوئے سر۔ مگر فتح ہماری اور اقتدار انگلستان کا۔“

جنرل میڈوز بھی لارڈ کارنوالس کے قہقہوں میں شریک ہو جاتا۔

”کیسے نادان ہیں یہ ہندوستانی۔“ لارڈ کارنوالس کا ایک اور شیطانی قہقہہ گونجنے لگتا۔ ”اپنی آمد تو ہمارے حوالے کر چکے، عنقریب اپنا ملک بھی ہمارے قدموں میں لا کر رکھ دیں گے۔“ لارڈ کارنوالس ان معصوم دیہاتی لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتا جنہیں پرشورام کے سپاہی اٹھا لاتے تھے اور پھر وہ عفت مآب دوشیزائیں فرنگیوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی تھیں۔



کشن راؤ کی غداری کے بعد سید غفار کو ریاست کے تمام عہدیداروں پر شک ہونے لگا

جب نیپو کو انگریز جنرل کی سراسیمگی کا علم ہوا تو اس نے بہترین میوے اور بھجوں کے سینکڑوں خوان لارڈ کارنوالس کے پاس بھیجے اور اس کے ساتھ صلح کے لئے ایک خط بھی تحریر کیا۔ لارڈ کارنوالس نے سلطان کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا اور میوے سے بھرے ہوئے تمام خوان بھی واپس کر دیئے۔ پھر دوسرے دن ہی محاصرہ اٹھا کر کڑی کد سے ہوتا ہوا ”اتری وردگ“ پہنچا۔ روانگی سے پہلے اس نے جنرل کراچی کو خط لکھا تھا۔ جنرل کراچی محاصرے کو تقویت پہنچانے کے لئے ملابار سے سرنگا پٹم پہنچنا چاہتا تھا۔

”میں اور میری فوج شدید مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔“ لارڈ کارنوالس نے جنرل کراچی کو حالات سے باخبر کرتے ہوئے تحریر کیا تھا۔ ”میرے سپاہی ناقابل بیان اذیتوں میں مبتلا ہیں۔ قلت غذا کی یہ صورت ہے کہ ان کی خوراک نصف کر دی گئی ہے۔ بار برداروں کی اکثریت بھوک سے مر رہی ہے اور جو بچ گئے ہیں وہ مرنے کے قریب ہیں۔ اس لئے تم ملابار میں مقیم رہو اور آگے بڑھ چکے ہو تو بلا تاخیر واپس لوٹ جاؤ۔ نیپو پر ہمارا قرض باقی ہے، کسی مناسب موقع پر وصول کر لیں گے۔“

لارڈ کارنوالس اپنی فوج کے ساتھ ”اتری وردگ“ میں بڑی اذیت ناک زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے سپاہی غذا کی کمی کے باعث نیم جاں ہو کر رہ گئے تھے۔ اگر اسی طرح کچھ دن اور گزر جاتے تو انگریز فوج کی مکمل تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مگر خود غرض اور متعصب مرہٹوں نے اسلام دشمنی میں ان عیار فرنگیوں کو بربادی سے بچا لیا جو اپنے سوا کسی کے دوست نہیں تھے۔

لارڈ کارنوالس غذا کی تلاش میں ”اتری وردگ“ سے ”چنگرونی“ پہنچا۔ یہ انگریزوں کی خوش نصیبی تھی اور ہندوستان کی بدبختی کہ مرہٹہ سردار پرشورام راستے میں مل گیا۔ اس کے پاس سامان رسد کی فراوانی تھی۔ کئی ماہ بعد انگریزوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ جب شکم کی آگ بجھی تو لارڈ کارنوالس کے ذہن میں نیپو کے خلاف سازش کے نئے شعلے بھڑکنے لگے۔



سلطان مطمئن ہو گیا تھا کہ انگریز اپنے اتحادیوں کے ساتھ واپس جا چکا ہے اور اب وہ ایک طویل عرصے تک ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ یہی سوچ کر نیپو نے اپنے بڑے بیٹے، فتح حیدر کو گرم کندہ کی طرف روانہ کیا۔ اس وقت نظام دکن کی فوج حافظ فرید الدین کی قیادت میں گرم کندہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ شہزادہ فتح حیدر اور علی رضا خان نے نظام کی فوج پر پوری طاقت سے حملہ کر دیا۔ حافظ فرید الدین نے کچھ دیر تو جم کر مقابلہ کیا مگر سلطانی لشکر کا حملہ بہت شدید تھا۔ حافظ فرید الدین زخمی ہو کر زمین پر گر اور میدان جنگ ہی میں اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ اپنے سالار کا یہ حشر دیکھ کر حیدر آبادی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔

گرم کندہ سے نکل کر شہزادہ فتح حیدر، مورسن بلی اور وانم باڑی کی طرف بڑھا۔ یہاں سکندر جاہ اور شیر الملک کے حیدر آبادی لشکر خیمہ زن تھے۔ سلطانی فوج کی آمد کی خبر سن کر سکندر جاہ اور

”نہم ہو جائے۔“

”اب اس کا وقت گزر چکا سید صاحب!“ سلطان کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔ وہ تینوں عورتیں اپنی بیگی کا سہارا لے کر آسمان سر پر اٹھا لیں گی اور یہ بات ہمارے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوگی۔ مذہب کی بنیاد پر مقامی ہندوؤں کے دل ہماری طرف سے تنگ ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ مرہٹوں اور دوسرے ہندو راجاؤں کے مذہبی جذبات بھی بھڑک اٹھیں گے اور انہیں ہمارے خلاف محاذ آرائی کا ایک نیا بہانہ مل جائے گا۔ اور میں میسور کی رانیوں کو قصور وار سمجھتا بھی نہیں کہ یہ ریاست پہلے انہی کی جاگیر تھی۔“ نیپو سلطان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”سید صاحب! میسور کی رانیوں یا سرنگاپٹم کے رہنے والے چند افراد کی غدار یوں سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہماری تباہی کا سبب تو وہ قلعہ دار ہیں جو اتحادیوں سے رشوت لے کر اپنے مضبوط مکان ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔“

سید غفار، سلطان کے دلائل سن کر خاموش ہو گئے مگر اس کے باوجود ان کا دل پورنیا اور رانیوں کی طرف سے صاف نہیں تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس گفتگو کے دوسرے دن ہی رانی لکشمی ما اور رانی دیوا جی منی نے اپنے ایجنٹ ترمل راؤ کو منی پیشکش کے ساتھ انگریزوں کے پاس بھیج دیا۔

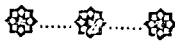
رانی لکشمی ما نے لارڈ کارنوالس کو کھلے لفظوں میں تحریر کیا تھا۔

”آپ کسی تردد کے بغیر سرنگاپٹم پر حملہ کریں۔ میں اخراجات جنگ کے طور پر ایک کروڑ پگڑے ادا کروں گی۔“ پگڑا، میسور کا سکہ جس کی قیمت ساڑھے تین روپے کے برابر تھی۔

”رانیوں سے کہو کہ وہ کچھ دن اور صبر سے کام لیں۔“ لارڈ کارنوالس نے ترمل راؤ کی پیٹھ تپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”عقرباب ان کی جاگیر انہیں مل جائے گی۔“

ترمل راؤ پیٹنگی کے طور پر ایک لاکھ پگڑے اپنے ہمراہ لے کر گیا تھا۔ وہ ساری رقم اس نے لارڈ کارنوالس کے سامنے ڈھیر کر دی۔ انگریز گورنر جنرل نے بڑے متکبرانہ انداز میں ہندوستانی سکوں پر اپنے پاؤں رکھ دیئے۔

”رانی کی یہ پیشکش قبول کی گئی۔“



برسات کا موسم ختم ہونے کے قریب تھا اور لارڈ کارنوالس، سلطنتِ خدا داد پر حملے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

اسی دوران ایک دن سریتا دیوی گھبرائی ہوئی راج محل پہنچی۔ مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم اسے دیکھ کر مسرت سے کھل اٹھیں مگر دوسرے ہی لمحے ان کے چہرے اور اُداس نظر آنے لگے۔

”بیٹی! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟“ مجیدہ بیگم نے آگے بڑھ کر سریتا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ ”تو تو برسوں کی بیمار نظر آ رہی ہے۔“ سریتا کی سرخ و سفید رنگت سیاسی مائل ہو گئی

تھا۔ ایک دن سالار میسور نے تنہائی میں عرض کیا۔

”سلطان والا چشم! کشن راؤ کے آخری الفاظ میرے ذہن میں کسی کانٹے کی طرح چبھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے کچھ جاسوسوں کو اس کام پر متعین کر دیجئے کہ وہ غداروں کا سراغ لگائیں۔ ہم ان سے نجات حاصل کئے بغیر کوئی نتیجہ خیز جنگ نہیں لڑ سکتے۔ ہر وقت یہی خدشہ رہتا ہے کہ کب اپنے ہی ساتھی کمائیں کھینچ لیں گے اور سازش کے ذریعے تیر ہمارے جسموں میں پیوست ہو جائیں۔“

”جاسوس بھی کہاں کہاں بھاگتے پھریں؟“ نیپو سلطان کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ ”وہ دشمنوں کے حملے کی خبر لائیں یا اپنی ہی صفوں میں چھپے ہوئے غداروں کی جستجو کریں؟ اور خود میں بھی کیا کروں سید غفار! بابا محترم کے انتقال سے لے کر آج تک مجھے ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا ہے۔ رعایا کے حقوق ادا کروں، غداروں کو تلاش کروں یا اتحادیوں سے جنگ کروں؟“

”سلطان معظم! میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں مگر پھر بھی جو غدار ہمارے قریب ہیں، ان پر تو قانون کی گرفت مضبوط ہونی چاہئے۔“ سید غفار نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

نیپو سلطان نے چونک کر اپنے سپہ سالار کی طرف دیکھا۔

”مثال کے طور پر میسور کی رانیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ انہیں پہلے ہی دن سے کھلا چھوڑ دیا گیا۔“ سید غفار نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”نواب بہادر کے دور حکومت میں بھی ان رانیوں نے بیرونی حملہ آوروں کا خیر مقدم کیا ہے۔ کشن راؤ کے بارے میں

بھی یہ اطلاعات موجود ہیں کہ وہ تینوں رانیوں سے بہت زیادہ رسم و راہ رکھتا تھا۔ اور اسی کشن راؤ نے پورنیا کو بھی نواب بہادر کے یہاں ملازم رکھوایا تھا۔ اسی لئے میں اپنی حد تک رانیوں کو

بھی مجرم سمجھتا ہوں اور پورنیا کو بھی۔“ سید غفار نے غداروں کی طرف ایک مبہم سا اشارہ کر دیا تھا۔ ”اگر پورنیا پر سختی کی جائے تو یہ راز فاش ہو سکتا ہے کہ کشن راؤ نے قتل ہونے سے پہلے جس

آگ کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ آگ حقیقتاً کیا ہے اور کہاں کہاں بھڑک رہی ہے۔“

”پورنیا ایک انتہائی دیانت دار اور لائق وزیر ہے سید صاحب!“ نیپو سلطان نے کھلے دل سے پورنیا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہندو ہوتے ہوئے بھی اس نے حکومت

کے خزانے میں ایک پیسے کی خورد برد نہیں کی ہے۔ اس کا حساب مکمل اور صاف ہے۔ اس کے برعکس میر صادق علی نے جو کچھ کیا، وہ آپ کے سامنے ہے۔ پھر ہم دونوں میں سے کسے غدار

سمجھیں گے؟“

سید غفار لا جواب ہو گئے۔ تاہم انہوں نے آخری کوشش کے طور پر عرض کرتے ہوئے کہا۔

”سلطان ذی وقار! آپ کی ہر بات درست۔ مگر پھر بھی میرا ذہن پورنیا کی طرف سے صاف نہیں۔ اگر آپ وزیر خزانہ کو بے قصور سمجھتے ہیں تو کم سے کم کچھ دنوں کے لئے تینوں رانیوں کو ان کے مکانات میں نظر بند کر دیجئے۔ یہاں تک کہ باہر لوگوں سے ان کا رابطہ مکمل طور



تھی اور وہ حسین و جمیل لڑکی اس وقت ایک خزاں رسیدہ شاخ کی مانند نظر آ رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں مادرِ ملکہ!“ سریتا دیوی نے جبراً مسکرائے کی کوشش کی۔ ”سمرات کہاں ہیں؟“

سریتا کا اشارہ ٹیپو کی طرف تھا۔

”وہ اس وقت دربارِ عام میں ہو گا۔“ مجیدہ بیگم نے کہا۔ ”کیا سلطان سے کوئی ضروری کام ہے؟“

”بہت ضروری۔“ سریتا دیوی حد سے زیادہ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ”اتنا ضروری کہ اس کے سوا مجھے کوئی دوسرا کام ہی نہیں۔“

مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم، سریتا کے لہجے کی خلش پر چونک اٹھی تھیں۔ ”پھر تو تجھے عشاء کے بعد تک انتظار کرنا ہو گا۔“

ٹیپو سلطان کی عات تھی کہ وہ ناشتے کے بعد مسلسل رات کے آٹھ بجے تک امورِ سلطنت انجام دیتا تھا۔ اس دوران اپنے ایک مخصوص کمرے میں ساری نمازیں ادا کرتا۔ یہ کمرہ دربارِ عام سے ملحق تھا۔

ٹیپو، دربارِ درخواست کرنے کے بعد محل پہنچا تو سریتا بڑی بے چینی کے ساتھ اس کی منتظر تھی۔ ٹیپو نے عشاء کی نماز ادا کی اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ سریتا بھی کھانے میں شریک تھی مگر غذا کا ہر لقمہ بمشکل اس کے حلق سے اتر رہا تھا۔ ٹیپو اسے بار بار ٹوکتا رہا۔ کئی مرتبہ سلطان نے سریتا کی شکستہ حالت کا بھی ذکر کیا مگر سریتا خاموش بیٹھی رہی۔

پھر جب کھانا ختم ہو گیا تو ٹیپو، سریتا سے مخاطب ہوا۔

”اس جنگل میں پڑے تم نے اپنی صحت تباہ کر ڈالی۔ کبھی آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھ لیا کرو۔“

”تمام آئینے ٹوٹ گئے اور ساری شکلیں مسخ ہو گئیں۔ اب دیکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔“

سریتا کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور وہ بڑے کرب ناک لہجے میں بول رہی تھی۔

”بیٹی! ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔“ مجیدہ بیگم نے سریتا کو تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ تنہائی کے شب و روز نے سریتا کو زندگی سے مایوس کر دیا ہے۔

”کیا امیدوں کا فسوں اور کیا مایوسیوں کا ظلم۔ سب کچھ فنا ہو گیا۔“ سریتا نے مجیدہ بیگم کی بات کا جواب دیا اور پھر ٹیپو سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”سمرات! کل رات میں نے بڑا دہشت انگیز خواب دیکھا ہے۔ اس منظر کی ہولناکی سے ابھی تک میرا دل قابو میں نہیں ہے۔“

ٹیپو ہمہ تن گوش ہو گیا۔ مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم بھی سریتا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

سریتا کہنے لگی۔

”میں نے نواب بہادر کو بڑی تکلیف دہ حالت میں دیکھا ہے۔ ان کا پورا جسم خون میں ڈوبا ہوا ہے اور دونوں بازو کٹے ہوئے تھے۔ نواب بہادر کے گرد ہندوؤں کا ایک ہجوم ہے اور

ہزاروں پجاری اپنے ہاتھوں میں ترشول اٹھائے ناچ رہے ہیں۔“

ابھی سریتا دیوی کی بات مکمل ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ مجیدہ بیگم غضب ناک ہو کر بول اٹھیں۔

”خاموش ہو جا، بے ہودہ لڑکی! جب بھی آتی ہے، کوئی بدشگونی کی خبر لے کر آتی ہے۔ پہلے آئی تھی تو سلطان کے تخت کی بربادی کی خبر لے کر آئی تھی۔ اور اب آئی ہے تو میرے بیٹے کی حالت زار بیان کرنے آئی ہے۔ نواب بہادر تو ہمیشہ تیرے دل میں ٹھکتے ہی رہے۔ ان ہی کی وجہ سے تو ٹیپو کو حاصل نہ کر سکی اور میسور کی ملکہ بننے کا تیرہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔“

”یہ آپ کیا فرما رہی ہیں مادرِ ملکہ؟“ اذیت و کرب کی شدت سے سریتا کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔

”منجوس لڑکی! پیدا ہوئی تو ماں کو کھائی اور پھر دادی اور باپ کو بھی کھالیا۔“ مجیدہ بیگم، بیٹے کی محبت میں اس وقت انتہائی توہم پرست عورت نظر آ رہی تھیں۔ ”جہاں بھی جاتی ہے، اپنی نحوست ساتھ لے کر جاتی ہے۔ جب تیری محرمیاں دور نہیں ہوتیں تو ہماری بربادی کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔“

یہ نفرت آمیز باتیں سن کر سریتا کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

”تو نے ہمارے حوالے سے کوئی اچھا خواب بھی دیکھا ہے؟“ اس بار فاطمہ بیگم، سریتا سے مخاطب ہوئیں۔ ان کا لہجہ بھی مجیدہ بیگم کی طرح شرار بار تھا۔

”آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔“ مجیدہ بیگم جوشِ غضب میں کھڑی ہو گئیں۔ ”خدا کے لئے، ہمارا پیچھا چھوڑ دے۔“

سریتا نے پھرائی ہوئی آنکھوں سے ٹیپو کی طرف دیکھا جیسے وہ سلطان سے مجیدہ بیگم کے جارحانہ رویے کی شکایت کر رہی ہو۔

”وادی محترم!“ ٹیپو نے مؤدب لہجے میں مجیدہ بیگم کے تحقیر آمیز سلوک کے خلاف احتجاج کرنا چاہا۔ مگر مجیدہ بیگم نے سلطان کو کبھی جھڑک دیا۔

ٹیپو اپنے بزرگوں کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ان کی غلط باتوں کو بھی کسی قسم کی تنقید کا اظہار کئے بغیر برداشت کر لیتا تھا۔ اس موقع پر بھی سلطان کو خاموش ہو جانا پڑا۔

سریتا کا نپتے جسم کے ساتھ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

”سمرات! میں اپنی تمام تر نحوستوں کے ساتھ یہاں سے جا رہی ہوں۔ کاش! مجھے پہلے معلوم ہو جاتا کہ راج محل کے لوگ مجھ بد نصیب سے اتنی محبت کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر سریتا دروازے کی طرف بڑھی اور پھر اچانک مڑ کر ٹیپو سے کہنے لگی۔ ”سمرات! کیا عجیب وقت ہے کہ لوگ اس پر خود غرضی کا الزام عائد کر رہے ہیں، جس نے آپ کی بھلائی کے سوا کوئی خواب ہی نہیں دیکھا۔“ یہ کہہ کر سریتا تیز قدموں سے چلی گئی۔

سلطان، سرنگاچم کے قلعے میں محصور ہو کر رہ گیا۔ رات ہو چکی تھی، اس لئے جنرل میڈوز کی یلغار رک گئی۔ ٹیپو رات بھر جنگ کے منصوبے بناتا رہا۔ وہ بار بار سید غفار اور شجاعت خان کو مخاطب کر کے کہتا۔ ”میرا قلعہ سے نکلنا بہت ضروری ہے۔ میں اپنے تمام لشکروں سے کٹ کر رہ گیا ہوں۔ یہ درست ہے کہ کچھ لوگوں نے غدار کی مگر ابھی میرے جاں نثار بھی تو باقی ہوں گے۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہیں؟ اگر ان کی خبر گیری نہیں کی گئی تو پھر رسم وفا کہاں باقی رہے گی اور کون کس پر اعتبار کرے گا؟“

”سلطان معظم! تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔“ سید غفار نے بڑے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ ”اہل وفا پر تو ہمیشہ زمین تنگ ہی رہتی ہے۔“ ٹیپو اس تاریک فضا میں بہت پر عزم تھا اور اس کا چہرہ دوپہر کے سورج کی طرح دمک رہا تھا۔ ”ہمت تو کرو۔ زمین بھی اسی کی ہے اور تمام راستے بھی اسی کے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال دے گا۔“

سلطان رات بھر اپنے فوجی افسروں سے مشورے کرتا رہا اور پھر امانہ فخر ادا کرنے کے بعد اس نے اپنے سپاہیوں کو قلعے سے نکل کر دشمن پر بھرپور حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سید غفار، شجاعت خان اور دوسرے فوجی افسر، سلطان کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ وہ کسی مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔

”محاصرہ بھی ایک قسم کی قید ہے۔ اور میں ایک قیدی کی حیثیت سے مرنا نہیں چاہتا۔“ اپنے فوجی مشیروں سے بات کرتے وقت ٹیپو کے لہجے کا فطری جلال نمایاں ہو گیا تھا۔ ”اگر وہ معلوم آجپنا ہے تو پھر ہمیں فرشتہ اجل سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بستروں اور پناہ گاہوں کی موت ایک مجاہد کو زیب نہیں دیتی۔ نوشتہ تقدیر سے قطع نظر ہمیں میدان جنگ میں اپنی موت کا استقبال کرنا چاہئے۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو آنے والے لوگ ہمارے بارے میں یہی کہیں گے کہ کیسے کم ہمت و بزدل لوگ تھے جو اسلحے کے ذخائر اور بڑے لشکر کے ساتھ قلعہ بند ہو کر بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا سامان رسد ختم ہو گیا اور انہوں نے زنجیریں پہننے کے لئے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ دشمنوں کی طرف بڑھا دیئے۔“

فوجی افسر خاموش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ سلطان فیصلہ کرنے کے بعد اپنے الفاظ واپس لینے کا عادی نہیں ہے۔

بالآخر سلطانی لشکر اپنی ارادوں کے ساتھ قلعے سے نمودار ہوا۔ لارڈ کارنوالس نے ٹیپو کے باہیوں کو دیکھ کر ایک بڑے جوش نعرہ بلند کیا۔

”انجام کار وہ اپنی موت پر رضامند ہو گئے۔“ مگر جب سلطانی لشکر نے انگریز فوج پر حملہ کیا تو لارڈ کارنوالس حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے انداز کچھ ایسا ہی تھا کہ جیسے بھوکے عقاب، چڑیوں کے غول پر جھپٹ پڑے ہوں۔

”خدا کا شکر ہے کہ محل میں خوشتوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہوا۔“ مجیدہ بیگم نے بلند آواز میں کہا۔

دادی کے اس طرز عمل سے ٹیپو کو شدید تکلیف پہنچی تھی۔ وہ یہ کہتا ہوا کمرے سے اٹھ کر چلا گیا۔ ”دادی محترم! کوئی انسان منحوس نہیں ہوتا۔“

”آج کل کے لڑکے بزرگوں کے تجربات و مشاہدات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔“ مجیدہ بیگم بھی غصے میں بھری ہوئی اپنی خواب گاہ کی طرف چلی گئیں۔

پھر دوسرے دن ہی اس خبر نے دارالحکومت کے در و بام کو ہلا کر رکھ دیا کہ نظام، مرہٹے اور انگریز ایک لشکر جرار لے کر سرنگاچم کے محاصرے کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

اتحادی سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ سامان رسد کا تسلسل برقرار رکھنے کے لئے لارڈ کارنوالس نے بڑے عجیب انتظامات کئے تھے۔ باربرداری کے لئے جس قدر مزدور رکھے گئے تھے ان میں مردوں سے زیادہ عورتیں شامل تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سپاہی کے حصے میں بارہ مزدور آتے تھے۔ باربرداری کے جانوروں کی تعداد سپاہیوں سے پندرہ گنا زیادہ تھی۔ ان جانوروں میں ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، بیل اور گدھے شامل تھے۔ جب اتحادیوں کی یہ فوج کسی مقام سے کوچ کرتی تھی تو دیکھنے والوں کو ایسا لگتا تھا جیسے ساری دنیا سپاہیوں سے بھر گئی ہے۔

جب یہ فوج کسی رکاوٹ کے بغیر سرنگاچم کے مقابل پہنچی تو ٹیپو سلطان پر یہ خوفناک راز کھلا کہ اس کے قلعہ داروں نے کسی محاذ پر بھی مدافعت نہیں کی اور دشمن لشکر کو کسی خوف و خطر کے بغیر آگے بڑھنے کے لئے راستہ دے دیا۔ یہ تمام قلعہ دار انگریزوں کے ہاتھوں اپنا ضمیر بھی فروخت کر چکے تھے اور اپنی زمین بھی۔

اتحادی فوجوں نے بڑی آسانی سے دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا۔ مہدی علی خان ناسلہ کی سازش سے لارڈ کارنوالس، شہر گنجام اور عدل باغ پر اس طرح قابض ہو گیا کہ نہ کوئی مقابل آیا، نہ کوئی شمشیر بے نیام ہوئی اور نہ کوئی خون کا قطرہ بہا۔ سازش اس قدر مکمل تھی کہ ٹیپو کے وفاداروں کو گمان تک نہ ہو سکا۔ پھر جب لارڈ کارنوالس نے دارالحکومت کے قریب انتہائی حساس علاقوں پر قبضہ کر لیا تو سلطان کو معلوم ہوا کہ خود اس کا جسم ہی اس کی شمشیروں کا ہدف ہے۔

اتحادیوں کی دوسری فوج، جو جنرل میڈوز کے ماتحت تھی، اس نے عید گاہ والے مورچے پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ سید غفار نے بڑی بے جگری سے انگریز فوج کا مقابلہ کیا تھا اور اس اہم ترین مورچے کو بچانے کے لئے اپنے سینکڑوں سپاہیوں کی قربانیاں پیش کی تھیں لیکن سب کچھ رائیگاں گیا۔ غداروں نے جنرل میڈوز کی ان راستوں پر رہنمائی کی جو انتہائی خفیہ تھے اور جن کے بچے و خیم کو راز داران سلطنت ہی جانتے تھے۔ گھر کے عہدیدوں نے ایک ایک راز فروخت کر دیا اور ٹیپو

ہو کہ میں فطرتاً ایک صلح پسند انسان ہوں۔ مجھے خوزیری سے سخت نفرت ہے اور میں قتال و جدال کو انسانی تہذیب کے لئے ایک لعنت سمجھتا ہوں۔ میں شاہِ برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں امن و آشتی کا سفیر ہوں، اس لئے پوری گرم جوشی کے ساتھ آپ کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ ممکن ہے کہ آپ جوشِ غضب میں میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیں۔ مگر میرا ہاتھ اسی طرح پھیلا رہے گا اور میں آپ کے انکار کے باوجود مسلسل امن اور صلح کا سوال کرتا رہوں گا۔“

بڑا عجیب خط تھا۔ سننے والوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ لہجے کی شناسائی، لارڈ کارنوالس پر ختم ہو گئی ہے۔ ٹیپو سلطان بھی دم بخود تھا۔ سلطنتِ خداداد کے فرمانروا کو لارڈ کارنوالس کی تحریر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

خط کے آخر میں انگریز گورنر جنرل نے لکھا تھا۔

”خیر! ہمارے اور آپ کے درمیان صلح تو یقینی ہے۔ مگر آئندہ جنگ کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے چند شرائط کا طے ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو میں اپنا شرائط نامہ ارسال کروں۔ واضح رہے کہ یہ شرائط انتہائی مناسب اور سلطان کے لئے قابلِ قبول ہوں گی۔“

آپ کا مخلص، لارڈ کارنوالس  
گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی

بڑا فریب کار خط تھا۔ سلطان کے غدار امیروں نے انتہائی پُر جوش انداز میں لارڈ کارنوالس کی اس پیشکش کا خیر مقدم کیا۔ ٹیپو کے وفادار امراء بھی جو فطرتاً عیش پسند تھے اور اس طویل محاذ آرائی سے تنگ آ چکے تھے، انہیں بھی لارڈ کارنوالس کی طرف سے صلح کا پیغام موصول ہونے پر خوشی کا احساس ہوا تھا۔ اور خود ٹیپو بھی نمک حراموں کی بھڑکائی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے کچھ دنوں کی مہلت چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے سلطان نے کارنوالس کا خط سن کر بھرے دربار میں اپنی مسرت کا اظہار کیا تھا۔

”اگر وہ حقیقتاً دوست ہے تو اسے ایک دوست کا سلام پہنچا دو۔“ سلطان نے لارڈ کارنوالس کے قاصد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم صلح کی خاطر اس کے شرائط نامے کا خوش دلی کے ساتھ انتظار کریں گے۔“

پھر جب انگریز گورنر جنرل کا شرائط نامہ موصول ہوا تو کچھ دیر کے لئے ٹیپو سناٹے میں آ گیا۔ لارڈ کارنوالس نے صلح کے لئے حسبِ ذیل شرائط پیش کی تھیں۔

سلطان اتحادیوں کے لئے تین کروڑ روپے کی آمدنی کا علاقہ چھوڑ دے۔

تین کروڑ روپے کی رقم نقد ادا کی جائے۔

اگر یہ رقم قسطوں میں ادا کی گئی تو آخری پائی وصول ہونے تک دوشیزادے، انگریزوں کی نگرانی میں رہیں گے۔

”یہ صلح کا شرائط نامہ ہے یا میری بربادی کی دستاویز؟“ شدتِ کرب سے ٹیپو کی آواز تیز

ٹیپو بذاتِ خود قلعے کی فسیل پر گولہ باری کی نگرانی کر رہا تھا۔

لارڈ کارنوالس کی فوج بمشکل چند گھنٹے ہی میدان میں ٹھہر سکی۔ جب فرنگیوں کے جسم کے ہوئے درختوں کی طرح گرنے لگے تو لارڈ کارنوالس اپنی فوج کے ہمراہ میدان سے فرار ہو گیا۔

سلطانی لشکر نے بہت دور تک انگریزی فوج کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور لارڈ کارنوالس ڈوبتے سورج کی روشنی میں دریا پار کر کے کڑی گتہ پہنچ گیا۔ ٹیپو کی فوج نے اندھیرا ہو جانے کے خیال سے انگریز لشکر کا تعاقب ترک کر دیا اور وہ تیز رفتاری کے ساتھ سرنگاپٹم کی طرف لوٹ آئی۔ اس وقت سلطانی فوج کسی ذہین سالار کی قیادت سے محروم تھی۔ ورنہ اگر تعاقب جاری رکھا جاتا تو اسی رات اتحادی فوجوں کا خاتمہ ہو جاتا۔

ٹیپو اپنے فوجی افسروں کی فراہم کردہ اطلاعات سے مطمئن ہو گیا کیونکہ اس کا لشکر، سرنگاپٹم کا محاصرہ توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ سلطان کا یہ سکون بہت عارضی تھا۔ لارڈ کارنوالس فرار کی ذلت اٹھانے اور شکست کا زخم کھانے کے باوجود چند ہی روز میں سنبھل گیا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک نئے زاویے سے دارالحکومت کا محاصرہ کر لیا۔ یہ نیا زاویہ ایک آہنی جال تھا، جسے ٹیپو نے اپنی بے پناہ شجاعت کے ذریعے توڑنے کی جدوجہد کی مگر غداروں نے سلطان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ ٹیپو جس قدر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، اسی قدر فولادی شکنجے میں جکڑتا جا رہا تھا۔ اپنے باقی علاقوں سے سلطان کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ ایسی خوفناک فضا میں سلطان کے کئی جاسوسوں نے سرنگاپٹم کی حدود سے نکلنے کی کوشش کی مگر لارڈ کارنوالس کے جاسوسوں نے انہیں پکڑ لیا۔ آخر سلطان کے جاسوسوں کو اس خیال سے خودکشی کرنی پڑی کہ کہیں انگریزوں کے تشدد کے سامنے ان کی زبانیں نہ کھل جائیں اور ریاست کے انتہائی نازک راز، دشمنوں تک نہ پہنچ جائیں۔

سرنگاپٹم کا محاصرہ طویل پکڑتا چلا گیا اور سلطان کی مشکلات میں پیچیدہ اضافہ ہوتا رہا۔ اب اس کا وقت بھی گزر چکا تھا کہ ٹیپو، اتحادیوں کو صلح کا پیغام بھیجے۔ اگر سلطان ایسا کرتا تو دشمن اپنی سخت شرائط پیش کرتے کہ یہ صلح، غلامی کی منزل پر جا کر ٹھہرتی۔

آخر جب لارڈ کارنوالس نے گیدڑوں اور لومڑیوں کی چالیں چل کر شیرِ مینور کے گرد آہنی حصار کھینچ دیا تو اسے ٹیپو سے صلح کرنے کا خیال آیا۔ انگریز گورنر جنرل کی یہ ایک اور الجھی ہوئی چال تھی۔

لارڈ کارنوالس نے بڑے شائستہ لہجے میں سلطان کے نام ایک خط تحریر کیا۔

”چند ماہ پہلے آپ کا ایک محبت نامہ موصول ہوا تھا، جس میں آپ کی طرف سے صلح کا پیغام دیا گیا تھا۔ اصولی طور پر مجھے فوراً اس کا جواب دینا چاہئے تھا مگر کیا عرض کوں کہ اس وقت میری بے اندازہ مصروفیات نے مجھے کاغذ، قلم اور روشنائی کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیا۔ میں اس سلسلے میں آپ سے بہت معذرت خواہ ہوں۔ اب فرصت میسر ہوئی ہے تو ایک لمحہ ضائع سے بغیر جناب والا کے مکتوب کا جواب دے رہا ہوں۔ شاید سلطانِ محترم کو میری اس عادت کی خیر

ہو گئی۔

”سلطان جو بھی سمجھیں۔“ میجر ڈفن نے نصف قد تک خم ہوتے ہوئے کہا۔ یہی میجر ڈفن، لارڈ کارنوالس کا قاصد بن کر ٹیپو کے دربار میں آیا تھا۔ بڑا عیار شخص تھا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی طاری تھی مگر وہ دل ہی دل میں ٹیپو کی بے کسی پر مسکرا رہا تھا۔

”مجھے اس میں سے کوئی شرط بھی منظور نہیں۔“ ٹیپو سلطان جھنجھلا گیا۔ ”تمہارا گورنر جنرل نہایت جھوٹا انسان ہے۔ اس نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ ساری شرائط مناسب بھی ہوں گی اور قابل قبول بھی۔“

”سلطان محترم! اس میں کون سی شرط ناقابل عمل ہے؟“ میجر ڈفن سیدھا ہوا۔ اب اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ قفس کر رہی تھی۔

ٹیپو نے میجر ڈفن سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ”میرے لئے ایک شرط بھی قابل عمل نہیں۔“ سلطان کی آواز سے اس کا وہی رواجی رعب و جلال نمایاں تھا۔

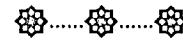
”تو پھر کمپنی بہادر کی بالادستی کو تسلیم کر لیجئے۔“ میجر ڈفن بڑی ذہانت سے لارڈ کارنوالس کی وکالت کر رہا تھا۔ ”اس کے بعد آپ کو کسی دشواری کا احساس نہیں ہو گا۔“

دراصل انگریز یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح ٹیپو ان کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دے۔ نظام اور مرہٹوں سے انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پیشوائے پونا اور والی دکن ان کے اشاروں پر تاج رہے تھے۔ بنگال اور آودھ کے حکمران پہلے ہی اپنے ضمیر اور قومی غیرت کو قتل کر کے فرنگیوں کے آستانے پر سجدے کر رہے تھے۔ بس ایک ٹیپو سلطان باقی رہ گیا تھا جس کی موجودگی کے سبب انگریزوں کو ان کے خواب کی تعبیر نہیں مل رہی تھی۔ لارڈ کارنوالس انگلستان کے وزیر اعظم، پٹ سے یہی وعدہ کر کے آیا تھا کہ وہ ٹیپو کو غلامی کی قابو پھانے گا یا پھر اپنے ہاتھوں سے اس مرد آزاد کا مقبرہ تعمیر کرے گا۔

کارنوالس کے اسی منصوبے کے تحت میجر ڈفن، سلطان کے حوصلوں کو آزمایا رہا تھا۔ اور اس نے درپردہ کمپنی بہادر کی غلامی قبول کرنے کی طرف ایک مبہم سا اشارہ بھی کر دیا تھا۔

ٹیپو، میجر ڈفن کے اس اشارے کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ ”خدا کی قسم! مجھ پر کوئی بھی عالم گزر جائے مگر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی غلامی قبول نہیں کروں گا۔“

”شرائط نامہ آپ نے سن لیا۔“ میجر ڈفن بدستور مسکرا رہا تھا۔ ”اتنے بڑے فیصلوں میں غلط سے کام نہیں لیا جاتا۔ میں کل پھر حاضر خدمت ہوں گا۔“ میجر ڈفن نے اسی ریاکارانہ ادا کے ساتھ جھک کر سلطان کو رخصتی سلام کیا اور تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔



میجر ڈفن کے جاتے ہی سلطان نے اپنے امراء کی طرف دیکھا۔ پورے دربار میں ایک امیر بھی ایسا نہیں تھا جو لارڈ کارنوالس کی پیش کردہ شرائط سے اختلاف کرتا۔

ٹیپو نے ایک لمحے میں صورت حال کو سمجھ لیا اور اس پر یہ خوفناک راز فاش ہو گیا کہ سلطنت خداداد کے اکثر امراء بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ پھر بھی اتمامِ حجت کے لئے اس نے ایک ایک امیر سے پوچھا۔

”انسان کو اپنی جان اور جاگیر بچانے کے لئے کبھی کبھی انتہائی ناپسندیدہ اور ناخوشگوار فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ آپ کا یہ فیصلہ بھی اسی انداز کا ہو گا۔“ ہر امیر کی زبان سے ایک ہی جیسے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

”تمہیں خبر ہے کہ میں کیا فیصلہ کرنے والا ہوں؟“ اپنے امراء کی حوصلہ شکن باتیں سن کر سلطان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”فی الحال ہمارا یہی مشورہ ہے کہ آپ لارڈ کارنوالس کی پیش کردہ شرائط تسلیم کر لیں۔“ امراء نے آزمائش کے میدان میں اپنے فرمانروا کو تہا چھوڑ دیا تھا۔

پورے دربار میں بس میر صادق علی اور پورنیا ہی تھے، جو پُر جوش آوازوں میں بول رہے تھے۔

”سلطان معظم! ہمیں یہ شرم ناک صلح قبول نہیں ہے۔ آپ کے جاہ و جلال کی قسم! اپنے خون کا ایک ایک قطرہ بہا دیں گے مگر دشمنوں کے آگے سر نہیں جھکائیں گے۔“

اگرچہ میر صادق اور پورنیا، ریاست کے سب سے بڑے غدار تھے لیکن وہ اس نازک صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو سلطان کا جاں نثار ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ٹیپو نے میر صادق اور پورنیا کی طرف دیکھا اور دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔



سلطان کی حرم سرا میں ایک کہرام برپا تھا۔ جب خواتین کو یہ معلوم ہوا کہ انگریزوں نے دہلی اور دہلی کو بطور برغمال طلب کیا ہے تو محل کی پوری فضا آہوں اور سسکیوں میں ڈوب گئی۔ مجیدہ بیگم اور رقیہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سلطان کی دوسری بیوی رقیہ کا برا حال تھا۔ کیونکہ اگر سلطان اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کو لارڈ کارنوالس کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر لیتا تو ایک ماں کی حیثیت سے رقیہ بانو کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہوتا۔

”مسلم خواتین کو یہ آہ و زاری زیب نہیں دیتی۔“ سلطان نے اپنی والدہ، دادی اور بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہمارے بچے دوسرے بچوں سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔ ان بچوں کی بے چارگی کا بھی کچھ خیال کیجئے، جن کے باپ ہماری ریاست کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر گئے۔ اگر آج ہمارے بچوں پر یہ وقت آپڑا ہے تو ہمیں اہل ایمان کی طرح صبر کرنا چاہئے۔ اور اہل تو میں نے دشمن کی یہ شرط قبول نہیں کی ہے۔ پھر وقت سے پہلے یہ شور ماتم کیسا؟“



کی تیز بارش ہو رہی ہو۔



دوسرے دن میجر ڈفنن دربار میں آیا تو سلطان نے لارڈ کارنوالس کی تینوں شرائط تسلیم کرتے ہوئے ایک کروڑ روپے نقد ادا کر دیے اور باقی رقم کی جلد ادائیگی کے لئے وعدہ کر لیا۔ میجر ڈفنن دوبارہ کارنوالس کے پاس پہنچا اور خچروں پر لدی ہوئی رقم اس کے سامنے ڈھیر کر دی۔

”ہم سیاست میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔“ لارڈ کارنوالس انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں ڈفنن سے مخاطب ہوا۔ ”سلطان سے کہو کہ وہ شرائط کی پوری پوری تکمیل کرے۔ ہم اس سے بھیک نہیں، خراج مانگ رہے ہیں۔ اگر سلطان کو ہماری شرائط منظور نہیں تو یہ رقم اس کے منہ پر مار دو اور صاف صاف کہہ دو کہ سلطنتِ خداداد کی تباہی تک جنگ جاری رہے گی۔“ لارڈ کارنوالس اب اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوا تھا۔ اس کے لہجے کی ساری شائستگی غائب ہو گئی تھی اور وہ بالکل انسان سے ایک ایسا درندہ بن گیا تھا، جس کے منہ کو آدمی کا خون لگ جاتا ہے۔

سلطان اپنے بچوں کو لارڈ کارنوالس کے حوالے کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے کسی نہ کسی طرح اس آفتِ ناگہانی کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل، سیاست کی بظاہر عیار ترین شاطر تھا۔ اس نے غداروں کے ذریعے پہلے ہی ساری معلومات حاصل کر لی تھیں کہ سلطان ایک مشیت تین کروڑ روپے کی رقم ادا نہیں کر سکے گا۔ نیپو نے ایک کروڑ روپیہ بھی اس طرح ادا کیا کہ پورا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔

”کل معاہدے کی ساری رقم لے جانا یا پھر اپنے بیٹوں کو ضمانت کے طور پر تمہارے حوالے کر دوں گا۔“ نیپو نے بڑی استقامت کے ساتھ میجر ڈفنن سے کہا۔

نیپو کا اقرار سن کر غدارانِ سلطنت بھی خوش تھے اور وہ امراء بھی، جنہیں عیش و نشاط کی زندگی پسند تھی۔ جاں نثاروں کی آنکھوں کے گوشے بھیک گئے کہ سلطان نے اپنے بیٹوں کی قربانی دے کر سلطنتِ خداداد کے وجود کو بچا لیا تھا۔

سلطان دربارِ برخاست کر کے حرمِ سرا میں پہنچا تو ایک حشر سا برپا تھا۔ رقیہ بانو بہت حوصلہ مند خاتون تھیں مگر اونا کی جدائی کے تصور نے انہیں گستاخ بنادیا۔

”کیا آپ کا اقتدار میری اولاد سے زیادہ قیمتی ہے؟“ رقیہ بانو جوشِ جذبات میں چیخنے لگی تھیں۔

”ڈشمنوں نے مجھ سے میرے ہی بیٹے طلب کئے تھے۔“ نیپو نے بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر انہیں تاج و تخت دے دیتے۔“ رقیہ بانو کے لہجے میں بڑی نثریت تھی۔

”تاج و تخت ایک حکمران کی آبرو ہوتے ہیں۔“ نیپو ایک جذباتی اور مضطرب ماں کو

یہ کہہ کر نیپو اپنی خصوصی نشست گاہ میں چلا گیا جہاں کچھ دیر بعد سلطان کے طلب کرنے پر سید غفار اور شجاعت خان بھی پہنچ گئے۔

جاں نثاروں کے ہجوم میں بس یہی دو افراد باقی رہ گئے تھے جن کے چہروں سے ابھی تک وفا کا رنگ نمایاں تھا۔ سلطان بہت دیر تک ان دونوں سے گفتگو کرتا رہا مگر سید غفار اور شجاعت خان بھی اپنے فرمانروا کو کوئی مشورہ نہ دے سکے۔ ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، جس میں سلطان کے وفاداروں کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر ریاست کے غدار اسی اندھیرے میں اپنا روشن مستقبل دیکھ رہے تھے۔

راج محل کا دوسرا حصہ، جہاں رانیاں مقیم تھیں، اس وقت مندر بنا ہوا تھا۔ سرنگاپٹم کے تمام برہمن، پنڈت اور پجاری راج محل میں جمع تھے اور پرشور آوازوں میں بھجن گائے جا رہے تھے۔ پورنیا ایک ایک لمحے کی خبریں پہنچا رہا تھا، جنہیں سن کر رانیاں اور راج گھرانے کے دوسرے افراد خوشی سے جھوم رہے تھے۔ ان سب لوگوں کو سلطان کی مکمل تباہی کا یقین ہو چکا تھا۔ اور گیانی آئند پال چیخ رہا تھا۔

”رام راج آچکا۔ اب اسے کوئی نہیں روک سکتا۔“

رانی لکشمی ما اور رانی دیواجی منی نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے نئی چال چلی۔ وہ دونوں سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بڑے افسردہ لہجے میں کہنے لگیں۔

”ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم ایسے نازک وقت میں ریاست کے کسی کام نہ آ سکے۔ پھر بھی راج محل میں شب و روز پوجا ہو رہی ہے اور سینکڑوں محبت و وطن ہندو آپ کی سلامتی کے لئے پراتھنا کر رہے ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو بہت جلد یہ سنگت کا سہ (مصیبت کا وقت) گزر جائے گا۔“

سلطان، رانیوں کی سازشوں سے بے خبر تھا، اس لئے وہ خاموشی سے لکشمی ما اور دیواجی منی کی گفتگو سنتا رہا۔ پھر جب وہ دونوں خاموش ہو گئیں تو سلطان نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ خدا، ہندوستان کو فرنگیوں کی غلامی سے محفوظ رکھے۔“

دراصل دونوں رانیاں یہ سوچ کر آئی تھیں کہ ایک طرف وہ ہمدردی کا اظہار کر کے اپنی مشتبہ شخصیات کو معصوم ثابت کر سکیں گی اور دوسری طرف سلطان کی بے چارگی و بدحواسی سے لطف اندوز ہو سکیں گی۔ رانی لکشمی ما اور رانی دیواجی منی، نیپو کی سادہ لوحی اور اعلیٰ ظرفی کی وجہ سے اپنی اس کوشش میں تو کامیاب ہو گئیں کہ سلطنتِ خداداد کے فرمانروا نے اب تک انہیں شک کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر ان کی دوسری خواہش پوری نہ ہو سکی۔ سلطان، رانیاں سے اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے موسمِ نہایت خوشگوار ہو اور ریاست کی سرحدوں پر امن و عافیت

اے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی کانٹا حلق سے شکم تک اتر گیا ہے۔ کھانا کھا کر دوبارہ سلطان اپنے کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی اس نے شجاعت خان کو طلب کر لیا۔  
”دروازہ بند کر دو۔“ شجاعت خان کے داخل ہوتے ہی ٹیپو نے کہا۔

شجاعت خان چہرے سے برسوں کا بیمار معلوم ہو رہا تھا۔  
”میں بابا محترم کی قبر پر حاضر ہونا چاہتا تھا۔“ ایک ٹیپو کے لہجے سے اُداسی جھلکنے لگی تھی۔  
شجاعت خان نے چونک کر سلطان کی طرف دیکھا۔

”شہزادے! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“ ٹیپو نے شجاعت خان کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی تھی، اسی وجہ سے شجاعت خان اسے ”شہزادہ“ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ مگر دربار میں وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ٹیپو کو ”سلطان محترم“ کہا کرتا تھا۔ ”نواب بہادر تو لال باغ میں آرام فرما رہے ہیں اور لال باغ پر دشمنوں کا قبضہ ہے۔ مگر آپ وہاں کس لئے تشریف لے جانا چاہتے تھے؟“

”میرے دل پر بہت بوجھ ہے شجاعت خان!“ ٹیپو کا لہجہ کچھ اور اُداس ہو گیا تھا۔ ”میں بابا محترم کے سامنے اپنے ناکارہ ہونے کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں شہزادے!“ ٹیپو کی شدتِ احساس نے شجاعت خان کو زلادیا تھا۔ ”آپ جیسے بیٹے تو کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر نواب بہادر زندہ ہوتے تو برسرِ عام آپ کی پیشانی کو بوسہ دیتے اور سب کے سامنے اعتراف کرتے کہ آپ فخرِ خاندان ہی نہیں، فخرِ ہندوستان بھی ہیں۔“

”نہیں شجاعت خان! تم اپنی محبت و جاں نثاری کا حق ادا کرنے کے لئے حقیقت سے آنکھیں جرا رہے ہو۔“ ٹیپو کے لہجے کا کرب مزید نمایاں ہو گیا تھا۔ ”ابھی تمہیں اندازہ نہیں مگر جب اتحادیوں سے یہ معاہدہ بحال کو پہنچے گا تو میں آدھے ملک سے محروم ہو چکا ہوں گا۔ کیا یہ فخر خاندان ہونے کی علامت ہے کہ باپ نے جو کچھ دیا تھا، بیٹے نے اسے گنوا دیا۔“

”نہیں شہزادے! یہ سارے مسائل آپ کو میراث میں ملے ہیں۔“ شجاعت خان، ٹیپو کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے مایوسیوں کے غبار کو دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”نواب بہادر اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے، جب بیشتر علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ آپ نے بیک وقت تین بڑی طاقتوں سے بچہ آرائی کی اور انہیں شکست دے کر اپنا ایک ایک علاقہ واپس لیا۔“

”اور اب؟“ ٹیپو نے شاندار ماضی کو نظر انداز کر کے شکستہ حال کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تو گردشِ وقت کا ایک اندازہ ہے شہزادے!“ شجاعت خان بڑے سچے لہجے میں حقائق بیان کر رہا تھا۔ ”جب مہرے ہی خلاف ہو جائیں تو میر سپاہ کیا کر سکتا ہے؟“

”یہ مہرے میرے خلاف کیوں ہیں؟“ آخر ٹیپو کے دل کا درد اُس کی زبان تک آ گیا۔  
”بار بار ان کی خطائیں معاف کرتا ہوں، انہیں عزتِ نفس کا سبق دیتا ہوں اور مصیبتِ آلود زندگی سے بچانا چاہتا ہوں۔ رعایا کی خوشحالی اور آزادی میرا نصب العین ہے اور مساوات

سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”دنیا میں بے شمار تاج اُتارے گئے ہیں لیکن مردوں کے تاج اس وقت تک نہیں اُترتے، جب تک ان کے کاندھوں سے سر نہ اُتر جائیں۔ آپ مجھے اتنی بڑی دعا تو نہ دیجئے کہ میرا سلامت رہے اور تاج اُتار لیا جائے۔“

شوہر کی بات سن کر رقیہ بانو سنبھل گئیں اور پھرانی ہوئی آنکھوں سے سلطان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں، جہاں ازیت و کرب کا غبار پھیلا ہوا تھا۔

”آپ کو اندازہ نہیں کہ میں کتنا تنہا ہوں؟“ ٹیپو اپنے لہجے کی خلش کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اگر آپ تنہائی کی شریک نہیں ہو سکتیں تو کم سے کم میری بے چارگی کو تماشا تو نہ بنائیے۔“ رقیہ بانو اپنی غلطی کا احساس کر کے وقتِ آمیز لہجے میں شوہر سے معافی مانگنے لگیں۔

”آپ نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ جذبات کی طغیانی میں اکثر لوگ بہہ جاتے ہیں۔“ پُر نے غم زدہ ماں کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”مگر کچھ لوگ آخری سانس تک بلا خیر موجوں سے لڑتے ہی رہتے ہیں۔ اگر وہ ذوبِ جان تو ان کی تاریخِ ہمیشہ کے لئے دریا کے سینے پر تیز کر دی جاتی ہے کہ موت کو گلے لگا لیا مگر پانی سے زندگی کی بھیک نہیں مانگی۔ اور اگر وہ ساحلِ مراد تک پہنچ جائیں تو خود اپنی تاریخِ رقم کرتے ہیں۔ پھر ان سے دریا بھی شرمندہ رہتا ہے اور طوفان بھی۔“ یہ کہہ کر ٹیپو خاموش ہو گیا۔ رقیہ بانو اپنے جذباتی ردِ عمل پر بہت شرمسار نظر آرہی تھیں۔  
”آپ جانتی ہیں کہ سید غفار نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے کیا کہا تھا؟“ سلطان دوبارہ اپنی شریکِ حیات سے مخاطب ہوا۔

رقیہ بانو چونک کر شوہر کی طرف دیکھنے لگیں۔  
”اُس مردِ جاں نثار نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر لارڈ کارنوالس آمادہ ہو جائے تو وہ شہزادوں کے بدلے اپنے دونوں بیٹے بھیجنے کے لئے تیار ہے۔“ سید غفار کی اس قربانی کا ذکر کرنے ہوئے ٹیپو کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلکنے لگی تھی۔

”یہ کوئی زبانی دعویٰ نہیں۔ میں سید غفار کو خوب جانتا ہوں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، اس پر عمل بھی کرتا ہے۔“

رقیہ بانو یہ واقعہ سن کر دم بخود رہ گئیں اور ٹیپو تیز قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آج راج محل میں کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ جب عشاء کی نماز کے بعد ٹیپو کو معلوم ہوا اس نے ایک ایک شخص کو کھانا کھانے پر مجبور کر دیا۔

”یہ خدا کی کیسی ناشکری ہے کہ تم لوگوں نے گھر کو ماتم کدہ بنا ڈالا؟“ کسی کے حلق سے غذا انہیں اُتر رہی تھی مگر لوگ حکمِ سلطانی سے مجبور تھے۔ خود ٹیپو بھی ان کے ساتھ شریک ہوا مگر اس وقت دنیا کی لذیذ ترین شے بھی بے مزہ لگ رہی تھی۔ سلطان نے دوسروں کو بھوک کی تکلیف سے بچانے کے لئے خود بھی چند لقمے لئے۔ لیکن ہر لقمے کے ساتھ

انسانی میرا نظریہ حیات۔ میں نے آج تک کسی غیر مسلم پر جبر نہیں کیا۔ پھر انہیں مجھ سے کیا شکایت ہے؟“

”عوام کو آپ سے کوئی شکایت نہیں۔“ شجاعت خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہندو رعایا تو آپ کو دیوتا کا درجہ دیتی ہے۔“

”پھر یہ ہنگامہ آرائی کیوں ہے؟“ یکایک ٹیپو کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

”اس سلسلے میں عام رعایا بے قصور ہے۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ایک ایک غدار کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال دیتی۔“ شجاعت خان نے بڑے بے باک انداز میں حقائق بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”ان ساری غداریوں کا سہرا امراء کے سر ہے اور امراء آپ سے خوش نہیں ہیں۔ ان کی ناخوشی کا سبب آپ کا اسلامی کردار ہے۔ آپ انہیں شراب پینے نہیں دیتے، رقص و سرود کی محفلوں پر پابندی عائد ہے، کینروں کی شکل میں دانتائیں رکھنے کی اجازت نہیں، رشوت حرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ امراء کو رعایا کا خدمت گار بنانا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ انہیں آقا تسلیم کیا جائے۔ پھر آپ سے کون خوش ہوگا؟“

ٹیپو نے اقتدار سنبھالنے ہی احترام کی ساری کافرانہ رسیں ختم کر دی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے ہندوستان میں یہ رسم عام تھی کہ رعایا اپنے فرمانروا کو سجدہ کرتی تھی یا پھر لوگ احتراماً اس قدر جھک جاتے تھے کہ ان کے سلام پر سجدے کا گمان ہوتا تھا۔ ٹیپو نے تخت نشین ہوتے ہی احترام کے ان مظاہروں کو حرام قرار دے دیا تھا۔ اس سلسلے میں سلطان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی کو ہاتھ اٹھا کر سلام نہیں کرتا تھا اور نہ کسی دوسرے شخص کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ سلطان کو ہاتھ اٹھا کر سلام کرے۔ بس احترام کے لئے ”السلام علیکم“ کے الفاظ کہہ دینا کافی تھے۔

امراء سلطنت کو سلطان کا یہ حکم بہت گراں گزرا تھا۔ وہ اپنے نفس کی تسکین کے لئے عوام کی پیشانیوں کو مین پر رگڑتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے اور ٹیپو نے ان متکبروں کو رعایا کے دوش بہ دوش کھڑا کر کے بندہ و آقا کا فرق مٹا دیا تھا۔

کورگ اور ملایا میں زمانہ قدیم سے یہ رسم جاری تھی کہ وہاں کی ہندو عورتیں نیم برہنہ لباس میں گھروں سے باہر نکلتی تھیں۔ اس علاقے پر قبضہ کرتے ہی سلطان نے حکم جاری کیا کہ آج کے بعد سے کوئی عورت اس شرم ناک حالت میں اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔ ٹیپو نے صدیوں بعد بے لباس ہندو تہذیب کو شرم و حیا کا لباس پہنایا تھا۔ سینکڑوں سال تک مردوں کی ہوس پرست نگاہوں کا مرکز بننے والی ہندو عورت، عہدِ سلطانی میں سر پر چادر ڈال کر نکلتی تھی۔

ٹیپو سے پہلے یہ قبیح رسم جاری تھی کہ غریب ہندو عورتیں سر بازار نیلام کر دی جاتی تھیں۔ عورتوں کی خرید و فروخت کے لئے بڑے بڑے شہروں میں منڈیاں قائم تھیں۔ سلطان نے برسرِ اقتدار آتے ہی اس لعنت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور عورتوں کے تاجروں کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ ٹیپو کا یہ اصلاحی کارنامہ ہندو جاگیرداروں اور زمینداروں کو سخت گراں گزرا تھا اور

اسی وجہ سے وہ دن رات سلطان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔

ٹیپو کی تخت نشینی سے پہلے جنوبی ہندوستان اور میسور میں غلاموں کی خرید و فروخت بھی عام تھی۔ سلطان نے اسد اوغلائی کا فرمان حضرت عمر فاروق کے ان الفاظ کے ساتھ جاری کیا۔

”اللہ نے ہر بچے کو اس کی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا کیا ہے۔ پھر تمہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ تم اپنے ہی ایک ہم جنس کو غلام بنا ڈالو۔“

ہندو سود خوروں کو سلطان کی یہ معاشرتی اصلاح بھی بہت گراں گزری تھی۔

ٹیپو سے پہلے شہر میسور کے قریب چا منڈی کی پہاڑی پر کالی دیوی کا مندر تھا، جہاں صدیوں سے انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ سلطان نے نہایت سختی سے اس حیوانی رسم کو روک دیا۔ جینٹ کی رسم کے متوقف ہوتے ہی عام انسانوں میں ناقابلِ بیان خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر برہمن اور ہندو پجاری خفا ہو گئے اور اپنے مذہبی اجتماعات میں سلطان کے خلاف زہر اگلنے لگے۔

”وہ ہندو دھرم کو تباہ کر رہا ہے۔ کیا تم میں ایسا کوئی سورما موجود نہیں جو ٹیپو کا سر کاٹ کر دیوی کے قدموں میں پیش کرے؟“

سلطان ٹیپو، بیمار ہندوستان کا مسیحا تھا مگر بد نصیب ہندوستانی اپنے مسیحا کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔

اور ٹیپو اپنے نائب سپہ سالار سے کہہ رہا تھا۔

”شجاعت خان! میں سچائی اور نیکی کا سفیر ہوں۔ جھوٹ اور بدی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ اگر کسی نے اس راستے میں میرا ساتھ نہیں دیا تو تنہا لڑوں گا۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ وہ اپنے راستے پر اور میں اپنے راستے پر۔“

”نہیں شہزادے! آپ اس راستے پر تنہا نہیں ہوں گے۔“ شجاعت خان جیسے آہنی اعصاب رکھنے والے انسان کے رخسار آنسوؤں سے بھگ گئے تھے۔ ”آپ جس مقام سے بھی مرکز دیکھیں گے، سچائی کے کچھ اور سفیر بھی آپ کے دوش بہ دوش ہوں گے۔ اگر چہ ان کی تعداد بہت مختصر ہوگی لیکن وہ جھوٹ کو سجدہ کرنے والے نہیں ہوں گے۔“



آج کی صبح عام دنوں سے زیادہ روشن تھی مگر محل کے در و بام پر الم ناک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹیپو نے اپنے دونوں بیٹوں شہزادہ عبدالخالق اور شہزادہ معز الدین کو بیگمات کے سامنے طلب کیا۔ پھر تمام صورت حال سمجھانے کے بعد اپنے ان بچوں سے مخاطب ہوا جن کی عمریں چودہ اور پندرہ سال سے زیادہ نہیں تھیں۔

”تم ایک عجیب و غریب محاذ جنگ پر جا رہے ہو جہاں تمہارے ساتھ نہ تمہارا باپ ہوگا اور نہ کوئی لشکر۔ تم دونوں بھائیوں کو تنہا لڑنا ہے۔ میں یہ خبر سن کر تو مطمئن ہو سکتا ہوں کہ لارڈ کارنوالس نے تمہیں قتل کراویا۔ مگر اس خبر سے مجھے ناقابلِ بیان تکلیف پہنچے گی کہ تم نے اس

معاہدے کی رو سے بارہ محل، ہیلیم، انوراگری، سنکل ورگ، ڈنڈیگل اور کالی کٹ انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے۔ دریائے تنگ بھدرائے شمال کی طرف کا سارا علاقہ مرہٹوں کو ملا اور تاٹیری، پارمری اور بلاری، نظام کے حصے میں آئے۔

انگریزوں سے جنگ کے خاتمے پر شیو سلطان نے ازسر نو سلطنت کے انتظام پر توجہ دی۔ ایک بار پھر میر صادق علی، ریاست کا وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اتحادیوں سے جنگ کے دوران میر صادق کا کردار جانثارانہ تھا۔ وہ بار بار سلطان کے جاہ و جلال پر قربان ہونے کی قسمیں کھاتا تھا۔ یہی میر صادق کی سب سے بڑی منافقانہ چال تھی اور اسی چال سے شیو سلطان ایک بار پھر دھوکا کھا گیا۔ مزید یہ کہ دوسرے فوجی افسروں اور امیروں نے بھی میر صادق کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ ”بے شک وہ سخت گیر ہے مگر ریاست کے بہترین انتظام کے لئے یہ سختی بھی بہت ضروری ہے۔“

غرض اسی قسم کی باتوں نے شیو سلطان کو مجبور کیا کہ وہ میر صادق کی سابقہ کوتاہیوں کو معاف کر کے اسے دوبارہ اس کے منصب پر بحال کر دے۔ خود میر صادق بھی اپنے حق میں فضا سازگار دیکھ کر نئے انداز سے شیو سلطان کی خوشامد پر اتر آیا تھا اور اپنے آپ کو سلطنتِ خداداد کا سب سے بڑا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں میر محمد صادق، سلطنتِ خداداد کا ادنیٰ نمک خوار، اپنے پروردگار اور پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو حاضر و ناظر سمجھ کر اقرار کرتا ہوں کہ آخری سانس تک اپنے آقا، سلطان معظم کا وفادار رہوں گا۔ میرا دل، میرا دماغ اور میری آنکھیں اسی کے حکم کے تابع رہیں گی۔ اپنے آقا کی طرف سے میرے دل میں کبھی کوئی دوسرہ پیدا نہیں ہوگا۔ میرا دماغ ہمیشہ شیو سلطان عالی مقام کی ترقی اور سلطنت کی توسیع کے لئے منصوبہ سازی کرتا رہے گا اور میری گناہ گار آنکھیں ہمہ وقت آقا کے جاہ و جلال کے آگے سجدہ ریز رہیں گی۔ اگر میں اپنے عہد نامے سے سرمو بھی انحراف کروں تو خدائے بزرگ و برتر اسی دنیا میں میرا منہ کالا کر دے۔ اور پھر جب میں مر جاؤں تو وہ مجھے دوزخ کا ایندھن بنا دے۔“

میر صادق علی نے اپنے گزشتہ عہد نامے میں نئے الفاظ کا اضافہ کر دیا تھا اور یہ الفاظ اس قدر پراثر تھا کہ شیو جیسا سادہ دل حکمران اس کے لہجے کی ریاکاری کو محسوس تک نہ کر سکا۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اب تک میر صادق پر غداری کا الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ وہ صرف ریاستی خزانے کی خورد برد میں ملوث تھا۔ شیو سلطان نے میر صادق کے اس جرم کو ایک عام انسانی لغزش سمجھ کر معاف کر دیا۔ میر صادق کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر بحال کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پڑھا لکھا انسان تھا اور ملک کی سیاست پر اس کی گہری نظر تھی۔ مختصر یہ کہ میر صادق اپنے منصوبے میں کامیاب ہوا اور شیو سلطان کی سادہ لوحی نے سلطنتِ خداداد کے سب سے بڑے نڈار کو اپنے لطف و کرم کے سائے میں پناہ دے دی۔

فرنگی سے رحم و کرم کی بھیک مانگی یا کوئی رعایت طلب کی۔“

”سلطان بابا! ایسی کوئی خبر آپ تک نہیں پہنچے گی۔“ دونوں شہزادوں کے سر بلند تھے اور لہجوں میں بڑی استقامت تھی۔

شیو دونوں شہزادوں کو لے کر دربار کی طرف بڑھا۔ حرم سرا میں ایک کہرام برپا تھا اور رقیہ بانو شدتِ غم سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔



جب میجر ڈفٹن دونوں شہزادوں کو لے کر لارڈ کارنوالس کے خیمے کے قریب پہنچا تو انگریز گورنر جنرل نے خیمے سے باہر نکل کر شہزادوں کا استقبال کیا اور میجر کی طرف ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ابھی تیرا کام ختم نہیں ہوا ہے۔ اسے آج ہی شیو سلطان کے حوالے کر دے۔“

میجر ڈفٹن، گھوڑے پر سوار ہو کر دوبارہ شیو کی خدمت میں حاضر ہوا اور لارڈ کارنوالس کا خط پیش کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کے لئے بطور خاص، گورنر جنرل بہادر کا محبت نامہ۔“

شیو نے خط پڑھنے کا حکم دیا۔ لارڈ کارنوالس نے شیو سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”کورگ کا علاقہ بھی ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ کاتب کی غلطی سے یہ شرط، معاہدے میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی۔“

لارڈ کارنوالس کا خط سن کر شیو سناٹے میں آ گیا۔

”مگر صلح نامے میں یہ شرط تو موجود نہیں تھی۔“ آخر شیو حیرت و سکوت کے گرداب سے نکلا اور نہایت تلخ لہجے میں میجر ڈفٹن سے مخاطب ہوا۔ ”لارڈ کارنوالس کپنی کا گورنر جنرل ہے یا سیاسی بازی گر؟“

”اس سلسلے میں گورنر جنرل بہادر بے قصور ہیں۔“ میجر ڈفٹن بڑی بے حیائی کے ساتھ اپنے آقا کی ہم نوائی میں مصروف تھا۔ ”یہ کاتب کی غلطی ہے، جس کے لئے لارڈ صاحب جواب دہ نہیں۔“

”اگر میں اس شرط کو تسلیم نہ کروں؟“ شیو، لارڈ کارنوالس کی فریب کارانہ چال کو سمجھ گیا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے الفاظ کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

”اس آخری شرط کو تسلیم کئے بغیر صلح کا معاہدہ مکمل ہی نہیں ہوگا۔“ میجر ڈفٹن کے الفاظ اپنے تھے مگر اس کے منہ میں زبان، لارڈ کارنوالس کی تھی۔

لارڈ کارنوالس جانتا تھا کہ شیو سلطان اپنے بیٹوں کی وجہ سے دوبارہ جنگ کا راستہ اختیار نہیں کرے گا۔ آخر یہی ہوا۔ شیو نے نہایت جبر کے عالم میں کورگ کا علاقہ بھی انگریزوں کے حوالے کر دیا۔



اپنے چہروں پر وفاداری کے نقاب پہنے ہوئے دوسرے عداروں نے بھی کم و بیش ان ہی الفاظ کے ساتھ حلف اٹھائے اور جو حقیقتا اہل وفائیں سے تھے، ان کی زبانیں بس اتنا ہی اقرار کر گئیں۔

”آزمائش کی راہ میں خدا ہمیں ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

تمام وزراء اور امراء کے حلف اٹھانے کے بعد ٹیپو سلطان نے ایک پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ پھر جب تمام لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو سلطنتِ خداداد کے حکمران نے ایک مختصر مگر پُر جوش تقریر کی۔

”مومن کا مقصود حیات! اول و آخر جہاد۔ جن لوگوں نے جہاد ترک کیا، وہ دشمنوں کی خوراک بن گئے۔ زندگی کی محبت نے انہیں بزدل و ناکارہ بنا دیا اور پھر وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ جذبہ جہاد اور اپنی منفوں میں مکمل اتحاد ہی اہل ایمان کی سب سے بڑی سیاسی قوت ہے۔ جن کی صفیں منتشر ہوئیں وہ خود بھی وقت کی تیز ہوا میں خس و خاشاک کی مانند بکھر گئے۔ میری حمایت کے بجائے دین اسلام کی حمایت کا عہد کرو۔ تم لوگ دنیا میں اسلام ہی کے نام سے پہچانے گئے اور اسی کی برکت سے تمہیں سر بلندیاں حاصل ہوئیں۔“

اس دعوت میں کسی ہندو افسر کو شریک نہیں کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وزیر خزانہ پورنیا وہاں موجود نہیں تھا۔ جیسے ہی سلطان کی تقریر ختم ہوئی، تمام امراء نے بلند آوازوں کے ساتھ دوسرا حلف اٹھایا۔ ان آوازوں میں تمام عدار امراء کی آوازیں زیادہ بلند تھیں۔ خصوصاً میر صادق علی چیخنے کے سے انداز میں بار بار کہہ رہا تھا۔

”جہاد اور صرف جہاد۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“

اس کے بعد تمام امراء کو سرخ رنگ کی خلعیں پیش کی گئیں۔ سید غفار، شجاعت خان اور دوسرے جاٹار تو سلطان کی اس عنایتِ خاص کا مفہوم سمجھ گئے تھے لیکن میر صادق اور دیگر عدار امراء کے چہروں پر حیرت کے گہرے سائے لرز رہے تھے۔

”یہ خلعیت شاہی نہیں، تمہارا کفن ہے۔“ ٹیپو نے اپنے امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے وقت سے پہلے پہن لو کہ اب یہی تمہارا لباس ہے۔ آئندہ جب تم دربار میں آؤ تو اسی کفن کو اپنے جسموں پر سجا کر آؤ تاکہ تمہیں تمہارا عہد یاد رہے۔“

سلطان کی گفتگو سن کر ایک لمحے کے لئے عدار امراء کے چہروں کا رنگ اڑ گیا مگر وہ بڑے ریاکار تھے۔ فوراً ہی لہجہ بدل کر کہنے لگے۔

”سلطان معظم کا ہزار بار شکریہ کہ حضور نے ہمیں اس خلعیت گراں بہا سے سرفراز کیا۔ سرکار والا کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے عہد سچے ہیں اور ہم اسی وقت سے اپنی موت کا استقبال کر رہے ہیں۔“

میر صادق سب سے بڑا منافق تھا، اس لئے پُر جوش انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سلطان

کی بخشی ہوئی خلعت کو بار بار بوسہ دینے لگا۔

”سلطان کا احسانِ عظیم ہے کہ ان کے دستِ کرم نے ایک غلام کے جسم پر خوں رنگ کفن سجایا۔ یہی میری قبائے سعادت ہے اور یہی میری خلعتِ فاخرہ۔ خدا مجھے توفیق دے کہ میں اپنے آقا کے جاہ و جلال پر قربان ہو جاؤں۔“

خود سلطان نے بھی سرخ رنگ کی قبا پہن لی تھی اور وہ اسی لباس میں اپنے سرکاری فرانس انجام دیتا تھا۔



شہزادہ معز الدین اور شہزادہ عبدالخالق کی جدائی میں رقیہ بانو کی حالت روز بہ روز بگڑتی جا رہی تھی۔ ریاست کے بہترین طبیب، رقیہ کا علاج کر رہے تھے مگر اس غم زدہ ماں کے لئے ہر دوا بے اثر تھی، جس کی آغوشِ محبت کو لارڈ کارنوالس نے اجازت دیا تھا۔ ٹیپو اپنی شکستہ دل شریک حیات کو بار بار تسلیاں دے رہا تھا۔

”میری طرف دیکھو کہ میں نے بھی خونی کفن پہن لیا ہے۔ اب میرا یہ لباس اسی وقت اترے گا، جب تمہارے دونوں بیٹے تمہاری آنکھوں کے سامنے موجود ہوں گے۔“

رقیہ بانو، شوہر کا درد بھگتی تھیں مگر انہیں اپنے دل پر قابو نہیں رہا تھا۔ اس لئے سلطان کی تسکین آمیز گفتگو بھی بے نتیجہ ثابت ہو رہی تھی۔ آخر ایک سال تک مسلسل بیمار رہ کر رقیہ بانو دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

”جب میرے شہزادے واپس آجائیں تو ان سے کہہ دینا کہ تمہاری ماں بہت مجبور تھی۔ اس سے زیادہ اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا کہ وہ شبِ تنہائی میں ایک شمع کی طرح قطرہ قطرہ کھلتی رہے اور پھر یکا یک بجھ جائے۔ الفراق میرے بچو! خدا کسی ماں کو یہ دکھ نہ دے کہ بس یہی میری دعا ہے۔“

رقیہ بانو کی زبان سے ادا ہونے والے یہ آخری الفاظ تھے جنہیں سن کر ٹیپو کی آنکھیں نم ہو گئیں اور دیکھنے والوں کو محسوس ہوا جیسے کسی آہنی چٹان میں کئی شکاف نمایاں ہو گئے ہوں۔

جب رقیہ بانو کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی تھی، اس وقت شجاعت خان نے سلطان سے عرض کیا تھا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں لارڈ کارنوالس کے پاس چلا جاؤں اور اس سے درخواست کروں کہ.....“

ابھی شجاعت خان کی بات مکمل ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ سلطان نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

”شجاعت خان! میں تم سے ایسی دل آزار باتوں کی توقع نہیں رکھتا۔ پہلے تو لارڈ کارنوالس جیسا سفاک انسان تمہاری درخواست قبول نہیں کرے گا۔ اور اگر بالفرض وہ شہزادوں کی چند روز

سید غفار بہت دیر تک اپنے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے رہے مگر پھر بھی ان کی آنکھوں کے آبشار بہہ نکلے اور انہیں سلطان کے حوالے سے ایک عجیب واقعہ یاد آ گیا۔

سلطان ایک محاذ جنگ پر رات کے وقت اپنے خیمے میں سو رہا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ سلطان حیران تھا کہ اسے کس نے جگایا؟ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی سماعت میں انسانی کراہوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ سلطان بے قرار ہو کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ آدھی رات کا وقت تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سلطان نے باہر آ کر دیکھا، خیمے کے دروازے پر پہرہ دینے والے محافظوں کو خوشگوار موسم نے تھک تھک کر سلا دیا تھا۔ سلطان کسی خطرے کا احساس کئے بغیر اس طرف بڑھا، جدھر سے وہ آوازیں ابھر رہی تھیں۔ چند قدم آگے جانے کے بعد نیپو پر یہ راز کھلا کہ اس کے خیمے کے قریب ہی جنگی قیدیوں کا خیمہ ہے۔ سلطان بے خوف و خطر تنہا ان لوگوں کے درمیان میں چلا گیا جو بظاہر پابہ نجز بھر تھے مگر اول و آخر دشمن تھے۔

”تم لوگوں کو کیا تکلیف ہے؟“ سلطان نے قیدیوں سے پوچھا۔ ”تمہاری چیخیں مجھے سونے نہیں دیتیں۔“

”ہم پیاسے ہیں۔“ قیدی بڑی مشکل سے بول رہے تھے۔ ”پانی مانگتے مانگتے ہمارے حلق میں کانٹے پڑ گئے، زبانیں اور ہونٹ پتھر کے ہو گئے مگر کوئی ہماری آواز نہیں سنتا، کوئی پانی کا ایک قطرہ تک نہیں دیتا۔“

قیدیوں کی فریاد سن کر سلطان کے دل پر قیامت گزر گئی۔ اس نے چراغ کی دھندلی روشنی میں دیکھا، بہت سے قیدی زمین پر پائے آب کی طرح تڑپ رہے تھے اور اب ان میں پانی مانگنے کی بھی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

نیپو تیز قدموں سے واپس آیا۔ پانی کی چھاگلے لے کر قیدیوں کے خیمے میں پہنچا اور اپنے ہاتھوں سے پیاسوں کو پانی پلانے لگا۔ قیدیوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے سلطان کو کئی بار اپنے خیمے کی طرف آنا پڑا۔ اس دوران پہرے دار محافظوں کی آنکھ کھل گئی اور وہ سلطان کو اس حال میں دیکھ کر لرز گئے۔ محافظوں نے بہت چاہا کہ وہ قیدیوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دے سکیں مگر سلطان نے انہیں جھڑک دیا۔

”تم کسی قابل نہیں۔ نہ اپنے فرائض انجام دے سکتے ہو اور نہ دوسروں کے حقوق ادا کر سکتے ہو۔“ شیریں گفتار اور متمل مزاج نیپو بہت زیادہ غضب ناک نظر آ رہا تھا۔ ”میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تم نے تو مجھے رسوا کر دیا۔“

پورے لشکر میں ہلچل مچ گئی۔ سید غفار ہمت کر کے آگے بڑھے اور انہوں نے سلطان کے ہاتھ سے پانی کی چھاگل لینے کی کوشش کی مگر نیپو نے انکار کر دیا۔

”سید صاحب! میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ براہ کرم میرے کاموں میں رکاوٹ

رہائی پر آمادہ بھی ہو جائے تو میں اس ذلت کو برداشت نہیں کروں گا۔ وہ یہی تو چاہتا ہے کہ میں اس کے آگے ہاتھ پھیلا دوں اور وہ میرے ہاتھوں کو کسی گداگر کے ہاتھ سمجھ کر جھٹک دے۔ شجاعت خان! میں نے آج تک اپنے خدا کے سوا کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ بے شک! میری زندگی میں یہ گراں لمحہ آ گیا ہے مگر خدا اسے بھی سلامتی کے ساتھ گزار دے گا۔“

پھر وہ سنگین لمحہ اس طرح گزرا کہ سلطان کی محبوب بیوی، رقیہ بانو دنیا سے گزر گئیں اور نیپو نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں قبر میں اتار دیا۔ یہ ایک اور جاں گداز ساعت تھی۔ سلطان اپنے اس ہم سفر کی رفاقتوں سے محروم ہو گیا تھا جو موسم کی تمام سختیوں میں اس کا شریک تھا۔ نیپو کی تنہائیاں بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں مگر اس نے عام حکمرانوں کی طرح شراب کی صراحتی یا کسی خویصورت رقصہ کے آچل میں اپنی تنہائیوں کا علاج نہیں ڈھونڈا۔ وہ حسب دستور عشاء کی نماز تک درباری کاموں میں مصروف رہتا اور پھر رات کا کھانا کھا کر اپنی خواب گاہ کے فرش پر سو جاتا۔

جس روز دونوں شہزادے، لارڈ کارنوالس کی قید میں گئے تھے، اسی دن سے نیپو نے اپنی خواب گاہ کا قیمتی ساز و سامان غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا تھا اور خود ٹاٹ جیسے موٹے کپڑے کے بستر پر سویا کرتا تھا۔ بعض جاں نثار امراء نے سلطان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”سلطان ذی وقار! یہ اتنا بڑا حادثہ نہیں ہے کہ جس سے متاثر ہو کر آپ اپنا طرز حیات ہی بدل ڈالیں۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو؟“ نیپو اپنے امراء کی بات سن کر برہم نظر آنے لگا۔ ”شکست معمولی یا غیر معمولی نہیں ہوتی۔ شکست بہر حال شکست ہوتی ہے۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو، مگر میں اپنا آدھا ملک گنوا چکا ہوں اور میرے دو بیٹے فرنگیوں کی قید میں ہیں۔ اگر شکست فتح کا یہ معاملہ دو حکمرانوں کے درمیان ہوتا تو میں ہرگز زمین پر نہ سوتا۔ لارڈ کارنوالس سے شکست کا انتقام لینے کے لئے میں نے قبل از وقت خونی کنٹن پہن لیا ہے جسے میں کسی حالت میں بھی نہیں اتارتا۔ مگر یہ معاملہ براہ راست میرے اور میرے بیٹوں کے درمیان ہے۔ میں نہیں جانتا کہ عبداللہ لہو اور معزز الدین اس وقت کس حال میں ہوں گے اور فرنگی جنرل نے انہیں کس حال میں رکھا ہو گا۔ یہ میرا اراکین سلطنت سے نہیں، اپنے بیٹوں سے عہد ہے کہ جب تک وہ جیل واپس نہیں آئیں گے، میں اسی طرح فرش خاک پر سوتا رہوں گا۔“

ایک باپ کی محبت کا یہ انداز دیکھ کر امراء کی آنکھیں بھی نم ناک ہو گئیں۔ بڑا عجیب باپ تھا۔ اہل دنیا کے سامنے مسکراتا تھا کہ جیسے اسے اپنے بیٹوں کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ تنہائی میں اس پر کیا گزرتی ہے۔ قریب کے کچھ لوگوں نے بس اتنا ہی دیکھا کہ اس کی پشت پر بکشی بستر سے علیحدہ ہو گئی ہے اور وہ کندر کے ٹاٹ پر اس طرح سو رہا ہے جیسے کوئی مفلوک الحال انسان۔

ڈالنے کی کوشش نہ کیجئے۔“

سید غفار چپ ہو گئے اور ٹیپو سلطان پیا سے قیدیوں کو پانی پلاتا رہا۔

سید غفار اس واقعہ کو یاد کر کے روتے رہے اور پھر دل ہی دل میں یہ کہتے ہوئے تھر سلاطانی سے چلے گئے۔

”اے خدا! تو ہی اپنے رازوں کو بہتر جانتا ہے۔ جس نے کبھی اپنے دشمن کو بھی تکلیف نہیں پہنچائی، آج وہ خود کیسی اذیت میں مبتلا ہے۔ اے تمام جہانوں کے پالنے والے! ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور سلطان کو آزمائش کے اس راستے میں ثابت قدم رکھ!“



اپنے دونوں بیٹوں سے جدا ہونے کے بعد ٹیپو کو سریتا دیوی کا وہ خواب یاد آیا، جس میں اس نے نواب حیدر علی کو دونوں بازوؤں سے محروم دیکھا تھا۔ یہی اس خواب کی تعبیر تھی کہ بیٹے، غداروں کے نرنغے میں گھرا ہوا تھا اور دونوں شہزادے لارڈ کارنوالس کی قید میں چلے گئے تھے۔ اس واقعے کو یاد کر کے ٹیپو کو شدت سے احساس ہوا کہ اس کی دادی اور والدہ نے سریتا دیوی کے ساتھ انتہائی جارحانہ سلوک کیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی سلطان مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر نہایت مؤدب لہجے میں عرض کرنے لگا۔

”دادی محترم! سریتا کے خواب کی تعبیر ظاہر ہو چکی۔ نواب بہادر کے کئے ہوئے بازوؤں سے یہی مراد تھی کہ میں اپنے دونوں بیٹوں سے محروم ہو جاؤں۔“

”آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ سریتا کا نام سنتے ہی مجیدہ بیگم غضب ناک نظر آنے لگیں۔

دادی کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سلطان کو اصلاح حال کی توقع نہیں رہی تھی۔ تاہم اس نے اتمام حجت کے طور پر دوبارہ عرض کیا۔

”میری التجا ہے کہ کسی طرح آپ اس لڑکی کی تالیف قلب کر دیں جسے اس محل کے کینوں نے منحوس کہہ کر پکارا ہے اور آپ خود بھی توبہ کریں کہ اللہ کو کسی بندے کا یہ طرز کلام پسند نہیں۔“

”تو ہمارے تجربات و مشاہدات کو جھٹلاتا ہے ٹیپو؟“ مجیدہ بیگم کا غصہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”روز ازل میں اس کے لئے بس نحوستیں ہی لکھی گئی تھیں۔ اگر وہ خوش نصیب ہوتی تو اس طرح در در کیوں بھٹکتی؟ کبھی تو خیر کی کوئی خبر لاتی اور کبھی تو برکت و سعادت کا کوئی خواب دیکھتی۔ اس کا ظاہری وجود بھی لعنت زدہ ہے، دل بھی تاریک ہے اور دماغ بھی۔ آنکھیں برے خواب دیکھتی ہیں اور زبان بری خبریں بیان کرتی ہے۔“ مجیدہ بیگم بڑی بے رحمی کے ساتھ اس لڑکی کے الزام تراشی کر رہی تھیں جو سرایا محبت تھی اور جسے تھکا دینے والی ریاضتوں نے انسانی کردار کا ایک خاص بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ سریتا پر خوابوں کے ذریعے عجیب رازوں کا انکشاف ہوتا تھا مگر وہ کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتی تھی۔ بس ایک ٹیپو تھا، جس کی محبت میں بے قرار ہو کر وہ محل تک چلی آئی تھی اور اس نے جو خواب دیکھا تھا، بے کم و کاست بیان کر دیا تھا۔ سریتا چاہتی

تھی کہ سلطان خفالتی تدابیر اختیار کر لے اور کسی طرح یہ سنگین خطرات ٹل جائیں۔ مگر لوح محفوظ کے فیصلوں کو کون بدل سکتا تھا؟ سریتا کا سارا خلوص رایگاں گیا اور بیگمات نے اسے ایک منحوس اور کالی زبان رکھنے والی عورت قرار دے کر محل سے نکال دیا۔

”مجھے تو اس کے ایمان پر بھی شک ہے۔“ مختصر سے وقفہ رسکوت کے بعد مجیدہ بیگم دوبارہ ٹیپو سے مخاطب ہوئیں۔ ”اہل ایمان کے یہ انداز ہوتے ہیں کہ ایک جوان عورت، ہندوانہ لباس پہن کر سرنگاپٹم کی گلیوں میں آزادانہ گھومتی پھرتی ہے۔“

اذیت و کرب کی شدت سے ٹیپو کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

”بس دادی محترم! کسی کے ایمان پر تو شک نہ کیجئے۔ یہ براہ راست اللہ اور اس کے بندے کا معاملہ ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں خالق و مخلوق کے رشتوں کا تعین کرنے والے؟“

”سامنے کے مناظر سے چشم پوشی تو نہیں کی جاسکتی۔“ مجیدہ بیگم کا لہجہ بدستور غضب ناک تھا۔ ”میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہی بیان کیا ہے۔“

ٹیپو، مجیدہ بیگم سے مایوس ہو چکا تھا۔ مجبوراً سلام کر کے اٹھ گیا اور سید حاسریتا کے پاس پہنچا۔ سریتا، سلطان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ”سمرات! آپ یہاں؟“

ٹیپو بھی بہت دیر تک سریتا کو دیکھتا رہا جو کبھی سنگ مرمر کی ایک دلکش عمارت تھی مگر جسے موسم کی سختیوں نے بے رنگ بنا دیا تھا اور حالات کی تیز بارشوں کے سبب جس کے تابناک چہرے پر کاسی کی گہری تہہ جم گئی تھی۔

”تمہارا خواب درست تھا سریتا!“ ٹیپو نے اتحادیوں سے جنگ اور اس کے بعد کے تمام حالات سناتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی دادی صاحبہ اور والدہ محترمہ کو قائل نہیں کر سکا۔ میری ہزار کوششوں کے باوجود وہ تو ہم پرست خواتین خود ساختہ عقائد کے حصار سے باہر نہ آ سکیں۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ بہر حال تم انہیں معاف کر دو۔“

”آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں کہاں اُلجھتے ہیں سمرات!“ ٹیپو کی شکست، رقیہ بانو کی موت اور شہزادوں کے یرغمال بنائے جانے کی خبر سن کر سریتا آب دیدہ ہو گئی تھی۔ ”آپ کے لئے اور بہت سے غم ہیں۔“

”میرے دل پر بہت بوجھ ہے سریتا!“ ٹیپو بار بار ایک ہی بات کو دہرا رہا تھا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میرے اہل خانہ کسی گناہ کا رخص بھی دل آزاری کریں۔ اور پھر تم تو بے گناہ ہو۔“

”نہیں سمرات!“ سریتا نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے حوالے سے میرے لئے ہر پتھر پھول ہے۔“

ٹیپو نے چونک کر سریتا کی طرف دیکھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ بھگہ گیا تھا لیکن آتش عشق ابھی تک بجڑ رہی تھی۔

”اگر آپ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ میں اپنی زبان سے اظہار کروں تو میں نے راج ماتا

درخواست پیش کی۔

”اگر آپ ان لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے تو پھر انہیں ہمارے حوالے کر دیجئے۔“

”جسے میں اپنے لئے حرام سمجھتا ہوں، اسی چیز کو تمہارے لئے حلال قرار دے دوں؟“

سلطان کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے تھے۔ ”خدا سے ڈرو۔ بہت سے حکمران اس حالت میں تباہ ہوئے ہیں کہ دشمن اپنے لشکر جرار کے ساتھ ان کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا اور وہ شراب کے نشے میں غرق، خوب صورت کنیزوں سے دل بہلا رہے تھے۔ کیا تم اب بھی نہیں سمجھتے کہ لارڈ کارنوالس تمہارے ساتھ کیسا خوف ناک کھیل، کھیل رہا ہے؟“

ہوس پرست امراء کو سلطان کا یہ طرز عمل سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ حسن فرنگ سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے مگر سلطان نے ان نیم برہنہ لڑکیوں کو حیا کا لباس پہنا کر عزت و اکرام کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔ اپنے فوجی کیمپ میں واپس آنے کے بعد ان ہی لڑکیوں میں سے ایک ذہین لڑکی جیلن نے لارڈ کارنوالس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”سلطان ایک بہادر، غیرت مند اور حیا دار انسان ہے۔ وہ دلوں پر حکومت کرنے کے انداز جانتا ہے۔ مگر اس کے امراء بہت ناکارہ اور بزدل ہیں۔ دشمن سے جنگ ہارنے کے بعد ان کی آنکھوں میں جذبوں کا خون نہیں، خوب صورت عورتوں کے جسموں کی بھوک اُتر آئی ہے۔ اور یہی بھوکے امیر، سلطان کی تباہی کا سبب بنیں گے۔“

ایک بار عید کے دن سلطان اپنی والدہ، فاطمہ بیگم کے سلام کے لئے حاضر ہوا۔ اور پھر ان ہی کے کمرے میں سو گیا۔ اسی دوران نواب حیدر علی مرحوم کی دو منظور نظر کنیزیں اپنے کمروں سے نکل کر فاطمہ بیگم کی خواب گاہ میں داخل ہوئیں جہاں ٹیپو سو رہا تھا۔ نواب حیدر علی کی یہ کنیزیں جواں سال بھی تھیں اور خوب صورت بھی۔ کنیزوں نے آتے ہی سلطان کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔ ٹیپو کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر جیسے ہی دونوں کنیزوں پر اس کی نظر پڑی، وہ شدت غضب سے چیخ اٹھا۔

”بد نصیبو! تم نے یہ کیا کیا؟ تم میری مائیں ہو۔ میں قیامت کے روز اپنے باپ کو کیا جواب دوں گا؟“

اس کے بعد سلطان نے ان دونوں کنیزوں کو خواجہ سرا کے حوالے کر دیا۔ ”انہیں ایسی بھرت ناک سزا دے کہ آئندہ کوئی کنیز میرے محل کی فضا میں بے حیائی کا زہر نہ گھول سکے۔“

اپنی اسی پاک بازی کی وجہ سے ٹیپو، سریتا کے جذبوں کی پذیرائی نہ کر سکا اور اس نے عاف صاف کر دیا۔

”تم مجھ سے وہ چیز طلب کرتی ہو جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

”آپ کے اختیار میں اتنا تو ہے کہ مجھے اپنی کنیز تسلیم کر لیں۔“ ایک بار پھر سریتا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ ”میں ڈرتی ہوں کہ کہیں زندگی بھر کی ریاضت رائیگاں نہ چلی

کو معاف کر دیا۔ حالانکہ میری نظر میں وہ قصور وار نہیں ہیں۔“ مختصر سی خاموشی کے بعد سریتا دوبارہ سلطان سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ تو ہمارا روز کا معمول ہے کہ ہم ذرا ذرا سی بات پر اپنے ہی جیسے انسانوں کو منحوس قرار دے دیتے ہیں۔ سمرات! یہ لفظ میں نے اتنی بار سنا ہے کہ اب اس سے ایک عجیب سی اپنائیت محسوس ہونے لگی ہے۔ گویا یہ میرا ہمزاد ہے یا میری ذات کا ایک حصہ۔“ سریتا نے مجیدہ بیگم کو معاف کر دیا تھا مگر اس کے لہجے میں بڑی غلش تھی۔

”مگر میں تو تمہارا احترام کرتا ہوں۔“ ٹیپو نے سریتا کے ذہن کی تکنیوں کو دور کرنے کے لئے کہا۔

”صرف احترام؟“ انتہائی ضبط کے باوجود سریتا کی زبان بے قابو ہو گئی۔ اس نے دو لفظوں میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ ”آپ فطرتاً ایک اعلیٰ ظرف انسان ہیں، اس لئے احترام تو اپنے خدمت گاروں کا بھی کرتے ہیں۔“

ٹیپو، سریتا کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے گریز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”میرے نزدیک سچائی کا احترام کرنا ہی سب کچھ ہے۔ دادی محترمہ نے غلط بات کہی۔ میں نے انہیں احساس دلانے کی کوشش کی حالانکہ میرے اور ان کے درمیان خونی رشتہ موجود ہے۔ مگر میں نے سچ کی خاطر اس رشتے کو جھٹلایا اور تم سے معافی مانگنے یہاں تک چلا آیا۔“

”سلطان کا بے حد شکریہ۔“ سریتا نے اس قدر کرب ناک لہجے میں کہا جیسے اس کے ذہن دوبارہ کھل گئے ہوں۔ وہ ٹیپو کی زبان سے ایک لفظ سننے کے لئے زندہ تھی مگر سلطان کے خزانہ گفتار میں وہی ایک لفظ موجود نہیں تھا۔

ٹیپو نے سریتا کی بگڑتی ہوئی حالت کو محسوس کر لیا تھا۔

”تم نے ہمیشہ مجھ سے وہ چیز مانگی جو میرے اختیار میں نہیں تھی۔“ ٹیپو نے بڑی سچائی کے ساتھ کہا۔ دور شیرادگی سے عہد فرماؤں کی تک بے شمار ایسے مقامات آئے تھے جب سینکڑوں توبہ شکن حسن رکھنے والی دوشیزاؤں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوششیں کی تھیں مگر وہ بڑی سبک رفتاری کے ساتھ آزمائش کے اس مرحلے سے گزر گیا تھا۔

صلح کے بعد لارڈ کارنوالس نے پچاس منتخب فرنگی لڑکیاں سلطان کی خدمت کے لئے بلواری نذر پیش کی تھیں مگر سلطان نے یہ کہہ کر ان لڑکیوں کو واپس کر دیا تھا۔

”گورنر جنرل کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ اور مسلمان اتنا بے ضمیر نہیں ہو سکتا کہ وہ مجبور عورتوں سے ان کی آزادیاں خرید کر انہیں انسانی ہوس کے مذبح خانے کی بھڑ بکریاں بنا ڈالے۔ یہ لڑکیاں تیری بیٹیوں کی حیثیت رکھتی ہیں، انہیں سیاست کے بازار میں فروخت نہ کر کہ ان کی رسوائی خود تیری بھی رسوائی ہے۔“

لارڈ کارنوالس کی بھیجی ہوئی لڑکیاں اس قدر حسین تھیں کہ ٹیپو کے اکثر امراء کی آنکھیں بند ہو کر رہ گئی تھیں۔ بعض امراء نے اپنے ذوق ہوس پرستی سے مجبور ہو کر سلطان کی خدمت میں



کرنا چاہتا تھا۔  
 کبھی شہزادوں سے یہ کہتا کہ تم انگریزوں کے غلام ہو اور ہمیشہ غلام ہی رہو گے..... کبھی کہتا کہ تمہارا باپ بھی عنقریب ہماری اطاعت تسلیم کرنے والا ہے..... کبھی کہتا کہ ٹیپو کے سارے فوجی افسر اور امراء ہمارے ہم نوا ہیں۔ آئندہ جنگ میں ریاست کی ایک گز زمین بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ غرض چار سال کے طویل عرصے میں لارڈ کارنوالس نے ان معصوم بچوں کو نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت ڈرے سہمے رہتے تھے۔

پھر جب شہزادہ عبدالخالق اور شہزادہ معز الدین انگریزی کیپ سے رخصت ہو کر سرنگاپٹم جانے لگے تو لارڈ کارنوالس نے اپنی آخری چال چلتے ہوئے کہا۔  
 ”اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کرنا کہ انگریز اس کے دشمن نہیں۔ اگر وہ ہم سے دوستی کر لے تو کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ سلطنتِ خدا داد اپنے رتبے میں اس قدر وسیع ہو جائے گی کہ لوگ اس کا طول و عرض دیکھ کر حسد کیا کریں گے۔“

جب شہزادہ عبدالخالق اور شہزادہ معز الدین نے باپ سے یہ بات کہی تو ٹیپو مسکرانے لگا۔  
 ”میں فرنگیوں کی دوستی کا مفہوم خوب سمجھتا ہوں بیٹے!“ سلطان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم صرف اپنی کھوئی ہوئی صحت بحال کرنے کی کوشش کرو۔ ان مسائل کو باپ کے لئے چھوڑ دو۔“



اچانک ہندوستانی سیاست نے ایک اور کروٹ لی۔ لارڈ کارنوالس کو واپس بلا لیا گیا۔ پھر فوراً ہی شاہِ انگلستان نے اپنے ایک اور بڑے شاطر کو بازی کھیلنے کے لئے ہندوستان بھیج دیا۔ یہ لارڈ ولزلی تھا۔ جس نے ہندوستان روانہ ہوتے وقت شاہِ برطانیہ سے عہد لیا تھا۔  
 ”میں کارنوالس نہیں ہوں کہ چند سکوں اور چند علاقوں پر قناعت کر لوں۔ میں شاہ کا ادنیٰ خادم ولزلی ہوں جو سلطنتِ خدا داد کی مکمل تباہی سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہوگا۔“  
 شاہِ انگلستان نے ولزلی کو گلے لگایا اور وہ پورے ہندوستان کو طوقِ غلامی پہنانے کا عہد کر کے جہاز میں سوار ہو گیا۔



سلطان ان تمام سیاسی تبدیلیوں سے بے نیاز اپنی سلطنت کے استحکام میں مصروف تھا۔ فرنگی ذہنیت اس پر بے نقاب ہو چکی تھی۔ سلطان نے بارہا انگریزوں کو احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ بھی اہل کتاب ہیں، اس لئے انہیں دوسرے اہل کتاب کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔

ٹیپو ایک شریف النفس اور بلند کردار مذہبی انسان ہونے کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے ساتھ ایک خاص حسنِ ظن رکھتا تھا مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ تمام عیسائی اپنے

جائے۔“ آج سرتیانے کھلے لفظوں میں اپنے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔  
 ”اگر تم ٹیپو کے لئے ریاضت کر رہی ہو تو کل ٹیپو فنا ہو جائے گا، پھر تمہاری ریاضت بھی فنا ہو جائے گی۔“ سلطان اس جاں سوختہ عشق کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔  
 ”ریاضت فنا کیسے ہو جائے گی؟“ سرتیا کے لہجے میں غیر معمولی جوش تھا۔ ”آپ ہی کے عشق نے مجھے اس ریاضت تک پہنچایا ہے، جسے فنا کے ہاتھ چھو بھی نہیں سکتے۔“  
 ٹیپو الجھ کر رہ گیا۔ پھر بہت دیر بعد آہستہ سے بولا۔

”ابھی مجھ پر انگریزوں کا کچھ قرض باقی ہے۔ پہلے اس قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ پھر میں واپس آؤں گا۔ تمہارے اس سوال کا جواب مجھ پر قرض ہے۔“ یہ کہہ کر ٹیپو جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”آپ کیا واپس آئیں گے سرتا؟“ سرتیانے انتہائی شکستہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے خود ہی آنا پڑے گا۔“

ٹیپو نے سید صاحب کی قبر پر فاتحہ خوانی کی اور واپس چلا آیا۔



چار سال بعد ٹیپو نے تادان جنگ کے طور پر دو کروڑ روپے کی باقی رقم لارڈ کارنوالس کو ادا کر دی۔ 1796ء میں دونوں شہزادے واپس آئے مگر اس طرح کہ ان کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔  
 ٹیپو اپنے بیٹوں کی یہ حالت دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا۔  
 ”کیا اس بد عہد لارڈ کارنوالس نے تمہیں جسمانی آزار پہنچائے ہیں؟“ سلطان نے شہزادوں سے پوچھا۔

”نہیں سلطان بابا!“ شہزادہ عبدالخالق اور شہزادہ معز الدین نے بیک زبان کہا۔ ”اس نے ہماری غذا اور آرام کا خاص خیال رکھا ہے۔“  
 ”پھر تمہاری حالت اتنی شکستہ کیوں ہے؟“ ٹیپو پریشان نظر آ رہا تھا۔  
 ”وہاں کتنا ہی آرام میسر ہو مگر قید خانہ پھر قید خانہ ہے۔“ شہزادوں کے بجائے سید غفار نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

نومر شہزادے، سلطان کے سوال کا کیا جواب دیتے؟ انہیں خود بھی خبر نہیں تھی کہ لارڈ کارنوالس جیسا عیار درندہ انہیں کس قسم کی اذیتیں پہنچا رہا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل مسلسل چار سال تک نفسیاتی آزار پہنچاتا رہا تھا۔ جب رقیہ بانو کے انتقال کی خبر انگریزی کیپ میں پہنچی تو لارڈ کارنوالس نے دونوں شہزادوں کو یہ جانگداز خبر سناتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”تمہاری ماں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اگر تمہارا باپ چاہتا تو جلد از جلد رقم ادا کر کے تمہاری ماں کو موت سے بچا سکتا تھا۔ مگر وہ دولت کی محبت میں گرفتار ہے اور اسے اپنے اقتدار کے سوا کسی چیز کی پروا نہیں۔“ لارڈ کارنوالس بڑے عیارانہ انداز میں بیٹوں کو باپ سے بدگمان

”ہمارا یہ طرز عمل آدابِ سفارت کے خلاف ہے۔“ نظام علی خان بہت آہستہ لہجے میں اپنے وزیر اعظم سے کہتا۔

”مجھے حیرت ہے کہ حضور آدابِ سفارت کی بات کر رہے ہیں۔“ میر عالم کی سرگوشیاں کچھ اور گہری ہو جاتیں۔ ”موسم کے تیور دیکھئے اور صرف اپنے وجود کا ذکر کیجئے جسے اس وقت شدید خطرات لاحق ہیں۔ حضور نے شاید اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ اس وقت دربارِ عالیہ میں انگریز بہادر کے نمائندے بھی موجود ہیں اور وہ گہری نظروں سے آپ کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اگر آپ نے ٹیپو کے سفیر کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک نہیں کیا تو گورنر جنرل لارڈ ولزلی براہِ راست اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔“

نظام علی خان ایک آہ سرد کھینچ کر رہ گیا۔ وہ میر عالم کے ہاتھوں میں کچھ پتلی تھا اور میر عالم کی ڈوریاں، فرنگی کے ہاتھوں میں تھیں۔ ہندوستانی سیاست کی بساط پر عجیب رقص ہو رہا تھا۔ تمام مہرے اپنے انجام سے بے پروا بڑے والہانہ انداز میں ناچ رہے تھے اور انہیں نچانے والے محض چند انگریز شاطر تھے۔ بس ایک ٹیپو سلطان تھا جس نے اس رقص میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

اس وقت کپتان جیمس کرک پیٹرک دربارِ دکن میں ریڈیڈنٹ کی حیثیت سے موجود تھا۔ نظام علی خان نے اسے شہت جنگ کا خطاب دیا تھا۔ کپتان پیٹرک ایک اوباش فطرت انسان تھا۔ اس کی اکثر راتیں ایک ایسے مکان میں گزرتی تھیں جو ریڈیڈنٹ کے قریب واقع تھا۔ اسی مکان میں عاقل الدولہ کی نو اسی خیر النساء بیگم بھی رات کو ٹھہرا کرتی تھی۔ خیر النساء سے میر عالم کا بھی قریبی رشتہ تھا۔ کپتان پیٹرک کو یہ لڑکی اتنی پسند آئی کہ وہ اُس کے حسن میں کھو کر رہ گیا۔ میر عالم، خیر النساء سے اکثر کہا کرتا تھا۔

”اب انگریز ہی ہندوستان کی قسمت کا مالک ہے۔ اس لئے اسے چاہئے کہ وہ کپتان پیٹرک کی قربتوں سے فائدہ اٹھائے۔“

خیر النساء بھی مزاجاً ایک بے راہ لڑکی تھی۔ کچھ اس کی اپنی فطرت اور کچھ خاندان والوں کی بے حیائی، غرض ان دونوں چیزوں نے مل کر بے غیرتی کا ایک نیا افسانہ ترتیب دے دیا۔ کپتان پیٹرک روزانہ رات کو اس مکان میں داخل ہوتا اور خیر النساء بیگم کے ساتھ داد و بخش دے کر صبح کے دھند لکے میں ریڈیڈنٹ واپس چلا جاتا۔ کچھ دن تو صرف حویلی کے بام و در ہی سیاہ کاری کے ان مناظر کو دیکھتے رہے۔ پھر جب محلے کے لوگ سرگوشیاں کرنے لگے تو کپتان پیٹرک نے خیر النساء بیگم کو اپنے ریڈیڈنٹ کے مکان میں داخل کر لیا۔

یہ خیر النساء بیگم کے حسن کی خیرات ہی تھی کہ میر عالم وزارتِ عظمیٰ کے منصب تک پہنچا تھا۔ اگرچہ وہ نظام علی خان کا مصاحب خاص تھا لیکن والی دکن اس سے زیادہ اسے کوئی دوسری حیثیت دینا نہیں چاہتا تھا۔ پھر جب کپتان پیٹرک نے وزیر اعظم کے لئے میر عالم خان کا نام

پنچیر کی تعلیمات کو فراموش کر چکے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں راندہ درگاہ قرار دے دیا گیا ہے۔ اور اب دنیا کی ہر معاشرتی خرابی ان کے خون میں شامل ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب انگریز کسی معرکے میں ٹیپو سے شکست کھا جاتے تھے تو فوراً ہی صلح کے لئے اپنا دامن پھیلا دیتے تھے۔ مگر جیسے ہی وہ گراں وقت گزر جاتا، وہ دوبارہ بے شرمی کے ساتھ اپنا عہد توڑ دیتے اور ٹیپو کے مقابل صف آرا ہو جاتے اور ہمیشہ ہندوستانی غداروں کے ساتھ مل کر سلطان کی پشت پر وار کرتے۔

فرنگیوں کی ان تمام تر ریاکاریوں کے باوجود سلطان ان کے لئے اپنے دل کے دروازے کھلے رکھتا تھا۔ مگر جب لارڈ کارنوالس نے تادان جنگ کے سلسلے میں اس کے دونوں بیٹوں کو یرغمال بنا لیا تو اسے شدت سے احساس ہوا کہ یہ اہل کتاب اپنی فطرت اور مزج میں ہندوستانی بت پرستوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں بلکہ فریب کاری میں دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

فرنگیوں سے مایوس ہو جانے کے بعد ٹیپو نے مرہٹوں اور ہندوستان کے دوسرے ہندو راجاؤں کی طرف دیکھا۔

”میں سیاست کے تمام نشیب و فراز کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کے سلسلے میں انگریزوں کے ارادے نہایت خطرناک ہیں۔“ ٹیپو نے مرہٹوں اور دوسرے ہندو راجاؤں کے نام لکھے جانے والے خطوط میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ”فرنگی نہ میرا دوست ہے اور نہ تمہارا۔ وہ صرف اپنی غرض کا بندہ ہے اور ہر قیمت پر ہندوستان کی آزادی خریدنا چاہتا ہے۔ ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہم آپس میں برسرِ پیکار ہیں اور اپنی نادانیوں کے سبب انگریز کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے درمیان کوئی سیاسی تنازع موجود ہے تو باہمی مذاکرات کے ذریعے اس کا تصفیہ کیا جاسکتا ہے۔“ مرہٹوں اور دوسرے ہندو راجاؤں نے سلطان کی ان تحریروں کا بہت مذاق اڑایا اور انتہائی تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

”شیر میسور، وقت کے آہنی پنجرے میں قید ہو گیا ہے اور اپنی مدد کے لئے دوسروں کو پکار رہا ہے۔ مگر اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اب اس نو لادی پنجرے کا دروازہ اس کی موت کے بعد ہی کھلے گا۔“

مرہٹوں اور دوسرے ہندو راجاؤں کا ذلت آمیز جواب سن کر ٹیپو، والی دکن کی طرف متوجہ ہوا۔ حالانکہ سلطان کو نظام علی خان سے کوئی توقع نہیں تھی مگر پھر بھی اس نے اتمامِ حجت کے طور پر آخری بار اپنا سفیر، دکن کے دربار میں بھیجا۔ نظام علی خان کے دل میں کبھی ٹیپو کے لئے نیکی کا کوئی دھندلا سا جذبہ پیدا ہوتا بھی تو اس کا وزیر اعظم میر عالم، سرگوشیاں کرنے لگتا۔

”حضور! ٹیپو کے سفیر کو ذلیل کر کے اپنے دربارِ عالیہ سے نکال دیجئے۔“

پیش کیا تو نظام علی خان بھڑک اٹھا۔

”وہ ایک خوشامدی کے لباس میں زیادہ اچھا لگتا تھا۔“

”مگر گورنر جنرل بہادر اسے وزیراعظم کی حیثیت سے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔“ کپتان پیٹرک اس قدر آمرانہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا جیسے نظام دکن اس کا ماتحت ہو۔

نظام علی خان نے حیدر علی اور نیپو سلطان کو مٹانے کے لئے انگریزوں سے مدد طلب کی تھی۔ خوبی تقدیر سے حیدر علی اور نیپو تو نہ مٹ سکے مگر والی دکن انگریزوں کا غلام بن گیا۔ اس کی شخصی وجاہت بھی فنا ہو گئی اور ذاتی پہچان بھی۔ اب اس کی زندگی اور سلطنت، فرنگیوں کے دم و کرم کی محتاج تھی۔ امور مملکت میں میر عالم اس قدر ذلیل ہو گیا تھا کہ اس کی مرضی کے خلاف نظام دکن کوئی حکم جاری نہیں کر سکتا تھا۔

یہ میر عالم ہی تھا جس نے نظام علی خان کو مجبور کیا کہ وہ سلطان کے سفیر کے ساتھ حقیر آمیز سلوک ورارکھے۔

”مجھے کسی کے تعاون کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے آقائے نعمت، لارڈ ولزلی کافی ہیں۔“ اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتے وقت خود نظام کو بھی بڑی اندامت محسوس ہو رہی تھی۔

پھر جب نیپو کا سفیر ناکام و نامراد واپس جانے لگا تو اہل دربار کے قہقہے گونجنے لگے۔ اس وقت کپتان پیٹرک بھی ایک خصوصی نشست پر نظام کے سامنے پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بڑی بے رحمانہ مسکراہٹ نقش کر رہی تھی۔

نظام کا یہ طرز عمل دیکھ کر نیپو کو سخت صدمہ پہنچا مگر پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ہندوستان میں ایسی کوئی ریاست باقی نہیں رہی تھی، جہاں سلطان نے اپنے سفیر نہ بھیجے ہوں۔ اس نے ہندوستان کی آزادی اور بقاء کے لئے دشمنوں کے دروازوں پر بھی دستک دی مگر کیا دوست اور کیا دشمن، سب کے سب اپنے دروازے مقفل کئے بیٹھے رہے یہاں تک کہ نیپو کے تمام سفیر ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے۔ ایسی سنگین ساعتوں میں نیپو کے کانوں میں سید اکرام بخاری کے الفاظ گونجنے لگے۔ سید صاحب نے اپنی موت سے چند لمحے قبل بڑے حسرت زدہ اور اذیت ناک لہجے میں کہا تھا۔

”بد نصیب ہندوستان! اب تجھے ذلت و بربادی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

سید صاحب کی پیش گوئی کے خدوخال ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن نیپو جیسے مرد مجاہد، گوشہ نشین ہو کر اپنی موت اور شکست کا انتظار نہیں کرتے۔ سلطان بدترین مایوسیوں اور اندھیروں کے گرداب میں الجھا ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ خون آشام موجوں کا سینہ چاک کر کے آزادی کے ساحل کی طرف بڑھنے کی کوششیں کرتا رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں امید کا پرچم تھا اور دوسرے ہاتھ میں غیرت مند جذبوں کا چراغ۔

ملکی اتحاد سے مایوس ہو کر سلطان نے اتحاد بین المسلمین کے لئے ترکی، شاہ ایران اور والی

کابل زماں شاہ کے دربار میں بھی اپنے سفیر بھیجے۔ اس کے ساتھ ہی فرانس کی حکومت سے بھی امداد طلب کی۔ نیپو نے نل از وقت ہی ایک معاہدہ نامہ تیار کر کے فرانس بھیج دیا تھا اور اپنے سفیر کو تاکید کر دی تھی کہ وہ ہر قیمت پر فرانس کے شاہ لوئی کو آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔ شاہ لوئی کے وزراء نیپو کی اس دریا دلی سے بہت متاثر ہوئے اور وہ فرانسیسی سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجے پر رضامند ہو گئے۔ مگر شاہ لوئی نے اس معاہدے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے نیپو کے خط کے جواب میں صرف اتنا لکھا کہ وہ سلطان کے جذبات کی قدر کرتا ہے۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو ریاست میسور کو حکومت فرانس کا تعاون حاصل ہو جائے گا۔ وزراء نے شاہ کو بہت سمجھایا کہ وہ اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے مگر فرانس کے حکمران کو خود اپنے ملک میں انقلاب برپا ہونے کا خطرہ تھا، اس لئے وزیروں کے مشورے پر عمل نہ کر سکا۔ البتہ کابل کے فرمانروا، زماں شاہ نے نیپو کو یقین دلاتے ہوئے لکھا۔

”آپ ایک لائق اعتبار دوست ہیں اور اسلام کی سر بلندی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو بوقت ضرورت میرے تمام جنگی وسائل آپ کے لئے حاضر رہیں گے۔“

ایک طرف سلطان کی سفارتی مہم جاری رہی اور دوسری طرف وہ ذاتی طور پر اپنی صفوں کو مضبوط کرتا رہا۔ ریاست کے تمام قلعوں کی مرمت کی گئی اور خاص طور پر سرنگا پٹم کے قلعے کو زیادہ مضبوط بنا دیا گیا۔ اسی عرصے میں ایران کا شہزادہ انتہائی شکستہ حالت میں سرنگا پٹم پہنچا۔ سلطان نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ اسے اپنا مہمان بنایا اور شہزادے کے جیب خرچ کے لئے دس ہزار روپے ماہانہ مقرر کئے۔ پھر جب تقریباً ایک سال بعد شہزادہ رخصت ہوا تو سلطان نے اسے قیمتی تحائف پیش کئے۔



نیپو نے پانچ چھ سال کے مختصر عرصے میں اپنی فوجی طاقت دوبارہ بحال کر لی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آدھا ملک گنوا دینے کے بعد تنہا سلطان اس علاقے کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن کر ابھرے گا۔ نیپو نے بے شمار ملکی اصلاحات کی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے ہندوستان میں مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) قائم کی اور باخبر عوام کو حکومت میں شامل کرنا چاہا تاکہ رعایا بھی امور سلطنت کی ذمہ داریاں سنبھالے اور اس طرح خدایوں کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ مگر حرام کار میر صادق نے سلطان کی ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ جمہوریت کا یہ پہلا تجربہ تھا، اس لئے جو نمائندے منتخب ہوئے ان کی اکثریت نا اہل تھی۔ میر صادق نے اپنی عیارانہ چالوں سے ان نمائندوں کو اپنے ساتھ ملا لیا یا پھر پیسے دے کر خرید لیا۔ اس طرح سلطان کی یہ تاریخ ساز سیاسی اصلاح اپنے پہلے ہی مرحلے میں دم توڑ گئی۔ نیپو نے اس مجلس شوریٰ کا نام ”زمرہ غم ناشد“ رکھا تھا۔

اس کے علاوہ سلطان نے فوجی اصلاحات بھی کی تھیں۔ لشکر و سپاہ کو نئے ہتھیار دے کر

مکار پورنیا نے سلطان کی نگاہوں میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے کئی سال تک بڑی دیانت داری کے ساتھ کام کیا مگر جب سلطان اس کی طرف سے غافل ہو گیا تو وہ غدار میر صادق سے جا ملا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میر صادق، سلطان کے اہم کارندوں کو توڑنے کے لئے بڑی بڑی رشوتیں پیش کرتا تھا اور ان رشوتوں کی ادائیگی پورنیا کے ہاتھوں ہوتی تھی جو بڑی بے دردی کے ساتھ سرکاری خزانہ لٹا رہا تھا۔

اپنے بیس قیمتی جہازوں کو پانی میں غرق کرنے کے بعد سلطان نے نئے احکامات جاری کیے اور کاریگروں کو سخت سزا دینے کے لئے حکم دیا۔

”آئندہ کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے کوئی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔ تم لوگوں نے جو قومی سرمایہ اور قیمتی وقت برباد کیا ہے، اس کی تلافی کی بھی ایک صورت ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جہاز تیار کرو۔ ایسے جہاز جنہیں دیکھ کر سمندری طوفان بھی سہم جائیں۔“ سلطان اپنے بحری بیڑے کی تیاری کے سلسلے میں ہمہ وقت پُر جوش رہتا تھا لیکن میر صادق نے اسے ایسی سیاسی چالوں میں الجھایا کہ سلطان کی توجہ تقسیم ہو گئی۔ اگرچہ ٹیپو نے جہاز سازی کے احکام جاری کر دیئے تھے مگر میر صادق کی ریشہ دوانیوں کے باعث 1796ء تک ان احکام پر عملدرآمد نہیں ہو سکا اور یہ سلطنت خدا داد کی بڑی بد نصیبی تھی۔

ٹیپو کی جمہوریت پسندی اور دیگر معاشرتی اصلاحات کا ذکر سن کر برطانیہ کے مشہور دانشور پروفیسر جوائے سر نے شاہ انگلستان سے بے ساختہ کہا تھا۔

”ٹیپو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ عفریب اسے مار ڈالا جائے گا۔ میرے خیال میں ٹیپو کو مار ڈالنا ہی چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر ہندوستان میں فرنگی قدر اقل کر دیا جائے گا۔“

ایک طرف پروفیسر جوائے سر، شاہ انگلستان کو ٹیپو کے قتل کے مشورے دے رہا تھا اور دوسری طرف میسور کی رانیوں کی ریشہ دوانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ رانیوں نے اپنے ایک خط کے ذریعے لارڈ ولزلی کے حضور میں اس طرح فریاد کی تھی۔

”ہم نے اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے 1760ء میں نواب والا جاہ محمد علی کے توسط سے ایک اپنی روانہ کیا تھا اس کے بعد بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ 1782ء میں گورنر مدراس لارڈ مکارتھی نے پورے وثوق کے ساتھ یقین دلایا تھا کہ ہماری ریاست ہمارے حوالے کر دی جائے گی۔ اس کے لئے یہاں سازش بھی کی گئی مگر عین وقت پر ٹیپو کو اس کا علم ہو گیا اور یہ سازش ناکام ہو گئی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ لارڈ کارنوالس کے زمانے میں یہاں کیا گزری؟ اب سنا جا رہا ہے کہ آپ اس ارادے سے یہاں تشریف لائے ہیں کہ حقدار کو اس کا حق دلا دیا جائے۔ شاہ برطانیہ کا اقبال بلند ہو کہ آپ کے سوا اس دنیا میں ہمیں کسی سے انصاف کی امید نہیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں کوشش کریں تو ہمارے مالی وسائل،

نئے خطوط پر استوار کیا گیا تھا۔ مگر بد قسمتی سے میر غلام علی لنگڑا وزیر دفاع تھا جو اپنے آقا، میر صادق کے حکم پر سلطان کی فوجی طاقت کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔

سلطان کی دور بین نظریں بڑی فوج سے زیادہ بحری طاقت پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ نواب حیدر علی نے بحری طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے جہاز بنانے کی ابتدا کر دی تھی لیکن ابھی یہ منصوبہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ فرشتہ اجل آپہنچا۔ سلطان نے تخت نشین ہوتے ہی اس طرف اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی۔ ٹیپو کا ارادہ تھا کہ ایک ایسا زبردست بحری بیڑا تیار کیا جائے جو ہندوستان کے ساحلوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان تمام بحری راستوں کی بھی نگرانی کرے جن سے گزر کر مغربی قومیں ہندوستان میں داخل ہوتی تھیں۔ اس مقصد کے لئے سلطان نے بصرہ، عمان اور عدن کا انتخاب کیا تھا۔ ٹیپو کی مستقبل شناس نظروں نے اسی وقت اندازہ کر لیا تھا کہ جب تک ان ساحلی مقامات پر ہندوستان کا قبضہ نہیں ہو گا، اس وقت تک یہ ملک سلامت نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ٹیپو نے ان بندرگاہوں کے حصول کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اپنی بحری طاقت کو بھی ترقی دینے کے لئے احکام جاری کئے۔ یہ بحری بیڑا پہلے ”بورڈ آف ٹریڈ“ کے ماتحت رکھا گیا۔ اس سے ساحلوں کی حفاظت کا کام لیا جاتا تھا تاکہ بحری قزاق اپنے ارادوں میں ناکام رہیں۔ اس بیڑے میں بار برداری کے جہاز بھی شامل تھے اور یہ جہاز تجارتی سامان لے کر ایران اور عرب کی بندرگاہوں تک جاتے تھے۔ جب 1792ء میں سلطان کو شکست ہوئی اور سلطنت کا آدھا حصہ ہاتھ سے نکل گیا تو اس پر یہ راز کھلا کہ شکست کی بنیادی وجہ بحری بیڑے کی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کا احساس کرتے ہی ٹیپو نے اپنی بحری طاقت کی تنظیم نو شروع کی تاکہ انگلستان کی بحری فوج کا مقابلہ کیا جاسکے۔ جنگ کے فوراً بعد 1793ء میں سلطان نے ”جینکل“ میں بحری درس گاہ قائم کی جہاں انگریزی طرز تعلیم کی بنیاد پر جہاز رانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

اسی سال ٹیپو نے سو جنگی جہاز تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر جب 1794ء میں سلطان نے بیس تیار شدہ جہازوں کا معائنہ کیا تو وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ انہیں جنگی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ تاہم ایک جہاز کو تجرباتی طور پر پانی میں اتارا گیا جو بمشکل ایک میل تک اپنا سفر جاری رکھ سکا اور پھر سلطان کی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے غرق آب ہو گیا۔ ٹیپو نے حسرت و افسوس کے ساتھ یہ منظر دیکھا اور پھر باقی جہازوں کو بھی پانی میں ڈبو دینے کا حکم جاری کر دیا۔

سلطان کے اس منصوبے کی ناکامی میں بھی غدار میر صادق کا ہاتھ تھا۔ اس نے جہاز بنانے والے کاریگروں کو بڑی بڑی رشوتیں دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ ناقص سامان کا استعمال کریں تاکہ سمندر کی بے رحم موجیں آسانی سے ان جہازوں کو اپنا شکار بنالیں۔ اب میر صادق اور وزیر خزانہ پورنیا کے درمیان مکمل طور پر افہام و تفہیم ہو چکی تھی اور وہ دونوں سلطان کے خلاف سازش میں ایک دوسرے کے شریک کار تھے۔



تھے۔ اس کی سیاست بڑی عجیب سیاست تھی۔ ایک طرف وہ میسور کی رانیوں کا محبوب تھا، دوسری طرف انگریزوں کا آلہ کار اور تیسری طرف سلطان کا معتمد وزیر خزانہ۔ وہ ایک ہی وقت میں بڑے بڑے سیاست دانوں کو مطمئن کرنے کا ہنر جانتا تھا۔

جب ولزلی کو تزل راؤ کے ذریعے رانی دیواجی مٹی کا خط موصول ہوا تو اس کے پتلے پتلے اور بھینچے بھینچے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رخص کرنے لگی۔ پھر وہ جنرل میڈوز سے مخاطب ہوا جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

”کروڑوں کے ملک میں کیا ایک بھی ذی ہوش انسان نہیں رہتا؟ سب کے سب آنکھیں بند کئے ہمارے بچھائے ہوئے جاں کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ کیا انہیں اندازہ نہیں کہ یہ ریشی پھندے ان کی گردنوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟“

”لارڈ! میں کچھ نہیں جانتا۔“ جنرل میڈوز، لارڈ ولزلی کا گہرا دوست تھا، اس لئے بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ ”مجھے صرف ٹیپو کا سر چاہئے۔“ جنرل میڈوز نے سلطان کے ساتھ ہر معرکے میں عبرت ناک شکست کھائی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ سلطان سے بے پناہ نفرت کرتا تھا۔

جب لارڈ کارنوالس اور ٹیپو کے درمیان صلح کے مذاکرات جاری تھے تو جنرل میڈوز نے اس معاہدے کی شدید مخالفت کی تھی۔ مگر جب لارڈ کارنوالس نے معاہدے پر دستخط کر دیئے تو جنرل میڈوز ناقابل بیان وحشت کا شکار نظر آنے لگا۔ پھر اس نے شدید اضطراب کے عالم میں اپنے گولی ماری۔ جنرل میڈوز کے لئے اس کا یہ وارکاری ثابت نہیں ہوا۔ پھر بھی زخم اتنا گہرا تھا کہ بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی جاسکی۔ آج وہی شکست خوردہ فرنگی جنرل اپنے دوست ولزلی کے سامنے اپنی نفرتوں کا اظہار کر رہا تھا۔

”لارڈ! مجھے ٹیپو کی لاش چاہئے کہ میں اسے اپنے گھوڑے سے باندھ کر شاہراہوں پر کھینچ سکوں۔ اس نے مجھے اتنے زخم دیئے ہیں کہ صرف میرا بدن ہی نہیں، میری شخصیت کی قبائے تابناک بھی داغوں سے بھر گئی ہے۔“

”صبر کرو جنرل! میں تجھے اتنا جذباتی نہیں سمجھتا تھا۔“ لارڈ ولزلی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ ”سیاست کے شاطر اس طرح بازی نہیں کھیلتے کہ اگر چال اُلجھ جائے تو وہ خودکشی پر آمادہ ہو جائیں۔ میں ہندوستان میں اسی لئے آیا ہوں کہ ٹیپو سے اس کا سر خرید سکوں۔“

”لارڈ! میں ٹیپو کو خوب جانتا ہوں۔ وہ کبھی اپنا سر نہیں بیچے گا۔“ جنرل میڈوز انتہائی تلخ اور نفرت آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔ ”بس کسی مرد جاں باز کی شمشیر ہی اُس کا سر خرید سکتی ہے اور وہ اس تجارت کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔“

”وقت آنے پر دیکھیں گے کہ ٹیپو کا سر کس طرح خریدا جاسکتا ہے۔“ لارڈ ولزلی نے جنرل

لشکر برطانیہ کی مدد کے لئے ہر وقت حاضر رہیں گے۔ ہم نے ایک کروڑ پگڈھے، لارڈ کارنوالس کی خدمت میں بھی پیش کئے تھے مگر وہ اپنی کچھ مجبوریوں کے سبب پوری ریاست پر قبضہ نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ شاہ برطانیہ نے انہیں واپس بلا لیا۔“

لارڈ ولزلی نے رانیوں کے ایجنٹ تزل راؤ کے ذریعے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا۔ ”میں نہیں جانتا کہ لارڈ کارنوالس اور آپ کے درمیان کیا معاہدہ طے پایا تھا۔“ لارڈ کارنوالس بھی عیار تھا اور لارڈ ولزلی بھی۔ اخراجات جنگ کے نام پر لارڈ کارنوالس نے رانیوں سے ایک کروڑ پگڈھے وصول کر لئے تھے جبکہ ایک پگڈھے کی قیمت تین ہندوستانی روپیوں کے برابر تھی۔ لارڈ کارنوالس ہندوستان سے رخصت ہوا تو اس نے لارڈ ولزلی سے اس رقم کا ذکر تک نہیں کیا۔ پھر جب رانیوں کے خط سے یہ انکشاف ہوا تو لارڈ ولزلی انجان بن گیا۔ دونوں ایک ہی رنگ اور ایک ہی نسل کے بیٹھے تھے۔ غیر عیسائی قوموں کا خون پینا ان کی عادت تھی۔ وہ آپس میں خون کی مقدار کا حساب نہیں رکھتے تھے کہ کس نے کتنا پیا؟ انہیں صرف خون پینے سے غرض تھی۔ جہاں سے جتنا بھی مل جاتا، بے دریغ پی لیتے اور پھر دوسرے شکاروں کی تلاش میں نکل پڑتے۔

لارڈ ولزلی کے جواب میں رانیوں نے ایک اور خط لکھا۔ ”اگر حضور پسند فرمائیں تو ہم اتنی ہی رقم دوبارہ مندر کر سکتے ہیں۔“ لارڈ ولزلی کے ساتھ ہی رانی دیواجی مٹی نے اپنے ایجنٹ تزل راؤ کو ایک علیحدہ خط تحریر کیا تھا۔

”گورنر مدد اس اور دوسرے انگریز عہدیداروں سے کہو کہ اگر وہ ہماری پروا نہ کرتے ہوں تو نہ کریں لیکن اپنی حفاظت اور سلامتی کے لئے فرانسیسی فوجوں کے اس ملک میں پہنچنے سے پہلے ضروری ہے کہ سلطان کا قصہ پاک کر دیا جائے۔ اگر میری باتیں لائق سماعت نہ بھی گئیں تو لارڈ صاحب زندگی بھر کف افسوس ملتے رہیں گے اور پھر ہندوستان میں انگریزوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔“

اس خط کے ساتھ ہی رانی دیواجی مٹی نے تزل راؤ کو اس معاہدے کی نقل بھی بھیج دی تھی، جو سلطان اور حکومت فرانس کے درمیان عنقریب طے پانے والا تھا۔ رانی نے تزل راؤ کو اس راز سے باخبر کر دیا تھا کہ ٹیپو، ترکی کے فرمانروا سلطان سلیم، شاہ ایران اور والی کابل زماں شاہ سے بھی فوجی تعاون کے سلسلے میں خط و کتابت کر رہا ہے۔ اگر اس فوجی اتحاد نے عملی شکل اختیار کر لی تو پھر ہندوستان میں کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ نہ فرنگیوں کے اقتدار کے منصوبے اور نہ رام راج کے سنہرے خواب۔ غنیمت ہے کہ ابھی تک دوسرے مسلم حکمرانوں کے ارادے ظاہر نہیں ہو سکے ہیں۔ مگر والی کابل زماں شاہ نے سلطان کو بھرپور مدد دینے کا یقین دلایا ہے۔

نمک حرام پوریا نے سلطنتِ خداداد کے سارے اہم ترین راز، رانیوں کو کھٹل کر دیئے

پھر کچھ دن بعد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل نے عجیب انداز سے امن و انصاف کا دھوکہ دیا۔ لاارڈ کارنوالس کے ساتھ ہونے والی جنگ میں وائٹاؤ کے کچھ علاقے پر انگریز قابض ہو گئے تھے۔ نئی حد بندی کے مطابق یہ سارا علاقہ سلطنتِ خداداد کی ملکیت تھا۔ سلطان اس وقت کے گورنر جنرل سر جان شور کو بار بار اس علاقے کی واپسی کے لئے لکھتا رہا مگر سر جان شور نے اسے نظر نہ کیا تو جہاں نہیں دی۔ یہاں تک کہ وہ انگلستان چلا گیا اور اس کی جگہ لاارڈ وٹزلی گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا۔ وٹزلی نے وائٹاؤ کے سلسلے میں کی جانے والی مراسلت سے فائدہ اٹھایا اور فوری طور پر ایک کمیشن قائم کر کے اس کی اطلاع دینا شروع کر دی۔

”عقربند وائٹاؤ کا علاقہ آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

لاارڈ وٹزلی نے امن و انصاف کے نام پر ایک ناکہ رچایا تھا مگر اعلیٰ ظرف اور سادہ دل نیپو اس سیاسی حیدرہ باز کو منصف و عادل سمجھ بیٹھا۔

سلطان نے اس اطلاع کے جواب میں لاارڈ وٹزلی کو ایک اور خط لکھا جو محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔

لاارڈ وٹزلی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح سلطان کو اس کی دوستی کا یقین آجائے اور پھر وہ دوستی پر دشمنی کی بدترین فصل بونے۔



نیپو بظاہر لاارڈ وٹزلی کے رویے سے مطمئن ہو گیا تھا مگر اس نے اپنی سفارتی کوششیں ترک نہیں کی تھیں۔ وہ سلطانِ ترکی، شاہِ ایران اور والیِ کابل کی طرف بھی دیکھ رہا تھا مگر حقیقتاً اس کی نظریں حکومتِ فرانس کے تعاون پر مرکوز تھیں۔ نیپو جانتا تھا کہ فرانس کی فوجوں کا اسلحہ بھی جدید ہے اور وہ میدانِ جنگ میں عیارِ فرنگیوں کا مقابلہ کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فرانسیسیوں کے قول و فعل کا اعتبار کیا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیپو نے شاہِ لونی سے کی جانے والی مراسلت کی ناکامی کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے دوسری سفارت فرانس بھیجی۔ اس بار سمندر کی بے رحم موجیں نیپو کی کامیابی کے راستے میں حائل ہو گئیں اور جہاز خراب ہو کر منگور واپس آ گیا۔ اسی دورانِ میسور کی تیسری جنگ چھڑ گئی جس میں اتحادی کامیاب ہوئے اور لاارڈ کارنوالس سلطنتِ خداداد کے نصف حصے پر قابض ہو گیا۔

پیشوائے پونا اور نظامِ دکن نے نیپو کو سخت آزار پہنچائے تھے۔ مگر پھر بھی وہ ان دونوں سے انتقام لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بس ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح انگریز ہندوستان سے چلے جائیں۔ مگر خود غرض اور عاقبتِ نااندیش حکمران، فرنگیوں کے مفادات کی حفاظت کر رہے تھے۔ اور ایک ایک کر کے برطانیہ کی غلامی کے طوق پہن رہے تھے۔

ادھر بنگال میں میر جعفر اور اودھ میں نواب شجاع الدولہ پہلے ہی اپنی آزادیاں فروخت کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے شاہِ انگلستان کو اپنا آقا تسلیم کر چکے تھے۔ ادھر اراکٹ اور دکن

میڈوز کوٹا لے ہوئے کہا اور دوبارہ رائیوں کے ایجنٹ تزل راؤ کا خط پڑھنے لگا۔ پھر یکایک لاارڈ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ نیپو اور حکومتِ فرانس کے درمیان ہونے والے معاہدے کا ذکر پڑھ کر وٹزلی کے دل و دماغ جل اٹھے۔ ویسے تو پوری انگریز قوم اہلِ فرانس سے نفرت کرتی تھی مگر لاارڈ وٹزلی کی نفرت شدید تر تھی۔ لاارڈ وٹزلی اور فرانس کی ایک خوب صورت عورت کے درمیان ناجائز تعلقات تھے مگر بعد میں ان دونوں نے شادی کر لی تھی۔ پھر جب لاارڈ وٹزلی ہندوستان آنے لگا تو اس کی بیوی نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ میڈم جولین نے لاارڈ سے طلاق نہیں مانگی تھی لیکن پھر بھی اس طرح علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ ان دونوں کے درمیان ازدواجی رشتہ قائم نہیں رہا تھا۔ وٹزلی کو بیوی کے طرزِ عمل سے سخت اذیت پہنچی تھی اور پھر اسی اذیت نے اہلِ فرانس کے خلاف شدید نفرت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔



نیپو سلطان بھی ان سیاسی تبدیلیوں سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ سلطنتِ خداداد کو دشمنوں کی دست درازیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے سر توڑ کوششیں کر رہا تھا مگر خدائے ابرار اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملانے کے درپے تھے۔ جب تک حرام پوریا، سلطنتِ خداداد کے تمام اہم راز رائیوں کے ذریعے انگریزوں کو منتقل کر چکا تو لاارڈ وٹزلی نے سلطان کو فریب دینے کے لئے ایک طویل خط تحریر کیا۔

”میں دیارِ ہند میں شاہِ انگلستان کی طرف سے امن و انصاف کا سفیر بن کر آیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کمپنی کے دوسرے ذمے دار افراد کا آپ کے ساتھ کیا طرزِ عمل رہا مگر میری آمد کے بعد شکوک و شبہات کی نفی کو ختم کرنا چاہئے۔ ہم دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے کھلے دشمن ہیں۔ بس یہی ہماری سیاست ہے اور یہی ہمارا دستور ہے۔“ (آپ کا دوست لاارڈ وٹزلی) جواباً نیپو نے بھی پُر جوش دوستانہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خط میں تحریر کیا۔

”آپ کا محبت نامہ پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ میں امن و انصاف کے سفیر کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ دونوں سلطنتوں کے درمیان اتحاد کا جو رشتہ قائم ہے وہ آپ کی موجودگی سے اور زیادہ مستحکم ہو جائے گا۔ معاہدے کی پابندی کرنا اور رسمِ دوستی کو نبھانا میرا مقصد خاص ہے۔ اس معاملے میں آپ کبھی مجھے سرد مہر اور غافل نہیں پائیں گے۔ خدا کرے آپ بھی میرے جذبول کا مفہوم سمجھتے ہوئے اپنی اسی روش پر قائم رہیں۔“ (امن و انصاف کی روایتوں کا پاسدار..... نیپو سلطان)

سلطان نے لاارڈ وٹزلی کے نام یہ خط 10 جولائی 1798ء کو تحریر کیا تھا۔

نیپو کا خط پڑھ کر وٹزلی مسکرایا۔

”مجھ سے زیادہ تیرے جذبات کا مفہوم کون سمجھ سکتا ہے؟“ یہ کہتے کہتے لاارڈ وٹزلی کے اندر چھپا ہوا ریاکار اور منافق انسان بے لباس ہو گیا۔

درخواست کے جواب میں سلطان کے نام مصر سے ایک خط تحریر کیا۔

”میرے سب سے زیادہ عظیم الشان سلطان اور میرے سب سے عزیز دوست نیپولسٹان کی خدمت میں۔ آپ کو غالباً یہ اطلاع تو پہنچ گئی ہو گی کہ ہماری فوج آج کل بحر قزقم کے ساحلوں پر خیمہ زن ہے۔ میرے ساتھ میری فوج کی بھی یہی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح آپ کو برطانیہ کے آہنی پنجے سے نجات دلائی جائے۔ میرا خیال ہے کہ میں ”مستعاً“ اور ”موخا“ کے راستے آپ تک پہنچوں۔ لیکن اس سے قبل آپ کے ملک کی سیاسی حالت کا بظرف غائر مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اس لئے آپ اپنے ایک سربراہ آدرہ اور دیانت دار عہدے دار کو، جس پر آپ پورا اعتماد رکھتے ہو۔ سوڑیا قاہرہ کے راستے روانہ کر دیں تاکہ میں اس شخص سے تفصیلی گفتگو کر سکوں۔ آپ کا دوست نیپولین بونا پارٹ۔“

ابھی نیپولین کا یہ خط سرنگا پٹم پہنچا بھی نہیں تھا کہ ایک اور حادثہ رونما ہوا۔ اس وقت نیپولین مصر میں مقیم تھا اور اس بحری راستے پر مکمل قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو یورپ اور ہندوستان کے درمیان سب سے اہم گزرگاہ تھا۔ اسی آبی گزرگاہ کے بارے میں نیپولین نے کہا تھا۔

”اس پر قابض ہونے کے بعد ہم بڑی آسانی سے انگلستان کو تباہ کر سکیں گے۔“

انگلستان کی فضاؤں میں نیپولین کے ان الفاظ کی گونج بڑی شدت کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ نیپولین کا وجود آمریت اور شہنشاہیت کے لئے ایک سنگین اور مستقل خطرہ تھا۔ برطانیہ کا شاہی خاندان اور جاگیردار طبقہ نیپولین کے اس بیان پر بری طرح سچ و تاب کھا رہا تھا۔

اگست 1798ء میں انگریزوں کے بحری بیڑے نے فرانس کے اس بیڑے پر انجانے میں حملہ کر دیا جو نیپولین ”ابو قیر“ میں لنگر انداز تھا۔ نتیجتاً فرانسیسی بیڑا تباہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر نیپولین شام کی طرف بڑھا جہاں ترکوں نے اس پر حملہ کر دیا اور وہ بندرگاہ ”عکہ“ میں محصور ہو گیا۔

نیپولین کے حوالے سے جب یہ خیریں سرنگا پٹم پہنچیں تو سلطنت خداداد کے وفاداروں کے چہرے اتر گئے۔ سلطان نے اپنی ریاست کو بچانے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی جس قدر کوششیں کی تھیں ان سب کا خون ہو گیا۔

اس نازک موقع پر نیپولین کی محسوری، ہندوستان کی غلامی کا سبب بن گئی۔ جب لارڈ ولزلی کو سلطان کے سفیروں کی واپسی اور نیپولین بونا پارٹ کے محصور ہونے کی خبریں ملیں تو وہ خوشی سے پاگل ہو کر ناپچنے لگا۔

”مجھے اسی خبر کا انتظار تھا۔ اب نیپوکی مدد کو فرانس سے کوئی نہیں آئے گا۔“

لارڈ ولزلی اب سلطان کو زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے 18 نومبر کو نیپو کے نام انتہائی سخت لہجے میں ایک خط تحریر کیا۔

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس خط و کتابت سے بے خبر ہوں جو آپ کے اور حکومت فرانس کے درمیان بہت دنوں سے جاری ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کی کم عقلی پر ماتم

میں نواب والا جاہ محمد علی اور نظام علی خان نے بھی اپنے آپ کو دولت انگلیہ کا ادنیٰ نمک خوار ثابت کر دیا تھا۔ بس نیپو اور مرہٹے ابھی زیر دام نہیں آئے تھے۔ پھر بھی مذہبی دشمنی کی بنیاد پر مرہٹے انگریزوں سے جا ملے تھے۔ نتیجتاً نیپو تباہ کر دیا گیا تھا اور ہندوستان کی تمام سیاسی قوتیں شیر میسور کو گھیرنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔

لارڈ ولزلی کی فریب کارانہ حمایت اور دوستی کے باوجود سلطان اپنی فوجی تیاریوں سے غافل نہیں تھا۔ اس نے تیسری بار اپنے سفیروں حسین علی اور شیخ ابراہیم کو فرانس روانہ کیا۔ سلطان کا جہاز 19 جولائی 1798ء کو پورٹ لوئی مارشس پر لنگر انداز ہوا۔

جب جنرل ملارٹی کو معلوم ہوا کہ یہ نیپولسٹان کے سفیر ہیں تو انہیں پندرہ توپوں کی سلامی دی گئی۔ عام رعایا نے اظہار عقیدت کرتے ہوئے ان پر چاروں طرف سے پھول برسائے۔ جنرل ملارٹی نے سلطان کے سفیروں سے معاہدہ کر لیا مگر مارشس کی حکومت نے اس معاہدے کو مسترد کر دیا۔

جنرل ملارٹی بڑا جانناز اور عہد کا پابند تھا۔ وہ اپنے معزز مہمانوں کے چہروں پر مایوسی کا رنگ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جنرل ملارٹی نے وعدہ کیا کہ وہ ہندوستان کو فرانسیسی فوج روانہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور انگریزوں کو اس ملک سے نکالنے میں سلطان کا پورا ساتھ دے گا۔ اور ایک جہاز مع سلطانی خطوط کے پیرس روانہ کرے گا اور مرکزی حکومت سے فوری امداد طلب کرے گا۔

پھر اپنے وعدے کے مطابق جنرل ملارٹی نے سلطان کے خطوط پیرس روانہ کئے اور اپنی مرکزی حکومت کو متوقع فوائد کی طرف متوجہ کیا۔ مگر یہاں بھی ہندوستان کی بد نصیبی آڑے آئی۔ جنرل ملارٹی کو معلوم نہیں تھا کہ سلطانی سفیروں کے پیچھے فرنگی جاسوس بھی لگے ہوئے ہیں۔ ان جاسوسوں نے فوری طور پر اس سفارتی مہم کی اطلاع انگریزوں کو پہنچا دی۔ نتیجتاً راستے میں ایک انگریزی جہاز نے اس فرانسیسی جہاز پر حملہ کر دیا جو سلطان کے خطوط لے کر پیرس جا رہا تھا۔ فرانسیسی جہاز تباہ ہو گیا اور اس طرح فرانس کی ”نظارت عامہ“ کو نیپو کے وہ خطوط نہ پہنچ سکے جن پر ہندوستان کی آزادی کا انحصار تھا۔

سلطان نے سمجھے ہوئے دل اور اداس چہرے کے ساتھ یہ خبر سنی۔

”خدا ہی جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں! پھر سارا ہندوستان غلامی کی زنجیریں پہننے والا ہے؟“

نیپو کی یہ اداسی بہت عارضی تھی۔ کچھ دن بعد وہ نئے حوصلوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے نے چوتھی سفارت فرانس روانہ کی۔ اس بار سلطان کے تین سفیروں میں ایک فرانسیسی امیر المرحوم ڈیوک بھی شامل تھا۔ فرانس کی نظارت عامہ نے اس سفارت کا شاندار استقبال کیا اور پھر نیپولین کے سامنے نیپو سے معاہدہ کرنے کی درخواست پیش کر دی۔ نیپولین بونا پارٹ نے اس

روانہ نہیں کیا۔ یہ بھی انگریز گورنر جنرل کی ایک گہری سیاسی چال تھی۔ وہ سلطان کو فکر و پریشانی میں مبتلا کر کے دوسرے مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

لارڈ ولزلی عجیب انداز کا شاطر تھا۔ وہ اپنے ہدف کی جانب بڑھنے سے پہلے راستے میں چاروں طرف بہت دھول اڑاتا تھا۔ پھر جب ساری فضا گرد و غبار سے بھر جاتی تھی اور اس کے دشمنوں کی آنکھیں دھندلا جاتی تھیں تو وہ اپنے اصلی نشانے پر تیر پھینکتا تھا۔

نپو سلطان کے ساتھ بھی لارڈ ولزلی نے یہی چال چلی تھی۔ سلطنتِ خداداد کے فرمانروا کو سخت تنبیہ کرنے کے بعد وہ مرہٹوں کی طرف متوجہ ہوا۔ لارڈ ولزلی کو خطرہ تھا کہ کہیں مرہٹے، نپو کے ساتھ نہ مل جائیں۔ سلطان مرہٹوں سے ہاپوس ہونے کے باوجود پیشوائے پونا کو مسلسل اس امر کا احساس دلارہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی خاطر دونوں سلطنتوں کا اتحاد بہت ضروری ہے۔ اگر ایسا ممکن نہیں ہوتا تو مستقبل قریب میں ہندوستان، فرنگیوں کے پنجہ ستم سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

وزیر اعظم نانافرنوئیس شروع میں نپو کے لئے سخت متعصبانہ جذبات رکھتا تھا مگر جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی اقتدار جڑ پکڑنے لگا تو اسے احساس ہوا کہ فرنگیوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لئے نپو سے دوستی ضروری ہے۔ لارڈ ولزلی، نانافرنوئیس کے ان خیالات سے پوری طرح باخبر تھا، اس لئے وہ مرہٹوں اور نپو کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دینا چاہتا تھا جو کسی طرح بھی عبور نہ کی جاسکے۔

پھر لارڈ ولزلی نے ایک اور عجیب چال چلی۔ چند سالوں سے دربار پونا آپس کے اختلافات اور سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور جب لارڈ ولزلی، ہندوستان کے ساحل پر اتر آ، اس وقت وزیر اعظم نانافرنوئیس، دولت راؤ سندھیا کی قید میں تھا اور مسند پیشوائی پر باجی راؤ متمکن تھا۔ دولت راؤ سندھیا، باجی راؤ پیشوا کا محافظ و نگراں تھا اور مرہٹوں میں سب سے زیادہ طاقتور حکمران بھی۔ اس لئے لارڈ ولزلی نے دولت راؤ سندھیا کو پونا سے ہٹا دینا چاہا۔ اس نے پونا کے انگریز سفیر کو لکھا کہ نانافرنوئیس کی رہائی کے لئے اس شرط پر کوشش کرے کہ وہ انگریزوں کا طرف دار رہے۔

ابھی انگریز سفیر کو لارڈ ولزلی کا یہ خط موصول بھی نہیں ہوا تھا کہ مرہٹوں نے خود آپس میں کجھوتہ کر لیا اور نانافرنوئیس کو قید سے رہائی مل گئی۔ جب مرہٹوں میں نفاق ڈالنے کی یہ کوشش ناکام رہی تو لارڈ ولزلی نے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ کچھ دن بعد لارڈ ولزلی نے پونا میں متعین گریز سفیر کرنل پالمر کو ایک طویل خط لکھا۔

”میں نہیں جانتا کہ دولت راؤ سندھیا اور نپو سلطان کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہے یا نہیں۔ پھر بھی سندھیا کی طاقتور فوج کا پونا میں رہنا ہمارے لئے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ اگر ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی بقاء چاہتے ہو تو کسی نہ کسی طرح دولت راؤ سندھیا کو پونا

کروں کہ آپ نے فرانسیسیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو کمپنی کے بدترین دشمن ہیں۔ ہمارے دشمن، آپ کے دوست؟ کیا عجیب فلسفہ ہے۔ بہر حال میں میجر ڈوٹن کو تحقیق حال کے لئے روانہ کر رہا ہوں۔ میں نے اسے یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ کمپنی کے تحفظ کے لئے جس قدر علاقہ چاہے، آپ سے طلب کر لے۔ فی الوقت یہی مناسب ہے کہ سلطنتِ خداداد کے تمام ساحلی علاقے ہمارے حوالے کر دیئے جائیں۔ بعد میں اس امر پر غور کیا جائے گا کہ آپ کو اس عہد شکنی کی کیا سزا دی جائے؟..... آپ کا سابقہ دوست۔ لارڈ ولزلی۔“

لارڈ ولزلی کا خط پڑھ کر نپو حیرت زدہ رہ گیا۔ امن، انصاف اور دوستی کی باتیں کرنے والے نے کس قدر جلد آنکھیں پھیر لی تھیں۔ سلطان پر ولزلی کی نیت کا حال کل چکا تھا۔ تاہم اس نے جنگ سے گریز اختیار کرنے کے لئے دوستانہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

”آپ تک جو خبریں پہنچائی گئی ہیں ان میں کچھ زیادہ صداقت نہیں ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ والد محترم کے زمانے سے فرانسیسی افسر اور سپاہی، ریاست میسور کے ملازم رہے ہیں۔ خوشگوار تعلقات کی بنیاد پر دونوں حکومتوں کے درمیان ہمیشہ سفارتی مہم بھی جاری رہی ہے۔ اب اگر ماضی کی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے سلطنتِ خداداد کا سفیر فرانس چلا گیا تو میرے دشمنوں پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟ آپ نے اپنے خط کے آخر میں ”سابقہ دوست“ کے الفاظ لکھ کر مجھے دلی تکلیف پہنچائی ہے مگر میں ذاتی طور پر اپنے عہد کا پابند ہوں اور اب بھی آپ کو اپنا دوست ہی تصور کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ سیاست کیسے کیسے رنگ بدلے گی۔ مگر میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ خود غرض اور موقع پرست لوگوں کے فریب میں نہ آئیں۔ ان کا تو ایک ہی کام ہے کہ وہ دونوں سلطنتوں کے درمیان نفاق و عداوت کے بیج بوٹے رہیں۔ مگر مجھے آپ کی روشن خیالی سے امید ہے کہ دلوں پر چھا جانے والا یہ دیتی غبار چھٹ جائے گا اور دوستی کے رشتے فروغ پاتے رہیں گے۔“

دراصل نپو سلطان مزید کچھ دنوں کی مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ اپنی فوجی تیاریاں مکمل کر سکے۔ پھر اگر فرنگیوں کی نیت خراب ہو تو وہ اتحادیوں سے آخری فیصلہ کن جنگ لڑ سکے۔ نیپولین بوناپارٹ کے ”ہند گاہ عکہ“ میں محصور ہو جانے کے بعد نپو کی امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی اور اب اسے حکومت فرانس سے کسی قسم کے تعاون کی کوئی توقع نہیں رہی تھی۔ پھر بھی نپو کو زمان شاہ والی کاہل اور شاہ ایران کی امداد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اگر یہ دونوں مملکتیں سلطان کے ساتھ بھرپور فوجی تعاون کرتیں تو سلطان اتحادیوں کے تمام منصوبوں کو ناکام بنا سکتا تھا۔ یہی وہ اسباب تھے کہ جن کے زیر اثر نپو سلطان نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے لارڈ ولزلی کی اشتعال انگیز یوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔



لارڈ ولزلی نے سلطان کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا اور تحقیقات کے لئے میجر ڈوٹن کو بھیجی



کرنل کالنس کے گوالیار پہنچتے ہی دولت راؤ سندھیا کے دزیروں اور امیروں میں شدید فتنہ پھیل گیا اور وہ ایک دوسرے کے دشمن نظر آنے لگے۔

پھر جب لارڈ ولزلی کو یہ خبر پہنچی کہ کرنل کالنس اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا ہے تو اس نے فوراً ہی نظام دکن کی طرف نیا جال پھینکا۔ حیدر آباد کے عظیم الامراء ارسطو جاہ کو یقین دلایا گیا کہ دولت راؤ سندھیا، تاوان جنگ کے لئے اس کے علاقوں پر حملہ کرنے والا ہے۔ آخر نظام علی خان نے بھی گھبرا کر لارڈ ولزلی کے سامنے میں پناہ حاصل کی۔ وہ سایہ جو غلامی اور موت کا سایہ تھا۔

نظام سے فارغ ہو کر لارڈ ولزلی نے ایک اور چال چلی۔ اودھ کی سلطنت دارن ہیسٹنگز کے زمانے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تابع ہو چکی تھی۔ اسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر لارڈ ولزلی نے ایک بڑی فوج اودھ کے اس علاقے کی طرف بھیج دی جس کی سرحدیں دولت راؤ سندھیا کی سرحدوں سے ملتی تھیں۔ اس کے بعد لارڈ ولزلی کے حکم پر یہ خبر عام کی گئی کہ اودھ کا نواب وزیر علی، بنارس کے راستے فرار ہو کر کابل پہنچ گیا ہے تاکہ وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے لئے شاہ زمان سے فوجی تعاون کی درخواست کر سکے۔

اگرچہ لارڈ ولزلی نے یہی اعلان کیا تھا کہ شاہ زمان کے متوقع حملے کو روکنے کے لئے اودھ کی سرحدوں پر انگریز فوج تعینات کی گئی ہے لیکن درپردہ وہ دولت راؤ سندھیا پر دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ آخر لارڈ ولزلی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ دولت راؤ سندھیا نے انگریزی فوجوں کے اجتماع کی خبریں سن کر یہی سمجھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اس کے شمالی علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی فوج لے کر پونا سے نکلا اور تیز رفتاری کے ساتھ گوالیار پہنچ گیا۔ لارڈ ولزلی یہی چاہتا تھا کہ اس کے منصوبے کی تکمیل میں حائل یہ سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے۔ پھر جب دولت راؤ سندھیا اپنے پایہ تخت پہنچ گیا تو لارڈ ولزلی نے پیشوائے پونا اور وزیراعظم نانافرنیس کے سامنے ”سب سی ڈیاری سٹم“ پیش کیا۔ اس سٹم کو قبول کرنے کے بعد مرہٹوں نے یقین دلایا کہ وہ پہلے معاہدے پر قائم رہیں گے۔ اگر آئندہ ٹیپو سلطان اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں جنگ ہوئی تو پونا کی ساری ہمدردیاں کمپنی کے ساتھ ہوں گی۔

نظام علی خان اور مرہٹوں سے معاہدہ کرنے کے بعد لارڈ ولزلی، افغانستان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھا کہ سلطان کا سفیر، افغانستان میں موجود ہے اور دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک فوجی معاہدے کے سلسلے میں مذاکرات کر رہا ہے۔ لارڈ ولزلی کے خیال میں اگر یہ مذاکرات کامیاب ہو جاتے اور شاہ، ہندوستان پر حملہ کر دیتا تو شمال میں افغان اور جنوب میں ٹیپو سلطان مل کر ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے نجات حاصل کر لیتے اور عیار فرنگی، چکی کے دوپانوں کے درمیان اس طرح پیس ڈالے جاتے، جیسے گندم۔ لارڈ ولزلی کو صورت حال کی سنگین کاشدیت سے احساس تھا، اس لئے وہ شاہ کو ٹیپو سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

چھوڑ دینے پر مجبور کر دو۔ میں بھی اس سلسلے میں دن رات غور و فکر کر رہا ہوں، تم بھی مسلسل سوچتے رہو۔

مرہٹوں میں دولت راؤ سندھیا کی فوج ہی ایک ایسی فوج تھی جو میدان جنگ میں کارگر ثابت ہو سکتی تھی ورنہ پیشوائے پونا کی ذاتی طاقت تو اس قدر محدود تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ آخر لارڈ ولزلی کے عیار ذہن نے ایک اور منصوبہ تراش لیا۔ مرہٹوں نے پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی سے ایسی عبرت ناک شکست کھائی تھی کہ آج تک اس شکست کے ذمہ ہرے تھے اور ان سے مسلسل خون رستا تھا۔ مرنے کے بعد بھی احمد شاہ ابدالی کے جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ اس کا نام سن کر بھی مرے لرز جاتے تھے۔ لارڈ ولزلی نے مرہٹوں کی اسی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ افواہ پھیلا دی کہ عنقریب احمد شاہ ابدالی کا پوتا، زماں شاہ ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دولت راؤ سندھیا کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنے شمالی مقبوضات کو بچانے کی فکر کرے۔ اس مشورے کا ایک ہی مقصد تھا کہ دولت راؤ سندھیا، زماں شاہ کے حملے کی خبر سن کر گھبرا جائے اور پھر اسی خوف و ہراس کے عالم میں پونا چھوڑ کر شمالی ہند کی طرف چلا جائے۔

لارڈ ولزلی کا منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا کہ دولت راؤ سندھیا پر زماں شاہ کے فرضی حملے کی خبر کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا اور وہ برابر پونا میں مقیم رہا۔

اپنی اس چال کی ناکامی پر لارڈ ولزلی کچھ دیر کے لئے شدید جھنجھلاہٹ کا شکار نظر آنے لگا۔ مگر چند روز بعد ہی اس کے ہنٹوں پر وہی پُر فریب مسکراہٹ نظر آنے لگی۔ ابھی دولت راؤ سندھیا، پونا میں مقیم تھا کہ لارڈ ولزلی نے کرنل کالنس کو سفیر بنا کر گوالیار روانہ کیا۔ گوالیار، دولت راؤ سندھیا کا پایہ تخت تھا۔ لارڈ ولزلی کی طرح کرنل کالنس بھی شاطرانہ چالیں چلنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ جب کرنل، گوالیار کی طرف روانہ ہونے والا تھا تو ایک دن پہلے لارڈ ولزلی نے اسے تنہائی میں طلب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”کرنل! تو میری بساط سیاست کا ایک ایسا مہرہ ہے جس پر میں ناز کرتا ہوں۔ تو خود بہت ذریعہ ودانا ہے، اس لئے میں تجھے کیا سمجھاؤں۔ مگر پھر بھی اتنا یاد رکھنا کہ تیری شکست میری ذاتی شکست ہوگی۔“

”معزز و محترم لارڈ! میری لغت میں تو شکست کا لفظ ہی تحریر نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر کرنل کالنس چند قدم آگے بڑھا اور لارڈ ولزلی کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ”عنقریب آپ سن لیں گے کہ آپ کے اس حقیر سے مہرے نے سیاست کی بساط پر کیا گل کھلائے؟ شاہ انگلستان اور لارڈ ولزلی کے وقار و جاہ کی قسم! ایسی بازی کھیلوں گا کہ ساری دنیا قیامت تک میری چالوں کو یاد رکھے گی۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔

لارڈ ولزلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تمام بحری اور بری فوجوں کو تیاری کا حکم دیا اور خود 31 دسمبر 1798ء کو مدراس پہنچ گیا۔ دسمبر کے آخر سے 3 فروری تک لارڈ ولزلی نے نیپو سلطان کو کئی خط تحریر کئے۔ ان تمام خطوط میں ایک ہی بات درج ہوتی تھی کہ سلطان، انگریز کے بدترین دشمن فرانیسیوں سے ساز باز کر رہا ہے۔ نمک حرام میر صادق نے لارڈ ولزلی کے بہت سے خطوط، سلطان تک پہنچنے ہی نہیں دیئے۔ اگرچہ ان خطوط کے موصول ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن پھر بھی اتنا ضرور ہوتا کہ سلطان تمام صورت حال سے باخبر رہتا اور آخر وقت تک کوئی نہ کوئی تدبیر اختیار کرتا تا کہ سلطنت خداداد کو جنگ سے محفوظ رکھا جاسکے۔

لارڈ ولزلی نے جنوری 1799ء کے آغاز میں سلطان کو آخری خط تحریر کیا۔ اس خط کے ساتھ سلطان ترکی کا وہ فرمان بھی منسلک تھا جس میں حکومت ترکی نے فرانیسیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا تھا۔ اس فرمان کا حوالہ دیتے ہوئے لارڈ ولزلی نے لکھا تھا۔

”سلطان ترکی کے اس اعلان جہاد کے بعد سلطنت خداداد پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنی سرزمین پر موجود تمام فرانیسیوں کو قتل کر ڈالے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو انہیں گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دے۔“

جواباً نیپو سلطان نے لارڈ ولزلی کو تحریر کیا۔

”میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ جس قوم کے افراد نے ہر آڑے وقت میں سلطنت خداداد کا ساتھ دیا ہو، میں انہیں کسی جرم کے بغیر قتل کرادوں۔ میں انہیں گرفتار کر کے تمہارے حوالے بھی نہیں کر سکتا کہ تمہارے دل فرانیسیوں کی طرف سے صاف نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان باوفا لوگوں کو اپنی سیاست کے قتل میں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالو گے۔ واضح رہے کہ میری سلطنت میں مقیم چند فرانیسی، برطانوی اقتدار کے لئے خطرہ نہیں بن سکتے۔ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے فرانیسی دوستوں کی طرف سے ضمانت فراہم کرتا ہوں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا، سو کہہ چکا۔ پھر بھی اگر آپ کی دوستی کے معاہدے میں فرانیسیوں کا قتل عام شامل ہے تو میں اس دوستی سے انکار کرتا ہوں۔“

جب سلطان کی طرف سے لارڈ ولزلی کو یہ خط تحریر کیا جا رہا تھا، اس وقت تمام فرانیسی افسر، نیپو کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انہوں نے بیک زبان کہا تھا۔

”سلطان ذی وقار! دوستی آپ کے نام پر ہمیشہ نازاں رہے گی۔ ہمارے مذاہب جدا ہیں، عقائد مختلف ہیں مگر پھر بھی آپ نے رفاقتوں کا حق ادا کر دیا۔“ یہ کہتے کہتے فرانیسی افسر ابدیدہ ہو گئے۔ ”ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ لارڈ ولزلی کے ارادے نہایت خطرناک ہیں۔ آپ واقف نہیں کہ وہ فرانیسیوں سے کس قدر نفرت کرتا ہے۔“

”پھر؟“ نیپو نے فرانیسی افسروں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ سلطنت خداداد کی بقا کا مسئلہ ہے۔ آپ ہمیں لارڈ ولزلی کے حوالے کر دیں اور اپنے

آخر اس نے اپنی سیاست کی ذہنیت سے ایک اور فتنہ گر چال برآمد کی۔ لارڈ ولزلی نے مراد آباد کے ایک شیعہ کو ایران بھیجا۔ انگریزوں کے خریدے ہوئے اس شخص نے عباس شاہ صفوی کے دربار میں پہنچ کر اس قدر زور و شور کے ساتھ گریہ و زاری کی کہ پورا دربار لرز اٹھا۔

”شہنشاہ نہیں جانتے کہ افغانستان میں شیعوں پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔“ وہ بہر ویا، عباس شاہ صفوی کے سامنے زار و قطار روتے ہوئے سینہ کو پی کر رہا تھا۔ ”خدا ہی جانتا ہے کہ میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں۔ افغانستان میں شیعوں کی عزت و آبرو محفوظ ہے اور نہ جان و مال۔ ان کے عقائد پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں اور سینکڑوں شیعہ ہر روز تہ تیغ کئے جا رہے ہیں۔“

عقائد کا مسئلہ تھا، اس لئے عباس شاہ صفوی بھی مشتعل ہو گیا اور اس نے صورت حال کی تحقیق کئے بغیر افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اس وقت زماں شاہ اپنی فوجوں کے ساتھ ہندوستان کی سرحد پر موجود تھا اور مرہٹوں اور انگریزوں کے خلاف جنگ کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ ایرانیوں کے حملے کی خبر سنتے ہی اسے کابل کی طرف لوٹ جانا پڑا۔ جیسے ہی لارڈ ولزلی کو زماں شاہ کی واپسی کی اطلاع ملی تو اس نے ایک زوردار تہقہہ لگایا۔ اُس کے قہقہے میں کسی درندے کی غزائیت کی گونج سنائی دیتی تھی۔



پوٹا، انگریزوں کے جال میں پھنس گیا تھا۔ دولت راؤ سندھیا کا خطرہ دور ہو چکا تھا۔ حیدر آباد کی آزادی سلب کر لی گئی تھی اور ایران کے زماں شاہ کے خلاف مشتعل کر دیا گیا تھا۔ عجیب صورت حال تھی کہ ایک طرف ہندوستان کے گوشے گوشے پر بد نصیبی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور دوسری طرف حکومت انگلستان اور لارڈ ولزلی کے اقبال کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ لارڈ ولزلی نے جو چال چلی، کامیاب ثابت ہوئی اس کے ہندوستانی حریف اندھے بھی تھے اور بہرے بھی۔ نہ انہیں کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ وہ اپنے بھلے کی کوئی بات سن سکتے تھے۔ بس پورے ہندوستان میں ایک نیپو سلطان تھا، جس کی آنکھیں بھی روشن تھیں اور دماغ بھی صحت و توانائی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہ آخری لمحے تک چیخا رہا کہ ہندوستان کو بچالو۔ مگر کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔ غلامی، ذلت و بربادی کی آہنی زنجیریں لئے دیے پاؤں بڑھتی رہی اور ہندوستان کے کروڑوں عوام، لاکھوں سپاہی اور ہزاروں اہل دانش چند انگریزوں کے اشاروں پر رقص کرتے رہے۔

لارڈ ولزلی کو یقین ہو گیا تھا کہ اب نیپو کہیں سے فوجی امداد حاصل نہیں کر سکے گا، اس لئے وہ سلطنت خداداد پر حملہ کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ لارڈ ولزلی کو لارڈ کارنوالس اور جنرل میڈوز نے بتا دیا تھا کہ سلطان کے امراء اور وزراء کس قماش کے لوگ ہیں؟ کون کس قیمت پر خریدا جاسکتا ہے اور سرنگاپٹم پر قبضہ کرنے کے آسان طریقے اور راستے کیا ہیں؟ لارڈ کارنوالس نے جو فصل بوئی تھی، وہ پک کر تیار ہو چکی تھی اور اب لارڈ ولزلی اسے کاٹنے والا تھا۔

”اگر آپ چاہیں تو میجر ڈوٹن کو بھیج سکتے ہیں تاکہ میں آپ کے نمائندے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفادات اور ان کے تحفظ پر تفصیلی گفتگو کر سکوں۔“

ٹیپو نے ایک بار پھر حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے جنگ کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ مگر سلطان اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ درپردہ اس کے خلاف اعلان جنگ ہو چکا ہے۔ خط و کتابت اور نئے نئے شرائط نامے پیش کرتا تو لارڈ ولزلی کی ایک گہری چال تھی۔ وہ سلطان کو لفظوں کے گورکھ دھندے میں الجھا کر اپنی فوجی کارروائی جاری رکھنا چاہتا تھا۔ نتیجتاً لارڈ ولزلی نے سلطان کے آخری خط کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

لارڈ ولزلی نے جنوری 1799ء کے وسط میں انگریزی فوج کے سپہ سالار جنرل ہارس کو ایک طویل خط تحریر کیا۔

”مجھے معلوم ہے کہ سلطان کے تمام امراء، وزراء اور باج گزار اس سے سخت بیزار ہیں اور ہماری پناہ میں آنے کے لئے بے قرار ہیں۔ وہ سلطنتِ خداداد کے جابرانہ نظام سے نجات چاہتے ہیں اور اپنی دستگیری کے لئے ہمیں مسلسل آوازیں دے رہے ہیں۔ اس موقع پر ہماری خاموشی ایک بہت بڑے اخلاقی جرم کے مترادف قرار پائے گی۔ اس لئے ٹیپو کے خلاف جنگ کرنا عین انصاف ہے اور ہم انصاف قائم کرنے ہی کے لئے ہندوستان آئے ہیں۔“

جنرل ہارس نے ایک ماہ میں اپنی فوجی تیاریاں مکمل کیں اور پھر 22 فروری 1799ء کو ٹیپو کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ انگریزی فوجیں دو ماہ پیشتر ہی سے سرحد پر موجود تھیں، برق رفتاری کے ساتھ سلطنتِ خداداد کی جانب بڑھیں۔ فرنگی لشکر کے ساتھ حیدر آباد کی فوجیں بھی تھیں، جن کی قیادت میر عالم کر رہا تھا۔ یہ تمام فوجیں اپنے طور پر انتہائی خفیہ انداز میں آگے بڑھ رہی تھیں مگر دراصل انہیں کوئی روکنے والا ہی نہ تھا۔ سلطان کے خلاف سازش مکمل ہو چکی تھی، اس لئے کسی مقام پر بھی اتحادی فوجوں کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں تک کہ دشمن سپاہی، سلطنتِ خداداد کی سرحدوں میں بہت آگے تک داخل ہو کر رائی کوٹ پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد انگریزی فوج کے سپاہی اور جاسوس ان غداروں کے مکانات میں روپوش ہو گئے جو اس سازش میں شریک تھے۔ یہ ٹیپو کی بدقسمتی تھی کہ انگریز سپاہیوں اور جاسوسوں کو پناہ دینے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔

لارڈ ولزلی کی طرف سے اپنے آخری خط کا جواب نہ ملنے پر سلطان کسی نئے خطرے کی آہٹ محسوس کر رہا تھا۔ پھر جب اس نے وزیراعظم میر صادق علی اور وزیر خزانہ پورنیا کو بلا کر اپنے اندیشوں کا اظہار کیا تو یہ دونوں نمک حرام انتہائی پرجوش لہجے میں کہنے لگے۔

”انگریزوں کی کیا مجال کہ وہ سلطنتِ خداداد کی حدود میں قدم بھی رکھ سکیں۔“

سلطان میر صادق اور پورنیا پر بے حد اعتماد کرتا تھا، اس لئے ان کا جواب سن کر بظاہر

اقتدار کو بچانے کی کوشش کریں۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو محض سپاہی ہیں۔ آج اگر بچ گئے تو کل کسی دوسرے محاذ پر قتل ہو جائیں گے۔“

فرانسیسی افسروں کی بات سن کر سلطان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کی آنکھوں میں غبار سا نظر آنے لگا۔

”اگر آپ اسے ہماری قربانی تصور کرتے ہیں تو یہ ایک بہت شریف النفس آقا اور بہت ہی لائقِ احترام دوست کے لئے نہایت حقیر قربانی ہو گی۔“ فرانسیسی افسروں کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ سچا تھا اور اس سچائی کی جھلک ان کے چہروں پر نمایاں تھی۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ جوشِ جذبات میں ٹیپو چیخ اٹھا۔ ”میں اپنے بچوں کو بطور ریغمال لارڈ ولزلی کے پاس بھیج سکتا ہوں اور ماضی میں ایسا کر بھی چکا ہوں مگر ایک خود غرض، جھوٹے اور منافق انسان کی ہوس پر اپنے دوستوں کو کس طرح قربان کر دوں؟ خدا کی قسم! میں ایسی بھانپیں چاہتا، جو فنا کی ہم رنگ ہو۔ میں تمہارے جذبہ ایثار کی قدر کرتا ہوں مگر آنے والی نسلوں سے یہ سنا نہیں چاہتا کہ ٹیپو اپنے چند روزہ اقتدار کے لئے سیاست کی نیلام گاہ میں دوستوں کی قربانیاں بھی فروخت کر گیا۔ مجھے ہرگز ایسا اقتدار نہیں چاہئے جس کی بنیادیں اہلِ وفا کی لاشوں پر رکھی ہوں۔“ ٹیپو کی آنکھیں بھی اشکوں سے لبریز تھیں۔ ”اگر ہو سکے تو بلاتا خیر تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نے انگریزوں سے، ہندوؤں سے، مسلمانوں سے، اپنوں سے، بیگانوں سے، غرض ہر شخص سے حسنِ ظن رکھا مگر یہ لوگ مجھے احمق و نادان سمجھتے رہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نادان ہوں یا پوری ہندوستانی قوم بدترین حماقت کا شکار ہے۔ لارڈ ولزلی کے مطالبات ابھی اور بڑھیں گے۔ عنقریب وہ یہ مطالبہ بھی پیش کرے گا کہ میں اس کی غلامی قبول کر لوں۔ خیر! یہ تو آزمائش کے وقت ہی پتہ چلے گا کہ میں نے کسے قبول کیا اور کسے ٹھکرادیا۔ اللہ مجھے فتوں کے اس جہنم میں ثابت قدم رکھے۔ پھر بھی میری یہ خواہش ہے کہ تم لوگ جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے جس دن کا انتظار تھا، شاید وہ آ پہنچا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ آنے والا دن میرے اور تمہارے لئے خوشگوار نہیں ہوگا۔“

سلطان نے انتہائی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرانسیسی افسروں اور سپاہیوں کو سلطنتِ خداداد سے چلے جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن وہ بھی غیرت مند لوگ تھے۔ انہوں نے سلطان سے صاف صاف کہہ دیا۔

”جب ہم نے آپ کی عنایاتِ خسروانہ کے سبب موسمِ بہار کی لذتیں حاصل کی ہیں تو پھر دورِ خزاں دیکھنے کے لئے آپ کو تنہا کیسے چھوڑ دیں؟“

ٹیپو نے فرانسیسی افسروں کا جواب سنا اور اس کے چہرے پر عزم اور حوصلے کا نیا رنگ ابھر آیا۔

اپنے خط کے آخر میں سلطان نے لارڈ ولزلی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

مطمئن ہو گیا لیکن درپردہ وہ ایک انجانے سے اضطراب میں مبتلا تھا اور اضطراب کی وجہ لارڈ ولزلی کی خاموشی تھی جس نے ابھی تک سلطان کے ایک انتہائی اہم خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ جنرل ہارس کی قیادت میں ایک انگریزی فوج، مدراس کی جانب سے سلطنتِ خداداد کی جانب بڑھ رہی تھی اور دوسری انگریزی فوج جنرل اسٹیورٹ کی قیادت میں ملابار اور کورگ کے راستے سے سرنگاپٹم کی طرف آرہی تھی۔ پھر جب اتحادیوں کی تمام فوجیں سلطنتِ خداداد کے انتہائی حساس مقامات تک پہنچ گئیں تو سلطان کو خبر ہوئی کہ اس کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جا چکا ہے۔

ٹیپو اپنے 13 فروری کے لکھے ہوئے خط کے جواب کا انتظار کر رہا تھا مگر اچانک اس پر یہ راز کھلا کہ اس کے خط کے جواب میں فوج کشی کی گئی ہے۔ بڑے سنگین لمحات تھے لیکن ٹیپو نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ انگریزی فوج کے مقابلے کے لئے دارالحکومت سے نکلا اور تین دن کے مختصر سے وقت میں ”پریاپٹن“ پہنچ گیا۔

وہ 5 مارچ کی کھراؤ صبح تھی۔ پریاپٹن کا میدان خیموں سے بھرا ہوا تھا۔ جس میں سلطان کا سبز خیمہ بہت نمایاں نظر آ رہا تھا۔ جب کورگ کے راجہ نے ”سدراسیر“ کی پہاڑی سے یہ منظر دیکھا تو گھبرا گیا۔ پھر اس نے فوراً ہی اپنے برق رفتار سواروں کو یہ خبر دے کر انگریزی کیپ کی طرف روانہ کر دیا کہ ٹیپو سلطان، پریاپٹن کے میدان میں خیمہ زن ہے۔

انگریزی فوج کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سلطان اس قدر جلد نقل و حرکت کر سکے گا۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ کورگ کے جنگلوں کے تمام راستے انتہائی دشوار گزار تھے۔

دوسری صبح جب پوری فضا کھراؤ تھی، سلطان آگے بڑھا اور انگریزی فوج کے ایک حصے سے اس کا مقابلہ ہو گیا۔ فرنگی سپاہی کچھ دیر تک جم کر مقابلہ کرتے رہے مگر انجام کار پسا ہو کر میدانِ جنگ سے فرار ہونے لگے۔ اس کوشش میں سینکڑوں انگریز سپاہی قتل ہو گئے۔ اگر راجہ کورگ بروقت انگریزوں کو اس علاقہ میں ٹیپو کی موجودگی کی اطلاع نہ دیتا تو فرنگیوں کی پوری فوج تباہ ہو جاتی۔ لیکن راجہ کی خبر رسانی نے انگریزی فوج کے اس حصے کو بچا لیا جو پیچھے آ رہا تھا۔ فرنگیوں کے اس لشکر کا بڑا حصہ تباہ و چکا تھا۔ اس لئے ٹیپو نے میر قمر الدین کو باقی ماندہ سپاہیوں کی سرکوبی پر مامور کیا اور خود مشرقی محاذ پر آ کر ”چن پٹن“ کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔

اس دوران حیدر آبادی اور انگریزی فوجیں ”رائی کوٹہ“ سے نکل کر ”آنیکل“ پر قبضہ کرتی ہوئی چن پٹن کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ مگر جب انہیں یہاں سلطان کی موجودگی کا علم ہوا تو جنرل ہارس راستہ کاٹ کر ”خان خانہلی“ کے علاقے میں جا پہنچا۔ یہ دیکھ کر سلطان ملوٹی (مکشن آباد) کی طرف بڑھا۔ اس محاذ پر انگریزوں سے طویل خونریز جنگ ہوئی۔ قریب تھا کہ انگریزی مورچہ فتح ہو جاتا مگر غدار میر معین الدین اور پورنیا نے سلطانی فوج کو انگریزی توپ خانے کی زد پر لگا دیا۔ جس کی وجہ سے ٹیپو کے جاں نثاروں کے چیتھڑے اڑ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے

میدانِ جنگ میں انسانی گوشت اور ہڈیوں کا ڈھیر نظر آنے لگا۔

پورنیا تو شروع ہی سے غدار تھا لیکن میر معین الدین نے اسلام اور دوستی کی قبا پہن کر غداری کی۔ میر معین الدین، نواب حیدر علی کی ملازمت میں آنے سے پہلے کرناٹک کی انگریزی فوج میں ایک معمولی عہدے پر مامور تھا۔ میسور کی پہلی جنگ کے بعد اس نے سلطنتِ خداداد کی ملازمت اختیار کر لی۔ نواب حیدر علی کے وقت میں میر معین الدین غداری کر کے مرہٹوں سے مل گیا تھا اور اس نے نمک حرامی کے عوض ”گرم کٹڈ“ کی جاگیر اپنے نام لکھوائی تھی۔

مرہٹوں کے جانے کے بعد جب صورتِ حال یکسر بدل گئی تو میر معین الدین نے نواب حیدر علی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ نواب حیدر علی ایک اعلیٰ ظرف انسان تھا، اس لئے اس نے میر معین الدین کو معاف کر دیا۔ یہی خوبی ٹیپو سلطان میں بھی تھی کہ وہ امان طلب کرنے پر اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا کرتا تھا۔ آخر یہی خوبی باپ اور بیٹے دونوں کے لئے ایک عذاب بن گئی۔ ریاست کے بے ضمیر افراد بار بار بدعہدی کرتے تھے اور نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی طرف سے بار بار انہیں معاف کر دیا جاتا تھا۔ انجام کار غفرو و درگزر کے اس مظاہرے نے بے شمار غداروں کی پرورش کی اور پھر یہی غدار سلطنتِ خداداد کی تباہی کا سبب بن گئے۔

میر معین الدین بھی انہی غداروں میں سے تھا جو دن رات ٹیپو سلطان کی وفاداری کے ترانے گاتے رہتے تھے مگر درپردہ مناسب وقت کے انتظار میں تھے کہ کب انہیں موقع ملے اور کب وہ اسلامی سلطنت کو فرنگیوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں۔ میر معین الدین نے میسور کی تیسری جنگ میں انتہائی وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا یہی وجہ تھی کہ سلطان نے اس کی فوجی خدمت سے خوش ہو کر اسے سپہ سالاری کے عہدے پر ترقی دے دی تھی۔ پھر قریب بانو کی موت کے بعد ٹیپو نے 1795ء میں میر معین الدین کی بیٹی خدیجہ زبانی بیگم سے نکاح کر لیا۔ سلطان کی اس بیوی سے 1797ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا مگر چند روز بعد ہی زبانی بیگم اور بچے کا انتقال ہو گیا۔ میر معین الدین نہ صرف سلطنتِ خداداد کی افواج کا سالار تھا بلکہ رشتے میں سلطان کا خسر بھی تھا۔ مگر غداروں کی نظر میں نہ کوئی حوالہ معتبر ہوتا ہے اور نہ کوئی رشتہ۔ اس نے اپنے سرکاری منصب سے بھی غداری کی اور قریب ترین رشتے کو بھی پامال کر ڈالا۔

میر معین الدین برسوں سے اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سلطانی افواج فرنگی لشکر پر غالب آنے لگیں، میر معین الدین نے سلطنتِ خداداد کے جانبازوں کو غلط راستے پر ڈال دیا اور پھر آن کی آن میں ہزاروں سپاہی انگریزی توپوں کی خوراک بن گئے۔ جب سلطان کو اس واقعے کی خبر ملی تو اس نے اپنی تمام فوج جمع کر کے انگریز لشکر پر حملہ کر دیا۔ سلطان کے جاں نثار سید غفار، نواب حسین علی خان اور نواب محمد رضا خان، فرنگی سپاہیوں پر بھوکے شیر کی طرح حملہ کر رہے تھے۔ اچانک نواب محمد رضا خان کے گولی لگی اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ سلطان نے اٹک بار آنکھوں کے ساتھ اپنے وفادار ساتھی کی لاش کو پاکی میں ڈالا اور سرنگاپٹم روانہ کر دیا۔



نواب محمد رضا خان کی شہادت کے بعد سلطانی افواج کے حملوں میں پہلے سے زیادہ شدت آگئی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اس بار ایک ایک انگریز سپاہی لقمہ اجل بن جاتا مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ عین حالت جنگ میں سلطان کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے انتہائی پریشان کن خبریں موصول ہوئیں۔

جاسوسوں نے بتایا کہ میر قمر الدین غداری کر کے دشمنوں سے جاملا ہے۔ اس نے کورگ میں انگریزی فوج کا مقابلہ نہیں کیا جس کی وجہ سے جنرل اسٹیورٹ کسی مزاحمت کے بغیر دارالحکومت کے قریب جا پہنچا ہے۔

اس خبر کے سنتے ہی سلطان نے جنگ روک دی اور اپنی فوج کو لے کر سرنگاپٹم کی طرف بڑھا۔ ٹیپو کے واپس ہوتے ہی اس انگریزی فوج کو جو محصور ہو کر رہ گئی تھی، نئی زندگی حاصل ہوگئی۔ سلطان برق رفتاری کے ساتھ دارالحکومت پہنچا۔ اس کے پیچھے انگریزی فوج بھی روانہ ہوئی جو سرنگاپٹم کے قریب جنرل اسٹیورٹ کی فوج سے آکر مل گئی۔ پھر ان دونوں فوجوں نے ان مورچوں پر قبضہ کر لیا جو سلطان نے قلعے کے سامنے شمال میں تعمیر کئے تھے۔ یہاں بھی انگریز سپاہیوں کو کسی مزاحمت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ وہ دارالحکومت کے انتہائی حساس مقامات تک اس طرح پہنچ گئے جیسے اپنے گھر میں چہل قدمی کر رہے ہوں۔

جنرل ہارس جس فوج کی قیادت کر رہا تھا، اس نے ”ہوسبلی“ کے قریب سے دریا عبور کیا اور قلعے کے عین مقابل جنوب میں واقع ایک ایسے باغ میں داخل ہوگئی جو بہت زیادہ گنجان تھا۔ اس باغ سے قلعے کی تفصیل تک درمیان میں صرف دریائے ”کلاویری“ اور ایک خندق ہے۔ یہاں دریا کی چوڑائی بہت کم رہ گئی ہے۔ مختلف مقامات پر ایسی پتھریلی زمین ہے جو برسات کے موسم کے علاوہ ہمیشہ خشک رہتی ہے۔ اس جگہ کو آسانی کے ساتھ عبور کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تفصیل کی اونچائی بھی کچھ زیادہ نہیں۔ سلطان کے امراء اور فوجی افسروں کی سازش سے جنرل ہارس اور اس کے سپاہی ایک اہم مورچے تک پہنچ گئے تھے۔ گھنے درختوں کے باعث باغ میں چھپی ہوئی فوج، قلعے کی تفصیل سے نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے سلطان کے جاں نثاروں کو احساس بھی نہ ہو سکا کہ دشمن کے ہاتھ ان کی شہرگوں تک آپہنچے ہیں۔

یہ قلعے کا سب سے کمزور پہلو تھا جس کی نشاندہی غدار میر قاسم علی نے کی تھی اور اسی نے انگریزی فوجوں کو ”ہوسبلی“ کے محفوظ راستے سے لاکر باغ میں ٹھہرایا تھا۔ میر قاسم علی کی تمام عمر سلطانی ملازمت میں بسر ہوئی تھی۔ اس کا وطن ریاست حیدرآباد کی سرحد پر واقع تھا اور یہ بھی میر صادق علی اور میر غلام علی کی طرح حسن بن صباح کا ماننے والا تھا۔

ایک بار میر قاسم سلطان سے رخصت لے کر اپنے وطن جا رہا تھا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی میر صادق علی اور پورنیا نے ٹیپو سے شکایت کی کہ وہ بہت سارسکاری مال اپنے ساتھ لئے جا رہا ہے۔ سلطان نے فوراً حکم جاری کر دیا کہ میر قاسم علی کو پکڑ کر واپس لایا جائے۔ پھر جب میر

قاسم علی کی تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے کسی قسم کا سامان برآمد نہ ہو سکا۔ سلطان نے ایک اعلیٰ ظرف حکمران کی طرح میر قاسم علی سے معذرت کی اور اسے اس کے وطن جانے کی اجازت دے دی۔ میر قاسم علی واپس آیا تو سلطان نے اس کی تالیف قلب کے لئے اسے قلعہ داری کے اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا۔ مگر میر قاسم علی ایک کینہ پرور انسان تھا۔ اس نے مراعات سلطانی کی کوئی قدر نہیں کی۔ اسی فتنہ گر جماعت کا ایک سرگرم نمائندہ تھا جو دنیا بھر میں اسلامی اقتدار کی جڑیں کھودنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میر قاسم علی ایک طرف ٹیپو کی عنایات سے فیض یاب ہوتا رہا اور دوسری طرف نظام حیدر آباد کے توسط سے انگریزوں سے ساز باز کرتا رہا۔ بس اسے کسی مناسب موقع کا انتظار تھا۔ آخر وہ موقع 1798ء میں اس کے ہاتھ آگیا۔ ایک دن میر قاسم علی نے ٹیپو کے حضور عرض کرتے ہوئے کہا۔

”سلطان ذی حشم! اب آپ کا یہ خادم بہت تھک گیا ہے، اس لئے درخواست گزار ہے کہ اسے اس عہدے سے سبکدوش کر دیا جائے تاکہ وہ باقی ماندہ زندگی کے دن اپنے وطن میں گزار سکے۔“

سلطان نے میر قاسم علی کی درخواست قبول کر لی اور پھر بھرے دربار میں اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے بڑی دیانت اور وفاداری کے ساتھ اپنا فرض منصبی ادا کیا۔ اس لئے تمہاری عزت افزائی ہم پر قرض ہے۔“ یہ کہہ کر ٹیپو نے میر قاسم علی کو گراں بہا انعامات سے نوازا۔ ”جب تم اپنے وطن پہنچو تو وہاں کے لوگوں کو بتانا کہ تمہارا سلطان اس طرح وفاداروں کی قدر کرتا ہے۔“ میر قاسم علی بڑا شہدہ باز تھا، اس نے انتہائی خوب صورت الفاظ میں سلطان کے احسانات کا شکریہ ادا کیا اور بار بار جھک جھک کر سلام کرتا رہا۔ حالانکہ سلطان کے دربار میں احترام کی یہ رسم ممنوع قرار دی جا چکی تھی لیکن میر قاسم علی بہت دیر تک اسی تعظیمی رسم کا مظاہرہ کرتا رہا جو دوسرے حکمرانوں کے دربار میں باعث افتخار سمجھی جاتی تھی۔ پھر وہ دونوں ہاتھ باندھے، اُلٹے قدموں چلتا ہوا دربار سے نکلا اور اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔

میر قاسم علی کا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ سرنگاپٹم کی حدود سے نکل کر حیدر آباد جانے کے بجائے جنرل ہارس سے جا کر ملا اور پھر اس نے انگریزی فوج کو ”ہوسبلی“ کے محفوظ راستے سے لا کر اس گنجان باغ میں ٹھہرا دیا جو فوجی نقطہ نظر سے ایک انتہائی اہم مورچہ تھا۔



ایک بار پھر سلطان کی حرم سرا میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سرتیاد یوی اچانک ٹیپو سے ملنے محل چلی آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی جمیدہ بیگم غضب ناک ہو گئی تھیں۔

”تو پھر آگئی اپنی خوشیتیں لے کر؟ اب تو نے کون سا خواب دیکھا ہے؟“

”مادر ملکہ! آنکھیں بھی بجھ گئیں اور خواب بھی فنا ہو گئے۔“ سرتیاد یوی کا لہجہ بہت آداس

سے محروم دیکھا تو نیپو کی دادی، مجیدہ بیگم نے اسے منحوس قرار دے کر نہ صرف محل سے نکال دیا بلکہ اس کی آمد پر پابندی بھی عائد کر دی۔ تقریباً سات سال بعد سرتیا دوبارہ محل میں داخل ہوئی تھی اور اس نے مجیدہ بیگم کی نفرت و غضب کی پرواہ کئے بغیر سب کے سامنے نیپو سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ سلطان دن بھر اپنے فوجی افسروں سے مشورے کرتا رہا اور پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد شجاعت خان کے ہمراہ اس کوٹھری میں پہنچا جہاں سرتیا مقیم تھی۔

نیپو کو اپنے سامنے پا کر سرتیا کے ہونٹوں پر ایک شگفتہ مسکراہٹ ابھر آئی مگر دوسرے ہی لمحے یہ مسکراہٹ آنسوؤں کی زد پر رکھے ہوئے کسی چراغ کی مانند بجھ گئی۔ سرتیا کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں جیسے وہ بہت دیر تک روتی رہی ہو۔

”تشریف رکھیں سمرات!“ سرتیا نے فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔

نیپو بے تکلفانہ انداز میں فرش پر بیٹھ گیا۔ شجاعت خان نے بھی سلطان کی تقلید کی مگر سرتیا کسی کنیز کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی رہی۔

”تم بھی بیٹھ جاؤ۔“ سلطان نے انتہائی نرم و شیریں لہجے میں سرتیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم خوب جانتی ہو کہ میں احترام کے اس مظاہرے کو پسند نہیں کرتا۔ ہمارے مذہب میں یہ جائز نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔“

سرتیا نے بہت غور سے نیپو کی طرف دیکھا۔ مذہب اسلام قبول کرنے اور پھر سید اکرام بخاری کی درس گاہ سے فیض یاب ہونے کے بعد وہ خود اتنی خوددار اور بے پروا ہو گئی تھی کہ کسی شہنشاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرتی تھی۔ مگر نیپو کے سامنے یہ رسم احترام کسی اور ہی جذبے کی عکاس تھی۔ سلطان بھی سرتیا کے اس جذبے کو سمجھتا تھا مگر آج تک اس نے ایک عورت کے جذبہ شوق کی پذیرائی نہیں کی تھی۔

سرتیا خاموشی سے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ سلطان کا ظاہری احترام اب بھی برقرار تھا۔ کچھ دیر تک کوٹھری کی فضا پر گہرا سکوت طاری رہا۔ سرتیا دیوی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آخر اس سکوت کو شجاعت خان نے توڑا۔

”بیٹی! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ شجاعت خان نے سرتیا کو منہ بولی بیٹی بنایا تھا مگر وہ اسے اپنی حقیقی بیٹی کی طرح چاہتا تھا۔ سرتیا نے سر اٹھا کر سلطان اور شجاعت خان کی طرف دیکھا۔ آنکھوں کے رُکے ہوئے آبشار دوبارہ جاری ہو گئے تھے۔

سرتیا کی یہ حالت دیکھ کر سلطان بھی پریشان سا نظر آنے لگا۔ ”کیا پھر کسی نے تمہیں کوئی آزار پہنچایا ہے؟“ سرتیا کے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر نیپو بھی سمجھا تھا کہ ریاست کے کسی شخص نے اسے ستایا ہے اور وہ فریادی بن کر یہاں تک پہنچی ہے۔

تھا اور اس کی آنکھوں میں خوں شدہ حسرتوں کا غبار بھرا ہوا تھا۔ ”اب دیکھنے کے لئے کچھ بھی باقی نہ رہا۔“

”خدا کے لئے یہاں سے چلی جا کہ تیرے منحوس قدم اس ریاست کو تباہ کر کے چھوڑیں گے۔“ مجیدہ بیگم کے غصے کا یہ عالم تھا کہ ان کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ”نہیں مادر ملکہ! اب میں واپس جانے کے لئے نہیں آئی ہوں۔“ سرتیا ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ ”یہ آپ کا آخری احسان ہوگا کہ مجھے یہاں کچھ دن ٹھہر جانے دیں۔“

”تجھے جانا ہی پڑے گا۔“ مجیدہ بیگم جوش غضب میں اس طرح کھڑی ہو گئی تھیں جیسے وہ خود سرتیا کو پھینچ کر محل سے باہر نکال دیں گی۔ شجاعت خان بڑی اذیت کے عالم میں سرتیا کے ساتھ مجیدہ بیگم کا یہ غیر انسانی سلوک دیکھ رہا تھا۔ آخر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ انتہائی تلخ لہجے میں بول اٹھا۔

”تُو اپنا ناپاک و منحوس وجود لے کر یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتی؟ یہ پاک لوگوں کی بہتی ہے اور یہاں کے رہنے والے سب کے سب بابرکت انسان ہیں۔“

سرتیا نے پلٹ کر سلطان کی طرف دیکھا۔ ”سمرات! میں نے آپ سے آج تک کچھ نہیں مانگا۔ رعایا کے ایک فرد کی حیثیت سے مجھے خدمت گاروں اور کنیزوں کی کسی کوٹھری میں کچھ دن گزار لینے دیجئے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔“

مجیدہ بیگم ایک بار پھر سرتیا دیوی پر برسنے لگی تھی کہ نیپو سلطان نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”دادی محترم! اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ کاش! آپ جان سکتیں کہ کس کی خوشتوں نے ریاست کو یہ دن دکھائے ہیں۔“

مجیدہ بیگم کو سلطان کی مداخلت کے سبب خاموش ہو جانا پڑا مگر پھر بھی سرتیا کے لئے ان کے دل میں نفرت و غضب کا ایک سمندر موجزن تھا۔

سرتیا قصر سلطانی سے نکل کر خدمت گاروں اور کنیزوں کی کوٹھریوں کی طرف چلی گئی مگر جاتے جاتے سلطان سے یہ کہتی گئی۔ ”سمرات! اگر آپ کو فرصت ہو تو آج رات کسی وقت اس کنیز کو ملاقات کا شرف بخش دیں۔ وقت بہت کم ہے۔“

سرتیا کی بات سن کر نیپو اور شجاعت خان دونوں چونک اٹھے۔ سلطان جانتا تھا کہ اس وقت سرتیا کی آمد بے سبب نہیں ہے۔ پہلے بھی اس تارک الدنیا عورت نے نیپو سلطان کو خبردار کیا تھا کہ اس کے اقتدار کو شدید خطرہ لاحق ہے مگر حرم سرا کی خواتین نے سرتیا کے اس انکشاف کو ذہنی خلل سے تعبیر کیا تھا۔ پھر جب سرتیا نے خواب کی حالت میں نواب حیدر علی کو دونوں بازوؤں

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ یکایک فضا گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سے گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ہی سرخ پوشوں کی صدائیں ابھرنے لگیں۔ ”خوش آمدید اے مرد باصفا! مرحبا اے شہید محترم! تجھے مبارک ہو کہ تیرا یہ سفر بہ عافیت تمام ہوا اور تُو اپنے گھڑے ہوئے رفیقوں سے آ ملا۔“ یہ کہہ کر سریتا چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔

”سرخ پوشوں کی آوازوں کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔“ مختصر سے سکوت کے بعد سریتا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتی کہ آنے والا شہسوار کون تھا مگر ”خوش آمدید“ کے نعرے سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والا، سید بابا کے شیر کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔“

سریتا کے خواب کی تفصیلات سن کر شجاعت خان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سید اکرام بخاری، نواب سراج الدولہ اور حافظت رحمت خان روہیلہ کو بھی اپنا شیر کہہ کر پکارتے تھے۔ ان دونوں مردانِ غیور کی شہادت پر سید صاحب بہت روئے تھے اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان کے آخری الفاظ یہی تھے۔ ”اے خدا! مجھے اپنے پاس واپس بلا لے۔ اب مجھ ناتواں میں یہ منظر دیکھنے کی طاقت نہیں ہے کہ گیدڑوں کی فوج مل کر میرے آخری شیر کو بھی مار ڈالے۔“

ٹیپو سلطان آخری لمحات میں سید صاحب کے قریب موجود نہیں تھا مگر ان کے یہ الفاظ نواب حیدر علی اور شجاعت خان نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ سنے تھے۔ سید صاحب کی تدفین کے بعد حیدر علی نے شجاعت خان سے پوچھا بھی تھا کہ سید صاحب کس شیر کا ذکر کر رہے تھے..... مگر شجاعت خان یہ کہہ کر ٹال گیا تھا کہ بزرگوں کی باتیں اس کی عقل سے بالاتر ہیں۔ سید صاحب نے اشارتاً کہا تھا کہ گیدڑوں کی فوج مل کر ان کے شیر کو ہلاک کر ڈالے گی۔ شجاعت خان اسی دن سے اُداس رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر مطمئن بھی ہو جاتا تھا کہ شاید سید صاحب کا اشارہ کسی اور طرف ہو۔ مگر جب انگریزوں نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا تو شجاعت خان کو بڑے تسلسل اور شدت کے ساتھ سید صاحب کے الفاظ یاد آیا کرتے تھے۔ پھر آج جب سریتا نے اپنا خواب بیان کیا تو شجاعت خان کو یقین آ گیا کہ سید صاحب کے آخری شیر کا انجام بھی قریب آ پہنچا ہے۔ شجاعت خان ایک اولوالعزم اور بہادر انسان تھا۔ اس نے نوعمری میں ایک بار محبت کی اور اسی محبت کے سہارے اپنی ساری زندگی گزار دی۔ اگرچہ سینکڑوں خوب صورت عورتوں نے بارہا اس کا دامن کھینچا لیکن وہ زینت جہاں کی یادوں کو سینے سے لگائے تنہا اپنی زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔ پھر ٹیپو نے اس کی آغوشِ محبت میں تربیت پائی۔ شجاعت خان نے اپنے دل کی آگ اس طرف منتقل کر دی۔ وہ سلطان کو اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سریتا کا خواب سن کر اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے تیز نشتر سے اس کے دل میں شگاف ڈال دیا ہو۔

ٹیپو حیرت و سکوت کے عالم میں سریتا کا بیان کردہ خواب سنتا رہا۔ پھر جب سریتا خاموش

”نہیں سمرات!“ سریتا نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں لوگوں کے طرزِ عمل کی شکایت نہیں کرتی۔ میں نے ان کا معاملہ روزِ حشر پر اٹھا رکھا ہے۔“

”پھر تم جیسی شجاع خاتون کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟“ سلطان کی ذہنی الجھن دُور ہو گئی تھی مگر پھر بھی وہ سریتا کی اشکباری کے سبب ایک عجیب سے اضطراب میں مبتلا تھا۔

”شاید سمرات نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث یہ منظر نہیں دیکھا کہ پھر بھی روتے ہیں۔“ سریتا کے لہجے میں بڑی خلش تھی۔

ٹیپو، سریتا کے اس سوالیہ جملے کا مفہوم سمجھتا تھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم نے کہا تھا کہ وقت بہت کم ہے۔“ سلطان نے سریتا کو اس کے الفاظ یاد دلانے ہوئے کہا۔

سریتا سنہل گئی۔

”ہاں سمرات! وقت بہت کم ہے۔“ اُس کے بہتے ہوئے آنسو خشک ہو گئے تھے مگر چہرہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند نظر آنے لگا تھا۔ ”میں نے کل رات سید بابا کو خواب میں دیکھا تھا۔“

استاد گرامی کا ذکر سن کر ٹیپو ہمد تن گوش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے احترام و عقیدت کا رنگ نمایاں تھا۔ اس کے برعکس شجاعت خان پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے ماضی کے تجربات کی روشنی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سریتا کا خواب کسی خوشخبری کا پیش خیمہ ثابت نہیں ہو گا۔ اگر کوئی اچھی خبر ہوتی تو سریتا کے چہرے پر خوشی کا گہرا عکس نمایاں ہوتا۔

”میں اس خواب کو دیکھ کر ذہنی طور پر الجھ گئی ہوں۔“ سریتا انتہائی شکستہ لہجے میں بول رہی تھی۔ ”میں نے دیکھا کہ سید بابا سرخ لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اتنا سرخ کہ جیسے انسانی خون ٹپک رہا ہو۔ ان کے ساتھ ہزاروں انسانوں کا ہجوم ہے اور وہ تمام افراد سید بابا کی طرح سرخ لباس پہنے ہوئے ہیں۔ سید بابا کچھ بے چین نظر آ رہے ہیں اور بار بار اس شاہراہ کی طرف دیکھ رہے ہیں جس پر سبزہ آگاہا ہے۔ آخر ایک سرخ پوش شخص، سید بابا سے پوچھتا ہے کہ انہیں کس کا انتظار ہے؟ سید بابا نہایت پُر جوش لہجے میں فرماتے ہیں۔

”مجھے میرے شیر کا انتظار ہے۔ بس وہ آیا ہی چاہتا ہے۔ ہم سب لوگ اسی کے استقبال کے لئے یہاں جمع ہیں۔ دعا کرو کہ وہ بحفاظت یہاں تک پہنچ جائے۔“

”ہمیں یہ تو خبر ہے کہ آپ اپنے شیر کے استقبال کے لئے یہاں آئے ہیں مگر آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ وہ شیر کون ہے؟“ ایک دوسرے سرخ پوش نے سید صاحب سے عرض کیا۔

”معتز یہ تم دیکھ لو گے کہ میرا شیر کون ہے۔“ سید بابا کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے ناقابلِ بیان مسرت کا رنگ نمایاں تھا۔ ”بہت جلال و جبروت والا ہے ہمارا شیر۔ ہندوستان کی زمین اب ایسا کوئی شیر دوبارہ پیدا نہیں کر سکے گی۔“

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم فرنگی کی غلامی پر رضامند ہو جائیں گے؟“  
 ”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ ٹیپو نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ”تم غیرت و وفا کے پیکر ہو۔ نہ تم نے اپنے ضمیر فروخت کئے اور نہ اپنی وفاداریاں بیلام کیں۔“  
 ”پھر ہمیں اپنے آپ سے جدا کیوں کر رہے ہیں؟“ سید غفار انتہائی ضبط کے باوجود رو پڑے۔

”میری دلی خواہش ہے کہ تم اپنے گھر والوں کے ساتھ شاد و آباد رہو۔“ سلطان کا لہجہ بھی بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔ ”میرا گھر تو مقتل بن چکا مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہارے گھر سے بھی شور مٹم بلند ہو اور کہنے والے کہیں کہ ٹیپو نے ایک ہاری ہوئی جنگ لڑی اور اپنے جاں نثاروں کو جان بوجھ کر وادی فنا کی طرف لے گیا۔“

”آپ سے پچھرنے کے بعد ہمارے ذہنوں میں زندگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔“ سید غفار کی آنکھیں اشکبار تھیں مگر لہجے سے ایک مرد جلال کا رنگ نمایاں تھا۔ ”اب گھروں سے آگ کے شعلے اٹھیں یا شور فغاں بلند ہو، رسم وفا تو ادا ہو کر رہے گی۔ اگر انگریزوں سے امان طلب کر کے بچ بھی گئے تو بستروں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں گے۔ اور یہ کیسی ذلت آمیز موت ہوگی۔ نہیں سلطان ذی حشم! ہمیں یہ موت پسند نہیں۔“

اپنے جاں نثاروں کا یہ انداز وفا دیکھ کر ٹیپو کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ پھر اس نے شجاعت خان کو مخاطب کر کے کہا۔

”وقت بہت کم ہے۔ میں والد محترم اور استاد گرامی کے مزارات پر حاضر ہونا چاہتا ہوں۔“ ابھی شجاعت خان کوئی جواب دیے نہیں پایا تھا کہ سید غفار درمیان میں بول اٹھے۔

”نواب بہادر اور سید صاب کے مزارات تو کافی فاصلے پر ہیں۔“  
 ”اب اتنے فاصلے پر بھی نہیں کہ میں ان تک نہ پہنچ سکوں۔“ ٹیپو نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”نہیں سلطان ذی وقار!“ سید غفار نے عرض کیا۔ ”فضا بہت محدود ہے۔ دارالحکومت کے گلی کوچے میں دشمنوں کے جاسوس گھوم رہے ہیں۔ کچھ پیہ نہیں چلتا کہ ان میں اپنا کون ہے اور بیگانہ کون۔“

”جاسوس کیا کریں گے؟“ سلطان نے اسی مطمئن لہجے میں کہا۔ ”زیادہ سے زیادہ دشمن کو یہ اطلاع فراہم کر دیں گے کہ ٹیپو محل سے نکل کر لال باغ کی طرف جا رہا ہے۔“ لال باغ، سرنگاپٹم کا ایک نواحی مقام ہے جہاں نواب حیدر علی کو دفن کیا گیا تھا۔

”اس قدر محدود فضا میں آپ کا لال باغ جانا مناسب نہیں۔“ سید غفار، سلطان کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اگر وقت آ جائے تو محفوظ ترین پناہ گاہ بھی انسان کی قبر بن جاتی ہے۔“ ٹیپو نے بے نیازانہ انداز میں کہا۔ ”میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ تم لوگ نہیں جانتے کہ میں اپنے دل پر

ہو گئی تو سلطان گہری سوچ میں ڈوب گیا۔  
 ”سمرات! کیا آپ جانتے ہیں کہ سید بابا کا وہ شیر کون ہے؟“ سریتا نے ٹیپو کو خاموش پا کر پوچھا۔ ”آپ تو ان کے بہت قریب رہے ہیں۔“ سریتا اپنے اس خواب کی تعبیر جانتی تھی مگر پھر بھی وہ حقیقت سے گریز چاہتی تھی۔

”ہاں! میں جانتا ہوں کہ سید صاحب کا وہ شیر کون ہے۔“ یکا یک ٹیپو کے لہجے سے غیر معمولی جلال ظاہر ہونے لگا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ سریتا ایک بار پھر رونے لگی۔  
 ”اپنے آنسوؤں کو دل کی گہرائیوں میں جذب کر لو۔“ ٹیپو اسی بارعب لہجے میں سریتا سے مخاطب ہوا۔ ”ہمارے آنسو، دشمنوں کو ہٹانے کا موقع فراہم کریں گے۔“

یہ کہہ کر سلطان اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”سریتا! میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے ایک بہت اہم خواب سے باخبر کر دیا۔“  
 ”مگر سید بابا کا شیر کون ہے؟“ سریتا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ”آپ نے بتایا نہیں سمرات!“

”عقرب قریب تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگی۔“ سلطان واپس جانے کے لئے مڑا۔  
 شجاعت خان، ٹیپو کے عقب میں چل رہا تھا۔ اس نے مڑ کر سریتا کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے سے سرنگائے اس طرح کھڑی تھی، جیسے اس کوٹھری کے کینن ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں اور اب وہ لوٹ کر واپس نہیں آئیں گے۔



اتحادی فوجیں سرنگاپٹم کے اطراف میں تمام حساس اور اہم مقامات پر قابض ہو چکی تھیں اور سلطان ہر طرف سے محصور ہو چکا تھا۔ زندگی بھر دشمنوں سے بھی خُسن ظن رکھنے والا اور اپنے امراء کی خطائیں معاف کرنے والا اب اس قدر تنہا تھا کہ اس مشکل صورت حال میں کسی فوجی افسر یا وزیر سے کوئی مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ادنیٰ خدمت گاروں سے لے کر اعلیٰ منصب داروں تک دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف مسلسل سازشیں کر رہے ہیں۔ بس گنتی کے چند جاں نثار تھے جو اپنے عہد پورے کرنے کے لئے ہر وقت سر یکف نظر آتے تھے۔ ایسی سنگین فضا میں ایک رات ٹیپو نے سید غفار، شجاعت خان اور دوسرے وفاداروں کو خلوت میں طلب کر کے کہا۔

”جنگ کا فیصلہ تو ہو چکا۔ اگر تم چاہو تو اپنے لئے امان طلب کر لو۔ میرے دل میں تمہاری طرف سے کبھی میل نہیں آئے گا۔“

ٹیپو کی بات سن کر تمام فوجی افسرانے میں آ گئے۔ ان کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں اور چہروں پر اذیت و کرب کا رنگ نمایاں تھا۔ آخر سید غفار نے لڑکھڑاتی زبان کے ساتھ کہا۔



کیا بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ اس بوجھ نے مجھے تھکا ڈالا ہے۔“

آخر سید غفار اور دوسرے فوجی افسروں نے سلطان کو مشورہ دیا کہ خدمت گاروں کا بھیس بدل کر لال باغ چلا جائے۔

”جب خدا نے لباس شاہی پہنایا ہے تو اسے اپنے ہاتھ سے اتار کر ناشکر گزار بندہ کیوں بنوں؟“ نیپو نے اپنے فوجی افسروں کی تجویز مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو دست قدرت ہی میرے جسم سے اس خلعتِ فاخرہ کو اتارے گا۔ کسی انسان کی کیا مجال کہ وہ وقتِ معلوم سے پہلے تجھے چھو بھی سکے۔“

پھر آدھی رات کے قریب سلطان، شجاعت خان کو اپنے ہمراہ لے کر باہر نکلا۔ سید غفار نے بہت چاہا کہ سلطان ایک فوجی دستے کی حفاظت میں یہ سفر اختیار کرے مگر نیپو نے اس مشورے کو بھی قبول نہیں کیا۔ وہ تمام خطرات سے بے نیاز اس جنگل کی طرف بڑھتا رہا جہاں ایک گوشے میں سید اکرام بخاری محو خواب تھے۔

سید صاحب کی قبر پر پہنچ کر نیپو نے اللہ سے طویل دعا مانگی۔

”اے قادرِ مطلق! میری دستگیری فرما کہ آج میں تیرے کرم کا سب سے زیادہ محتاج ہوں۔ مجھے استقامت دے کہ میرا یہ سفر بے عافیت تمام ہو جائے۔ اے عظیم و خیر! تو خوب جانتا ہے کہ میرے اس راستے میں کیسے کیسے فراق گھات لگائے بیٹھے ہیں اور صیادوں نے ہواؤں میں کیسے کیسے خوشنما جال لگا رکھے ہیں۔ بس ایک تیری ہی ذات بے نیاز ہے جو اپنے حقیر و ناتواں بندے کو ان فتنوں سے بچا سکتی ہے۔ میرے سینے کو حرص و ہوس کے جذبات سے پاک کر کہ دنیا اپنی تمام تر دلفریبیوں کے ساتھ میرے سامنے آراستہ ہے۔ اہل دنیا کہتے ہیں کہ میری دنیا برباد ہو گئی مگر میں تجھ سے اپنی آخرت کی سلامتی کی بھیک مانگتا ہوں۔ اے لازوال خزانوں کے مالک! اپنے گدائے بے نوا، نیپو کو مایوس نہ کر کہ وہ تیرے کرم ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اے ہمیشہ زندہ و قائم رہنے والے! اپنی ان ہی صفاتِ عالیہ کے صدقے میں میری پہچان بھی برقرار رکھ!“

پھر وہ لال باغ پہنچ کر نواب حیدر علی کے مقبرے پر حاضر ہوا۔

”بابا محترم! میں ایک ناکارہ بیٹا تھا۔ آپ کے عظیم ورثے کی حفاظت نہ کر سکا۔ خدا مجھے معاف کرے۔“ نیپو کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا۔ وہ بے اختیار گھٹنوں کے بل جھکا اور باپ کی قبر سے لپٹ کر رونے لگا۔ یہاں تک کہ حیدر علی کی قبر کا غلاف، نیپو کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

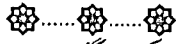
شجاعت خان کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس نے پوری زندگی میں نیپو جیسا اعلیٰ ظرف انسان نہیں دیکھا تھا جو اہل وطن کی غداروں کا شکوہ کرنے کے بجائے اپنی ناکامیوں کا اعتراف کر رہا تھا۔ ”نہیں شہزادے! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔“ شجاعت خان نے جھک کر اپنے

دونوں ہاتھ نیپو کے کاندھوں پر رکھ دیئے۔ ”غداروں کے گناہ اپنے نامہ اعمال میں کیوں درج کراتے ہو؟“

نیپو نے شجاعت خان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور باپ کی قبر سے سرٹیکے بیٹھا رہا۔

پھر بہت دیر بعد نیپو کی آواز، مقبرے میں گونجی۔

”بابا محترم! آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر آپ کو آپ جیسا ایک بھی ساتھی مل جاتا تو دنیا ایک بار پھر فتوحاتِ فاروق کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی..... مگر میں کسی سے کیا کہوں؟ میرے تو بازو بھی کٹ گئے اور زبان بھی۔“



جب انگریزوں کی فوجی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اتحادیوں کی توپوں نے سرنگا پٹم کے قلعے پر گولہ باری شروع کر دی۔ یہ اس امر کی طرف کھلا اشارہ تھا کہ سلطان بے دست و پا ہو چکا ہے اور اس کی وفادار فوجیں دشمنوں کے زرخے میں گھر چکی ہیں۔ بڑے حوصلہ شکن لمحات تھے مگر نیپو نے ہمت نہیں ہاری اور وہ دشمن کا زور توڑنے کے لئے مسلسل تدبیریں کرتا رہا۔

نیپو نے انگریزوں کی گولہ باری دیکھ کر اپنے سپاہیوں کو بھی جوانی کا ردائی کا حکم دیا۔ قلعے کی فسیل پر نصب توپیں کئی دن تک گرجتی رہیں مگر دشمن کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا۔ اتحادیوں کا نہ کوئی سپاہی مرا اور نہ کوئی گھوڑا زخمی ہوا۔ حالانکہ قلعے سے کی جانے والی گولہ باری اتنی شدید تھی کہ جنرل ہارس کا مورچہ جو اس قلعے کے مقابل ایک گنجائشِ باغ میں قائم کیا گیا تھا، یقینی طور پر تباہ ہو جاتا۔ نیپو اس بات پر حیران تھا کہ اس کی توپیں اتنی بے اثر کیوں ثابت ہو رہی ہیں۔

آخر ایک دن وہ خود قلعے کی فسیل پر پہنچا اور اس نے توپچیوں کو گولے داغنے کا حکم دیا۔ سلطان کا حکم سن کر توپچی خوف زدہ ہو گئے۔ سلطان بڑے تعجب سے ان کے زرد چہروں اور کانپتے جسموں کی طرف دیکھتے لگا۔ توپچیوں کی یہ حالت سلطان کو ان کی طرف سے مشکوک بنا رہی تھی۔

پھر جب نیپو کے حکم پر ایک توپ داغی گئی تو حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی ٹکڑے ہو گئیں۔ گولوں میں بارود کے بجائے ”سن اور مٹی“ بھری ہوئی تھی۔

”معاذ اللہ! ایسی نمک حرامی اور ایسی غدار؟“ شدتِ کرب سے سلطان کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

نیپو نے توپچیوں کو قتل کرا دینا چاہا مگر وہ یہ کہتے ہوئے اس کے قدموں میں گر پڑے۔

”حضور! ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ ہمیں جو اسلحہ دیا گیا ہے، وہی استعمال کریں گے۔“

”بظاہر تم بے قصور ہو مگر تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے مجھے اس سازش سے باخبر نہیں کیا۔“ نیپو

تڑپ تھی۔

”مجھے یقین ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے۔ مگر میرے عزیزو! تمہارے خون کے چند قطرے  
سے کیا ہوگا؟“ نیپو کے لہجے میں کسی قدر اُداسی تھی۔ ”یہاں تو خون کے ایک دریا کی ضرورت  
ہے۔ پھر بھی تمہاری محبتوں کا شکریہ۔ تم اپنے نہیں مگر اپنوں سے بہتر ثابت ہوئے۔“

”اب ہمارے خیال میں یہی مناسب ہے کہ حضور تمام جواہرات، اشرفیاں اور توشک  
خانے کا قیمتی سامان لے کر حرم سرا کی خواتین کے ساتھ قلعے سے باہر نکل جائیں۔ باہر نکل کر دس  
ہزار سوار، پانچ ہزار پیادے اور بیس ضرب توپ اپنے ہمراہ لیں اور یلغار کے انداز میں صوبہ سرا  
اور چنلدرگ کے قلعے میں جا پہنچیں۔“ دوسرے فرانسیسی افسر موسیو لالی نے سلطان کو مشورہ دیتے  
ہوئے کہا۔ ”اور سرنگا پنم کے قلعے کو میرے اور موسیو سپو کے سپرد کر جائیں۔ جب تک ہم میں  
سے ایک بھی زندہ رہے گا، حضور کا حق نمک ادا کرتا رہے گا۔ اور اگر ہماری یہ تجویز قابل قبول نہ  
ہو تو ہم سب فرانسیسیوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیجئے۔ وہ ہمارے چلے جانے کے بعد آپ  
کے ساتھ مصالحت کی گفتگو کرنے لگیں گے۔ بس ہم فرانسیسی ہی ان کے دلوں میں کانٹنے کی  
طرح کھٹکتے ہیں۔“ یہ کہتے کہتے شدت جذبات سے موسیو لالی کا چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔

موسیو سپو، موسیو لالی اور دوسرے فرانسیسی افسروں کا جواب سن کر نیپو کے چہرے پر ایک  
عجیب سارنگ اُبھر آیا۔ اس کی کشادہ آنکھیں ایک لمحے کے لئے خوشی کے جذبات سے چمکنے  
لگیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے ان میں مایوسیوں کا غبار سا بھر گیا۔

”دوستو! تم غریب الوطن میری ہی طلب پر یہاں آئے ہو اور میں خوب جانتا ہوں کہ تم  
نے کبھی میری رفاقت اور وفاداری سے منہ نہیں موڑا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تم جیسے شریف،  
بہادر، نمک حلال اور وفادار دوستوں کو دشمنوں کے حوالے کر دوں؟ اگر اس کشمکش میں میری تمام  
سلطنت تباہ و برباد ہو جائے تو میں اس امر پر راضی ہو جاؤں گا۔ مگر تمہیں کسی بھی حالت میں  
انگریزوں کے حوالے نہیں کروں گا۔“

نیپو کا جواب سن کر موسیو لالی بے قرار ہو گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے نیپو کے  
ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت عظیم ہیں۔ اتنے عظیم کہ میں نے آپ جیسا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ کاش! یہ  
بیار قوم آپ کی قدر کر لیتی کہ آپ اس قوم کے مسیحا ہیں۔ مگر میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ  
عاقبت فراموش اور اندھی قوم اپنے چارہ گر ہی کو قتل کر دینا چاہتی ہے۔ پھر کون اس کا علاج  
کرے گا اور کون اس کو ہلاکت سے بچائے گا؟ کوئی بھی نہیں..... کوئی بھی نہیں۔“ موسیو لالی  
شدت جذبات سے وارفتہ ہو گیا تھا۔ ”جب زمین والے اپنا علاج نہیں چاہتے تو آسمان بھی ان  
کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کی قسم! ہلاک ہو گئے ہندوستانی اور برباد ہو گیا ہندوستان۔ کچھ بھی  
باقی نہیں بچا۔ ہر طرف طوق غلامی کے بوجھ سے جھکی ہوئی گردنیں ہیں، خوف و دہشت سے

کا غصہ نا قابل بیان تھا۔

”حضور! ہمارے سروں پر جبر کی تلوار لٹک رہی ہے۔ پھر ہم کس طرح زبان کھولیں؟“ ایک  
توپچی نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر ہم سرکار کو اطلاع دیتے تو ہمارے بیوی بچے قتل کر  
دیئے جاتے۔“

آخر مکمل تحقیق کے بعد یہ راز فاش ہوا کہ توپ خانے کا مگر اس میر افضل اس سازش میں  
شریک ہے اور اسی کے حکم سے مصنوعی گولے تیار کئے گئے ہیں۔

نیپو نے میر افضل کو قتل کرا دیا۔ مگر وہ نمک حرام مرتے مرتے بھی بے ضمیری اور بے حیائی کا  
بھرپور مظاہرہ کر گیا۔

”سلطان! آپ کس کس کو قتل کرائیں گے؟ یہاں تو پوری بستی ہی غدار ہے۔ مگر دراصل  
کوئی بھی غدار نہیں۔ سب کے سب اپنے اپنے جذباتوں اور خواہشوں کے وفادار ہیں۔ ہر شخص  
کیف و نشاط اور عیش و آسائش کی زندگی گزارنا چاہتا ہے اور آپ اس زندگی پر اخلاقیات کے  
پہرے بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ حالات کے آئینہ خانے میں ذرا  
غور سے دیکھیے، آپ تمہارے گئے ہیں۔“

نیپو سلطان کچھ دیر تک میر افضل کی لاش کو ترپتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جب اس غدار کا  
جسم ساکت ہو گیا تو نیپو نے با آواز بلند کہا۔

”میر افضل! تُو جھوٹ بولتا تھا۔ مسلمان کبھی تمہا نہیں ہوتا۔ اس لئے میں بھی تمہا نہیں  
ہوں۔ تعداد میں مختصر سہی لیکن ابھی تو رفیقان سفر میرے ساتھ ہیں۔ اگر یہ چھڑ گئے تو میرا مقصد  
میرے ساتھ رہ جائے گا۔“

جب غدار یوں اور اندرونی سازشوں کا سلسلہ یہاں تک پہنچ گیا تو نیپو نے موسیو سپو،  
موسیو لالی اور دوسرے فرانسیسی افسروں کو خلوت میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

”میری طرح تم بھی دیکھ رہے ہو کہ سلطنت خداداد میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے جن لوگوں  
کو زندگی بھر اپنا معتمد اور وفادار سمجھا، وہ سب کے سب دشمن سے جا ملے۔ تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ  
روز بہ روز اور لحظہ بہ لحظہ غنیم کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے۔ میرے بیرونی ہمدرد اور نمکسار اپنے  
اپنے مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہیں سے فوجی امداد کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔“

یہ کہہ کر سلطان مشورہ طلب نظروں سے فرانسیسی افسروں کی طرف دیکھنے لگا۔  
تمام فرانسیسی افسر کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہوں  
پھر موسیو سپو نے انتہائی بُر جوش لہجے میں عرض کیا۔

”ہم سلطنت خداداد کے نمک خوار ہیں اور حضور نے ہم پر بھروسہ کیا ہے۔ جب  
زبانی ہمارا پیشہ نہیں۔ ہم سپاہی ہیں اور اپنی تلواروں کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جہاں حضور کا پسینہ  
گرے گا، وہاں اہل دنیا ہمارا بہتا ہوا خون دیکھیں گے۔“ موسیو سپو کے ہر لفظ میں سچائی کی

پتھرائی ہوئی آنکھیں ہیں، ندامت کے پسینے سے شرابور جسم ہیں اور غربت کی شاہراہوں پر سستی ہوئی لعنت زدہ زندگی ہے۔ میرے عزیز سلطان! یہ ہے آپ کا ہندوستان۔“

موسیولالی نے اس قدر جذباتی اور اثر انگیز لہجے میں حقیقت کی عکاسی کی تھی کہ سید غفار اور شجاعت خان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ٹیپو بار بار اپنے ہاتھ ملنے لگا۔

”میں انہیں برسوں سے پکار رہا ہوں مگر میری آواز کوئی نہیں سنتا۔“ سلطان کے لہجے سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔ ”لوگ تو پاگل کی آواز سن کر بھی ٹھہر جاتے ہیں، پھر میری صدائیں اتنی بے اثر کیوں ہیں؟“

”یہ نہیں سنیں گے سلطان ذی شان!“ موسیولالی کا لہجہ انتہائی تلخ ہو گیا تھا۔ ”آسمان نے ان کی سماعت چھین لی ہے۔ یہ سازِ زندگی کی لذتوں سے بے بہرہ ہیں۔ اب انہیں صرف موت کا نعمہ ہی سنائی دے سکتا ہے۔ آپ نے ان کی طرف غور سے نہیں دیکھا، یہ ناپیا بھی ہیں۔ اندھوں کے جہوم کی قیادت نہیں کی جاسکتی۔ یہ موت کے غار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انہیں اس غار میں گر جانے دیجئے۔ اندھوں کی یہی سزا ہوتی ہے کہ راستے کے پتھروں سے ٹکرا کر لہولہان ہو جائیں یا پھر کسی گہرے گڑھے میں گر کر ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائیں۔“

موسیولالی چلا گیا مگر سلطان کے غلوت کدے میں اس کے لفظوں کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ ”اندھوں کے جہوم کی قیادت نہیں کی جاسکتی۔“



فرانسیسی افسروں کے جانے کے بعد سلطان نے اپنے تمام وزراء اور امراء کا ایک خفیہ اجلاس طلب کیا اور ان کے سامنے موسیولالی کی تجویز رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ میں سرنگاپٹم چھوڑ کر چتدرگ کے قلعے میں چلا جاؤں۔ ابھی وہ علاقہ دشمنوں کی دسترس سے دور ہے۔ پھر جب طویل محاصرے کے دوران انگریزی فوجیں تھک جائیں گی تو ہمارے تازہ دم لشکر آسانی کے ساتھ ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ فرانس یا کسی دوسرے ہمدرد ملک سے فوجی امداد حاصل ہو جائے۔“

سلطان کی گفتگو سن کر بیشتر امراء کے چہرے بگڑ گئے۔ وہ سب کے سب غدار تھے اور جلد از جلد سلطنتِ خدا داد کا خاتمہ چاہتے تھے۔ اس لئے موسیولالی اور دوسرے فرانسیسی افسروں کی تجویز سن کر پریشان نظر آنے لگے۔ اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں ٹیپو ایک محفوظ مقام پر پہنچ جاتا اور سازش کے تمام منصوبے ناکام ہو کر رہ جاتے۔ دراصل یہی وہ نمک حرام امراء تھے جن کی دغا بازیوں کے سبب سلطان سرنگاپٹم میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ موسیولالی ایک بڑا فوجی مدبر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ یہ محاصرہ تنگ ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ سلطان اپنے بستر پر بھی کروٹ لینے کے قابل نہیں رہے گا۔ اسی لئے فرانسیسی افسر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سلطان اس تھوڑی سی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چتدرگ چلا جائے۔

مگر ٹیپو کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ٹیپو اپنے امراء سے مشورہ کئے بغیر دارالحکومت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مشکلات پر تو کسی نہ کسی طرح قابو پایا جاسکتا تھا مگر سلطان کی بد نصیبی یہ تھی کہ وہ ان امراء سے مشورہ طلب کر رہا تھا جو بہت دن پہلے انگریزوں کے ہاتھوں میں نہ صرف سلطنتِ خدا داد کو فروخت کر چکے تھے بلکہ ٹیپو کی زندگی کا سودا بھی کر چکے تھے۔ اس خرید و فروخت کی تکمیل میں بس چند دنوں کا وقفہ حائل تھا، جسے موسیولالی نے اپنے تدبیر سے طویل کرنے کی کوشش کی تھی۔

غدار امراء ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کر رہے تھے کہ اگر سلطان چتدرگ چلا گیا تو پھر کیا ہو گا؟ محل کے اس مخصوص کمرے کی فضا پر بہت دیر تک گہرا سکوت طاری رہا۔ آخر نمک حرام پورنیا اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور دست بستہ عرض کرنے لگا۔

”حضور! ہم غلاموں کی حیثیت ہی کیا جو اپنے آقا کو کوئی مشورہ دے سکیں۔ آپ پر سب کچھ روشن ہے اور آپ امورِ مملکت کو ہم سے کہیں زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ پھر بھی یہ ناچیز اتنا ضرور عرض کرے گا کہ اس کے نزدیک انگریزوں اور فرانسیسیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“ پورنیا ٹھہر ٹھہر کر انتہائی سرد لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ وزیروں کے حلقے میں بے زبان مشہور تھا اور یہی اس کی سیاست کا کمال تھا۔ سب اس کے دوست تھے مگر وہ کسی کا دوست نہیں تھا۔ سب اس پر اعتبار کرتے تھے لیکن وہ سب کی طرف سے ہوشیار رہتا تھا۔ پورنیا اس حقیقت سے باخبر تھا کہ اگر سلطان، سرنگاپٹم چھوڑ کر چتدرگ چلا گیا تو تمام سازشیں دھری کی دھری رہ جائیں گی اور سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے سلطان کے گرد اپنی منطق کا نیا جال بچھا دیا۔

”حضور بہتر جانتے ہیں کہ انگریز بھی غرض کے بندے ہیں اور فرانسیسی بھی ہوس کے غلام۔ دونوں تاجر ہیں اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے ہندوستان آئے ہیں۔ انہیں جس سودے میں زیادہ فائدہ نظر آئے گا اسی کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے۔ غلام کے خیال میں موسیولالی کی تجویز اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ سرنگاپٹم کے قلعے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر انگریزوں کو بولی لگانے کی دعوت دے۔ پھر جب اسے منہ مانگی قیمت مل جائے گی تو وہ.....“ عیار پورنیا نے جان بوجھ کر اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

ٹیپو سلطان بہت غور سے پورنیا کی باتیں سن رہا تھا۔

مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد وہ حرام کار دوبارہ سر جھکا کر عرض کرنے لگا۔

”عقائد کے اعتبار سے بھی دونوں اسلام کے دشمن ہیں۔ پھر حضور کس بنیاد پر فرانسیسیوں سے خیر خواہی کی توقع رکھتے ہیں؟“ یہ کہہ کر پورنیا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

سلطان کے چہرے پر ابھرنے کے آثار صاف نمایاں تھے۔ اس ابھرنے میں مزید اضافہ

اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں مجبور نہیں ہوں۔ اپنا یہ شرائط نامہ مجبوروں کے سامنے پیش کرے۔ خدا نے مجھے آزاد پیدا کیا ہے اور میں اسی اعزاز کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جانا پسند کروں گا۔“

لارڈ ولزلی کے سفیر کے ہونٹوں پر بڑی زہر آلود مسکراہٹ تھی۔ میر صادق علی، پورنیا اور دوسرے غدار امراء بھی دل ہی دل میں سلطان کی بے چارگی پر مسکرا رہے تھے۔ مگر سلطان کے چہرے پر وہی جلال تھا جسے دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کے دل پانی ہو جاتے تھے۔

سلطان نے لارڈ ولزلی کا شرائط نامہ پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی غلامی سے انکار کر دیا تھا۔ اگر بالفرض ٹیپو، لارڈ ولزلی کی اس پیشکش کو قبول بھی کر لیتا تو اسے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ عیار ولزلی نے دہری چال چلی تھی کہ ایک طرف اس نے شرائط نامہ تحریر کرا کے انگریز سفیر کو سلطان کے دربار میں بھیجا اور دوسری طرف اپنے ایک معتد کو خفیہ ہدایات دے کر جنرل ہارس کے پاس روانہ کیا۔

”قلعہ فتح ہونے تک سلطان سے صلح کے بارے میں کوئی گفت و شنید نہ کی جائے۔“

قدرت ٹیپو کی رہنمائی کر رہی تھی۔ شرائط نامہ چاک کر کے وہ بڑی رسوائی سے بچ گیا اور لارڈ ولزلی کی خوف ناک چال ناکام ہو گئی۔

مجبوراً سلطان نے موسیولالی کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے چتدرگ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جواہرات، خزانہ اور توشک خانے کا قیمتی سامان بڑے بڑے صندوقوں میں بند کر دیا گیا تاکہ ہاتھیوں اور اونٹوں کے ذریعے سارا اسباب چتدرگ کے محفوظ قلعے میں پہنچا دیا جائے۔ حرم سرا کی خواتین کے لئے تیز رفتار بیلوں اور طاقتور کھاروں کا بندوبست کیا گیا۔ میر صادق علی، پورنیا اور دوسرے غدار امراء بڑی خاموشی سے سلطان کی ان تیاریوں کو دیکھ رہے تھے۔

جب چتدرگ جانے کی تیاریاں مکمل ہو چکیں تو رات کا کچھ حصہ گزر جانے کے بعد سلطان نے اپنے تمام امراء کو خلوت میں طلب کر کے کہا۔

”دوستو! میں چتدرگ جا رہا ہوں۔ اس مقام کی طرف، جہاں دشمنوں کی دست درازیاں سے محفوظ رہ سکوں۔“

ٹیپو کی بات سن کر غدار امراء کے چہرے اتر گئے۔

میر صادق علی اس غیر متوقع صورت حال کو برداشت نہ کر سکا اور بے اختیار بول اٹھا۔

”سلطان دیشان! ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟“ وہ نمک حرام خود کو سلطان کا سب سے بڑا ہمدرد ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خدا کے سہارے۔“ ٹیپو نے اداں لہجے میں کہا۔ ”میرا یہ قیام زیادہ طویل نہیں، عارضی ہوگا۔“

میر صادق علی بڑا ریاکار اور بہروپیا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنی دستار وزارت اتاری اور

کرنے کے لئے غدار میر صادق علی کھڑا ہوا اور انتہائی ہرجوش لہجے میں کہنے لگا۔

”سرکار والا! آپ کا حسن ظن اور اعلیٰ ظرفی اپنی جگہ مگر تاج بھی بتاتی ہے کہ فرانسیسیوں نے آج تک کسی سے وفائیں نہیں کی۔ اگر وہ دل کے کھلے اور قول کے سچے ہوتے تو اب تک فرانسیسی بحری بیڑا بھی پہنچ چکا ہوتا اور ایک بہت بڑی فوج بھی ہندوستان کے ساحلوں پر اتر چکی ہوتی۔“ میر صادق علی اتنے زور و شور سے بول رہا تھا جیسے کوئی تند و تیز موج کنارے سے ٹکرا رہی ہو۔ ”حضور! دنیا کچھ بھی کہے مگر میں تو بار بار یہی عرض کروں گا کہ ان فرانسیسیوں نے سلطنت خداداد کے لئے ہمیشہ مشکلات پیدا کی ہیں۔ یہ مغربی تاجر جو خوب صورت الفاظ میں عہد و بیان کرتے رہے مگر جب آزمائش کا وقت آیا تو آپ کو منجھدار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ ان کی ظاہری شکل و صورت سے دھوکا نہ کھائیے۔“ ”سب زرد برادر شغال“ (زرد رنگ کا کتا، گیدڑوں کا بھائی ہوتا ہے) میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ حضور جیسے ہی سرنگاپٹم کا قلعہ فرانسیسیوں کے حوالے کریں گے، یہ اسے فرنگیوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں گے اور اس کے بدلے میں اپنی قوم کے لئے نئی مراعات طلب کریں گے۔“

موسیولالی اور دوسرے فرانسیسی اپنے عہد کے پابند بھی تھے اور ٹیپو کے ساتھ مخلص بھی مگر صورت حال اس قدر اُلجھ گئی تھی کہ سلطان کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اگر وہ اپنے امراء کی مرضی کے بغیر سرنگاپٹم کا قلعہ فرانسیسیوں کے حوالے کر دیتا تو یہی اراکین سلطنت اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا کر تعاون سے ہاتھ کھینچ لیتے اور چند فرانسیسی سپاہی با اختیار ہوتے ہوئے بھی مجبور شخص بن کر رہ جاتے۔ حالات کا یہی وہ نازک پہلو تھا کہ جس کے باعث سلطان، موسیولالی کی تجویز پر عمل نہ کر سکا۔

آخر اس گراں وقت کو ٹالنے کے لئے سلطان نے انگریزوں سے صلح کر لینی چاہی مگر لارڈ ولزلی نے جو شرائط پیش کیں انہیں پڑھ کر سلطان کا خون کھول گیا۔

لارڈ ولزلی کی پیش کردہ شرائط حسب ذیل تھیں۔

”تمام فرانسیسیوں کو انگریزوں کے حوالے کیا جائے یا پھر انہیں ان کے عہدوں سے برطرف کر کے سلطنت خداداد سے نکال دیا جائے۔۔۔۔۔ تمام ساحلی علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیئے جائیں۔۔۔۔۔ اور ٹیپو سلطان اطاعت و فرمانبرداری کا اعلان کرتے ہوئے ہر سال خراج ادا کرے۔“ دراصل یہ صلح کا شرائط نامہ نہیں، غلامی کی ایک دستاویز تھی جس پر سلطان کو اپنے دستخط ثبت کرنا تھے۔ اور پھر محکومی کی مہر کو اپنی پیشانی پر سجایا لیتا تھا۔

ٹیپو نے سر دربار انگریزی سفیر کے سامنے شرائط نامہ چاک کر ڈالا اور با آواز بلند کہا۔

”لارڈ ولزلی کو بس اتنا بتا دینا کہ مردوں کی جنگ میں ہر چیز جائز نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا عہد شکن نہیں دیکھا جس نے سچائی کو قتل کر ڈالا اور دوستی کو ہمیشہ کے لئے رسوا کر دیا۔“ اہل دربار نے آج تک سلطان کو اس قدر غضب ناک حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ ”اور



جلد تکمیل تک پہنچ جائے۔ اور تیسری طرف سلطان کی عدم موجودگی میں سرنگاپٹم پر دشمنوں کے قبضے کا جواز بھی پیش کر رہا تھا کہ جب میر سپاہ، محاذ پر موجود نہیں رہا تو پھر جاں نثار کیا کرتے؟ پورنیا نے اتنے پردوں میں دل کی بات کہی تھی کہ اس کی جھوٹی وفا کا بھرم بھی رہ گیا اور وہ اپنی چال بھی چل گیا۔

ٹیپو شہید حیرت و سکوت کے عالم میں پورنیا کے بہتے ہوئے آنسو دیکھتا رہا۔ اچانک بدر الزماں ناکھ آگے بڑھا اور اس نے بھی دوسرے منافقوں کی طرح اپنی دستار فضیلت سلطان کے قدموں پر رکھ دی۔

”سلطان ذی حشم! جیسے ہی اہل شہر کو یہ خبر ملے گی کہ حضورات کے اندھیرے میں حرم سرا اور شہزادگان کے ساتھ چتلد رگ تشریف لے گئے ہیں تو جاں نثاروں کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور پوری قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔“

سلطان نے بڑی حیرت سے بدر الزماں ناکھ کی طرف دیکھا۔ تمام امراء اس کے چتلد رگ جانے کی مخالفت کر رہے تھے۔ سب کی زبانوں پر اعلانِ وفا جاری تھا مگر کسی ایک چہرے پر بھی محبت اور سچائی کی ہلکی سی جھلک تک موجود نہیں تھی۔ سلطان ایک بار پھر شہید ذہنی کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ بدر الزماں ناکھ دوبارہ بول اٹھا۔

”سلطان معظم خوب جانتے ہیں کہ ناکھ قبیلے نے آپ کے سوا کسی کی سرداری قبول نہیں کی۔“ بدر الزماں کے ایک ایک لفظ میں ریاکاری اور منافقت پوشیدہ تھی۔ ”اگر آپ سرنگاپٹم چھوڑ کر چتلد رگ تشریف لے گئے تو میں اور میری قوم ہر عہد و پیمان سے آزاد ہیں۔ فراموشی تو کجا، میں کسی مسلمان امیر کے آگے بھی سر جھکانے کو تیار نہیں ہوں۔“ بدر الزماں ناکھ کے سینے میں برسوں سے ٹیپو کے خلاف آتشِ انتقام بھڑک رہی تھی۔ ٹیپو کا اس کے سوا کوئی قصور نہیں تھا کہ نواب حیدر علی نے اس کی شادی امام صاحب بخشی ناکھ کی لڑکی سے کر دی تھی۔ یا پھر ٹیپو کا گناہ یہ تھا کہ اس نے اپنے برادرِ بستی برہان الدین کی شادی کے لئے گورنر حیدرنگر بدر الزماں ناکھ کی بیٹی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ لڑکی اس قدر مغرور اور قومی برتری کے احساس میں مبتلا تھی کہ اس نے شادی کی پہلی ہی رات کو کنوئیں میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔

بدر الزماں ناکھ عرب ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو تمام ہندوستانی مسلمانوں سے افضل سمجھتا تھا مگر اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ ٹیپو کے سامنے اس رشتے سے انکار کر دیتا۔ غلطی خود بدر الزماں ناکھ کی تھی لیکن اس نے ٹیپو کو مجرم قرار دیا تھا اور اپنی بیٹی کی لاش پر قسم کھائی تھی کہ وہ سلطان سے انتقام لئے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ برسوں انتظار کرنے کے بعد آج وہ ساعت انتقام آگئی تھی۔ جب سلطان دشمنوں کے زمرے میں گھر گیا تو بدر الزماں ناکھ نے وہی بزدلانہ چال چلی جسے دنیا بھر کے کم ظرف اور کینہ پرور انسان اپنی ذہانت سے تعبیر کرتے ہیں۔

سلطان کے قدموں میں رکھ دی۔

”ہم تو محض آپ کے زیر سایہ زندہ ہیں۔ اگر حضور کی نظر کرم پھر گئی تو کہاں کی زندگی اور کہاں کا اقتدار؟ کسی طرف بھی چلے جائیں گے اور اپنے مردہ وجود کو کہیں بھی گم کر دیں گے۔ یہ ساری جاں سوزیاں اور تمام قربانیاں تو صرف حضور کی خاطر ہیں۔ جب سرکار ہی نہ رہے تو پھر سرنگاپٹم میں کیا باقی رہ گیا؟“ یہ کہتے کہتے میر صادق علی کے لہجے سے رقت جھلکنے لگی اور وہ بار بار آنکھیں صاف کرنے لگا جیسے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”میں دنیا سے تو نہیں جا رہا ہوں میر صادق!“ ٹیپو اپنے وزیر اعظم کی منافقت کو خلوص اور وفاداری کی ایک روشن مثال سمجھ رہا تھا اس لئے انتہائی محبت آمیز لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”چتلد رگ کے سفر کا مقصد یہ نہیں کہ دشمنوں سے ڈر کر کسی محفوظ پناہ گاہ میں روپوش ہو جاؤں۔ سلطنتِ خداداد کی بقاء کے لئے مزید طاقت جمع کرنا چاہتا ہوں۔ میرے جاں نثار نہیں جانتے کہ کس قدر عیار دشمن سے مقابلہ ہے۔“

”حضور کے جاہ و جلال کی قسم! دشمن آپ کی اس حکمت عملی کو فرار سے تعبیر کرے گا۔“ میر صادق علی نے مگرچھ کی طرح نئی کر وٹ لی۔ ”خدا مجھے یہ الفاظ سننے کے لئے زندہ نہ رکھے کہ شیر میسور نے گیدڑوں کی یلغار سے خوف زدہ ہو کر محاذِ جنگ ہی چھوڑ دیا۔“ ریاکار میر صادق علی، سلطان کو اسی کے لفظی طلسم میں جکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ٹیپو اکثر مواقع پر اپنا یہ تاریخ ساز جملہ دہرایا کرتا تھا۔

”گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔“

سلطان اپنے وزیر اعظم کی اس بات کا جواب دیتا ہی چاہتا تھا کہ عدار پورنیا آگے بڑھا اور اس نے بھی میر صادق کی طرح اپنی دستارِ تار کر ٹیپو کے قدموں میں رکھ دی۔

”مالک! اب ہم سے کسی دوسرے کی غلامی نہیں ہوگی۔“ پورنیا، میر صادق سے بھی بڑا بہروپیا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری محسوس ہو رہی تھیں۔

”یہاں کسی دوسرے کی غلامی کا سوال کہاں سے آگیا؟“ ٹیپو نے حیرت زدہ نظروں سے اپنے وزیر خزانہ کی طرف دیکھا۔

”آپ کے تشریف لے جانے کے بعد سرنگاپٹم میں کیا باقی رہ جائے گا؟“ چند لمحوں میں عیار پورنیا کی منافقت کا مظاہرہ مکمل ہو گیا تھا اور اب اس کی بے وفا آنکھیں خلوص و وفاداری کے اشک برس رہی تھیں۔ ”عزت مآب یہاں نہیں ہوں گے تو غیر ہوں گے اور میں غیروں کی آمد سے پہلے ہی کسی گوشہ گمنامی کی طرف چلا جاؤں گا۔“

پورنیا نے مبہم اشارے میں ٹیپو پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کے جاتے ہی دار الحکومت پر انگریز قابض ہو جائیں گے۔ پورنیا کی سیاست کا کمال یہ تھا کہ ایک طرف وہ سلطان کی جدائی کا ماتم کر رہا تھا، دوسری طرف سلطان کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ غداروں کا منصوبہ جلد از

”اہل چتلد رگ کا بھی کیا بھروسہ؟ ممکن ہے کہ ان لوگوں نے بھی اپنی وفاداریاں دوسروں کے ہاتھوں فروخت کر دی ہوں۔“

شیو کے اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

”تم میں سے کون اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ سرا اور چتلد رگ کے باشندے وفادار ہیں؟“ اپنے جان نثار مشیروں کو خاموش پا کر سلطان نے پوچھا۔

”چتلد رگ کے باشندوں سے حسن ظن تو ہے۔“ سید غفار بے غصہ تھے کہ سلطان کسی نہ کسی طرح سرنگاپٹم کی حدود سے نکل جائے۔ ”یقین نہ سہی مگر ایک اُمید موہوم تو ہے۔“

شیو مسکراتے لگا۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں برائے نام بھی شکستگی نہیں تھی۔ ”یہ لوگ مجھے میرے حسن ظن ہی کی تو سزا دے رہے ہیں۔“ یکا یک شیو کے لہجے سے اس غلغلے کا اظہار ہونے لگا جو برسوں سے اس کے سینے میں کسی زخم کی طرح سلگ رہی تھی۔ ”اُمید موہوم کے پیچھے کہاں تک بھاگو گے؟ اب ان حقائق کا سامنا کرو جن کے پیچھے موت کے سوا کچھ نہیں۔“

جاں نثاروں نے سر جھکا لئے۔ اس قدر تلخ تجربات سے گزرنے کے بعد اب کسی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ (اللہ کی مرضی تمام انسانی ارادوں پر غالب ہے)“ یکا یک سلطان نے پُر جوش نعرہ بلند کیا۔ ”زندگی اور موت کے تصور سے بے نیاز ہو کر سلطنتِ خداداد کا دفاع کرو۔“

اس کے بعد سلطان نے حرم سرا کے چاروں طرف ایک خندق کھدوا کر اس میں بارود بچھوا دیا کہ اگر انگریز قلعے میں داخل ہو جائیں تو اپنے ناموس کی حفاظت کے لئے حرم سرا کو اُڑا دیا جائے۔ یہ سلطان کا انتہائی اقدام تھا جسے جاں نثاروں کی مختصر سی جماعت اُداس نظروں اور بچھے ہوئے چہروں کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

حرم سرا کی حفاظت کے اقدامات مکمل کرنے کے بعد سلطان نے توپ خانے اور دوسرے اہم جنگی مقامات پر اپنے سپاہی متعین کئے اور فوج کا ایک دستہ انگریزوں کا سامانِ رسد روکنے کے لئے روانہ کیا۔ مگر اس کے کسی حکم کی بھی صحیح تعمیل نہ ہو سکی۔ جاں نثاروں کے لباس میں بھی بے شمار غدار موہود تھے۔



سازش اس قدر مکمل تھی کہ 30 اپریل اور 2 مئی کی درمیانی رات میں لیفٹیننٹ بل اور لیفٹیننٹ لارنس خندق پارکر کے قلعے میں داخل ہوئے اور تمام صورتِ حال کا جائزہ لے کر بحفاظت واپس چلے آئے۔ ہزاروں نگہبانوں کی موجودگی میں ان سے یہ پوچھنے والا کوئی نہیں تھا کہ تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟ اگر دونوں انگریز فوجی افسر حلیہ بھی بدل لیتے، تب بھی قلعے کے محافظوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی مخصوص رنگت اور خدو خال چیخ

بدترزاں ناکھ نے پہلے بھی کئی بار سلطان کو جنگی محاذوں پر فریب دینے کی کوشش کی تھی مگر اس وقت شیو فوجی اعتبار سے بہت مضبوط تھا۔ اس لئے بدترزاں کا ہر منصوبہ ناکام رہا۔ آج جبکہ شکست و بربادی سلطان سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی تو بدترزاں ناکھ نے بڑی بے حیائی کے ساتھ پیٹھ پھیر لی۔ وہ اپنی بیٹی کی موت کا انتقام اس شخص سے لے رہا تھا جو سرسبز بے قصور تھا۔ خود کو ”نجیب الطرفین“ کہنے والے بدترزاں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر شیو جنگ ہار گیا تو ان لاکھوں مسلمان لڑکیوں کا کیا ہوگا جن کی عصمتوں کے پیرہن تار تار کرنے کے لئے فرنگی اور ہندو درندے اپنے خونے پیچھے کھولے آگے بڑھ رہے تھے۔

غدار تو ہر حال میں غدار ہوتا ہے مگر بدترزاں اپنی غداری کا جواز پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سلطان کے چتلد رگ جانے کے فیصلے کو بنیاد بنادیا اور یہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

”میں سلطان کے سوا کسی کی قیادت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔“

اگر شیو، بدترزاں ناکھ کے اس اعلان کے بعد دارالحکومت سے چلا جاتا تو وہ نمک حرام، سلطان کے اس اقدام کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر انگریزوں سے جاملتا۔ اور اگر شیو سرنگاپٹم میں ٹھہر جاتا تو اتحادی فوجیں چند روز میں سلطنتِ خداداد کا خاتمہ کر دیتیں۔ یہی بدترزاں کی سیاست کا کمال تھا۔ بالآخر وہ اپنی سیاست میں کامیاب ہو گیا۔

شیو شدید اُجھٹن میں مبتلا تھا۔ اگر وہ اپنے امراء کی مرضی کے خلاف دارالحکومت کو موسیولالی اور دوسرے فرانسیسی افسروں کے حوالے کر دیتا تو مقامی فوجیں جو ان غدار امراء کے ماتحت تھیں، تعاون سے محروم ہو جاتا ایک بڑی شکست کے مترادف تھا۔ شیو نے چتلد رگ جانے کا فیصلہ محض اس لئے کیا تھا کہ اس کے جاں نثار ایک طویل عرصے تک سرنگاپٹم کا دفاع کرتے رہیں اور سلطان اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی فوجی تیاریاں مکمل کر لے۔ مگر جب غداروں کی بدینتی کھل کر سامنے آگئی تو شیو نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

موسیولالی اور دوسرے فرانسیسی افسر بار بار سلطان کو سمجھاتے رہے۔

”حضور! اس مملکت کے غداروں نے آپ کے لئے نیا جال پھیلایا ہے۔ اسے توڑ کر جلد از جلد نکل جائیے۔“

”پھر دارالحکومت کا کیا ہوگا؟“ شیو نے اپنے مشیروں سے سوال کیا۔ ”میں جان بوجھ کر تو یہ زہر نہیں کھا سکتا۔“

”آپ سلامت رہیں۔ ہم سینکڑوں سرنگاپٹم آباد کر دیں گے۔“ سید غفار بہت زیادہ جذباتی نظر آرہے تھے۔ ”خدا کے لئے آپ غداروں کی اس بستی کو چھوڑ دیں۔“

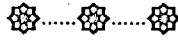
شیو نوشتہ دیوار پڑھ چکا تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے پر خوف و ہراس کی جھلک تک نہیں تھی۔

پھر جب مسلمان نجومی بارگاہِ سلطانی میں کھڑے رہ گئے تو ٹیپو انتہائی خوشگوار لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

”تمہیں یہ سب کچھ زیب نہیں دیتا کہ چند پیسوں کی خاطر لوگوں کو ان کے مستقبل کے حوالے سے جھوٹی سچی خبریں دیتے پھرو۔ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں کہ آج یا کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ خدا سے ڈرو کہ غیب کا حال صرف اسی کو معلوم ہے۔“

مسلمان نجومی نادم و شرمسار، پسینے میں نہائے ہوئے چلے گئے تو سلطان ”کلائی ڈڈی“ سے نکل کر محل میں پہنچا مگر زنان خانے میں داخل نہیں ہوا۔ یہاں سلطان کو اس کے جاسوسوں نے بتایا کہ آج کی رات قلعے پر شدید حملے کا امکان ہے۔

ٹیپو نے بہت تیزی سے مختلف مورچوں پر اپنے سپاہی مامور کئے اور خود شمالی فصیل کی طرف چلا گیا۔



انگریزوں کی مسلسل گولہ باری سے قلعے کی جنوب مغربی فصیل پر ایک بڑا شگاف پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے یہ پہلو بہت کمزور تھا۔ اسی صورت حال کے پیش نظر سلطان نے اپنے برادرِ نبی میر معین الدین کو اس دفاعی مورچے پر متعین کیا تھا۔ میر معین الدین کی مدد کے لئے سید غفار بھی موجود تھے مگر ان کی حیثیت ایک ماتحت کی تھی۔ اس لئے وہ میر معین الدین کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ قلعے کے اس حصے تک پہنچنے کے لئے طویل و عریض خندق کو عبور کرنا پڑتا تھا جو ہر وقت پانی سے لبریز رہتی تھی۔ انگریزوں نے فروری کے مہینے میں سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا تھا مگر وہ قلعے پر حملہ کرنے کے لئے گرمی کے موسم کا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ اس موسم میں دریا پیاب ہو جاتا تھا۔ ”پانی کی اسی کمی کے سبب خندق بھی خشک ہو جاتی ہوگی۔“ یہ لارڈ ولزلی کا اندازہ تھا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سلطان نے خندق کو بھرنے کے لئے متبادل انتظام بھی کیا تھا۔ پھر جب ولزلی پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ خندق ہمیشہ لبریز رہتی ہے تو اس نے سلطان کے برادرِ نبی، میر معین الدین سے ساز باز کی۔ میر معین الدین نے بڑی عیاری سے کام لیتے ہوئے خندق میں اتنا پانی چھوڑا کہ وہ دور سے خالی معلوم نہ ہو۔ پھر اس نے ایک دوسرے غدار کے ذریعے لارڈ ولزلی تک یہ پیغام پہنچا دیا۔

”بے خوف و خطر چلے آؤ۔ خندق میں گھنٹوں کے برابر پانی ہے۔“

اگر خندق میں اس کی گہرائی کے مطابق پانی رکھا جاتا تو انگریز سپاہی اور ان کے گھوڑوں کو خندق عبور کرنے میں شدید دشواری پیش آتی۔ یہاں تک کہ وہ ٹیپو کے سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے اور قلعے پر قبضہ کرنے کا فرنگی کا خواب اپنی تعبیر سے محروم رہ جاتا۔ مگر جب گھر کا بھیدی ہی دشمن کی رہنمائی کر رہا ہو تو پھر کیا خندق اور کیا دریا؟

میر معین الدین کا منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا مگر سید غفار کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا کہ

چچ بتا دیتے کہ وہ فرنگی ہیں اور جاسوسی کے خیال سے قلعے میں داخل ہوئے ہیں۔ مگر انہیں کون پہچانتا کہ محافظوں نے اپنی آنکھیں لارڈ ولزلی کے ہاتھوں فروخت کر دی تھیں اور انہیں کون روکتا کہ نگہبانوں کی تلواریں اور بازو ایٹ انڈیا کمپنی کے پاس رہن رکھے ہوئے تھے۔

محاصرے کے آخری چودہ دن سلطان نے ”کلائی ڈڈی“ کے قریب گزارے تھے۔ یہ ڈڈی، قلعے کی اندرونی فصیل میں محل کے شمال مغرب میں واقع تھی۔ اسے پانی لانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ڈڈی کے نزدیک پتھر کا بنا ہوا ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں سلطان دو ہفتے سے مقیم تھا۔ قریب ہی ملازمین کے لئے چار چھوٹے چھوٹے کمرے بنادیئے گئے تھے۔

4 مئی 1799ء کی صبح کوریاست کے مسلمان اور ہندو نجومی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیک زبان کہنے لگے۔

”حضور کے لئے آج کا دن انتہائی نامبارک ہے۔“

ابھی نجومیوں کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ٹیپو درمیان ہی میں بول اٹھا۔

”مسلمان کے لئے کوئی دن نامبارک نہیں ہوتا۔ آخر تم لوگ کیا کہنا چاہتے ہو؟ نامبارک

سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

مسلمان نجومی تو خاموش رہے مگر سرنگا پٹم کے برہمن ڈرتے ڈرتے کہنے لگے۔ ”ستاروں کی چالیں اس قدر خطرناک ہیں کہ آج کے دن کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ ہندو نجومی اشاروں میں بات کر رہے تھے۔

”زیادہ سے زیادہ آج کے دن میری موت واقع ہو سکتی ہے۔“ ٹیپو کے ہونٹوں پر وہی شگفتہ مسکراہٹ ابھر آئی جس کا مظاہرہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی کر سکتا تھا۔ ”کیا تم یہی کہنا چاہتے ہو؟“

برہمنوں نے گہرا کسر جھکا لئے۔ پھر ایک پنڈت نے جھکے ہوئے کہا۔ ”سرکار! ہماری التجا ہے کہ آج کے دن صدقہ دے دیں۔ اس طرح یہ منحوس گھڑی ٹل جائے گی۔“

”بے شک! صدقات سے موت کی گھڑی بھی ٹل جاتی ہے مگر اس صورت میں کہ روز و

شب کا بنانے والا بھی اسے ٹالنا چاہے۔“ ٹیپو کے لہجے سے غیر معمولی اطمینان جھلک رہا تھا۔

اس کے بعد سلطان نے ہندو نجومیوں کی خواہش کے مطابق ”چن ٹین“ کے ایک سنیا سی کو ہاتھی، ایک تھیلا کالے تیل اور دوسرو پے دے دیئے۔ باقی نجومیوں کو ایک ایک سیاہ تیل، سیاہ گائے، سیاہ بھیڑ، سیاہ بکری، کپڑے، تیل اور نوے نوے روپے دیئے۔ پھر جب وہ ہندو نجومی جانے لگے تو سلطان نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جب تم یہ صدقات غریبوں میں تقسیم کرنے لگو تو ان سے کہہ دینا کہ یہ ان کے سلطان کا

آخری عطیہ ہے۔“

پنڈتوں نے چونک کر سلطان کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر چلے گئے۔

ہے۔“ یہ کہہ کر میر معین الدین بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا۔  
میر معین الدین کے بٹے ہی ایک زبردست دھماکا ہوا۔ کسی فرنگی توپ نے فصیل کی طرف گولہ داغا تھا۔ پھر جب کچھ دیر بعد دھواں چھٹ گیا تو معلوم ہوا کہ سید غفار شہید ہو چکے ہیں۔  
دراصل سبز چھتری ایک خفیہ اشارہ تھا جس کے ذریعے فرنگی سپاہیوں کو خبر دی گئی تھی کہ چھتری کے نیچے کھڑا ہونے والا شخص، سلطان کا سب سے بڑا جال ٹار سید غفار ہے اور اسے راستے سے ہٹانا بہت ضروری ہے۔ میر معین الدین کی طرف سے اشارہ پاتے ہی فرنگی توپچی کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے سید غفار اپنے خون میں نہا گئے اور ان کے ساتھ ہی ان دونوں سپاہیوں کے بھی چپقتے اڑ گئے جو چھتری اٹھائے کھڑے تھے۔ سید غفار کے مرتے ہی فوج کو وہاں سے ہٹالیا گیا تاکہ انگریزی فوج کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔

سید غفار کی لاش دو گھنٹے تک قلعے کی فصیل پر پڑی رہی۔ اس دوران انگریزی فوج فصیل کے شکاف سے گزر کر قلعے میں داخل ہو گئی۔ انگریزی فوج کے اس دستے کی قیادت میجر ڈالس کر رہا تھا۔ جب میجر ڈالس، فصیل پر پہنچا تو اسے تین آدمی نظر آئے جو بظاہر مردہ پڑے تھے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان میں ایک میر معین الدین ہے۔ باقی دو آدمی اس پر گرے ہوئے تھے۔ میجر ڈالس کے حکم پر ان دونوں لاشوں کو کھینچ کر الگ کیا گیا۔ میر معین الدین بے ہوش تھا۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے گئے۔ جب کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا تو میجر ڈالس نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔

”سید صاحب!“

میر معین الدین اپنے آپ کو سید کہا کرتا تھا اور انگریزوں میں بھی وہ اسی نام سے مشہور تھا۔  
”ہاں! میں ہی ہوں، آپ کا خادم۔“ میر معین الدین نے نحیف لہجے میں کہا اور میجر ڈالس کے پاؤں پکڑ لئے۔

”یہ کون ہے؟“ میجر ڈالس کے دوسرے ساتھی میجر آلن نے میر معین الدین کی طرف اپنی بندوق کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کسی وقت کمپنی کی فوج میں ملازم تھا۔“ میجر ڈالس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔  
”ہمارا بہت وفادار ہے۔“

”یقیناً!“ میجر آلن بھی مسکرا رہا تھا۔

میجر ڈالس نے میر معین الدین کے لئے پاکی لانے کا حکم دیا۔ اس دوران میجر ڈالس، میر معین الدین سے ٹپو کے بارے میں پوچھتا رہا کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟

میر معین الدین بار بار قسمیں کھا کر میجر ڈالس کو یقین دلاتا رہا کہ سلطان محل میں موجود ہے۔ میجر ڈالس نے محسوس کیا کہ بات کرتے وقت میر معین الدین کی آواز کانپ رہی تھی۔

محل میں سلطان کی موجودگی کی خبر پاتے ہی میجر ڈالس اور میجر آلن، جزل بیرڈ کے پاس

انگریز قلعے کی فصیل پر چڑھ کر قلعے میں داخل ہو جاتے۔ آخر میر معین الدین نے اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ کو بھی دور کر دیا۔

”سید صاحب! آپ اسی وقت سلطان کے حضور تشریف لے جائیں اور انہیں آگاہ کر دیں کہ آج دن میں کسی وقت دشمن حملہ آور ہو سکتا ہے۔“ میر معین الدین پر شدید گھبراہٹ طاری تھی۔

سید غفار حیرت سے اپنے اعلیٰ افسر کا منہ دیکھنے لگے۔ ”میری معلومات کچھ اور ہیں۔ دشمن کتنا ہی طاقتور بھی مگر وہ دن کی روشنی میں کبھی حملہ نہیں کرے گا۔“

”میں آپ کی اطلاعات کو جھٹلا نہیں رہا ہوں سید صاحب!“ میر معین الدین کی بدحواسی بڑھتی جا رہی تھی مگر حقیقتاً اس نے خوف و دہشت کا ٹانک رچایا تھا۔ ”ابھی ابھی میرے کچھ جاسوسوں نے انگریزی فوج کی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھی ہے۔ اس لئے مجھے خدشہ ہے کہ کہیں دشمن دن کے اُجالے ہی میں حملہ نہ کر دے۔“

سلطان سے بے پناہ محبت اور فرض شناسی کی شدت نے سید غفار کو فریب کھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ میر معین الدین کی باتوں میں آگئے اور پھر شیز تیز قدموں سے شمالی فصیل کی طرف چلے گئے جہاں ٹیپو اپنے سپاہیوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

سید غفار کی بات سن کر ٹیپو بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے کہ دشمن دن کی روشنی میں قلعے کی طرف پیش قدمی کرے۔ میرے جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق آج کی رات بہت اہم ہے۔ فرنگی رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔“

سید غفار صبح آٹھ بجے کے قریب سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک میر معین الدین کی فراہم کردہ اطلاعات پر اصرار کرتے رہے مگر ٹیپو نے دن کے وقت دشمن کے حملے کے امکان کو مسترد کر دیا۔ پھر سلطان سید غفار سے دوسرے جنگی محاذوں کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دس بج گئے اور سید غفار، سلطان سے اجازت لے کر رخصت ہوئے۔

اس وقت سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ سید غفار پسینے میں نہاتے ہوئے میر معین الدین کے پاس پہنچے تو اس تک حرام نے اپنے دو سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ سپاہی ایک بڑی سی سبز چھتری اٹھائے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے سید غفار کے سر پر سایہ کر دیا۔

”مجاہدوں کے لئے سب موسم یکساں ہے۔“ سید غفار نے چھتری بردار سپاہیوں کو اپنے قریب سے ہٹانا چاہا مگر وہ پتھر کے ستون کی طرح کھڑے رہے۔

آخر میر معین الدین، سید غفار کے نزدیک آیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”سید صاحب! آج تو قیامت کی سی گرمی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سورج سوانیزے پر اتر آیا ہے۔ ذرا پسینہ خشک ہو جانے دیجئے۔ مجھے آپ کے منصب اور جال فشانوں کا خوب اندازہ



مخاطب ہوا جو دوپہر کے کھانے میں اس کے ساتھ شریک تھے۔

”آخر تمہارا شوق غداری تکمیل پا گیا؟“ سلطان کا لہجہ نہایت غضب ناک بھی تھا اور تحقیر آمیز بھی۔ ”خدا، رسول، مذہب، حیا، ضمیر اور غیرت، سبھی کچھ تو بچ چکے۔ کیا اب بھی تمہارے پاس فروخت کرنے کو کچھ باقی رہ گیا ہے؟ اگر کچھ ہے تو اسے بھی سیاست کی نیلام گاہ میں پیش کر دو۔ تمہارے سفید فام آقا، بولیاں لگانے کے لئے بازار میں داخل ہو چکے ہیں۔“ ٹیپو کے ہونٹوں سے نفرت کی آگ برس رہی تھی۔ غدار امراء مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔

”مگر اب تمہارے پاس بازار میں لے جانے کے لئے بچا ہی کیا ہے؟“ ٹیپو کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ ”ابھی تو تم ان خوابوں کے طلسم میں گرفتار ہو جو تمہیں انسانیت کے تاجروں نے دکھائے ہیں۔ مگر یاد رکھو کہ ہر خواب ٹوٹنے اور ہر طلسم برباد ہونے کے لئے ہے۔ تمہیں اس غداری کا نتیجہ اس وقت معلوم ہو گا، جب تم اور تمہاری تسلیں فرنگیوں کے اشارے پر سر بازار اس طرح رقص کریں گی کہ ان کے پیروں میں بے آبروئی کی زنجیر ہوگی اور گردنوں میں طوق غلامی۔“ یہ کہہ کر ٹیپو سلطان آگے بڑھا، چند قدم چل کر واپس مڑا۔ ”تم نے ہمیشہ میری پشت پر وار کئے ہیں۔ اس وقت میں تمہا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں بندوق ہیں۔ اگر تم میرے سینے پر وار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو پھر میں جیسے ہی مڑوں، اپنی بندوقوں کو میری پشت پر خالی کر دیتا اور اس کے بعد اپنے آقاؤں کو اطلاع دے دیتا کہ وہ شخص مارا گیا جو انسانی ضمیر اور جسم کی آزادی کا علمبردار تھا۔“

یہ کہہ کر ٹیپو مڑا اور تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ پھر وہ چھوٹے دروازے سے باہر نکلا۔ اس وقت سلطان نیم رنگ کپڑے کی قبائلی پہنے ہوئے تھا۔



ٹیپو کو آخر تک اپنے سپہ سالار میر قمر الدین کا انتظار تھا۔ میر قمر الدین، سلطان کا سوتلا ماموں زاد بھائی تھا اور اسی رشتے سے ٹیپو اس پر بہت اعتبار کرتا تھا۔ جب لاڑ ڈلی نے سلطنتِ خداداد کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا، اس وقت سلطان نے میر قمر الدین کو ایک بڑا لشکر دے کر ورگ روانہ کر دیا تھا تا کہ وہ فرنگیوں کی پیش قدمی کو روک سکے۔ مگر ٹیپو کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ میر قمر الدین بہت پہلے انگریزوں سے ساز باز کر کے ”گرم کنڈہ“ کی جاگیر اپنے نام لکھوا چکا ہے۔ فرنگیوں کی سیاست کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے میر قمر الدین اور میر معین الدین دونوں کے نام گرم کنڈہ کی جاگیر لکھ دی تھی۔ میر معین الدین تو اس جاگیر کے حصول سے پہلے ہی مر چکا تھا لیکن میر قمر الدین زندہ تھا اور ایک لشکر جہاز لے کر سرنگا پٹم کے قریب ہی کسی خفیہ مقام پر موجود تھا۔ اگر میر قمر الدین پشت سے انگریزی فوج پر حملہ کر دیتا تو ایک ایک فرنگی تہہ تیغ ہو جاتا یا اسے قیدی بنا لیا جاتا۔

چلے گئے اور میر معین الدین کی حفاظت کے لئے دو سپاہی متعین کر گئے۔ کچھ دیر بعد چار کھار پاکی اٹھائے ہوئے میر معین الدین کے قریب آئے۔ ٹیپو کے اعتبار کا قاتل اور سلطنتِ خداداد کا غدار پاکی میں سوار ہونے کے لئے کھڑا ہوا مگر اس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ میر معین الدین چکرا کر زمین پر گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میر معین الدین کو کیا بیماری لاحق تھی۔ بظاہر اس کے جسم پر کسی زخم کا نشان نہیں تھا۔ ”گرم کنڈہ“ کی جاگیر کی ہوس میں مذہب و ملت، وطن اور خاندانی رشتوں کو فروخت کرنے والا بے حس و حرکت پڑا تھا اور حسرتیں اس کی لاش پر نوحہ خوانی کر رہی تھیں۔



سید غفار اس مقام پر شہید ہوئے تھے جہاں میر معین الدین اور اس کے حامی چند سپاہیوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اس لئے سلطان کے وفادار فوجیوں کو پتہ ہی نہیں چل سکا کہ ان کا سالار جام شہادت نوش کر کے اس دنیا سے بہت دور جا چکا ہے۔ اگرچہ قلعے کی فیصل تک پہنچنے کے لئے انگریزوں کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو چکی تھی لیکن ابھی سلطان کے ہزاروں جاں نثار سپاہی باقی تھے جو بہت زیادہ مستعد نظر آ رہے تھے۔ اس دشواری پر قابو پانے کے لئے حرام کار پور نیا نے نئی چال چلی۔ وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے اس غدار نے تمام سپاہیوں کو حکم بھیجا کہ خواہ تقسیم کی جا رہی ہے۔ فوج مطمئن تھی اور انہیں دور دور تک دشمن کے حملے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس لئے قلعے کی فیصل پر متعین تمام سپاہی اپنی تنخواہیں لینے کے لئے مسجدِ اعلیٰ کے قریب چلے گئے۔

اب قلعے کی فیصل پر سناٹا تھا۔ موقع ملتے ہی پورنیا کے معتمد کچھ سپاہیوں نے ایک سفید جھنڈا بلند کر کے اسے دیر تک ہوا میں لہرا دیا۔ یہ انگریزوں اور سلطنتِ خداداد کے غداروں کے درمیان پہلے سے طے شدہ ایک خفیہ اشارہ تھا۔ جس کا مفہوم تھا کہ راستہ صاف ہے اور آنے والے بے خوف و خطر قلعے کے اندر چلے آئیں۔ نمک حرام پورنیا اپنے منصوبے کے مطابق سپاہیوں میں تنخواہیں تقسیم کرتا رہا اور انگریزی فوج آسانی کے ساتھ فیصل پر چڑھ کر قلعے میں داخل ہو گئی۔

اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے۔ سلطان ایک آم کے درخت کے سائے میں بیٹھا تھا۔ اس نے اسی جگہ کھانا طلب کیا۔ چند امراء بھی سلطان کے قریب موجود تھے۔ ابھی ٹیپو نے کھانے کا ایک لقمہ ہی تناول کیا تھا کہ یکایک ایک شور بلند ہوا۔ لوگ چیختے ہوئے سلطان کی طرف آ رہے تھے۔

”سید غفار شہید کر دیئے گئے اور فرنگیوں کی فوج قلعے میں داخل ہو چکی ہے۔“ غدار کا جو لقمہ سلطان کے ہاتھ میں تھا اس نے اسے دستِ خوان پر رکھ دیا اور تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی تلوار گلے میں ڈالی اور دو نالی بندوق اٹھا کر ان امراء سے

زندگی زیادہ عزیز ہے۔“

سلطان نے پلٹ کر اپنے اس فوجی افسر کی طرف دیکھا اور انتہائی غضب ناک لہجے میں جواب دیا۔ ”گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ اگر وفادار ہو تو میری آبرومندانہ اور مجاہدانہ موت کی دعائیں کرو۔ اب زندگی کا اس کے سوا دوسرا کوئی مفہوم نہیں۔ کیا میں انگریزوں کی غلامی قبول کر لوں؟“

دروازے کے سامنے گھسان کا رن پڑا۔ یہاں جگہ بہت تنگ تھی، اس لئے سلطان کے جاں نثاروں کو اپنی جواں مردی کے جوہر دکھانے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ پھر بھی وہ اس بے جگری کے ساتھ لڑے کہ سینکڑوں فرنگی اور اتحادی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا۔ شجاعت خان سائے کی طرح سلطان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

ناگہاں ایک انگریز سپاہی کی گولی سلطان کے گھوڑے ”طاؤس“ کے پیروں میں لگی۔ گھوڑا زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ سلطان نیچے اتر آیا۔ اب دست بدست جنگ ہو رہی تھی۔ سلطان کی شمشیر خارا شگاف نے کئی دشمن سپاہیوں کے سر تن سے جدا کر دیے۔ اس کی بددقت نے کئی فرنگیوں کے سینوں کو نشانہ بنایا۔ مگر اب شجاعت و مردانگی کے اس مظاہرے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ غداروں کی مخبری کے سبب پوری انگریزی فوج اس جگہ ٹوٹ پڑی تھی، جہاں ٹیپو سلطان موجود تھا۔ اچانک دشمن کی ایک گولی شجاعت خان کے دل پر لگی۔ شجاعت خان، سلطان کی سپر بنا ہوا تھا۔ اگر وہ اتنے قریب نہ ہوتا تو یہی گولی سلطان کے سینے کو اپنا نشانہ بنا لیتی۔ شجاعت خان لہرا کر زمین پر گرا۔

”الوداع میرے شہزادے!..... الفراق میرے آقا!..... آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہوا۔“

بس یہ چند الفاظ تھے، جنہیں شجاعت خان بمشکل ادا کر سکا۔

”خدا حافظ شجاعت خان! تم نے اپنے امیر کی اطاعت کا حق ادا کر دیا۔ میں تم سے راضی ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ بھی تم سے راضی ہو جائے۔“ ٹیپو نے اپنے جاں نثار کو مرتے ہوئے دیکھا مگر اس کی چارہ گری نہ کر سکا کہ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ جب تک سلطان نے شجاعت خان کو مخاطب کر کے رخصتی الفاظ ادا کئے، اتنی دیر میں کئی اور جاں نثار خون میں نہا گئے۔ انگریزی فوج اس طرح گولیاں برسا رہی تھی، جیسے آسمان سے ژالہ باری ہو رہی ہو۔ سلطان کے بارہ ہزار جاں نثار شہید ہو چکے تھے۔ کچھ زندہ تھے مگر نیم جانی کے عالم میں زمین پر پڑے سسک رہے تھے۔ یکایک سلطان کے جسم پر چار گولیاں لگیں..... دو بازوؤں میں، ایک دل کے قریب اور ایک کان پر۔ سلطان شدید زخمی ہو کر گر پڑا۔ وہ بار بار پانی مانگ رہا تھا مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ سلطان کا خادم خاص راجہ خان زندہ بھی تھا اور صحیح سلامت بھی۔ راجہ خان نو مسلم مرہٹہ تھا جس پر سلطان بہت زیادہ مہربان تھا۔ اس کے پاس پانی کی

سید غفار کی شہادت اور انگریزوں کے قلعے میں داخل ہو جانے کی خبر سن کر شجاعت خان نے سلطان سے بڑے حسرت زدہ لہجے میں کہا تھا۔

”کاش! اس وقت قمر الدین اپنی فوج لے کر آ جاتے۔“

”اگر اُسے آنا ہوتا تو آچکا ہوتا۔“ ٹیپو کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ ”اب کوئی نہیں آئے گا شجاعت خان! بس موت ہی آئے گی اور وہی ہماری بچی رفیق ہے۔ ہمارے سارے احباب، سارے جاں نثار کوتاہی اور تاخیر کا شکار ہو سکتے ہیں مگر موت ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرتی۔ مادی اسباب اور ویلیوں کو پکارنے کے بجائے ہمیں اپنے رفیق کے والہانہ استقبال کی تیاریاں کرنی چاہئیں۔“ سلطان ہر شے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اسے اپنی شکست اور موت کا یقین تھا مگر پھر بھی اس نے دشمنوں سے عافیت طلب نہیں کی۔ وہ ”ڈڈی دروازے“ سے نکل کر اپنے محافظ دستے کے ساتھ ”علم ہتری“ کی طرف بڑھا۔ میر صادق علی کسی دشمن جاسوس کی طرح سلطان کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنے آدمیوں کے ذریعے انگریزوں کو یہ خبر پہنچا دی کہ سلطان ”علم ہتری“ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسے قلعے سے باہر نکلنے کا موقع نہ دیا جائے۔

دہلی دروازے کے قریب پہنچ کر سلطان کا مقابلہ اس انگریزی فوج سے ہو گیا جو قلعے کی تفصیل پر آرہی تھی۔ سلطان اور اس کے محافظ دستے نے انگریزی فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا۔ یہاں نہ صرف بددقوں سے لڑائی ہو رہی تھی بلکہ تلواریں بھی استعمال ہو رہی تھیں۔ اگر غدار پور نیا تنخواہیں تقسیم کرنے کے بہانے سے سلطانی فوج کو نہ ہٹا لیتا تو جنوبی تفصیل پر بھی فرنگی لشکر کو روک دیا جاتا۔ تقریباً تین گھنٹے تک سلطان نے انگریزی فوج کو آگے بڑھنے سے روک رکھا۔ مگر اچانک وہ انگریزی فوج جو پور نیا اور میر معین الدین کی غداروں کے سبب جنوبی تفصیل اور مشرقی دروازے پر قابض ہو چکی تھی، شہر کی اندرونی تفصیل تک پہنچ گئی اور سلطان کے محافظ دستے پر گولیاں برسانے لگی۔ مجبور ہو کر سلطان نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ پھر جب وہ ”ڈڈی دروازے“ پر پہنچا تو اسے اندر سے بند پایا۔ کچھ دیر پہلے سلطان کے نکلنے ہی نمک حرام میر صادق نے دروازہ بند کر دیا تھا تا کہ سلطان کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچنے کے لئے اس راستے کو استعمال نہ کر سکے۔

سلطان نے چند لمحوں میں فیصلہ کرتے ہوئے نیا راستہ اختیار کیا۔ انگریزی فوج قلعے کی اندرونی تفصیل پر سے مسلسل گولیاں برسا رہی تھی مگر سلطان ایک ایک قدم پر مدافعت کرتا ہوا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اور عین اس وقت جب وہ قلعے کے بڑے دروازے کے قریب پہنچا تو اس کا مقابلہ جنوب مشرق سے آنے والی انگریزی فوج سے ہو گیا۔ اب سلطان اپنے جاں نثاروں کے ساتھ تین اطراف سے محصور ہو گیا تھا۔

اس صورت حال کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے سلطان کے ایک ہمدرد فوجی افسر نے کہا۔

”حضور! اپنے آپ کو انگریزوں پر ظاہر کر دیں۔ ہمیں فتح و نصرت کے مقابلے میں آپ کی

چھاگل موجود تھی مگر راجہ خان نے اپنے آقا کے خشک ہونٹوں پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پٹکایا۔ وہ لاشوں کے پیچھے خاموش بیٹھا رہا۔

سریتا دیوی کئی گھنٹوں سے سلطان کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سپاہیوں کے جہوم کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ پھر جب چاروں طرف موت کا سناٹا پھیل گیا تو وہ سلطان کو تلاش کرتی ہوئی اُس کے قریب پہنچ گئی۔ بارودی کپش نے سلطان کے جسم کو جلا ڈالا تھا مگر اُس کے ہوش و حواس باقی تھے۔ ٹپو نے سریتا کو پہچان لیا اور اس نے پانی طلب کرتے ہوئے کہا۔

”بارودی..... سرنگوں میں..... آگ لگا کر..... حرم سرا..... کو آؤ دو۔“ سلطان نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کئے۔ اسے آخری وقت میں اپنے ناموس کا بہت خیال تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انگریز اور ہندو سپاہی، خواتین کی بے آبروئی کریں۔

سریتا زار و قطار روتی ہوئی اُنھی مگر دوسرے ہی لمحے راجہ خان نے اسے اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا۔ سریتا، ٹپو کے قدموں کے قریب ہی گر پڑی۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ، سلطان کے پیروں پر رکھ دیئے۔ ایک چال سوختہ عشق کو محبوب کا وصال میسر آ گیا تھا۔

سلطان کی آواز مدہم ہوتی جا رہی تھی۔ راجہ لاشوں کی اوٹ سے نکل کر سلطان کے قریب آیا۔ اب سلطنت خداداد کا فرمانروا پانی نہیں مانگ رہا تھا۔ سلطان کے ہونٹ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ راجہ خان نے جھک کر سنا، سلطان لکڑی شہادت پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے تین بار توجید و رسالت کا اقرار کیا اور غداروں کی بستی سے بہت دُور چلا گیا۔

راجہ خان گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر جب اسے یقین آ گیا کہ سلطان مر چکا ہے تو اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ، ٹپو کی گردن کی طرف بڑھے۔ راجہ خان کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ دہشت زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے سلطان کے گلے سے وہ قیمتی ہار اتار لیا جو اپنی ساخت میں بے مثال تھا۔ پھر وہ تیزی سے بھاگا اور اس جگہ چھپ گیا جہاں بہت سے شہیدوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

سلطان کو شہید ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے مگر انگریزوں کو اس بات کی خبر نہیں تھی۔ خود قلعے کے جاں نثار محافظ بھی اس راز سے واقف نہیں تھے کہ سلطان اس وقت کہاں ہے اور اس پر کیا گزر رہی ہے؟ اس سلسلے میں جنرل بیرڈ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اسے ایک ہی فکر لاحق تھی کہ اگر سلطان سرنگاپٹم سے نکل گیا تو اس پر قابو پانا دشوار ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر جنرل بیرڈ نے میجر آلن کو حکم دیا۔

”تم اپنا ایک فوجی دستہ لے کر محل میں جاؤ اور سلطان کو اطلاع دو کہ اگر وہ کسی مقابلے کے بغیر اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دے تو اس کی پوری حفاظت کی جائے گی ورنہ محل میں رہنے والے ہر شخص کے لئے اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا۔“

جنرل بیرڈ کا حکم پاتے ہی میجر آلن ایک سفید جھنڈا لئے ہوئے محل کے دروازے پر پہنچا۔ پھر اس نے قلعے دار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جنرل بہادر کا ایک پیغام سلطان کو فوراً پہنچا دو۔ ورنہ گزرنے والا ہر لمحہ تم سب کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوگا۔“

قلعے دار پہلے تو راضی نہیں ہوا مگر جب میجر آلن نے سخت لہجے میں دھمکیاں دیں تو وہ اسے اور دوسرے انگریز فوجی افسروں کو اندر لے گیا۔ محل کے صحن میں چند سپاہی ہتھیار باندھے کھڑے تھے۔ میجر آلن نے انہیں سفید جھنڈا دکھایا اور کہا کہ یہ امن کا جھنڈا ہے۔ مسلح سپاہی بے یقینی کے عالم میں انگریز افسروں کو دیکھتے رہے۔ میجر آلن نے اطمینان دلانے کے لئے اپنی تلوار نکال کر ان کے حوالے کر دی۔

قاصد فوراً ہی اندر چلا گیا۔ مگر جب واپس آنے میں اسے بہت دیر ہوئی تو میجر آلن نے کہلا بھیجا۔ ”تاخیری حربے اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ بات بہت زیادہ بگڑ جائے گی۔“

میجر آلن کا تنبیہی پیغام ملتے ہی قلعہ دار واپس آیا اور انگریز افسروں کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ اندر چلا گیا۔

یہاں فرش پر دو شہزادے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شہزادہ معز الدین بھی تھا جو میسور کی تیسری جنگ میں بطور یرغمال انگریزوں کے پاس رہ چکا تھا۔ دونوں شہزادے سہمے ہوئے تھے۔

میجر آلن نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ہمیں بتاؤ کہ سلطان کہاں ہیں؟ وہ کچھ بھی کر لیں، اب ان کے لئے محاصرہ توڑنا ناممکن ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس بے سود کوشش میں وہ اپنی جان گنوا بیٹھیں۔“

دونوں شہزادے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد شہزادہ معز الدین، میجر آلن سے مخاطب ہوا۔

”سلطان معظم محل میں موجود نہیں ہیں۔“

”محل کے دروازے کھول دیئے جائیں تاکہ تلاشی کے بعد ہم مطمئن ہو جائیں۔“ اس بار میجر آلن کا لہجہ سخت تھا۔

”ہم حکم سلطانی سے مجبور ہیں۔“ شہزادہ معز الدین نے کہا۔ ”ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

میجر آلن نے فوراً ہی لہجہ بدل ڈالا اور بہت دیر تک شہزادوں کو سمجھاتا رہا۔ ”میرے سوا کوئی بھی اندر نہیں جائے گا۔“

آخر دروازہ کھول دیا گیا۔ جب میجر آلن وہاں پہنچا تو جنرل بیرڈ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ پہلے سے موجود تھا۔ میجر آلن نے گھبرا کر جنرل بیرڈ کی طرف دیکھا۔ شدت غصہ سے اس کا چہرہ

پر بہت سی مشعلیں منگوائی گئیں۔

اسی تلاش کے دوران جنرل بیرڈ کو ٹیپو کا نمک حرام خدمت گار، راجہ خان ملا جو خون میں لت پت نظر آ رہا تھا۔ اس غدار نے چیخ کر کہا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس کے جسم پر کسی گولی یا تلوار کی ہلکی سی خراش تک نہیں آئی تھی۔ اس حرام کار کا لباس شہیدوں کے خون سے رنگین ہوا تھا اور وہ اسی خون کے پردے میں اپنے آپ کو زخمی ظاہر کر رہا تھا۔ جنرل بیرڈ نے راجہ خان سے سلطان کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس جگہ کی نشاندہی کی، جہاں سلطان زخمی ہو کر گھوڑے سے گر رہا تھا۔

جنرل بیرڈ، مشعلوں کی روشنی میں آگے بڑھا۔ قدم قدم پر شہیدوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ آخر بڑی کٹکٹش کے بعد جنرل بیرڈ اس جگہ پہنچا جس کی نشاندہی راجہ خان نے کی تھی۔ شجاعت خان اور سریتا دیوی کے علاوہ وہاں سلطان کے دوسرے جاں نثاروں کی لاشیں بھی موجود تھیں۔ جنرل بیرڈ بہت دیر تک سلطان کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا مگر صورت نا آشنا ہونے کے سبب ناکام رہا۔ آخر وہ انگریز سپاہی، نمک حرام راجہ خان کو سہارا دے کر وہاں تک لائے۔ اس غدار نے فوراً ہی اپنے آقا کو پہچان لیا اور پلٹ کر جنرل بیرڈ سے مخاطب ہوا۔

”میں نے آخری وقت میں سلطان کو بہت سمجھایا تھا کہ پوری دنیا بل کر بھی شاہ انگلستان کی فوجی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر انہوں نے میری بات نہیں مانی اور اپنی دنیا خراب کر ڈالی۔“ زمانہ ساز راجہ خان، انگریزی اقتدار کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا کہ اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جائے اور وہ فرنگیوں کے قہر و غضب سے محفوظ رہے۔

جنرل بیرڈ اور کرنل ولزلی نے راجہ خان کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ دونوں مشعلوں کی روشنی میں سلطان کے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ سلطان کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ نمایاں تھی جیسے وہ کسی خوب صورت منظر کی دلفریبیوں میں گم ہو۔

”یہ تو ابھی زندہ ہے۔“ کرنل ولزلی نے گہرائے ہوئے لہجے میں جنرل بیرڈ سے کہا۔ کرنل ولزلی، لارڈ ولزلی کا چھوٹا بھائی تھا۔

جنرل بیرڈ بھی سلطان کی ظاہری حالت دیکھ کر حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ ٹیپو کا پورا جسم خون میں نہایا ہوا تھا لیکن اس کی روشن آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ جیسے وہ کسی وقت بھی اٹھ کھڑا ہو سکتا ہے۔

ابھی جنرل بیرڈ اور کرنل ولزلی حیرت و پریشانی میں مبتلا تھے کہ راجہ خان درمیان میں بول اٹھا۔

”نہیں حضور! آپ کو شبہ ہو رہا ہے۔ چار بجے کے قریب سلطان کو گولی لگی تھی اور اب تو مغرب کا وقت بھی گزر گیا۔ میرے خیال میں سلطان کو مرے ہوئے تین چار گھنٹے ہو چکے

سرخ ہو رہا تھا۔ میر صادق نے بیرڈ کو یہ غلط خبر پہنچائی تھی کہ انگریز قیدیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جب دونوں شہزادے، جنرل بیرڈ کے روبرو آئے تو وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ان سے ملا۔ پھر دونوں شہزادوں کو لفٹیننٹ کرنل آگنیو اور کیپٹن میرٹ کی حراست میں دے دیا گیا۔

جنرل بیرڈ، سلطان تک پہنچنے کے لئے پورے محل کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ اس نے صحن میں اپنے سپاہی متعین کئے اور اندر کی طرف بڑھا۔ قلعہ دار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ کو میری بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ سلطان ذی شان، محل کے اندر موجود نہیں ہیں۔“

”میں اپنی آنکھوں کے سوا کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔“ جنرل بیرڈ کا لہجہ غضب ناک تھا۔ ”میں محل کے ایک ایک کمرے، ایک ایک گوشے اور ایک ایک تہہ خانے کی تلاشی لوں گا۔ اس کے بعد سوچوں گا کہ تیری بات میں کتنی صداقت ہے۔“

قلعہ دار جانتا تھا کہ جنرل بیرڈ، سلطان کو تلاش کرتے کرتے حرم سرا میں داخل ہو جائے گا اور یہ بات اسے گوارا نہیں تھی۔ اگرچہ سلطان جنگ ہار چکا تھا لیکن پھر بھی اس کے کچھ جاں نثار ابھی تک رسم و نفاذ نبھا رہے تھے۔ قلعہ دار بھی ان ہی جاں نثاروں میں سے تھا اور حرم سرا کے ناموس کی خاطر جنرل بیرڈ کو اندر جانے سے روک رہا تھا۔

آخر قلعہ دار اس راز کو فاش کرنے پر مجبور ہو گیا، جسے اب چھپانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”سلطان اپنی فوج کے ساتھ اندرونی فصیل کے دروازے کی طرف گئے تھے۔ وہاں کئی گھنٹوں تک خوف ناک جنگ ہوتی رہی ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ اس جنگ کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ سلطان وہاں موجود ہیں یا قلعے سے باہر نکل گئے ہیں؟“ قلعہ دار کا لہجہ بہت شکستہ تھا۔

”اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو تیرا انجام بہت دردناک ہو گا۔“ جنرل بیرڈ کسی دردے کی طرح غزبیا۔

”اس سے زیادہ دردناک انجام کیا ہو گا کہ جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا، وہاں آپ کے سپاہی اس طرح منہ اٹھائے چلے آ رہے ہیں، جیسے قصر سلطانی نہ ہو، کوئی تماشا گاہ ہو۔“ قلعہ دار کا لہجہ نہایت طنز آمیز تھا۔ شکست کھا جانے والوں کا آخری ہتھیار ان کی زبان ہوتی ہے۔ سو قلعہ دار نے اپنا وہ آخری ہتھیار بھی استعمال کر ڈالا تھا۔

جنرل بیرڈ نے ایک وحشیانہ ہتھیار لگایا اور میر آلن کو لے کر اندرونی فصیل کے دروازے کی طرف بڑھا۔

جب جنرل بیرڈ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا تو ہر طرف لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مردہ جسموں کے اس نجوم میں سلطان کو پہچاننا دشوار تھا۔ آخر لاشوں کو کھینچ کھینچ کر نکالا گیا مگر ان کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر جنرل بیرڈ کے حکم



ہیں۔“ نمک حرام راجہ خان، ٹیپو کی موت کی تصدیق اس لئے کر رہا تھا کہ جب اس نے سلطان کے گلے سے وہ قیمتی ہار اتارا تھا، اس وقت سلطان کے جسم میں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہیں تھی۔

راجہ خان کی یقین دہانی کے بعد کرنل ولزلی آگے بڑھا اور سلطان کی نبض دیکھنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد گہرا کرکھڑا ہو گیا۔

”نا قابل یقین..... نا قابل یقین۔“ کرنل ولزلی کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ ”سلطان کی نبض ڈوب چکی ہے مگر جسم ہم جیسے زندہ لوگوں سے بھی زیادہ گرم ہے۔ جزل! تم بھی غور سے دیکھو۔ اس کے زخموں سے اب تک خون بہہ رہا تھا۔ تین چار گھنٹے تو کجا، دس پندرہ منٹ پہلے مرنے والے انسان کی بھی یہ حالت نہیں ہو سکتی۔ آخر اس کے بدن میں کتنا خون ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا؟“

جزل بیرڈ بھی کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے قلعہ دار، مرزا اسد بیگ کو بھی اسی جگہ طلب کر لیا۔

”کیا یہی ہے تمہارا سلطان؟“ جزل بیرڈ نے ٹیپو کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مرزا اسد بیگ نے مشعلوں کی روشنی میں جھک کر دیکھا۔

”دنیا میں جو کچھ بھی ہے، اپنے اللہ کی طرف لوٹ کر جانے والا ہے۔“ یہ کہہ کر مرزا اسد بیگ سیدھا ہوا۔ ”ہاں یہی ہے شیر میسور، جس نے گیدڑوں کے ہجوم کی غلامی نہیں کی۔“ اسد بیگ کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔ ”ہاں، یہی ہے میرا فاتح سلطان جس نے تن تنہا غداروں اور فریب کاروں کے لشکر عظیم کو شکست دی۔“

ابھی مقتل میں مرزا اسد بیگ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ ایک انگریز کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور دوسرے ہی لمحے فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ فرنگی سپاہی نے جوش غضب میں اپنی بندوق، مرزا اسد بیگ کے سینے پر خالی کر دی تھی۔ ٹیپو کا یہ جاں نثار جو حرم سرا کی حفاظت پر مامور تھا، خون میں نہا کر اپنے آقا سے اس طرح جا ملا کہ مرزا اسد بیگ کا سر، ٹیپو کے قدموں پر تھا۔

راجہ خان کے بعد قلعہ دار مرزا اسد بیگ نے بھی ٹیپو کی شہادت کی تصدیق کر دی تھی۔ پوری طرح مطمئن ہو جانے کے بعد جزل بیرڈ نے انتہائی متکبرانہ لہجے میں اپنے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

”جاؤ اور جزل ہارس کو خوش خبری دو کہ انگریزی فوج نے سرنگا پٹم کا غرور خاک میں ملا دیا اور نواب حیدر علی سے کھائی ہوئی تمام شکستوں کا قرض اتار دیا۔ فوراً آؤ اور اپنی آنکھوں سے انگلستان کی بلند آقبالی کے مناظر دیکھو۔“

جب جزل ہارس نے جزل بیرڈ کے سپاہیوں کی زبانی ٹیپو کی موت کی خبر سنی تو وہ کچھ دیر کے لئے سکتے میں آ گیا۔ فرنگی جزل کے ہونٹ کھلے کے کھلے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر جب اس کی یہ کیفیت ختم ہوئی تو اس نے بیرڈ کے ایک سپاہی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

”تو کچھ کہتا ہے؟ تیری بیٹائی سلامت ہے؟“ جزل ہارس، وحشتوں کی مانند بول رہا تھا۔ ”منہاج برطانیہ زندہ باد!“ جزل ہارس پوری طاقت سے چیخا۔ ”ایسٹ انڈیا کمپنی زندہ باد! عظیم قوم، عظیم فتح۔“

جزل ہارس بھاگتا ہوا وہاں پہنچا، جہاں جزل بیرڈ اور کرنل ولزلی اس کے منتظر تھے۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں مقتل کی فضا بڑی بڑھول نظر آ رہی تھی۔ جزل ہارس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ ٹیپو کی لاش دیکھی اور دل کی پوری طاقت سے چیخا۔

”اب ہندوستان ہمارا ہے۔“

جزل ہارس نے یہ جملہ کئی بار دہرایا اور اپنی بندوق سے ہوا میں دو فائر کئے۔ کچھ دیر بعد سلطان کی لاش کو ایک پالکی کے ذریعے محل میں پہنچا دیا گیا۔



وہ رات اہل سرنگا پٹم پر بہت بھاری تھی۔ قوم کے غم میں جاگنے والا عادل سلطان اور ہمدرد محافظ اس دار فانی سے بہت دور جا چکا تھا اور غدار امراء نے اپنی ہوس پرستی کی خاطر مخلوق خدا کی تقدیریں خون آشام سفید بھیڑیوں کے ہاتھوں فروخت کر دی تھیں۔ رات بھر لوٹ مار اور قتل و غارت گری ہوتی رہی۔ ہر طرف گولیاں چلنے کی آوازیں اور زخموں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

محل میں کہرام برپا تھا۔ قدم قدم پر انگریز سپاہی مامور تھے۔ سلطان کی تجہیز و تکفین کا انتظام قاضی شہر کے سپرد کیا گیا تھا۔ سلطان کو مکہ معظمہ کے بنے ہوئے ایک خاص کپڑے کا کفن پہنایا گیا جو تھوڑی دیر بعد ہی خون سے رنگین ہو گیا۔ جزل ہارس، جزل بیرڈ اور کرنل ولزلی اس واقعہ پر سخت حیران تھے۔

”یہ خون کیوں نہیں رکتا؟“ کرنل ولزلی نے قاضی شہر سے پوچھا۔

”سلطان شہید ہوئے ہیں اور یہ بہتا ہوا خون ان کی زندگی کی علامت ہے۔“ قاضی شہر نے سوگوار لہجے میں کہا۔

تینوں انگریز فوجی افسر قاضی شہر کی اس بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے۔ ان کی اپنی قوم میں بے شمار انگریز سپاہی قتل ہوئے تھے مگر آج تک ان کی آنکھوں سے ایسا کوئی منظر نہیں گزرا تھا۔

چار بجے کے قریب مرد شہید کا جنازہ اٹھایا گیا۔ حرم سرا کی خواتین میں ایک بار پھر شور

حرام کار پورنیا، جنرل ہارس اور جنرل بیرڈ کے سامنے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دراصل پورنیا بھی وزارتِ عظمیٰ کا امیدوار تھا اور اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت حاصل تھی۔ قلعے سے نکلے ہی جنرل ہارس نے پورنیا کو سخت لہجے میں تنبیہ کر دی تھی۔

”تو نے ساری زندگی بے پناہ ذہانت سے کام لیا مگر آخری وقت میں اس قدر نادانی؟“ جنرل ہارس، پورنیا کو سمجھا رہا تھا۔ ”دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں، اس لئے ہم سے دُور دُور چل۔“ پورنیا فوراً ہی ہٹ گیا اور سلطان کے جنازے کے قریب پہنچ کر زور زور سے رونے لگا۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ خدا نے زندگی میں بھی ٹیپو کو عزت و تکریم بخشی اور مرنے کے بعد بھی۔

فاتح حکمران، مفتوح فرمانرواؤں کے ساتھ بڑا تحقیر آمیز سلوک کرتے ہیں۔ ٹیپو بھی ایک شکست خوردہ انسان تھا مگر اس کا جنازہ اس شان سے جا رہا تھا کہ جیسے وہ آج بھی ریاستِ میسور کا مطلق العنان حاکم ہو۔ انگریزی فوج جو کل تک سلطان کے خلاف صف آرا تھی، آج شہر کے مختلف راستوں پر دو روہ قطاروں میں اپنی بندوقیں اور سر جھکائے کھڑی تھی اور سلطان کی میت کو آخری سلامی پیش کر رہی تھی۔

جنازے کے آگے چار انگریزی کمپنیاں تھیں۔ دائیں اور بائیں سلطنتِ خداداد کے امراء اور دیگر معززین شہر تھے۔ جنازے کے عین پیچھے شہزادہ عبداللہ ق برہنہ سرگھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے بال پریشان تھے اور آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔

جنازہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ راستے میں ہزاروں لوگ سلطان کے عدل و انصاف اور الطافِ کریمانہ کے واقعات سنا سنا کر رو رہے تھے۔ شدتِ غم سے نڈھال سینکڑوں ہندو اور مسلمان، جنازے کے آگے آ کر اس طرح لیٹ جاتے تھے کہ انہیں ہٹانا دشوار ہو جاتا تھا۔ مسلمان عورتیں بھی بے حال تھیں۔ مگر ہندو خواتین اپنے سروں پر مٹی ڈال کر ماتم کر رہی تھیں۔

آج کا دن بہت زیادہ گرم تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہواؤں کو کسی شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہے۔ درخت اس طرح ساکت تھے کہ ایک پتہ تک نہیں ہلتا تھا۔ آسمان پر سیاہ گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے بادلوں کی مہیب گرج سنائی دیتی تھی۔ بجلی کی کڑک سے لوگ اچھل جاتے تھے۔ اسی حالت میں جنازہ لال باغ پہنچا۔ ہجوم اس قدر بڑھ گیا تھا کہ انسانوں کا سانس لینا دشوار تھا۔ قلعے سے ماتی تو پیس سر کی جا رہی تھیں مگر بارودی گولوں کی آوازیں، ماتم گساروں کے شور و فغاں میں ڈوب کر رہ گئی تھیں۔ اگر کچھ دیر کے لئے انسانی گریہ و زاری کا سلسلہ رک جاتا تو بجلی کی خوف ناک کڑک سنائی دیتی جیسے آسمان پر بھی کچھ ہو رہا ہے۔

جب سلطان کا جنازہ نواب حیدر علی کے مقبرے کے عین مقابل پہنچا تو فوجی بینڈ ختم گیا۔ چار فوجی کمپنیاں جو میت کے آگے آگے تھیں، دو روہ قطاریں باندھ کر کھڑی ہو گئیں تاکہ جنازے کو ان کے درمیان سے مقبرے میں لے جایا جائے۔

سلطان کی میت کو آہستہ آہستہ اتار کر زمین پر رکھا گیا۔ مسجدِ اعلیٰ کے خلیفہ نمازِ جنازہ

نفاں بلند ہوا۔ قاضی شہر نے انہیں صبر کی تلقین کی۔ خاندانِ سلطانی سے تعلق رکھنے والی خواتین گھٹی گھٹی سسکیوں میں رو رہی تھیں مگر ٹیپو کی خواصوں اور کینزوں کا برا حال تھا۔ ان کے بال پریشان تھے اور وہ بڑے جانتگداز لہجے میں بین کر رہی تھیں۔ ان ماتم کرنے والی کینزوں میں ہندو خادائیں بھی شامل تھیں۔ شدتِ جذبات میں اکثر کینز اس پالکی کے آگے لیٹ جاتی تھیں جس میں سلطان کا جنازہ رکھا گیا تھا۔ جنرل ہارس کے حکم پر قلعے کے منتظمین نے بڑی مشکل سے ان فریادی کینزوں کو جنازے کے سامنے سے ہٹایا۔ پھر جب سلطان کی میت قلعے سے باہر نکلی تو آخری بار شور ماتم اٹھا۔

”ہمارے دیوتا کو کہاں لئے جا رہے ہو؟“ یہ ان ہندو کینزوں کی آوازیں تھیں، جنہیں سلطان شہید نے تمام عمر اپنی بیٹیاں سمجھا تھا۔ ”اس کے جانے کے بعد پھر وہی پتھر کے دیوتا رہ جائیں گے۔ پھر وہی پتھروں کا کاروبار ہوگا۔ پھر جسم و جاں کے شیشے ٹوٹیں گے اور مظلوموں کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ظالمو! تم نے اس دیوتا کو مار ڈالا جو راکشسوں کی اس بستی میں صدیوں بعد پیدا ہوا تھا۔ اب کون ماں ہے جو اس جیسا بیٹا جنے گی؟ کوئی بھی نہیں..... کوئی بھی نہیں۔ ان زندہ پتھروں کو کیوں نہیں توڑا جو خدا بنے بیٹھے ہیں؟“

جنرل ہارس، جنرل بیرڈ اور کرنل ولزلی ہندو عورتوں کی فریادیں سن رہے تھے اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔

”جو انسان، دیوتا کے درجے پر پہنچ جائے، اسے قتل ہو جاتا ہی چاہئے۔ ورنہ ہماری پرستش کون کرے گا؟“

میسور کی رانیاں بھی جنازے کے ہمراہ تھیں۔ خوشی کے جذبات سے ان کے دل بے قابو تھے مگر وہ زبردستی اپنے چہروں پر سوگواری کا رنگ سجانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ رانیوں کا ایجنٹ ترمل راؤ بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”مہارانی! آپ کو رام راج مبارک ہو۔“ ترمل راؤ نے رانی دیواجی منی سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”خاموش ہو جاؤ ترمل راؤ! یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔“ رانی دیواجی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”آپ کو اپنا وعدہ تو یاد ہے نا؟“ ترمل راؤ بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ترمل راؤ نے اسی شرط پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے ساز باز کی تھی کہ نئی حکومت میں اسے میسور کا وزیرِ اعظم بنایا جائے گا۔

”ہاں! یاد ہے۔“ رانی دیواجی منی کی آنکھوں میں ناگواری کا رنگ ابھر آیا تھا۔ ”پہلے اس کی لاش کو دفن تو ہو جانے دے۔ میری ہی قوم کے لوگ اسے دیوتا کہہ رہے ہیں؟“ رانی کابس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ ٹیپو کے جنازے کی بے حرمتی کرنے سے بھی باز نہیں آتی۔“

جزل بیرڈ نے کئی بار ٹیپو سے شکست فاش کھائی تھی، اس لئے سلطان کے خلاف اس کے دل میں غبار بھرا ہوا تھا۔ جب اس نے انگریز سپاہیوں کی لوٹ مار کا حال سنا تو مسکرانے لگا۔  
”لوٹ مار اور قتل و غارت گری، فاتح سپاہیوں کا حق ہے۔ تم یہاں کیوں چلے آئے؟ فوراً واپس جاؤ اور اپنے حقوق حاصل کرو۔ نادانوں! اگر تم نے وقت ضائع کر دیا تو زندگی بھر کفِ افسوس ملتے رہو گے۔“

سپاہی اپنے افسر کا حکم سن کر مسکراتے اور اس طوفانی رات میں بھاگتے ہوئے قلعے سے باہر چلے گئے۔

سپاہیوں کے جاتے ہی جزل بیرڈ بھی اپنے محافظ فوجیوں کے ساتھ یہ دلچسپ تماشا دیکھنے کے لئے قلعے سے باہر نکل آیا۔ بڑے بڑے امراء کے گھر لوٹ کر تباہ کر دیئے گئے تھے۔ کچھ دیر تک یہ تماشا دیکھنے کے بعد جزل بیرڈ قلعے میں واپس آ گیا۔ اس نے واپس آ کر دیکھا کہ یہاں ایک نیا ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ اگرچہ سلطان کے خزانے پر سخت پہرہ بٹھا دیا گیا تھا لیکن پھر بھی کچھ سپاہی ایک خفیہ راستے سے دروازے توڑ کر اندر داخل ہو گئے تھے اور سلطنتِ خداداد کی دولت لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جزل بیرڈ نے بڑی مشکل سے ان سپاہیوں کو باہر نکالا۔ اس ہنگامہ آرائی میں سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ انگریز سپاہی مال و متاع لوٹ کر اپنی جیبیں تو بھر رہے تھے مگر دوسروں کو اس عمل سے باز رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔



صبح ہوتے ہی جب ان واقعات کی خبر جزل ہارس کو پہنچی تو اس نے جزل بیرڈ کو ہٹا کر اس کی جگہ کرنل ولزلی کو مامور کیا اور سرنگاپٹم کے بڑے بڑے امراء کے گھروں پر فوجی پہرے بٹھا دیئے گئے۔ جزل ہارس کا خیال تھا کہ اس انتظامی تبدیلی کے بعد صورت حال معمول پر آ جائے گی مگر لوٹ مار اور قتل و غارت کا وہی عالم رہا۔

آخر تک آ کر کرنل ولزلی خود جزل ہارس کے پاس پہنچا اور انتہائی تلخ لہجے میں کہنے لگا۔  
”آپ کو تو ال شہر فریڈرک کو اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیں کہ وہ ہر حال میں میرے حکم کا تابع رہے۔ جب تک چند لوٹ مار کرنے والوں کو پھانسی نہیں دی جائے گی، اس وقت تک اس طوفان کو روکنا محال ہے۔ جزل اسٹیورٹ اور ہمارے بہت سے سپاہی شہر میں موجود ہیں۔ جزل اسٹیورٹ کی وجہ سے زیادہ دہشت پھیل رہی ہے۔ جب تک ہم مؤثر ذرائع اختیار نہیں کریں گے، لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس نہیں آئیں گے۔“

جزل اسٹیورٹ نے بھی کئی بار ٹیپو سے ذلت آمیز شکست کھائی تھی۔ اسی باعث وہ تنگ نظر فوجی، سرنگاپٹم کے معصوم اور بے دست و پا شہریوں سے اپنی شکست کا انتقام لے رہا تھا۔ جزل اسٹیورٹ کی شہ پر اس کے سپاہی نہ صرف شہریوں کا مال و متاع لوٹ رہے تھے بلکہ خوب صورت اور جوان عورتوں کی آبروریزی بھی کر رہے تھے۔

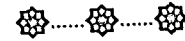
پڑھانے کے لئے آگے بڑھے اور ہزاروں انسان اپنی صفیں درست کرنے لگے۔ صف بندی کے بعد جیسے ہی امام نے ”اللہ اکبر“ کہا تو لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ جیسے آسمان ٹوٹ کر زمین پر گر رہا ہے۔ بجلی کی ایسی ہیبت ناک کڑک سنائی دی کہ کچھ دیر کے لئے انسانی سماعتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ روشنی اس قدر تیز تھی کہ میدان میں موجود تمام لوگوں کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر فضا پر گہرا سکوت چھا گیا۔ نماز ختم ہوئی اور ٹیپو کو نواب حیدر علی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

حیدر آباد کا وزیر اعظم میر عالم جنازے میں شریک نہیں تھا۔ وہ اپنے چند افسروں کے ساتھ اس وقت مقبرے کے نزدیک نمودار ہوا جب سلطان کو مرقد میں اتارا جا رہا تھا۔

جزل ہارس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ سلطان کے حضور آخری سلامی پیش کرے۔ جزل کا اشارہ پاتے ہی توپوں کے دہانے کھل گئے اور سرنگاپٹم کی پوری فضا بارودی گولوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی آسمان پر بادل اس طرح گرے کہ توپوں کا شور مدہم پڑ گیا۔ فوجی بینڈ ماتمی جنیں بجا رہا تھا لیکن بجلی کی خوفناک کڑک کے باعث کسی شخص کو بھی بینڈ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی آسمان کے دہانے کھل گئے اور باد و باران کا ایسا خوفناک طوفان آیا کہ سرنگاپٹم کے باشندے رات بھر اپنے گھروں میں بچوں کی طرح سہمے بیٹھے رہے اور آسمانی قہر سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگتے رہے۔

اس قدر بارش ہوئی کہ دریائے کاویری میں سیلاب آ گیا۔ اس موقع پر سلطنتِ خداداد کے بعض وفاداروں نے اپنے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

”کاش! یہ سیلاب ایک دن پہلے آ جاتا، پھر خندقیں لبریز ہو جاتیں اور فرنگی فوج قلعے کی فصیل تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتی۔“



انگریز سپاہیوں نے اس طوفانی رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے شہر میں لوٹ مار شروع کر دی۔ جزل بیرڈ دن بھر کا تھکا ہوا تھا، اس لئے آرام کرنے کی غرض سے محل کے برآمدے ہی میں لیٹ گیا تھا۔ مگر ابھی اس کی آنکھ بھی نہیں لگی تھی کہ چند سپاہیوں نے اسے جگاتے ہوئے کہا۔

”شہر کے مختلف مقامات پر آگ لگی ہوئی ہے اور ہر طرف لوٹ مار ہو رہی ہے۔ ہم نے ایک دو جگہ مداخلت کی مگر ناکام رہے۔ قلعے کی تسخیر کے بعد سپاہی اپنی کمپنیوں میں واپس نہیں گئے اور بار برداری کے لئے جو لوگ باہر کے خیموں میں موجود تھے، وہ بھی شہر میں داخل ہو گئے ہیں۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا اور سب کے سب لوٹ مار میں مشغول ہیں۔ کئی معزز لوگوں پر محض اس لئے تشدد کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی چھپی ہوئی دولت کا پتہ بتا دیں۔ عورتیں گھر چھوڑ کر گلیوں میں اور گوشوں میں کھڑی ہیں۔“

داخل ہوا اور اس نے اپنی تلوار، جزل ہارس کے قدموں میں رکھ دی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بیک وقت دو غداروں میر معین الدین اور میر قمر الدین سے ”گرم کندہ“ کی جاگیر کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میر معین الدین اپنے سینے پر داغ حسرت سجائے ہوئے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اب میر قمر الدین تنہا امیدوار تھا اس لئے جزل ہارس کو کسی دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ اس نے گرم کندہ کے سلسلے میں قانونی دستاویزات میر قمر الدین کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”تجھے نیا منصب مبارک ہو۔ اگر تیری وفاداریوں کا یہی انداز رہا تو ہم آئندہ بھی تجھے مایوس نہیں کریں گے۔“

بے غیرت میر قمر الدین سر دربار گھنٹوں کے بل جھک گیا اور اس نے جزل ہارس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

”جزل بہادر کا اقبال بلند ہو اور تاج برطانیہ اسی آب و تاب کے ساتھ ہمیشہ فروزاں رہے۔“

میر قمر الدین کو اس کی غداری کا صلہ دینے کے بعد جزل ہارس، جزل بیرڈ سے مخاطب ہوا۔

”میر صادق کہاں ہے؟..... ہندوستان میں تاج برطانیہ کا سب سے بڑا وفادار۔ ہنگاموں کے دوران کئی بار اس کا خیال آیا مگر اتنی مہلت نہ مل سکی کہ اپنے آدمیوں کی خبر گیری کر سکوں۔“

میر صادق علی کے ذکر پر جزل بیرڈ بھی چونک اٹھا۔ ”اس کی مسلسل غیر حاضری بہت معنی خیز ہے۔“

پھر جزل ہارس کے حکم پر میر صادق علی کی تلاش کی گئی۔ آخر بہت جستجو کے بعد وہ غدار مل گیا۔ مگر اس طرح کہ اس کی لاش سڑ چکی تھی۔

واقعہ یوں تھا کہ جب سلطان انگریزوں کے حملے کی خبر سن کر ڈڈی دروازے سے نکلا تو نمک حرام میر صادق نے واپسی کا راستہ بند کر دیا اور خود مشرقی دروازے کی طرف بڑھا تاکہ قلعے سے نکل کر اپنی حویلی چلا جائے جو منجم میں واقع تھی۔ جب میر صادق، مشرقی دروازے کے قریب پہنچا تو سلطان کے ایک جاں نثار سپاہی نے اسے گھوڑے سے کھینچ کر زمین پر گرادیا اور تلوار کے ایک ہی وار میں قتل کر دیا۔ چار دن تک میر صادق علی کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی یہاں تک کہ اس کا گوشت گل سڑ کر گرنے لگا اور پورے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔

میر صادق کے قتل کی خبر سنتے ہی جزل ہارس، جزل بیرڈ، کرنل ولزلی، میجر آلن، میجر بسٹن، میجر ڈالس اور دوسرے اعلیٰ فوجی افسر دوڑ پڑے۔ مگر وہ تاج برطانیہ کے وفادار کا آخری دیدار نہ کر سکے۔ میر صادق کی لاش اتنی سخی ہو چکی تھی کہ اسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ جسم کے سڑ جانے سے فضا میں اس قدر بدبو پھیلی ہوئی تھی کہ وہاں ایک لمحے کے لئے بھی ٹھہرنا دشوار ہو رہا

جزل ہارس نے کرنل ولزلی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کرنل بار بار اپنی تجویز پر اصرار کرتا رہا مگر جزل ہارس اطمینان کی حالت میں خاموش بیٹھا رہا جیسے وہ خود بھی قتل و غارت گری کے اس کھیل میں شریک ہو۔ کرنل ولزلی جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے اپنے بڑے بھائی، لارڈ ولزلی کو ایک طویل خط تحریر کیا۔

”میرے محترم بھائی! میں نہایت افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ 4 مئی کی رات کو سرنگاپٹم پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔ شہر میں شاید ہی کوئی ایسا مکان ہو جو لٹنے اور برباد ہونے سے بچ گیا ہو۔ ہمارے سپاہی بیش قیمت جواہرات، سونے کی سلاخیں اور دوسری قیمتی اشیاء انتہائی سستی قیمت پر فروخت کر رہے ہیں یا انہیں دوسری چیزوں کے بدلے میں دے رہے ہیں۔ ایک بیش قیمت موتی ایک بوتل شراب کے عوض دیا جا رہا ہے۔ ہمارے ایک فوجی ڈاکٹر نے ایک نگریز سپاہی سے دو بازو بند خریدے ہیں، جن میں قیمتی ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد کے ایک جوہری نے ایک بازو بند کی قیمت تیس ہزار پونڈ بتائی ہے اور دوسرے کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس قدر مال و دولت حاصل کرنے کے باوجود ہمارے افسر اور سپاہی، سرنگاپٹم کی تمام املاک اور خزانے بھی لوٹ لیتا چاہتے ہیں۔ فوج کا ہر شخص بلکہ جزل ہارس تک اس کے لئے بے قرار ہے کہ مالی غنیمت جلد سے جلد تقسیم ہو جائے۔ ہماری فاتح فوج بالکل بے قابو ہو چکی ہے اور اسے لوٹ مار کے سوا دنیا میں کوئی اور کام نہیں ہے۔“

اپنے اسی طویل خط میں آگے چل کر کرنل ولزلی نے اپنے بڑے بھائی کو تحریر کیا تھا۔

”مال غنیمت کی تقسیم کے لئے جو ایجنٹ مقرر کئے گئے ہیں، وہ ”جوگلوں“ سے بھی زیادہ خونخوار ہیں۔ انہوں نے محل کے دروازے اور سلطان کے کپڑے تک فروخت کر ڈالے ہیں اور ابھی ان کے پاس سلطان کے لمبوسات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ وہ کپڑے ہیں جنہیں سلطان استعمال کیا کرتا تھا۔ اگر سلطانی لمبوسات کی فروخت پر فوری پابندی عائد نہ کی گئی تو مجھے خوف ہے کہ ریاست کے وہ مسلمان جو ہمارے قبضے سے بیزار ہیں، ان لمبوسات کو تیرک کے طور پر خرید لیں گے اور یہ بات ہمارے لئے شرم ناک ہوگی۔ لہذا میری رائے یہی ہے کہ حکومت برطانیہ خود ان لمبوسات کو خرید لے اور پھر انہیں شہزادوں کے حوالے کر دے یا جس طرح مناسب سمجھے، عمل کرے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ہمارے ایجنٹوں نے حرم سرا کی خواتین کی بھی تلاش لی ہے۔ فاتح کچھ بھی کریں مگر اس عمل سے ہماری قوم کی نیک نامی میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔“



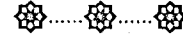
چار دن تک قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ پھر جزل ہارس سرنگاپٹم میں لوٹنے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا تو یہ طوفان ختم کیا میر قمر الدین، سلطان کی شہادت کے دوسرے دن قلعے میں



تھا۔ جنرل ہارس اور دوسرے فوجی افسروں کے چہروں پر رومال تھے اور وہ ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہے تھے۔

”اسے دفن کر دو..... اسے دفن کر دو۔“

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجرانے سب سے بڑے وفادار کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ ماتی بیڑا بجایا گیا، نہ غسل دیا گیا، نہ کسی نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ بس چند مزدوروں نے اسی جگہ گڑھا کھودا اور میر صادق کے سرے ہوئے جسم کو گڑھے میں ڈال دیا۔



**قتل و غارت اور لوٹ مار کا طوفان** ختم جانے کے بعد جنرل ہارس، ٹیپو سلطان کے اثاثوں کی تقسیم کے لئے بے قرار نظر آ رہا تھا۔ جب سرنگاپٹم کا خزانہ ایک طویل وعریض کمرے میں جمع کیا گیا تو فرنگیوں کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ تمام فوجی افسر دولت کے اس انبار کو حاصل کرنے کے لئے اس طرح مضطرب تھے جیسے بھوکوں کا ہجوم روٹیوں کے ذخیرے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بے چین ہو۔ ہر آنکھ سوالی تھی اور ہر ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔

سلطان کی ایک تلوار، ہیروں کا نایاب جھومر اور بہت سے طلائی زیورات لارڈ ولزلی کے لئے بطور تحفہ بھیجے گئے۔ ٹیپو کی دوسری تلوار، جنرل بیرڈ کو بطور انعام دی گئی۔ سلطان کی ایک دستار اور ایک تلوار لارڈ کارنوالس کو انگلستان بھیجی گئی۔ دوسری قیمتی اشیاء کے علاوہ جنرل ہارس کے حصے میں ایک لاکھ بیالیس ہزار نو سو دو اشرفیاں آئیں۔

لارڈ ہیرس، انگریزی فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ اپنے عہدہ منصب کی وجہ سے وہ اثاثوں کی تقسیم میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس کے حصے میں دوسری نایاب چیزوں کے علاوہ ایک ایسا ہار بھی آیا تھا جس کی قیمت 1799ء میں تیرہ ہزار پانچ سو پونڈ تھی۔ یہ تمام اشیاء لارڈ ہیرس کے خیمے میں پہنچا دی گئیں۔

بڑے افسروں کے بعد باقی جواہرات اور قیمتی چیزیں حسب مراتب چھوٹے افسروں اور سپاہیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ غرض انگریزی فوج کا ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن اور باربردار بھی پیاسا نہیں رہا۔ سرنگاپٹم کے خزانے سے ہر شخص کو اتنا ملا کہ اس کا دامن تنگ ہو گیا۔

ٹیپو سلطان نے عجیب و غریب ساخت کا ایک تخت بنوایا تھا اس کی پشت پر ایک ”ہما“ کی تصویر تھی جو سونے اور قیمتی جواہرات کی بنی ہوئی تھی۔ وہ بے مثال تخت سونے کے چار شیروں کی پشت پر قائم تھا۔ اس تخت کے ٹکڑے کر کے تمام فوجی افسروں کے سامنے ڈھیر لگا دیئے گئے۔ ہر شخص کے حصے میں اٹھارہ سو پونڈ آئے۔ تخت کی چھت دو ہزار پانچ سو پونڈ میں جنرل کانٹ کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ اس تخت کے سامنے دو شیر جو خالص سونے کے تھے، شاہِ برطانیہ کے لئے انگلستان بھیج دیئے گئے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر میر عالم نے حیدر آبادی فوج کا حصہ طلب کیا تو جنرل ارس

مسکرانے لگا۔

”تم کس منہ سے اپنا حصہ مانگ رہے ہو؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ قلعے پر صرف انگریز سپاہیوں نے قبضہ کیا تھا۔ اس جنگ میں تمہارے سپاہیوں کی حیثیت باربرداروں سے زیادہ نہیں تھی۔ فاتح ہم تھے، اس لئے مالِ غنیمت بھی ہمارا حق تھا۔“

جنرل ہارس نے تمام فوجی افسروں کے سامنے حیدر آباد دکن کے وزیرِ اعظم میر عالم کو بے لباس کر دیا تھا۔ مگر وہ بے غیرت پھر بھی مسکراتا رہا۔

”بجا فرمایا حضور نے۔ ہمارے لئے یہی شرف کافی ہے کہ ہم شاہِ برطانیہ کے باربرداروں میں شامل ہیں۔“ یہ کہہ کر اس بے حیا نے گردن جھکا لی۔

اچانک کرنل ولزلی چونک اٹھا۔ اس نے محل کے ایک گوشے میں شیروں کی دھاڑ سنی تھی۔ ”جنرل! میرا خیال ہے کہ میر عالم کو بھی مالِ غنیمت میں شریک کیا جاسکتا ہے۔“ کرنل ولزلی بڑے عجیب لہجے میں جنرل ہارس سے مخاطب ہوا۔

جنرل ہارس حیرت زدہ انداز میں کرنل کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرے ساتھ آئیے۔“ کرنل ولزلی نے کہا اور اس طرف بڑھ گیا، جدھر سے شیروں کی خوفناک آوازیں آرہی تھیں۔

ٹیپو کے پچاسوں شیر فولا دی بنجروں میں بند تھے اور بری طرح دھاڑ رہے تھے۔ جنگ کی ہلاکت خیزیوں کے سبب کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی پھر سلطان کے ان محبوب جانوروں کی نگہداشت کون کرتا؟ تمام شیر پانچ دن سے بھوکے تھے اور اسی بھوک کی شدت نے انہیں دھاڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جب انگریز فوجی افسر، آہنی بنجروں کے قریب پہنچے تو محل کا ایک بوڑھا خدمت گار، شیروں سے کہہ رہا تھا۔

”خاموشی کے ساتھ مر جاؤ! تمہارا رزق دینے والا اس دنیا سے چلا گیا۔“

بوڑھے خدمت گار کی گفتگو سن فرنگی افسر سناٹے میں آ گئے۔

پھر کرنل ولزلی، میر عالم سے مخاطب ہوا۔

”سلطان کے ان شیروں کا شمار بھی مالِ غنیمت میں ہوتا ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنا حصہ لے سکتے ہو۔ کیسے شاندار اور اعلیٰ نسل کے شیر ہیں۔ واقعی، سلطان کا انتخاب بے مثال ہے۔“

”میں ان جانوروں کا کیا کروں گا؟“ میر عالم نے گھبرا کر کہا۔ اس کے چہرے سے خفت کے آثار نمایاں تھے۔

”سرکار! آپ ان شیروں کو کس کے حوالے کر رہے ہیں؟“ بوڑھے خدمت گار نے بڑی

تھارت سے میر عالم کی طرف دیکھا اور پھر کرنل ولزلی سے مخاطب ہوا۔ ”یہ شیر ہیں اور ان کی ناز

برداری کوئی شیر ہی کر سکتا ہے۔“

میر عالم مال غنیمت نہ ملنے کے سبب پہلے ہی جھنجھلایا ہوا تھا۔ سلطان کے بوڑھے خدمت گار کی تحقیر آمیز گفتگو سن کر برہم ہو گیا۔ وزیر اعظم حیدر آباد، شیروں کے محافظ کو اپنی بندوق کا نشانہ بنانا ہی چاہتا تھا کہ کرئل وٹری نے اسے جھڑک دیا۔

”بوڑھا ٹھیک کہتا ہے۔ تجھ سے شیروں کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔“

سلطان کے شیروں کا کوئی طلب گار نہیں تھا۔ آخر پانچ دن سے بھوکے ان تمام شیروں کو گولی مار دی گئی۔

مرنے والے شیروں کی دھاڑ سے پورا محل گونج رہا تھا۔ اور جو اہل دل باقی رہ گئے تھے، انہیں ان دھاڑوں کے عقب سے ابھرتی ہوئی سلطان شہید کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

(تمت بالآخر)

